عمدۃ المتکلمین زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین حجۃ الاسلام امام

ابو حامد محمد بن محمد غزالی رحمۃ اللہ

کی تحقیق انیق اور علوم معارف کے بے بہا خزانہ

احیاءِ عُلوم الدّین

المعروف احیاء العلوم کا با محاورہ مستند اردو ترجمہ



مِصباحُ السّالکین

مترجم: مولانا محمد صدیق ہزاروی

پروگریسو بکس






www.maktabah.org

عُمدۃ المتکلمین زبدۃ العارفین قُدوۃ السالکین حجۃ الاسلام امام

ابو حامد محمد بن محمد غزالی رحمۃ اللہ

کی تحقیق انیق اور علوم معارف کے بے بہا خزانہ

احیاءِ علوم الدّین

المعروف احیاء العلوم کا بامحاورہ مستند اردو ترجمہ

مِصباح السّالکین

جلد چہارم

مترجم: مولانا محمد صدیق ہزاروی

پروگریسو بکس

۴۰-بی، اردو بازار، لاہور
فون: ۷۳۵۲۷۹۵

نام کتاب	....	احیاء العلوم
مصنف	....	حجتہ الاسلام حضرت امام محمد غزالیؒ
مترجم	....	مولانا محمد صدیق ہزاروی سعیدی
جلد	....	چہارم
حوالہ جات	....	حق نواز نقشبندی
تصحیح / پروف ریڈنگ	....	مولانا محمد یٰسین قصوری / محمد عبداللہ قادری
		مولانا محمد اختر رضا القادری / محمد ادریس قادری
پرنٹرز	....	حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز' لاہور
ناشر	....	چوہدری غلام رسول
		میاں جواد رسول
قیمت	....	مکمل 4 جلد سیٹ

فہرست مضامین احیاء العلوم اُردو جلد چہارم

توبہ کا بیان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم :

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس کی تعریف سے ہر کتاب کا افتتاح ہوتا ہے اور اس کے ذکر سے ہر خطاب کا آغاز ہوتا ہے، اسی کی حمد کے باعث جنت میں نعمتوں کا حصول ہوگا اسی کے نام سے بدبخت تسلی حاصل کرتے ہیں اگرچہ ان کے آگے پردہ ڈال دے اور ان کے اور خوش بخت لوگوں کے درمیان ایک ایسی دیوار بنا دے جس میں دروازہ ہو اس کے اندر رحمت ہو اور اس کا ظاہر اس ذات والاصفات کی جانب سے عذاب ہو۔

ہم اس کی بارگاہ میں اس طرح توبہ کرتے ہیں جیسے وہ لوگ توبہ کرتے ہیں جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہی تمام پالنے والوں کا پالنہار ہے اور اسے مسبب الاسباب سمجھتے ہیں اور اس سے اس طرح امید رکھتے ہیں جس طرح وہ لوگ امید رکھتے ہیں جو اسے رحیم، غفور اور توبہ قبول کرنے والا بادشاہ جانتے ہیں۔

ہم اپنی امید کو خوف کے ساتھ اس طرح ملاتے ہیں جس طرح وہ لوگ ملاتے ہیں جنہیں اس بات میں شک نہیں ہوتا کہ وہ باوجود اس بات کے کہ گناہ کو بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت عذاب دینے والا بھی ہے۔

ہم اس کے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں اور آپ کی آل و اصحاب پر بھی، ایسا درود جو ہمیں پیشی کے دن کی پریشانی سے بچائے۔ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں قرب اور اچھا ٹھکانہ بنائے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد ـــــ

عیبوں پر پردہ ڈالنے والے اور غیب کی باتیں جاننے والے کی طرف رجوع کے ذریعے گناہوں سے توبہ کرنا سالکین کے راستے کا آغاز، کامیاب لوگوں کا اصل سرمایہ، مریدین کا پہلا اقدام، بھٹکنے والوں کی استقامت کی چابی اور مقربین اور ہمارے جد امجد حضرت آدم (آپ پر اور تمام انبیاء کرام پر رحمت و سلام ہو) کے مصطفیٰ و مجتبیٰ ہونے کا مطلع ہے۔

اور اولاد کے لیے اپنے آباؤ اجداد کی پیروی نہایت ضروری ہے یہ بات تعجب خیز نہیں کہ آدمی گناہ اور جرم کرے تو وہ طبیعت و خصلت میں اپنے آباؤ اجداد کے مشابہ ہوتا ہے۔

لیکن جب باپ توڑنے کے بعد جوڑے اور گرانے کے بعد تعمیر کرے تو اولاد کے لیے بھی ضروری ہے کہ نفی اور اثبات اور وجود و عدم دونوں طرفوں میں اس کی اتباع کرے۔

حضرت آدم علیہ السلام نے ندامت کا راستہ دیا کہ اپنے کئے پر پشیمانی کا اظہار فرمایا تو جو شخص گناہ (لغزش) کے لیے ان

کو مقتدا قرار دے لیکن توبہ کرتے ہیں ان کی پیروی نہ کرے اس کے قدم پھسل گئے بلکہ صرف بھلائی مقربین فرشتوں کا طریقہ ہے اور برائی ہی برائی ہو اور اس کی تلافی نہ ہو تو یہ شیطانوں کی خصلت ہے جب برائی میں پڑنے کے بعد نیکی کی طرف رجوع کرنا انسانی ضرورت ہے جو صرف نیکی کرتا ہے وہ فرشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا مقرب ہے اور جو صرف برائی کرتا ہے وہ شیطان ہے اور جو برائی ہو جانے کے بعد بھلائی کی طرف رجوع کرکے اس کی تلافی کرنے والا واقع میں انسان ہے کیوں کہ انسان کے خمیر میں دونوں باتیں رکھی گئی ہیں اب انسان اپنا نسب فرشتے سے صحیح ثابت کرے یا آدم علیہ السلام سے یا شیطان سے نسبت کرے تو جو آدمی توبہ کرتا ہے وہ اس بات پر دلیل قائم کرتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی طرف اس کی نسبت صحیح ہے کیوں کہ وہ انسان کی تعریف کو اپناتا ہے اور جو آدمی گناہوں پر ڈٹ جاتا ہے وہ شیطان سے نسبت اور نسب کو ثابت کرتا ہے۔

فرشتوں سے نسب کی تصحیح کہ آدمی صرف نیکی ہی کرے بندے کے لیے ممکن نہیں ہے کیوں کہ انسانی خمیر میں نیکی کے ساتھ برائی نہایت مضبوطی سے ملی ہوئی ہے اسے یا تو ندامت کی آگ الگ کر سکتی ہے یا جہنم کی آگ تو شیطانی خباثتوں سے انسانی جوہر کو الگ کرنے کے لیے آگ سے جلانا ضروری ہے اب تمہیں چاہیے کہ جو آگ ہلکی ہے اسے اختیار کرو اور کم درجہ کی خرابی کی طرف جلدی کرو اس سے پہلے کہ اختیار کی بساط لپیٹ دی جائے اور مجبوری کے گھر کی طرف لے جائے یا تو جنت کی طرف اور یا جہنم کی جانب۔

اور جب دین میں توبہ کا یہ مقام ہے تو نجات دینے والے امور کے بیان میں توبہ کی حقیقت، شرائط، سبب، علامت، نتیجہ، اس سے روکنے والی آفات اور اسے آسان کرنے والی دواؤں کی تشریح کو مقدم کرنا ضروری ہے اور اس بات کی وضاحت چار ارکان سے ہوتی ہے۔

پہلا رکن:

نفس توبہ، اس کی تعریف و حقیقت، نیز یہ کہ توبہ فوری واجب ہے تمام لوگوں کے لیے اور تمام حالات میں ضروری ہے اور جب وہ صحیح ہو تو مقبول ہوتی ہے۔

دوسرا رکن:

جس چیز سے توبہ کی جائے اور وہ گناہ ہیں ان کی صغیرہ و کبیرہ میں تقسیم بندوں سے متعلق گناہ اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق گناہ نیکیوں اور برائیوں پر درجات کی تقسیم اور ان کو پانے کی کیفیت اور وہ اسباب جن سے صغیرہ گناہ کبیرہ گناہوں میں بدل جاتے ہیں۔

تیسرا رکن:

توبہ اور اس کے دوام کی شرائط، گذشتہ مظالم کا تدارک کیسے کیا جائے گناہوں کے کفارے کی کیفیت اور

دوام توبہ میں توبہ کرنے والوں کی اقسام۔

چوتھا رکن:

توبہ کا باعث اور گناہ کے مرتکبین کے اصرار کی گرہ کیسے کھل سکتی ہے ان چار ارکان سے مقصود پورا ہو جائے گا انشاءاللہ تعالیٰ

پہلی فصل:

توبہ کی حقیقت اور اس کی تعریف

جان لو! توبہ تین ترتیب وار امور کا نام ہے اور ان ہی سے منظم ہوتی ہے (۱) علم (۲) حال (۳) فعل ــــ پہلا (یعنی علم) دوسرے کا باعث ہے اور دوسرا (یعنی حال) تیسرے (فعل) کا سبب ہے اور یہ انتظام و ایجاب ملک و ملکوت میں جاری سنت الٰہیہ کے مطابق ہوتا ہے۔

علم ــــ گناہوں کے بہت بڑے ضرر کی معرفت کا نام ہے اور یہ کہ گناہ بندے اور اس کے ہر محبوب کے درمیان حجاب ہے جب اسے اس بات کی معرفت ایسے یقین کے ساتھ حاصل ہو جائے جو اس کے دل پر غالب ہے تو اس معرفت سے دل میں ایک درد اٹھتا ہے جس کا سبب محبوب سے نہ ملنا ہے کیونکہ جب دل کو محبوب کے نہ ملنے کا شعور ہوتا ہے تو اسے رنج ہوتا ہے اور اگر اس کا سبب اس کا اپنا فعل ہو تو اسے اس پر افسوس ہوتا ہے تو اس کا یہ رنج جو اس کے اپنے فعل کے ذریعے ہوا جس کے سبب سے اس کا محبوب اسے نہ مل سکا، ندامت کہلاتا ہے۔

اور جب یہ رنج اس کے دل پر چھا جاتا ہے تو اس سے دل میں ایک دوسری حالت پیدا ہوتی ہے جسے ارادہ اور قصد کہتے ہیں اور یہ اس فعل کے لیے ہوتا ہے جس کا حال ماضی اور استقبال تینوں زمانوں سے تعلق ہوتا ہے حال کے ساتھ تعلق اس گناہ کو چھوڑنے کے ساتھ ہے جو محبوب کی ملاقات میں رکاوٹ بنا مستقبل کے ساتھ تعلق کی صورت یہ ہے کہ جس گناہ کی وجہ سے محبوب نہیں ملا زندگی بھر اس کے قریب نہ جانے کا عزم کرنا اور ماضی کے ساتھ ندامت کے تعلق کی نوعیت یہ ہے کہ اگر نیکی کے ذریعے اس کی تلافی ہو سکتی ہے تو اس نقصان کو پورا کرے۔ پس علم پہلی سیڑھی اور ان نیکیوں کا مطلع ہے اور اس علم سے مراد ایمان اور یقین ہے کیونکہ ایمان اس بات کی تصدیق کا نام ہے کہ گناہ مہلک زہر ہیں اور یقین اس تصدیق کی تاکید اور اس سے شک کو دُور کرنا ہے نیز اسے دل پر غالب کرتا ہے تو اس ایمان کا نور دل پر چمکتا ہے تو ندامت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اب دل میں رنج پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ نورِ ایمان کی چمک سے اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے محبوب سے پردے میں ہے جس طرح آدمی اندھیرے میں ہو اور سورج طلوع ہو تو بادلوں کے چھٹ جانے یا ظاہری رکاوٹوں کے دور ہونے سے اسے روشنی حاصل ہوتی ہے تو وہ اپنے محبوب کو دیکھ لیتا ہے اور بعض اوقات وہ ہلاکت کے قریب ہوتا ہے اور محبت کی آگ اس کے دل میں شعلہ زن ہوتی ہے اور یہ آگ اسے کسی تدبیر پر آمادہ کرتی ہے۔

تو علم اور ندامت اور حال و استقبال میں گناہ کے ترک کا ارادہ اور ماضی کی تلافی تین چیزیں ہیں جو ترتیب سے حاصل ہوتی ہیں اور ان سب کے مجموعہ پر توبہ کا اطلاق ہوتا ہے اکثر توبہ کا اطلاق صرف ندامت پر ہوتا ہے اور علم اس کے لیے ایک مقدمے کی حیثیت رکھتا ہے ترکِ گناہ پھل کی طرح ہوتا ہے اور آخر میں حاصل ہوتا ہے اسی لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلنَّدَمُ التَّوْبَةُ۔ (۱) ندامت (ہی) توبہ ہے۔

کیوں کہ ندامت اس علم کی وجہ سے ہوئی ہے جس کا یہ نتیجہ ہے اور وہ عزم اس کی بنیاد ہے جو اس کے بعد آرہا ہے گویا ندامت دونوں طرفوں سے محفوظ ہے یعنی پھل دینے والی چیز اور پھل، اس اعتبار سے توبہ کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ خطائے سابق پر باطن کا پگھلنا توبہ ہے اور اس میں صرف دل کا رنج پایا جاتا ہے اسی لیے کہا گیا کہ توبہ دل کی آگ ہے جو بھڑکتی ہے اور جگر میں ایک درد ہے جو پھیلتا نہیں اور گناہوں کے ترک کے حوالے سے توبہ کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ یہ ظلم و جفا کا لباس اتار کر وفا کی بساط بچھانا ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمہ اللہ نے فرمایا توبہ، حرکات مذمومہ کو حرکات محمودہ سے بدلنا ہے اور یہ کام خلوت خاموشی اور حلال کھانے سے پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے گویا انہوں نے توبہ کے تیسرے معنیٰ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

توبہ کی تعریف میں بے شمار اقوال ہیں جب ان باتوں کو سمجھ لو اور ان کو ترتیب کے ساتھ لازم کر لو تو جان لو کہ جو کچھ بھی اس کی تعریف میں کہا گیا ہے ان میں سے کوئی بھی تعریف ان باتوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ حقائق امور کا علم طلب کرنا محض الفاظ کی طلب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

دوسری فصل:

توبہ کا وجوب اور اس کی فضیلت

جان لو! آیات و احادیث سے توبہ کا وجوب واضح ہوتا ہے اور یہ اس شخص کے لیے نور بصیرت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے جس کی بصیرت کھلی ہو اور اللہ تعالیٰ نے نور ایمان کے ذریعے اس کے سینے کو کھول دیا ہو حتیٰ کہ وہ اس جہالت کی اندھیریوں میں اس نور کے ساتھ چلنے پر قادر ہو جائے جو اس کے آگے آگے ہے اور قدم قدم پر قائد کی ضرورت باقی نہ رہے۔

تو سالک یا تو اندھا ہوتا ہے کہ وہ چلنے میں قائد کا محتاج ہوتا ہے یا اسے دکھائی دیتا ہے کہ جب راستہ مل گیا تو خود بخود چل پڑتا ہے دین کے بارے میں بھی لوگوں کا یہی حال ہے اور ان اقسام کی تقسیم میں بعض لوگ طاقت نہیں رکھتے اور وہ تقلید

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۳۷۶ مرویات عبداللہ

سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتے انہیں اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ہر قدم پر قرآن پاک یا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نص سنیں اور کبھی یہ بات ان کے لیے مشکل ہوتی ہے تو حیران ہو جاتے ہیں تو ایسے لوگوں کی سیر مختصر ہوتی ہے اگرچہ ان کی عمر لمبی اور محنت زیادہ ہو کیوں کہ قدم چھوٹے چھوٹے پڑتے ہیں اور بعض خوش بخت ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے تو وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہوتے ہیں اور وہ مشکل راستے پر چلنے کے لیے بھی ایک ادنیٰ اشارے سے بیدار ہو جاتے ہیں اور سخت گھاٹیاں طے لیتے ہیں ان کے دلوں میں قرآن پاک اور ایمان کا نور چمکتا ہے اور نور کی شدت کے باعث ان کے لیے ادنیٰ بیان بھی کافی ہوتا ہے قریب ہے کہ اس کا تیل اسے روشن کرے اگرچہ اس سے آگے نہ پہنچا اور جب آگ پہنچے تو یہ نور علیٰ نور ہوتا ہے اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنے نور کی طرف ہدایت دیتا ہے اور ایسے لوگوں کو کسی منقول نص کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تو جس آدمی کی یہ حالت ہو وہ جب وجوب توبہ کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہے تو پہلے نور بصیرت سے توبہ کی ماہیت کو دیکھتا ہے پھر وجوب کا معنیٰ معلوم کرتا ہے پھر وجوب اور توبہ کو جمع کرتا ہے تو اسے توبہ کے واجب ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ اسے معلوم ہو کہ واجب وہی چیز ہے جو ابدی سعادت تک پہنچاتی ہے اور ہمیشہ کی ہلاکت سے نجات دیتی ہے اس لیے کہ اگر کسی کام کے کرنے اور اسے چھوڑنے کے ساتھ سعادت اور بدبختی کا تعلق نہ ہو تو اس کے وجوب سے موصوف ہونے کا کوئی مطلب نہ ہو اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں کام واجب کرنے سے واجب ہوگیا تو یہ محض ایک بات ہے کیونکہ جس کام کے کرنے یا چھوڑنے سے فوری طور پر یا مستقبل میں کوئی غرض نہ ہو اس میں مشغول ہونے کا کوئی مطلب نہیں ہے اسے کوئی دوسرا ہم پر واجب کرے یا نہ۔

جب وجوب کا معنیٰ معلوم ہوگیا اور وہ ابدی سعادت کا وسیلہ ہے اور معلوم ہو کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے سوا کوئی سعادت نہیں اور اس سے جو پردے اور رکاوٹ میں رہا وہ لامحالہ بدبخت ہے اور یہ بدبختی اس کے اور اس کی خواہش کے درمیان حائل ہوگی اور وہ آتش فراق اور آتش جہنم سے جلے گا اور یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے دور رکھنے والی چیز خواہشات کی پیروی اس فانی جہان سے مانوس ہونا اور اس چیز پر جھکنا ہے جس سے لازماً جدا ہونا ہوگا۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے قریب صرف یہی بات کرتی ہے کہ آدمی اس دنیا کی زیب و زینت سے قلبی تعلق ختم کر دے اور مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو یعنی اس کے ذکر کے ذریعے اس سے مانوس ہو اور حسب طاقت اس کے جمال و جلال کی معرفت کے ذریعے اس سے محبت کرے۔

یہ بات بھی جان لے کہ وہ گناہ جو اللہ تعالیٰ سے پھیر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے دشمن جو اس سے دور کر دیتے ہیں اور وہ شیطان ہیں ان کی پسندیدہ باتوں کے پیچھے پیچھے چلنا دربار الٰہیہ سے انسان کو دور کر دیتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ حصول قرب کے لیے دور کرنے والے راستوں سے ہٹنا ہوگا اور یہ ہٹنا علم، ندامت اور عزم کے ذریعے مکمل ہوتا ہے کیونکہ

جب تک معلوم نہ ہو کہ گناہ محبوب سے دُوری کا سبب ہیں آدمی نادم نہیں ہوتا اور دوری کے راستے پر چلنے کی وجہ سے اسے رنج نہیں ہوتا اور جب تک رنج نہ ہو وہ واپس نہیں آتا اور واپسی کا مطلب گناہ کا چھوڑنا اور عزم و ارادہ ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ محبوب تک پہنچنے کے لیے یہ تین باتیں ضروری ہیں۔ اور نور بصیرت سے حاصل ہونے والا ایمان اس طرح ہوتا ہے اور جو لوگ اس بلند مقام پر فائز نہ ہوں اور اکثر لوگوں کا یہی حال ہے تو اس کے لیے تقلید اور اتباع کا میدان کھلا ہے وہ اس کے ذریعے ہلاکت سے نجات کی طرف جا سکتا ہے وہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور سلف صالحین کے اقوال کو پیش نظر رکھے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

وَتُوبُوا إِلَى اللهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (۱)

اور اے مومنو! تم سب اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ (رجوع) کرو تاکہ تم کامیابی پاؤ۔

یہ عمومی حکم ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللهِ تَوْبَةً نَصُوحًا۔ (۲)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسی توبہ کرو جو نصیحت کارگر (اور خالص ہو)

نصوح کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ خالص اللہ تعالیٰ (کی رضا) کے لیے ہو اور اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو یہ لفظ، نُصح سے بنا ہے۔ توبہ کی فضیلت پر یہ آیت کریمہ بھی دلالت کرتی ہے۔

إِنَّ اللهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ۔ (۳)

بے شک اللہ تعالیٰ بہت توبہ کرنے والوں اور خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلتَّائِبُ حَبِيبُ اللهِ وَالتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ۔

توبہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے اور گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ نور آیت ۳۱

(۲) قرآن مجید، سورۃ تحریم آیت ۸

(۳) قرآن مجید، سورۃ تحریم آیت ۸

(۴) سنن ابن ماجہ ص ۳۲۳، ابواب الزھد

اللهُ اَفْرَحُ بِتَوْبَةِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ مِنْ رَجُلٍ نَزَلَ فِي اَرْضٍ دَوِيَّةٍ مُهْلِكَةٍ مَعَهُ رَاحِلَتُهُ عَلَيْهَا طَعَامُهُ وَشَرَابُهُ فَوَضَعَ رَأْسَهُ فَنَامَ نَوْمَةً فَاسْتَيْقَظَ وَقَدْ ذَهَبَتْ رَاحِلَتُهُ فَطَلَبَهَا حَتّٰى إِذَا اشْتَدَّ عَلَيْهِ الْحَرُّ وَالْعَطَشُ اَوْمَا شَاءَ اللهُ قَالَ اَرْجِعُ اِلٰى مَكَانِي الَّذِي كُنْتُ فِيهِ فَاَنَامُ حَتّٰى اَمُوْتَ فَوَضَعَ رَأْسَهُ عَلٰى سَاعِدِهِ لِيَمُوْتَ فَاسْتَيْقَظَ فَاِذَا رَاحِلَتُهُ عِنْدَهُ عَلَيْهَا زَادُهُ وَشَرَابُهُ فَاللهُ تَعَالٰى اَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ مِنْ هٰذَا بِرَاحِلَتِهِ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ مومن بندے کی توبہ پر اس آدمی سے بھی زیادہ خوش ہوتا (پسند کرتا ہے) جو شخص کسی ناموافق ہلاکت خیز جگہ پر اترے اس کے ساتھ اس کی سواری بھی ہو جس پر اس کا کھانا اور مشروب ہے وہ نیچے سر رکھے ہی گہری نیند سو جاتا ہے پس جب بیزار ہوتا ہے تو اس کی سواری جا چکی ہوتی ہے وہ اسے تلاش کرتا ہے حتی کہ اسے سخت گرمی اور پیاس کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا جو کچھ اللہ تعالیٰ چاہے وہ (دل میں) کہتا ہے کہ میں اپنی اس جگہ کی طرف لوٹ جاتا ہوں جہاں میں تھا وہاں سو جاتا ہوں حتی کہ مر جاؤں وہ اپنے بازو پر سر رکھتا ہے کہ مر جائے پھر وہ بیدار ہوتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی سواری اس کے پاس ہے اور اس کا سامان اور پانی وغیرہ بھی اس پر موجود ہے (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) جس قدر وہ بندہ اس سواری کے ملنے پر خوش ہوتا ہے اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ کو اس سے بھی زیادہ پسند فرماتا ہے اور بعض روایات میں ہے کہ وہ بہت زیادہ خوشی کی وجہ سے شکر ادا کرتے ہوئے یہ الفاظ کہتا ہے "میں تیرا رب ہوں اور تو میرا بندہ ہے"

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی تو فرشتوں نے ان کو مبارک باد دی اور حضرت جبریل اور حضرت میکائیل علیہما السلام زمین پر اترے اور عرض کیا اے آدم علیہ السلام! اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ قبول فرمائی تو اس سے آپ کی آنکھوں کو ٹھنڈک حاصل ہوگئی۔

حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا اے جبریل علیہ السلام! اگر اس توبہ (کی قبولیت) کے بعد بھی سوال ہوا تو میرا ٹھکانہ کیا ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اے آدم! آپ نے اپنی اولاد کے لیے بطور وراثت رنج و تکلیف بھی چھوڑی اور توبہ بھی۔ ان میں سے جو مجھے پکارے گا تو میں اس کی دعا قبول کروں گا جس طرح آپ کی دعا قبول کی ہے جو مجھ سے بخشش مانگے میں اس سے بخل نہیں کروں گا کیونکہ میں قریب ہوں اور دعا قبول کرنے والا بھی اے آدم علیہ السلام۔ میں توبہ کرنے والوں کو قبروں سے اس طرح باہر لاؤں گا کہ وہ خوش ہوں گے اور ہنس رہے ہوں گے۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۳۳ کتاب الدعوات / صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۵۵ کتاب التوبۃ

اوران کی دعا قبول ہو گی۔

اس سلسلے میں احادیث و آثار بے شمار ہیں اور امت کا توبہ کے وجوب پر اجماع ہے کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہوں کے ہلاکت خیز اور اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث ہونے کا علم ہوا اور یہ وجوب ایمان میں داخل ہے مگر کبھی اس سے غفلت ہو جاتی ہے تو اس علم کا معنیٰ غفلت کا ازالہ ہے اور اس کے واجب ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

اور توبہ کے معانی میں سے گناہوں کو زمانہ حال میں چھوڑنا اور مستقبل میں چھوڑنے کا عزم کرنا ہے نیز پہلے حالات میں جو کوتاہی ہو چکی ہے اس کا تدارک کرنا ہے اور اس کے واجب ہونے میں بھی کوئی شک نہیں جہاں تک گذشتہ گناہوں پر ندامت اور غمگین ہونے کا تعلق ہے تو یہ بھی واجب ہے اور یہ توبہ کی روح ہے اور اس سے تلافی مکمل ہوتی ہے تو یہ کس طرح واجب نہ ہو گی بلکہ وہ تو ایک قسم کی تکلیف ہے جو لامحالہ حاصل ہوتی ہے لیکن ایسا اس وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں ضائع ہونے والی عمر سے جو نقصان ہوا اس کی پہچان حاصل ہو جائے۔

سوال:

دل کی تکلیف تو لازمی بات ہے جو آدمی کے اختیار میں نہیں ہے تو اسے واجب کیسے کہا جا سکتا ہے۔

جواب:

اس کا سبب محبوب کے فوت ہونے کا حقیقتاً علم ہونا ہے اور اس کے سبب تک پہنچنے کا بھی ایک راستہ ہے اور اسی قسم کے مفہوم کے تحت علم، وجوب میں داخل ہے یہ مطلب نہیں کہ آدمی خود ذاتی طور پر علم کو پیدا کرتا ہے یہ محال ہے بلکہ علم، ندامت، فعل، ارادہ قدرت اور قادر سب کچھ اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے اور اس کے فعل سے ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔ اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا فرمایا۔ (۱)

ارباب بصیرت کے نزدیک یہی بات حق ہے اور اس کے علاوہ گمراہی ہے

سوال:

کیا بندے کو کام کرنے یا چھوڑنے کا اختیار نہیں ہے۔

جواب:

ہاں ہے لیکن یہ ہمارے قول کے خلاف نہیں ہے کہ ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا بلکہ اختیار بھی تو اللہ تعالیٰ کا پیدا

---

(۱) قرآن مجید، سورہ الصافات آیت ۹۶

کردہ ہے اور بندہ اس اختیار میں بھی مجبور ہے اللہ تعالیٰ جب صحیح ہاتھ پیدا کرتا ہے اور اس نے لذیذ کھانا بھی پیدا کیا معدے میں کھانے کا شوق بھی پیدا فرمایا اور دل میں یہ علم پیدا کیا کہ یہ کھانا خواہش کو پورا کر دیتا ہے اور یہ تردد بھی پیدا کیا کہ خواہش کے پورا ہونے کے بعد کیا یہ کھانا مضر ہوگا اور کیا کوئی ایسی رکاوٹ ہے جس کی وجہ سے کھانا نہ کھا سکے پھر علم پیدا کیا کہ کوئی رکاوٹ نہیں ہے پھر ان اسباب کے جمع ہونے پر کھانے کا ارادہ پکا ہو جاتا ہے تو متعارض خیالات کے بعد ارادے کے پکا ہونے اور کھانے کی خواہش پیدا ہونے کے بعد ارادے کی پختگی کو اختیار کہا جاتا ہے اور جب اسباب مکمل ہو جاتے ہیں تو اختیار کا حصول ضروری ہوتا ہے پس جب اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے ارادہ پختہ ہو جاتا ہے تو صحیح اور تندرست ہاتھ لازماً کھانے کی طرف بڑھتا ہے کیوں کہ ارادے اور قدرت کے پورا ہونے کے بعد فعل کا حصول ضروری ہوتا ہے پس حرکت پیدا ہوتی ہے اور یہ حرکت قدرت اور ارادے کی پختگی کے بعد اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے وجود میں آتی ہے

اور یہ دونوں باتیں بھی اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے پیدا ہوتی ہیں اور ارادے کی پختگی بھی خواہش اور رکاوٹ نہ ہونے کے علم کے بعد ہوتی ہے اور یہ دونوں باتیں بھی تخلیق خداوندی سے ہیں لیکن ان مخلوقات میں ایک ترتیب ہے جو تخلیق خداوندی سے متعلق اس کی عادت مبارکہ کے مطابق ہے اور اللہ تعالیٰ کے طریقے اور عادت مبارکہ میں تم ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ ہاتھ میں لکھنے کے لیے حرکت اس وقت تک پیدا نہیں کرتا جب تک اس (ہاتھ) میں صفت قدرت نہ ہو اور جب تک وہ اس میں حیات پیدا نہ کرے نیز جب تک پختہ ارادہ پیدا نہ فرمائے اور مضبوط ارادے کو اس وقت پیدا کرتا ہے جب خواہش اور میلانِ نفس پیدا فرمایا ہے۔ اور یہ میلان مکمل طور پر اس وقت تک نہیں اٹھتا جب تک اس بات کا علم پیدا نہ کرے کہ یہ نفس کے موافق ہے چاہے فی الحال ہو یا مستقبل میں۔ اور علم کو بھی دوسرے اسباب سے پیدا کرتا ہے جو حرکت، ارادے اور علم کی طرف لوٹتے ہیں۔ تو علم اور طبعی میلان ہمیشہ پختہ ارادے کے پیچھے چلتا ہے اور قدرت و ارادہ ہمیشہ حرکت کی اتباع کرتا ہے۔ تو ہر فعل میں اسی طرح ترتیب ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے ہے لیکن بعض مخلوقات دوسری بعض کے لیے شرط قرار پائی ہیں۔

اسی لیے بعض کو مقدم اور بعض کو مؤخر کرنا واجب ہے جیسے ارادہ علم کے بعد، علم حیات کے بعد اور حیات جسم کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے تو زندگی کے پیدا ہونے کے لیے جسم کی تخلیق شرط ہے یہ نہیں کہ زندگی جسم سے پیدا ہوتی ہے اور حیات کا پیدا ہونا علم کی تخلیق کے لیے شرط ہے یہ مطلب نہیں کہ علم، حیات سے پیدا ہوتا ہے لیکن محل قبولِ علم کے لیے اسی وقت تیار ہوتا ہے جب اس میں حیات ہو اور علم کا پیدا ہونا ارادے کی پختگی کے لیے شرط ہے یہ نہیں کہ علم ارادے کو پیدا کرتا ہے لیکن ارادے کو وہی جسم قبولِ علم کے لیے اسی وقت تیار ہوتا ہے جب اس میں حیات ہو اور علم کا پیدا ہونا ارادے کی پختگی کے لیے شرط ہے یہ نہیں کہ علم ارادے کو پیدا کرتا ہے لیکن ارادے کو وہی جسم قبول کرتا ہے جو زندہ (اور) عالم ہو اور وجود میں وہی چیز داخل ہوتی ہے جو ممکن ہو اور امکان

کے لیے ترتیب ہے جو تغیر کو قبول نہیں کرتی کیوں کہ اس کے لیے تبدیلی محال ہے پس جب وصف کی شرط پائی جاتی ہے تو محل اس وصف کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے پس یہ وصف استعداد کے حاصل ہونے پر اللہ تعالیٰ کے جود و کرم اور ازلی قدرت کے تحت حاصل ہوتا ہے۔

اور جب شروط کے سبب سے استعداد میں ترتیب ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے فعل سے حوادث کا حصول بھی ترتیب سے ہوتا ہے اور بندہ ان مرتب حوادث کا محل ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قضا میں پل جھپکنے میں مرتب ہو جاتا ہے اور یہ ایسی ترتیب کلی ہے جس میں تغیر نہیں اور تفصیل کے ساتھ ان کا ظہور ایسے انداز سے کے ساتھ مقرر ہے جس سے آگے نہیں بڑھتا ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ۔ (۱) بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک انداز ے کے ساتھ پیدا کیا۔

اور قضائے کلی کو اس آیت میں بیان فرمایا۔

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ۔ (۲) اور ہمارا امر تو ایک ہی ہے (اور وہ) پلک جھپکنے کی طرح ہے۔

بندے اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کے جاری ہونے کے لیے مسخر ہیں اور قدر میں سے ایک قدر کاتب کے ہاتھ میں حرکت کو پیدا کرنا بھی ہے اور یہ حرکت اس مخصوص صفت کی تخلیق کے بعد ہوتی ہے جو اس کاتب کے ہاتھ میں ہے اور اسے قدرت کہا جاتا ہے اور اس مضبوط توجہ کی تخلیق کے بعد ہے جو اس کاتب کے نفس میں ہے اور وہ قصد ہے اسی طرح یہ حرکت اس چیز کے علم کے بعد ہوتی ہے جس کی طرف میلان ہوتا ہے اسے ادراک اور معرفت کہتے ہیں۔

جب ملکوت کے باطن سے یہ چار باتیں مسخر بندے کے جسم پر ظاہر ہوتی ہیں تو ظاہری دنیا والے جن کو غیب کا علم نہیں ہے کہتے ہیں اسے فلاں شخص! تم نے حرکت کی تم نے کنکری پھینکی، تم نے لکھا لیکن پردۂ غیب سے آواز آتی ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (۳) اور آپ نے (کنکریاں) نہیں پھینکیں جب آپ نے پھینکیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکیں۔

اور تم نے قتل نہیں کیا جب تم نے قتل کیا

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ۔ (۴) تم ان سے لڑو اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے ہاتھوں عذاب دے گا

---

(۱) قرآن مجید سورۃ القمر آیت ۴۹

(۲) قرآن مجید سورۃ القمر آیت ۵۰

(۳) قرآن مجید سورۃ انفال آیت ۱۷

(۴) قرآن مجید سورۃ توبہ آیت ۱۴

یہاں آکر ان لوگوں کی عقلیں حیران ہو جاتی ہیں جو ظاہری عالم سے وابستہ ہیں اب بعض کہتے ہیں بندہ محض مجبور ہے کوئی کہتا ہے کہ وہ خود اپنے افعال کا خالق ہے کچھ اعتدال پر ہیں وہ کہتے ہیں بندہ اپنے افعال کا کاسب ہے۔ اگر ان کے لیے آسمانوں کے دروازے کھولے جائیں اور وہ عالم غیب اور عالم ملکوت کو دیکھیں تو ان کے لیے ظاہر ہو جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک من وجہ سچ کہتا ہے اور سب کے سب قصوروار بھی ہیں کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی اس بات کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکا اور نہ اس کے علم نے اس کے کناروں کو گھیرا ہے، اور پورا علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جب عالم غیب کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے نور کی چمک پڑے اور اللہ تعالیٰ غیب اور ظاہر کو جانتا ہے وہ اپنے غیب کو سوائے اپنے پسندیدہ رسولوں کے کسی پر ظاہر نہیں کرتا اور ظاہر پر تو ان لوگوں کو بھی مطلع کرتا ہے جو اس کے پسندیدہ نہ ہوں۔

اور جو شخص سلسلہ اسباب اور مسببات کو حرکت دے اور ان کے تسلسل اور مسبب الاسباب کے ساتھ ربط کی وجہ معلوم کر لے تو اس پر تقدیر کا راز منکشف ہو جاتا ہے اور اسے اس بات کا یقینی علم حاصل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی خالق اور مُوجد نہیں ہے۔

سوال:

آپ نے فرمایا کہ انسان کو مجبورِ محض سمجھنے والے بندے کو اپنے افعال کا خالق ماننے والے اور محض کاسب ماننے والے سب من وجہ سچے ہیں اور اس سچائی کے باوجود ان میں کوتاہی پائی جاتی ہے تو یہ تناقض ہے اس بات کو کس طرح سمجھا جائے کیا کسی مثال کے ذریعے اس بات کو سمجھا جا سکتا ہے۔

جواب:

نابینا لوگوں کی ایک جماعت نے سنا کہ فلاں شہر میں ایک عجیب حیوان لایا گیا ہے جسے ہاتھی کہتے ہیں اور انہوں نے کبھی بھی اس کی صورت نہیں دیکھی تھی اور نہ اس کا نام سنا تھا کہنے لگے ہمیں چاہیے ہم اسے دیکھیں اور جس قدر ہو سکے ہاتھ لگا کر اس کی پہچان حاصل کریں چنانچہ انہوں نے اسے تلاش کیا اور جب اس تک پہنچے تو اسے ہاتھوں سے چھوا کسی نابینے کا ہاتھ اس کے پاؤں پر پڑا کسی کا اس کے ہونٹ پر اور کسی کا ہاتھ اس کے کان پر پڑا ان سب نے کہا ہم نے ہاتھی کی پہچان حاصل کر لی ہے جب واپس آئے تو کچھ دوسرے اندھوں نے ان سے سوال کیا تو ان کے جواب مختلف تھے جس نے اس کے پاؤں کو چھوا تھا اس نے کہا وہ تو ایک کھردرے ستون کی طرح ہے البتہ یہ اس سے نرم ہے جس نے اس کے ہونٹ کو ہاتھ لگایا تھا اس نے کہا جس طرح تم کہتے ہو اس طرح نہیں بلکہ وہ سخت ہے اس میں ذرا بھی نرمی نہیں ہے اور چکنا ہے کھردرا نہیں وہ ستون کی طرح موٹا بالکل نہیں ہے بلکہ مرچ مصالحہ کوٹنے والے ڈنڈے کی طرح ہے جس نے اس کے کان کو پکڑا تھا اس نے کہا وہ نرم اور کھردرا ہے تو انہوں نے بعض باتوں میں ایک دوسرے کی تصدیق کی لیکن کہا کہ وہ ڈنڈے کی طرح نہیں ہوتا اور نہ ستون کی طرح ہے بلکہ وہ ایک چوڑا اور موٹا چمڑا ہے تو ان میں سے ہر ایک نے من وجہ تصدیق کی کیوں کہ ان میں سے ہر ایک نے ہاتھی

کی جس قدر پہچان حاصل کی اس کی خبر دی سب نے ہاتھی کے وصف کی خبر دی لیکن مجموعی طور پر وہ ہاتھی کی صورت کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔

تو اس مثال کو سامنے رکھیے اور اس پر قیاس کیجیے کیوں کہ اکثر اختلافات کی مثال یہی ہے چونکہ یہ کلام علوم مکاشفہ سے مل جاتا ہے اور اس کی موجوں کو حرکت دیتا ہے اور یہ ہماری غرض نہیں ہے لہٰذا ہم اپنے مقصد کی طرف لوٹتے ہیں وہ یہ کہ توبہ اپنے تینوں اجزاء کے ساتھ واجب ہے وہ اجزاء علم، ندامت اور ترکِ گناہ ہے ندامت وجوب میں اس لیے داخل ہے کہ وہ ان افعال الٰہیہ میں داخل ہے جو بندے کے علم اور اس کے ارادے اور قدرت کے درمیان ہے اور جس چیز کا یہ وصف ہو اس کو وجوب کا اسم شامل ہوتا ہے۔

تیسری فصل:

توبہ فوراً واجب ہے

توبہ کے فوری واجب ہونے میں کسی کو شک نہیں کیوں کہ اس بات کی پہچان حاصل کرنا کہ گناہ ہلاکت میں ڈالتے ہیں نفس ایمان سے ہے اور وہ فوری طور پر واجب ہے اور اس وجوب سے عہدہ برآ وہی شخص ہو گا جو اس (توبہ) کو اس طرح جانے کہ یہ فعل مکروہ سے روکنے والا ہے یہ معرفت ان علوم مکاشفہ میں سے نہیں ہے جو عمل سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ یہ علوم معاملہ میں سے ہے اور ہر وہ علم جس سے مراد یہ ہو کہ وہ عمل کا باعث بنے اس سے عہدہ برآ اس صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ عمل کا باعث بنے تو گناہوں کے نقصان دہ ہونے کا علم اس لیے مقصود ہوتا ہے کہ وہ ترکِ گناہ کا باعث بنے اور جو شخص اسے نہیں چھوڑتا وہ ایمان کے اس جزء سے محروم ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے آپ نے فرمایا۔

لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ (۱) مومن جب زنا کرتا ہے تو وہ زنا کرتے وقت مومن نہیں ہوتا۔

اس سے آپ کی مراد ایمان کی نفی نہیں ہے جو علوم مکاشفہ کی طرف لوٹتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ، اس کی وحدانیت، اس کی صفات اس کی کتب اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا۔ کیوں کہ زنا اور گناہ ایمان کی نفی نہیں کرتے بلکہ آپ کی مراد یہ کہ زنا اللہ تعالیٰ سے دُور کرنے والا اور اس کی ناراضگی کا موجب ہے جیسے ایک ڈاکٹر کہتا ہے یہ زہر ہے اس کو نہ کھانا اور جب وہ شخص کھاتا ہے تو کہا جاتا ہے اس نے ڈاکٹر کی بات نہیں مانی اس لیے کھایا ہے یہ مطلب نہیں کہ وہ ڈاکٹر کے موجود ہونے اور اس کے ڈاکٹر ہونے کو نہیں مانتا اور اس کی تصدیق نہیں کرتا بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اس کی بات کی تصدیق نہیں کرتا کہ یہ زہر ہے جو ہلاکت میں ڈالتا ہے کیوں کہ جو آدمی زہر کو مہلک جانتا ہے وہ اسے بالکل نہیں کھاتا۔ تو گناہ گار آدمی لازماً ناقص الایمان ہے

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۲۹۱، ابواب الفتن

اور ایمان کا ایک دروازہ نہیں بلکہ وہ ستر سے کچھ اوپر ہیں سب سے اعلیٰ دروازہ شہادت ہے اور سب سے ادنیٰ دروازہ راستے سے اذیت پہنچانے والی چیزوں کو دور کرنا ہے۔

اس کی مثال کسی شخص کا یہ قول ہے کہ ایک ہی طرح کے انسان موجود نہیں ہیں بلکہ وہ ستر سے کچھ اوپر قسم کے ہیں سب سے اعلیٰ قلب اور روح ہے اور سب سے ادنیٰ ظاہری جسم سے خرابی کو دُور کرنا ہے کہ اس کی مونچھیں کٹی ہوئی ہوں اور ناخن بھی کٹے ہوئے ہیں چہرے کو گندگی سے پاک رکھے تاکہ جانوروں سے ممتاز ہو جو کھلے پھرتے ہیں اور گوبر سے آلودہ ہوتے ہیں ان کے ناخنوں اور کھروں کے بڑا ہونے کی وجہ سے ان کی صورتیں پسندیدہ نہیں ہوتیں۔

یہ مثال مناسب ہے اور مطابق ہے پس ایمان ،انسان کی طرح ہے اور اس میں توحید کی شہادت کا نہ ہونا اسے کلی طور پر باطل کر دیتا ہے جیسے انسان میں رُوح کا نہ ہونا اس کے معدوم ہونے کی دلیل ہے۔

اور جس کے پاس صرف توحید و رسالت کی شہادت ہو وہ اس انسان کی طرح ہے جس کے اعضاء کٹے ہوئے ہوں اور آنکھیں پھوڑی گئی ہوں وہ تمام ظاہری اور باطنی اعضاء سے محروم ہے البتہ روح سے محروم نہیں اور جس طرح اس قسم کی حالت والا آدمی مرنے کے قریب ہوتا ہے کہ اس کی ضعیف رُوح تنہا رہ گئی ہے اور وہ ان اعضاء سے الگ ہو گئی جو اسے مدد اور تقویت پہنچاتے ہیں اور وہ کسی بھی وقت اس سے جدا ہو سکتی ہے اسی طرح اس شخص کا حال ہے جس کے پاس صرف ایمان ہے اور وہ اعمال میں کوتاہی کرتا ہے قریب ہے کہ اس کے ایمان کا درخت جڑ سے اکھڑ جائے جب ذرا سی بھی تیز ہوا آئے۔

یعنی جب ملک الموت آتا ہے تو اس وقت ایمان ہل جاتا ہے تو ہر وہ ایمان جس کی اصل یقین میں ثابت نہ ہو اور اعمال میں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی نہ ہوں وہ اس وقت قائم نہیں رہتا جب موت کے فرشتے کا ظہور ہوتا ہے اور ہولناک منظر کی تند و تیز ہوا چلتی ہے اسے اس وقت برے خاتمے کا ڈر ہوتا ہے وہ ایمان جسے عبادات کا پانی ہر وقت پلایا جاتا ہے وہ مضبوط اور راسخ ہو جاتا ہے۔

کسی گناہ گار کا کسی عبادت گار سے کہنا کہ میں بھی تمہاری طرح مومن ہوں ایسا ہی ہے جیسے کدو کے درخت نے صنوبر کے درخت سے کہا کہ میں بھی درخت ہوں اور تو بھی درخت ہے اور صنوبر کے درخت نے کیا ہی اچھا جواب دیا اس نے کہا عنقریب جب خزاں کی ہوا چلے گی تو تجھے نام کی شرکت کی وجہ سے پیدا ہونے والے دھوکے کا پتہ چل جائے گا۔ اس وقت تیری جڑیں اکھڑ جائیں گی اور تیرے پتے بکھر جائیں گے اور تجھے جو نام کی شرکت کی وجہ سے دھوکہ ہوا ہے وہ واضح ہو جائے گا تو نے سمجھا کہ تو بھی درخت ہے اور میں بھی درخت ہوں لیکن تو ان اسباب سے غافل ہے جو درخت کو قائم رکھتے ہیں۔

وَسَوْفَ تَرٰى اِذَا انْجَلَى الْغُبَارُ اَفَرَسٌ تَحْتَكَ اَمْ حِمَارٌ۔

عنقریب جب گرد و غبار چھٹ جائے گا تو تُو دیکھ لے گا کہ گھوڑے پر سوار ہے یا گدھے پر۔

اور یہ بات خاتمے کے وقت ظاہر ہو گی یہی وجہ ہے کہ موت کے گھائل کرنے والے آثار سے عارفین کی رگِ جان کٹ

جاتی ہے کیوں کہ اس وقت بہت سے لوگ ثابت قدم رہتے ہیں پس گناہ گار آدمی جب اس بات سے نہیں ڈرتا کہ وہ اپنے گناہ کی وجہ سے ہمیشہ جہنم میں رہے گا جیسے ایک تندرست آدمی جب نقصان دہ خواہشات کی تکمیل میں رہتا ہے اور وہ اپنی صحت کی وجہ سے موت کا خوف نہیں رکھتا اور موت عام طور پر اچانک نہیں آتی پس اس سے کہا جاتا ہے کہ تندرست آدمی کو بیماری کا خوف ہوتا ہے پھر جب وہ بیمار ہوتا ہے تو موت کا ڈر ہوتا ہے اسی طرح گناہ گار کو برے خاتمے کا خوف ہوتا ہے (اللہ تعالیٰ سب کو بچائے) تو ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا ہوگا۔

تو گناہ ایمان کے لیے اس طرح (نقصان دہ ہیں) جیسے مضر صحت کھانے جسم کو نقصان پہنچاتے ہیں وہ معدے میں جمع ہوتے رہتے ہیں حتیٰ کہ اخلاط (صفرا بلغم وغیرہ) کے مزاج کو بدل دیتے ہیں اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ یہاں تک کہ مزاج بگڑ جاتا ہے اور اچانک بیمار ہو جاتا ہے اور پھر اچانک مر جاتا ہے تو گناہوں کا معاملہ بھی یہی ہے

تو یہ نتیجہ یہ ہوا کہ جب اس فانی دنیا میں ہلاکت کے خوف سے وہ زہر سے بچتا ہے اور ان کھانوں سے فوری طور پر بھی اور ہر حال میں بچتا ہے جو نقصان دہ ہوتے ہیں تو ابدی ہلاکت سے ڈرنے والے پر بدرجہ اولیٰ گناہوں سے اجتناب واجب ہے اور جب زہر کھانے والے پر واجب ہے کہ جوں ہی نادم ہو توبہ کرے اور اس کے کھانے سے رجوع کرے اور اسے معدے سے نکال دے اور یہ عمل فوری طور پر کرے تاکہ اس کا جسم ہلاکت سے بچ جائے حالاں کہ اس کا نقصان صرف دنیوی ہے اور دین کے معاملے میں زہر کھانا جو گناہوں کی صورت میں ہے بدرجہ اولیٰ نقصان دہ ہے تو اسے اس سے رجوع کرنا چاہیے اور جس قدر ممکن ہو تدارک کرے جب تک اس کے لیے مہلت ہے اور وہ اس کی زندگی ہے کیوں کہ جس کو اس زہر کا خوف اس لیے ہے کہ باقی رہنے والی آخرت سے محروم ہو جائے گا جس میں ہمیشہ کی نعمتیں اور بہت بڑی سلطنت ہے اور اس کے فوت ہونے سے جہنم کی آگ اور ہمیشہ کے عذاب کا سامنا ہوگا اور دنیوی زندگی اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کیوں کہ اس کی کوئی انتہا نہیں پس توبہ کی جلدی کرنا ضروری ہے اس سے پہلے کہ گناہوں کا زہر روحِ ایمان پر اثر انداز ہو اور یہ ایسا اثر ہوگا جس کا ڈاکٹروں کے پاس بھی کوئی علاج نہیں اور نہ ہی اس کے بعد کوئی پرہیز اثر کرے گی اس کے بعد نصیحت کرنے والوں کی نصیحت اور واعظین کا وعظ بھی فائدہ نہیں دے گا اس پر یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ وہ ہلاک ہونے والوں میں سے ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ گرامی کے عموم میں داخل ہے

ارشاد خداوندی ہے:

إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُقْمَحُونَ ۝ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ۝ وَسَوَاءٌ

ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیئے پس وہ ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں اور ہم نے ان کے سامنے ایک دیوار بنا دی اور ان کے پیچھے بھی ایک دیوار، تو ہم نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا پس وہ دیکھ نہیں سکتے

عَلَيْهِمْ ءَ أَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ (۱)

اور ان کے لیے برابر ہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لاتے۔

تمہیں لفظ ایمان دھوکہ نہ دے کہ تم کہو اس آیت سے کافر مراد ہے کیونکہ تمہارے لیے بیان کیا گیا کہ ایمان کے ستر سے زائد دروازے ہیں اور زانی جب زنا کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ حالت ایمان میں زنا نہیں کرتا تو جو شخص ایسے ایمان سے پردے میں ہو جس کی شاخیں اور فروع ہیں تو وہ عنقریب خاتمے کے وقت اصل ایمان سے بھی پردے میں ہو گا جیسے وہ شخص جس کے اعضاء نہ ہوں حالانکہ وہ روح کے اطراف اور فروع ہیں تو عنقریب وہ موت کی طرف جائے گا جو روح کو ختم کر دیتی ہے جو اصل ہے تو فرع کے بغیر اصل باقی نہیں رہتی اور اصل کے بغیر فرع کا وجود نہیں ہوتا اصل اور فرع میں صرف ایک بات کا فرق ہے وہ یہ کہ فرع کا وجود اور اس کا بقا دونوں وجودِ اصل کو چاہتے ہیں لیکن اصل کا وجود فرع کے وجود کو نہیں چاہتا تو اصل کا باقی رہنا فرع کے ساتھ ہے اور فرع کا وجود اصل پر موقوف ہوتا ہے تو علوم مکاشفہ اور علوم معاملہ ایک دوسرے کو لازم ہیں جس طرح فرع اور اصل لازم و ملزوم ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہو سکتے اگرچہ ایک اصل کے رتبہ میں ہے اور دوسرا فرع کے مرتبہ میں۔

اور علوم معاملہ اگر عمل کی ترغیب نہ دیں تو ان کا معدوم ہونا ان کے وجود سے بہتر ہے کیونکہ اگر وہ اپنے مقصود کے مطابق عمل نہ کریں تو وہ اس شخص کے خلاف ہوں گے جو ان علوم سے موصوف ہے یہی وجہ ہے کہ جاہل بدکار کے مقابلے میں عالم بدکار کا عذاب زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے علم کے بیان میں احادیث نقل کی ہیں۔

چوتھی فصل:

ہر شخص پر اور ہر حال میں توبہ واجب ہے

قرآن پاک کی واضح آیت توبہ کے وجوب پر دلالت کرتی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (۲)

اور اے مومنو! تم سب اللہ تعالیٰ کے ہاں توبہ کرو تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔

اس میں عام خطاب ہے اس کے علاوہ نورِ بصیرت بھی راہنمائی کرتا ہے کیوں کہ توبہ کا معنی اس راستہ سے واپس لوٹنا ہے

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ یسین آیت ۸، ۹، ۱۰

(۲) قرآن مجید، سورۂ نور آیت ۳۱

جو اللہ تعالیٰ سے دور اور شیطان کے قریب کرتا ہے اور یہ بات اسی شخص سے متصور ہوتی ہے جو عاقل ہو اور اصل عقل کا کمال اس وقت ہو سکتا ہے جب خواہشات غضب اور تمام مذموم صفات جو انسان کی گمراہی کے لیے شیطان کے جال ہیں، کامل ہوں کیوں کہ چالیس سال کی عمر میں عقل کامل ہوتی ہے اور اس کی اصل اس وقت کامل ہوتی ہے جب بلوغت کی علامات ظاہر ہوتی ہیں اور اس کی علامات سات سال کے بعد ظاہر ہو جاتی ہیں اور خواہشات شیطان کا لشکر ہیں جب کہ عقل فرشتوں کے لشکر ہیں اور جب وہ دونوں جمع ہوں تو لازماً ان کے درمیان لڑائی ہوتی ہے کیونکہ ایک دوسرے کی ضد ہونے کی وجہ سے دونوں اکٹھی نہیں ہو سکتیں جس طرح رات اور دن نیز روشنی اور اندھیرا جمع نہیں ہو سکتے اور جب ان میں سے ایک غالب ہو تو وہ دوسرے کو نکال پھینکتا ہے اور جب خواہشات بچپن اور جوانی میں عقل کے کامل ہونے سے پہلے ہی کامل ہو جاتی ہیں تو شیطانی لشکر سبقت لے جاتا ہے اور وہ دل پر قبضہ کر لیتا ہے اور اسے خواہشات سے اُنس اور اُلفت ہو جاتی ہے کیونکہ عادتاً شہوت کا یہی تقاضا ہوتا ہے اب خواہشات دل پر غالب آتی ہیں اور ان سے نکلنا دشوار ہوتا ہے پھر عقل جو اللہ تعالیٰ کی جماعت اور اس کا لشکر ہے، چمکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو آہستہ آہستہ اس کے دشمنوں سے بچاتی ہے اور اگر وہ مضبوط اور کامل نہ ہو تو دل کا میدان شیطان کے قبضے میں رہتا ہے اور وہ لعنتی اپنا وعدہ پورا کرتا ہے جس کے بارے میں قرآن پاک میں اس طرح مذکور ہے۔

لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا۔

میں اس (آدم علیہ السلام) کی اولاد پر ضرور غالب آؤں گا البتہ چند ایک (بچ جائیں گے) (۱)

اور اگر عقل کامل اور قوی ہو تو پہلے مرحلے میں وہ خواہشات کو توڑ کر شیطانی لشکر کا قلع قمع کرتی ہے اور بری عادات کو ختم کرتی ہے اور زبردستی طبیعت کو عبادت کی طرف لوٹاتی ہے اور توبہ کا یہی معنیٰ ہے اور وہ اس راستے سے لوٹتا ہے جس پر خواہش راہبر اور شیطان گڑھا کھودنے والا ہو اب وہ اسے اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلاتی ہے اور ہر شخص کی خواہش عقل پر سبقت رکھتی ہے اور اس کی وہ فطرت جو شیطان کا آلہ ہے اس طبیعت پر مقدم ہوتی ہے جو فرشتوں کا سامان ہے تو جو کام خواہش کے مطابق کئے ہوں ان سے رجوع کرنا ہر انسان کے لیے ضروری ہے وہ نبی ہو یا کوئی غیر عاقل، لہٰذا یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ توبہ کی یہ ضرورت حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ خاص ہے اور کہا گیا ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ هِنْدًا لَهَا الْغَدْرُ وَحْدَهَا — یہ خیال نہ کرو کہ صرف ہند (عورت) ہی دھوکہ باز ہے ہر
سَجِيَّةُ نَفْسٍ كُلِّ غَانِيَةٍ هِنْدُ۔ — خوبصورت عورت کی طبیعت ہند کی طرح ہے۔

بلکہ یہ حکم ازلی ہے جو انسانی جنس پر لکھ دیا گیا اس کے خلاف فرض نہیں کیا جا سکتا جب تک سنت الٰہیہ نہ بدلے اور اس

(۱) قرآن مجید سورۃ اسراء آیت ۶۲

میں تبدیلی کی توقع نہیں لہذا جو شخص کفر اور جہالت کے ساتھ بالغ ہوا اس پر واجب ہے کہ اپنے کفر اور جہالت سے توبہ کرے اور اگر وہ اپنے والدین کے تابع ہونے کی وجہ سے مسلمان بالغ ہو لیکن اسلام کی حقیقت سے غافل ہو تو اس پر اپنی غفلت سے توبہ واجب ہے یعنی اسلام کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ جب تک خود ایمان نہ لائے ماں باپ کا ایمان اسے کافی نہیں ہے اور اگر اسے اسلام کی سمجھ ہے تو اس مطلق العنانی سے توبہ کرے جو خواہشات کی محبت والفت میں عادت بن گئی اور روکنے، اجازت دینے، وغیرہ میں اللہ تعالیٰ کی حدود کی رعایت کرے اور یہ توبہ کے ابواب میں سے سب سے زیادہ سخت دروازہ ہے اکثر لوگ اس میں ہلاک ہوئے کیوں کہ وہ اس سے عاجز رہے اور یہ سب کچھ توبہ اور رجوع ہے۔

تو یہ اس بات پر دلالت ہے کہ توبہ ہر شخص کے حق میں فرض عین ہے کسی انسان کا اس سے بے نیاز ہونا تصور نہیں کیا جا سکتا جس طرح حضرت آدم علیہ السلام اس سے بے نیاز نہیں ہوئے تو باپ کی خلقت میں جس چیز کی گنجائش نہیں تھی اولاد کی خلقت میں اس کی گنجائش کہاں؟

جہاں تک اس کے دائمی اور ہر حال میں واجب ہونے کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی انسان اعضاء کے گناہوں سے خالی نہیں ہے کیوں کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے بھی لغزش واقع ہوئی جیسے قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں انبیاء کرام علیہم السلام کی لغزشوں اور ان پر ان کے رونے کا ذکر ہے۔

اور اگر آدمی کسی وقت اعضاء سے گناہ کا مرتکب نہ بھی ہو تو بھی وہ دل کے ساتھ گناہوں کے ارادے سے خالی نہیں ہوتا اور بعض حالات میں ارادے سے بھی خالی ہو تو اللہ تعالیٰ، اس کی صفات اور افعال کے علم سے غفلت ضرور ہوتی ہے اور یہ سب کچھ نقص ہے اور اس کے کئی اسباب ہیں اور کسی چیز کی ضد میں مشغول ہو کر اس چیز کے اسباب کو چھوڑنا اس راستے سے دوسرے راستے کی طرف رجوع ہے اور توبہ سے مراد بھی رجوع ہے پس انسان کے حق میں اس کوتاہی سے خالی ہونے کا تصور نہیں ہو سکتا البتہ مقدار میں فرق ہے اصل ہر ایک میں ضروری ہے۔

اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

وَاِنَّهُ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِىْ حَتّٰى اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِى الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً۔ (۱)

بے شک میرے دل پر کچھ پردہ آجاتا ہے یہاں تک میں ایک دن رات میں ستر بار سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگتا ہوں۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بزرگی عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ

تاکہ اللہ تعالیٰ آپ سے (ہجرت سے) پہلے کے الزام بھی

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۴۶ کتاب الذکر

وَمَاتَاَخَّرَ۔ دور کردے اور (ہجرت کے) بعد کے الزام بھی (دور فرمادے) (۱)

جب آپ کا یہ حال ہے تو دوسروں کا کیا حال ہوگا (حالانکہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم گناہوں سے معصوم ہیں تعلیم امت اور مزید درجات کے حصول کے لیے آپ استغفار فرماتے تھے ۱۲ ہزاروی)

سوال :

دل پر جو غم یا خیالات آتے ہیں وہ نقصان ہے اور کمال اس سے خالی رہنے میں ہے اور جلال خداوندی کی گہرائی کی معرفت میں کمی بھی نقص ہے اور جوں جوں معرفت بڑھتی ہے کمال بھی زیادہ ہوتا ہے اور نقصان کے اسباب سے کمال کی طرف انتقال رجوع ہے اور رجوع کا دوسرا نام توبہ ہے لیکن یہ فضائل ہیں فرائض نہیں ہیں حالانکہ ہر حال میں توبہ کے وجوب کا قول کیا گیا ہے جب کہ ان امور سے توبہ واجب نہیں ہے کیوں کہ کمال کا حصول شرعی طور پر واجب نہیں ہے تو آپ کے اس قول سے کیا مراد ہے کہ ہر حال میں توبہ واجب ہے۔

جواب :

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ انسان اپنی ابتدائے خلقت میں خواہشات کی اتباع سے خالی نہیں ہے اور توبہ کا معنیٰ صرف خواہشات کو چھوڑنا ہی نہیں بلکہ گذشتہ گناہوں کے تدارک سے توبہ کی تکمیل ہوتی ہے اور ہر وہ خواہش جس کے پیچھے انسان چلتا ہے اس سے ایک تاریکی اس کے دل کی طرف اٹھتی ہے جس طرح سانس کی بھاپ سے صاف شیشے کا منہ دھندلا جاتا ہے اور جب خواہشات کی تاریکی بڑھتی ہے تو وہ رین (زنگ) بن جاتی ہے جس طرح سانس کے بخارات جب شیشے کے منہ پر جمع ہوتے ہیں تو اسے زنگ لگ جاتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (۲) ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کے باعث زنگ چڑھ گیا ہے۔

پھر جب زنگ جمع ہو جاتا ہے تو وہ پکا ہو جاتا ہے اور اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے جس طرح شیشے کے منہ پر لگنے والا زنگ جب زیادہ ہوتا ہے اور عرصہ دراز تک رہتا ہے تو وہ اس کے اندر سرایت کر کے اس کو خراب کر دیتا ہے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ فتح آیت ۲

(۲) اس آیت کریمہ کا ترجمہ کرنے میں علماء اہل سنت سے نہایت احتیاط سے کام لیا ہے ہم نے اپنے خیال میں جو ترجمہ مناسب سمجھا اسے درج کر دیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ دیگر تراجم اہلسنت صحیح نہیں ہیں ۱۲ ہزاروی)

(۳) قرآن مجید سورۃ المطففین آیت ۱۴

اور اب اسے صیقل نہیں کیا جا سکتا ہے اور وہ اس کی طبعی میل کی طرح ہو جاتا ہے۔

توبہ میں صرف مستقبل میں گناہ چھوڑنا کافی نہیں بلکہ دل پر جو زنگ جم چکا ہے اس کو دور کرنا بھی ضروری ہے جیسا کہ شیشے میں صورتوں کے ظہور کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ آئندہ اس پر سانس اور بخارات نہیں ڈالیں گے بلکہ اس کے لیے پہلے سے چڑھا ہوا زنگ بھی دور کرنا پڑے گا اور جس طرح گناہوں اور خواہشات سے دل کی طرف ایک تاریکی اٹھتی ہے اسی طرح عبادات اور طاعات سے ایک نور پیدا ہوتا ہے اور اس نور سے گناہ کی تاریکی دور ہو جاتی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

اَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا۔ (۱) گناہ کے پیچھے نیکی لاؤ وہ اس کو مٹا دے گی۔

تو بندہ کسی حال میں بھی دل سے گناہوں کے آثار کو مٹانے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اور وہ نیکیوں کے ذریعے مٹتے ہیں جن کے آثار گناہوں کے آثار کی ضد ہیں اور یہ ایسے دل میں ہوتا ہے جو پہلے سے صاف ہو اور پھر عارضی اسباب سے تاریک ہو گیا ہو اور اگر اسے شروع سے پالش کرنا ہو تو یہ عمل بہت طویل ہے جیسے شیشے سے زنگ کو ختم کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا شروع سے اسے شیشہ بنانا مشکل ہے پس یہ نہایت طویل اعمال ہیں جو انسان سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔

جہاں تک آپ کی اس بات کا تعلق ہے کہ اسے واجب نہیں کہنا چاہیئے بلکہ یہ محض فضیلت اور طلب کمال ہے تو جان لو کہ واجب کے دو معنی ہیں ایک وہ جو شریعت کے فتویٰ میں داخل ہے اور اس میں تمام مخلوق شریک ہے اور یہ وہ مقدار ہے کہ اگر تمام مخلوق اس میں مشغول ہو جائے تو نظام عالم خراب نہیں ہوگا اور اگر تمام لوگوں کو اس بات کا پابند بنایا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈریں جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے تو وہ اسباب رزق کی تلاش چھوڑ دیں گے اور دنیا سے بالکل لاتعلق ہو جائیں گے اور اس طرح تقویٰ بالکل ہی باطل ہو جائے گا۔ کیوں کہ جب معیشت تباہ ہو جائے گی تو کوئی بھی شخص تقویٰ کے لیے فارغ نہ ہوگا بلکہ کپڑے بننے، کاشتکاری کرنے، روٹی پکانے وغیرہ میں مشغول ہوں گے اور ہر شخص جس چیز کا محتاج ہوگا وہ اس میں اپنی زندگی صرف کر دے گا۔ تو اس اعتبار سے یہ درجات واجب نہیں ہیں۔

واجب کی دوسری صورت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے قرب کے حصول اور صدیقین کے مقام محمود تک رسائی کے لیے ضروری ہے اور اس تک پہنچنے کے لیے ان تمام کاموں سے توبہ ضروری ہے جن کا ہم نے ذکر کیا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ نفلی نماز میں طہارت واجب ہے یعنی جو اس کا ارادہ کرے گا وہ طہارت کے بغیر اسے ادا نہیں کر سکتا لیکن جو آدمی نفلی نماز سے محروم رہتا ہے اور اس نقصان کو برداشت کرتا ہے تو اس پر اس نماز کے لیے طہارت واجب نہیں ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ آنکھ، کان، ہاتھ اور پاؤں انسانی وجود میں شرط ہیں یعنی اس شخص کے لیے شرط ہیں جو کامل انسان بننا چاہتا ہے جس

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۱۵۸ مرویات ابوذر

کی انسانیت نفع بخش ہو اور اس کے ذریعے وہ دنیا میں بلند مقام حاصل کرے لیکن جو شخص صرف اصل حیات پر اکتفا کرتا ہے اور وہ اس بات پر راضی ہو کر قصاب کے پھٹے پر پڑے ہوئے گوشت اور (ڈھیر) پر پڑے ہوئے چھیچھڑے کی طرح ہو تو ایسی زندگی کے لیے آنکھ، ہاتھ اور پاؤں ضروری نہیں ہیں۔

پس اصل واجبات جو عام لوگوں سے متعلق فتویٰ میں داخل ہیں ان سے صرف نجات ملتی ہے اور اصل نجات محض اصل حیات کی طرح ہے اور اس سے اوپر جو سعادتیں ہیں جن کے ساتھ زندگی کی تکمیل ہوتی ہے وہ ان اعضاء اور آلات کی طرح ہیں جن سے زندگی کی زیبائش و آرائش ہے انبیاء کرام، اولیاء عظام اور علماء دین اسی کے لیے کوشاں ہیں اور حسب مقام ان کی کوشش میں فرق ہے۔ وہ اسی کی حرص کرتے اور اسی کے گرد چکر لگاتے تھے اور اسی مقصد کے لیے انہوں نے دنیا کی کی تمام لذتوں کو ترک کر دیا تھا حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک پتھر کو تکیہ بنا کر آرام فرما ہوئے شیطان آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کیا آپ نے آخرت کے لیے دنیا چھوڑ نہیں دی تھی؟ آپ نے فرمایا ہاں میں نے چھوڑ دی تھی لیکن ہوا کیا ہے؟ اس نے کہا آپ نے دنیا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پتھر کو تکیہ بنایا ہے آپ سر زمین پر کیوں نہیں رکھتے؟۔ (یہ سن کر) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے وہ پتھر پھینک دیا اور اپنا سر مبارک زمین پر رکھ دیا آپ کا اس پتھر کو پھینکنا دنیوی لذت سے توبہ کرنا تھا تمہارا کیا خیال ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس بات کو نہیں جانتے تھے کہ زمین پر سر رکھنا عام لوگوں سے متعلق فتویٰ کے مطابق واجب نہیں ہے۔

اور کیا تم نہیں جانتے کہ جب نماز میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اس کپڑے کی وجہ سے ہٹ گئی جس پر بیل بوٹے تھے تو آپ نے اس کو اتار دیا (۱) اور آپ کے نعلین مبارک کے تسمے نے آپ کی توجہ پھیر دی تو آپ نے پرانا تسمہ لگا دیا۔ (۲)

کیا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم نہ تھا کہ آپ جو شریعت لے کر تشریف لائے ہیں اس کے مطابق یہ تمام لوگوں پر واجب نہیں ہے اور اس علم کے باوجود آپ نے رجوع کیوں کیا، کیا اس کا مقصد صرف یہی بات نہیں تھی کہ آپ نے دیکھا کہ وہ آپ کے دل مبارک پر ایسا اثر کر رہا ہے جو اس مقام محمود تک پہنچنے میں رکاوٹ ہے جس کا آپ سے وعدہ کیا گیا تھا۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دودھ نوش فرمایا پھر پتہ چلا کہ یہ جائز طریقے پر نہیں ہے تو آپ اس کو نکالنے کے لیے اپنے حلق میں انگلی ڈالی حتیٰ کہ قریب تھا آپ کی جان نکل جائے کیا آپ کو فقہ کا یہ مسئلہ معلوم نہ تھا کہ لاعلمی میں کسی چیز کے کھانے سے آدمی گناہ گار نہیں ہوتا اور فقہی فتویٰ کے مطابق اس کا نکالنا ضروری نہیں ہے تو آپ نے

---

(۱) صحیح بخاری جلد اول ص ۵۳ کتاب الصلوٰۃ

ممکن حد تک یعنی معدے کو خالی کرنے کے ذریعے اس سے توبہ کیوں کی؟ کیا اس کی وجہ وہ راز نہ تھا جو آپ کے سینے میں پنہاں تھا کہ عام لوگوں کے لیے فتویٰ الگ چیز ہے اور طریقِ آخرت کے خطرات سے صرف صدیقین ہی آگاہ ہوتے ہیں۔

تو ان لوگوں کے حالات پر غور کیجیے جو تمام مخلوق میں اللہ تعالیٰ کی پہچان سب سے زیادہ رکھتے تھے وہ اللہ تعالیٰ کے راستے، اس کی خفیہ تدابیر، اللہ تعالیٰ کی ذات کے حوالے سے دھوکے کے مقام کو اچھی طرح جانتے تھے دنیوی زندگی کے دھوکے سے ایک بار بچو اور پھر اللہ تعالیٰ پر دھوکہ کھانے سے ہزاروں مرتبہ بچو یہ وہ اسرار ہیں کہ جس شخص کو ان کی خوشبو حاصل ہو جائے وہ جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے والے سالک کے لیے ہر گھڑی توبۃ النصوح لازم ہے اگرچہ اسے حضرت نوح علیہ السلام کی عمر حاصل ہو جائے اور یہ کسی مہلت کے بغیر فی الفور واجب ہے۔

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ نے سچ فرمایا کہ اگر عقلمند آدمی اپنی زندگی میں صرف اس بات پر روئے کہ اس کی گذشتہ زندگی عبادت کے بغیر گذر گئی اور ضائع ہو گئی تب بھی اسے مرتے دم تک غمگین ہونا لائق ہے تو اس کا کیا حال ہو گا جو باقی کی طرح مستقبل میں بھی جہالت سے کام لیتا ہے۔

آپ نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ عقلمند آدمی کو جب ایک نفیس موتی ملتا ہے اور وہ کسی فائدے کے حاصل کیے بغیر ضائع ہو جاتا ہے تو وہ یقیناً اس پر روتا ہے اور اگر اس کا ضائع ہونا اس کی ہلاکت کا باعث ہو تو اس کا رونا اور زیادہ ہو گا (تو غور کیجیے) زندگی کی ہر گھڑی بلکہ ہر سانس ایک نفیس جوہر ہے جس کا کوئی بدل نہیں ہے وہ اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ تجھے ابدی سعادت تک پہنچا دے اور دائمی بدبختی سے بچائے اس لیے اس سے زیادہ نفیس جوہر کیا ہو سکتا ہے اگر تم اسے غفلت میں ضائع کر دو گے تو واضح نقصان اٹھاؤ گے۔ اور اگر اسے گناہ میں صرف کرو گے تو واضح طور پر ہلاک ہو جاؤ گے اب اگر تم اس مصیبت پر نہیں روتے تو یہ تمہاری جہالت ہے اور جہالت کی مصیبت تمام مصیبتوں سے بڑھ کر ہے لیکن جاہل کو اس بات کی پہچان نہیں ہوتی کہ یہ مصیبت ہے کیونکہ غفلت کی نیند اس کے اور معرفت کے درمیان حائل ہوتی ہے اور لوگ غفلت کی نیند سوئے ہوئے ہیں جب موت آتی ہے تو جاگ جاتے ہیں اس وقت ہر مفلس کو اپنے افلاس کا اور ہر مصیبت زدہ کو اس کی مصیبت کا علم ہوتا ہے لیکن اس وقت اس کا تدارک نہیں ہو سکتا۔

بعض عارفین فرماتے ہیں کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام جب کسی بندے کے سامنے آتے ہیں تو فرماتے ہیں تمہاری زندگی کی ایک گھڑی باقی ہے اور تو پلک جھپکنے کے برابر بھی اس سے آگے نہیں بڑھے گا اس وقت بندہ افسوس اور حسرت کا اظہار کرتا ہے کہ اگر دنیا اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ بھی اسے ملتی تو اسے حاصل نہ کرتا اور اگر اس ساعت کے ساتھ ایک اور ساعت کا اضافہ ہو اور وہ اس میں تکلیف برداشت کرکے گذشتہ کوتاہیوں کا ازالہ کر تا تو کیا ہی اچھا ہے! لیکن اس وقت مہلت کہاں! اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کا پہلا معنیٰ یہی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ۔ (۱)

اور ان کے اور ان کی خواہشات کے درمیان رکاوٹ پیدا کھڑی کر دی گئی۔

اور اس ارشاد گرامی میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے:

مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا۔ (۲)

(توبہ کرو) اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی ایک کو موت آئے تو وہ کہے اے میرے رب تو نے مجھے قریب کے وقت تک مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کرتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ کسی نفس کے وقت موت کو پیچھے نہیں کرتا جب وہ آجاتا ہے

کہا گیا کہ اجل قریب جو اس کے پیچھے لگی ہوتی ہے اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جب بندے کی نگاہوں سے پردہ اٹھتا ہے تو وہ کہتا ہے اے موت کے فرشتے! مجھے ایک دن کی مہلت دے دے میں اپنے رب کی بارگاہ میں عذر پیش کر سکوں اور توبہ کروں اور اپنے لیے اچھا توشہ لے لوں فرشتہ جواب دیتا ہے تم نے اپنی زندگی کے) دن تباہ کر دیئے اب کوئی دن نہیں مل سکتا وہ کہتا ہے مجھے ایک ساعت کی مہلت دے فرشتہ جواب دیتا ہے تم نے تمام ساعتیں ضائع کر دیں اب کوئی ساعت نہیں ہے پس اس پر توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور جان حلق تک آجاتی ہے اور اسی افسوس کی حالت میں اس کی سانس اکھڑ جاتی ہے وہ گذشتہ نقصان کی تلافی نہ کرنے پر نا امیدی اور زندگی کے ضیاع پر حسرت و ندامت کے گھونٹ پیتا ہے ان حالات کے صدمات میں اس کا اصل ایمان مضطرب ہو جاتا ہے اب جب اس کی روح نکلتی ہے تو اگر اس کی تقدیر میں اچھا لکھا تھا تو اس کی روح توحید پر نکلتی ہے اور یہی حسن خاتمہ ہے اسی سلسلے میں فرمایا گیا۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْئٰنَ۔ (۳)

اور ان لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برے کام کرتے ہیں حتیٰ کہ جب ان میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو کہتا ہے میں اب توبہ کرتا ہوں۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ

بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے جو نادانی

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ سبا آیت ۵۴

(۲) قرآن مجید، سورۂ المنافقون آیت ۱۰

(۳) قرآن مجید، سورۂ نساء آیت ۱۸

السُّوٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ (۱) میں برائی کر بیٹھتے ہیں پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں یعنی گناہ کے فوراً بعد وہ نادم ہونے کے ذریعے توبہ کرتے ہیں اور اس (گناہ) کے بعد نیکی کر کے اس (گناہ) کے اثر کو زائل کرتے ہیں اس سے پہلے کہ دل پر زنگ چڑھ جائے اس وقت وہ زائل ہونے کے قابل نہیں رہتا۔

اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا۔ (۲) برائی کے پیچھے نیکی لاؤ وہ اس (برائی) کو مٹا دے گی۔

اسی لیے حضرت لقمان رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا اے میرے بیٹے! توبہ میں تاخیر نہ کرنا کیوں کہ موت اچانک آتی ہے۔

اور جو شخص ٹال مٹول کرتے ہوئے توبہ کی طرف سبقت نہیں کرتا وہ دو عظیم خطروں کے درمیان ہوتا ہے ایک یہ کہ اس کے دل پر گناہ کی تاریکی مسلسل جمع ہوتی رہتی ہے حتیٰ کہ وہ زنگ اور مہر کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اب وہ زائل نہیں ہو سکتی دوسرا خطرہ یہ کہ ہو سکتا ہے بیماری یا موت آ جائے اب اسے گناہ کے ازالے کی مہلت نہیں ملے گی اسی لیے حدیث شریف میں آیا ہے۔

اِنَّ اَكْثَرَ صِيَاحِ اَهْلِ النَّارِ مِنَ التَّسْوِيفِ۔ جہنمیوں کی زیادہ چیخ و پکار توبہ میں ٹال مٹول کرنے کی وجہ سے ہوگی۔

اور جو بھی ہلاک ہوا وہ ٹال مٹول کرنے کی وجہ سے ہوا تو ایسے آدمی کا اپنے دل کو سیاہ کرنا نقد اور عبادت کے ذریعے اسے روشن کرنا بطور ادھار ہوتا ہے یہاں تک کہ اسے موت اٹھا لیتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حضور ایک مریض دل کے ساتھ جاتا ہے تو دل بندے کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے زندگی بھی اس کی امانت ہے بلکہ عبادت کے تمام اسباب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کے پاس امانت ہیں تو جو شخص امانت میں خیانت کرے پھر اس کا ازالہ بھی نہ کرے اس کا معاملہ خطرناک ہوتا ہے۔

بعض عارفین فرماتے ہیں کہ بندے کے پاس اللہ تعالیٰ کے دو راز ہیں جو بطور الہام اس کو بتاتا ہے ایک یہ کہ جب وہ اپنی ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندے! میں نے تجھے دنیا میں پاک اور طاہر بھیجا ہے اور تیرے پاس تیری زندگی بطور امانت رکھی ہے تو میں دیکھوں گا کہ تم کس طرح اس کی حفاظت کرتے ہو اور دوسرا یہ کہ جب اس کی روح پرواز کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے میرے بندے! تو نے میری امانت کی حفاظت کیسے کی ہے کیا میری اس ملاقات تک تو وعدہ پر قائم رہا تو میں بھی اپنا قول پورا کروں گا یا تو نے اسے ضائع کر دیا تو میں مطالبے اور عذاب کے ذریعے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ نساء آیت ۱۷

(۲) مسند امام احمد بن حنبل ۵ ص ۱۵۸ از روایت ابوذر

تجھ سے ملاقات کروں گا قرآن پاک کی اس آیت کریمہ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ۔ (۱)

تم مجھ سے کیا ہوا (اپنا) وعدہ پورا کرو میں تم سے کیا ہوا (اپنا) وعدہ پورا کروں گا۔

اور اس آیت کریمہ میں بھی اسی طرح اشارہ ہے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ (۲)

اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور وعدوں کا خیال رکھتے ہیں۔

پانچویں فصل :

شرائط توبہ کے جمع ہونے پر اس کی قبولیت یقینی ہے

جب تمہیں قبولیت کا معنیٰ معلوم ہو گیا تو اب تمہیں کسی بھی صحیح توبہ کے قبول ہونے میں شک نہیں ہونا چاہیئے جو لوگ بصیرت کے نور سے دیکھتے اور انوار قرآن سے فیضیاب ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر سلیم دل اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوتا ہے اور قیامت کے دن اسے قربِ خداوندی کا اعزاز حاصل ہوگا وہ اس قابل ہوتا ہے کہ باقی رہنے والی آنکھ سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کر سکے۔

ان لوگوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ دل اپنی اصل کے اعتبار سے صحیح سالم پیدا کیا گیا ہے اور ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور اس کی سلامتی گناہوں کی گرد و غبار چھا جانے سے زائل ہوتی ہے انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ندامت کی آگ اس غبار کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور نیکی کا نور دل کے چہرے سے گناہ کی تاریکی کو مٹا دیتا ہے اور یہ کہ نیکیوں کے نور کے سامنے گناہوں کے اندھیرے نہیں ٹھہرتے جیسے دن کی روشنی کے سامنے رات کے اندھیروں کا بس نہیں چلتا۔ بلکہ اس طرح سمجھو کہ صابن کی سفیدی کے مقابلے میں میل کی کدورت ٹھہر نہیں سکتی اور جس طرح بادشاہ میلے کپڑے کو اپنا لباس بنانا پسند نہیں کرتا اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی تاریک دل کو اپنے قرب کے لیے قبول نہیں کرتا اور جس طرح ادنیٰ کاموں میں کپڑے کا استعمال اسے میلا کر دیتا ہے اور اسے صابن اور گرم پانی سے صاف کیا جاتا ہے تو خواہشات کی تکمیل سے بھی دل میلا ہو جاتا ہے اور اسے آنسوؤں کے پانی اور ندامت کی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے جس سے وہ پاک اور صاف ہوتا ہے اور ہر پاک دل اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہوتا ہے جس طرح پاک کپڑا ہی پسندیدہ اور قبول ہوتا ہے لہٰذا تم پر طہارت اور پاکیزگی کا حصول لازم ہے جہاں

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۴۰

(۲) قرآن مجید، سورۂ مومنون آیت ۸

تک قبولیت کا تعلق ہے تو اس کے لیے ازلی حکم موجود ہے جسے رد نہیں کیا جا سکتا اور اسے فلاح کہا جاتا ہے ارشاد خداوندی ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ تحقیق اس نے کامیابی حاصل کی جس نے اسے (نفس کو) پاک کیا۔ (۱)

اور جو شخص تحقیق کی بنیاد پر آنکھ کے مشاہدہ سے زیادہ مضبوط اور روشن معرفت نہیں رکھتا کہ دل گناہوں اور عبادات سے متاثر ہوتے ہیں اور یہ تاثیر ایک دوسرے کی ضد ہوتی ہے ایک کے لیے بطور مجاز اندھیرے کا لفظ استعمال ہوتا ہے جیسے جہالت کو مجازی طور پر اندھیرا کہتے ہیں اور دوسرے کے لیے لفظ نور بولا جاتا ہے جیسے علم کو مجازی طور پر نور کہا جاتا ہے اور نور اور اندھیرے کے درمیان تضاد ضروری اور واضح ہے دونوں جمع نہیں ہو سکتے کو گویا دین سے اس کا تعلق ایسا ہے جیسے چھلکا حاصل کرے اور نام کی حد تک واسطہ ہے اور اس کا دل دین کی حقیقت سے بڑے سخت پردے میں ہے بلکہ وہ اپنے نفس کی حقیقت اور اس کی صفات سے بھی حجاب میں ہے اور جو شخص اپنے نفس سے ناواقف ہو وہ دوسروں سے بہت زیادہ لاعلم ہوتا ہے اور اس سے مراد دل ہے کیوں کہ دل کے ذریعے ہی دوسری چیزوں کا پتہ چلتا ہے تو جو شخص اپنے دل کی معرفت نہیں رکھتا اسے دوسروں کی پہچان کیسے حاصل ہو گی۔

اور جو شخص یہ وہم کرے کہ توبہ کے صحیح ہونے کے باوجود وہ قبول نہیں ہوتی تو یہ اسی طرح ہے جیسے کسی کو وہم ہو جائے کہ سورج طلوع ہوتا ہے لیکن اندھیرا دور نہیں ہوتا اور کپڑا صابن کے ساتھ دھویا جاتا ہے لیکن میل زائل نہیں ہوتی۔ ہاں جب میل تہ بہ تہ جمع ہو کر کپڑے کے اندر داخل ہو جائے تو اب اسے صابن بھی دور نہیں کر سکتا اس کی مثال یہ ہے کہ گناہ اکٹھے ہوتے ہیں اور کئی تہیں بن جاتی ہیں حتیٰ کہ مہر لگ جاتی ہے اور دل زنگ آلود ہو جاتا ہے تو اس قسم کا دل نہ رجوع کرتا ہے اور نہ ہی توبہ۔

ہاں بعض اوقات زبان سے کہتا ہے کہ میں نے توبہ کی اور یہ ایسے ہی جیسے دھوبی اپنی زبان سے کہے کہ میں نے کپڑے کو دھویا لیکن یہ زبانی قول کپڑے کو بالکل پاک نہیں کرتا جب تک کپڑے کی اس صفت کو اس کی ضد کے ساتھ تبدیل نہ کیا جائے مگر یہ حال اصل توبہ سے باز رہنے کا ہے اور کچھ بعید بھی نہیں۔ بلکہ عام لوگ جو دنیا کی طرف متوجہ اور آخرت سے منہ پھیرنے والے ہیں ان پر یہی بات غالب ہے توبہ کی قبولیت کے سلسلے میں اربابِ بصیرت کے لیے اتنا بیان کافی ہے لیکن ہم اس کے پردوں کو آیات، احادیث اور آثار کے ذکر کے ساتھ مضبوط کرتے ہیں۔ کیوں کہ قرآن و سنت کی شہادت کے بغیر بات یقینی نہیں ہوتی۔

ارشاد خداوندی ہے،

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ الشمس آیت ۹

وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ عَنْ عِبَادِہٖ وَیَعْفُوْ عَنِ السَّیِّئَاتِ (۱)

اور وہی (اللہ) ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا اور گناہ معاف کرتا ہے۔

اور ارشاد فرمایا:

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ۔ (۲)

(وہ) گناہ بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے

اس کے علاوہ بھی آیات ہیں۔

اور یہ حدیث پیچھے گزر چکی ہے کہ بندہ اپنی گمشدہ سواری کے ملنے پر اتنا خوش نہیں ہوتا جس قدر اللہ تعالیٰ کو بندے کی توبہ پسند ہے۔ (۳)

اور خوشی (اور پسندیدگی) قبولیت کے بعد ہوتی ہے لہٰذا یہ حدیث قبولیت پر کچھ زیادتی کی دلیل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ یَبْسُطُ یَدَہٗ بِالتَّوْبَۃِ لِمُسِیْءِ اللَّیْلِ اِلَی النَّہَارِ وَلِمُسِیْءِ النَّہَارِ اِلَی اللَّیْلِ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنَ الْمَغْرِبِ۔ (۴)

اللہ تعالیٰ کا دست رحمت توبہ کے ساتھ کشادہ ہوتا ہے اس کے لیے جو رات سے صبح تک اور صبح سے شام تک گناہ کرتا ہے حتیٰ کہ سورج مغرب سے طلوع ہو جائے۔

ہاتھ کا پھیلانا قبولیتِ توبہ سے کنایہ ہے اور کسی چیز کا طالب قبول کرنے والے سے بڑھ کر ہے کئی قبول کرنے والے طالب نہیں ہوتے لیکن جو طالب ہوگا وہ قبول بھی کرے گا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَوْ عَمِلْتُمُ الْخَطَایَا حَتّٰی تَبْلُغَ السَّمَاءَ ثُمَّ نَدِمْتُمْ لَتَابَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ۔ (۵)

اگر تم گناہوں کا ارتکاب کرو حتیٰ کہ وہ آسمان تک پہنچ جائیں پھر تم نادم ہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول کرے گا۔

اور آپ نے یہ بھی فرمایا:

اِنَّ الْعَبْدَ لَیُذْنِبُ الذَّنْبَ فَیَدْخُلُ بِہٖ

بے شک بندہ ایک گناہ کرتا ہے پس اس کے ساتھ جنت

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ شوریٰ آیت ۲۵

(۲) قرآن مجید، سورۂ غافر آیت ۳

(۳) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۳۳ کتاب الدعوات

(۴) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۵۸ کتاب التوبہ

(۵) سنن ابن ماجہ ص ۳۲۳، ابواب الزھد

الْجَنَّةَ۔ میں چلا جاتا ہے۔

عرض کیا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم وہ کیسے؟ فرمایا وہ اسے پیش نظر رکھتا ہے اور توبہ کرتے ہوئے اس سے بھاگتا ہے حتیٰ کہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے (۱)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كَفَّارَةُ الذَّنْبِ النَّدَامَةُ۔ (۲) گناہ کا کفارہ ندامت ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ۔ (۳) گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جس کا کوئی گناہ نہ ہو۔

ایک حبشی نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں بے حیائی کے کاموں کا مرتکب ہوتا ہوں کیا میری توبہ قبول ہوگی؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں قبول ہوگی وہ چلا گیا اور پھر واپس آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ مجھے گناہ کرتے ہوئے دیکھتا تھا؟ آپ نے فرمایا ہاں (یہ سن کر) اس حبشی نے ایک ایسی چیخ ماری کہ اس کی روح پرواز کر گئی۔ (۴)

ایک روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس پر لعنت فرمائی تو اس نے مہلت مانگی اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک مہلت دے دی اس نے کہا مجھے تیری عزت کی قسم جب تک انسان کے جسم میں روح ہے میں اس سے نہیں نکلوں گا اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! جب تک اس میں روح ہے میں اس سے توبہ کو نہیں روکوں گا۔ (۵)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ كَمَا يُذْهِبُ الْمَاءُ الْوَسَخَ۔ (۶) بے شک نیکیاں، برائیوں کو اس طرح زائل کرتی ہیں جیسے پانی میل کو دور کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں بے شمار احادیث وارد ہیں۔

---

(۱) کنز العمال جلد ۴ ص ۲۱۰ حدیث ۱۰۱۸۸

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۲۸۹ مرویات ابن عباس

(۳) سنن ابن ماجہ ص ۳۲۳، ابواب الزہد

(۴)

(۵) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۲۹ مرویات ابو سعید خدری

(۶) حلیۃ الاولیاء جلد اول ترجمہ ۱۴ ص ۲۷۰

آثار:

حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی:۔

فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا۔ (۱) پس بے شک وہ خوب توبہ کرنے والوں کو بخش دیتا ہے۔

اس آدمی کے حق میں نازل ہوئی جس سے گناہ سرزد ہوتا ہے پھر وہ توبہ کرتا ہے پھر گناہ کرتا ہے اور اس کے بعد پھر توبہ کرتا ہے۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

گناہ گاروں کو (اس بات کی) خوشخبری دیجئے کہ اگر وہ توبہ کریں گے تو ان سے قبول کی جائے گی اور صدیقین کو اس بات سے ڈرائیں کہ اگر میں نے عدل سے کام لیا تو ان کو عذاب دوں گا۔

حضرت طلق بن حبیب رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے حقوق اتنے بڑے ہیں کہ بندہ ان کو ادا نہیں کر سکتا لیکن صبح و شام توبہ کیا کرو۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جو شخص اپنی خطا کو یاد کرے جس کا وہ مرتکب ہوا اور اس سے اس کا دل ڈھل جائے تو نامۂ اعمال سے وہ گناہ مٹ جاتا ہے ایک روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک نبی علیہ السلام سے کچھ لغزش ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی (فرمایا) مجھے اپنی عزت کی قسم اگر آپ نے دوبارہ یہ کام کیا تو میں عذاب دوں گا انہوں نے عرض کیا اے میرے رب! تو تُو ہے اور میں میں ہوں تیری عزت کی قسم اگر تو مجھے محفوظ نہیں رکھے گا تو یہ لغزش دوبارہ ہو سکتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بچا لیا۔

بعض بزرگ فرماتے ہیں بندہ گناہ کرکے اس پر مسلسل نادم رہتا ہے حتیٰ کہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے، شیطان کہتا ہے افسوس میں اسے گناہ میں مبتلا نہ کرتا۔

حضرت حبیب بن ثابت رحمہ اللہ فرماتے ہیں قیامت کے دن آدمی کے گناہ اس کے سامنے پیش کئے جائیں گے ایک گناہ سے آمنا سامنا ہوگا تو وہ کہے گا میں اسی سے ڈرتا تھا فرماتے ہیں' پھر' اس کی بخشش ہو جائے گی۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک گناہ کے بارے میں پوچھا جس کا وہ مرتکب ہوا تھا کہ کیا اس سے توبہ ہو سکتی ہے انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا پھر اس کی طرف متوجہ ہوئے تو دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں آپ نے اس سے فرمایا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں توبہ کے دروازے کے علاوہ باقی تمام کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ اس (توبہ کے دروازے) پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو اسے بند نہیں کرتا پس تو عمل کر اور مایوس نہ ہو۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ اسراء آیت ۲۵

حضرت عبدالرحمٰن بن ابوالقاسم رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم نے حضرت ابراہیم رحمہ اللہ سے کافر کی توبہ اور اس آیت کریمہ کے بارے میں گفتگو کی۔

اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۔ (۱) اگر وہ باز آجائیں تو گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

تو انہوں نے فرمایا مجھے امید ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کے ہاں اچھے حال میں ہو گا اور مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ مسلمان کی توبہ گویا اسلام کے بعد اسلام لانا ہے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تم سے جو بات بھی بیان کروں گا وہ کسی بھیجے ہوئے نبی یا اتاری گئی کتاب سے بیان کروں گا بے شک بندہ جب گناہ کا مرتکب ہوتا ہے پھر پلک جھپکنے کے برابر بھی نادم ہو تو پلک جھپکنے سے بھی جلدی وہ گناہ زائل ہو جاتا ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا توبہ کرنے والوں کے پاس بیٹھا کرو کیونکہ ان کے دل بہت نرم ہوتے ہیں۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں مجھے معلوم ہے کہ کب اللہ تعالیٰ میری بخشش فرمائے گا پوچھا گیا کب؟ فرمایا جب میری توبہ قبول فرمائے گا ایک دوسرے بزرگ فرماتے ہیں مجھے مغفرت سے محرومی کا اتنا خوف نہیں جتنا توبہ کی محرومی سے ڈرتا ہوں یعنی مغفرت تو توبہ کے لوازمات اور اس کے پیچھے آنے والی ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک نوجوان تھا اس نے بیس سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی پھر بیس سال اس کی نافرمانی کی اس کے بعد شیشے میں دیکھا تو داڑھی میں سفید بال آگئے تھے اسے برا معلوم ہوا تو بارگاہ خداوندی میں عرض کیا یا اللہ میں نے بیس سال تیری عبادت کی پھر بیس سال تیری نافرمانی کی اگر میں تیری طرف رجوع کروں تو میری توبہ قبول کرے گا؟ تو اس نے ایک کہنے والے کو سنا وہ کہہ رہا تھا لیکن دکھائی نہیں دیتا ہے کہ تو نے ہم سے دوستی کی تو ہم نے بھی تم سے محبت کی اور تم نے ہمیں چھوڑا تو ہم نے تمہیں چھوڑ دیا تم نے ہماری نافرمانی کی تو ہم نے تمہیں مہلت دی اب اگر تو ہماری طرف رجوع کرے گا تو ہم تجھ سے قبول کریں گے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جنہوں نے گناہوں کے درخت اس طرح لگائے ہیں جیسے دلوں میں جان ہوتی ہے ان کو توبہ کا پانی دیا تو ان پر ندامت اور غم کا پھل لگا تو وہ جنون کے بغیر ہی مجنون بن گئے اور عاجزی اور گونگے پن کے بغیر ہی وہ غبی بن گئے لیکن وہ بلیغ و فصیح ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت رکھتے ہیں پھر انہوں نے جام صفا نوش کیا تو طویل آزمائش پر صبر کرتے رہے پھر ان کے دل عالم ملکوت کے مشتاق ہوئے اور پردہ ہائے جبروت کے خفیہ امور میں غور و فکر کرنے لگے اور انہوں نے ندامت کے سائبان کے سائے

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ انفال آیت ۳۸

میں بیٹھ کر گناہوں کا صحیفہ پڑھنا شروع کیا تو ان کے نفسوں پر جزع فزع طاری ہو گیا حتیٰ کہ وہ تقویٰ کی سیڑھی کے ذریعے زُہد کے بلند مقام تک پہنچ گئے، ان کو ترکِ دین کی کڑواہٹ میٹھی اور بستر کی سختی نرمی معلوم ہونے لگی حتیٰ کہ وہ نجات اور سلامتی کی رسی کے ساتھ کامیاب ہوئے ان کی رُوحیں اپنی خوراک حاصل کرتی کرتی نعمتوں کے باغوں میں چلی گئیں انہوں نے زندگی کے سمندر میں غوطہ لگایا، جزع فزع کی خندقوں اور خواہشات کے پُلوں کو پار کر گئے حتیٰ کہ وہ علم کے صحن میں اتر گئے اور حکمت کے تالاب سے پانی پیا، پھر ہوشیاری کی کشتی میں سوار ہوئے اور سلامتی کے سمندر سے نفع حاصل کیا یہاں تک کہ راحت کے باغوں اور عزت و کرامت کی کان تک پہنچ گئے ـــــ اس بات کے لیے اتنا بیان کافی ہے کہ توبہ بہر حال صحیح اور مقبول ہوتی ہے۔

سوال:

کیا آپ بھی معتزلہ کی طرح یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر توبہ کا قبول کرنا واجب ہے۔

جواب:

جو کچھ میں نے ذکر کیا ہے اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ پر توبہ کا قبول کرنا واجب ہے بلکہ وہی مراد ہے جو کہا جاتا ہے کہ کپڑا جب صابن سے دھویا جائے تو میل کا دُور ہونا لازمی ہے اور پیاسا جب پانی پیئے تو پیاس کا زائل ہونا ضروری ہے اور جب ایک مدت تک پانی نہ ملے تو پیاس واجب ہو جاتی ہے اور جب مسلسل پیاسا رہے تو موت واجب ہوتی ہے اور ان تمام باتوں سے وہ بات مراد نہیں ہے جو معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر یہ کام واجب ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے عبادت کو گناہوں کے کفارے کے طور پر پیدا فرمایا ہے اور نیکی کو برائی کے مٹانے کے لیے تخلیق فرمایا جیسا کہ پانی کو پیاس بجھانے کے لیے پیدا کیا اور اس کی قدرت میں اس کے خلاف کی بھی گنجائش ہے اگر اس کی مشیئت کا تقاضا ہو۔ پس اللہ تعالیٰ پر کچھ بھی واجب نہیں ہے لیکن جس کام کے لیے اس کا ازلی ارادہ ہو چکا ہے وہ کام لازماً ہو گا۔

سوال:

ہر توبہ کرنے والے کو اپنی توبہ کی قبولیت میں شک ہوتا ہے جب کہ پانی پینے والے کو پیاس کے بجھنے میں شک نہیں ہوتا تو توبہ کی قبولیت میں شک کیوں ہوتا ہے؟

جواب:

اس کا قبولیت میں شک اسی طرح ہے جیسے شرائطِ صحت کے وجود میں شک ہوتا ہے کیونکہ توبہ کے ارکان اور شرائط بہت باریک ہیں جیسا کہ آگے آرہا ہے اور عام طور پر تمام شرائط پائی نہیں جاتیں جیسے ایک شخص اسہال کی دوائی پیتا ہے لیکن اسے شک ہوتا ہے کہ معلوم اس سے اسہال ہوں گے یا نہیں؟ اور یہ شک دوائی میں اسہال کی شرائط کے حصول کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس کی وجہ حال، وقت، دوائی کی ترکیب اور اس کے اجزا کے کھرا ہونے میں شک ہے تو اس قسم کی مثالیں توبہ کے پائے جانے کے بعد خوف کا موجب ہوتی ہیں اور اس کی یقینی قبولیت میں شک پیدا کرتی ہیں

جیساکہ شرائط کے بیان میں ذکر کیا جائے گا۔

دوسرا رکن:

کس سے توبہ؟

اور یہ صغیرہ و کبیرہ گناہ ہیں —— جاننا چاہیے کہ توبہ گناہ کو چھوڑنے کا نام ہے اور کسی چیز کو اسی وقت چھوڑا جاسکتا ہے جب اس کی معرفت حاصل ہو اور جب توبہ واجب ہے تو جس عمل کے ذریعے اس تک رسائی ہوتی ہے وہ بھی واجب ہوگا لہٰذا گناہ کی پہچان ضروری ہے اور گناہ ہر اس کام کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو چاہے وہ مخالفت عمل کو چھوڑنے کی صورت میں ہو یا کرنے کے اعتبار سے — اس کی تفصیل امور تکلیفیہ کی اول سے آخر تک تشریح کا تقاضا کرتی ہے اور یہ ہماری غرض نہیں ہے بلکہ ہم اجمالی طور پر گناہوں اور ان کی اقسام کا ذکر کریں گے۔

پہلی فصل:

بندوں کی صفات کے اعتبار سے گناہوں کی اقسام

جان لو! بندے کے اوصاف و اخلاق بہت زیادہ ہیں جیساکہ اس کی تشریح قلبی عجائب اور مہلکات کے سلسلے میں معلوم ہو چکی ہے لیکن گناہ کے مراکز اور چشمے چار صفات میں بند ہیں صفاتِ ربوبیت، شیطانی صفات، بہیمی صفات اور سبعی (درندوں کی) صفات کیوں کہ انسان کا خمیر مختلف آمیزشوں سے تیار کیا گیا ہے تو اس معجون میں سے ہر جز ایک اثر کا تقاضا کرتی ہے جیسے سکنجبین میں شکر، سرکہ اور زعفران کا الگ الگ اثر ہوتا ہے۔

صفتِ ربوبیت کا تقاضا تکبر، فخر، جبر، مدح و ثناء عزت اور مالداری اور ہمیشہ رہنے کی چاہت، تمام لوگوں سے بلندی کی خواہش ہے، گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں تم سب کا بلند ترین رب ہوں اس سے کبیرہ گناہ پھوٹتے ہیں جن سے لوگ غافل ہیں اور وہ ان کو گناہ شمار نہیں کرتے یہ بہت بڑے ہلاکت خیز امور ہیں جو تمام گناہوں کی اصل جیسے ہیں جیساکہ ہم نے مہلکات کے بیان میں ذکر کیا ہے۔

دوسری شیطانی صفت ہے جس سے حسد، سرکشی، بہانہ بازی، مکر و فریب اور فساد نیز برائی کا حکم دینا ہے اس میں کھوٹا پن، منافقت نیز بدعات اور گمراہی کی طرف دعوت دینا بھی شامل ہے۔

تیسری صفت، صفت بہیمیہ یعنی چانوروں والی صفت ہے جس سے حرص، پیٹ اور شرمگاہ کی خواہشات کو پورا کرنا ہے اسی سے زنا، لواطت، چوری، یتیموں کا مال کھانا اور خواہشات کے لئے مال و متاع جمع کرنا ہے۔

چوتھی صفت، صفت سبعیہ (درندوں والی صفت) ہے اس سے غصہ، کینہ، لوگوں کو مارنا پیٹنا، قتل کرنا، لوگوں کے مال ضائع کرنا ہے اور اس سے کئی گناہ پیدا ہوتے ہیں۔

فطرت میں یہ صفات تدریجاً آتی ہیں سب سے پہلے جانوروں والی صفت غالب آتی ہے اس کے بعد درندوں والی صفت آتی ہے پھر جب دونوں جمع ہو جاتی ہیں تو دھوکہ بازی کے لیے عقل کو استعمال کرتی ہیں نیز مکروفریب اور حیلے بہانے کی ترغیب دیتی ہیں اور یہ شیطانی صفت ہے پھر آخر میں صفت ربوبیت غالب آتی ہے اور وہ فخر، غلبہ، بلندی، بڑائی کی طلب اور تمام مخلوق پر غالب آنے کا قصد ہے۔

تو یہ صفات گناہ کی جڑیں اور چشمے ہیں پھران سے اعضا پر گناہ پھوٹتے ہیں ان میں سے بعض کا تعلق صرف دل سے ہے جیسے کفر، بدعت، منافقت اور لوگوں کے بارے میں بری سوچ، بعض آنکھ اور کان سے متعلق ہیں، بعض زبان پر جاری ہوتے ہیں اور بعض پیٹ اور شرمگاہ سے تعلق رکھتے ہیں کچھ گناہ ہاتھوں اور پاؤں سے سرزد ہوتے ہیں اور بعض کا تعلق تمام بدن سے ہے اور ان کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ واضح ہیں۔

دوسری تقسیم:

جان لو! گناہ یا تو بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوتے ہیں یا حقوق العباد سے متعلق ہوتے ہیں جو گناہ خاص ایک بندے سے متعلق ہیں وہ نماز، روزے اور خاص اس سے متعلق واجبات کو چھوڑنا ہے اور جو حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں وہ زکوٰۃ نہ دینا، کسی کو قتل کردینا، لوگوں کا مال غصب کرنا اور ان کی عزت کے درپے ہونا ہے دوسرے کا جو حق بھی لیا جائے گا وہ اس کی ذات سے متعلق ہوگا یا کسی عضو سے یا مال سے یا عزت سے اس کا تعلق ہوگا یا دین اور جاہ و مرتبے سے متعلق ہوگا۔ دین لینے کی صورت یہ ہے کہ اسے گمراہ کرے اور بدعت کی طرف بلائے نیز گناہوں کی ترغیب دے اور اللہ تعالیٰ پر امید کی جانب کو ترجیح دیتے ہیں۔

بندوں کے حقوق سے متعلق گناہ زیادہ سخت ہیں اور جو بندے اور اس کے رب کے درمیان ہیں اگر وہ گناہ شرک سے متعلق نہ ہو تو اس میں معافی کی زیادہ امید ہوتی ہے حدیث شریف میں آیا ہے۔

اَلدَّوَاوِیْنُ ثَلَاثَۃٌ دِیْوَانٌ یُغْفَرُ وَ دِیْوَانٌ لَا یُغْفَرُ وَ دِیْوَانٌ لَا یُتْرَکُ فَالدِّیْوَانُ الَّذِیْ یُغْفَرُ ذُنُوْبُ الْعِبَادِ بَیْنَھُمْ وَبَیْنَ اللّٰہِ تَعَالٰی وَاَمَّا الدِّیْوَانُ الَّذِیْ لَا یُغْفَرُ فَالشِّرْکُ بِاللّٰہِ تَعَالٰی وَاَمَّا الدِّیْوَانُ الَّذِیْ لَا یُتْرَکُ فَمَظَالِمُ الْعِبَادِ۔ (۱)

دیوان (نامۂ اعمال) تین قسم کے ہیں ایک وہ دیوان ہے جس کی بخشش ہو جائے گی، دوسرا وہ دیوان ہے جس کی بخشش نہیں ہوتی اور تیسرا دیوان وہ ہے جسے (حساب کے بغیر) چھوڑا نہیں جائے گا جو دیوان بخش دیا جائے گا وہ بندوں کے وہ گناہ ہیں جو حقوق اللہ سے متعلق ہیں اور جس دیوان کی بخشش نہیں ہوگی وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے اور جس دیوان کو چھوڑا نہیں جائے گا وہ بندوں کے حقوق ہیں۔

(۱) المستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۵۷۵ کتاب الاہوال

یعنی ان کا مطالبہ ضرور ہوگا۔ حتیٰ کہ اسے معاف کیا جائے۔

تیسری تقسیم:

گناہ صغیرہ بھی ہوتے ہیں اور کبیرہ بھی اس سلسلے میں لوگوں کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں صغیرہ اور کبیرہ کی تقسیم صحیح نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی جو بھی مخالفت ہے وہ کبیرہ گناہ ہے لیکن یہ قول ضعیف ہے۔

کیوں کہ ارشاد خداوندی ہے:

إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُدْخَلًا كَرِيمًا۔ (۱)

اور اگر ان کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو جن سے تم کو روکا جاتا ہے تو ہم تمہارے (صغیرہ) گناہوں کو معاف کر دیں گے اور تمہیں عزت والی جگہ میں داخل کریں گے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ۔ (۲)

وہ لوگ جو کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں مگر جو شاذو نادر ہو جائے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ يُكَفِّرْنَ مَا بَيْنَهُنَّ إِنِ اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ۔ (۳)

پانچ نمازیں اور جمعہ دوسرے جمعہ تک درمیان والے گناہوں کو مٹا دیتے ہیں اگر کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے۔

دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ إِلَّا الْكَبَائِرَ۔ (۴)

اس دوران کبیرہ گناہوں کے علاوہ جو گناہ سرزد ہوں ان کے لیے (یہ نمازیں) کفارہ ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلْكَبَائِرُ الْإِشْرَاكُ بِاللهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ

کبیرہ گناہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ نساء آیت ۳۱

(۲) قرآن مجید، سورۃ النجم آیت ۳۲

(۳) صحیح مسلم جلد اول ص ۱۲۲ کتاب الطہارۃ

(۴) ؍؍ ؍؍ ؍؍

وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْيَمِيْنُ الْغَمُوْسُ۔ (۱) نافرمانی کرنا کسی کو قتل کرنا اور جھوٹی قسم ہے

کبیرہ گناہوں کی تعداد کے سلسلے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اختلاف ہے چار، سات گیارہ اور اس سے بھی زیادہ تعداد بیان ہوئی ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں گناہ کبیرہ چار ہیں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں سات ہیں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نو ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تک یہ بات پہنچی کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سات کا قول کرتے ہیں تو انہوں نے فرمایا ستر کہنا زیادہ مناسب ہے کبھی آپ فرماتے جس کام سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اس کا ارتکاب گناہ کبیرہ ہے کچھ حضرات نے فرمایا کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے دوزخ سے ڈرایا ہے وہ کبیرہ گناہ ہے بعض بزرگوں کا قول ہے کہ دنیا میں جس گناہ کی سزا مقرر ہے وہ کبیرہ ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں ابہام ہے ان کی تعداد معلوم نہیں جیسے لیلۃ القدر اور جمعۃ المبارک کے دن قبولیتِ دعا کی گھڑی۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے جب سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا سورۃ نساء کے شروع سے پڑھنا شروع کرو یہاں تک کہ تیس نمبر آیت میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی تک پہنچو۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ۔ اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو جن سے تمہیں روکا گیا ہے (تو ہم تمہارے صغیرہ گناہ مٹا دیں گے۔ (۲)

تو اس سورت میں اس مقام تک جن جن کاموں سے منع کیا گیا ہے وہ سب کبیرہ گناہ ہیں حضرت ابوطالب مکی فرماتے ہیں کبیرہ گناہ ستر ہیں میں نے ان کو مختلف احادیث اور حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہم کے اقوال سے جمع کیا ہے ان میں سے چار کا تعلق دل سے ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا، گناہ پر اصرار کرنا، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونا اور ناپسندیدہ بات کے پہنچنے سے بے خوف ہونا ہے چار زبان سے متعلق ہیں جھوٹی گواہی دینا، کسی پاکدامن پر زنا کا الزام لگانا، جھوٹی قسم اٹھانا اور یہ، وہ ہے جس سے کسی باطل کو حق یا حق کو باطل قرار دیا جاتا ہے بعض نے کہا اس سے وہ قسم مراد ہے جس کے ذریعے کسی مسلمان کا مال ناحق طریقے پر لیا جاتا ہے اگرچہ پیلو کی مسواک ہی کیوں نہ ہو اس قسم کو یمین غموس کہا جاتا ہے کیونکہ قسم اٹھانے والا جہنم میں غوطہ زنی کرتا ہے اور چوتھی بات جادو ہے اور یہ ہر اس کلام کا نام ہے جو انسان اور اس کے اجزا کو اس کی اصلی تخلیق سے بدل دے۔

تین گناہوں کا تعلق پیٹ سے ہے اور یہ شراب نوشی اور ہر نشے والی چیز پینا، یتیم کا مال ظلم کے طریقے پر کھانا جان اور بوجھ کر سود کھانا۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۰ کتاب الدیات

(۲) قرآن مجید، سورہ نساء آیت ۳۱

دو گناہ شرمگاہ سے تعلق رکھتے ہیں زنا اور غیر فطری فعل، دو گناہ ہاتھوں سے متعلق ہیں اور وہ قتل اور چوری کرنا ہے ایک پاؤں سے تعلق رکھتا ہے اور وہ میدان جنگ سے بھاگنا ہے اس طرح کہ ایک دو کے مقابلے سے اور دس بیس کے مقابلے سے بھاگ جائیں ایک گناہ کا تعلق پورے جسم سے ہے اور وہ ماں باپ کی نافرمانی ہے یعنی ماں باپ کی نافرمانی کی صورت یہ ہے کہ وہ کسی حق کے بارے میں اس پر قسم کھائیں تو وہ ان کی قسم کو پورا نہ کرے اور اگر اس سے کسی حاجت کا سوال کریں تو وہ پورا نہ کرے اگر وہ اسے برا کہیں تو وہ ان کو مارے وہ بھوکے ہوں تو ان کو کھانا نہ دے (۱)

یہ قول اگرچہ (مقصد کے) قریب ہے لیکن اس سے بھی پوری طرح تسلی نہیں ہوتی کیونکہ اس میں کمی زیادتی ممکن ہے کیونکہ انہوں نے سود خوری اور یتیم کا مال کھانے کو کبیرہ گناہوں میں شامل کیا ہے اور گناہ مال سے متعلق ہیں اور جسمانی کبیرہ گناہوں میں صرف قتل کا ذکر کیا ہے، کسی کی آنکھ پھوڑ دینا اور ہاتھ کاٹ دینا نیز اس قسم کی دیگر تکالیف جو مسلمانوں کو پہنچائی جاتی ہیں اور انہیں مارا پیٹا جاتا ہے اور طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں ان کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ یتیم کو مارنا اور اس کو اذیت پہنچانا، نیز اس کے اعضاء کاٹنا اس کا مال کھانے سے بڑا گناہ ہے کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے۔

مِنَ الْكَبَائِرِ السَّبَّتَانِ بِالسَّبَّةِ وَمِنَ الْكَبَائِرِ اِسْتِطَالَةُ الرَّجُلِ فِي عِرْضِ اَخِيْهِ الْمُسْلِمِ۔ (۲)

ایک گالی کے مقابلے میں دو گالیاں دینا بھی کبیرہ گناہوں میں شامل ہے اور کسی شخص کا اپنے مسلمان بھائی کی عزت کے سلسلے میں دست درازی کرنا بھی کبیرہ گناہ ہے۔

حضرت ابو سعید خدری اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں۔
تم کچھ ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہاری نگاہ میں بال سے بھی زیادہ باریک ہیں حالانکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ہم ان کو کبیرہ گناہوں میں شمار کرتے تھے۔ (۳)

---

(۱) حوالہ جات

(۱) صحیح بخاری جلد دوم ص ۱۰۱۵ کتاب الایمان
(۲) صحیح بخاری جلد اول ص ۳۸۸ کتاب الوصایا
(۳) صحیح بخاری جلد دوم ص ۸۸۴ کتاب الادب
(۴) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۸۸۷ کتاب الادب
(۵) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۱۱ ص ۱۶۴ حدیث ۱۱۲۳۲
(۶) مجمع الزوائد جلد اول ص ۱۰۴ کتاب الایمان
(۷) ایضاً ص ۱۰۵
(۸) ایضاً ص ۱۰۴
(۹) کنز العمال جلد ۱۰ ص ۷۲۳ حدیث ۲۹۳۵۵
(۱۰) ایضاً جلد ۶ ص ۱۹۶ حدیث ۱۵۳۲۶
(۱۱) مجمع الزوائد جلد اول ص ۲۰۷ کتاب الطہارۃ
(۱۲) شعب الایمان جلد ۲ ص ۲۰ حدیث ۱۰۵۰
(۱۳) الفردوس بماثور الخطاب جلد اول ص ۲۱۱ حدیث ۸۰۵
(۱۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۹ مروایات عبادہ بن قرطہ

ایک جماعت کہتی ہے کہ ہر وہ گناہ جسے جان بوجھ کر کیا جائے وہ بھی کبیرہ گناہ ہے اور جس کام سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا وہ بھی کبیرہ گناہ ہے۔

پتہ کیسے چلے؟

چوری کے کبیرہ گناہ ہونے اور نہ ہونے کا پتہ اس وقت تک نہیں چل سکتا جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ کبیرہ گناہ کیا ہوتا ہے؛ اور اس سے کیا مراد ہے جیسے ایک شخص کہتا ہے کہ چوری حرام ہے یا نہیں؛ تو جب تک حرام کا معنیٰ معلوم نہ ہو اس پر کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ پھر ہم بحث کریں گے کہ آیا یہ معنیٰ چوری میں پایا جاتا ہے؛

تو کبیرہ گناہ اپنے لفظ کے اعتبار سے مبہم ہے لغت اور شرع میں اس کا کوئی خاص موضوع نہیں ہے کیوں کہ صغیرہ اور کبیرہ دونوں اضافی ہیں کیونکہ ہر گناہ اپنے سے کم تر گناہ کے مقابلے میں کبیرہ ہے اور اپنے سے اوپر والے گناہ کے مقابلے میں صغیرہ ہے کسی غیر عورت کے ساتھ لیٹنا اس کی طرف دیکھنے کے مقابلے میں کبیرہ گناہ ہے لیکن زنا کے مقابلے میں صغیرہ ہے کسی مسلمان کا ہاتھ کاٹنا اسے مارنے کی نسبت گناہ کبیرہ ہے لیکن اسے قتل کرنے کی نسبت صغیرہ ہے۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کہا جائے جن گناہوں پر جہنم میں جانے سے ڈرایا گیا ہے ان کو کبیرہ کہا جائے مطلب یہ ہوگا کہ ہم ان گناہوں کو اس لیے کبیرہ کہتے ہیں کہ آگ کا عذاب بہت بڑا ہے۔

یہ بھی اصطلاح بنائی جاسکتی ہے کہ جن گناہوں پر سزا مقرر ہے وہ کبیرہ ہیں کیوں کہ جو سزا دنیا میں بطور وجوب ملتی ہے وہ بہت سزا ہے یہ اصطلاح بھی ہو سکتی ہے کہ کتاب اللہ میں جن گناہوں کو واضح طور پر منع کیا گیا ہے وہ کبیرہ ہیں تو یوں کہا جائے گا کہ قرآن پاک میں ان کے ذکر کی تخصیص ان گناہوں کے بڑا ہونے کی دلیل ہے پھر بھی ان کا کبیرہ و عظیم ہونا لامحالہ اضافی ہوگا کیوں کہ قرآن پاک میں جو کچھ مذکور ہے اس میں بھی درجات کا فرق ہے۔

تو ان اصطلاحات میں کوئی حرج نہیں ہے اور صحابہ کرام سے جو الفاظ منقول ہیں وہ ان سب میں آجاتے ہیں اور ان کو ان میں سے کسی بھی احتمال پر آثار نا عقل سے بعید نہیں ہے ہاں یہ بات اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مفہوم معلوم کیا جائے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ۔ (۱)

اگر تم کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو ہم تم سے تمہارے (صغیرہ) گناہوں کو مٹا دیں گے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلصَّلَوٰتُ كَفَّارَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ اِلَّا الْكَبَائِرَ۔ (حوالہ گزر چکا ہے)

نمازیں درمیان والے گناہوں کے لیے کفارہ ہیں سوائے کبیرہ گناہوں کے۔

---

(۱) قرآن مجید سورۂ نساء آیت ۳۱

تو یہ کبیرہ گناہوں کو ثابت کرتا ہے۔

اس سلسلے میں حق یہ ہے کہ شریعت کی نظر میں گناہ تین قسموں میں منقسم ہیں ایک وہ جن کا کبیرہ ہونا معلوم ہے دوسرے وہ جن کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ صغیرہ گناہوں میں شمار ہوتے ہیں اور تیسری قسم ان گناہوں کی ہے جن میں شک ہے ان کا حکم معلوم نہیں ہے تو ایسے گناہوں کی جامع مانع تعریف جاننے کے لیے طلب ایک ناممکن بات کی تلاش ہے یہ تو صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سماعت کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہے یعنی آپ نے فرمایا ہوتا کہ کبیرہ گناہوں سے میری مراد دس یا پانچ گناہ ہیں اور آپ ان کی تفصیل بھی بیان کر دیتے لیکن اس طرح نہیں آیا بلکہ بعض روایات میں ہے کہ تین گناہ کبیرہ ہیں (۱) بعض میں ہے کہ سات گناہ کبیرہ گناہ ہیں (۲) پھر یہ بھی آیا کہ ایک گالی کے مقابلے میں دو گالیاں دینا گناہ کبیرہ ہے اور وہ ان سات اور تین سے خارج ہے تو معلوم ہوا کہ آپ کی مراد کوئی خاص عدد نہیں ہے تو جس چیز کی تعداد شریعت نے بیان نہیں کی اس کی تعداد کے لیے طمع کیسے کی جا سکتی ہے یا یہ کہ شریعت کا مقصود اسے مبہم چھوڑنا ہے تاکہ لوگ خوف زدہ رہیں جیسا کہ لیلۃ القدر کو مبہم رکھا تاکہ اس کی طلب میں لوگ خوب کوشش کریں۔

ہاں ہمارے لیے ایک راستہ ہے جس کے ذریعے کبیرہ گناہوں کی جنس اور انواع کی پہچان حاصل کر سکتے ہیں اور یہ پہچان حقیقی ہوگی۔ لیکن ان کے افراد کی پہچان محض گمان اور اندازے سے ہی ہو سکتی ہے اور ہم سب سے بڑے گناہ کو بھی معلوم کر سکتے ہیں لیکن سب سے چھوٹے گناہ کی معرفت کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے۔

اس کا بیان یوں ہے کہ ہمیں شرعی دلائل اور انوار بصیرت دونوں کے ذریعے معلوم ہے کہ تمام شریعتوں کا مقصود مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے قرب سے بہرہ ور کرنا اور اس کی ملاقات کی سعادت کا حصول ہے اور اس مقصد تک پہنچنے کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات، اس کی کتب اور اس کے رسولوں کی معرفت ضروری ہے۔ اور اسی طرف اس ارشاد خداوندی میں اشارہ ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ (۳)

یعنی اس لیے پیدا کیا کہ وہ صرف میرے بندے بنیں اور بندہ اس وقت تک بندہ بن نہیں سکتا جب تک اسے اپنے رب کی ربوبیت اور اپنی بندگی کی پہچان نہ ہو اور ضروری ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے رب کو پہچانے انبیاء کرام کی بعثت کی

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۸۸۴، کتاب الادب

(۲) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۷، ص ۸۴ حدیث ۱۰۲

(۳) قرآن مجید سورۃ الذاریات: آیت ۵۶

غایت بھی یہی تھی لیکن یہ مقصد یہ صرف دینوی زندگی سے ہی پورا ہو سکتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا بھی یہی مقصد ہے۔

آپ نے فرمایا:

اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ (۱) دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

تو دین کے تابع کرتے ہوئے دنیا کی حفاظت بھی مقصود بن گئی کیوں کہ اس کا وسیلہ ہے اور دنیا میں سے آخرت کے ساتھ دو چیزیں متعلق ہیں ایک جان اور دوسرا مال، اور ہر وہ عمل جو اللہ تعالیٰ کی معرفت کا دروازہ بند کر دے وہ سب سے بڑا گناہ ہے اور اس کے بعد وہ جو انسانی زندگی میں خلل انداز ہو اور اس سے کم وہ جو انسانی معیشت کا راستہ مسدود کر دے جس سے انسانی زندگی متعلق ہوتی ہے تو یہ تین مرتبے ہیں (اللہ تعالیٰ کی معرفت میں رکاوٹ، حیات انسانی میں رکاوٹ اور معیشت میں رکاوٹ) دلوں میں معرفت، بدن میں حیات اور لوگوں پر مال کی حفاظت ضروری ہے اور تمام شریعت میں مقصود ہے اور ان تین باتوں میں مختلف ادیان اور ملتوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی نبی کو بھیجے اور اس کی بعثت سے مخلوق کی دینی و دینوی اصلاح کا ارادہ فرمائے پھر ان کو اس بات کا حکم دے جو ان کو اس کی معرفت اور اس کے رسولوں کی معرفت سے روک دے یا ان کو جان و مال ہلاک کرنے کا حکم دے تو اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ گناہ کبیرہ کے تین مراتب ہیں۔

پہلا مرتبہ:

وہ گناہ جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کی معرفت میں رکاوٹ ہو اور یہ کفر ہے اور اس سے بڑا گناہ کوئی نہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان حجاب ہی جہالت ہے اور اس کے قرب کا وسیلہ علم و معرفت ہے اور اس کا قرب و بُعد، معرفت اور جہالت کے اندازے پر ہوتا ہے اور وہ جہالت جو کفر ہے اس کے قریب قریب گناہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خوفی اور اس کی رحمت سے ناامیدی ہے کیونکہ یہ بھی بعینہ جہالت ہے اس لیے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لیتا ہے اس سے اس بات کا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ بے خوف یا ناامید ہوگا۔

اس سے نچلے درجے میں وہ تمام بدعات ہیں جو اللہ تعالیٰ ذات، اس کی صفات اور اس کے افعال سے متعلق ہیں اور ان میں سے بعض دوسری بعض کے مقابلے میں زیادہ سخت ہیں اور جس قدر ان سے لاعلمی میں فرق ہے اسی قدر ان میں بھی فرق ہے اسی طرح جس قدر اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے افعال، شریعتوں اور اوامر و نور الٰہی سے تعلق ہے اسی مناسبت سے ان بدعات کے درمیان فرق ہوگا اور ان کے مراتب بے شمار ہیں قرآن پاک میں مذکورہ کبائر میں داخل ہونے کے

---

(۱) الاسرار المرفوعۃ ص ۲۲۳ حدیث ۴۷۲

اعتبار سے ان کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جن کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ ان کبائر کے ذکر میں شامل ہیں جو قرآن پاک میں مذکور ہیں دوسری وہ جن کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ داخل نہیں ہیں اور تیسری وہ جن کے بارے میں شک ہے اور اس شک کے ازالے کی طمع سعی لا حاصل ہے۔

دوسرا مرتبہ:

انسانی جانیں ہیں کیونکہ ان کے باقی رہنے اور ان کی حفاظت کے ذریعے زندگی کو دوام حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو کسی نفس کا قتل یقیناً کبیرہ گناہوں میں سے ہے اگرچہ کفر سے کم درجہ میں ہے کیوں کہ اس کے ذریعے مقصود کا وسیلہ ختم ہو جاتا ہے اس لیے کہ دنیوی زندگی سے آخرت کا ارادہ کیا جاتا ہے اور اس تک پہنچنا اللہ تعالیٰ کی معرفت سے ہوتا ہے پھر اس کبیرہ گناہ سے اعضاء کا کاٹنا متصل ہوتا ہے اور ہر وہ کام جو ہلاکت تک پہنچائے حتیٰ کہ مارنا بھی اس میں شامل ہے ان میں سے بعض گناہ دوسرے بعض کے مقابلے میں زیادہ بڑے ہیں اور اس درجہ میں زنا اور غیر فطری فعل کی حرمت بھی آتی ہے کیونکہ اگر لوگ صرف مردوں سے خواہشات کی تکمیل پر متفق ہو جائیں تو نسلِ انسانی منقطع ہو جائے اور موجود کو ختم کرنا وجود کے خاتمے کے قریب ہے۔

زنا اصل وجود کو ختم نہیں کرتا لیکن نسب کو خراب کرتا ہے اور باہمی وراثت اور مدد بلکہ ان تمام امور کو باطل کر دیتا ہے جن کے بغیر زندگی کا نظام درست نہیں ہو سکتا بلکہ زنا کے جواز کی صورت میں یہ نظام کیسے پایۂ تکمیل کو پہنچے گا حالانکہ جانوروں کے معاملات کا انتظام نہیں ہو سکتا جب تک ان میں سے خاص مادہ کے لیے خاص نر کا امتیاز نہ کیا جائے یہی وجہ ہے کہ شریعت میں زنا کے جواز کا تصور بھی نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس (شریعت) کا مقصد اصلاح ہے اور مناسب یہ ہے کہ زنا کا درجہ قتل کے بعد ہو کیونکہ اس سے وجود کا دوام ختم نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ اس کی اصل میں رکاوٹ بنتا ہے بلکہ نسبوں کے درمیان امتیاز ختم ہو جاتا ہے اور یہ ان اسباب کو حرکت دیتا ہے جو قریب ہے کہ باہمی لڑائی تک پہنچا دیں۔

اور مناسب ہے کہ غیر فطری فعل کے مقابلے میں یہ زیادہ سخت گناہ ہو کیونکہ دونوں طرف سے شہوت اس عمل کی داعی ہوتی ہے اس لیے یہ زیادہ واقع ہوتا ہے اور اس کی کثرت کی وجہ سے اس کے نقصان کا اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔

تیسرا مرتبہ:

مال ہیں کیونکہ ان سے لوگوں کا گزر اوقات ہوتا ہے لہٰذا لوگوں کو اس کے حصول کی کھلی چھٹی نہیں دی جا سکتی کہ جیسے چاہیں حاصل کریں غنڈہ گردی سے یا چوری کے ذریعے یا کسی دوسرے ناجائز طریقے سے لیں بلکہ مال کی حفاظت ضروری ہے کیوں کہ اس کے ذریعے انسانی جانیں باقی رہتی ہیں لیکن مال لیا جائے تو اس کی واپسی بھی ممکن ہے اور اگر کھا لیا تو اس کا تاوان دیا جا سکتا ہے لہٰذا اس کا معاملہ اتنا بڑا نہیں ہے ہاں جب اس طریقے پر لیا ہو کہ اس کا تدارک مشکل ہو تو اب یہ گناہ کبیرہ میں سے ہونا چاہیے اور اس کے چار طریقے ہیں۔

(۱) خفیہ طریقے پر لینا جیسے چوری ہے کیوں کہ جب مالک کو اس کی اطلاع نہیں تو تدارک کیسے ہوگا۔

(۲) یتیم کا مال کھانا یہ بھی خفیہ طریقہ ہے یعنی اس کے ولی اور سرپرست کے حوالے سے خفیہ ہے کیونکہ ان کے پاس یہ مال امانت ہوتا ہے اور اب دعویٰ کرنے والا صرف وہ یتیم ہی ہوتا ہے اور وہ چھوٹا ہے اسے کوئی سمجھ نہیں ہے لہٰذا یہ بہت بڑا معاملہ ہے بخلاف کسی کا مال چھیننے کے کیوں کہ یہ ظاہر ہے اور اس کی پہچان ہو جاتی ہے اسی طرح کسی نے امانت رکھی ہو تو اس میں خیانت کی صورت میں امانت رکھنے والا دعویٰ دار ہے جو اپنے لیے انصاف کا طالب ہے۔

(۳) جھوٹی گواہی کے ذریعے کسی کے مال کو نقصان پہنچانا۔

(۴) جھوٹی قسم کے ذریعے امانت وغیرہ لینا۔

یہ وہ طریقے ہیں جن کا تدارک ممکن نہیں ہے اور نہ ان کے حرام ہونے میں شریعتوں کا اختلاف ہے البتہ ان میں سے بعض دوسری بعض کے مقابلے میں زیادہ سخت ہیں لیکن یہ تمام، دوسرے مرتبہ سے نچلے درجے میں ہیں کیوں کہ وہ جانوں سے متعلق ہے۔

ان چاروں کو گناہ کبیرہ میں شمار کرنا چاہیے اگرچہ ان میں سے بعض کے بارے میں شریعت نے سزائیں مقرر نہیں کی ہیں لیکن عام طور پر وعید آتی ہے اسزا سے ڈرایا گیا ہے اور دنیوی معاملات میں ان کی تاثیر بھی زیادہ ہے۔

جہاں تک سود کا تعلق ہے تو وہ دوسرے آدمی کا مال اس کی مرضی سے کھانا ہے لیکن شرعی اعتبار سے اس میں خلل واقع ہوتا ہے اور اس جیسے مسائل میں شریعتوں کا باہم اختلاف ہو سکتا ہے اور غصب کرنا دوسرے کا مال اس کی مرضی اور شریعت کی رضا کے بغیر کھایا جاتا ہے اس کے باوجود اسے کبیرہ گناہوں میں شمار نہیں کیا گیا جب کہ سود مالک کی مرضی سے کھایا جاتا ہے البتہ شریعت کی مرضی کے خلاف ہوتا ہے اور شریعت نے بڑی سختی کے ساتھ اس سے روکا ہے لیکن غصب وغیرہ ذریعے ظلم کو بھی بہت بڑا جرم قرار دیا گیا اور خیانت بھی بہت بڑا جرم ہے لیکن خیانت اور غصب کے ذریعے ایک دمڑی کھانے کو بھی گناہ کبیرہ قرار دینا محل نظر ہے اور یہ مقام شک ہے اور اکثر گمان کا میلان اسی طرف ہے کہ یہ گناہ کبیرہ نہ ہو بلکہ گناہ کبیرہ ان گناہوں کے ساتھ خاص ہو جن پر تمام شریعتوں کا اتفاق ہو کیوں کہ وہ ضروریات دین سے ہیں۔

تو ابو طالب مکی کے بیان کردہ کبائر سے تہمت لگانا، جادو کرنا شراب پینا، میدان جہاد سے بھاگنا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا باقی رہ گئے شراب اس لیے کہ وہ عقل کو زائل کر دیتی ہے لہٰذا وہ کبیرہ گناہوں میں سے ہونے کے زیادہ لائق ہے اس پر شریعت کی طرف سے بھی سخت سزا کا ذکر آیا ہے اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ نفس کی حفاظت کی طرح عقل کی حفاظت بھی ضروری ہے بلکہ عقل کے بغیر نفس میں کوئی بھلائی نہیں ہے لہٰذا عقل کو زائل کر دینا گناہ کبیرہ ہے لیکن یہ بات شراب کے ایک قطرے میں جاری نہیں ہوتی لہٰذا اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی شخص پانی پیئے جس میں ایک قطرہ شراب ہو تو یہ گناہ کبیرہ نہیں ہے یہ ناپاک پانی پینا ہے اور قطرۂ شراب پانی کے بغیر ہو تو اس میں شک ہے اور شراب نوشی پر شریعت

نے خدا اس لیے مقرر کی ہے کہ اس کے بہت بڑا جرم ہونے کا پتہ چلے پس شریعت میں اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا اور شریعت کے تمام اسرار پر مطلع ہونا انسانی قوت کے بس میں نہیں ہے پس اگر اجماع اس کے کبیرہ ہونے پر ثابت ہو تو اتباع واجب ہے ورنہ خاموشی کی گنجائش باقی ہے۔

جہاں تک قذف (زنا کے الزام) کا تعلق ہے تو اس میں صرف عزتوں پر حملہ ہوتا ہے اور عزتیں مال کے مقابلے میں نچلے درجہ میں ہیں اور اس کے بھی کئی مراتب ہیں سب سے بڑا الزام کسی کی طرف زنا کی نسبت کرنا ہے اور شریعت نے اسے بہت بڑی بات قرار دیا۔ اور میرا ظنِ غالب یہ ہے کہ صحابہ کرام ہر اس گناہ کو کبیرہ گناہ شمار کرتے تھے جس کی وجہ سے حد واجب ہوتی ہے۔

تو اس اعتبار سے پانچ نمازیں اس کا کفارہ نہیں بنتیں اور کبیرہ سے ہماری مراد یہی ہے۔ لیکن چونکہ یہ بات جائز ہے کہ اس میں شریعتوں کا اختلاف ہو تو محض قیاس اس گناہ کے کبیرہ اور عظیم ہونے پر دلالت نہیں کر سکتا بلکہ یوں ہو سکتا تھا کہ شریعت کہتی اگر ایک غیر فاسق شخص کسی دوسرے آدمی کو زنا کرتے ہوئے دیکھے تو اس کے لیے جائز ہوتا کہ وہ گواہی دے اور جس کے خلاف گواہی دی ہے اسے صرف اس گواہی کی وجہ سے کوڑے لگائے جاتے اور اگر اس کی گواہی قبول نہ ہوتی تو دنیوی مصالح کے حوالے سے حد لگانا ضروری نہ ہوتا اگرچہ بعض ظاہری مقاصد کے تحت ضرورت کے بعض مراتب کے حوالے سے حد لگانا اچھا ہوتا تو اس صورت میں اسے اس آدمی کے حق میں کبیرہ گناہوں کے ساتھ ملایا جا سکتا ہے جو شرعی حکم کی معرفت رکھتا ہے لیکن جسے محض یہ گمان ہو کہ وہ تنہا گواہی دے سکتا ہے یا اس کا خیال ہو کہ گواہی دے کر دوسرے کی مدد کر رہا ہے تو اس کے حق میں اسے کبیرہ گناہ نہیں کہا جا سکتا۔

جہاں تک جادو کا تعلق ہے تو اگر اس میں کفر یہ کلمات ہوں تو یہ کبیرہ گناہ ہے ورنہ اس کے جرم کا بڑا ہونا اس سے پیدا ہونے والے ضرر کے مطابق ہوتا ہے کہ اس سے کسی کی ہلاکت واقع ہوئی ہے یا کوئی بیمار ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔

میدان جنگ سے بھاگنا اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا بھی قیاس کے مطابق محل توقف میں ہیں۔ اور جب قطعی طور پر معلوم ہوا کہ لوگوں کو دی جانے والی ہر قسم کی گالی سوائے زنا کے نیز ان کو مارنا اور مال وغیرہ غصب کرنے کے بعد ان پر ظلم کرنا اور ان کو ان کے گھروں اور شہروں سے نکال کر جلاوطن کرنا کبیرہ گناہوں میں سے نہیں ہیں کیوں کہ یہاں سترہ گناہوں میں شامل نہیں ہیں جن کا ذکر ہوا ہے اور وہ سب سے زیادہ تعداد ہے جیسا کہ کہا گیا ہے تو اس میں خاموشی اختیار کرنا عقل سے بعید بات نہیں ہے لیکن چونکہ حدیث شریف ان کے کبیرہ ہونے پر دلالت کرتی ہے لہٰذا ان کو کبیرہ گناہوں کے ساتھ ملایا گیا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہمارے نزدیک کبیرہ گناہ وہ ہیں جن کا کفارہ شرعی طور پر پانچ نمازیں نہ بن سکیں اور ان میں سے بعض وہ ہیں جن کے بارے ان کو کفارہ بننا چاہیے اور بعض کے بارے میں توقف کیا جاتا ہے اور جن کے بارے میں توقف کیا جاتا ہے ان میں سے بعض کے بارے میں گمان ہے کہ وہ گناہ کبیرہ ہیں اور بعض میں شک ہے اور یہ ایسا شک ہے جسے صرف

کتاب وسنت کی واضح دلیل سے ہی زائل کیا جا سکتا ہے لہذا اس میں کوئی طمع نہیں ہو سکتا پس اس کا شک دور کرنا محال ہے۔

سوال:

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کبیرہ گناہ کی تعریف معلوم کرنا محال ہے تو جس چیز کی تعریف محال ہو شریعت کا حکم اس سے کس طرح متعلق ہو سکتا ہے۔

جواب:

دنیا میں جس چیز سے کوئی حکم متعلق نہ ہو اس میں ابہام آسکتا ہے کیونکہ آدمی عمل کا مکلف تو دنیا میں ہی ہوتا ہے اور گناہ کبیرہ پر بالخصوص اس کے کبیرہ ہونے کے حوالے سے دنیا میں کوئی حکم نہیں لگتا بلکہ جن جن گناہوں سے حد واجب ہوتی ہے وہ اپنے ناموں سے معروف ہیں جیسے چوری اور زنا وغیرہ۔

اور کبیرہ کے بارے میں یہ حکم کہ پانچوں نمازیں اس کا کفارہ نہیں بنتیں یہ آخرت کے اعتبار سے ہے اور ابہام اس کے زیادہ لائق ہے تاکہ لوگ خوف زدہ رہیں اور پرہیز کریں اور پنجگانہ نمازوں پر تکیہ کر کے صغیرہ گناہوں کی جرأت بھی نہ کریں کیونکہ ارشاد خداوندی ہے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (۱)

اور اگر تم ان کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو جن سے تمہیں روکا جاتا ہے تو ہم تم سے تمہارے (صغیرہ) گناہ مٹا دیں گے۔

لیکن کبیرہ گناہوں سے بچنا اس وقت صغیرہ گناہوں کا کفارہ بنتا ہے جب قدرت اور ارادے کے باوجود بچتا رہے جیسے ایک شخص کسی عورت سے جماع پر قادر ہونے کے باوجود اس سے جماع کرنے سے بچتا ہے اور صرف دیکھنے یا چھونے پر اکتفا کرتا ہے تو جماع سے بچنے کے سلسلے میں اس کے نفس کا مجاہدہ اس کے دل کو روشن کرنے میں اس حالت سے زیادہ موثر ہوتا ہے جب وہ اسے دیکھے تو دل تاریک ہو جائے کفارہ بننے کا یہی مطلب ہے اور اگر وہ شخص جماع کرنے پر قادر ہو یا کسی ضرورت کے تحت عاجز ہو یا طاقت تو رکھتا ہو لیکن کسی دوسرے خوف کی وجہ سے رک جائے تو یہ رکاوٹ بالکل کفارہ نہیں بن سکتی جس شخص کی طبیعت شراب پینے کو نہ چاہتی ہو حتی کہ اگر اس کے لیے مباح بھی ہو تو بھی نہیں پیتا تو اس کا یہ بچنا شراب خوری کے ابتدائی صغیرہ گناہوں سے نہیں بچاتا جیسے گانا وغیرہ سننا۔

ہاں جو شخص شراب نوشی اور مزامیر سننے کی خواہش رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ کوشش کر کے اپنے آپ کو شراب سے روکتا ہے لیکن مزامیر سے باز نہیں آتا تو اس کے نفس کا یہ مجاہدہ ہو سکتا اس کے دل سے اس اندھیرے کو مٹا دے جو مزامیر سننے کے گناہ سے پیدا ہوا ہے۔

یہ تمام آخروی احکام ہیں اور ہو سکتا ہے ان میں سے بعض محل شک میں رہیں اور متشابہات میں سے ہوں لہذا ان کی تفصیلات نص (واضح حکم) کے بغیر معلوم نہیں ہوتی اور نص میں نہ ان کی گنتی آئی ہے اور نہ ہی جامع تعریف۔ بلکہ مختلف الفاظ

آئے ہیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلصَّلٰوۃُ اِلَی الصَّلٰوۃِ کَفَّارَۃٌ وَرَمَضَانُ اِلٰی رَمَضَانَ کَفَّارَۃٌ اِلَّا مِنْ ثَلٰثٍ اِشْرَاکٌ بِاللّٰہِ وَتَرْکُ السُّنَّۃِ وَنَکْثُ الصَّفْقَۃِ۔

(ایک نماز دوسری) نماز تک اور رمضان، رمضان تک (گناہوں کا) کفارہ ہے سوائے تین گناہوں کے ایک اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا دوسری سنت کو چھوڑنا اور تیسرا سودا توڑنا۔

⁂

عرض کیا گیا یا رسول اللہ! سنت کو چھوڑنے کا کیا مطلب ہے فرمایا (مسلمانوں کی) جماعت سے نکل جانا اور سودا توڑنا یہ ہے کہ کسی شخص سے سودا طے کرکے اس کے خلاف تلوار لے کر نکل کھڑا ہو اور اس سے لڑے۔ (۱)

تو یہ اور اس قسم کے دوسرے الفاظ گناہ کبیرہ کی جامع تعریف کا احاطہ نہیں کرتے اور نہ ان کی تعداد کا احاطہ کرتے ہیں لہٰذا لامحالہ یہ مبہم رہیں گے۔

سوال:

اسی شخص کی گواہی قبول ہوتی ہے جو کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتا ہے اور قبولیتِ شہادت کے لیے صغیرہ گناہوں سے پرہیز شرط نہیں ہے تو یہ دنیوی احکام ہیں۔

جواب:

ہم شہادت کے رد کرنے کو کبیرہ گناہوں کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے اور اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو شخص مزامیر سنتا ہے یا ریشمی کپڑا پہنتا ہے سونے کی انگوٹھی پہنتا ہے اور سونے چاندی کے برتنوں میں رکھا تا) پیتا ہے اس کی گواہی بھی قبول نہیں ہوتی اور یہ کسی کا قول نہیں ہے کہ یہ امور کبیرہ گناہوں سے ہیں۔

حضرت امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب کوئی حنفی (انگور وغیرہ کا) نبیذ (رس) پیئے تو میں اسے حد لگاؤں گا لیکن میں اس کی گواہی کو رد نہیں کرتا تو انہوں نے اسے کبیرہ گناہ قرار دیا کیونکہ حد لگانے کا ذکر فرمایا لیکن اس وجہ سے اس کی گواہی کو رد نہیں کیا معلوم ہوا کہ گواہی کی قبولیت و عدم قبولیت کا تعلق صغیرہ یا کبیرہ گناہوں سے نہیں ہے بلکہ تمام گناہ انسان کی عدالت کو نقصان پہنچاتے ہیں ہاں جن گناہوں سے آدمی بچ نہ سکتا ہو کیوں کہ ان کی عادت ہو چکی ہوتی ہے جیسے غیبت، جاسوسی، بدگمانی، گفتگو میں جھوٹ، غیبت سننا نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کا عمل چھوڑ دینا شبہ والی چیزیں کھانا اولاد اور غلام کو گالی دینا اور ضرورت سے زیادہ محض غصے کی وجہ سے ان کو مارنا، ظالم بادشاہوں کی عزت کرنا، فاسق و فاجر لوگوں کی مجلس اختیار کرنا اہل و اولاد کو دین کی بنیادی ضرورتوں سے متعلق تعلیم دلانے میں سستی کرنا۔

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۵۰۶ روایات ابوہریرہ

تو یہ ایسے گناہ ہیں کہ گواہی دینے والے کا ان سے بچنا ناممکن ہے تھوڑے ہوں یا زیادہ ہاں اس طرح بچ سکتا ہے کہ لوگوں سے الگ تھلگ رہے اور محض اخروی امور کے لیے گوشہ نشینی اختیار کرے اور ایک عرصۂ دراز تک اپنے نفس کو مجاہدے میں ڈالے حتیٰ کہ لوگوں سے میل ملاپ رکھنے کے باوجود اسی طریقے پر رہے اور اگر اس قسم کے آدمی کی گواہی ہی قبول کی جائے تو اس کا ملنا مشکل ہوگا اور احکام باطل ہو جائیں گے نیز شہادت بھی نہیں دی جا سکے گی۔

جب کہ ریشمی لباس پہننا، مزامیر سننا، شطرنج وغیرہ کھیلنا شراب نوشی کے وقت شراب نوشوں کی مجلس اختیار کرنا اجنبی عورتوں کے ساتھ علیحدگی میں رہنا اور اس قسم کے صغیرہ گناہ بہت زیادہ ہیں تو شہادت کی قبولیت اور عدم قبولیت کے سلسلے میں اس قسم کے معیار کو پیش نظر رکھا جائے کبیرہ اور صغیرہ گناہوں کو معیار نہ بنایا جائے۔

پھر یہ صغیرہ گناہ جن کی وجہ سے گواہی کو رد نہیں کیا جاتا اگر بار بار ان کا مرتکب ہوگا تو اس کا شہادت کے رد کرنے پر اثر ہوگا جیسے کوئی شخص غیبت اور عیب جوئی کو اپنی عادت بنالے اسی طرح فاجر لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے اور صغیرہ گناہ، بار بار کرنے سے کبیرہ بن جاتا ہے جیسے مباح (جائز) کام بار بار کیا جائے تو وہ صغیرہ گناہ بن جاتا ہے جیسے شطرنج وغیرہ کھیلنا اور ہمیشہ ترنم کے ساتھ گانے گانا —— تو یہ صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کا بیان ہے۔

دوسری فصل:

آخرت میں جنت اور دوزخ کے درجات کی نیکیوں اور برائیوں کے اعتبار سے تقسیم

جان لو! دنیا ظاہری عالم کا نام ہے اور آخرت پوشیدہ عالم ہے اور دنیا سے مراد موت سے پہلے کی حالت ہے اور آخرت موت کے بعد کی حالت ہے پس تمہاری دنیا اور آخرت تمہاری صفات اور احوال ہیں جو ان میں سے قریب اور ملی ہوئی ہے وہ دنیا ہے اور جس میں تاخیر ہے وہ آخرت ہے اب ہم دنیا میں سے جو آخرت ہے اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں یعنی دنیا جو عالم ملک ہے ہم اس میں گفتگو کرتے ہیں لیکن ہماری غرض آخرت کی تشریح مثالوں کے بغیر نہیں ہو سکتی اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ۔ (۱)

اور یہ مثالیں ہیں جنہیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور ان کو وہی سمجھتے ہیں جو علم والے ہیں۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عالم ملکوت کے مقابلے میں عالم ملک نیند کی طرح ہے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ عنکبوت آیت ۴۳

اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوا انْتَبَهُوا۔ لوگ سوئے ہوئے ہیں پس جب مر جائیں گے تو بیدار ہوں گے (۱)

اور جو کچھ بیداری میں ہوتا ہے وہ خواب کی حالت میں مثالوں کے ذریعے ہوتا ہے جو تعبیر کے بغیر واضح نہیں ہوتا اسی طرح جو کچھ عنقریب آخرت میں ہوگا وہ دنیا کی نیند میں زیادہ مثالوں کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے یعنی خواب کی طرح ان کی پہچان بھی تعبیر سے حاصل ہوتی ہے۔

اگر تم سمجھو تو تمہارے لیے تین مثالیں ہی کافی ہیں۔

ایک شخص نے حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ کے پاس حاضر ہو کر عرض کیا میں نے دیکھا کہ گویا میرے ہاتھ میں انگوٹھی ہے جس کے ساتھ میں لوگوں کے مونہوں اور عورتوں کی شرمگاہوں پر مہر لگا رہا ہوں (اس کی تعبیر کیا ہے؟) آپ نے فرمایا تم موذن ہو اور رمضان المبارک میں طلوع فجر سے پہلے اذان دیتے ہو اس نے کہا آپ نے سچ فرمایا۔

ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے کہا میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں زیتون کا تیل زیتون میں ڈال رہا ہوں، انہوں نے فرمایا تم نے ایک لونڈی خریدی ہے اس کا حال معلوم کرو وہ تمہاری ماں ہے جو تمہارے بچپن میں قید کی گئی تھی۔

ایک اور شخص نے عرض کیا کہ میں نے دیکھا گویا میں خنزیروں کی گردنوں میں موتیوں کا ہار ڈال رہا ہوں، آپ نے فرمایا تو نااہل لوگوں کو حکمت کی تعلیم دیتا ہے ——— تو واقعی ایسا ہی تھا۔

اور تعبیر اول سے آخر تک مثالیں ہیں جو تجھے ضرب الامثال کا طریقہ بتاتی ہیں اور مثال سے ہماری مراد یہ ہے کہ معنیٰ کو ایسی صورت میں بیان کرنا کہ اگر اس کے معنیٰ کی طرف نظر کی جائے تو وہ سچ ہو اور اگر اس کی صورت کو دیکھیں تو وہ جھوٹ ہو۔

اگر موذن، مہر (انگوٹھی) کی شکل اور اس سے شرمگاہوں پر مہر لگانے کی ظاہری صورت کو دیکھے تو یہ جھوٹ ہوگا کیونکہ وہ اس سے کبھی بھی مہر نہیں لگا سکتا اور اگر اس کے معنیٰ کو دیکھا جائے تو وہ سچا ہوگا کیونکہ اس سے مہر کی روح اور معنیٰ صادر ہوا اور وہ روکنا ہے اور مہر سے بھی یہی مقصود ہوتا ہے۔ اور انبیاء کرام علیہم السلام لوگوں سے مثال کے طریقے پر گفتگو کرتے ہیں کیوں کہ ان کو اس بات کا مکلف بنایا گیا ہے کہ لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کریں اور ان کی عقل کا اندازہ یہی ہے کہ وہ سوئے ہوئے ہیں اور سونے والے کے لیے جو چیز منکشف ہوتی ہے وہ مثالی صورت میں ہوتی ہے اور جب مر جائیں گے تو بیداری کی حالت ہوگی اور انہیں معلوم ہوگا کہ وہ مثالی صورت سچی تھی۔

اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

---

(۱) الاحادیث الضعیفہ الموضوعہ جلد اول ص ۲۲۱ حدیث ۱۰۲

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ (۱)
مومن کا دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہے (جیسا اس کے شایان شان ہے)

اور یہ مثالی صورت ہے جسے صرف معرفت والے سمجھ سکتے ہیں جب کہ جاہل آدمی کی عقل کا اندازہ ظاہری مثال سے آگے نہیں بڑھ سکتا کیونکہ وہ اس تفسیر سے لاعلم ہے جسے تاویل کہا جاتا ہے جیسے خواب میں دیکھی جانے والی مثالوں کی وضاحت کو تعبیر کہا جاتا ہے تو جاہل آدمی اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ اور انگلی ثابت کرے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے اس قول سے بہت بلند بڑا ہے۔

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ۔ (۲)
بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی (یا ان کی) صورت پر پیدا فرمایا۔

کیوں کہ صورت سے رنگ اور شکل و ہیبت کا تصور آتا ہے اور یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہو رہی ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بلند ہے یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ صفات الٰہیہ کے سلسلے میں پھسل گئے حتیٰ کہ کلام کے بارے میں بھی ـــ اور انہوں نے اسے آواز اور حروف قرار دیا اسی طرح دیگر صفات کا بھی معاملہ ہے اور اس میں تفصیلی گفتگو ہے۔

اسی طرح بعض اوقات آخرت کے معاملے میں بھی مثالیں دی جاتی ہیں لیکن بے دین آدمی اسے جھٹلاتا ہے کیوں کہ اس کی نظر ظاہری مثال اور اس کے تناقض پر پڑتی ہے۔

جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

يُؤْتٰى بِالْمَوْتِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيْ صُوْرَةِ كَبْشٍ اَمْلَحَ فَيُذْبَحُ۔ (۳)
قیامت کے دن موت کو ایک سفید و سیاہ مینڈھے کی صورت میں لاکر ذبح کیا جائے گا۔

تو ملحد بیوقوف اس کو تسلیم نہیں کرتا اور جھٹلاتا ہے اور وہ اسے انبیاء کرام کو جھٹلانے کے لیے استدلال کرتا ہے اور کہتا ہے سبحان اللہ موت تو ایک عرض ہے (جو دوسری دل کے ساتھ قائم ہوتی ہے) اور مینڈھا جسم ہے تو ایک عرض (وصف) کیسے جسم میں بدل سکتا ہے اور یہ تو محال ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے بیوقوں کو اپنے اسرار کی معرفت سے الگ تھلگ رکھا ہے ارشاد فرمایا۔

---

(۱) الدر المنثور جلد ۲ ص ۸، تحت آیت ربنا لا تزغ قلوبنا

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۲۴۴ مرویات ابوہریرہ

(۳) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۹۱ کتاب التفسیر

وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ۔ (۱) اور اسے وہی سمجھتے ہیں جو اہل علم ہیں۔

اور یہ بیچارہ اتنی بات نہیں سمجھتا کہ جو آدمی کہتا ہے میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک مینڈھا لایا گیا اور کہا گیا کہ یہ وہ بیماری ہے جو شہر میں پھیلی ہوئی ہے اور اسے ذبح کر دیا جاتا ہے تو تعبیر بتانے والا کہتا ہے تم نے ٹھیک دیکھا ہے معاملہ اسی طرح ہے جس طرح تو نے دیکھا ہے اور یہ اس بات پر دلالت ہے کہ یہ بیماری ختم ہو جائے گی اور پھر کبھی نہیں آئے گی کیوں کہ جسے ذبح کیا جاتا ہے اس کے واپس آنے کی امید نہیں ہوتی اور تعبیر بتانے والے نے اس کی صحیح تصدیق کی ہے اور یہ شخص بھی اپنے خواب میں سچا ہے اور اس کی حقیقت اور اصل یہ ہے کہ جو فرشتہ خوابوں پر مقرر ہے اور یہ وہ فرشتہ ہے جو روحوں کو سوتے وقت اس بات پر مطلع کرتا ہے جو لوح محفوظ میں ہے اور وہ بات مثال کے ذریعے بتاتا ہے کیوں کہ سونے والا مثال کے بغیر سمجھ نہیں سکتا تو اس کی مثال صادق اور معنی صحیح ہے۔

تو رسل عظام بھی دنیا میں لوگوں سے اس طرح کلام کرتے ہیں کہ وہ آخرت کے مقابلے میں نیند کی حالت میں ہیں تو ان کی سمجھ تک معانی مثالوں کے ذریعے پہنچاتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور بندوں پر اس کی مہربانی ہے نیز جس بات کو مثال کے بغیر سمجھنے سے وہ عاجز ہیں اس کا ادراک آسان کر دیا تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی کہ موت کو ایک سفید و سیاہ مینڈھے کی صورت میں لایا جائے گا ایک مثال ہے تاکہ ذہنوں تک بات پہنچے اور موت سے مایوسی ہو اور دلوں میں یہ بات پیدا کر دی گئی ہے کہ وہ مثالوں سے متاثر ہوتے ہیں اور ان کے واسطہ سے معانی کا ثبوت ہوتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی قدرت کی انتہا کو یوں تعبیر فرمایا۔

كُنْ فَيَكُونَ۔ (۲) (فرماتا ہے) ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے۔

اور فوری بدلنے کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ذکر فرمایا۔

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ۔ (۳) مومن کا دل رحمٰن کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے۔

ہم نے قواعد عقائد کے ضمن میں اس کی حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے اب ہم اپنی اصل غرض کی طرف لوٹتے ہیں۔

تو نیکیوں اور برائیوں کے حوالے سے درجات اور سزاؤں کی تقسیم مثالیں بیان کئے بغیر سمجھ نہیں آتی تو جو مثال ہم بیان کرتے ہیں اس سے اس کا معنیٰ سمجھنا چاہیے صورت کی طرف نظر نہیں کرنی چاہیے تو ہم کہتے ہیں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ عنکبوت آیت ۴۳

(۲) قرآن مجید، سورۃ یٰسین آیت ۸۲

(۳)

آخرت میں لوگوں کی بہت سی اقسام ہیں وہ جنت کے درجات کے حوالے سے ہیں یا جہنم کے طبقات کے اعتبار سے خوش بختی اور بد بختی دونوں وجہ سے یہ تقسیم ہے۔ اور یہ تفاوت اور فرق شمار سے باہر ہے جس طرح دنیوی خوش بختی اور بدبختی کے لحاظ سے تفاوت ہے اور اس معنیٰ کے اعتبار سے دنیا اور آخرت میں کوئی فرق نہیں ہے کیوں کہ ملک اور ملکوت دونوں کا مدبر ایک ہی ذات ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور ازل سے اس کا جو طریقہ چلا آرہا ہے وہ بھی یکساں ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن ہم درجات کے افراد کو شمار کرنے سے عاجز ہیں البتہ ان کی جنس کو شمار کر سکتے ہیں تو ہم کہتے ہیں آخرت میں لوگ چار قسموں میں تقسیم ہوں گے (۱) ہلاک ہونے والے (۲) عذاب میں مبتلا (۳) نجات پانے والے اور کامیاب ہونے والے (ہالک، معذّب، ناجی اور فائز) دنیا میں اس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی بادشاہ کسی ملک پر قابض ہوتا ہے تو بعض لوگوں کو قتل کر دیتا ہے یہ ہلاک ہونے والے ہیں بعض کو ایک خاص مدت تک سزا دیتا ہے قتل نہیں کرتا تو یہ عذاب میں مبتلا ہیں بعض کو چھوڑ دیتا ہے تو یہ نجات پانے والے ہیں اور کچھ کو خلعت (لباس وغیرہ) عطا کرتا ہے تو یہ کامیاب ہونے والے (فائزین) ہیں اگر بادشاہ عادل ہو تو استحقاق کی بنیاد پر تقسیم کرتا ہے وہ اسی کو قتل کرتا ہے جو اس کے استحقاقِ حکومت کا منکر اور حکومت کے حوالے سے اس کا دشمن ہو اور سزا اسی کو دے گا جو اس کی حکومت اور بلندیٔ درجہ کا اعتراف کرتا ہے لیکن اس کی خدمت میں کوتاہی کرتا ہے رہائی اسے دیتا ہے جو اس کے منصب کا اعتراف کرتا ہے اور اس میں کوتاہی نہیں کرتا کہ اسے سزا دے البتہ اس کی خدمت نہیں کرتا کہ اسے خلعت عطا کرے۔ اور خلعت اسے ہی دیتا ہے جو اپنی تمام عمر اس کی خدمت اور مدد میں صرف کر دیتا ہے پھر کامیاب ہونے والوں کی خلعتوں میں بھی فرق ہونا چاہیے یعنی خدمت کے اعتبار سے ان کے درجات کو سامنے رکھا جائے جب کہ ہلاک ہونے والوں کو ہلاک کرنا یا تو حقیقتاً گردن مارنے سے ہوتا ہے یا اعضاء کاٹنے کے ذریعے سزا دی جاتی ہے گویا دشمنی کے درجات کے اعتبار سے ہلاکت میں بھی فرق ہوگا۔

اور جن کو سزا دی جاتی ہے ان کی سزا میں بھی فرق ہوتا ہے کسی کو سخت کسی کو ہلکی پھلکی نیز کسی کو زیادہ مدت اور کسی کو تھوڑی مدت کی سزا ہوتی ہے یعنی ان کی کوتاہی کے درجات کے اعتبار سے تفریق ہوگی۔

ان مراتب میں سے ہر مرتبہ بے شمار درجات میں تقسیم ہوتا ہے تو اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ آخرت میں بھی لوگوں کے درجات میں فرق ہوگا کوئی ہلاک ہوگا کوئی ایک مدت تک عذاب میں مبتلا ہوگا کوئی نجات پا کر سلامتی کے گھر میں جائے گا اور کوئی کامیاب ہوگا اور کامیاب ہونے والے کئی درجات میں تقسیم ہوں گے بعض جنت عدن میں جائیں گے کوئی جنت الماویٰ اور کوئی جنت الفردوس کا مستحق ہوگا۔ اور جن کو عذاب ہوگا وہ بھی مختلف درجات میں تقسیم ہوں گے کسی کو تھوڑا عذاب ہوگا کسی کو ایک ہزار سال اور کسی کو سات ہزار سال۔ اور یہ وہ شخص ہے جو جہنم سے سب سے آخر میں نکلے گا جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے (۱)

اسی طرح ہلاک ہونے والے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہوں گے ان کے طبقات میں بھی فرق ہے اور ایسا درجاتِ عبادات اور گناہوں میں اختلاف کے باعث ہوگا اب ہم اس تقسیم کی کیفیت ذکر کرتے ہیں۔

پہلا مرتبہ :

یہ ہلاک ہونے والوں کا درجہ ہے اور ہلاک ہونے والوں سے ہماری مراد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونے والے ہیں کیونکہ جو مثال ہم نے بیان کی ہے اس میں جس کو بادشاہ نے قتل کیا وہ اس بات سے مایوس ہوگیا کہ بادشاہ اس سے راضی ہوگا اور اس کی عزت کرے گا تو مثال کے معانی سے تمہیں غافل نہیں ہونا چاہیے اور یہ درجہ ان لوگوں کا ہے جو منکر ہیں اور منہ پھیرتے ہیں وہ صرف دنیا کے ہو کر رہ گئے اور وہ اللہ تعالیٰ اس کے رسولوں اور کتابوں کو جھٹلاتے ہیں کیونکہ اخروی سعادت تو اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی زیارت ہے اور اس کا حصول صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب وہ معرفت حاصل ہو جس کو ایمان اور تصدیق کہتے ہیں۔ اور اس کا انکار کرنے والے منکر ہیں اور جو لوگ جھٹلانے والے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو تمام جہانوں کے رب اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں اور وہ اس دن لازماً اس سے پردے میں ہوں گے اور جو بھی اپنے محبوب سے جدا رہتا ہے اس کے اور اس کی خواہشات کے درمیان لازماً حجاب ہوتا ہے تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے فراق میں نارِ جہنم میں جلتے رہیں گے اسی لیے عارفین فرماتے ہیں ہمیں نہ تو جہنم کا خوف ہے اور نہ ہی حورِ عین کی امید ہمارا مقصود تو ملاقات ہے اور گریز صرف حجاب سے ہے اور وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی عوض کی خاطر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے وہ کمینہ ہے گویا وہ جنت کے حصول یا جہنم سے بچنے کے لیے عبادت کرتا ہے بلکہ عارف تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے عبادت کرتا ہے اور اس کا مقصود بھی صرف ذاتِ خداوندی ہوتی ہے جہاں تک حورِ عین اور جنتی میووں کا تعلق ہے تو وہ ان کی خواہش نہیں رکھتا اور آگ سے بھی نہیں ڈرتا کیوں کہ جب فراق کی آگ غالب آتی ہے تو وہ اس آگ پر غالب آجاتی ہے جو جسموں کو جلاتی ہے فراق کی آگ اللہ تعالیٰ کی وہ آگ ہے جو دلوں پر چڑھتی ہے اور جہنم کی آگ کے شعلے صرف جسموں تک محدود ہوتے ہیں اور جب دل میں تکلیف ہو تو جسم کی تکلیف معمولی معلوم ہوتی ہے اسی لیے کہا گیا ہے۔

وَفِیْ فُؤَادِ الْمُحِبِّ نَارُ جَوًی اَحَرُّ نَارِ الْجَحِیْمِ اَبْرَدُھَا۔

اور محب کے دل میں محبت کی آگ ہے جس کے مقابلے میں جہنم کے گرم ترین آگ بھی سرد تر ہے۔

اور عالم آخرت میں اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ دنیا میں اس کی نظیر ہے جس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے دیکھا گیا ہے کہ جس پر وجد (غلبہ عشق) طاری ہوتا ہے وہ آگ اور پاؤں کو زخمی کرنے والے کانٹوں پر بھی چلتا ہے لیکن اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا کیوں کہ اس کے دل کی حالت غالب ہوتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ جس شخص کو لڑائی کی حالت میں غصہ آتا ہے اور اسے کئی زخم آتے ہیں تو اسے اس وقت پتہ نہیں چلتا کیونکہ غصہ ایک قلبی آگ کا نام ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلْغَضَبُ قِطْعَۃٌ مِّنَ النَّارِ۔ (۱) غصہ، آگ کا ایک ٹکڑا ہے

اور جسم کے جلنے سے دل کا جلنا زیادہ سخت ہوتا ہے اور جو چیز زیادہ سخت ہو وہ کمزور کے احساس کو باطل کر دیتی ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو۔ تو آگ اور تلوار سے ہلاکت صرف دو ٹکڑوں کو الگ کرتی ہے جو ظاہر میں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں اور جسمانی رابطہ جس قدر ممکن ہے ان کے درمیان تھا تو جو شخص دل اور اس کے محبوب کے درمیان جدائی ڈالتا ہے تو وہ زیادہ تکلیف پہنچاتا ہے بشرطیکہ آدمی صاحب بصیرت اور ذی شعور ہو کیونکہ یہ تعلق جسمانی پیوستگی سے زیادہ سخت ہوتا ہے اور یہ بات، بعید از عقل نہیں ہے کہ جو دل سے خالی ہے وہ اس تکلیف کا ادراک نہ کر سکے اور جسمانی تکلیف کے مقابلے میں اسے ہلکا سمجھے۔

اگر بچے کو اختیار دیا جائے کہ بادشاہت یا گیند بلے میں سے کسی ایک کو چھوڑ دے تو وہ بادشاہی سے محرومی کو بالکل محسوس نہیں کرے گا اور نہ ہی اسے اپنے لیے تکلیف سمجھے گا اور وہ کہے گا کہ مجھے گیند کے ساتھ میدان میں دوڑنا بادشاہی کے ہزار تخت سے بہتر ہے اگرچہ اس میں بیٹھنا ہی ہو بلکہ جس آدمی پر پیٹ کی خواہش غالب ہو اگر اسے ہریسہ اور حلوہ کھانے یا ایسا کام کرنے کے درمیان اختیار دیا جائے جس سے دشمن مغلوب ہوتا ہے اور دوست خوش ہوتے ہیں تو وہ ہریسہ اور حلوہ کھانے کو ترجیح دے گا اور یہ تمام باتیں اس لیے ہیں کہ اس شخص میں وہ باتیں نہیں ہیں جن کے ذریعے جاہ و مرتبہ محبوب ہوتا ہے۔ اور نہ وہ بات ہے جس کے پائے جانے سے کھانا لذیذ معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ ان لوگوں کے لیے جن کو جانوروں اور درندوں کی صفات اپنا غلام بنا لیتی ہیں اور ان میں فرشتوں کی صفات ظاہر نہیں ہوتیں جو ان کی ضد ہیں اور ان کے لائق صرف اللہ تعالیٰ کے قرب کی لذت ہے اور اس سے بعد اور حجاب تکلیف دہ ہوتا ہے۔

اور جس طرح قوت ذائقہ صرف زبان میں اور قوت سماعت صرف کانوں میں ہوتی ہے اسی طرح یہ صفات بھی صرف دل سے تعلق رکھتی ہیں اور جو دل سے محروم ہے اس میں یہ احساس نہیں ہوتا جیسے کوئی شخص سماعت اور بصارت سے محروم ہو تو وہ خوش آوازی اور اچھی صورتوں اور رنگوں کی لذت نہیں پا سکتا اور ہر شخص کے پاس دل نہیں ہوتا اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی صحیح نہ ہوتا ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ۔ (۲) بے شک اس (قرآن) میں اس شخص کے لیے نصیحت ہے جس کے پاس دل ہے۔

---

(۱) جامع ترمذی ص ۳۱۹، ابواب الفتن (۲) قرآن مجید، سورۂ ق آیت ۳۷

اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو دل سے مفلس قرار دیا جو قرآن پاک سے نصیحت حاصل نہیں کرتا اور اس دل سے وہ (گوشت کا لوتھڑا) مراد نہیں جسے سینے کی ہڈیوں نے گھیر رکھا ہے بلکہ اس سے وہ لطیفہ مراد ہے جو عالم امر سے تعلق رکھتا ہے اور یہ وہ گوشت ہے کہ اس کا عرش عالم خلق سے ہے سینہ اس کی کرسی ہے اور تمام اعضاء اس کا جہاں اور مملکت ہے اور خلق و امر کا مالک، اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن یہ لطیفہ جس کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے۔

قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّي۔ (۱) آپ فرما دیجئے روح میرے رب کے حکم میں سے ہے

یہ امیر اور بادشاہ ہے کیونکہ عالم امر اور عالم خلق کے درمیان ترتیب ہے اور عالم امر، عالم خلق پر امیر ہے اور یہی وہ لطیفہ ہے کہ جب یہ درست ہو تو تمام جسم درست ہوتا ہے اور جس نے اسے پہچان لیا اس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اور جس نے اپنے نفس کی پہچان حاصل کی اسے اس کے رب کی پہچان حاصل ہو گئی۔

اس وقت بندہ اس معنیٰ کی ادنیٰ خوشبو سونگھ لیتا ہے جو (معنی) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں لپٹا ہوا ہے آپ نے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ۔ (ترجمہ اور حوالہ پیچھے گزر چکا ہے)

ایک جماعت اس کے ظاہری لفظ کو اٹھائے پھرتی ہے اور دوسرا گروہ اس کی تاویل کے راستے میں بھٹک رہا ہے اللہ تعالیٰ ان دونوں پر رحم فرمائے اگرچہ اس کی تاویل میں بھٹکنے والوں کے مقابلے میں ظاہری لفظ پر محمول کرنے والے زیادہ رحم کے مستحق ہیں کیونکہ رحمت مصیبت کے مطابق ہوتی ہے اور ان لوگوں کی مصیبت زیادہ ہے اگرچہ حقیقت امر سے محرومی کی مصیبت میں دونوں شریک ہیں، حقیقت تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے اور یہ اس کی حکمت ہے اس کے ساتھ جسے چاہے خاص کر لیتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی اسے بہت زیادہ بھلائی عطا کی گئی۔

اب ہم اصل غرض کی طرف لوٹتے ہیں اور اس طرف لگام کو پھیرتے ہیں جو علوم معاملات سے اعلیٰ ہے اور اس کتاب میں ہمارا مقصود یہی ہے یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ ہلاکت صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو جاہل بھی ہیں اور جھٹلانے والے بھی، اور اس پر قرآن و سنت کی اس قدر شہادت موجود ہے جو شمار سے باہر ہے اسی لیے ہمیں ان کے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسرا مرتبہ:

یہ ان لوگوں کا رتبہ ہے جن کو عذاب دیا جائے گا اور یہ اصل ایمان کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں لیکن اس کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں کیونکہ ایمان کی بنیاد اور اصل توحید ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرے اور جو آدمی اپنی

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ اسراء آیت ۸۵

خواہش کی پیروی کرتا ہے اس نے اپنی خواہش کو معبود بنالیا وہ زبان سے توحید کا قائل ہے لیکن حقیقت میں موحد نہیں ہے بلکہ "لا الہ الا اللہ" کا معنیٰ ان دو آیتوں میں بیان ہوا ہے ارشاد خداوندی ہے۔

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ۔ آپ فرما دیجئے "اللہ ہے" پھر ان لوگوں کو ان کی بیہودگیوں میں کھیلتا ہوا چھوڑ دیں۔ (۱)

مطلب یہ ہے کہ غیر اللہ کو بالکل چھوڑ دیں۔ اور ارشاد خداوندی ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا۔ وہ لوگ جنہوں نے کہا ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ ثابت قدم رہے۔ (۲)

اور جب صراط مستقیم کہ اس پر استقامت کے بغیر توحید مکمل نہیں ہوتی بال سے بھی زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اور اس پل صراط کی طرح ہے جو آخرت میں ہوگا تو کوئی بھی شخص اس پر استقامت سے ادھر اُدھر ہونے سے بچ نہیں سکتا اگرچہ تھوڑا سا ہی ہو، کیونکہ کوئی شخص خواہشات کی اتباع سے خالی نہیں ہوتا اگرچہ کم ہی ہو اور یہ بات کمال توحید میں اس قدر نقص پیدا کرتی ہے جس قدر وہ صراط مستقیم سے ادھر اُدھر ہوتا ہے اور اس سے لامحالہ قرب کے درجات میں کمی آتی ہے اور ہر نقصان کے ساتھ دو قسم کی آگ ہے ایک اس کمال سے جدائی کی آگ جو اس کمی کی وجہ سے ناقص ہو گیا اور دوسری جہنم کی آگ جیسا کہ قرآن پاک نے اسے بیان کیا ہے تو جو آدمی بھی صراط مستقیم سے اِدھر اُدھر ہوتا ہے وہ دو وجہ سے دو مرتبہ عذاب میں مبتلا ہوتا ہے لیکن عذاب کی شدت اور نرمی اور مدت کے اعتبار سے اس میں تفاوت دو باتوں کی وجہ سے ہوتا ہے ایک ایمان کی قوت وضعف اور خواہشات کی زیادہ اور کم اتباع کی وجہ سے —— کیونکہ عام طور پر کوئی بھی شخص ان دو باتوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہوتا ارشاد خداوندی ہے:

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا۔ (۳)

اور تم میں سے ہر ایک کا اس (دوزخ) پر گزر ہوگا یہ آپ کے رب کا حتمی فیصلہ ہے پھر ہم ان لوگوں کو نجات دیں گے جو پرہیزگار رہیں اور ظالموں کو دوزخ میں چھوڑ دیں گے کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔

اسی لیے بزرگوں میں سے جو لوگ ڈرنے والے تھے وہ کہتے تھے ہمارا خوف اس وجہ سے ہے کہ ہمیں جہنم کے اوپر

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ انعام آیت ۹۱

(۲) قرآن مجید، سورۃ فصلت آیت ۳۰

(۳) قرآن مجید، سورۃ مریم آیت ۷۱، ۷۲

سے گزرنے کا یقین ہے جب کہ نجات میں شک ہے جب حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے وہ حدیث بیان کی جس میں اس شخص کا حال بیان ہوا جو دوزخ سے ہزار سال بعد نکلے گا اور وہ پکارے گا اے حنان اے منان ! (اے بہت رحم فرمانے اور بہت احسان فرمانے والے) حضرت حسن نے فرمایا کاش وہ شخص میں ہوتا۔ (۱)

جان لو، حدیث شریف سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جہنم سے سب سے آخر میں نکلنے والا شخص سات ہزار سال بعد نکلے گا البتہ ایک لحظہ اور سات ہزار سال کے درمیان مدت میں اختلاف ہے حتیٰ کہ بعض جہنم کے اوپر سے بجلی کی چمک کی طرح گزر جائیں گے اور وہ وہاں ٹھہریں گے نہیں۔ ایک لحظہ اور سات ہزار سال کے درمیان چھ مختلف درجے ہوں گے ایک دن، پھر ایک ہفتہ پھر ایک مہینہ اور باقی تمام مدتیں۔

اختلاف شدت میں ہے جس کی سب سے زیادہ شدت بے انتہا ہوگی اور کم از کم یہ کہ حساب میں الجھا دیا جائے گا جس طرح بادشاہ کام میں کوتاہی کرنے والے بعض لوگوں کو حساب میں الجھا دیتا ہے اور پھر معاف کر دیتا ہے اور بعض اوقات کوڑوں سے مارتا ہے اور کبھی مختلف قسم کی سزائیں دیتا ہے ـــــ عذاب کے سلسلے میں ایک تیسرا اختلاف ہے جس کا مدت اور شدت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ عذاب کی انواع کا اختلاف ہے کیوں کہ جس شخص کو مالی جرمانہ ہوا وہ اس کی طرح نہیں جس کا مال ضبط ہوا، اولاد قتل ہوئی، عورتیں لونڈیاں بنائی گئیں رشتہ داروں کو سزا دی گئی اور مارا گیا زبان، ہاتھ ناک اور کان وغیرہ کاٹے گئے تو جس طرح دنیا میں مختلف قسم کی سزائیں ہیں اسی طرح آخرت میں بھی مختلف سزائیں ہوں گی جن پر شریعت کے قطعی دلائل پائے جاتے ہیں اور یہ ایمان کی قوت وضعف، عبادت کی کثرت و قلت نیز گناہوں کی کثرت و قلت کے اعتبار سے ہے۔

عذاب کی سختی گناہوں کے زیادہ قبیح اور کثرت کی وجہ سے ہے اور عذاب کی کثرت گناہوں کی کثرت کے باعث ہے اور اس کی انواع کا مختلف ہونا گناہوں کی انواع کے اختلاف کے سبب سے ہے یہ بات ارباب قلوب پر قرآن پاک کے شواہد اور نور ایمان سے منکشف ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۔ (۲) اور تمہارا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (۳) آج ہر نفس کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا۔

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۲۳۰ مرویات انس

(۲) قرآن مجید سورہ فصلت آیت ۴۶

(۳) قرآن مجید سورۃ غافر آیت ۱۷

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۔ (۱)

اور انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کوشش کی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ۔ (۲)

پس جو آدمی ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بھی برائی کرے گا اسے دیکھ لے گا۔

اور ان کے علاوہ آیات واحادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ عذاب اور ثواب ، اعمال کا بدلہ ہے ۔ اور دونوں صورتوں میں عدل ہی ہے ظلم نہیں ہے جب کہ رحمت اور عفو ودرگزر کی جانب کو ترجیح ہے اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بارے میں یوں بتایا۔

سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ غَضَبِیْ ۔ (۳)

میری رحمت ، میرے غضب ، سے سبقت لے گئی۔

اور ارشاد خداوندی ہے :

وَاِنْ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفْھَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْہُ اَجْرًا عَظِیْمًا ۔ (۴)

اور اگر وہ نیکی ہو تو وہ اسے بڑھاتا ہے اور اپنی طرف سے بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔

تو یہ امور یعنی درجات اور طبقات کا نیکیوں اور گناہوں سے مربوط ہونا شریعت کے قطعی دلائل اور نورِ معرفت سے معلوم ہوا اور تفصیل صرف ظن غالب سے معلوم ہوتی ہے اور اس کی دلیل احادیث کا ظاہر اور ایک قسم کا الہام ہے جو عبرت کی نگاہ سے دیکھنے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔

تو ہم کہتے ہیں کہ جس شخص کا اصل ایمان مضبوط ہو اور وہ کبیرہ گناہوں سے بچے تمام فرائض یعنی پانچوں ارکان اسلام اچھی طرح ادا کرے اور اس سے صادر ہونے والے گناہ صرف صغیرہ ہوں اور وہ بھی متفرق ہوں اور ان پر اصرار نہ کرے تو ہوسکتا ہے اس سے صرف حساب وکتاب ہی ہو کیونکہ جب اس کا حساب ہوگا تو نیکیاں ، گناہوں کے مقابلے میں وزنی ہوں گی کیوں کہ حدیث شریف میں ہے کہ پانچ نمازیں جمعۃ المبارک (کی نماز) اور رمضان المبارک کے روزے درمیان والے گناہوں کا کفارہ ہیں اسی طرح قرآن پاک کی رو سے کبیرہ گناہوں سے اجتناب بھی صغیرہ گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے اور کفارہ

---

(۱) قرآن مجید سورۃ النجم آیت ۳۹

(۲) قرآن مجید ، سورۃ زلزال آیت ۷ ، ۸

(۳) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۵۶ کتاب التوبۃ

(۴) قرآن مجید سورۃ نساء آیت ۴۰

کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ اگر حساب، سے نہ بھی بچے عذاب سے محفوظ رہتا ہے اور جس آدمی کی یہ حالت ہو اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوتا ہے پس مناسب ہے کہ میزان میں نیکیوں کے وزنی ہونے اور حساب سے فراغت کے بعد پسندیدہ زندگی میں ہو۔

ہاں اس کا اصحاب یمین (دائیں جانب والوں) یا مقربین سے لاحق ہونا اور جنت عدن یا جنت الفردوس میں جانا ایمان کی اقسام پر منحصر ہے کیوں کہ ایمان دو قسم کا ہے ایک تقلیدی ایمان جیسے عوام کا ایمان ہے کہ وہ جو کچھ سنتے ہیں اس کی تصدیق کر کے ڈٹ جاتے ہیں اور دوسرا کشفی ایمان ہے جو اللہ تعالیٰ کے نور سے سینے کے کھل جانے سے حاصل ہوتا ہے حتیٰ کہ تمام موجودات اس پر اپنی حقیقت کے ساتھ منکشف ہو جاتی ہیں۔

معلوم ہوا کہ تمام کا لوٹنا اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کیونکہ (حقیقی) وجود تو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات و افعال کا ہے۔ اور اس قسم کے لوگ مقربین ہیں جو جنت الفردوس میں جاتے ہیں اور وہ ملاء اعلیٰ (بلند مرتبہ فرشتوں) کے زیادہ قریب ہوتے ہیں ان کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے بعض سابقون ہیں بعض ان سے نچلے درجہ میں ہیں اور ان کے درجات میں فرق اس سبب سے ہے کہ ان کو حاصل ہونے والی معرفتِ خداوندی میں بھی تفاوت ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت کے سلسلے میں عارفین کے درجات بے شمار ہیں کیونکہ جلالِ الٰہی کی حقیقت کا ادراک ناممکن ہے اور معرفت کے سمندر کا نہ کوئی ساحل ہے اور نہ ہی گہرائی، اور اس میں غوطہ لگانے والے اپنی اپنی قوت کے حساب سے غوطہ لگاتے ہیں نیز جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ازل میں لکھ دیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف راستے کی منازل بے انتہا ہیں اس سبب اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلنے والوں کے درجات بھی بے حساب ہیں۔

اور وہ مومن جن کا ایمان تقلیدی ہے اور ان کا درجہ مقربین کے درجہ سے کم ہے ان کے بھی کئی درجات ہیں اصحابِ یمین کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ان کا رتبہ مقربین کے درجات میں سے ادنیٰ درجہ کے قریب ہوتا ہے یہ ان لوگوں کا حال ہے جو تمام کبیرہ گناہوں سے بچتے ہیں اور تمام فرائض ادا کرتے ہیں یعنی پانچوں فرائض ادا کرتے ہیں اور وہ زبان سے کلمہ شہادت ادا کرنا اور نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج ہے۔

لیکن جو شخص ایک یا زیادہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے یا بعض ارکان اسلام کو چھوڑ دیتا ہے اگر وہ مرنے سے پہلے اچھی طرح توبہ کرے تو وہ ان لوگوں سے مل جائے گا جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب نہیں ہوتے کیوں کہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے جیسے گناہ نہ کرنے والا۔ اور دھلا ہوا کپڑا ایسا ہو جاتا ہے جیسے کبھی وہ میلا ہوا ہی نہیں۔

اور اگر وہ توبہ کرنے سے پہلے مر جائے تو موت کے وقت اس کے حال کا خوف ہے کیونکہ بعض اوقات گناہوں پر اصرار کی صورت میں آنے والی موت ایمان کے متزلزل ہونے کا باعث بنتی ہے اور اس طرح اس کا خاتمہ بُرا ہوتا ہے خاص طور پر جب کہ اس کا ایمان تقلیدی ہو کیوں کہ تقلید اگرچہ کتنی ہی پختہ کیوں نہ ہو ادنیٰ شک اور خیال سے ڈھیلی پڑ جاتی ہے

جب کہ عارف بصیر اس بات سے زیادہ دُور ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں بُرے خاتمہ کا ڈر ہو۔

اور یہ دونوں اگر ایمان پر فوت ہوں تو بھی عذاب کا خوف ہوتا ہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دے اور یہ عذاب حساب و کتاب کے مناقشہ سے زیادہ ہوتا ہے اور جس قدر گناہوں پر اصرار کی مدت زیادہ ہوتی ہے اسی قدر عذاب بھی زیادہ ہوتا ہے اور شدت کی بنیاد کبیرہ گناہوں کی برائی کے حساب سے ہوتی ہے اسی طرح گناہوں کی مختلف اقسام عذاب کی شدت میں تفاوت پیدا کرتی ہیں اور جب عذاب کی مدت ختم ہو جاتی ہے تو تقلیدی ایمان والے اصحاب یمین کے درجات میں اور عارفین اعلیٰ علیین میں جاتے ہیں ایک حدیث شریف میں ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

آخِرُ مَنْ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ يُعْطٰى مِثْلَ الدُّنْيَا كُلِّهَا عَشْرَةَ اَضْعَافٍ۔ (۱)

جو شخص جہنم میں سے سب سے آخر میں نکلے گا اسے تمام دنیا کی مثل دس گنا دیا جائے گا۔

تمہیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اس سے جسمانی پیمائش مراد ہے کہ ایک کوس کی جگہ دو اور دس کی جگہ بیس کوس ہوں مثال کے طور پر اسے بیان کرنے میں لاعلمی ہے بلکہ اس کو اس طرح سمجھیں جس طرح کوئی شخص کہتا ہے کہ اس نے ایک اونٹ لیا اور اسے اس کی مثل دے دیئے گویا ایک اونٹ جب دس دینار کے مقابلے میں ہو تو اس آدمی نے ایک سو دینار دیئے اور اگر اس سے وزن اور بوجھ میں ہی مثل سمجھے تو اگر ترازو کے ایک پلڑے میں ایک سو دینار رکھے دسویں حصے کے برابر بھی نہیں ہو سکتے بلکہ اجسام کے معانی اور ارواح کا مقابلہ ہوتا ہے شکلوں اور جسموں کا نہیں کیوں کہ اونٹ اپنے بوجھ، طول اور عرض وغیرہ کی وجہ سے نہیں بلکہ مالیت کی وجہ سے مقصود ہوتا ہے تو اس کی رُوح مالیت ہے جب کہ اس کا جسم گوشت اور خون ہے اور ایک سو دینار اس کی دس مثل اس صورت میں بنتے ہیں جب رُوحانی موازنہ کیا جائے جسمانی موازنہ سے نہیں اور جو شخص سونے اور چاندی سے مالیت کی رُوح کو پہچانتا ہے اس کے نزدیک یہ بات سچی ہے بلکہ اگر اسے ایک جوہر دیا جائے جس کا وزن ایک مثقال ہو جب کہ اس کی قیمت ایک دینار ہو اور وہ کہے کہ میں نے اسے اس کی دس مثل دیا تو وہ سچا ہوگا لیکن اس بات کی سچائی صرف جوہریوں کو معلوم ہوتی ہے کیونکہ جوہریت کی رُوح صرف آنکھ سے نہیں دیکھی جا سکتی بلکہ آنکھ کے پیچھے ایک دانائی ہوتی ہے اسی طرح بچہ بلکہ دیہاتی آدمی بھی اسے جھٹلاتا ہے اور کہتا ہے یہ جوہر تو ایک پتھر ہے جس کا وزن ایک مثقال ہے جب کہ اونٹ کا وزن اس سے ہزار گنا زیادہ ہے تو یہ شخص جو کہتا ہے کہ میں نے دس گنا دیا، جھوٹ بولتا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ بچہ جھوٹ بول رہا ہے لیکن اس کے نزدیک اس بات کی تحقیق کا یہی ایک راستہ ہے کہ وہ بلوغت اور عقل کے کامل ہونے کا انتظار کرے اور اس کے دل میں وہ نور آجائے جس کے ذریعے وہ جواہر اور باقی تمام اموال کی ارواح کا ادراک کر سکے اس وقت اس کے لیے سچائی منکشف ہوگی اور

---

(۱) صحیح مسلم جلد اول ص ۱۰۵ کتاب الایمان

عارف آدمی، مقلد کوتاہ بین کو یہ بات سمجھا نہیں سکتا کہ اس موازنہ کے سلسلے میں یہ حدیث سچی ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلْجَنَّۃُ فِی السَّمٰوَاتِ۔ (۱) جنت آسمانوں میں ہے۔

اور آسمان دینوی ہیں تو پھر دنیا میں اس کی اپنی دس مثل کس طرح آسکتی ہیں یہ بات جس طرح ایک بالغ آدمی بچے کو نہیں سمجھا سکتا اور نہ ہی کسی دیہاتی کو ـــــ

اور جس طرح جوہری کو کسی دیہاتی کو سمجھانا پڑ جائے تو وہ قابلِ رحم ہوتا ہے اسی طرح اس موازنہ کے سمجھانے کے سلسلے میں عارف بھی قابلِ رحم ہوتا ہے جب اسے کسی بیوقوف کو یہ موازنہ سمجھانا پڑ جائے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِرْحَمُوْا ثَلَاثَۃً عَالِمًا بَیْنَ الْجُھَّالِ وَغَنِیَّ قَوْمٍ افْتَقَرَ وَعَزِیْزَ قَوْمٍ ذَلَّ۔ (۲) تین آدمیوں پر رحم کرو عالم جو جاہلوں کے درمیان ہو محتاج قوم کے درمیان مال دار اور ذلیل قوم کے درمیان معزز آدمی۔

اس اعتبار سے انبیاء کرام علیہ السلام امت کے درمیان قابلِ رحم ہوتے ہیں کہ امت کی عقل کی کمی کے باعث جو کچھ ان کو برداشت کرنا پڑا وہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش تھی جو تقدیر ازلی کے طور پر ان پر آپڑی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کا یہی مطلب ہے۔ آپ نے فرمایا۔

اَلْبَلَاءُ مُوَکَّلٌ بِالْاَنْبِیَاءِ ثُمَّ الْاَوْلِیَاءِ ثُمَّ الْاَمْثَلِ فَالْاَمْثَلِ۔ (۳) انبیاء کرام علیہ السلام کو آزمائشوں میں ڈالا گیا پھر اولیاء کرام کو پھر ان کے مشابہ اس کے بعد ان جیسے لوگوں کو (آزمایا گیا)

تمہیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ آزمائش تو صرف حضرت ایوب علیہ السلام پر ہی نازل ہوئی اور آپ کو جسمانی طور پر مبتلا کیا گیا حالانکہ حضرت نوح علیہ السلام کو بھی آزمائش میں ڈالا گیا اور وہ بہت بڑی آزمائش تھی کیونکہ آپ کو ایک ایسی جماعت کے ساتھ آزمایا گیا جو آپ کی دعوت سے مزید بھاگتے تھے اسی لیے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض لوگوں کی باتوں سے اذیت پہنچی تو آپ نے فرمایا۔

رَحِمَ اللّٰہُ اَخِیْ مُوْسٰی لَقَدْ اُوْذِیَ بِاَکْثَرَ مِنْ ھٰذَا فَصَبَرَ۔ (۴) اللہ تعالیٰ میرے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے بے شک انہیں اس سے بھی زیادہ اذیت دی گئی لیکن انہوں نے صبر کیا۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد اول ص ۴۸۳ کتاب الانبیاء

(۲) الموضوعات لابن الجوزی جلد اول ص ۲۲۶ باب الرحمۃ للعالم

(۳) المستدرک للحاکم جلد ۳ ص ۳۴۳ کتاب معرفۃ الصحابۃ۔

(۴) صحیح بخاری جلد اول ص ۴۸۲ کتاب الانبیاء

توکوئی بھی منکرین کے ذریعے ابتلاء و آزمائش سے خالی نہیں رہا اور اولیاء و علماء کی آزمائش جاہلوں کے ذریعے ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اولیاء کرام طرح طرح کی ایذا اور مختلف قسم کی آزمائشوں سے خالی نہیں ہوتے۔ انہیں ملک بدر کر دیا جاتا ہے حکمرانوں کے سامنے ان کی چغلی کھائی جاتی ہے ان کے خلاف کفر کی گواہی دی جاتی ہے اور کچھ لوگ دین چھوڑ جاتے ہیں اور یہ بات ضروری ہے کہ اہل معرفت، جاہلوں کے نزدیک کافروں میں شمار ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنا بہت بڑا اونٹ چھوٹے سے موتی کے بدلے میں دے دے تو جاہل لوگوں کے نزدیک یہ فضول خرچی اور مال ضائع کرنا ہے۔

جب تم نے یہ باریک باتیں معلوم کر لیں تو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات پر ایمان رکھنا چاہیے کہ جو شخص جہنم سے آخر میں نکلے گا اس کو دنیا کا دس گنا دیا جائے گا اور تمہیں تصدیق کو ایسی باتوں پر منحصر کرنے سے بچنا چاہیے جن کا ادراک محض آنکھ اور دیگر حواس سے ہوتا ہے اس طرح تو دو پاؤں والا گدھا شمار ہوگا کیوں کہ حواس خمسہ میں گدھا تمہارے ساتھ شریک ہے جب کہ تو ان اسرارِ الٰہیہ کے باعث گدھے سے ممتاز ہے جن کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر ڈالا گیا تو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈر گئے۔ تو جو بات حواس خمسہ کے ادراک سے باہر ہو وہ اس عالم سِر سے تعلق رکھتی ہے جس کی وجہ سے انسان، گدھے اور باقی جانوروں سے ممتاز ہوتا ہے۔

تو جو شخص اس بات کو بھول جائے اور چھوڑ دے اور صرف جانوروں کے درجہ پر قناعت کرے اور محسوسات سے آگے نہ بڑھے وہ اس کوتاہی کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے تو تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا تو اس نے ان کو ان کے نفسوں سے غافل کر دیا تو جو شخص صرف اسی چیز کا ادراک کرتا ہے جس کا تعلق حواس ظاہرہ کے ساتھ ہے اس نے اللہ تعالیٰ کو بھلا دیا کیوں کہ اس عالم میں اللہ تعالیٰ کو حواس کے ذریعے معلوم نہیں کر سکتے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو بھلا دیتا ہے یقیناً وہ اسے خود اس کی اپنی ذات سے غافل کر دیتا ہے وہ جانوروں کے مقام پر اتر آتا ہے اور ملاءِ اعلیٰ کی طرف ترقی رک جاتی ہے نیز وہ اس امانت میں خیانت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے پاس رکھی ہے اور وہ ان انعاماتِ خداوندی کا ناشکرا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمائے ہیں، اور یوں وہ اپنے آپ کو عذاب کے لیے پیش کرتا ہے مگر اس کا حال جانوروں سے بھی بدتر ہوتا ہے کیوں کہ جانور مرنے کے بعد چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کے پاس تو امانت ہے تو عنقریب امانت والے کی طرف لوٹانا ہوگی کیوں کہ امانت کا لوٹنا اسی کی طرف ہے اور یہ امانت روشن سورج کی طرح ہے یہ اس فانی جسم کی طرف اتاری گئی اور اس میں آکر غروب ہو گئی عنقریب جب یہ جسم بگڑ جائے گا تو وہ اپنے غروب ہونے کے مقام سے طلوع ہو کر اپنے خالق و مالک کی طرف لوٹ جائے گی یا تو تاریک گرہن لگی ہوئی اور چمکتی ہوئی روشن۔ اور وہ جو چمکتی ہوئی روشن ہے وہ بارگاہ ربوبیت سے حجاب میں نہیں ہے جو تاریک ہے وہ بھی بارگاہِ خداوندی کی طرف لوٹے گی کیوں کہ سب کا مرجع وہی ہے لیکن وہ اپنے سر کو اعلیٰ علیین سے اسفل السافلین کی طرف جھکائے ہوگی اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلَوْ تَرٰى إِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ — اور اگر تم دیکھو جب مجرم اپنے رب کے ہاں سر جھکائے

عِنْدَ رَبِّهِمْ (۱) ہوں گے۔

اس آیت میں بیان فرمایا کہ وہ اپنے رب کے پاس ہی ہوں گے لیکن ان کے چہرے پیٹھ کی طرف ہوں گے اور ان کے سر اوپر والی جہت سے نچلی جانب ہوں گے یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ان لوگوں کے بارے میں جو اس کی توفیق سے محروم ہیں وہ اپنے راستے کی طرف ان کی راہنمائی نہیں کرتا ہم گمراہی سے اور جاہلوں کے مقامات کی طرف اترنے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

تو یہ ان لوگوں کی تفریق کا بیان ہے جو جہنم سے نکالے جائیں گے اور ان کو دنیا کی دس مثل یا اس سے زیادہ دیا جائے گا اور جہنم سے وہی نکلے گا جو موحد ہو گا اور توحید سے میری مراد یہ نہیں کہ زبان سے کلمہ طیبہ پڑھ دے کیونکہ زبان کا تعلق اس ظاہری عالم سے ہے اس لیے یہ صرف ظاہری عالم میں نفع دیتی ہے یعنی اس کی گردن اور مال کی مدت زندگی تک ہے اور جب گردن اور مال نہیں رہے گا تو زبانی قول فائدہ نہیں دے گا نفع تو توحید میں صداقت سے ہو گا اور کمالِ توحید یہ ہے کہ تمام امور کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جانے اور اس کی علامت یہ ہے کہ جو کچھ اسے پہنچے اس کی وجہ سے مخلوق پر غصہ نہ کھائے کیوں کہ وہ وسیلے کو نہیں دیکھتا بلکہ مسبب الاسباب کو دیکھتا ہے جیسا کہ توکل کے باب میں اس کی تحقیق آئے گی اور اس توحید میں بھی مختلف درجات ہیں بعض لوگوں کا عقیدۂ توحید پہاڑ کی طرح ہوتا ہے اور بعض کا ایک مثقال جتنا جب کہ کچھ لوگوں کا عقیدۂ توحید رائی کے دانے اور ذرے کے برابر ہوتا ہے پس جس شخص کے دل میں ایک دینار کے برابر ایمان ہو گا وہ جہنم میں سے سب سے پہلے نکلے گا۔

اور حدیث شریف میں ہے۔

اَخْرِجُوا مِنَ النَّارِ مَنْ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ دِيْنَارٍ مِّنَ الْاِيْمَانِ۔ (۲)	اس شخص کو جہنم سے نکالو جس کے دل میں ایک دینار کے برابر ایمان ہے۔

اور سب سے آخر میں وہ نکلے گا جس کے دل میں ذرے کے برابر ایمان ہو گا اور مثقال اور ذرے کے درمیان جس قدر مختلف درجات ہیں وہ مثقال والے طبقے اور ذرے والے طبقہ کے درمیان حسب مراتب نکلتے جائیں گے مثقال اور ذرے کے ساتھ موازنہ مثال کے طریقے پر بیان کیا گیا ہے جیسا کہ ہم نے جنس اور نقد کے درمیان موازنہ ذکر کیا ہے۔

اکثر موحد لوگوں کے حقوق ادا نہ کرنے کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے کیوں کہ حقوق العباد کا دیوان (نامہ اعمال)

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ سجدہ آیت ۱۲

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۲۸۲ مرویات، ابن عباس

چھوڑا نہیں جائے گا لیکن دوسرے گناہوں کی فوری معافی اور کفارہ ہو گا۔ حدیث شریف میں ہے۔
کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اور اس کی نیکیاں پہاڑوں جیسی ہوں گی کہ اگر محفوظ رہیں تو وہ جنتی ہو اب اصحاب حقوق کھڑے ہوں گے کسی کو اس نے گالی دی ہوگی کسی کا مال لیا ہو گا اور کسی کو مارا ہو گا تو ان کے حقوق اس شخص کی نیکیوں سے پورے کئے جائیں گے حتیٰ کہ اس کے لیے کوئی نیکی باقی نہیں رہے گی اب فرشتے کہیں گے اے ہمارے رب! اس کی نیکیاں ختم ہو گئی ہیں اور مطالبہ کرنے والے بہت سے لوگ باقی ہیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا ان کے گناہ اس کے کھاتے میں ڈالو اور اس کے لیے جہنم کی طرف ایک پروانہ لکھ دو۔ تو جس طرح وہ بطور قصاص دوسروں کے گناہوں سے ہلاک ہوا اسی طرح مظلوم ظالم کی نیکیوں کے باعث نجات پائے گا کیونکہ وہ اس کے ظلم کی وجہ سے مظلوم کی طرف منتقل ہوں گی۔ ابن جلاء رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ کسی نے ان کی غیبت کی پھر ان کے پاس کسی کو معافی کے لیے بھیجا تو انہوں نے فرمایا میں معاف نہیں کروں گا۔ میرے نامہ اعمال میں اس سے افضل کوئی نیکی نہیں ہے تو میں اسے کیسے مٹا دوں؟ انہوں نے اور دوسرے حضرات نے بھی فرمایا کہ ہمارے بھائیوں کے گناہ ہماری نیکیاں ہیں ہم ان کے ذریعے اپنے نامہ اعمال کو سجانا چاہتے ہیں۔

تو اُخروی سعادت اور بدبختی کے درجات کے سلسلے میں بندوں کے درمیان تفاوت کا تذکرہ ہم کرنا چاہتے تھے وہ یہی یہاں ہے۔ اور یہ سب ظاہری اسباب کے حکم سے ہے جو ڈاکٹر کے اس فیصلے کے مشابہ ہے کہ یہ مریض لامحالہ مر جائے گا اور یہ لاعلاج ہے اور دوسرے مریض کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے کہ اس کی بیماری معمولی ہے اور علاج بھی آسان ہے یہ ایک خیال ہے جو عام طور پر صحیح ہوتا ہے لیکن بعض اوقات ہلاک ہونے والا مریض ٹھیک ہو جاتا ہے اور ڈاکٹر کو اس کا شعور نہیں ہوتا اور معمولی بیماری والا موت کے منہ میں چلا جاتا ہے اور ڈاکٹر کو پتہ تک نہیں چلتا، کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خفیہ اسرار میں سے ہے جو زندوں کی رُوح سے متعلق ہیں اور یہ خفیہ اسرار اسباب کو پیدا کرنے والے نے معلوم مقدار پر مرتب کئے ہیں اور بندہ اس کی گہرائی تک نہیں جا سکتا آخرت میں کامیابی اور نجات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ان کے بھی خفیہ اسباب ہیں بندے کی طاقت نہیں ہے کہ ان پر مطلع ہو سکے یہ خفیہ سبب جو نجات کی طرف لے جاتا ہے اسے عفو و رضا کہتے ہیں اور جو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے اسے غضب اور انتقام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس سے آگے مشیت الٰہیہ ازلیہ کا راز ہے جس پر مخلوق مطلع نہیں ہو سکتی۔

اسی لیے ہم پر واجب ہے کہ ہم گناہ گار پر عفو و درگزر کو جائز سمجھیں اگرچہ اس کے ظاہری گناہ زیادہ ہی ہوں اسی طرح اطاعت گزار پر غضب کو بھی جائز جانیں اگرچہ اس کی ظاہری نیکیاں زیادہ ہی کیوں نہ ہوں کیوں کہ تقویٰ پر اعتماد ہے اور تقویٰ دل میں ہوتا ہے۔ اور وہ اس قدر دقیق ہے کہ خود متقی اس پر مطلع نہیں ہو سکتا دوسرا کس طرح اطلاع پائے گا لیکن بعض اوقات ارباب قلوب پر منکشف ہوتا ہے کہ بندے کی معافی کسی خفیہ سبب سے ہوئی ہے جو معافی کا تقاضا کرتا تھا اور غضب کا سبب

بھی مخفی ہے جو اللہ تعالیٰ سے دُوری کا مقتضی تھا اگر یہ بات نہ ہوتی، تو معافی اور غضب اعمال و اوصاف کا بدلہ نہ ہونے اور اگر جزا و سزا نہ ہوتی تو عدل نہ ہوتا اور اگر عدل نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کا یہ قول صحیح قرار نہ پاتا۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ۔ (۱) اور تمہارا رب بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

اور نہ ارشاد خداوندی صحیح قرار پاتا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ۔ (۲) بے شک اللہ تعالیٰ ایک ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

حالانکہ یہ سب قول صحیح ہیں اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے اور وہ اپنی کوشش (کا پھل) دیکھے گا اور ہر شخص اپنی کمائی کے ساتھ گروی ہے اور جب انہوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا اور جب انہوں نے خود اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی حالت کو بدل دیا۔

ارشاد خداوندی ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ۔ (۳) بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود بدلنے کی کوشش نہ کریں۔

یہ تمام باتیں اہل دل پر منکشف ہوتی ہیں اور یہ انکشاف آنکھوں کے ساتھ دیکھنے سے بھی زیادہ واضح ہوتا ہے کیونکہ نگاہ کو غلطی لگ سکتی ہے اس لیے کہ وہ بعید کو قریب اور بڑے کو چھوٹا دیکھتی ہے لیکن قلبی مشاہدہ کو غلطی نہیں لگتی اور یہ معاملہ بصیرت قلبی کی کیفیت میں ہوتا ہے ورنہ جب وہ کھل جاتی ہے تو اس میں جھوٹ کا تصور بھی نہیں ہوتا اس ارشاد خداوندی میں اسی طرف اشارہ ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ (۴) جو کچھ آنکھوں نے دیکھا دل نے اس کو نہیں جھٹلایا۔

تیسرا رتبہ:

یہ نجات پانے والوں کا رتبہ ہے اور نجات سے فقط سلامتی مراد ہے سعادت اور کامیابی مراد نہیں ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدمت بھی نہ کی کہ خلعت حاصل کرتے اور کوتاہی بھی نہ کی کہ سزا پاتے ان لوگوں کا حال کفار سے پاگل، بچوں اور بیہوش لوگوں کے زیادہ مشابہ ہے بلکہ ان لوگوں کی طرح بھی ہے جن کو اطراف و اکناف میں اسلام کی دعوت نہ پہنچی اور

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ فصلت آیت ۴۶

(۲) قرآن مجید، سورۃ النساء آیت ۴۰

(۳) قرآن مجید، سورۃ الرعد آیت ۱۱

(۴) قرآن مجید، سورۃ النجم آیت ۱۱

وہ جہالت اور عدمِ معرفت پر رہے نہ انہیں معرفت حاصل ہے اور نہ انکار اسی طرح نہ تو وہ عبادت کرتے ہیں اور نہ ہی نافرمانی۔ نہ قربِ خداوندی کا وسیلہ ہے اور نہ کوئی جرم جو ان کو اللہ تعالیٰ سے دُور کرے یہ لوگ جنتی ہیں نہ جہنمی بلکہ وہ ان دونوں منزلوں کے درمیان ایک منزل اور ان دونوں مقاموں کے درمیان مقام پر اتریں گے شریعت نے اسے اعراف کا نام دیا ہے اور مخلوق میں سے ایک جماعت کا اس میں داخل ہونا قرآن پاک کی آیات اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یقینی طور پر ثابت ہے (۱)

اور انوارِ بصیرت سے بھی پتہ چلتا ہے لیکن معین کر کے کسی پر حکم لگانا مثلاً یہ کہ بچے اعراف والوں میں سے ہوں تو یہ بات غیر یقینی ہے محض گمان ہے حقیقتاً اس کی اطلاع عالمِ نبوت میں ہوتی ہے اولیاء اور علماء کا رتبہ یہاں تک نہیں جاتا۔ اور بچوں کے بارے میں مروی روایات میں بھی تعارض ہے حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسی بچے کے فوت ہونے پر فرمایا۔

یہ جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس بات کو رد کرتے ہوئے فرمایا۔ تمہیں کیسے پتہ چلا! (۲)

لہٰذا اس مقام پر اشکال واشتباہ زیادہ غالب ہے۔

چوتھا درجہ :

یہ کامیاب ہونے والوں کا رتبہ ہے اور وہ عارفین ہیں مقلدین نہیں ہیں یہ لوگ مقربین سابقین ہیں کیوں کہ مقلد اگر جنت میں کچھ نہ کچھ کامیابی پائے گا تو وہ اصحابِ یمین سے ہوگا اور یہی لوگ مقرب ہوں گے اور جو کچھ ان کو عطا ہوگا وہ حدِ بیان سے باہر ہے اور جس قدر بیان ہو سکتا ہے وہ قرآن پاک میں مذکور ہے اور اللہ تعالیٰ کے بیان کے بعد کسی کا بیان نہیں ہو سکتا اور اس عالم میں جس کی تعبیر ناممکن ہے وہ اس ارشاد خداوندی میں اجمالاً بیان ہوا ہے۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ۔ (۳)

اور ہر نفس آنکھوں کی اس ٹھنڈک کو نہیں جانتا جو اس کے لیے پوشیدہ رکھی گئی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزرا۔ اور عارفین کا مطلوب یہی حالت ہے جس کے بارے میں

---

(۱) المعجم الصغیر للطبرانی جلد اول ص ۲۲۸ من اسمہ عبید اللہ

(۲) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۳۷ کتاب القدر

(۳) قرآن مجید، سورۂ سجدہ آیت ۱۷

یہ تصور نہیں ہو سکتا کہ اس عالم میں کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزرا ہو گا حور و قصور، پھل اور دودھ، شہد و شراب، زیورات و کنگن وغیرہ کی انہیں حرص نہیں ہے اور اگر وہ انہیں دیئے جائیں تو وہ اس پر قناعت نہیں کریں گے وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذت کے طالب ہیں اور یہ انتہائی درجہ کی سعادت اور لذت ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت رابعہ عدویہ رحمہا اللہ سے پوچھا گیا کہ جنت میں آپ کی رغبت کا کیا عالم ہے؛ فرمایا پہلے صاحب خانہ پھر گھر، ــــ تو یہ وہ لوگ ہیں جن کو مالک مکان نے مکان اور اس کی زینت سے بے خبر رکھا ہے بلکہ اس کے سوا ہر چیز حتیٰ کہ اپنے نفسوں سے بھی بے خبر ہیں۔

ان کی مثال اس عاشق جیسی ہے جو اپنے معشوق کا گرویدہ ہو وہ اپنی پوری ہمت اس کا چہرہ دیکھنے اور اس کے بارے میں سوچنے میں گزار دیتا ہے وہ حالت استغراق میں ہوتا ہے اور اپنے نفس سے غافل ہوتا ہے اس کے بدن کو جو تکلیف پہنچتی ہے اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا اس حالت کو اپنے نفس سے فنا سے تعبیر کرتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے غیر میں مستغرق ہو گیا اور اس کے تمام غم ایک ہو گئے اور وہ اس کا محبوب ہے، اب اس میں محبوب کے غیر کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس کی طرف متوجہ ہو نہ اپنی اور نہ کسی اور کی ــ یہی حالت آخرت میں آنکھوں کی ایسی ٹھنڈک تک پہنچائے گی جس کے بارے میں تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اس عالم میں کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزرے جس بہرے اور گونگے کے دل پر رنگوں اور آواز کی صورت کا خیال متصور نہیں ہوسکتا جب تک اس کی سماعت و بصارت سے پردہ نہ اٹھ جائے اس وقت اسے اس کی حالت کا ادراک ہوتا ہے اور وہ قطعی طور پر جان لیتا ہے کہ اس سے پہلے اس کے دل میں اس صورت کا خیال نہیں آسکتا تھا تو حقیقت میں دنیا ایک حجاب ہے اور اس کے اٹھنے سے پردہ اٹھ جائے گا اور اس وقت حیات طیبہ کے ذوق کا ادراک ہو گا اور یہ کہ آخرت کا گھر ہی اصل زندگی ہے اگر وہ جانتے۔

نیکیوں کے حساب سے درجات کی تقسیم کے سلسلے میں اس قدر بیان کافی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اپنے لطف و کرم سے توفیق دینے والا ہے۔

تیسری فصل:

صغیرہ گناہ، کیسے کبیرہ بنتے ہیں

جاننا چاہیے کہ چند اسباب سے صغیرہ گناہ، کبیرہ بن جاتے ہیں ان میں سے ایک بات گناہ پر ڈٹ جانا اور اسے بار بار کرنا ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ اصرار کی صورت میں گناہ، صغیرہ نہیں رہتا، اور استغفار کی صورت میں کبیرہ گناہ باقی نہیں رہتا۔

اگر ایسا ہو سکے کہ ایک کبیرہ گناہ کے بعد آدمی باز رہے اور دوسرا کبیرہ نہ کرے تو اس صغیرہ گناہ کے مقابلے میں معافی کی زیادہ امید ہوتی ہے جس صغیرہ پر آدمی ڈٹا رہتا ہے اس کی مثال اس طرح ہے کہ جیسے ایک پتھر پر پانی کا ایک قطرہ مسلسل گرتا ہے

تو اس میں اثر کرتا ہے اور اگر اتنا پانی ایک ہی مرتبہ ڈال جائے تو وہ اثر انداز نہیں ہوتا۔
اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
خَيْرُ الْاَعْمَالِ اَدْوَمُهَا وَاِنْ قَلَّ (۱) بہترین عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ کم ہو۔
اور اشیاء اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں اور جب دائمی عمل نفع بخش ہوتا ہے اگرچہ کم ہو تو دل کو منور و مطہر کرنے کے لیے زیادہ اور ٹوٹ جانے والا عمل کم نفع دیتا ہے اسی طرح قلیل گناہ جب بار بار کئے جائیں تو دل کو تاریک کرنے میں ان کی تاثیر زیادہ ہوتی ہے البتہ ایسا کم ہوتا ہے کہ آدمی اچانک کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو اور اس کے آگے پیچھے کوئی صغیرہ گناہ نہ ہو بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ زنا کرنے والا اچانک زنا کرنے اور اس سے پہلے ارادہ اور زنا کے مقدمات نہ ہوں اور ایسا بھی بہت کم ہوتا ہے کہ کسی سابقہ دشمنی کے بغیر اچانک قتل کر دے تو ہر کبیرہ گناہ سے پہلے اور بعد صغیرہ گناہ ہوتے ہیں اور اگر کبیرہ گناہ کا اچانک ہو جانا منصور ہو اور وہ اسے دوبارہ بھی نہ کرے تو اس میں اس صغیرہ کے مقابلے میں معافی کی زیادہ امید ہوتی ہے جو صغیرہ عمر بھر کرتا رہا۔
صغیرہ گناہ کے کبیرہ بن جانے کا ایک سبب یہ ہے کہ گناہ کو معمولی سمجھا جائے انسان جب گناہ کو بڑا سمجھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ چھوٹا ہو جاتا ہے اور جب اسے چھوٹا سمجھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ بڑا ہوتا ہے کیونکہ اسے بڑا سمجھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے دل میں اس سے نفرت پائی جاتی ہے اور وہ اسے ناپسند کرتا ہے اور یہی نفرت اس کی شدت تاثیر کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے اور اس کو معمولی سمجھنا اس سے الفت کی علامت ہے اور اس سے دل پر گہرا اثر مرتب ہوتا ہے اور عبادات کا مقصد دل کو روشن کرنا اور گناہوں کے ذریعے اس پر چڑھنے والی سیاہی سے اسے محفوظ رکھنا ہے یہی وجہ ہے کہ جو کچھ اس سے غفلت میں صادر ہوتا ہے اس پر اس کا مواخذہ نہیں ہوتا اور حدیث شریف میں ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ يَرٰى ذَنْبَهٗ كَالْجَبَلِ فَوْقَهٗ يَخَافُ اَنْ يَّقَعَ عَلَيْهِ وَالْمُنَافِقُ يَرٰى ذَنْبَهٗ كَذُبَابٍ مَرَّ عَلٰى اَنْفِهٖ فَاَطَارَهٗ۔ (۲)

مومن اپنے گناہ کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے اس کے اوپر پہاڑ ہو اور اس کے اس پر گرنے کا ڈر ہو اور منافق اپنے گناہ کو مکھی کی طرح دیکھتا ہے جو اس کے ناک سے گزرتی ہے تو وہ اسے اڑا دیتا ہے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا وہ گناہ جس کی بخشش نہیں ہوتی بندے کا یہ قول ہے کہ کاش وہ سب گناہ جو میں نے کئے ہیں ایسے ہی ہوتے مومن کے دل میں گناہ کی بڑائی اس وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ جلال الٰہی کا علم رکھتا ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ

---

(۱) صحیح مسلم جلد اول ص ۲۶۶ کتاب صلوٰۃ المسافرین۔

(۲) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۳۳ کتاب الدعوات / شعب الایمان جلد ۵ ص ۱۱۸ حدیث ۱۰۴)

اس نے جس کی نافرمانی کی ہے وہ بڑی ذات ہے تو صغیرہ گناہ کو بھی کبیرہ سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی کی طرف وحی بھیجی کہ تحفے کی قلت کو نہ دیکھو یہ دیکھو کہ بھیجنے والا کتنا بڑا ہے اور گناہ کے چھوٹا ہونے کو نہ دیکھو بلکہ اس ذات کی بڑائی کو دیکھو جس کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اسی اعتبار سے بعض عارفین نے فرمایا کہ گناہ صغیرہ کا وجود ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہر مخالفت گناہ کبیرہ ہے اسی طرح بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تابعین سے فرمایا کہ تم ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہاری نگاہ میں بال سے بھی زیادہ باریک ہیں جب کہ ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ان اعمال کو ہلاکت خیز امور سے سمجھتے تھے کیوں کہ جلالِ خداوندی کے حوالے سے صحابہ کرام کو معرفت تامہ حاصل تھی۔

تو وہ جلالِ خداوندی کی نسبت سے صغیرہ گناہ کو بھی کبیرہ سمجھتے تھے یہی وجہ ہے کہ جاہل کے مقابلے میں عالم کا گناہ بڑا ہوتا ہے۔ اور بعض باتیں جو عام آدمی سے معاف ہو جاتی ہیں عارف سے معاف نہیں ہوتیں کیونکہ گناہ اور مخالفت، حکم خداوندی کی مخالفت کرنے والے کی مناسبت سے بڑھ جاتی ہے (صغیرہ گناہ کے کبیرہ ہونے کا) ایک سبب صغیرہ گناہ پر خوش ہونا اور فخر کرنا ہے نیز یہ کہنا کہ مجھ سے یہ کام نعمت خداوندی کی وجہ سے ہوا ہے حالانکہ وہ اس بات سے غافل ہے کہ اس کا سبب بدبختی ہے پس جب بھی بندے کو صغیرہ گناہ کی لذت حاصل ہوتی ہے وہ گناہ کبیرہ ہو جاتا ہے اور دل کی سیاہی میں اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے حتیٰ کہ گناہ کے مرتکب بعض لوگ اپنے گناہ پر خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں کہ ان سے یہ کام سرزد ہوا۔ جیسے وہ کہتا ہے تم نے مجھے دیکھا نہیں میں نے کس طرح اس کی عزت کو تار تار کر دیا اور مناظر اپنے مناظرہ میں کہتا ہے تم نے دیکھا میں نے کس طرح اسے رسوا کیا۔ اور کس طرح میں نے اس کی برائیاں ذکر کر کے اسے کو شرمندہ کیا اور کس طرح میں نے اسے ہلکا کیا اور اسے دھوکے میں مبتلا کیا۔

اور تجارت میں معاملہ کرنے والا کہتا ہے تم نے دیکھا میں نے کس طرح اس پر کھوٹا سکہ چلا دیا اور کس طرح اسے دھوکے میں مبتلا کیا میں نے کس طرح اسے مالی نقصان پہنچایا اور اسے بیوقوف بنایا۔ اس قسم کی باتوں سے صغیرہ گناہ، کبیرہ میں بدل جاتا ہے پس بے شک گناہ ہلاکت میں ڈالتے ہیں تو جب بندہ ان میں مبتلا ہوتا ہے اور شیطان اسے گناہ پر مجبور کرنے کے ذریعے اس پر غالب آتا ہے تو مصیبت اور افسوس کا مقام ہے کہ دشمن اس پر غالب آگیا اور اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ سے دُور ہو گیا وہ مریض جو دوائی کا برتن ٹوٹنے پر خوش ہوتا ہے کہ چلو دوائی پینے کی تکلیف سے جان چھوٹی تو اس بیمار کی شفاء کی امید نہیں ہو سکتی۔

(گناہ صغیرہ کے کبیرہ بننے کا) ایک اور سبب بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اس کی پردہ پوشی کی ہے اور بردباری فرمائی ہے نیز اسے ڈھیل دی ہے اسے معمولی سمجھے اور اسے معلوم نہ ہو سکے کہ یہ ڈھیل سزا ہے تاکہ اس طرح اس کا گناہ بڑھ جائے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ گناہوں پر اس کا قادر ہونا اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خبری کی وجہ سے ہوتا ہے

اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے مغالطے کی وجہ سے بے علم ہے۔ جیسے ارشاد خداوندی ہے۔

وَيَقُولُونَ فِي أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيرُ۔ (۱)

اور وہ اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری باتوں پر ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا، تو انہیں جہنم کافی ہے وہ اس میں داخل ہوں گے اور کیا ہی بُری جگہ ہے لوٹنے کی۔

(گناہ صغیرہ کے کبیرہ میں بدلنے کی) ایک اور وجہ یہ ہے کہ آدمی گناہ کر کے اسے ظاہر کرے یعنی ارتکابِ گناہ کے بعد اس کا ذکر کرے یا دوسرے کے سامنے کرے یہ اس کا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈالا ہے اور وہ اسے اٹھا رہا ہے اور جس کے سامنے اپنے گناہ کا ذکر کرتا ہے اسے برائی کی ترغیب دیتا ہے یا اسے اپنے فعل پر گواہ بناتا ہے تو یہ دونوں باتیں جرم ہیں جو پہلے گناہ کے ساتھ مل کر اسے سخت کر دیتی ہیں اور اگر اس کے ساتھ دوسروں کو ترغیب بھی دے اور ان کو اس پر ابھارے اور ان کے لیے اسباب تیار کرے تو یہ چوتھا جرم بن جائے گا اور معاملہ بہت خراب ہو جائے گا۔

حدیث شریف میں ہے:

كُلُّ النَّاسِ مُعَافًى إِلَّا الْمُجَاهِرِينَ يَبِيتُ أَحَدُهُمْ عَلَى ذَنْبٍ قَدْ سَتَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ فَيُصْبِحُ فَيَكْشِفُ سِتْرَ اللَّهِ وَيَتَحَدَّثُ بِذَنْبِهِ۔ (۲)

تمام لوگوں کے لیے معافی ہے لیکن گناہ کو ظاہر کرنے والوں کے لیے نہیں تم میں سے ایک گناہ کی حالت میں رات گزارتا ہے تحقیق اللہ تعالیٰ نے اس پر پردہ ڈالا پس صبح وہ اللہ تعالیٰ کے پردے کو پھاڑ دیتا ہے اور اپنا گناہ بیان کرتا پھرتا ہے۔

یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور نعمتوں میں سے یہ بات بھی ہے کہ وہ خوبصورت چیزوں کو ظاہر کرتا اور بُری چیزوں کو چھپاتا ہے اور وہ پردہ دری نہیں فرماتا پس گناہ کا اظہار نعمت کی ناشکری ہے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ گناہ نہ کرو اور اگر ہو جائے تو دوسروں کو ترغیب نہ دو اس طرح دو گناہ ہو جائیں گے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوفِ۔ (۳)

منافق مردوں اور منافق عورتوں کا باہمی تعلق ہے وہ برائی کا حکم دیتے اور نیکی سے روکتے ہیں۔

---

(۱) قرآن مجید سورۃ مجادلہ آیت ۸

(۲) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۸۹۶ کتاب الادب

(۳) قرآن مجید، سورۃ توبہ آیت ۶۷

بعض بزرگوں نے فرمایا آدمی اپنے بھائی کی پردہ دری اس سے بڑھ کر نہیں کرتا کہ پہلے گناہ پر اس کی مدد کرے اور پھر اسے اس کے سامنے معمولی قرار دے۔

اگناہ صغیرہ کے کبیرہ ہو جانے کی) ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گناہ کرنے والا عالم ہو اور لوگ اس کی اقتدا کرتے ہوں جب وہ اس کا ارتکاب یوں کرے کہ لوگ دیکھ رہے ہوں تو یہ کبیرہ گناہ ہو جائے گا جیسے کوئی عالم ریشمی کپڑا پہنے اور سونے کی سواری پر سوار ہو بادشاہوں سے شبہ کے ساتھ مال حاصل کرے بادشاہوں کے پاس آمد و رفت رکھے اور ان کے حال کو برابر جانے بلکہ ان کی مدد کرے مسلمانوں کی عزت کے خلاف زبان کھولے، مناظرے میں حد سے تجاوز کرے اور مقصود دوسرے فریق کی توہین کرنا ہو نیز ایسے علوم میں مشغول ہو جن کا مقصد محض مرتبے کا حصول ہے جیسے جدل و مناظرے کا علم، یہ وہ گناہ ہیں جن میں عالم کی اتباع کی جاتی ہے اب وہ عالم دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے لیکن اس کی برائی باقی رہتی ہے اور عرصہ دراز تک دنیا میں پھیلتی رہتی ہے اس شخص کے لیے خوشخبری ہے جس کے مرنے کے ساتھ ہی اس کے گناہ بھی مر جاتے ہیں۔ ایک حدیث شریف میں ہے۔

مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يَنْقُصُ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئًا۔ (۱)

جس نے کوئی بُرا طریقہ جاری کیا اس پر اس کا گناہ ہوگا اور ان لوگوں کا گناہ بھی جو اس پر عمل کریں گے (لیکن) ان کے گناہ میں بھی کمی نہیں ہوگی۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوا وَآثَارَهُمْ۔ (۲)

اور ہم لکھتے ہیں جو کچھ انہوں نے آگے بھیجا اور جو ان کے نشانات ہیں۔

آثار سے مراد وہ اعمال ہیں جو اس عمل کرنے والے اور اس کے عمل کے ختم ہو جانے کے بعد وجود میں آتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں عالم کے لیے خرابی اس کی اتباع کی وجہ سے ہوتی ہے اس سے کوئی لغزش ہو جاتی ہے پھر وہ اس سے رجوع کر لیتا ہے لیکن لوگ اس کام کو کرتے لگتے ہیں اور پورے عالم میں پھیلا دیتے ہیں۔

بعض بزرگوں نے فرمایا عالم کی لغزش کشتی کے ٹوٹنے کی طرح ہے وہ خود بھی ڈوبتی ہے اور اس میں جو سوار ہیں وہ بھی ڈوبتے ہیں۔ اسرائیلی روایات میں ہے کہ ایک عالم بدعت کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرتا تھا پھر اس نے توبہ کر لی اور عرصہ دراز تک لوگوں کی اصلاح میں مشغول رہا تو اللہ تعالیٰ نے اس دور کے نبی علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ آپ اس

---

(۱) صحیح مسلم جلد اول ص ۳۲۷ کتاب الزکوٰۃ

(۲) قرآن مجید، سورۂ یٰسین آیت ۱۲

سے فرمائیں کہ اگر تمہارا گناہ صرف میرے اور تیرے درمیان ہوتا تو میں تجھے بخش دیتا لیکن ان لوگوں کا کیا کروں جو تیری وجہ سے گمراہ ہو کر جہنم کے مستحق ہوئے۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علما کا معاملہ زیادہ خطرناک ہے لہذا ان پر دو ذمہ داریاں ہیں ایک ترکِ گناہ اور دوسرا گناہ کا چھپانا اگر کبھی سرزد ہو جائے۔

اور جیسا کہ گناہوں کی وجہ سے علما کے لیے سزا زیادہ ہے اسی طرح ان کی نیکیوں کا ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے اگر شریعت کے مطابق چلیں پس جب وہ زیب و زینت اور دنیا کی طرف میلان چھوڑ دیں اور تھوڑے سے مالِ دنیا پر قناعت کریں حسبِ ضرورت رزق اور پرانے کپڑوں پر صبر کر لیں اور یوں اس کی اتباع کی جائے اور علماء و عوام اس کی اقتدا کرنے لگیں تو اسے ان کے ثواب کے برابر ملے گا۔ اور اگر وہ زیب و زینت کی طرف مائل ہو تو اس سے نچلے درجہ کے لوگوں کی طبیعت اس سے مشابہت کی طرف میلان رکھے گی اور زیب و زینت کے لیے حکمرانوں کی چاپلوسی نیز حرام مال جمع کرنا ضروری ہو جائے گا تو گویا یہی عالم ان امور کا باعث ہوگا تو علما کی حرکات کے آثار نفع و نقصان دونوں صورتوں میں زیادہ ہوتے ہیں۔ جن اعمال سے توبہ کرنی چاہیے ان سے توبہ کے بارے میں اس قدر تفصیل کافی ہے۔

تیسرا رکن:

توبہ کی تکمیل اس کی شرائط اور آخر عمر تک اس کا باقی رہنا

ہم نے ذکر کیا ہے کہ توبہ ندامت کا نام ہے جو عزم اور قصد کو پیدا کرتی ہے اور یہ ندامت اس بات کے علم کا نتیجہ ہے کہ گناہ بندے اور اس کے محبوب کے درمیان حائل ہوتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک یعنی علم، ندامت اور عزم کے لیے دوام کے لیے کچھ شرائط ہیں اور ان سب کا بیان ضروری ہے۔

علم کا بیان تو سببِ توبہ کا بیان ہے جو بعد میں آئے گا اور ندامت دل کے درد کا نام ہے اور یہ اس وقت ہوتی ہے جب محبوب کے نہ ملنے کا شعور ہو اور اس کی علامت طویل حسرت، غم اور آنسوؤں کا بہانا اور رونا اور فکر ہے جس آدمی کو اس بات کا علم ہو کہ اس کی بعض اولاد یا رشتہ داروں پر کوئی مصیبت نازل ہونے والی ہے تو اس کی پریشانی اور رونا دھونا زیادہ ہو جاتا ہے اور نفس سے زیادہ عزیز کیا چیز ہے اور جہنم سے زیادہ سخت سزا کونسی ہو سکتی ہے نیز گناہوں سے بڑھ کر عذاب کا باعث کیا چیز ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے زیادہ سچا خبر دینے والا کون ہے اگر کوئی ڈاکٹر کسی شخص کو خبر دے کہ اس کے بیمار بیٹے کی بیماری لاعلاج ہے یا وہ عنقریب مر جائے گا تو اسی وقت اس کا غم بڑھ جاتا ہے حالانکہ اس کا بیٹا اس کے لئے اپنے نفس سے زیادہ عزیز نہیں ہے اور نہ ڈاکٹر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عالم اور سچا ہے نہ موت جہنم سے زیادہ سخت ہے اور نہ موت، گناہوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور جہنم میں داخل

ہونے پر زیادہ دلالت کرتی ہے تو جب ندامت کا درد زیادہ ہوگا تو اس کے سبب گناہوں کے مٹنے کی امید بھی زیادہ ہوئی۔ اور صحیح ندامت کی علامت دل کی نرمی اور آنسوؤں کا بہنا ہے حدیث شریف میں ہے۔

جَالِسُوا التَّوَّابِينَ فَإِنَّهُمْ أَرَقُّ أَفْئِدَةً۔ خوب توبہ کرنے والوں کے پاس بیٹھا کرو کیوں کہ ان کے دل زیادہ نرم ہوتے ہیں۔ (۱)

ندامت کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس کے دل میں گناہوں کی حلاوت کی بجائے ان کی کڑواہٹ قرار پکڑے اور گناہ کی طرف میلان کی بجائے ناپسندیدگی اور رغبت کی بجائے نفرت پیدا ہو۔

اسرائیلی روایات میں ہے کہ ایک نبی علیہ السلام نے ایک بندے کی قبولیت توبہ کے بارے میں پوچھا کہ اس نے سالہا سال عبادت کی لیکن توبہ کی قبولیت ظاہر نہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم اگر تمام آسمانوں اور زمین والے اس کی سفارش کریں تو بھی میں اس کی توبہ قبول نہیں کروں گا کیوں کہ جس گناہ سے وہ توبہ کر رہا ہے اس کی مٹھاس اب بھی اس کے دل میں موجود ہے۔

سوال:

گناہ تو وہ اعمال ہیں جن کی خواہش طبعی ہوتی ہے تو ان کی کڑواہٹ کیسے محسوس کرے گا۔

جواب:

جو شخص ایسا شہد کھائے جس میں زہر ملا ہوا ہو اور وہ اسے اس کی لذت اور ذائقے کی وجہ سے محسوس نہ ہو پھر وہ بیمار ہو جائے اور اس کی بیماری اور درد طویل ہو جائے اس کے بال بکھر جائیں اور اعضاء جواب دے جائیں پھر جب اس کے سامنے شہد لایا جائے جس میں اسی قسم کا زہر ہو اور اسے سخت بھوک بھی لگی ہوئی ہو اور اس کی مٹھاس کی وجہ سے خواہش بھی ہو تو کیا وہ اس شہد سے نفرت کرے گا یا نہیں؟ اگر تم کہو کہ نہیں تو یہ مشاہدہ اور تجربہ کے خلاف ہے بلکہ وہ تو بعض اوقات اس شہد سے بھی نفرت کرتا ہے جس میں زہر نہ ہو کیوں کہ اسے اس کا شبہ پڑتا ہے۔

پس توبہ کرنے والا جو گناہوں کی تلخی دل میں پاتا ہے اس کا بھی یہی حال ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر گناہ کا ذائقہ شہد کی طرح اور اس کا عمل زہر والا ہوتا ہے اور جب تک ایسا ایمان نہ ہو توبہ صحیح اور سچی نہیں ہوتی اور چونکہ ایسا ایمان بہت کم پایا جاتا ہے اس لیے توبہ بھی کم ہوتی ہے اور توبہ کرنے والے بھی۔

لہٰذا تم اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والے گناہوں کو معمولی خیال کرنے والوں اور ان پر اصرار کرنے والوں کو ہی دیکھتے ہو توبہ ندامت کی تکمیل کی شرط ہے اور اسے موت تک رہنا چاہیئے اور تمام گناہوں میں یہ کڑواہٹ بھی محسوس ہونی چاہیے۔

---

(۱) الاحادیث الضعیفۃ جلد اول ص ۱۳۷ حدیث ۱۰۳

اگرچہ اس نے پہلے ان کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ جیسے شہد میں ملا ہوا زہر کھانے والا ٹھنڈے پانی سے بھی نفرت کرتا ہے جب اسے یہ معلوم ہو کہ اس میں بھی زہر ہے کیوں کہ اسے شہد سے تکلیف نہیں پہنچتی بلکہ اس میں جو زہر تھا اس سے پہنچی ہے اور جو آدمی چوری اور زنا سے توبہ کرتا ہے اسے چوری اور زنا سے ضرر نہیں پہنچا بلکہ اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی ہے اور یہ بات تمام گناہوں میں جاری ہوتی ہے۔

باقی رہا وہ قصد جو ندامت سے پیدا ہوتا ہے وہ تدارک کا ارادہ ہے اس کا حال سے تعلق ہے اور وہ ہر اس ممنوع کام کے ترک کو واجب کرتا ہے جس میں وہ ملوث ہو نیز ہر اس فرض کی ادائیگی کرے جو فی الحال اس کی طرف متوجہ ہے اور اس کا ماضی سے تعلق ہے اور وہ کوتاہی کا تدارک کرنا ہے اور اس کا مستقبل سے بھی تعلق ہے اور وہ عبادت کا دائمی ہونا اور مرتے دم تک گناہ کو چھوڑے رکھنا ہے۔

ماضی کے ساتھ تعلق کے حوالے سے اس توبہ کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ اپنے فکر کو اس پہلے دن کی طرف لوٹائے جس دن عمر کے اعتبار سے یا احتلام کے باعث بالغ ہوا اور گذشتہ زندگی کے ایک ایک سال ایک ایک مہینے ایک ایک دن اور ایک ایک سانس کی چھان بین کرے اور دیکھے کہ کونسی کونسی عبادات میں کوتاہی ہوئی ہے اور کن کن گناہوں کا ارتکاب کیا ہے اگر نماز چھوڑی ہو یا ناپاک کپڑوں میں ادا کی ہو یا غیر صحیح نیت کے ساتھ ادا کی ہو کہ اسے نیت کی شرط کا علم نہ ہو تو آخر تک ان تمام نمازوں کی قضا کرے اگر فوت شدہ نمازوں کی تعداد میں شک ہو تو بالغ ہونے سے حساب شروع کرے اور جن نمازوں کی ادائیگی کا یقین ہو ان کو چھوڑ کر باقی نمازیں ادا کرے اور اس سلسلے میں غالب گمان پر عمل کرے اور غور و فکر بھی کرے۔

اور روزہ اگر سفر میں چھوڑا اور اسے قضا نہیں کیا یا جان بوجھ کر توڑ دیا یا رات کو نیت کرنا بھول گیا اور قضا نہیں کیا (احناف کے نزدیک ماہ رمضان کے روزوں کے نیت رات کے وقت ضروری نہیں ۱۲ ہزاروی) تو غور و فکر کے ذریعے ان روزوں کی تعداد معلوم کر کے ان کی قضا کرے۔

جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے تو تمام مال کا حساب لگائے اور جب سے اس کا مالک ہوا ہے اس وقت سے سالوں کا شمار کرے بلوغت سے نہیں کیونکہ زکوٰۃ بچے کے مال میں بھی واجب ہے اب جو غالب گمان ہو کہ اتنی زکوٰۃ اس کے ذمہ ہے وہ ادا کرے اور اگر اس کی ادائیگی میں اپنے مذہب کی مطابقت کا خیال نہ کیا مثلاً شافعی مسلک سے تعلق تھا اور زکوٰۃ کے آٹھوں مصارف کو ادائیگی نہیں کی یا جو مال واجب ہوا تھا اس کا عوض دے دیا تو تمام زکوٰۃ دوبارہ دے کیوں کہ یہ زکوٰۃ بالکل ادا نہیں ہوئی۔ زکوٰۃ کا حساب اور اس کی معرفت ایک طویل بات ہے۔ اور اس کا حساب معلوم کرنے میں مکمل غور و فکر چاہیئے۔ اسے چاہیے کہ علماء سے ادائیگی کا طریقہ پوچھے۔

حج کا مسئلہ اس طرح ہے کہ بعض سالوں میں اسے حج کی طاقت ہوتی ہے لیکن جانے کا اتفاق نہیں ہوتا اب

وہ مفلس ہوگیا تو بھی اس پر حج لازم ہے اگر وہ افلاس کی وجہ سے حج کرنے پر قادر نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ زادراہ کا اندازہ حلال مال کمائے اور اگر مال کمانے کی کوئی تدبیر بھی نہ ہو اور اس کے پاس مال بھی نہ ہو تو لوگوں کو متوجہ کرے کہ وہ اسے زکوٰۃ اور دیگر صدقات سے اس قدر مال دیں کہ وہ حج کر سکے اگر وہ حج کرنے سے پہلے مر گیا تو گناہ گار مرا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

وَمَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ إِنْ شَاءَ يَهُودِيًّا وَإِنْ شَاءَ نَصْرَانِيًّا۔ (۱)

اور جو شخص مر جائے اس حال میں کہ (فرض ہونے کے باوجود) اس نے حج نہیں کیا تو چاہے وہ یہودی ہو کر مرے چاہے عیسائی ہو کر (مرے)

اور طاقت کے حصول کے بعد طاری ہونے والا عجز اس سے حج کو ساقط نہیں کرتا۔ تو عبادات کی چھان بین اور ان میں کی گئی کوتاہی کا یوں تدارک کرنا چاہیئے۔

جہاں تک گناہوں کا تعلق ہے تو جب سے بالغ ہوا ہے اس وقت سے غور و فکر کرے کہ اس کا کان، آنکھ، زبان، پیٹ، ہاتھ پاؤں، شرمگاہ اور دوسرے اعضاء سے کون کونسے گناہ سرزد ہوئے پھر تمام دنوں اور ساعتوں کا حساب لگائے اور گناہ کا دفتر کھول کر ایک ایک گناہ کی تفصیل معلوم کرے حتیٰ کہ تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں پر مطلع ہو جائے پھر ان میں غور کرے ان میں سے جو گناہ حقوق اللہ کے حوالے سے ہوں لوگوں کے حقوق سے متعلق نہیں ہیں مثلاً غیر محرم عورت کی طرف دیکھنا، حالتِ جنابت میں مسجد میں بیٹھنا، قرآن پاک کو بے وضو ہاتھ لگانا، بدعت کا اعتقاد رکھنا، شراب نوشی کرنا، گانے سننا اور ان کے علاوہ دوسرے گناہ جن کا حقوق العباد سے کوئی تعلق نہیں تو ان سے توبہ یہ ہے کہ ان پر ندامت اور حسرت ظاہر کرے اور ان کی مقدار کا حساب لگائے یعنی ان کے کبیرہ ہونے اور مدت کے حساب سے دیکھے پھر ہر گناہ کے مناسب کوئی نیکی تلاش کرے اور ان گناہوں کے برابر نیک اعمال کرے یہ، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی پر عمل کرنا ہے۔

آپ نے فرمایا:۔

اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُ كُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا۔ (۲)

اللہ تعالیٰ سے ڈرو جہاں بھی ہو اور برائی کے بعد نیکی لاؤ وہ اسے مٹا دے گی۔

بلکہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کو بھی سامنے رکھے۔

---

(۱) الکامل لابن عدی جلد ۴ ص ۱۶۲۰ ترجمہ عبد الرحمان بن قطامی

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۱۵۳ مرویات ابوذر

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱) بے شک نیکیاں، برائیوں کو لے جاتی ہیں۔

تو گانا، سننے کے گناہ کو قرآن پاک کی سماعت اور مجالسِ ذکر کے ذریعے ختم کرے مسجد میں حالتِ جنابت میں بیٹھنے کا کفارہ عبادت میں مشغولیت کے ساتھ اعتکاف کے ذریعے ادا کرے بے وضو قرآن پاک کو ہاتھ لگانے کے گناہ کا کفارہ قرآن پاک کی عزت اور کثرتِ تلاوت کو بنائے نیز قرآن پاک کو بہت زیادہ چومے نیز ایک نسخہ قرآن پاک اپنے ہاتھ سے لکھ کر وقف کردے (۲)

شراب نوشی کا کفارہ یوں ادا کرے کہ حلال مشروب جو شراب سے بھی زیادہ عمدہ اور پسندیدہ ہو صدقہ کرے تمام گناہوں کا شمار ناممکن ہے مقصود تو ان کے خلاف راستے پر چلنا ہے کیونکہ بیماری کا علاج اس کی ضد کے ساتھ کیا جاتا ہے کسی گناہ کی وجہ سے دل پر جو تاریکی آتی ہے اسے وہی نور ختم کر سکتا ہے جو اس گناہ کے مقابلے نیکی کے باعث پیدا ہوتا ہے گناہ کی ضد نیکی ہی مناسب ہوتی ہے لہذا چاہیے کہ ہر گناہ کو اس کی ہم جنس نیکی کے ذریعے مٹائے مگر یہ نیکی اس کی ضد سے ہو، کیوں کہ سفیدی، سیاہی کے ذریعے زائل ہوتی ہے گرمی یا ٹھنڈک کے ذریعے نہیں گناہوں کے مٹانے کا یہ تدریجی طریقہ بہت مناسب ہے اس میں گناہوں کے دور ہونے کی امید زیادہ ہے نیز ایک ہی قسم کی عبادت میں مصروفیت کے مقابلے میں اس پر یقین زیادہ ہے اگرچہ وہ بھی گناہوں کے مٹانے میں موثر ہے۔ یہ تو حقوق اللہ کا معاملہ ہے۔ اور یہ اس بات پر دلالت ہے کہ کسی چیز کا کفارہ اس کی ضد کو بنانا چاہیئے کیوں کہ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے اور دنیا کی اتباع کا اثر دل میں اس طرح ہوتا ہے کہ آدمی اس پر خوش ہوتا اور اس کا شوق رکھتا ہے پس اگر مسلمان کو کوئی ایسی تکلیف پہنچے جس کے سبب سے اس کا دل دنیا سے اچاٹ ہو جائے تو یہ بھی اس کے لیے کفارہ ہوگا کیوں کہ دل کو غم اور رنج کی وجہ سے دنیا سے علیحدگی ہوتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مِنَ الذُّنُوبِ ذُنُوبٌ لَا يُكَفِّرُهَا إِلَّا الْهُمُومُ۔ بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ صرف رنج و غم ہے

ایک روایت میں ہے۔

إِلَّا الْهَمَّ بِطَلَبِ الْمَعِيْشَةِ۔ (۳) طلب معیشت کا غم ان گناہوں کا کفارہ ہے۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے۔

---

(۱) قرآن مجید سورۃ ہود آیت ۱۱۴

(۲) آج کل اس کی صورت چھپا ہوا قرآن پاک خرید کر وقف کر دینا ہے ۱۲ ہزاروی

(۳) مجمع الزوائد جلد ۴ ص ۶۴، ۶۳ کتاب البیوع۔

إِذَا كَثُرَتْ ذُنُوْبُ الْعَبْدِ وَلَمْ تَكُنْ لَّهُ أَعْمَالٌ تُكَفِّرُهَا أَدْخَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْهُمُوْمَ فَتَكُوْنُ كَفَّارَةً لِذُنُوْبِهِ۔ (۱)

جب بندے کے گناہ زیادہ ہو جاتے ہیں اور اس کے پاس ایسے اعمال نہیں ہوتے جو ان کا کفارہ بنیں تو اللہ تعالیٰ اسے پریشانیوں میں مبتلا کر دیتا ہے جو اس کے گناہوں کا کفارہ بنتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ دل میں جو غم آتا ہے اور بندے کو اس کا علم نہیں ہوتا وہ گناہوں کی تاریکی اور ان پر غمگین ہونا ہے اسے چاہیئے کہ حساب کے لیے کھڑا ہونے اور حشر کی دہشت سے واقف ہو۔

سوال:

انسان کا غم عام طور پر مال، اولاد اور جاہ و مرتبہ کا ہوتا ہے اور یہ گناہ ہے تو کفارہ کیسے بنے گا؟

جواب:

جان لو! ان چیزوں کی محبت گناہ ہے اور ان سے محرومی کفارہ ہے اگر محبت کی بنیاد پر ان سے نفع اٹھاتا ہے تو گناہ مکمل ہو جائے گا ایک روایت میں ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے جیل میں حضرت یوسف علیہ السلام سے ملاقات کی انہوں نے پوچھا آپ نے اس غمگین بزرگ (حضرت یعقوب علیہ السلام) کو کس حالت میں چھوڑا؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے جواب دیا ان کو آپ کا اتنا رنج ہے جتنا ان سو عورتوں کو ہوتا ہے جن کے بچے مر جاتے ہیں انہوں نے پوچھا اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لیے کیا ثواب ہے؟ فرمایا ایک سو شہید کا ثواب ہے۔

تو غم بھی حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوتاہی کا کفارہ بنتے ہیں یہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے۔

جہاں تک بندوں کے حقوق کا تعلق ہے تو ان میں بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اس کا گناہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر ظلم کرنے سے بھی منع فرمایا ہے تو جو گناہ حقوق اللہ سے متعلق ہیں ان کا تدارک ندامت اور افسوس کے ذریعے ہوتا ہے نیز مستقبل میں ان گناہوں کو چھوڑا جائے اور ان کے مقابل نیکیوں کو اپنایا جائے لوگوں کی ایذا رسانی کے مقابلے میں ان پر احسان کیا جائے ان کے مال غصب کئے ہوں تو حلال مال سے صدقہ کیا جائے اور اگر غیبت و عیب جوئی وغیرہ کے ذریعے ان کی عزت پر حملہ کیا ہے تو ان کی تعریف کرے بشرطیکہ وہ دین دار ہوں اور اپنے ہم پلہ لوگوں کی جو اچھی باتیں معلوم ہوں ان کو ظاہر کرے اگر لوگوں کو قتل کیا ہے تو اس کا کفارہ غلاموں کو آزاد کرنا ہے (آجکل غلامی کا سلسلہ نہیں ہے) کیوں کہ یہ بھی زندہ کرنا ہے کیوں کہ غلام ذاتی طور پر مفقود اور مالک کے ذریعے زندہ ہے اور آزاد کرنا ایک طرح کا کسی کو وجود میں لانا ہے انسان اس سے زیادہ پر قادر نہیں ہو سکتا لہٰذا کسی کو ختم کر دینا اس کو وجود میں لانے

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۱۵۷ مرویات عائشہ

کے متقابل ہے۔

اس سے تمہیں معلوم ہوگیا کہ ہم نے گناہ کے کفارے اور اسے مٹانے کے سلسلے میں جو کچھ اس کے مخالف راستے پر چلنے سے متعلق لکھا ہے اس پر شریعت کی گواہی پائی جاتی ہے کیونکہ قتل کا کفارہ غلام آزاد کرنا رکھا گیا ہے پھر جب یہ سب کچھ کرلے تو بھی اس وقت تک نجات نہیں پا سکتا اور نہ ہی یہ عمل اسے کفایت کر سکتا ہے جب تک بندوں کے حقوق ادا نہ کرے اور حقوق العباد یا تو جان سے متعلق ہوتے ہیں یا مالوں سے اور یا عزت سے تعلق رکھتے ہیں یا ان کا تعلق دلوں سے ہوتا ہے اور اس سے محض ایذا رسانی مراد ہے۔

جہاں تک جانوں کا تعلق ہے تو اگر قتل خطاء کا معاملہ ہے تو اس سے توبہ یہ ہے کہ دیت ادا کی جائے اور وہ مستحق تک پہنچے یا تو وہ خود دے یا اس کی عاقلہ (ورثاء) ادا کریں جب تک خون بہا مستحق تک نہ پہنچے یہ گناہ گار رہے گا۔

اور اگر جان بوجھ کر قتل کیا ہے جس سے قصاص واجب ہوتا ہے تو قصاص سے توبہ قبول ہوگی اور اگر (مقتول کے ورثاء کو) قاتل کا علم نہ ہو تو اسے (قاتل کو) چاہیئے کہ مقتول کے ولی کو جاکر بتا دے اور اپنے آپ کو اس کے اختیار میں دے دے اب اس کی مرضی اسے قتل کرے یا معاف کردے اسی عمل کی بدولت گناہ سے جان چھوٹے گی اس کے لیے قتل کو چھپانا جائز نہیں اور یہ گناہ شراب، زنا، چوری ڈاکہ زنی یا ایسے عمل کی طرح نہیں ہے جس کے باعث حد واجب ہوتی ہے ان صورتوں میں توبہ کے لیے ضروری نہیں کہ اپنے آپ کو رسوا کرے اور پردہ اٹھا دے اور حاکم سے مطالبہ کرے کہ وہ اس سے اللہ تعالیٰ کا حق وصول کرے بلکہ اس پر لازم ہے کہ گناہ پر پردہ ڈالے اور اپنے آپ کو طرح طرح کے مجاہدات اور عذاب نفس میں ڈالنے کے ذریعے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی حد قائم کرے محض حقوق اللہ میں توبہ کرنے اور نادم ہونے والوں کے لیے معافی زیادہ قریب ہے اور اگر وہ اپنا معاملہ حکمران کے پاس لے جائے کہ وہ اس پر حد قائم کرے تو بھی صحیح ہے اور اس کی توبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صحیح مقبول ہوگی اور اس کے دلیل حضرت ماعز رضی اللہ عنہ والی روایت ہے حضرت ماعز بن مالک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے مجھ سے زنا سرزد ہوا میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے پاک کردیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واپس کردیا جب دوسرا دن ہوا تو پھر حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! مجھ سے زنا سرزد ہوا ہے آپ نے دوبارہ واپس کردیا جب تیسرا دن ہوا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان کے لیے ایک گڑھا کھودا گیا پھر آپ نے حکم دیا تو ان کو رجم کیا گیا اب ان کے بارے میں صحابہ کرام دو حصوں میں بٹ گئے ایک گروہ کہتا تھا کہ وہ ہلاک ہوئے اور ان کو ان کے گناہوں نے گھیر لیا ہے جب کہ دوسرے گروہ نے کہا کہ ان کی توبہ سے زیادہ سچی توبہ کسی کی نہیں ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِّمَتْ بَيْنَ اُمَّةٍ ‏ بے شک انہوں نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اسے امت

تَوَسَّعَتْهُمْ (۱) کے درمیان تقسیم کر دیا جائے تو وہ ان سب کو کافی ہو۔
غامدیہ، حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! مجھ سے زنا کا گناہ سرزد ہوا ہے پس مجھے پاک کیجئے آپ نے انہیں واپس بھیج دیا جب دوسرا دن ہوا تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے مجھے واپس کیوں بھیجا ہے؟ شاید آپ مجھے بھی حضرت ماعز کی طرح لوٹانا چاہتے ہیں اللہ کی قسم! میں حاملہ ہوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب تم جاؤ جب بچہ پیدا ہو جائے (تو آنا) جب بچہ پیدا ہوا تو وہ اسے کپڑے کے ایک ٹکڑے میں لے کر حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! یہ بچہ ہے جو پیدا ہو چکا ہے آپ نے فرمایا جاؤ اور اسے دودھ پلاؤ یہاں تک کہ یہ دودھ چھوڑ کر غذا کھانے لگے جب بچے نے غذا کھانا شروع کی اور دودھ پینا چھوڑ دیا تو وہ اسے لے کر حاضر ہوئیں اور اس کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم اس نے دودھ پینا چھوڑ دیا اور کھانا کھانے لگا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچہ ایک مسلمان مرد کے حوالے کیا پھر حکم دیا تو ان کے سینے تک گڑھا کھودا گیا اس کے بعد آپ نے لوگوں کو حکم دیا تو انہوں نے اس خاتون کو سنگسار کر دیا حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایک پتھر لے کر آئے اور اس کے سر میں مارا اس سے خون کے چھینٹے آپ کے چہرے پر پڑے تو آپ نے اس کو برا بھلا کہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ کلمات کہتے ہوئے سنا تو فرمایا۔

مَهْلًا يَا خَالِدُ فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْتَابَ بِهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَ لَهُ۔

رک جاؤ اے خالد! پس اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے البتہ اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ٹیکس وصول کرنے والا بھی ایسی توبہ کرے تو اسے بخش دیا جائے — پھر آپ کے حکم سے اس خاتون کو دفن کر دیا گیا۔

جہاں تک قصاص اور حد قذف کا تعلق ہے تو اس میں صاحب حق کو اپنے اوپر اختیار دینا ضروری ہے اور اگر کسی کا مال لیا ہے تو وہ غصب یا خیانت کے ذریعے لیا ہوگا یا کسی قسم کا دھوکہ کر کے معاملے میں غبن کیا ہوگا جیسے کھوٹا سکہ رائج کرنا یا مبیع کا عیب چھپانا یا مزدور کی مزدوری میں کمی کرنا یا اسے بالکل اجرت نہ دینا تو ان تمام باتوں کی چھان بین شروع سے کرے بالغ ہونے کے بعد سے نہیں کیوں کہ جو کچھ بچے کے مال میں واجب ہے بالغ ہونے کے بعد اس کا نکالنا اس بچے پر لازم ہے اگر اس کے ولی نے اس میں کوتاہی کی ہو اور اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو وہ ظالم ہے اس سے مطالبہ کیا جائے کیوں کہ مالی حقوق میں بچہ اور بالغ برابر ہیں۔

آدمی کو چاہیے کہ ایک ایک دانے اور ایک ایک پیسے کا حساب کرے اور یہ زندگی کے پہلے دن سے توبہ کے دن

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۶۸ کتاب الحدود

(۲) 〃 〃 〃 〃

تمام ہو۔اس سے پہلے کہ قیامت کے دن حساب لیا جائے اور قیامت کی پوچھ گچھ سے پہلے ہی احتساب کرے جو شخص دنیا میں اپنے نفس کا احتساب نہیں کرتا آخرت میں اس کا حساب طویل ہو جاتا ہے اگر غالب گمان یا کسی قسم کے اجتہاد سے اسے معلوم ہو جائے کہ اس کے ذمہ کس قدر ہے تو اسے لکھ لے پھر شہروں میں گھوم پھر کر ان کو تلاش کرے اور ان سے معاف کروائے یا ان کے حقوق ادا کر دے ظالموں اور تاجروں کے لیے اس قسم کی توبہ مشکل ہوتی ہے کیوں کہ معاملہ کرنے والے تمام لوگوں کو تلاش کر سکتے اور نہ ہی ان کے ورثاء کو ڈھونڈھ سکتے ہیں لیکن ہر شخص پر لازم ہے کہ جس قدر ممکن ہو سکے کرے۔

اگر عاجز ہو جائے تو صرف ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ اپنی نیکیوں میں اضافہ کرے تاکہ قیامت کے دن حق دار کا حق ان سے ادا کیا جائے یعنی اس کی نیکیاں لے کر ان لوگوں کے پلڑے میں ڈالی جائیں جن کے حقوق اس کے ذمہ ہیں لیکن اس کی نیکیاں اس قدر زیادہ ہوں جس قدر مظالم زیادہ تھے کیوں کہ جب اس کی نیکیاں کفایت نہیں کریں گی تو حقوق والوں کے گناہ اس کے کھاتے میں ڈالے جائیں گے۔ تو اس طرح وہ دوسروں کے گناہوں کے سبب سے ہلاک ہوگا۔

تو حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں پوری توبہ کرنے والوں کے لیے یہی طریقہ ہے اور اس سے لازم آتا ہے کہ تمام زندگی نیکی میں گزارے اگر عمر لمبی ہو یعنی جتنا طویل عرصہ حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے اسی قدر نیکیوں کا زمانہ بھی ہونا چاہیے۔

اور چوں کہ عمر کا کوئی پتہ نہیں کہ کس قدر ہو گی اور بعض اوقات موت قریب ہوتی ہے تو تنگ وقت میں نیکیوں کے لیے اس سے بھی زیادہ مستعد ہو جس قدر وہ کشادہ وقت میں برائیوں کے لیے مستعد تھا یہ ان حقوق کا معاملہ ہے جو اس کے ذمہ ہیں لیکن جو مال موجود ہے تو اگر اس کے مالک کا علم ہے تو اس کی طرف لوٹا دے اور جس کے مالک کا علم نہ ہو اس پر اسے صدقہ کرنا لازم ہے اگر حلال و حرام باہم مل جائے تو اسے چاہیے کہ سوچ بچار کے ذریعے حرام کی مقدار معلوم کرے اور یہ مقدار صدقہ کر دے جیسا کہ اس سے پہلے حلال و حرام کی بحث میں گزر چکا ہے اور اگر ان کے دلوں کو یوں اذیت پہنچائی ہے کہ لوگوں کے سامنے ایسی باتیں کی ہیں جو ناپسندیدہ ہیں یا پیٹھ پیچھے عیب لگایا تو جس کے ساتھ زبان درازی کی یا اپنے کسی عمل سے اس کا دل دکھایا ہو تو ان میں سے ایک ایک کو تلاش کر کے معافی مانگے اور جو فوت ہو گیا یا غائب ہو گیا اس کا معاملہ بھی اس کے ساتھ چلا گیا اور اب اس کا تدارک اسی طرح ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ نیکی کرے تاکہ قیامت کے دن ان کے ذریعے بدلہ دے سکے لیکن جو شخص مل جائے اور وہ دل کی خوشی سے معاف کر دے تو یہ اس گناہ کا کفارہ ہے اور اسے چاہیے کہ اس شخص کو بتا دے کہ اس نے کس قدر جرم کیا اور اس کے درپے ہوا کیونکہ وضاحت کے بغیر مبہم معافی کافی نہیں ہے اس لیے بعض اوقات جب اس شخص کو اس کی زیادتی کی کثرت کا علم ہوتا ہے تو وہ برضا و رغبت معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور یہ قیامت کے لیے جمع ہو جاتا ہے پھر اس کی نیکیوں سے کفارہ ادا کیا جاتا ہے یا اس کے گناہ اس کے کھاتے میں ڈالے جاتے ہیں۔

اور اگر ان جرائم میں ایسے جرم بھی ہوں کہ ان کے ذکر کرنے یا اس شخص کو بتانے سے اسے اذیت پہنچتی ہے مثلاً

اس کی لونڈی یا بیوی سے زنا کا ارتکاب کیا ہو یا اس کے کسی خفیہ عیب کو زبان پر لایا ہو تو اس کے بیان کرنے سے تکلیف بڑھ جاتی ہے اور اس طرح معافی مانگنے کا راستہ مسدود ہو جاتا ہے ہاں مبہم طور پر معافی مانگ سکتا ہے (کہ میں نے تم سے جو زیادتی کی ہے معاف کر دو) اب جو ظلم و زیادتی رہ جائے گی اسے نیکیوں کے ذریعے پورا کرے جس طرح مرنے والے اور غائب سے زیادتی کو پورا کیا جاتا ہے۔

جہاں تک اس کے ذکر کرنے اور آگاہ کرنے کا تعلق ہے تو یہ ایک نیا گناہ ہے جس سے الگ معافی مانگنا پڑے گی اور اگر اس جرم کا ذکر کیا اور جس کے ساتھ زیادتی کی تھی اسے بتا دیا لیکن وہ معاف کرنے پر راضی نہ ہوا تو گناہ اس کے ذمہ رہے گا کیونکہ وہ اس (دوسرے شخص کا حق ہے اب اسے چاہیے کہ اس سے نرمی کا سلوک کرے اور اس کے کام کاج میں مدد کرے اس سے محبت اور شفقت کا اظہار کرے تاکہ اس کا دل اس کی طرف مائل ہو کیونکہ انسان، احسان کا بندہ ہے اور جو شخص برائی کی وجہ سے بھاگتا ہے وہ نیکی کے ذریعے مائل ہوتا ہے لہذا جب زیادہ محبت اور مہربانی کی وجہ سے اس کا دل خوش ہوگا تو وہ خود بخود معاف کرنے پر تیار ہو جائے گا۔

اور اگر اس کے باوجود معاف نہ کرنے پر اصرار کرے تو بھی اس سے مہربانی کا سلوک اور عذر پیش کرنا مجرم کی ان نیکیوں میں شمار ہوگا جو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان مظالم کا بدلہ ہوگا۔ جیسے کوئی شخص دنیا میں کسی کا مال ہلاک کرے پھر اس کی مثل لائے لیکن مال کا مالک اسے قبول کرنے یا معاف کرنے سے انکار کر دے تو حاکم فیصلہ دے گا کہ وہ اس مال پر قبضہ کرے اس کا دل چاہے یا نہ۔ اسی طرح میدانِ قیامت میں سب سے بڑا حاکم اور سب سے زیادہ انصاف کرنے والا اللہ تعالیٰ حکم جاری کرے گا۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم سے پہلے لوگوں میں ایک شخص تھا جس نے ننانوے قتل کئے تھے اس نے زمین والوں میں سے سب سے زیادہ علم والے کے بارے میں پوچھا تو ایک راہب کی طرف اس کی راہنمائی کی گئی وہ اس کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں کیا میری توبہ قبول ہوگی اس نے کہا نہیں، چنانچہ اس شخص نے اسے بھی قتل کر دیا پھر کسی بڑے عالم کے بارے میں پوچھا تو ایک عالم کی طرف راہنمائی کی گئی اس نے کہا ہاں، تمہارے اور تمہاری توبہ کے درمیان کون حائل ہو سکتا ہے فلاں علاقے کی طرف جاؤ وہاں کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار ہیں ان کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اپنے علاقے کی طرف واپس نہ آنا کیونکہ وہ برا علاقہ ہے وہ چلا گیا جب راستے کے درمیان میں پہنچا تو اسے موت آگئی اب رحمت کے فرشتے کہنے لگے یہ شخص صدق دل سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف جا رہا تھا جب کہ عذاب کے فرشتوں نے کہا اس نے کبھی بھی اچھا عمل نہیں کیا تو ایک فرشتہ انسانی صورت میں آیا اور انہوں نے اسے اپنا فیصل بنا لیا اس نے کہا دونوں زمینوں کے درمیان فاصلے کی پیمائش کرو وہ جس علاقے کے قریب ہوگا اسے اسی سے قرار دیا جائے گا انہوں نے زمین

کی پیمائش کی تو دیکھا کہ وہ اس زمین کے زیادہ قریب تھا جدھر کا اس نے قصد کیا تھا چنانچہ رحمت کے فرشتوں نے اس پر قبضہ کر لیا ایک روایت میں ہے کہ وہ نیکوکار لوگوں کی بستی کے ایک بالشت زیادہ قریب تھا چنانچہ اسے ان میں سے قرار دیا گیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس (پہلی زمین) سے فرمایا دور ہو جا اور اس دوسری بستی سے فرمایا قریب ہو جا اور فرمایا ان دونوں کے درمیان فاصلے کی پیمائش کرو چنانچہ انہوں نے اسے ایک بالشت زیادہ قریب پایا تو اسے بخش دیا گیا (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ جب تک نیکیوں کا پلڑا بھاری نہیں ہوگا چھٹکارا نہیں ہوگا اگرچہ وہ ذرے کے برابر ہی بھاری ہو لہٰذا توبہ کرنے والے کو چاہیے کہ اپنی نیکیوں میں اضافہ کرے۔

جہاں تک مستقبل سے مربوط عزم وارادے کا تعلق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے پکا وعدہ کرے کہ آئندہ کبھی بھی ان گناہوں کی طرف نہیں آئے گا اور نہ ہی ان جیسے دوسرے گناہوں کا مرتکب ہوگا۔

مثلاً ایک شخص بیماری کی حالت میں جانتا ہے کہ اسے پھل نقصان دیتے ہیں تو وہ نہایت پختہ عہد کرتا ہے کہ جب تک وہ بیمار ہے پھل نہیں کھائے گا یہ عزم فی الحال پختہ کرنا چاہیے اگرچہ یہ خیال بھی ہو کہ دوسری حالت میں اس پر خواہش غالب آجائے گی لیکن جب تک وہ فی الحال اس کو چھوڑنے کا پکا ارادہ نہ کرے وہ توبہ کرنے والا شمار نہیں ہوگا۔ اور پہلے ہی مرحلہ میں یہ بات پایۂ تکمیل کو اس وقت پہنچے گی جب وہ تنہائی اختیار کرے، خاموش رہے، کھانا کم کھائے، سونے میں کمی کرے اور حلال روزی جمع کرے اگر اسے وراثت میں حلال مال ملا ہے تو اسی پر اکتفا کرے یا کسی پیشے سے بقدر ضرورت کماتا ہے تو اسی پر قناعت کرے کیوں کہ گناہوں کی جڑ اور بنیاد حرام مال کھانا ہے اور جب تک حرام مال پر ڈٹا رہے گا توبہ کرنے والا کیسے قرار پائے گا۔

اور جو آدمی کھانوں اور لباس کے سلسلے میں خواہش کو چھوڑنے پر قادر نہیں ہوتا وہ حلال پر اکتفا بھی نہیں کر سکتا اور شبہے والی چیزوں کو بھی چھوڑ نہیں سکتا اور بعض بزرگوں نے فرمایا جو شخص خواہش کو چھوڑنے میں سچا ہو اور سات مرتبہ اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے نفس سے جہاد کرے وہ اس خواہش میں مبتلا نہیں ہوگا اور ایک دوسرے بزرگ فرمایا جو آدمی گناہ سے توبہ کرے اور پھر سات سال تک اس پر استقامت اختیار کرے وہ کبھی بھی اس (گناہ) کی طرف نہیں لوٹے گا۔

توبہ کرنے والا اگر عالم نہ ہو تو اس کے لیے ایک اہم بات یہ ہے کہ وہ اس بات کا علم حاصل کرے کہ مستقبل میں اس پر کیا واجب ہے اور کیا حرام ہے یہاں تک کہ اس کے لیے استقامت ممکن ہو۔ اور اگر وہ تنہائی کو ترجیح نہیں دے گا تو اس کے لیے استقامتِ مطلقہ مکمل نہیں ہوگی البتہ یہ کہ بعض گناہوں سے توبہ کرے جیسے کوئی شخص شراب

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۵۹ کتاب التوبۃ۔

نوشی، زنا اور غصے سے توبہ کرے تو یہ مطلق توبہ نہیں ہے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ یہ توبہ صحیح نہیں ہے اور بعض کہنے والوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے اور اس مقام پر لفظ صحت مجمل ہے بلکہ جو آدمی اس کی صحت کا انکار کرتا ہے اس سے پوچھا جائے کہ صحیح نہ ہوتے سے تمہاری کیا مراد ہے؟ اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ بعض گناہوں کے چھوڑنے سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس کا وجود اور عدم برابر ہے تو تم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ گناہوں کی کثرت عذاب کے زیادہ ہونے کا سبب ہے اور گناہوں کی کمی، عذاب کی کمی کا باعث ہے اور جو شخص کہتا ہے کہ اس کی توبہ صحیح ہے اس سے پوچھو کہ اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ بعض گناہوں سے توبہ ایسی قبولیت کا باعث ہے جو نجات یا کامیابی تک پہنچاتی ہے تو یہ بات بھی غلط ہے بلکہ نجات اور کامیابی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب تمام گناہوں کو چھوڑ دے یہ ظاہر کا حکم ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر کے مخفی اسرار میں گفتگو نہیں کرتے۔

اور جو شخص کہتا ہے کہ یہ توبہ صحیح نہیں اگر وہ کہے کہ میری مراد یہ ہے کہ توبہ ندامت کا نام ہے اور چوری پر وہ اس لیے نادم ہوتا ہے کہ یہ گناہ ہے اس لیے نہیں کہ یہ چوری ہے اور محال ہے کہ وہ چوری پر نادم ہو لیکن زنا پر پشیمان نہ ہو اگر اس کے گناہ ہونے کی وجہ سے پریشان ہوتا ہے کیوں کہ دونوں کی علت ایک ہی ہے کیوں کہ جس آدمی کو اپنے بیٹے کے تلوار سے قتل ہونے کا دُکھ ہوتا ہے اسے اس کے چھری سے قتل ہونے پر بھی دکھ ہوتا ہے کیونکہ اس کی پریشانی تو محبوب (بیٹے) کے چلے جانے کی وجہ سے ہے چاہے وہ تلوار کے ذریعے ہو یا چھری کے ساتھ ضائع ہو۔

تو جب بندے کو اپنے محبوب کے ضائع ہونے کا دُکھ ہوتا ہے اور یہ نافرمانی کی وجہ سے ہوتا ہے چاہے وہ چوری کے ذریعے ہو یا زنا کے باعث ـــــ تو بعض گناہوں پر پریشانی ہو اور بعض پر نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے تو ندامت ایک حالت ہے جو اس بات کے علم سے واجب ہوتی ہے کہ گناہ، محبوب کو ضائع کرنے کا باعث ہے یہ بات نہیں کہ بعض گناہوں سے ایسا ہوتا ہے اور بعض سے نہیں۔

اگر یہ بات جائز ہوتی تو شراب کے ایک مٹکے سے توبہ کرنا اور دوسرے سے نہ کرنا جائز ہوتا اور جب یہ بات محال ہے کیوں کہ گناہ دونوں مٹکوں کی شراب میں ایک جیسا ہے مٹکے تو محض برتن ہیں۔ تو اسی طرح گناہوں کا مسئلہ ہے کیوں وہ سب اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا باعث ہیں اور نافرمانی اس اعتبار سے کہ نافرمانی ہے ایک طرح کی ہے۔

اس وقت توبہ کے صحیح نہ ہونے کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں سے ایک مقام و مرتبہ کا وعدہ فرمایا ہے جو ندامت کے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک جیسے گناہوں میں سے بعض پر ندامت ہو اور بعض پر نہ ہو یہ ایسے ہی ہے جیسے ملک کا حصول ایجاب و قبول دونوں کے مکمل ہونے سے ہوتا ہے جب تک ایجاب و قبول کی تکمیل نہیں ہوگی عقد صحیح نہیں ہوگا یعنی اس کا نتیجہ حاصل نہیں ہوگا اور وہ مالک بننا ہے۔

اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ محض گناہ کو چھوڑنے کا فائدہ صرف اتنا ہو گا کہ جس قدر گناہ چھوڑا ہے اس کا عذاب نہیں ہو گا جب کہ ندامت کا فائدہ یہ ہے کہ گذشتہ گناہ معاف ہو جائیں گے پس چوری چھوڑنے سے پہلے کی گئی چوری کا کفارہ ادا نہیں ہو گا بلکہ اس پر ندامت کفارہ بنے گی۔ اور ندامت کا تصور اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اسے گناہ سمجھے اور یہ بات تمام گناہوں کو شامل ہے۔

یہ ایسا کلام ہے جس کا مفہوم واقع ہے اور انصاف پسند اس کی ایسی تفصیل بیان کرتا ہے جس سے مطلب واضح ہو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ بعض گناہوں سے توبہ تین حال سے خالی نہیں یا تو کبیرہ گناہوں سے ہو گی صغیرہ سے نہیں یا صغیرہ سے ہو گی، کبیرہ سے نہیں یا بعض کبیرہ سے ہو گی اور بعض سے نہیں۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کبیرہ گناہ سے ہو صغیرہ سے نہ ہو تو یہ بات ممکن ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کبیرہ گناہ بڑے گناہ شمار ہوتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب کو دعوت دیتے ہیں جب کہ صغیرہ گناہوں کی معافی ہو سکتی ہے تو یہ بات محال نہیں کہ وہ بڑے گناہ سے توبہ کرے اور اس پر نادم ہو جیسے ایک شخص بادشاہ اور اس کی بیوی کے خلاف جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کے جانور کو بھی نقصان پہنچاتا ہے تو وہ اس کے گھر والوں کے حوالے سے کئے گئے جرم سے خوف زدہ ہوتا ہے جب کہ جانور کی نسبت سے کئے گئے جرم کو معمولی سمجھتا ہے اور ندامت گناہ کو بڑا سمجھنے اور اس کے اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث ہونے کے اعتبار سے ہوتی ہے اور شریعت میں اس کا وجود ممکن ہے گذشتہ زمانوں میں توبہ کرنے والے لوگ بے شمار تھے اور ان میں سے کوئی بھی معصوم نہ تھا کیوں کہ توبہ کے لیے معصوم ہونا ضروری نہیں اور ڈاکٹر بعض اوقات مریض کو شہد سے نہایت سختی سے منع کرتا ہے لیکن شکر سے ممانعت نچلے درجہ کی ہوتی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بعض اوقات، شکر کا نقصان بالکل ظاہر نہیں ہوتا تو مریض شہد سے توبہ کرتا ہے شکر سے نہیں اس بات کا پایا جانا محال نہیں ہے اور اگر وہ اپنی خواہشات کے تحت دونوں کو کھائے تو اسے شہد کے کھانے پر ندامت ہو گی شکر کے استعمال پر نہیں دوسری صورت یہ ہے کہ بعض کبیرہ گناہوں سے توبہ کرے اور بعض سے نہ کرے اور یہ بات بھی ممکن ہے کیوں کہ اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ بعض کبیرہ گناہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت سخت ہیں جیسے کوئی شخص قتل لوٹ مار ظلم اور بندوں کے حقوق سلب کرنے سے توبہ کرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ بندوں کے حقوق سے متعلق گناہوں کو احساب کے بغیر چھوڑا نہیں جائے گا جب کہ وہ گناہ جن کا حقوق اللہ سے تعلق ہے وہ جلدی معاف ہو جاتے ہیں اور یہ بات بھی ممکن ہے جیسا کہ کبیرہ اور صغیرہ گناہوں میں تفاوت ہے کیوں کہ کبیرہ گناہوں میں بھی تفاوت ہے اور ان کے مرتکب کے اعتقاد میں بھی اختلاف ہے۔ اسی لیے وہ بعض اوقات ان کبیرہ گناہوں سے بھی توبہ کرتا ہے جن کا حقوق العباد سے کوئی تعلق نہیں ہے جیسے وہ شراب سے توبہ کرتا ہے لیکن زنا سے توبہ نہیں کرتا کیونکہ اس کے سامنے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شراب تمام برائیوں کی چابی ہے اور یہ کہ جب، عقل زائل ہو جائے تو وہ تمام گناہوں کا ارتکاب کرے گا اور اسے علم بھی نہیں ہو گا۔ تو

اس کے نزدیک شراب نوشی جس سے خوف پیدا ہوتا ہے اسے ترجیح دینا اس کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ مستقبل میں اسے چھوڑ دے اور گذشتہ پر ندامت اختیار کرے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ وہ کسی ایک صغیرہ یا زیادہ صغیرہ گناہوں سے توبہ کرے حالانکہ وہ کبیرہ گناہ پر ڈٹا ہوا ہو اور وہ جانتا بھی ہو کہ یہ کبیرہ گناہ ہے جیسے ایک شخص غیبت یا غیر محرم کی طرف دیکھنے وغیرہ سے توبہ کرتا ہے لیکن وہ بار بار شراب پیتا ہے تو ایسا بھی ہو سکتا ہے کیوں کہ ہر مومن گناہوں سے ڈرتا ہے اور ان پر نادم ہوتا ہے چاہے وہ کمزور ہو یا طاقت ور لیکن اس گناہ میں اس کی لذتِ نفس اس گناہ کے خوف کی وجہ سے پیدا ہونے والے قلبی دکھ اور تکلیف سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے کیوں کہ کچھ ایسے اسباب ہیں جو خوف کو کمزور کرتے ہیں مثلاً جہالت اور غفلت وغیرہ اور کچھ اسباب خواہش کو مضبوط کرتے ہیں۔

پس ندامت موجود ہوتی ہے لیکن اتنی نہیں ہوتی کہ اس سے تحریکِ عزم پر قادر ہو پس اگر قوی شہوت سے بچ جائے یعنی اس کے مقابلے میں کمزور شہوت ہو تو خوف اس خواہش پر غالب ہو کر اسے دبا لے گا اور اس سے گناہ کا چھوڑنا لازم ہو گا اور بعض اوقات فاسق کو شراب کی اس قدر رغبت ہوتی ہے کہ وہ اس سے صبر نہیں کر سکتا اور اسے غیبت، عیب جوئی اور غیر محرم کی طرف دیکھنے کی بھی کچھ خواہش ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے لیکن یہ خوف اسی قدر ہوتا ہے جس سے کمزور خواہش کا قلع قمع ہو سکے مضبوط خواہش کا نہیں۔ اب خوف کا لشکر اسے چھوڑنے کا عزم پیدا کر سکتا ہے بلکہ یہ فاسق اپنے دل میں کہتا ہے کہ اگر شیطان اس غلبۂ شہوت کے واسطے سے بعض گناہوں میں مجھ پر غالب آجائے تو مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ لگام بالکل ڈھیلی چھوڑ کر اسی کے قابو میں چلا جاؤں بلکہ میں بعض گناہوں میں اس سے لڑوں گا ہو سکتا ہے میں اس پر غالب آجاؤں تو بعض گناہوں کے سلسلے میں میرا اس پر غالب آنا میرے بعض گناہوں کا کفارہ ہو گا اگر اس بات کا تصور نہ ہوتا تو فاسق سے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا تصور نہ کیا جاتا ——— اور اس سے کہا جاتا کہ اگر تمہاری نماز اللہ تعالیٰ کے غیر کے لیے ہے تو یہ صحیح نہیں اور اگر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہی فسق کو چھوڑ دے کیوں کہ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا حکم یکساں ہے۔

یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہاری نماز تقربِ خداوندی کے لیے ہو جب تک تم اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے اس نافرمانی ترک نہ کرو اور یہ کہنا محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مجھ پر دو امر ہیں اور میرے لیے اس کی نافرمانی میں دو سزائیں ہیں ایک کے سلسلے میں تو میں شیطان پر غالب آسکتا ہوں لیکن دوسری کے بارے میں عاجز ہوں تو جس میں مجھے قدرت حاصل ہے میں اس پر غالب آؤں گا اور مجھے امید ہے کہ اس کے لیے شیطان کے ساتھ میرا مقابلہ ان بعض گناہوں کا کفارہ بن جائے گا جن میں زیادہ خواہش کی وجہ سے میں عاجز ہوں تو اس بات کا تصور کیسے نہیں ہو گا اور یہ ہر مسلمان کی حالت ہے کیوں کہ ہر مسلمان اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی کرتا ہے اور نافرمانی بھی اور اس کا سبب یہی بات ہے۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بعض گناہوں کی خواہش کے سلسلے میں خوف کا غلبہ ممکن الوجود ہے اور خوف اگر گزشتہ عمل سے متعلق ہو تو اس سے ندامت پیدا ہوتی ہے اور ندامت، عزم کو جنم دیتی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"اَلنَّدَمُ التَّوْبَةُ"، ندامت، توبہ ہے۔ اور ہر گناہ پر ندامت شرط نہیں ہے اور آپ نے فرمایا۔

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ۔ گناہ سے توبہ کرنے والا گناہ نہ کرنے والے کی طرح ہے۔

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمام گناہوں سے توبہ کرنے والا ایسا ہے۔

ان معانی کی بنیاد پر یہ بات کہنے والے کا قول ساقط ہو گیا کہ بعض گناہوں سے توبہ غیر ممکن ہے کیوں کہ وہ خواہش کے حق میں اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بننے میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ شراب نوشی سے توبہ کرے لیکن نبیذ (انگور کے رس) سے توبہ نہ کرے کیوں کہ ناراضگی کے اقتضا میں دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ نیز وہ کثیر سے توبہ کرے قلیل سے نہ کرے کیونکہ گناہوں کی کثرت عذاب کے زیادہ ہونے میں مؤثر ہوتی ہے تو جس قدر چھوڑنے سے وہ عاجز ہوتا ہے اس مقدار کے مطابق خواہشات مددگار ہوتی ہیں اور بعض خواہشات کو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے چھوڑ دیتا ہے جیسے کسی مریض کو ڈاکٹر نے پھل کھانے سے روکا ہو تو وہ تھوڑا پھل کھاتا ہے زیادہ نہیں کھاتا۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ وہ کسی گناہ سے توبہ کرے لیکن اسی جیسے دوسرے گناہ سے توبہ نہ کرے بلکہ جس سے اس نے توبہ کی ہے وہ اس کے خلاف ہو گا جو ابھی باقی ہے اور یہ اختلاف گناہ کی شدت کے اعتبار سے ہو گا یا غلبۂ شہوت کی وجہ سے ۔۔۔ اور جب توبہ کرنے والے کے اعتقاد میں یہ تفاوت و اختلاف حاصل ہوتا ہے تو خوف اور ندامت کے اعتبار سے بھی اس کی حالت مختلف ہوتی ہے اور یوں اس گناہ کو چھوڑنے کے اعتبار سے بھی اس کی حالت کا اختلاف متصور ہو گا تو اس کا اس گناہ پر نادم ہونا اور اسے چھوڑنے کا پکا ارادہ کرنا اسے ایسے لوگوں کے ساتھ ملا دیتا ہے جو گناہ نہیں کرتے اگرچہ وہ تمام اوامر و نواہی میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں کرتا۔

سوال:

جو شخص عنین ہو (جسے جماع کی طاقت نہ ہو) اور اس نے اس بیماری سے پہلے زنا کیا ہو کیا اس کی توبہ صحیح ہے؟

جواب:

میں کہتا ہوں اس کی توبہ قبول نہ ہو گی کیونکہ توبہ اس ندامت کا نام ہے جس سے گناہ چھوڑنے کا مضبوط ارادہ پیدا ہوتا ہے اور یہ ایسے شخص کے لیے ہے جو گناہ پر قادر ہو۔ اور جو آدمی گناہ پر قادر ہی نہیں اس کے لیے گناہ کا وجود خود بخود ختم ہو گیا اس کے چھوڑنے سے نہیں۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر اس بیماری کے بعد اسے ایسی معرفت حاصل ہو جس سے گذشتہ کیے گئے گناہ کا نقصان متحقق ہو جائے اور اس سے جلن، افسوس اور ندامت پیدا ہو یعنی اگر اسے جماع کی خواہش باقی ہو تو ندامت کی جلن اس شہوت کا قلع قمع کر دے اور اس پر غالب آجائے تو مجھے اس بات کی امید ہے کہ یہ اس کے گناہ کا کفارہ بنے اور اسے مٹا دے کیونکہ اس بات میں اختلاف نہیں ہے کہ اگر وہ عنین بننے سے پہلے توبہ کرتا ہے اور اس کے فوراً بعد مر جاتا تو وہ توبہ کرنے والوں میں شمار ہوتا ہے۔

اور اگر اس پر ایسی حالت طاری نہ ہو جس میں شہوت برانگیختہ ہوتی ہے اور اسباب شہوت کا پورا کرنا آسان ہوتا ہے لیکن وہ توبہ کرنے والا ہوگا کیونکہ اس کی ندامت اس حد تک پہنچ گئی جو اس کے ارادے کو زنا سے پھیرنا ضروری قرار دیتی ہے یا اس کا ارادہ ظاہر ہو جاتا ہے اور جب عنین کے حق میں ندامت کی قوت کا یہاں تک پہنچنا محال نہیں ہے لیکن وہ خود جانتا نہیں کیوں کہ جس آدمی کو کسی چیز کی خواہش نہ ہو وہ ادنیٰ خوف کے ساتھ بھی اپنے نفس کو اس کے چھوڑنے پر قادر سمجھتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ اس کی ضمیر اور ندامت کی مقدار پر مطلع ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اسے قبول فرمائے بلکہ اس کی قبولیت ظاہر ہے۔ ان تمام باتوں میں حقیقت اس بات کی طرف لوٹتی ہے کہ گناہ کا اندھیرا دل سے دو چیزوں کو مٹا دیتا ہے ایک ندامت کی جلن اور دوسری بات مستقبل میں اسے چھوڑنے کے ذریعے سخت مجاہدہ کرنا۔ اور زوالِ شہوت سے مجاہدہ ممتنع ہو گیا لیکن ندامت کا مضبوط ہونا محال نہیں ہے کیوں کہ ندامت، مجاہدے کے بغیر بھی اسے مٹانے پر قادر ہوتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ہم کہتے کہ توبہ کرنے والا جب تک توبہ کے بعد زندہ نہ رہے اس کی توبہ قبول نہ ہوگی کیوں کہ اسے زندگی میں کئی بار اس شہوت کے سلسلے میں اپنے نفس سے مجاہدہ کرنا پڑے گا لیکن شریعت کا ظاہر اس قسم کی شرط پر بالکل دلالت نہیں کرتا۔

سوال:

فرض کیا دو قسم کے توبہ کرنے والے ہیں ایک وہ ہے جو توبہ کے بعد گناہ کی طرف میلان نہیں رکھتا جب کہ دوسرے کے نفس میں اب بھی میلان باقی ہے لیکن وہ نفس سے مجاہدہ کر کے اسے اس کی طرف جانے سے روکتا ہے اور منع کرتا ہے تو ان میں سے کونسا افضل ہے؟

جواب:

اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے حضرت احمد بن ابی الحواری اور ابو سلیمان دارانی کے اصحاب فرماتے ہیں کہ نفس سے مجاہدہ کرنے والا افضل ہے کیوں کہ اسے توبہ کے ساتھ ساتھ مجاہدے کی فضیلت بھی حاصل ہے جب کہ بصرہ کے علماء فرماتے ہیں دوسرا آدمی افضل ہے کیونکہ اگر وہ اپنی توبہ میں کوتاہی بھی کرے پھر بھی وہ اس مجاہد کی نسبت سلامتی کے زیادہ

قریب ہے جس کے مجاہدے میں کوتاہی آسکتی ہے۔ دونوں فریقوں نے جو کچھ فرمایا وہ حق بھی ہے اور کمالِ حقیقت میں کوتاہی سے خالی بھی نہیں ہے لیکن اس میں حق بات یہ ہے کہ جس شخص کا گناہ کی طرف میلان نہیں رہا اس کی دو حالتیں ہیں پہلی حالت یہ کہ اس کے میلان کا ختم ہونا محض اس وجہ سے ہے کہ نفس شہوت میں کمی آگئی تو اس کے مقابلے میں مجاہد افضل ہے کیونکہ وہ مجاہدے کی وجہ سے چھوڑتا ہے جو اس کی قوتِ نفس پر دلالت کرتا ہے نیز یہ کہ اس کے دین کو اس کی شہوت پر غلبہ حاصل ہے اور یہ قوتِ یقین اور قوتِ دین پر قطعی دلیل ہے۔

اور قوتِ دین سے ہماری مراد وہ ارادہ ہے جو اشارۂ یقین سے برانگیختہ ہوتا ہے اور شیاطین کے ارادے سے برانگیختہ ہونے والی شہوت کا خاتمہ کر دیتا ہے تو مجاہدہ ان دو قوتوں پر قطعی طور پر دلالت کرتا ہے۔

اور یہ کہنا کہ یہ شخص سلامتی کے زیادہ قریب ہے کیوں کہ جب خواہش میں کمی ہو گی تو وہ گناہ کی طرف نہیں لوٹے گا تو یہ بات صحیح ہے لیکن اس کے لیے "افضل" کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ جسے جماع کی طاقت نہیں وہ اس سے افضل ہے جسے اس کی طاقت ہے کیوں کہ وہ شہوت کے خطرے سے محفوظ ہے اور بچہ، بالغ سے افضل ہے کیوں کہ اسے سلامتی حاصل ہے اور مفلس اس بادشاہ سے افضل ہے جو اپنے دشمنوں پر غالب اور ان کا قلع قمع کرنے والا ہے کیوں کہ مفلس کا کوئی دشمن نہیں ہوتا اور بادشاہ بعض اوقات مغلوب ہو جاتا ہے اگرچہ کئی بار غالب ہو۔

ایسی باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جن کا دل محفوظ ہے اور ان کی نگاہ صرف ظاہر پر ہوتی ہے وہ سیدھے سادے لوگ ہوتے ہیں انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ عزت تو خطرناک مقامات پر جانے میں ہے اور بلندی کے لیے یہی شرط ہے کہ وہ دھوکے کے مقامات پر جائے بلکہ یہ تو اس آدمی کے قول کی طرح ہے جو کہتا ہے کہ وہ شکاری جس کے پاس گھوڑا اور کتا نہ ہو وہ شکار کے فن میں افضل ہے اور رکھنے والے سے بلند مرتبہ ہے کیوں کہ اسے گھوڑے کی سرکشی کا خطرہ نہیں ہوتا جس کی وجہ وہ گر جائے اور اس کے اعضاء ٹوٹ جائیں اور اس بات سے بھی بے خوف ہوتا ہے کہ کتا اسے کاٹے اور اس پر زیادتی کرے — تو یہ بات غلط ہے۔

بلکہ جس کے پاس گھوڑا یا کتا ہوتا ہے جب وہ مضبوط ہو اور وہ ان کی عمدہ تربیت کا طریقہ جانتا ہو وہ شکار کرنے کی سعادت کی وجہ سے دوسروں سے بلند مرتبہ ہوگا۔

<u>دوسری حالت:</u>

قوتِ یقین کی وجہ سے گناہ کی طرف میلان نہ رہا ہو اور پہلے کی نسبت سچا مجاہدہ کر کے شہوت کے غلبہ کا استیصال کر چکا ہو حتیٰ کہ وہ آدابِ شریعت سے مزین ہو چکا ہو اور اب اس کی خواہش دین کے اشارے کے مطابق ہو اور دین کے اس پر غلبہ کی وجہ سے وہ ٹھہر چکی ہو یہ اس شخص کی نسبت اعلیٰ مرتبہ پر ہے جسے شہوت کے خاتمے کے لیے تکلیف اٹھانا پڑے۔

اور کسی شخص کا یہ کہنا کہ اسے مجاہدے کی فضیلت حاصل نہ ہو گی، جہاد و مجاہدے کے مقصود سے ناواقف ہونے کی

دلیل ہے کیوں کہ مجاہدہ بعینہٖ مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود تو دشمن کو اپنے آپ سے دُور کرنا ہے تاکہ وہ تجھے اپنی خواہشات کی طرف نہ کھینچے اور اگر وہ تجھے اپنی طرف کھینچنے سے عاجز ہو تو دین کے راستے کی طرف چلنے سے نہ روکے پس جب تم اس پر غالب آجاؤ اور مقصود حاصل ہو جائے تو تم نے کامیابی حاصل کرلی اور جب تک تم مجاہدہ میں رہو گے کامیابی کے طالب شمار ہو گے اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کسی نے دشمن پر غلبہ پایا اور اسے اپنا غلام بنالیا ہو جب کہ دوسرا ابھی تک لڑ رہا ہو اور لڑائی میں مصروف ہو اسے معلوم نہیں کہ وہ کیسے محفوظ رہے گا۔

نیز اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے شکاری کتے کو سکھالیا اور گھوڑے کو سدھالیا ہو اور اب وہ دونوں اس کے پاس سوئے ہوئے ہوں کتے نے کاٹنا اور گھوڑے نے سرکشی ترک کردی ہو۔ جب کہ دوسرا شخص وہ ہے جو ابھی تک ان کو سکھانے میں مشغول ہے۔

اس سلسلے میں ایک فریق کے قدم پھسل گئے انہوں نے گمان کیا کہ جہاد ہی مقصودِ اعلیٰ ہے انہیں معلوم نہیں کہ یہ تو راستے کی خرابیوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا نام ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے گمان کیا کہ خواہشات کا مکمل طور پر قلع قمع کرنا مقصود ہے حتیٰ کہ بعض لوگوں نے اپنے نفسوں پر اس بات کا تجربہ کیا لیکن وہ اس سے عاجز رہے اور کہنے لگے یہ محال ہے چنانچہ انہوں نے شریعت کو جھٹلا دیا اور اباحت کے راستے پر چل پڑے اور خواہشات کی اتباع شروع کردی یہ تمام باتیں جہالت اور گمراہی ہیں ہم نے ریاضت نفس کے بیان میں ذکر کیا ہے

سوال:

ان دو توبہ کرنے والوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جن میں سے ایک نے اپنے گناہ بھلا دیئے اور وہ غور و فکر میں مشغول نہ ہوا جب کہ دوسرے نے ان کو پیشِ نظر رکھا اور وہ ہمیشہ غور و فکر کرتا ہے اور ان پر ندامت کی آگ میں جلتا ہے تو ان میں سے کونسا افضل ہے؟

جواب:

اس سلسلے میں بھی اختلاف ہے بعض حضرات نے فرمایا حقیقتِ توبہ یہ ہے کہ تم اپنے گناہوں کو اپنے پیشِ نظر رکھو۔ کسی دوسرے نے کہا کہ حقیقتِ توبہ گناہوں کو بھلانے کا نام ہے ہمارے نزدیک یہ دونوں مذہب حق ہیں لیکن دونوں حالتوں کی طرف اضافت کرتے ہوئے اور صوفیوں کا کلام ہمیشہ ناقص ہوتا ہے کیوں کہ ان میں سے ہر ایک کی عادت ہے کہ وہ صرف اپنے حال کی خبر دیتا ہے دوسروں کے معاملے کی ان کو فکر نہیں ہوتی پس حال کے اختلاف سے جواب بھی مختلف ہوتے ہیں اور یہ ارادے، ہمت اور کوشش کی طرف نسبت کے حوالے سے نقصان ہے کیوں کہ ایسا آدمی اپنی حالت پر ہی نظر رکھتا ہے دوسرے کے حال سے اسے غرض نہیں ہوتی کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کا راستہ محض اس کا نفس ہے

اور اس کی منازل اس کے احوال ہیں اور بعض اوقات بندے کا اللہ تعالیٰ کی طرف راستہ علم سے ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف راستے بے شمار ہیں اگرچہ قرب و بُعد کے لحاظ سے ان میں اختلاف ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کون زیادہ صحیح راستے پر ہے جب کہ اصل ہدایت میں وہ مشترک ہوتے ہیں۔

تو میں (امام غزالی رحمہ اللہ) کہتا ہوں کہ گناہ کا تصور، اس کا ذکر اور اس پر رونا دھونا مبتدی کے حق میں کمال ہے کیونکہ جب وہ اسے بھول جائے گا تو اس کا جلنا زیادہ نہیں ہوگا پس اس کا ارادہ اور سلوک کے راستے کی طرف شوق نہیں ہوگا یہی وجہ ہے کہ اس سے خوف اور غم جو اس قسم کے گناہ کی طرف لوٹنے سے روکتا ہے، زائل ہو جائے اور سالک کے لیے یہ نقصان کی بات ہے کیوں کہ یہ ایسی مشغولیت ہے جو سلوکِ طریق سے مانع ہے بلکہ سالک کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ سلوک کے علاوہ کسی طرف توجہ نہ دے اور اگر اس کے لیے منزل تک پہنچنے کے آثار واضح ہوں، انوار معرفت اور غیب کی چمک منکشف ہو تو وہ اس میں مستغرق ہو جائے گا اور اس کے لیے دوسری جانب توجہ کی گنجائش نہ ہوگی اور یہ کمال ہے۔

بلکہ اگر کسی مسافر نے کسی شہر کی طرف جانا ہو اور راستے میں نہر پڑتی ہو جس کا پل پہلے ہی اس نے توڑ دیا ہو تو وہ ایک مدت تک اسے عبور کرنے کی مشقت اٹھائے گا اور اگر وہ نہر کو عبور کر کے کنارے پر بیٹھ جائے اور پل کے توڑنے پر افسوس کا اظہار کرے تو یہ دوسری رکاوٹ ہے جو پہلی رکاوٹ سے فراغت کے بعد پیش آئی ہے۔

ہاں اگر جانے کا وقت نہ ہو مثلاً رات کا وقت ہو اور چلنا مشکل ہو یا اس کے راستے میں نہریں ہوں اور اسے وہاں سے گزرنے کا خوف درپیش ہو تو پل کے ٹوٹنے پر رات بھر روتا رہے تاکہ طویل غم کی وجہ سے دوبارہ ایسا کام کرنے کا ارادہ نہ کرے۔ اور اگر اسے تنبیہ ہو چکی ہو اور نفس پر پختہ یقین ہو کہ وہ آئندہ ایسا کام نہیں کرے گا، تو پل کی یاد میں رونے اور افسوس کرنے کی بجائے راستے پر چلنا زیادہ بہتر ہے اور یہ بات وہی شخص جانتا ہے جو راستے کی معرفت رکھتا ہے۔

نیز وہ مقصد، رکاوٹ اور راستے پر چلنے سے واقف ہو ہم نے علم کے بیان میں اشارتاً اور ہلاکت خیز امور کے بیان میں بھی ذکر کیا ہے۔

بلکہ ہم کہتے ہیں کہ دوام توبہ کی شرط یہ ہے کہ اُخروی نعمتوں کے بارے میں زیادہ غور و فکر کرے تاکہ اس کی رغبت زیادہ ہو لیکن اگر وہ نوجوان ہے تو ان چیزوں کے بارے میں زیادہ غور نہ کرے جن کی مثل دنیا میں ہے مثلاً حُوریں اور محلات وغیرہ کیوں کہ بعض اوقات یہ فکر رغبت کو حرکت دیتا ہے اور وہ فوری طور پر ملنے والی نعمت طلب کرتا ہے اور اُخروی نعمت پر راضی نہیں ہوتا بلکہ اسے چاہیے کہ وہ صرف دیدار خداوندی کی لذت کے بارے میں سوچے کیوں کہ دنیا میں اس کی کوئی مثل نہیں ہے اسی طرح بعض اوقات گناہ کی یاد شہوت کو حرکت دیتی ہے اور مبتدی کو بھی اس سے نقصان پہنچتا ہے اس وقت بھول جانا ہی افضل ہے۔

اور تمہیں اس بات کو بیچ سمجھنے سے اس لیے اعراض نہیں کرنا چاہیئے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنی خطا پر روئے تھے کیوں کہ اپنے آپ کو انبیاء کرام علیہم السلام پر قیاس کرنا انتہائی کج فہمی ہے کیوں کہ وہ بعض اوقات اپنے اقوال وافعال کو اس قدر نیچے لے آتے ہیں کہ وہ درجات ان کی امتوں کے لائق ہیں وہ تو ہدایت دینے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں پس وہ امت کی تعلیم اور نفع کے لیے اپنے مقام سے نیچے اتر کر بعض کام کرتے ہیں (مثلاً وہ گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں حالانکہ وہ (انبیاء کرام) گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں تو یہ محض امت کی تعلیم کے لیے ہوتا ہے کسی نبی کے استغفار سے یہ سمجھنا کہ وہ بھی معاذ اللہ گناہ گار تھے انتہائی درجہ کی جہالت ہے ۱۲ ہزاروی)

کئی مشائخ اپنے مرید کو کسی ریاضت کا حکم دیتے ہیں تو خود اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں حالانکہ وہ مجاہدہ سے فراغت کے بعد اس سے بے نیاز ہوتے ہیں وہ اپنے نفس کی تادیب کر چکے ہوتے ہیں لیکن مرید کی آسانی کے لیے اس طرح کرتے ہیں۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَمَا اِنِّی لَا اَنْسٰی وَلٰکِنْ اُنَسّٰی لِاُشَرِّعَ۔ سنو! میں بھولتا نہیں بلکہ مجھے بھلایا جاتا ہے تاکہ تمہارے لیے جواز کی دلیل ہو۔ (۱)

اور ایک روایت میں ہے کہ میں اس لیے بھولتا ہوں کہ تمہارے لیے سنت بنے اور اس بات سے تمہیں تعجب نہیں ہونا چاہیے کیونکہ امتیں انبیاء کرام کی شفقت کے سائے میں اسی طرح ہوتی ہیں جیسے بچے باپ کے سایۂ عاطفت میں ہوتے ہیں اور جیسے جانور چرواہے کی حمایت میں ہوتے ہیں (۲)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب باپ اپنے بچے کو بولنا سکھاتا ہے تو کیسے وہ بچوں کی طرح باتیں کرتا ہے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا "کخ کخ" (کسی چیز کے کھانے پینے بچوں کو منع کرنے کے لیے بولا جاتا ہے) یہ اس وقت کی بات ہے جب انہوں نے صدقہ کی ایک کھجور اٹھا کر منہ میں ڈالی تھی۔ (۳)

حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت اس بات سے کوتاہ نہ تھی کہ آپ فرماتے یہ کھجور پھینک دو یہ حرام ہے لیکن جب آپ نے دیکھا کہ بچہ آپ کی بات سمجھ نہیں سکے گا تو فصاحت کو چھوڑ کر توتلی زبان کی طرف رجوع کیا بلکہ جو شخص کسی بکری یا پرندے کو سکھاتا ہے تو بکری کی آواز اور سیٹی کی آواز نکالتا ہے اور یہ اس کی تعلیم کی وجہ سے ہے تو تمہیں اس قسم کی باریک باتوں سے غافل نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ یہاں عارفین کے قدم پھسلتے ہیں غافل لوگوں کا ذکر ہی کیا ہے ہم اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم

---

(۱) موطا امام مالک ص ۸۴ کتاب السہو

(۲) سنن ابی داؤد جلد اول ص ۲ کتاب الطہارۃ

(۳) صحیح بخاری جلد اول ص ۲۰۲ کتاب الزکوٰۃ

سے حسن توفیق کا سوال کرتے ہیں۔

دوامِ توبہ کے سلسلے میں بندوں کی اقسام

جان لو! توبہ کرنے والے چار طبقات میں تقسیم ہوتے ہیں۔

پہلا طبقہ:

گناہ گار توبہ کرے اور آخر عمر تک توبہ پر قائم رہے اس طرح وہ اپنی کوتاہی کا تدارک کرتا ہے اور اس کا نفس اسے گناہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت نہیں دیتا البتہ وہ لغزشیں ہوتی رہتی ہیں جن سے عام طور پر انسان خالی نہیں ہوتا جب تک نبوت کے رتبہ پر فائز نہ ہو ـــــ توبہ پر استقامت ہے اور ایسا شخص نیکیوں میں سبقت لے جانے والا اور برائیوں کو نیکیوں میں بدلنے والا ہوتا ہے اس توبہ کو توبۃ النصوح کہتے ہیں اور یہ نفس، نفسِ مطمئنہ کہلاتا ہے جو اپنے رب کی طرف یوں لوٹتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے راضی اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں اسی طرف اشارہ ہے۔ آپ نے فرمایا۔

سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ الْمُسْتَهْتِرُوْنَ بِذِكْرِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَضَعَ الذِّكْرُ عَنْهُمْ اَوْزَارَهُمْ فَوَرَدُوْا الْقِيَامَةَ خِفَافًا۔ (۱)

اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ ذکر کرنے والے اور اس میں اور اس پر فریفتہ ہونے والوں سے ذکر الٰہی ان کے بوجھ اتار دیتا ہے تو وہ قیامت کے دن ہلکے بوجھ سے آئیں گے۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ بوجھوں کے نیچے دبے ہوئے تھے اور ذکر خداوندی نے ان سے یہ بوجھ اتار دیئے۔

خواہشات سے مزاحمت کے اعتبار سے ان لوگوں کے کئی طبقات ہیں کچھ توبہ کرنے والے ایسے ہیں کہ معرفت کے غلبہ کے نیچے ان کی خواہشات دب جاتی ہیں تو ان کا نزاع کم ہو جاتا ہے اور ان کے سلوک کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اور بعض وہ ہیں جو نفس کے نزاع سے خالی نہیں ہوتے لیکن وہ مجاہدۂ نفس اور شہوات کے رد میں تاخیر کرتے ہیں۔

پھر نزاع کے درجات بھی کثرت و قلت اور اختلاف مدت و اختلاف انواع کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں اسی طرح طولِ عمر کی وجہ سے بھی اختلاف ہوتا ہے بعض وہ ہوتے ہیں کہ توبہ کرتے ہی فوت ہو جاتے ہیں ایسے لوگ قابلِ رشک ہوتے ہیں کیوں کہ وہ سلامتی کے ساتھ اور کوتاہی کے ارتکاب سے پہلے ہی رخصت ہو گئے جب کہ بعض وہ ہوتے ہیں جو توبہ کے بعد عرصہ دراز تک زندہ رہتے ہیں ان کا مجاہدہ اور صبر تادیر رہتا ہے ان کی استقامت بھی زیادہ ہوتی ہے اور نیکیوں میں بھی اضافہ

---

(۱) جامع ترمذی ص ۱۷۵، ابواب الدعوات

ہوتا ہے ان لوگوں کا حال افضل واعلیٰ ہوتا ہے کیوں کہ ہر گناہ کو آنے والی نیکی مٹا دیتی ہے حتیٰ کہ بعض علماء نے فرمایا کہ گناہ گار نے جس گناہ کا ارتکاب کیا وہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتا جب تک وہ شخص صدقِ شہوت کے ساتھ اس پر دس مرتبہ قادر نہ ہو پھر اس سے صبر کرے اور محض خوفِ خداوندی کی وجہ سے شہوت کو توڑ دے۔

یہ شرط بعید از قیاس ہے لیکن اگر اسے فرض کیا جائے تو اس کے عظیم اثر کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن کمزور مرید کو اس راستے پر نہیں چلنا چاہیے اس طرح شہوت برانگیختہ ہوگی اور اسباب حاضر ہوں گے حتیٰ کہ وہ قادر ہو جائے گا پھر اس سے باز رہنے کی طمع کرے گا۔ کیوں کہ اس بات کا خوف موجود ہے کہ شہوت کی باگ اس کے اختیار سے باہر ہو جائے اس طرح وہ گناہ کی طرف بڑھے گا اور توبہ ٹوٹ جائے گی۔ بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے اسباب کے پیدا کرنے سے گریز کرے جو اس گناہ کو آسان کرنے والے ہیں حتیٰ کہ اپنے اوپر ان کا راستہ بند کر دے اور اس کے ساتھ شہوت کو توڑنے کی کوشش کرے جس قدر ہو سکے تاکہ شروع سے اس کی توبہ محفوظ رہے۔

دوسرا طبقہ:

یہ ایسا توبہ کرنے والا ہے جو اصل عبادات کی بجا آوری اور کبیرہ گناہوں کو چھوڑنے میں استقامت کا راستہ اختیار کرتا ہے لیکن پھر بھی ایسے گناہوں سے خالی نہیں ہوتا جو قصد و ارادہ کے بغیر ہو جاتے ہیں یعنی وہ ان گناہوں میں پھنس جاتا ہے وہ ارادے سے ان کا اقدام نہیں کرتا بلکہ جب وہ ان گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے تو اپنے نفس کو ملامت کرتا، نادم ہوتا اور افسوس کا اظہار کرتا ہے، بلکہ وہ اپنے اس عزم کی تجدید کرتا ہے کہ وہ اس گناہ کے اسباب سے بچتا رہے گا یہ نفس، نفس لوامہ (ملامت کرنے والا) کہلانے کے زیادہ لائق ہے کیوں کہ یہ آدمی کو ان برے احوال پر ملامت کرتا ہے جو بے ارادہ ہو جاتے ہیں ارادے اور قصد سے نہیں ہوتے، یہ بھی ایک بلند مرتبہ ہے اگرچہ پہلے مرتبہ کے مقابلے میں کم ہے۔

توبہ کرنے والوں کا عام حال یہی ہوتا ہے کیوں کہ انسان کی فطرت میں شر موجود ہے وہ بہت کم اس سے الگ ہوتی ہے۔ انسان کی انتہائی کوشش یہی ہے کہ وہ خیر کو شر پر غالب کرے تاکہ اس کے نامۂ اعمال کا نیکیوں والا پلڑا بھاری ہو اور نیکیوں کا وزن زیادہ ہو جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ گناہوں کا پلڑا بالکل ہی خالی ہو تو یہ بات نہایت بعید ہے، ان لوگوں سے اللہ تعالیٰ کا اچھا وعدہ ہے ارشاد خداوندی ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ۔ (۱)

وہ لوگ جو کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں سوائے چھوٹے گناہوں کے تو بے شک تمہارا رب وسیع مغفرت والا ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ النجم آیت ۳۲

توہر وہ چھوٹا گناہ کہ آدمی کا دل اس پر نہ جمے تو وہ اس لائق ہے کہ اسے لمم قرار دیا جائے جس کو معاف کیا گیا ہے۔
ارشاد خداوندی ہے:

وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ۔ (۱)

اور وہ لوگ جو بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں یا اپنے نفسوں پر ظلم کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے اور اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں۔

تو اس کے باوجود کہ ان لوگوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے کیوں کہ وہ لوگ نادم ہوتے اور اپنے نفسوں کو ملامت کرتے ہیں اسی قسم کے مرتبہ کی طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اشارہ ہے۔
حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

خِیَارُکُمْ کُلُّ مُفْتَّنٍ تَوَّابٍ۔ (۲)

تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو گناہ میں مبتلا ہونے کی صورت میں توبہ کرے۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے:

اَلْمُؤْمِنُ کَالسُّنْبُلَۃِ یَفِیْءُ اَحْیَانًا وَیَمِیْلُ اَحْیَانًا۔ (۳)

مومن (گندم) بالی کی طرح ہے کبھی لوٹا کرتا ہے کبھی جھکتا ہے۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے۔

لَا بُدَّ لِلْمُؤْمِنِ مِنْ ذَنْبٍ یَاْتِیْہِ الْفَیْنَۃَ بَعْدَ الْفَیْنَۃِ۔ (۴)

مومن کے لیے ضروری ہے کہ کبھی کبھار اس سے گناہ سرزد ہو تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اس کا یہ مطلب نہیں کہ قصداً گناہ کرے ہزاروی)

یہ سب اس بات کے قطعی دلائل ہیں کہ اس قدر گناہ توبہ کو نہیں توڑتا اور ایسا شخص گناہ پر اصرار کرنے والوں میں شامل نہیں ہوتا اور جو شخص ایسے لوگوں کو درجۂ تائبین سے مایوس کرے وہ اس ڈاکٹر کی طرح ہے جو تندرست آدمی کو دائمی صحت سے مایوس کرتا ہے کیوں کہ وہ بار بار گرم پھل اور کھاتے کھاتا ہے لیکن وہ ہمیشہ نہیں کھاتا اور یہ شخص اس فقیہ کی طرح ہے

---

(۱) قرآن مجید سورۂ آل عمران آیت ۱۳۵
(۲) شعب الایمان جلد ۵ ص ۴۱۸ حدیث ۷۱۲۰
(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۳۹۴، ۳۹۵، مرویات جابر
(۴) سنن ابن ماجہ جلد ۲ ص ۲۲۲

جو فقہ کے کسی طالب علم کو فقہاء کے درجہ پر پہنچنے سے مایوس کرتا ہے کیوں کہ وہ کبھی کبھی سبق کا تکرار نہیں کرتا حالانکہ وہ عام طور پر کوتاہی نہیں کرتا یہ بات ڈاکٹر اور فقیہ کی کوتاہی اور ناقص ہونے پر دلالت ہے بلکہ دین کا فقیہ تو وہ ہوتا ہے جو مخلوق کو سعادتوں کے درجات کے حصول سے صرف اس وجہ سے مایوس نہیں کرتا کہ وہ کبھی کبھی گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

كُلُّ بَنِيْ اٰدَمَ خَطَّاءُوْنَ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ الْمُسْتَغْفِرُوْنَ (۱)

تمام انسان غلطی کرتے ہیں لیکن بہترین خطاکار وہ ہیں جو توبہ کرتے اور بخشش مانگتے ہیں۔

نیز آپ نے ارشاد فرمایا۔

اَلْمُؤْمِنُ وَاهٍ رَاقِعٌ فَخَيْرُهُمْ مَنْ مَاتَ عَلٰى رَقْعِهٖ۔ (۲)

مومن پھاڑنے والا پیوند لگانے والا ہوتا ہے اور ان میں سے بہتر وہ ہے جو پیوند لگاتے لگاتے فوت ہو۔

یعنی گناہ کے ذریعے اپنے ایمان کو پھاڑتا ہے اور توبہ و ندامت کے ذریعے پیوند لگاتا ہے ارشاد خداوندی ہے

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ۔ (۳)

ان لوگوں کو دوگنا اجر دیا جائے گا کیونکہ انہوں نے صبر کیا اور وہ نیکی کے ذریعے برائی کو دور کرتے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے گناہ نہ ہونے کے باعث تعریف نہیں فرمائی۔

تیسرا طبقہ:

وہ لوگ جو توبہ کر کے ایک عرصہ تک اس پر استقامت اختیار کرتے ہیں پھر بعض گناہوں میں ان پر خواہش غالب آجاتی ہے تو وہ قصداً و ارادے سے اس گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں کیوں کہ غلبہ شہوت کی وجہ سے وہ عاجز ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ عبادت و اطاعت میں مصروف رہتے ہیں اور قدرت اور خواہش کے باوجود گناہوں کو چھوڑ دیتے ہیں ان پر صرف یہ ایک یا دو خواہشیں غالب آتی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس خواہش کو ختم کرنے کی طاقت دے اور اس کے شر سے بچائے وہ اس خواہش کو پورا کرتے وقت بھی یہ تمنا کرتے ہیں اور جب اس سے فارغ ہوتے ہیں تو نادم ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کاش میں ایسا نہ کرتا اور میں عنقریب اس سے توبہ کروں گا اور اس شہوت کے خاتمہ کے لیے نفس سے لڑوں گا لیکن اس کا نفس اسے ٹالتا رہتا ہے اور بار بار اپنی توبہ کو توڑتا ہے یہ وہ

---

(۱) سنن ابن ماجہ جلد

(۲) شعب الایمان جلد ۵ ص ۴۱۹ حدیث ۷۱۲۳

(۳) قرآن مجید، سورۃ القصص آیت ۵۴

نفس ہے جسے نفس مسولہ گمراہ کرنے والا نفس کہا گیا ہے اور ایسا آدمی ان لوگوں میں سے ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا۔ (۱)

اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور انہوں نے اچھے اور برے اعمال کو باہم ملا دیا۔

تو ایسا آدمی جو عبادت و اطاعت بھی کرتا ہے اور جس برائی کا مرتکب ہوتا ہے اسے ناپسند بھی کرتا ہے اس لیے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے لیکن توبہ میں تاخیر کی وجہ سے اس کا انجام خطرناک بھی ہے کیوں کہ ہو سکتا ہے توبہ سے پہلے مر جائے اور اللہ تعالیٰ جو چاہے فیصلہ فرمائے۔

اب اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کا تدارک کرے اس کے نقصان کو پورا کر دے اور اس کی توبہ قبول فرمائے تو وہ سابقین کے ساتھ مل جائے گا اور اگر اس پر بدبختی اور شہوت غالب آئے گی تو یہ خوف ہے کہ خاتمے کے وقت ازلی قول، صادق آجائے کیوں جب علم حاصل کرنے والا علم کے مشاغل سے احتراز کرتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازل میں اسے جاہلوں میں لکھا گیا ہے۔ تو اس کے حق میں امید کمزور ہو جاتی ہے اور جب اس کے لیے تحصیل علم کے اسباب کا دوام آسان ہوتا ہے تو یہ اس بات کی دلالت ہوتی ہے کہ ازل میں اس کے لیے لکھ دیا گیا ہے کہ یہ علماء میں سے ہے اسی طرح اخروی سعادتوں کا ارتباط اور ان کا حصول نیز برائیوں کا تعلق بھی اسباب سے متعلق ہے جس طرح مرض اور صحت غذاؤں اور دواؤں سے متعلق ہیں یونہی نفس کا فقہ سے تعلق کہ اس کے ذریعے بلند مناصب حاصل کرتا ہے سستی چھوڑنے اور نفس کو مسلسل فقہ کا عادی بنانے سے ہے تو جس طرح ریاستی منصب اور عہدۂ قضا نیز علمی سبقت کا استحقاق اسی نفس کو ہوتا ہے جو طویل فقہی تعلق کی وجہ سے فقیہ بن جاتا ہے پس آخرت کا ملک اور اس کی نعمتوں کا حصول اور رب العالمین کا قرب اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب دل طویل تزکیہ اور تطہیر کے باعث سلیم اور طاہر ہو تمام ارباب کے رب کی ازلی تدبیر اسی طرح ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰاهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔ (۲)

اور قسم ہے نفس کی اور جس نے اس کو ٹھیک بنایا پھر اس کے دل میں گناہ اور تقویٰ ڈالا تحقیق اس نے کامیابی پائی جس نے اسے پاک کیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اسے گناہ میں چھپایا۔

تو جب بندہ گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو گناہ نقد اور توبہ ادھار ہوتی ہے۔ اور یہ ذلت و رسوائی کی علامت ہے نبی اکرم صلی اللہ

---

(۱) قرآن مجید سورۃ توبہ آیت ۱۰۲

(۲) قرآن مجید، سورۃ والشمس آیت ۷، تا ۱۰

علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ سَبْعِيْنَ سَنَةً حَتّٰى يَقُوْلَ النَّاسُ إِنَّهُ مِنْ أَهْلِهَا وَلَا يَبْقٰى بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ إِلَّا شِبْرٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا۔ (۱)

"بندہ ستر سال جنتیوں والے عمل کرتا ہے حتی کہ لوگ کہتے ہیں یہ اہل جنت سے ہے اور اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس پر تقدیر ازلی سبقت کرتی ہے تو وہ جہنمیوں والے عمل کرنے لگتا ہے پس جہنم میں داخل ہو جاتا ہے"

تو توبہ سے پہلے خاتمہ کا خوف ہوتا ہے اور ہر سانس پہلی زندگی کے لئے خاتمہ ہے کیوں کہ ممکن ہے موت اس سے ملی ہوئی ہو لہذا تمام سانسوں کی حفاظت کرنی چاہیے ورنہ ممنوع کام میں پڑ جائے گا اور اس وقت دائمی حسرت میں مبتلا ہو گا جب اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

چوتھا طبقہ:

یہ لوگ توبہ کر کے ایک مدت تک اس پر استقامت اختیار کرتے ہیں پھر گناہ یا گناہوں کی طرف لوٹ آتے ہیں اور نئے سرے سے توبہ نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے فعل پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں بلکہ غافل آدمی کی طرح خواہشات کی مکمل طور پر اتباع کرتے ہیں یہ بھی گناہوں پر اصرار کرنے والوں میں سے ہے یہ نفس، برائی کا حکم دینے والا نفس ہے جو بھلائی سے بھاگتا ہے اس کو برے خاتمہ کا خوف ہوتا ہے اور اس کا معاملہ مشیتِ خداوندی کی حوالے ہوتا ہے اگر اس کا خاتمہ برائی پر ہو تو وہ ایسا بدبخت ہے جس کی بدبختی کی انتہا نہیں اور اگر بھلائی پر خاتمہ ہو حتی کہ اسے توحید پر موت آئے تو جہنم سے چھٹکارے کی امید ہوتی ہے اگرچہ ایک عرصہ کے بعد ہی ہو اور یہ بات بھی محال نہیں ہے کہ کسی خفیہ سبب کے باعث اسے عام معافی میں شامل کیا جائے جیسے کوئی شخص خزانے کے لیے کسی ویران جگہ چلا جائے تو اتفاقاً اسے خزانہ مل جائے تو یہ بات محال نہیں ہے اسی طرح وہ کسی گھر میں اس لیے بیٹھے کہ سیکھنے کے بغیر اسے اللہ تعالیٰ کئی علوم کا عالم بنا دے جیسے انبیاء کرام علیہم السلام کا معاملہ ہے۔

تو عبادات کے ذریعے بخشش طلب کرنا، محنت اور تکرار کے ذریعے علم حاصل کرنے اور تجارت نیز سمندری سفر کے ذریعے طلبِ مال کی طرح ہے جب کہ خراب اعمال کے ساتھ محض امید پر طلب مغفرت ایسے ہی ہے۔ جیسے ویران جگہ خزانہ تلاش کرنا اور فرشتوں کی تعلیم کے ذریعے علوم تلاش کرنا (ایسا ممکن ہے لیکن عام طور پر یوں نہیں ہوتا) کوشش کے بعد علم کا حصول، تجارت کرنے والے کو مالداری اور نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے والے کی بخشش ہو جانا بھی غنیمت ہے پس علماء کے علاوہ تمام لوگ محروم ہیں اور باعمل علماء کے علاوہ باقی تمام علماء محروم ہیں اور عمل کرتے والے بھی سب محروم ہیں سوائے مخلص لوگوں کے

---

(۱) صحیح بخاری جلد اول ص ۴۶۹ کتاب الانبیاء / مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۲۷۸ مرویات ابی ہریرہ

اور مخلص لوگوں کے لیے بھی بہت بڑا خطرہ ہے۔

تو جس طرح وہ شخص جو اپنے گھر کو ویران اور مال کو ضائع کر دیتا ہے اپنے آپ کو اور اہل وعیال کو بھوکا رکھتا ہے اس کا خیال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا منتظر ہے کہ وہ اسے خزانہ عطا فرمائے گا جسے وہ ویران گھر میں زمین کے نیچے پائے گا تو ایسا شخص عقلمند لوگوں کے نزدیک بیوقوف اور دھوکے میں شمار ہوتا ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور فضل میں وہ چیز محال نہیں ہے جس کا وہ منتظر ہے اسی طرح جو آدمی اللہ تعالیٰ کے فضل سے مغفرت کی انتظار کرتا ہے حالانکہ وہ عبادات میں کوتاہی کرتا ہے گناہوں پر مصر ہے اور مغفرت کے راستے پر نہیں چلتا تو وہ بھی اہل دل لوگوں کے ہاں بے عقل لوگوں میں شمار ہوتا ہے تو ایسے بے عقل شخص اور نیکی کو ضائع کرنے کے سلسلے میں اپنی حماقت کو رواج دینے والے پر تعجب ہے کہ جب وہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ کریم ہے اور اس کی جنت میرے جیسے لوگوں کے لیے تنگ نہیں ہے اور نہ ہی میرے گناہ نقصان دیں گے۔ پھر تم دیکھو گے کہ وہ سمندر میں سفر کرتا ہے اور دینار (روپے پیسے) کی طلب میں مشکلات برداشت کرتا ہے اور جب اسے کہا جاتا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ کریم ہے اور اس کے خزانوں کے دینار تمہارے فقر سے قاصر نہیں ہیں اور تجارت سے تمہاری سستی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی لہٰذا تو گھر میں بیٹھ جائے شاید وہ تجھے یہاں ہی اسے طریقے پر رزق عطا کرے جو تیرے وہم وگمان میں بھی نہیں ہے۔

تو وہ شخص اس قائل کا مذاق اڑائے گا اور اسے بیوقوف قرار دیتے ہوئے کہے گا یہ کیسی حرص ہے؟ آسمان سے سونا اور چاندی نہیں برستے یہ چیزیں تو کمانے سے حاصل ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ جو مسبب الاسباب ہے اس نے اسی طرح ان کو مقدر فرمایا ہے اور اپنا طریقہ اسی طرح جاری کیا اور اس کی سنت (طریقے) میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور وہ دھوکے کا شکار شخص یہ بات نہیں جانتا کہ آخرت اور دنیا کا رب ایک ہی ہے اور اس کی سنت دونوں جہانوں میں تبدیل نہیں ہوتی اور اس نے فرمایا ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۔ اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جو اس نے محنت کی۔

تو وہ کس طرح یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں کریم ہے اور دنیا میں کریم نہیں ہے۔ اور وہ کس طرح کہتا ہے کہ مال کمانے میں کوتاہی اس کے کرم کا تقاضا نہیں ہے اور عمل میں کوتاہی کے باوجود دائمی نعمت مل جائے گی اور یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے جو اسے کسی محنت کے بغیر آخرت میں عطا فرمائے گا۔ لیکن یہ (دنیوی مال) سخت محنت کے باوجود عام طور پر نہیں ملتا، (وہ یہ بات کہتا ہے لیکن) اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کو بھول جاتا ہے۔

وَفِى السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ اور آسمانوں میں تمہارا رزق ہے اور جس کا تم سے

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ النجم آیت ۳۹

وَمَا تُوْعَدُوْنَ۔ (۱) وعدہ کیا جاتا ہے۔

توہم اندھے پن اور بھٹکنے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں اور یہ عقیدہ جہالت کے اندھیرے کنویں میں سر کے بل گرنے اور غوطہ لگانے کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس قسم کا آدمی اس بات کے لائق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مصداق ہو۔ ارشاد خداوندی ہے۔

وَلَوْ تَرٰی اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاکِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا۔ (۲)

اور اگر تم دیکھو جب مجرم اپنے رب کے پاس اپنے سروں کو جھکائے ہوئے کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے دیکھا اور سنا پس ہمیں واپس لوٹا دے تاکہ ہم اچھے کام کریں۔

یعنی ہم نے دیکھ لیا کہ تو نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ ہے یعنی تو نے فرمایا۔

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی۔ (۳)

انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے اس نے کوشش کی۔

تو ہمیں واپس بھیج دے تاکہ ہم کوشش کریں۔ لیکن اس وقت واپسی ممکن نہ ہوگی اور اس پر عذاب ثابت ہو جائے گا توہم جہالت اور شک کی دعوت دینے والے (ایسے) امور سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں جو برے انجام کا باعث ہیں۔

فصل

توبہ کرنے والے سے گناہ سرزد ہو تو وہ کیا کرے

جس شخص نے توبہ کرلی ہو اب اگر وہ قصداً یا غلبۂ شہوت وغیرہ کی وجہ سے کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اس پر (دوبارہ) توبہ اور ندامت واجب ہے نیز اسے چاہیئے کہ وہ اس گناہ کے مقابل نیکی کے ذریعے کفارہ کی ادائیگی میں مشغول ہو جیسا کہ ہم نے اس کا طریقہ ذکر کیا ہے اور اگر شہوت کے غلبہ کی وجہ سے اس کا نفس ترکِ گناہ کے ارادے پر اس کی مدد نہ کرتا ہو تو وہ دو واجب باتوں میں سے ایک سے عاجز آگیا۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ دوسرے واجب کو نہ چھوڑے وہ یہ کہ وہ نیکی کے ذریعے برائی کو دور کرے تاکہ وہ مٹ جائے اب یہ ان لوگوں میں سے ہو جائے گا جن کے اچھے اور برے اعمال ملے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ الذاریات آیت ۲۲
(۲) قرآن مجید، سورۃ السجدہ آیت ۱۲
(۳) قرآن مجید سورہ النجم آیت ۲۹

دُھلتے ہیں۔ وہ نیکیاں جو گناہوں کا کفارہ بنتی ہیں ان کا تعلق دل سے ہوتا ہے یا زبان سے یا وہ اعضاء سے تعلق رکھتی ہیں تو جس عضو سے گناہ گا ارتکاب ہوا ہے یا بدی کے اسباب کا جس سے تعلق ہے اسی سے نیکی عمل میں لائے۔

جہاں تک دل کا تعلق ہے تو مغفرت اور عفو کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں گریہ وزاری کرے اور بھاگے ہوئے غلام کی طرح ذلت کا اظہار کرے حتیٰ کہ سب لوگوں پر اس کی ذلت ظاہر ہو جائے۔

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے درمیان تکبر میں کمی کرے کیوں کہ بھاگنے والے غلام کو حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے غلاموں پر برائی کا اظہار کرے اسی طرح مسلمانوں کے لیے خیرات اور عبادت پر عزم کا قلبی ارادہ ہونا چاہیے۔

اور جہاں تک زبان کا تعلق ہے تو ظلم کا اعتراف کرے اور بخشش طلب کرے اور کہے اسے میرے رب! میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور برا عمل کیا پس تو میرے گناہوں کو بخش دے اور استغفار کی تمام اقسام کو عمل میں لائے جیسا کہ ہم نے دعاؤں اور اذکار کے باب میں بیان کیا ہے۔

اور اعضاء کے ساتھ نیکی عبادات اور صدقات ہیں جو مختلف اقسام پر مشتمل ہیں روایات میں اس بات پر دلالت پائی جاتی ہے کہ جب ایک گناہ کے بعد آٹھ اعمال صالحہ لائے جائیں تو معافی کی امید ہوتی ہے چار اعمال کا تعلق دل سے ہے اور یہ، توبہ، توبہ کا عزم، گناہ چھوڑنے کی چاہت اور اس پر گناہ کا خوف نیز اس کی مغفرت کی امید ہے۔

اور چار اعمال کا تعلق اعضاء سے ہے ایک یہ ہے کہ گناہ کے بعد دو رکعتیں پڑھے اس کے بعد ستر بار استغفار کرے اور ایک سو مرتبہ "سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ" (پاک ہے اللہ تعالیٰ جو عظمت والا ہے اور اسی کی تعریف ہے) پڑھے پھر کوئی صدقہ کرے اور اس کے بعد روزہ رکھے۔

بعض روایات میں ہے کہ کامل وضو کرکے مسجد میں جائے اور دو رکعتیں پڑھے۔ (۱)

اور بعض احادیث مبارکہ میں ہے کہ چار رکعات پڑھے (۲)

ایک حدیث شریف میں آیا ہے۔

إِذَا عَمِلْتَ سَيِّئَةً فَأَتْبِعْهَا حَسَنَةً تُكَفِّرْهَا السِّرُّ بِالسِّرِّ وَالْعَلَانِيَةُ بِالْعَلَانِيَةِ۔ (۳)

جب تم سے کوئی برائی ہو جائے تو اس کے بعد نیکی کرو وہ اسے مٹا دے گی پوشیدہ کے بعد پوشیدہ اور علانیہ کے بدلے علانیہ۔

---

(۱) کنز العمال جلد ۴ ص ۲۲۶ حدیث ۱۵۲۷۸

(۲) شعب الایمان جلد اول ص ۲۷۴ حدیث ۶۱۰

(۳) کنز العمال جلد ۱۵ ص ۸۴۷ حدیث ۴۳۰۹۹

اسی لیے کہا گیا ہے کہ پوشیدہ صدقہ رات کے گناہوں کو اور ظاہری صدقہ دن کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔
اور صحیح حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے ایک عورت سے زنا کے علاوہ سب کچھ کیا تو آپ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ کیجئے۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے ہمارے ساتھ صبح کی نماز نہیں پڑھی؟ اس نے کہا جی ہاں پڑھی ہے آپ نے فرمایا بے شک نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ (۱)
یہ حدیث شریف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورتوں کے ساتھ زنا کے علاوہ جو حرکت کی (مثلاً بوسہ وغیرہ) تو وہ صغیرہ گناہ ہے کیوں کہ نماز کو اس کا کفارہ قرار دیا گیا۔ اور اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ كَفَّارَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ إِلَّا الْكَبَائِرَ۔ (۲)

پانچ نمازیں درمیان کے گناہوں کے لیے کفارہ ہیں سوائے کبیرہ گناہوں کے،

تو ان تمام احوال کے مطابق مناسب یہی ہے کہ ہر دن اپنا محاسبہ کرے اور تمام گناہوں کا حساب لگا کر نیکیوں کے ذریعے ان کو دور کرنے کی کوشش کرے۔

سوال:

جب تک (گناہوں پر) اصرار کا عقیدہ حل نہ ہو استغفار کیا فائدہ دے گا؟ جب کہ حدیث شریف میں ہے۔

اَلْمُسْتَغْفِرُ مِنَ الذَّنْبِ وَهُوَ مُصِرٌّ عَلَيْهِ كَالْمُسْتَهْزِئِ بِآيَاتِ اللّٰهِ۔ (۳)

اصرار کی حالت میں گناہ سے استغفار کرنے والا اس آدمی کی طرح ہے جو اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑاتا ہے۔

بعض بزرگ فرماتے تھے میں لفظ "استغفر اللہ" سے بھی استغفار کرتا ہوں (یعنی جب گناہ ترک نہ کرے) اور کہا گیا ہے کہ محض زبانی استغفار، جھوٹوں کی توبہ ہے حضرت رابعہ عدویہ نے فرمایا کہ ہمارا بخشش طلب کرنا خود بے شمار استغفار کا محتاج ہے۔

جواب:

استغفار کے سلسلے میں اس قدر روایات آئی ہیں کہ شمار سے باہر ہیں ہم نے اذکار اور دعوات کے بیان میں ان کا ذکر کیا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی رہنے اور استغفار کو اکٹھا ذکر کیا ارشاد خداوندی ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ

اور اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں کہ وہ ان کو عذاب

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۵۸ / ۳۵۹

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۳۵۹ مرویات ابو ہریرہ

(۳) الترغیب والترہیب جلد ۲ ص ۹۷ کتاب التوبہ

وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۔ (۱) وہ جب تک آپ ان میں موجود ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہیں دیتا جب کہ وہ بخشش طلب کر رہے ہوں۔

پس بعض صحابہ کرام فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے لئے دو پناہیں تھیں ایک چلی گئی یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا (ظاہری طور پر) ہمارے درمیان موجود ہونا (۲) (باقی نہ رہا) اور استغفار ہمارے پاس موجود ہے اگر یہ بھی چلی جائے تو ہم ہلاک ہو جائیں تو ہم کہتے ہیں کہ وہ استغفار جو جھوٹوں کی توبہ ہے وہ محض زبانی استغفار ہے اس میں دل شریک نہیں ہوتا جیسے آدمی عادتاً یا غفلت کی حالت میں کہتا ہے "استغفر اللہ" میں اللہ تعالیٰ سے بخشش کا طالب ہوں اور جیسے وہ جہنم کی آگ کے بارے میں سن کر کہتا ہے "میں اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں لیکن اس سے اس کا دل متاثر نہیں ہوتا یہ محض زبان کی حرکت سے ہوتی ہے اس سے کوئی زیادہ نفع نہیں ہوتا۔ مگر جب اس کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں دل کا تضرع اور انکساری شامل ہو ارادہ سچا ہو، نیت اور رغبت میں خلوص ہو تو وہ ذاتی طور پر نیکی ہے جو اس بات کی صلاحیت رکھتی ہے کہ اس سے برائی کو دور کیا جائے۔

فضیلتِ استغفار کے سلسلے میں جو روایات آئی ہیں وہ اسی مفہوم پر محمول ہیں حتیٰ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَلَوْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً ۔ (۲) جو شخص استغفار کرتا ہے وہ گناہ پر اصرار کرنے والا نہیں ہوتا اگرچہ دن میں ستر مرتبہ گناہ کرے۔

اس سے مراد دل سے بخشش طلب کرنا ہے اور توبہ و استغفار کے کئی درجات ہیں اور ان کا آغاز بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوتا اگرچہ آخر تک نہ پہنچے اسی لیے حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے فرمایا بندے کو ہر وقت اپنے مولا کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی سب سے اچھی حالت یہ ہوتی ہے کہ ہر معاملے میں اسی کی طرف رجوع کرے اور اگر گناہ کا ارتکاب ہو جائے تو یوں کہے اے میرے رب میرے گناہ پر پردہ ڈال دے۔ اور جب گناہ سے فارغ ہو تو کہے" یا اللہ! میری توبہ قبول کر اور جب توبہ کر چکے تو کہے یا اللہ مجھے محفوظ فرما پھر جب نیک عمل کرئے تو کہے یا اللہ! مجھ سے قبول فرما۔

حضرت سہل رحمہ اللہ سے استغفار کے بارے میں پوچھا گیا جو گناہوں کا کفارہ بنتا ہے تو انہوں نے فرمایا استغفار کا آغاز قبولیت ہے پھر رجوع اور پھر توبہ ہے استجابت (قبولیت) اعضاء کے اعمال ہیں رجوع (انابت) دل کے اعمال ہیں اور توبہ، اپنے مولا کی طرف متوجہ ہونا ہے یعنی مخلوق کو چھوڑ دے پھر اپنی کوتاہی کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرے اللہ تعالیٰ

---

(۱) قرآن مجید، سورہ انفال آیت ۳۳

(۲) جامع ترمذی ابواب التفسیر ص ۴۹۶

(۳) شرح السنۃ للبغوی جلد ۵ ص ۸۰ حدیث ۱۲۹۷

کی نعمت سے بے خبر رہنے اور ذکر کو ترک کرنے کے سلسلے میں جو کوتاہی ہوتی ہے اس کے لیے بھی استغفار کرے اس وقت اسے بخش دیا جائے گا اور مالک کے پاس اس کا ٹھکانہ ہوگا اس کے بعد تنہائی اختیار کرنا ہے پھر ثابت قدمی اس کے بعد بیان، پھر فکر، بعدازاں معرفت، پھر مناجات اس کے بعد خالص دوستی، پھر باہمی تعلق پھر راز کی گفتگو ہے (جسے خُلّت کہتے ہیں) اور یہ بات بندے کے دل میں اسی وقت ٹھہرتی ہے جب علم اس کی غذا ہو ذکر اس کے قیام اور مضبوطی کا سبب ہو، رضا، اس کا زادِ راہ ہو اور توکل اس کا دوست ہو پھر اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظر رحمت فرماتا ہے اور اسے عرش کی طرف اٹھاتا ہے اب اس کا مقام وہی ہوتا ہے جو عرش کو اٹھانے والے فرشتوں کا ہوتا ہے حضرت سہل رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کے بارے میں بھی پوچھا گیا۔

کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ توبہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوتا ہے اس کا کیا مطلب ہے تو انہوں نے فرمایا! محبوب اس وقت ہوتا ہے۔ جب اس میں وہ تمام شرائط پائی جائیں جن کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے۔

اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ۔ (۱)

توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے روزہ رکھنے والے رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ تعالیٰ کی حدود کی حفاظت کرنے والے۔

اور فرمایا محب وہی ہوتا ہے جو ان کاموں کو نہیں کرتا جن کو اس کا محبوب پسند نہیں کرتا۔

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے دو فائدے ہیں ان میں سے ایک گناہوں کا کفارہ بنتا ہے حتیٰ کہ وہ یوں ہو جاتا ہے کہ گویا اس کا کوئی گناہ ہی نہیں۔ اور دوسرا فائدہ درجات کا حصول ہے حتیٰ کہ وہ محبوب بن جاتا ہے اور کفارے کے بھی کئی درجات ہیں ان میں سے بعض گناہ کو بالکل مٹا دیتے ہیں اور بعض اس میں تخفیف کا باعث ہوتے ہیں اور یہ تفاوت، توبہ کے درجات میں تفاوت کے باعث ہوتا ہے۔

پس دل سے استغفار اور نیکیوں کے ذریعے تدارک اگرچہ پہلے درجات میں اصرار کے عقدے کو حل نہیں کرتے لیکن فائدہ سے بالکل خالی نہیں ہوتے لہٰذا یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ ان کا وجود، نہ ہونے کے برابر ہے بلکہ اہل مشاہدہ اور ارباب قلوب کو اس بات کا یقین ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول سچا ہے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَه۔ (۲)

پس جو شخص ذرا برابر بھی نیکی کرے گا اس کے اجر کو دیکھ لے گا۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ توبہ آیت ۱۱۲

(۲) قرآن مجید، سورۂ زلزال آیت ۷

اور نیکی کا ایک ذرہ بھی اثر سے خالی نہیں ہوتا جیسا کہ ترازو میں جَو کا ایک دانہ بھی (ترازو کے جھکاؤ کے لیے) کچھ نہ کچھ اثر رکھتا ہے اور اگر پہلا اثر سے خالی ہوتا تو دوسرا بھی اس کی مثل ہوتا اور کئی ذرات اٹھانے کے باوجود ترازوں میں جھکاؤ نہ ہوتا اور یہ بات لازماً محال ہے بلکہ نیکیوں کا پلڑا نیکی کے ذرات کے باعث جھکا ہوا ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ بھاری ہو جاتا ہے اور برائی والا پلڑا اوپر کو اٹھ جاتا ہے تو تمہیں اس بات سے بچنا چاہیے کہ عبادات کے ذرات کو معمولی سمجھ کر ان کو عمل میں نہ لاؤ۔

اور گناہوں کے ذرات کو بھی معمولی نہ سمجھے اور اس بیوقوف عورت کی طرح نہ ہو جائے جو سُوت کاتنے سے بچنے کے لیے یہ بہانہ کرتی ہے کہ وہ ایک ساعت میں ایک ہی دھاگہ کات سکتی ہے اور کہتی ہے کہ ایک دھاگے سے کیا مالداری آئے گی اور اس سے کتنے کپڑے بنیں گے حالانکہ اس بیوقوف کو معلوم نہیں کہ دنیا کے تمام کپڑے ایک ایک دھاگے سے مل کر ہی بنے ہیں۔ اور یہ تمام اجسام عالم اس قدر وسعت کے باوجود ایک ایک ذرہ سے مل کر بنے ہیں۔

تو دل سے عاجزی کا اظہار اور طلب مغفرت ایک ایسی نیکی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں بالکل ضائع نہیں ہوتی بلکہ میں (امام غزالی) کہتا ہوں کہ زبان سے استغفار بھی نیکی ہے کیوں کہ غفلت کی حالت میں استغفار کے ساتھ زبان کی حرکت اس گھڑی میں کسی مسلمان کی غیبت یا فضول کلام سے بہتر ہے بلکہ استغفار سے خاموشی اختیار کرنے سے بھی بہتر ہے۔ تو اس کی فضیلت، خاموشی کے مقابلے میں ظاہر ہوتی ہے اور دل کے عمل کے مقابلے میں اس کا نقصان ظاہر ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی نے اپنے شیخ ابو عثمان مغربی سے کہا کہ بعض اوقات میری زبان پر ذکر اور قرآن جاری ہوتا ہے جب کہ میرا دل غافل ہوتا ہے انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہارے ایک عضو کو اچھے کام میں مصروف رکھا اور اس کا عادی بنایا اس کو برائی میں نہیں لگایا اور فضول کاموں کا عادی نہیں بنایا۔

انہوں نے جو کچھ ذکر کیا وہ حق ہے اگر اعضاء کو نیک کاموں کی عادت پڑ جائے حتیٰ کہ وہ اس کے لیے فطرت کی طرح ہو جائے تو وہ تمام گناہوں کو دور کر سکتا ہے پس جو شخص اپنی زبان کو استغفار کا عادی بناتا ہے جب وہ دوسرے آدمی سے جھوٹ سنتا ہے تو فوراً استغفر اللہ کہتا ہے جس کی اس کو عادت ہو چکی ہے اور جس آدمی کو فضول باتیں کرنے کی عادت ہو اس کی زبان سے نکلتا ہے تم کتنے بیوقوف ہو اور تمہارا جھوٹ کتنا برا ہے اور جس شخص کو استعاذہ (نعوذ باللہ) کہنے کی عادت ہو جب کسی شریر کے افعالِ شر کے بارے میں سنتا ہے تو زبان کی عادت کے مطابق کہتا ہے "نعوذ باللہ"، اور جب فضول بات کہنے کی عادت ہوگی تو کہے گا اللہ تعالیٰ کی اس پر لعنت ہو تو ایک کلمہ گناہ کا باعث ہے اور دوسرے کلمہ کے ساتھ سلامت رہتا ہے اور اس کی سلامتی کی وجہ یہ ہے کہ اس کی زبان اچھی بات کہنے کی عادی ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کا ایک مطلب یہ بھی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (۱) بے شک اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

---

(۱) قرآن مجید سورۃ توبہ آیت ۱۲۰

اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کا بھی یہی مفہوم ہے۔

وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (۱)

اور اگر نیکی ہو تو اللہ تعالیٰ اسے بڑھا دیتا ہے اور اپنی طرف سے اسے بہت بڑا اجر عطا فرماتا ہے۔

تو دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس نیکی کو بڑھایا کہ غفلت میں بھی استغفار کو زبان کی عادت بنایا حتیٰ کہ اس عادت کے ذریعے غیبت، لعنت اور فضول باتوں کے ذریعے نافرمانی کے شر کو دور فرمایا یہ تو دنیا میں ایک معمولی نیکی کا بڑھنا ہے اور آخرت کا بڑھنا بہت بڑا ہے اگر وہ جانتے تمہیں محض آفات کا خیال کر کے عبادات کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے اس طرح عبادات میں رغبت کم ہو جائے گی یہ شیطانی مکر ہے جس کے ذریعے وہ دھوکے میں مبتلا لوگوں کو پھنساتا ہے اور ان کو یہ تصور دیتا ہے کہ وہ عقلمند ہیں نیز وہ پوشیدہ باتوں کو جاننے والے سمجھ دار ہیں دل کی غفلت کے ساتھ زبان سے ذکر کرنے میں کیا بھلائی ہے تو اس مکر و فریب کے حوالے سے لوگوں کی تین قسمیں ہیں۔

اپنے آپ پر ظلم کرنے والے، درمیانی راہ اختیار کرنے والے اور نیکیوں میں سبقت کرنے والے۔

جہاں تک سبقت کرنے والوں کا تعلق ہے تو وہ کہتے ہیں اسے لعنتی! تو نے سچ کہا لیکن تمہارا مقصد باطل ہے یقیناً میں تجھے دو مرتبہ ستاؤں گا اور دو طریقوں سے تجھے ذلیل کروں گا میں زبان کی حرکت کے ساتھ دل کی حرکت کو ملاؤں گا تو یہ اس شخص کی طرح ہے جو شیطانی زخم پر نمک چھڑکتا ہے۔

لیکن جو ظالم مغرور ہیں وہ اپنے آپ کو اس باریک بات سے واقف سمجھ کر دل کے اخلاص سے عاجز ہوتے ہیں اور وہ زبان کو ذکر کا عادی نہیں بناتے تو وہ شیطان کی مدد کرتے ہیں وہ دھوکے کی رسی کے ساتھ لٹک جاتے ہیں اور اب ان دونوں کے درمیان موافقت اور مشارکت ہو جاتی ہے جیسے کہا گیا ہے مشکیزے کے منہ کو بند کرنے والی چیز اس کے موافق ہو گئی تو اس نے اسے گلے میں ٹکا لیا۔

جہاں تک میانہ روی اختیار کرنے والے کا تعلق ہے تو وہ شیطان کے خلاف عمل میں اپنے دل کو شریک نہیں کر سکتا اور وہ جانتا ہے کہ محض زبانی ذکر دل کی نسبت ناقص ہوتا ہے لیکن خاموشی اور فضول باتوں کے مقابلے میں (محض زبانی ذکر) افضل ہے وہ اس پر برقرار رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ بھلائی کی عادت کے سلسلے میں وہ اس کے دل کو بھی زبان کے ساتھ شریک کرے۔

تو سبقت کرنے والا اس جولاہے کی طرح ہے جو اپنے کام کو برا جان کر کاتب بن جائے اور ظالم جو زبانی ذکر کو بھی چھوڑ دیتا ہے اس جولاہے کی طرح ہے جو اپنا پیشہ چھوڑ کر خاکروب بن جائے اور درمیانہ راستہ اختیار کرنے والے کی

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ النساء آیت ۴۰

مثال اس کی طرح ہے جو کتابت سے عاجز آجاتا ہے تو کہتا ہے میں جولاہے کے پیشے کی مذمت سے انکار نہیں کرتا لیکن یہ کاتب کے مقابلے میں مذموم ہے خاکروب کے مقابلے میں نہیں لہذا جب میں کتابت سے عاجز ہوں تو جولاہے کے پیشے کو نہیں چھوڑ سکتا اسی لیے حضرت رابعہ عدویہ رحمہا اللہ نے فرمایا تھا کہ ہمارا استغفار کئی استغفار کا محتاج ہے تو تمہیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ انہوں نے زبان کی مذمت محض ذکر خداوندی کی وجہ سے کی ہے بلکہ وہ قلبی غفلت کی مذمت کرتی ہیں تو یہ استغفار، مزید استغفار کی محتاج دل کی غفلت کی وجہ سے ہے زبان کی حرکت کی وجہ سے نہیں اور اگر وہ زبانی استغفار سے بھی خاموش ہو جائے تو دوہرے استغفار کا محتاج ہوگا ایک کا نہیں۔

توجس کی مذمت کی گئی یا جس کی تعریف کی گئی اس کو اسی طرح سمجھنا چاہیئے ورنہ سچ کہنے والی ذات (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس حدیث کا مطلب سمجھ نہیں آئے گا کہ آپ نے فرمایا "نیک لوگوں کی نیکیاں، مقربین کے گناہ ہیں"، کیونکہ یہ امور اضافی طور پر ثابت ہوتے ہیں لہذا ان کو اضافت کے بغیر نہیں اپنانا چاہیے بلکہ مناسب یہ ہے کہ عبادات اور گناہوں کے ذرات کو بھی حقیر نہ جانے اسی لیے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے تین چیزیں، تین چیزوں میں رکھی ہیں اپنی رضا کو عبادت میں رکھا ہے پس تم اس سے کسی چیز کو بھی حقیر نہ جانو ہو سکتا ہے اس کی رضا اسی میں ہو غضب اپنی نافرمانی میں رکھا پس اس سلسلے میں کسی بات کو معمولی نہ سمجھو ہو سکتا ہے اس کا غضب اسی میں ہو اور اپنی ولایت کو اپنے بندوں میں رکھا لہذا ان میں سے کسی کو حقیر نہ جانو ہو سکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہو اور قبولیت کو زیادہ کیا اور اپنی دعاؤں میں پوشیدہ رکھا پس دعا کو نہ چھوڑو شاید قبولیت اسی میں ہو۔

چوتھی فصل:

توبہ کی دوا اور اصرار کے خاتمہ کے لیے علاج

جان لو انسان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ نوجوان جس میں بچوں والی عادات پائی جاتی ہیں وہ نیکی کرتے اور برائی سے بچنے پر نشو و نما پاتا ہے اسی نوجوان کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تَعَجَّبَ رَبُّكَ مِنْ شَابٍ لَيْسَتْ لَهُ صَبْوَةٌ۔ (۱)

تیرے رب کو وہ نوجوان پسند ہے جس میں بچپن والی عادات نہ ہوں۔

اس قسم کے نوجوان نادر ہیں بہت کم پائے جاتے ہیں۔

اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو گناہ کے ارتکاب سے خالی نہیں ہوتے پھر ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو گناہ پر

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۵۱ مرویات عقبہ بن عامر

مصر رہتے ہیں اور دوسرے توبہ کرنے والے، اور ہماری غرض یہ ہے کہ ہم اصرار کو دور کرنے کا علاج بیان کریں اور اس سلسلے میں دوا کا ذکر کریں۔

تو جاننا چاہیے کہ توبہ کی شفاء، دوا سے ہوتی ہے اور دعا سے وہی واقف ہوتا ہے جو بیماری سے آگاہ ہوتا ہے کیونکہ مرض کے اسباب کی ضد علاج ہے تو جو بیماری کسی سبب سے آتی ہے اس کا علاج اس سبب کو دور کرنا اسے ختم کرنا اور باطل کرنا ہے اور ہر چیز کا بطلان اس کی ضد سے ہوتا ہے اور اصرار کا سبب غفلت اور خواہش ہے اور غفلت کی ضد علم ہے جب کہ خواہش کی ضد ان اسباب کو ختم کرتے پر صبر کرنا ہے جو خواہش کو حرکت دیتے ہیں اور غفلت خطاؤں کی اصل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (۱) اور وہی لوگ غافل ہیں یقیناً وہ آخرت میں خسارہ پانے والے ہیں۔

تو، توبہ کی دوا ایک معجون ہے جو علم کی مٹھاس اور صبر کی کڑواہٹ سے مرکب ہوتا ہے۔ تو جس طرح سکنجبین۔ شکر کی مٹھاس اور سرکے کی ترشی سے مل کر بنتی ہے اور ان میں سے ہر ایک سے ایک غرض ہوتی ہے جو دونوں کے مجموعے سے حاصل ہوتی ہے تو ان اسباب کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو صفرا کے ہیجان کا باعث بنتے ہیں تو جس آدمی کو اصرار کی بیماری ہو اسے دل کے علاج کا یہی طریقہ سمجھنا چاہیے۔

تو اب دوا کی اصل دو چیزیں ہیں ان میں سے ایک علم ہے اور دوسری چیز صبر ہے اور ان دونوں کا بیان ضروری ہے۔

سوال:

کیا اصرار کے خاتمہ کے لیے ہر علم نفع دیتا ہے یا اس کے لیے کوئی مخصوص علم ہے تو جان لو کہ دل کے امراض کے علاج کے لیے کئی علوم ہیں لیکن ہر مرض کے لیے ایک مخصوص علم ہے، جیسا کہ علم طب تمام امراض کے علاج کے لیے نفع بخش ہے لیکن ہر بیماری ایک مخصوص علم کے ساتھ خاص ہے اسی طرح اصرار کی دوا کا مسئلہ ہے۔

تو اب ہم جسمانی بیماریوں کی مثال پر اس خاص علم کا ذکر کرتے ہیں تاکہ سمجھنا آسان ہو تو ہم کہتے ہیں۔ بیمار کو کئی باتوں کی تصدیق کی حاجت ہوتی ہے۔

۱۔ مجموعی طور پر وہ اس بات کی تصدیق کرے کہ بیماری اور صحت کے کئی اسباب ہیں جن تک اختیار کے ساتھ رسائی ہوتی ہے۔ جیسا کہ مسبب الاسباب (اللہ تعالیٰ) نے ان کو مرتب فرمایا ہے تو یہ اصل طب کا یقین ہے کیوں کہ جو آدمی طب پر یقین نہیں رکھتا وہ علاج میں مشغول نہیں ہو سکتا اور اس پر ہلاکت ثابت ہوتی ہے تو ہمارے زیر بحث مسئلہ کی یہ مثال ہے کہ

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ النحل آیت ۱۰۸، ۱۰۹

ایمان شریعت، کی اصل ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اُخروی سعادت کا ایک سبب ہے اور وہ عبادت ہے اور بدبختی کا ایک سبب ہے جو گناہ ہے اور یہ احکام شریعت پر ایمان کی بنیاد ہے اور اس کا حصول ضروری ہے تحقیق کے ساتھ ہو یا تقلید کے ذریعے، اور یہ دونوں باتیں مجموعی ایمان میں شامل ہیں۔

۲۔ ضروری ہے کہ مریض خاص ڈاکٹر پر یقین رکھتا ہو کہ وہ طب کا عالم اور ماہر ہے جو کچھ بتاتا ہے اس میں سچ کہتا ہے نہ دھوکہ دیتا ہے اور نہ جھوٹ بولتا ہے کیونکہ جب تک یہ یقین نہ ہو محض طب پر یقین رکھنا نفع بخش نہیں ہوتا اور ہمارے موضوع کے سلسلے میں اس کی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا یقین ہو اور اس بات پر ایمان ہو کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ حق اور سچ ہے اس میں جھوٹ اور خلاف واقعہ بات نہیں ہے۔

۳۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ طبیب کی بات غور سے سنے کہ وہ کن پھلوں کے کھانے سے روکتا اور کن مضر اسباب سے ڈراتا ہے حتیٰ کہ پرہیز نہ کرنے کے سلسلے میں اس پر خوف غالب آجائے تو شدتِ خوف پرہیز کا باعث بنتا ہے دین کے سلسلے میں اس کی مثال یہ ہے کہ ان آیات اور احادیث کی طرف خوب دھیان دے جو تقویٰ کی ترغیب دیتی اور گناہوں کے ارتکاب نیز خواہشات کی اتباع سے روکتی ہیں۔ اور اس سلسلے میں جو کچھ سنے اس کی تصدیق کرے اور اسے کسی قسم کا شک اور تردد نہ ہو حتیٰ کہ اس سے ایسا خوف پیدا ہو جو صبر پر تقویت پہنچاتا ہے علاج کے سلسلے میں یہ آخری رکن ہے۔

۴۔ طبیب کی اس بات کو غور سے سنے جو اس کے مرض کے ساتھ خاص ہے اور جس سے پرہیز ضروری ہے تاکہ پہلے اسے ان افعال و احوال اور ماکولات و مشروبات کا تفصیلی علم حاصل ہو جو نقصان دہ ہیں کیونکہ ہر مریض پر ہر چیز سے پرہیز لازم نہیں اور نہ ہی ہر دوا اسے فائدہ دیتی ہے بلکہ ہر خاص بیماری کے لیے علم بھی مخصوص ہے اور علاج بھی۔

اور دین سے اس کی مثال یہ ہے کہ ہر انسان ہر قسم کی خواہش میں مبتلا نہیں ہوتا اور نہ ہی ہر قسم کے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے بلکہ ہر مومن کے لیے ایک یا زیادہ مخصوص گناہ ہیں فی الحال اسے اتنی بات کی ضرورت ہے کہ اسے ان کے گناہ ہونے کا علم ہو جائے۔

پھر ان کی آفات اور ضرر کی مقدار کا علم ہو اس کے بعد اس بات کا علم ہو کہ ان سے صبر کیسے ہو سکتا ہے اور پھر اس بات کو جانے کہ سابقہ گناہوں کا کفارہ کیسے ادا ہوگا یہ علوم دین کے معالجوں کے ساتھ خاص ہیں اور یہ علماء ہیں جو انبیاء کرام کے وارث ہیں گناہ گار کو اگر اپنے گناہ کا علم ہو جائے تو اس پر لازم ہے کہ طبیب سے علاج کروائے اور طبیب عالم ہے اور اگر اس کو اس بات کا علم نہ ہو کہ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ گناہ ہے تو عالم پر لازم ہے کہ اسے اس بات سے آگاہ کرے اور اس کی صورت یہ ہے کہ عالم کسی علاقہ، شہر، محلے یا مسجد یا کسی مجمع کی ذمہ داری سنبھالے اور وہاں کے لوگوں کو دین سکھائے اور ان کے سامنے واضح کرے کہ کیا کام ان کے لیے نقصان دہ ہے اور کونسا کام نفع بخش ہے کیا بات ان کی بدبختی کا باعث ہے اور کونسی بات میں سعادت مندی ہے اور وہ اس بات کا انتظار نہ کرے کہ اس سے پوچھا جائے بلکہ لوگوں کو

خود بخود دین کی دعوت دے کیوں کہ علماء کرام انبیاء عظام کے وارث ہیں اور انبیاء کرام نے لوگوں کو جاہل نہیں چھوڑا بلکہ وہ ان کو ان کے اجتماعات میں پکارتے اور شروع شروع میں وہ ان کے دروازوں پر جاتے اور ان کو ہدایت دیتے کیوں کہ دل کے مریض اپنی بیماری کا علم کا نہیں رکھتے جیسے کسی شخص کے چہرے پر سفید داغ پیدا ہو جائیں اور اس کے پاس آئینہ نہ ہو تو جب تک اسے دوسرا نہ بتائے اسے اس بات کا علم نہیں ہو سکتا اور یہ بات تمام علماء پر فرض عین ہے۔

اور تمام حکمرانوں پر لازم ہے کہ وہ ہر بستی اور ہر محلے میں کسی دیندار عالم کا یقین کریں جو لوگوں کو ان کا دین سکھائے کیونکہ لوگوں کی پیدائش جہالت پر ہوتی ہے لہٰذا اصل اور فرع دونوں کو اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے۔ اور دنیا بیماروں کی جگہ ہے کیوں کہ زمین کے اندر فوت شدہ اور اس کی پیٹھ پر بیمار رہتے ہیں اور دلوں کے مریض، جسم کے مریضوں سے زیادہ ہیں علماء طبیب اور حکمران بیماری کے گھر کے حاکم ہیں تو جس مریض کا علاج علماء سے نہ ہو سکے اسے حکمران کے سپرد کیا جائے تاکہ وہ اس کے شر کو دُور کرے جیسے وہ بیمار جو پرہیز نہیں کرتا یا جس پر جنوں غالب ہو تو اسے ڈاکٹر پاگل خانے کے نگران کے پاس بھیجتا ہے تاکہ وہ اسے طوق اور زنجیر پہنائے اور اپنے آپ کو بھی اور لوگوں کو بھی اس کے شر سے محفوظ رکھے دلوں کے امراض، بدنی امراض سے تین وجوہ سے بڑھ گئے ہیں۔

(۱) دل کا مریض یہ نہیں جانتا کہ وہ بیمار ہے۔

(۲) اس کا انجام اس دنیا میں نظر نہیں آتا جب کہ بدن کے مرض کا انجام موت ہے جو دکھائی دیتی ہے اور طبیعتیں اس سے نفرت کرتی ہیں اور جو کچھ موت کے بعد ہے وہ دکھائی نہیں دیتا اور گناہوں کا انجام دل کی موت ہے جو اس دنیا میں نظر نہیں آتی تو گناہوں سے نفرت کم ہوتی ہے اگرچہ اس کے مرتکب کو اس کا علم بھی ہو اسی لیے تم اسے دیکھو گے کہ قلبی بیماری میں وہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتا ہے جب کہ بدنی بیماری میں بھروسہ کیے بغیر علاج کرواتا ہے۔

(۳) لا علاج مرض یہ ہے کہ طبیب نہ ملے اور طبیب، تو علماء ہیں اور اس زمانے میں وہ خود شدید بیمار ہو گئے حتیٰ کہ وہ علاج کرنے سے عاجز آ گئے۔ اور چوں کہ یہ مرض سب میں موجود ہے حتیٰ کہ ان کا نقصان ظاہر نہیں ہوتا تو وہ لوگوں کو گمراہ کرنے پر مجبور ہو گئے اور وہ ان کو ایسے اشارے دیتے ہیں جو ان کی مرض کو بڑھاتے ہیں کیوں کہ مہلک بیماری تو دنیا کی محبت ہے اور یہ بیماری خود اطباء پر غالب آ گئی ہے وہ اس بات کے خوف سے لوگوں کو ڈرانے پر قادر نہیں کہ لوگ کہیں گے تمہیں کیا ہوا دوسروں کو علاج کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو یہی وجہ ہے کہ تمام مخلوق اس بیماری میں مبتلا ہو گئی وبا بڑھ گئی اور دوا ختم ہو گئی اور لوگ طبیبوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔ بلکہ طبیب (علماء) لوگوں کو گمراہ کرنے میں مشغول ہو گئے کاش جب وہ نصیحت نہیں کرتے تو خیانت تو نہ کرتے اصلاح نہیں کر سکتے تو فساد پھیلانے سے باز رہتے کاش وہ خاموش رہیں اور کچھ نہ بولیں۔

یہ لوگ جب بولتے ہیں تو ان کا بنیادی مقصد لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنا ہوتا ہے اور اس مقصد تک تب ہی پہنچ

سکتے ہیں جب امید دلائیں اور امید کے اسباب کو ترجیح دیں نیز رحمت کے دلائل ذکر کریں کیوں کہ ان باتوں سے کانوں کو زیادہ لذت حاصل ہوتی ہے اور طبیعت پر یہ باتیں ہلکی ہوتی ہیں اب جب لوگ وعظ کی مجلس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو انہیں گناہوں پر زیادہ جرأت ہو جاتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ بڑھ جاتا ہے۔

پس جب طبیب جاہل یا خائن ہوگا تو دوائی کے ساتھ ہلاک کرے گا کیونکہ غیر مناسب جگہ پر استعمال کرے گا تو امید اور خوف دو دوائیں ہیں لیکن ان دو آدمیوں کے لیے جو متضاد بیماریوں میں مبتلا ہیں جس آدمی پر خوف غالب ہو حتیٰ کہ وہ دنیا کو بالکل چھوڑ دے اور اپنے آپ کو ایسے کام کا مکلف بنائے جس کی طاقت نہیں رکھتا اور اپنے آپ پر زندگی کو بالکل تنگ کر دے تو ایسے شخص کے زیادہ خوف کو امید کے اسباب ذکر کر کے توڑا جائے تاکہ وہ اعتدال کی طرف آجائے۔

اسی طرح وہ شخص جو گناہوں پر مصر ہو اور توبہ کی خواہش بھی رکھتا ہو لیکن ناامیدی اور مایوسی کی وجہ سے اس سے رُکتا ہو کہ گذشتہ گناہ بہت بڑے ہیں اس کا علاج بھی امید کے اسباب کے ذریعے کیا جائے حتیٰ کہ وہ توبہ کی قبولیت کا طمع کر کے توبہ کرے۔

لیکن جو شخص گناہوں میں ڈوبا ہوا ہو اور فضل خداوندی پر مغرور ہو امید کے اسباب کے ذریعے اس کا علاج کرنا اس طرح ہے جیسے حرارت والے کا علاج شہد سے کرنا تاکہ اسے شفا حاصل ہو یہ جاہلوں اور غبی قسم کے لوگوں کا طریقہ ہے غرضیکہ طبیبوں کا فساد مرض کو لاعلاج کیے ہوئے ہے کہ وہ دوا کو بالکل قبول نہیں کرتی۔

سوال:

کوئی ایسا طریقہ ذکر کریں جسے واعظ، مخلوق کو وعظ کرتے ہوئے اختیار کرے؟

جواب:

جان لو کہ یہ لمبا طریقہ ہے اور اس کا احاطہ ناممکن ہے ہاں ہم اصرار کے ترک کے سلسلے میں کچھ نفع بخش انواع کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو لوگوں کو گناہوں کے چھوڑنے پر مجبور کرے اور اس کی چار قسمیں ہیں۔

۱۔ قرآن پاک کی وہ آیات ذکر کرے جو گناہ گاروں اور نافرمانوں کو ڈرانے والی ہیں اسی طرح جو احادیث و آثار مروی ہیں ان کو بیان کرے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

مَا مِنْ یَوْمٍ طَلَعَ فَجْرُہٗ وَلَا لَیْلَۃٍ غَابَ شَفَقُھَا اِلَّا وَمَلَکَانِ یَتَجَاوَبَانِ بِاَرْبَعَۃِ اَصْوَاتٍ یَقُوْلُ اَحَدُھُمَا یَا لَیْتَ ھٰذَا الْخَلْقَ لَمْ یُخْلَقُوْا وَیَقُوْلُ الْاٰخَرُ یَا لَیْتَھُمْ اِذْ خُلِقُوْا عَلِمُوْا لِمَاذَا خُلِقُوْا فَیَقُوْلُ الْاٰخَرُ

نہیں ہے کوئی دن جس میں فجر طلوع ہوتی ہے اور نہیں کوئی رات جس میں شفق غائب ہوتی ہے مگر چار فرشتے چار آوازوں کے ساتھ ایک دوسرے کو جواب دیتے ہیں ان میں سے ایک کہتا ہے کاش! یہ مخلوق پیدا نہ ہوتی دوسرا کہتا ہے جب یہ پیدا ہوئے ہیں تو کاش ان کو اس بات کا

يَا لَيْتَهُمْ إِذْ لَمْ يَعْلَمُوا لِمَاذَا خُلِقُوا عَمِلُوا بِمَا عَلِمُوا۔ (۱)

علم ہوتا کہ ان کو کیوں پیدا کیا گیا پہلا کہتا ہے اگر ان کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ کیوں پیدا ہوئے تو جس بات کا علم تھا اس پر عمل کرتے۔

اور بعض روایات میں ہے۔

کاش یہ ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر ان باتوں کا ذکر کرتے جو ان کو معلوم تھیں تو دوسرا کہتا ہے کاش جب انہوں نے اس بات پر عمل نہیں کیا جس کا ان کو علم تھا تو جو عمل کیا اس سے توبہ بھی کر لیتے (۲)

بعض بزرگوں نے فرمایا جب بندہ گناہ کرتا ہے تو دائیں طرف والا فرشتہ بائیں طرف والے کو حکم دیتا ہے اور وہ اس پر امیر ہے کہ چھ گھڑیاں اس سے قلم کو اٹھائے رکھے اگر وہ توبہ و استغفار کرے تو نہ لکھے اور اگر استغفار نہ کرے تو لکھ دے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا جو بندہ گناہ کرتا ہے تو زمین کے جس حصے پر وہ ہوتا ہے وہ زمین اللہ تعالیٰ سے اجازت مانگتی ہے کہ اسے اندر دھنسا دیا جائے اور آسمان سے چھت اس پر گرنے کی اجازت طلب کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ زمین و آسمان سے فرماتا ہے میرے بندے سے رک جاؤ اور اسے مہلت دو تم نے اسے پیدا نہیں کیا اگر تم اسے پیدا کرتے تو تمہیں اس پر رحم آتا، شاید وہ میری بارگاہ میں توبہ کرے تو میں اسے بخش دوں اور ہو سکتا ہے وہ اس گناہ کو نیکی میں بدل دے تو میں اسے نیکی کا ثواب عطا کروں۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ۔ (۳)

بے شک اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کو جنبش کرنے سے روکے ہوئے ہے اور وہ ہٹ جائے تو اس کے سوا انہیں کون روکے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے۔

اَلطَّابِعُ مُعَلَّقٌ بِقَائِمَةِ الْعَرْشِ فَإِذَا انْتُهِكَتِ الْحُرُمَاتُ وَاسْتُحِلَّتِ الْمَحَارِمُ أَرْسَلَ اللّٰهُ الطَّابِعَ فَيَطْبَعُ عَلَى الْقُلُوبِ

مہر لگانے والا عرش کے پائے سے لٹکا ہوا ہے پس جب بہت زیادہ بے حرمتی ہوتی ہیں اور حرام کو حلال سمجھا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ مہر لگانے والے کو بھیجتا ہے

---

(۱) کنز العمال جلد ۱۵ ص ۹۶۰ حدیث ۴۳۱۶۲

(۲) کنز العمال جلد ۶ ص ۱۵۱ حدیث ۱۴۰۱۴

(۳) قرآن مجید، سورۃ فاطر آیت ۴۱

بِمَا فِیْھَا۔ (۱) تو وہ لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔

اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ کی روایت ہیں۔

اَلْقَلْبُ مِثْلُ الْکَفِّ الْمَفْتُوْحَۃِ کُلَّمَا اَذْنَبَ الْعَبْدُ ذَنْبًا اَنْقَبَضَتْ اِصْبَعٌ حَتّٰی تَنْقَبِضَ الْاَصَابِعُ کُلُّھَا فَیُسَدُّ عَلَی الْقَلْبِ فَذٰلِکَ ھُوَ الطَّبْعُ۔ (۲)

دل کھلی ہتھیلی کی طرح ہے جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو ایک انگلی بند ہو جاتی ہے حتیٰ کہ تمام انگلیاں بند ہو جاتی ہیں تو یوں دل بند ہو جاتا ہے یہی مہر لگانا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا۔

بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان گناہوں سے حد معلوم ہے جب بندہ وہاں تک پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل پر مہر لگا دیتا ہے اب اس کے بعد اسے نیکی کی توفیق نہیں دی جاتی۔

گناہ کرنے والے کی مذمت اور توبہ کرنے والوں کی تعریف میں بے شمار احادیث و آثار وارد ہوتے ہیں واعظ کو چاہیے کہ ان میں سے اکثر کو بیان کرے اگر وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث ہے۔ آپ نے کوئی درہم اور دینار نہیں چھوڑا بلکہ آپ نے علم و حکمت چھوڑی ہے اور ہر عالم کو جس قدر پہنچی وہ اس میں آپ کا وارث ہے (۳)

دوسری قسم:

انبیاء کرام اور سلف صالحین کی حکایات اور ان کو لغزشوں کے باعث جو مصائب اٹھانے پڑے یہ حکایات مخلوق کے دلوں میں خوب جمتی ہیں اور ان کا نفع زیادہ ہے۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کا واقعہ اور کس طرح آپ کو جنت سے باہر آنا پڑا حتیٰ کہ روایت میں ہے کہ جب آپ نے اس (ممنوعہ) درخت سے کھایا تو آپ کے جسم سے لباس اتر گیا اور شرمگاہ ظاہر ہو گئی مگر تاج اور دستار کو شرم آئی کہ آپ کے سر سے اتر جائیں تو حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر آپ کے سر سے تاج اتارا اور آپ کی پیشانی سے دستار کو کھولا اور عرش کے اوپر سے آواز آئی تم دونوں (حضرت آدم و حوا علیہما السلام) میرے پڑوس سے اتر جاؤ جو میرے حکم کی خلاف ورزی کرے میرے پڑوس میں نہیں رہتا حضرت آدم علیہ السلام نے روتے ہوئے حضرت حوا علیہا السلام کی طرف دیکھا اور فرمایا ہماری لغزش کی پہلی نحوست یہ ہے ہم محبوب کے پڑوس

---

(۱) الکامل لابن عدی جلد ۳ ص ۱۱۳۲ ترجمہ سلیمان بن مسلم الخشاب

(۲) شعب الایمان جلد ۵ ص ۴۴۱ حدیث ۷۲۰۶

(۳) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۳۹ کتاب الوصایا۔

سے نکال دیئے گئے ۔ (۱)

اور روایات میں ہے کہ جب حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کو ان کی خطا پر تنبیہ کی گئی کہ آپ کے گھر میں چالیس دن تک ایک مورتی کی پوجا ہوتی رہی اور کہا گیا ہے اس لیے تنبیہ کی گئی کہ ایک عورت نے آپ سے درخواست کی کہ میرے باپ کے حق میں فیصلہ کرنا آپ نے وعدہ کیا لیکن اس پر عمل نہ فرمایا، بعض نے کہا آپ نے اس بات کو پسند کیا کہ اس عورت کی خاطر اس کے باپ کے حق میں فیصلہ کریں تو آپ سے چالیس دن حکومت واپس لی گئی تو آپ جدھر منہ آیا پریشان حال بھاگ کھڑے ہوئے آپ اپنے ہاتھ سے مانگتے لیکن آپ کو کھانا نہ دیا جاتا۔ جب وہ کہتے کہ مجھے کھانا دو میں سلیمان بن داؤد ہوں تو آپ کو زخمی کیا جاتا ہے دُور کیا جاتا اور مارا جاتا منقول ہے کہ آپ نے ایک عورت کے گھر سے کھانا طلب کیا تو اس نے آپ کو دُور کر دیا اور آپ کے چہرۂ مبارکہ پر تھوکا ایک روایت میں ہے کہ ایک بڑھیا نے گھڑا نکالا جس میں پیشاب تھا تو اسے آپ کے سر پر ڈال دیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کے پیٹ سے ایک انگوٹھی نکالی تو چالیس دن کی سختی کے بعد آپ نے اسے پہنا پس پرندے آکر آپ کے سر مبارک پر جھکنے لگے اور جن شیطان اور جنگلی جانور آپ کے گرد جمع ہو گئے اب بعض وہ لوگ جنہوں نے آپ سے ناروا سلوک کیا تھا معذرت کرنے لگے تو آپ نے فرمایا تم نے اس سے پہلے مجھ سے جو سلوک کیا میں اس پر تمہیں ملامت نہیں کرتا اور تمہاری اس معذرت پر تمہاری تعریف بھی نہیں کرتا یہ تو آسمان کی طرف سے آنے والا ایک معاملہ تھا جو ضروری تھا۔

اسرائیلی روایات میں مروی ہے کہ ایک شخص نے کسی دوسرے شہر میں ایک عورت سے نکاح کیا تو اس نے اپنا غلام بھیجا تاکہ وہ اس عورت کو اس کے پاس لے کر آئے تو اس عورت کے دل میں اس کا خیال آگیا اور اس نے اس سے قرب کا مطالبہ کیا لیکن اس غلام نے مجاہدہ کر کے اپنے آپ کو بچا لیا تو اس کے تقویٰ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے نبی بنا دیا تو وہ بنی اسرائیل میں نبی تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ہے کہ آپ نے حضرت خضر علیہ السلام سے پوچھا اللہ تعالیٰ نے کس وجہ سے آپ کو غیب پر مطلع فرمایا؟ انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے لیے گناہوں کو چھوڑنے کی وجہ سے۔

مروی ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے لیے ہوا چلتی تھی آپ نے اپنی نئی قمیص کی طرف دیکھا تو گویا انہوں نے اسے پسند کیا راوی کہتے ہیں ہوا نے اسے اتار دیا، انہوں نے فرمایا تم نے ایسا کیوں کیا میں نے تو تجھے اس بات کا حکم نہیں دیا تھا ہوا نے جواب دیا ہم آپ کی اطاعت اس وقت کرتے ہیں جب آپ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔

---

(۱) انبیاء کرام علیہم السلام کے ایسے واقعات میں اللہ تعالیٰ کی کئی حکمتیں ہوتی ہیں نیز ان کے ایسے کاموں کو زلۃ (لغزش) سے تعبیر کیا گیا اور لغزش یا زلہ پھسلنے کو کہتے ہیں لہٰذا ایسے کاموں کو گناہ نہیں کہہ سکتے انبیاء کرام گناہوں سے معصوم ہیں اور پھسلنا اپنے ارادے یا مرضی سے نہیں ہوتا ۱۲ ہزاروی

مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ آپ کو معلوم ہے میں نے آپ کے اور آپ کے بیٹے یوسف علیہ السلام کے درمیان جدائی کیوں ڈالی ہے؟ انہوں نے عرض کیا مجھے معلوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اس لیے کہ آپ نے ان کے بھائیوں سے فرمایا مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ اسے بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے غافل ہو آپ نے اس پر بھیڑیئے کا خوف کیوں کیا؛ مجھ سے توقع کیوں نہیں کی ان کے بھائیوں کی غفلت کی طرف نظر کیوں کی میری حفاظت کو کیوں نہیں دیکھا اور کیا آپ جانتے ہیں کہ میں نے ان کو آپ کی طرف واپس کیوں کیا؛ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ فرمایا اس لیے کہ آپ نے مجھ سے امید رکھتے ہوئے یوں کہا۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِىْ بِهِمْ جَمِيْعًا۔ (۱)
قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو میرے پاس لائے۔

اور آپ نے یہ بھی فرمایا۔

اِذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَيْاَسُوْا۔ (۲)
جاؤ پس یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی کو تلاش کرو اور مایوس نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَاَنْسَاهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِى السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ۔ (۳)
تو شیطان نے اس (زندی) سے بھلا دیا کہ وہ (یوسف علیہ السلام کا) ذکر اپنے مالک سے کرتا تو (یوں) آپ کئی سال قید خانے میں رہے۔

اس قسم کی حکایات کی بے شمار مثالیں ہیں اور قرآن پاک نیز احادیث میں یہ حکایات محض قصہ کہانی کے طور پر نہیں آئے بلکہ ان کا مقصد عبرت حاصل کرنا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ انبیاء کرام علیہم السلام سے معمولی لغزشیں معاف نہیں ہوئیں تو دوسروں سے کبیرہ گناہ کس طرح معاف ہوں گے ہاں ان کی سعادت یہ تھی کہ انہیں فوری طور پر تنبیہ کی گئی اور ان کا معاملہ آخرت تک موخر نہیں کیا گیا جب کہ بدبخت لوگوں کو مہلت دی جاتی ہے تاکہ ان کے گناہ بڑھ جائیں نیز آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور زیادہ بڑا ہے اس قسم کی باتیں گناہوں پر اصرار کرنے والوں کے سامنے زیادہ بیان کی جائیں توبہ توبہ کو دعوت دینے والے امور کو حرکت دینے کے لیے یہ بات نفع بخش ہے۔

تیسری قسم:

لوگوں کے سامنے یہ بات بیان کی جائے کہ گناہوں پر دنیا میں سزا متوقع ہے اور بندے کو جو مصیبت پہنچتی ہے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ یوسف آیت ۸۳

(۲) قرآن مجید، سورۂ یوسف آیت ۸۷

(۳) قرآن مجید، سورۂ یوسف آیت ۴۲

وہ اس کے گناہوں کے سبب ہوتی ہے اس لیے کہ کئی لوگ آخرت کے معاملے میں سستی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنی جہالت کے باعث دنیوی سزا سے ڈرتے ہیں تو مناسب یہی ہے کہ ان کو دنیوی سزا سے ڈرایا جائے کیوں کہ عام طور پر تمام گناہوں کی نحوست دنیا میں ہی ہوتی ہے جیسا کہ حضرت داؤد سلیمان علیہما السلام کے واقعہ میں مذکور ہے حتیٰ کہ بعض اوقات بندے پر اس کے گناہوں کے سبب سے رزق تنگ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات لوگوں کے دلوں سے اس کی قدر و منزلت ختم ہو جاتی ہے اور اس پر اس کے دشمن مسلط ہو جاتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ الْعَبْدَ لَیُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ یُصِیْبُہٗ (۱) بے شک بندہ اپنے گناہ کے باعث جس کا وہ مرتکب ہوتا ہے، رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میرا خیال ہے کہ بندہ گناہ کی وجہ سے علم کو بھول جاتا ہے (۲)

اور بعض بزرگوں نے فرمایا لعنت چہرے کا سیاہ ہونا اور مال کا نقصان نہیں ہے بلکہ لعنت یہ ہے کہ انسان ایک گناہ سے نکل کر اس جیسے یا اس سے بھی برے گناہ میں مبتلا ہو جائے — اور بات اسی طرح ہے جس طرح انہوں نے فرمایا ہے کیوں کہ لعنت کا معنیٰ (رحمت سے) دور کر دینا اور پھینک دینا ہے، اور جب انسان کو نیکی کی توفیق نہ ملے اور اس کے لیے برائی کا ارتکاب آسان ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کر دیا گیا اور توفیق کے ملنے سے محرومی سب سے بڑی محرومی ہے اور ہر گناہ دوسرے گناہ کی دعوت دیتا ہے اور وہ دو گنا ہوتا ہے پس بندہ ان علماء کی مجالس سے حاصل ہونے والے نفع سے محروم ہو جاتا ہے جو گناہوں سے نفرت کرتے ہیں نیز وہ صالحین کی ہمنشینی سے بھی محروم رہتا ہے بلکہ ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ بھی ناراض ہوتا ہے تاکہ اس سے نیک لوگ بھی ناراض رہیں۔

ایک بزرگ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ کیچڑ میں کپڑوں کو لپیٹے ہوئے چل رہے تھے تاکہ پاؤں پھسل نہ جائے حتیٰ کہ ان کا پاؤں پھسل گیا اور وہ گر گئے وہ کھڑے ہوئے اور روتے روتے کیچڑ کے درمیان چلنے لگے وہ کہہ رہے تھے۔ بندے کی یہی مثال ہے وہ گناہ سے بچتا اور کنارہ کش رہتا ہے حتیٰ کہ وہ ایک یا دو گناہوں میں جا پڑتا ہے اس وقت وہ گناہوں میں ڈوب جاتا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ گناہ کی فوری سزا یہ ہے کہ وہ دوسرے گناہ کی طرف لے جاتا ہے۔

اسی لیے حضرت فضیل رحمہ اللہ نے فرمایا کہ تم پر جو گردش زمانہ یا دوسرے بھائیوں کی طرف سے ظلم آتا ہے وہ تمہارے گناہوں کی وجہ سے ہوتا ہے اور کسی بزرگ نے فرمایا کہ اگر میرے گدھے کی عادت بگڑ جائے تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ میرے گناہ کی

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۸۰ مرویات ثوبان

وجہ سے ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں میں اپنے گناہوں کی سزا اپنے گھر کے چوہے میں بھی معلوم کر لیتا ہوں۔

شام کے ایک صوفی بزرگ فرماتے ہیں میں نے ایک خوبصورت عیسائی غلام کی طرف دیکھا تو پھر دیکھتا ہی رہ گیا اتنے میں حضرت ابن جلاء دمشقی رحمہ اللہ میرے پاس سے گزرے انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا تو مجھے ان سے حیا آیا اس نے کہا اے ابو عبداللہ! سبحان اللہ! مجھے یہ صورت اچھی لگی تھی اور یہ صنعت پہ ندا آئی مجھے اس بات پر تعجب ہوا کہ یہ کیسے آگ کے لیے پیدا کیا گیا انہوں نے میرا ہاتھ دبایا اور فرمایا تم کچھ عرصہ بعد اس گناہ کی سزا پاؤ گے فرماتے ہیں تین سال بعد مجھے اس کی سزا ملی۔

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں احتلام بھی ایک سزا ہے اور جب کسی شخص سے نماز باجماعت چھوٹ جاتی ہے تو یہ اس کے کسی گناہ کی سزا ہوتی ہے حدیث شریف میں ہے۔

مَا اَنْكَرْتُمْ مِنْ زَمَانِكُمْ فَبِمَا غَيَّرْتُمْ مِنْ اَعْمَالِكُمْ۔ (۱)

تم جو بات اپنے حالات میں ناپسند کرتے ہو وہ تمہارے اعمال کی وجہ سے بدل کر آئی۔

اور حدیث شریف میں ہے۔

يَقُوْلُ اللهُ تَعَالٰى اِنَّ اَدْنٰى مَا اَصْنَعُ بِالْعَبْدِ اِذَا اٰثَرَ شَهْوَتَهٗ عَلٰى طَاعَتِهٖ اَنْ اُحْرِمَهٗ لَذِيْذَ مُنَاجَاتِيْ۔ (۲)

اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے کہ بندہ جب اپنی خواہش کو میری عبادت پر ترجیح دیتا ہے تو میں اسے کم از کم سزا یہ دیتا ہوں کہ اپنے ساتھ مناجات کی لذت سے محروم کر دیتا ہوں۔

ابو عمرو بن علوان کے ایک طویل واقعہ میں منقول ہے وہ فرماتے ہیں میں ایک دن کھڑا نماز پڑھ رہا تھا تو میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی جو نہایت طویل ہوگئی حتی اس سے مردوں کے ساتھ شہوت کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا تو میں زمین پہ گر گیا اور میرا تمام جسم سیاہ ہوگیا میں گھر میں چھپ کر بیٹھ گیا اور تین دن تک باہر نہ نکلا میں حمام میں جا کر اپنے جسم کو صابن سے دھوتا لیکن سیاہی بڑھتی چلی جاتی یہاں تک کہ تین دن بعد وہ سیاہی دور ہوگئی میں نے حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ سے ملاقات کی انہوں نے مجھے موضع رقہ سے بغداد بلایا تھا جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فرمایا تجھے شرم نہ آئی کہ تو اللہ تعالی کے سامنے کھڑا ہے اور تیرا نفس شہوت میں اس قدر ڈوبا کہ تجھ پہ غالب آگیا اور تجھے اللہ تعالی کے حضور حاضری سے نکال دیا اگر میں تمہارے لیے اللہ تعالی سے دعا نہ مانگتا اور تیری طرف سے توبہ نہ کرتا تو تو اسی رنگ کے ساتھ اللہ تعالی سے ملاقات

---

(۱) مجمع الزوائد جلد ۱۰ ص ۱۳۱ کتاب الزھد

(۲)

کرتا ۔ ابو عمرو فرماتے ہیں مجھے تعجب ہوا کہ ان کو یہ بات کیسے معلوم ہو گئی حالانکہ وہ تو بغداد میں ہیں اور میں مقام رقہ میں تھا۔ (۱)

تو جاننا چاہیے کہ انسان جو گناہ بھی کرتا ہے اس سے اس کے دل کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اگر وہ نیک بخت ہے تو تنبیہ کے لیے وہ سیاہی چہرے پر ظاہر ہو جاتی ہے اور اگر وہ بد بخت ہے تو اس سے مخفی رہتی ہے حتیٰ کہ اس میں ڈوبا رہتا ہے اور جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے۔

گناہوں کی دنیوی آفات کے سلسلے میں بے شمار احادیث مروی ہیں اور یہ آفات فقر اور مرض وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں بلکہ دنیا میں گناہ کی ایک شامت یہ بھی ہے کہ اس کے بعد بھی اسی گناہ کی صفت میں رہے پس اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو وہ اس کی سزا ہو اور وہ اچھی طرح صبر سے بھی محروم رہے حتیٰ کہ بدبختی دوگنا ہو جائے اور اگر اسے کوئی نعمت پہنچے تو اس کے حق میں مہلت ہو اور اچھے شکر سے محروم ہو جائے حتیٰ کہ ناشکری کی سزا ملے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والے کو اس اطاعت کی برکت حاصل ہوتی ہے اور ہر نعمت اس کے حق میں اس کی اطاعت کی جزا ہوتی ہے اور اسے اس کے شکر کی توفیق حاصل ہوتی ہے ہر آزمائش اس کے گناہوں کا کفارہ اور درجات کی بلندی کا باعث ہوتی ہے۔

چوتھی قسم:

ایک ایک گناہ پر جو سزائیں وارد ہوئی ہیں مثلاً شراب نوشی، زنا، چوری، قتل، غیبت، تکبر، حسد وغیرہ کی سزائیں بیان کرے اور یہ اس قدر ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں ہے اور غیر اہل کے سامنے ان کا ذکر ایسے ہی ہے جیسے کسی نامناسب جگہ پر دوائی استعمال کی جائے۔ بلکہ عالم کو ماہر طبیب کی طرح ہونا چاہیے کہ پہلے وہ نبض، رنگ اور حرکات و سکنات سے باطنی بیماریوں سے آگاہی حاصل کرتا ہے اور ان کے علاج میں مشغول ہوتا ہے تو عالم کو بھی چاہیے کہ احوال کے قرائن سے پوشیدہ صفات معلوم کرے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کرتے ہوئے انہی صفات کا حال بیان کرے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا کہ مجھے نصیحت فرمائیں لیکن زیادہ نہ ہو آپ نے فرمایا غصہ نہ کھاؤ (۱)

اور ایک دوسرے شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے نصیحت کیجئے تو آپ نے فرمایا۔

عَلَيْكَ بِالْيَأْسِ مِمَّا فِي أَيْدِي النَّاسِ فَإِنَّ ذٰلِكَ هُوَ الْغِنٰى وَإِيَّاكَ وَالطَّمَعَ فَإِنَّهُ

جو کچھ لوگوں کے پاس ہے تم اس سے مایوس ہو جاؤ بے شک یہی مالداری ہے نیز طمع سے بچو یہ حاضر فقر ہے اور

---

(۱) معلوم ہوا اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو پوشیدہ باتوں پر بھی مطلع کر دیتا ہے مسلمانوں کا یہی عقیدہ ہونا چاہیے اس کے خلاف عقیدہ بدعت ہے ۱۲ ہزاروی

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۴۶۶ مرویات ابو ہریرہ

اَلْفَقْرُ الْحَاضِرُ وَصَلِّ صَلَاةَ مُوَدِّعٍ وَاِيَّاكَ وَمَا يُعْتَذَرُ مِنْهُ۔ (۱)

رخصت ہونے والے کی طرح نماز پڑھو اور ایسے کام سے بچو جس سے عذر پیش کرنا پڑے۔

حضرت محمد بن واسع رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا کہ مجھے نصیحت کیجئے انہوں نے فرمایا میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ دنیا اور آخرت میں فرشتہ بن جاؤ اس نے کہا یہ بات کیسے ہوگی؟ فرمایا دنیا سے بے رغبتی اختیار کرو۔

تو گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے شخص میں غصے کی علامات ملاحظہ فرماکر اسے اس سے منع فرمایا اور دوسرے آدمی میں لوگوں سے طمع اور لمبی امید کے اسباب دیکھے اور حضرت محمد بن واسع رحمہ اللہ نے پوچھنے والے شخص میں دنیوی حرص کے اسباب دیکھ کر اسے نصیحت کی۔

ایک شخص نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں انہوں نے فرمایا رحم کرنے والے بن جاؤ میں تمہارے لیے جنت کا ضامن ہوں گویا انہوں نے اس میں سختی کے آثار بھانپ لیے تھے۔

ایک آدمی نے حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ مجھے نصیحت فرمائیں انہوں نے فرمایا لوگوں سے دور رہو، لوگوں کے ساتھ رہا کرو لوگوں کا ہونا ضروری ہے کیوں کہ لوگ ہی تو لوگ ہیں اور سب لوگ بھونکنے والے نہیں لوگ تو چلے گئے اور باقی بھوسہ رہ گیا میں ان کو لوگ نہیں سمجھتا بلکہ وہ مایوسی کے پانی میں غوطہ زن ہو گئے۔

گویا انہوں نے اس شخص میں میل جول کی آفت کو ملاحظہ فرمایا اور اس بات کی خبر دی جو اس وقت اس پر غالب تھی اور اس پر لوگوں کو اذیت دینے کا عمل غالب تھا اور لوگوں سے ان کی حالت کے مطابق کلام کیا جاتا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں لکھا کہ مجھے ایک تحریر عنایت فرمائیں جس میں مجھے کوئی نصیحت کریں مختصر بات ہو تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ایک تحریر بھیجی گئی جس میں لکھا تھا آپ پر سلامتی ہو بعد اس کے میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا۔

مَنِ الْتَمَسَ رِضَا اللّٰهِ بِسَخَطِ النَّاسِ كَفَاهُ اللّٰهُ مُؤْنَةَ النَّاسِ وَمَنِ الْتَمَسَ سَخَطَ اللّٰهِ بِرِضَا النَّاسِ وَكَلَهُ اللّٰهُ اِلَى النَّاسِ۔ (۲)

جو شخص لوگوں کی ناراضگی میں اللہ تعالیٰ کی رضا تلاش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے مشقت سے بچا لیتا ہے اور جو آدمی لوگوں کی رضا حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کو ناراض کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے۔

اس کے بعد لکھا آپ پر سلامتی ہو۔

---

(۱) المستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۳۲۶ کتاب الرقاق

(۲) مجمع الزوائد جلد ۱۰ ص ۲۲۵ کتاب الزھد

تو غور کیجیے ام المومنین نے کس طرح اس آفت کا ذکر کیا کہ حکمران جس کے در پے ہیں اور وہ لوگوں کی رعایت کرنا اور ان کی رضا جوئی ہے اس کے بعد ایک مرتبہ انہوں نے ان کو لکھا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے تو وہ تمہیں لوگوں سے بچائے گا اور جب لوگوں سے ڈرو گے تو وہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے بچا نہیں سکیں گے، والسلام۔

تو ہر نصیحت کرنے والے کو چاہیے کہ اس کی توجہ باطنی صفات کی طرف ہو اور اس کے لائق حالات معلوم کرے تاکہ وہ ضروری امور کو بیان کرے کیوں کہ شریعت کے تمام مواعظ ہر ایک تک پہنچانا ناممکن ہے اور اسے اس بات کا وعظ کرنا جس کی اسے ضرورت نہیں ہے وقت ضائع کرنا ہے۔

سوال:

اگر واعظ ایک اجتماع کو وعظ کر رہا ہو یا جس آدمی نے اس سے وعظ کا سوال کیا ہے وہ اس کی باطنی حالت کو نہ جانتا ہو تو وہ کیا کرے؟

جواب:

جان لو! اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان باتوں کا ذکر کرے جن کی سب کو ضرورت ہو یا اکثر لوگ اس کے محتاج ہوں کیوں کہ علوم شرعیہ میں غذائیں اور دوائیں دونوں چیزیں ہیں غذائیں سب لوگوں کے لیے ہیں اور دوائیں صرف بیماروں کے لیے ہیں۔

اس کی مثال اس روایت میں ہے ایک شخص نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ تقویٰ تمام بھلائیوں کی اصل ہے نیز تم پر جہاد لازم ہے کیونکہ اسلام کی رہبانیت (گوشہ نشینی) یہی ہے قرآن پاک سے تعلق قائم کرو یہ زمین والوں میں تمہارے لیے نور اور اہل آسمان میں تمہاری یاد ہے نیز تم پر لازم ہے کہ اچھی بات کے علاوہ خاموشی اختیار کرو کیوں کہ اس سے شیطان غلبہ حاصل کرتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی خدمت میں ایک شخص نے نصیحت کی درخواست کی تو انہوں نے فرمایا تم اللہ تعالیٰ کے دین کی عزت کرو اللہ تعالیٰ تمہیں عزت عطا فرمائے گا۔

حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے سے فرمایا اے میرے بیٹے! علماء کے سامنے دو زانو ہو جا اور ان سے جھگڑا نہ کرو ورنہ وہ تجھے برا سمجھیں گے۔ دنیا سے اپنی ضرورت کے مطابق لو اور زائد کمائی اپنی آخرت کے لیے خرچ کرو۔ دنیا کو بالکل ہی نہ چھوڑو ورنہ محتاج ہو جاؤ گے اور لوگوں کے کاندھوں کا بوجھ بنو گے، ایسا روزہ رکھو جو تمہاری خواہش کو توڑ دے ایسا روزہ نہ رکھو جو تمہاری نماز کو نقصان پہنچائے کیوں کہ نماز، روزے سے افضل ہے، بیوقوف لوگوں کے پاس نہ بیٹھو اور نہ منافق سے میل جول رکھو۔

انہوں نے اپنے بیٹے کو یہ نصیحت بھی کی فرمایا اے بیٹے! تعجب کے بغیر نہ ہنسو اور حاجت کے بغیر نہ پھرو بے مقصد

بات کا سوال نہ کرو اپنا مال ضائع نہ کرو اور دوسروں کے مال کی اصلاح کرو کیوں کہ تمہارا مال وہ ہے جو تم نے آگے بھیجا اور جو کچھ تم نے چھوڑا وہ دوسروں کا مال ہے۔

اے میرے بیٹے! جو رحم کرتا ہے اس پر رحم کیا جاتا ہے، جو خاموش رہتا ہے وہ محفوظ رہتا ہے جو اچھی بات کرتا ہے غنیمت پاتا ہے اور جو بری بات کرتا ہے وہ گناہ گار ہوتا ہے جو آدمی اپنی زبان پر کنٹرول نہیں کرتا وہ پشیمان ہوتا ہے۔

ایک شخص نے حضرت ابو حازم سے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں انہوں نے فرمایا جس عمل پر تجھے مرنا اچھا لگتا ہو اسے لازم پکڑو اور جس کام کی حالت میں تمہیں موت کا آنا مصیبت معلوم ہو اس سے بچو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے فرمایا مجھے کوئی نصیحت کیجئے انہوں نے فرمایا اے عمران کے بیٹے! ہنستے رہا کرو غصے میں نہ رہا کرو نفع دینے والے بنو، نقصان پہنچانے والے نہ بنو جھگڑوں سے بچو اور ضرورت کے بغیر کہیں نہ جاؤ۔ نیز تعجب کے بغیر نہ ہنسو۔ لوگوں کی خطاؤں پر انہیں عار نہ دلاؤ بلکہ اپنی خطا پر رُو۔

ایک شخص نے حضرت محمد بن کرام رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں انہوں نے فرمایا اپنے خالق کی رضا جوئی کے لیے اس قدر کوشش کر جتنی کوشش اپنے نفس کو راضی کرنے کے لیے کرتا ہے۔

ایک شخص نے حضرت حامد لفاف سے کہا مجھے کوئی نصیحت کریں انہوں نے فرمایا اپنے دین کو میل کچیل سے بچانے کے لیے اس طرح غلاف بناؤ جیسے قرآن پاک کا غلاف ہوتا ہے انہوں نے پوچھا دین کا غلاف کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا ضرورت کے بغیر دنیا کی طلب نہ کرنا، ضرورت کے علاوہ گفتگو نہ کرنا اور ضرورت کے بغیر لوگوں سے میل جول نہ رکھنا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کو لکھا حمد و صلوٰۃ کے بعد! اس بات سے ڈریں جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ڈرایا اور اس چیز سے پرہیز کریں جس سے اللہ تعالیٰ نے بچنے کا حکم دیا جو کچھ آپ کے پاس ہے اس سے آگے کا سامان کریں کیوں کہ موت کے وقت یقینی خبر آئے گی۔ والسلام۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کو لکھا کہ انہیں کوئی نصیحت کریں تو انہوں نے لکھا۔

"حمد و صلوٰۃ کے بعد! بے شک سب سے بڑا خطرہ اور پریشان کن امور آپ کے آگے ہیں اور آپ کو ان کا مشاہدہ ضرور کرنا ہے یا تو نجات حاصل ہو گی یا تباہی ہو گی۔ اور جان لو کہ جو شخص اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے وہ نفع اٹھاتا ہے اور جو ان امور سے غافل رہتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے جو آدمی انجام کار پر نظر رکھتا ہے وہ نجات پاتا ہے اور جو اپنی خواہش کی بات مانتا ہے وہ گمراہ ہوتا ہے جو شخص بردباری اختیار کرتا ہے وہ غنیمت حاصل کرتا ہے، جو ڈرتا ہے وہ امن میں رہتا ہے جو امن میں ہوتا ہے وہ عبرت حاصل کرتا ہے اور عبرت پکڑنے والا صاحب بصیرت ہوتا ہے اور اہل بصیرت ہی سمجھتے ہیں اور جو سمجھتے ہیں وہ جانتے ہیں جب کوئی لغزش ہو جائے تو باز آ جاؤ اور جب ندامت پیدا ہو تو گناہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو۔

جب کوئی بات معلوم نہ ہو تو اس کے بارے میں پوچھو اور جب غصہ آئے تو رک جاؤ۔"

حضرت مطرف بن عبداللہ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز (رحمہما اللہ) کی طرف لکھا۔ "حمد وصلوٰۃ کے بعد! دنیا سزا کا مقام ہے اور اس کے لیے وہی جمع کرتا ہے جس کے پاس عقل نہیں اور اس کے دھوکے میں وہی آتا ہے جس کو علم نہیں ہوتا تو اے امیر المومنین! دنیا میں اس شخص کی طرح رہو جو اپنے زخم کا علاج کرتا ہے اور دوائی کی شدت پر صبر کرتا ہے کیوں کہ وہ بیماری کے انجام کو جانتا ہے۔"

اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے حضرت عدی بن ارطاۃ رحمہ اللہ کو لکھا "حمد وصلوٰۃ کے بعد! بے شک دنیا اولیاء اللہ کی دشمن ہے اور اللہ تعالیٰ کے دشمن کی بھی دشمن ہے اللہ تعالیٰ کے دوستوں کو غم اور رنج پہنچاتی ہے اور اس کے دشمنوں کو دھوکہ دیتی ہے۔"

آپ نے اپنے بعض گورنروں کو لکھا۔

حمد وصلوٰۃ کے بعد انہیں بندوں پر ظلم کی قدرت حاصل ہے پس جب تم کسی پر ظلم کا ارادہ کرو تو اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی قدرت کو یاد کرو۔ اور جان لو! انسانوں کی طرف جو تکلیف آئے گی وہ زائل ہو جائے گی لیکن تمہارے اوپر باقی رہے گی اور یہ بات بھی جان لو کہ اللہ تعالیٰ ظالموں سے مظلوموں کا بدلہ لینے والا ہے والسلام۔

تو عام لوگوں کو اس طرح وعظ کیا جائے نیز جس کے کسی خصوصی واقعہ کا علم نہ ہو اسے بھی اسی طرح نصیحت کی جائے یہ وعظ غذاؤں کی طرح ہیں جن سے نفع اٹھانے میں سب لوگ مشترک ہیں چونکہ اس قسم کے واعظین باقی نہیں رہے اس لیے نصیحت حاصل کرنے کا دروازہ بھی بند ہو گیا اور گناہ غالب آگئے، فساد پھیل گیا اور لوگ ایسے واعظوں کے ساتھ آزمائش میں مبتلا ہو گئے جو قافیے اور سجع ملاتے ہیں اور اشعار پڑھتے ہیں۔ اور جو کچھ ان کی وسعتِ علم میں نہیں اس کے لیے تکلف کرتے ہیں اور دوسروں کی حالت کی مشابہت اختیار کرتے ہیں چنانچہ عام لوگوں کے دلوں سے ان کا وقار ختم ہو گیا اور چونکہ ان کی گفتگو دل سے نہیں نکلتی اس لیے دلوں تک نہیں پہنچتی بلکہ بولنے والا لاف زن اور سننے والے تکلف برتنے والے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دین سے پیچھے ہٹنے والا ہے تو اس صورت میں طبیب کو پہلے مریض کا اور علماء کو پہلے نافرمان لوگوں کا علاج کرنا چاہیے یہ علاج کے ارکان اور اصول میں سے ایک رکن اور اصل ہے دوسرا اصل صبر ہے اور اس کی حاجت اس لیے ہے کہ مریض کا مرض بڑھنے کی وجہ ضرور رساں چیز کھانا ہے اور وہ نقصان دہ چیز اس لیے کھاتا ہے کہ اس کے نقصان سے غافل ہوتا ہے یا اس پر شہوت کا غلبہ ہوتا ہے پس اس کے دو سبب ہیں جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے وہ غفلت کا علاج ہے پس شہوت کا علاج باقی رہ گیا اور اس کے علاج کا طریقہ ہم نے ریاضت نفس کے بیان میں ذکر کیا ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مریض کو جب مضر کھانے کا اشتیاق زیادہ ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے ضرر کی زیادتی سے واقف ہو پھر وہ چیز اس کی آنکھوں سے غائب کر دی جائے اور اس کے سامنے نہ لائی جائے پھر ایسی چیز جو صورتاً اس کے مشابہ ہو لیکن اس کا نقصان زیادہ نہ ہو، کے ذریعے تسلی حاصل کرے پھر وہ چیز جسے استعمال کر رہا ہے اس سے

حاصل ہونے والی تکلیف کے خوف کی قوت سے اسے بھی چھوڑ دے اور صبر کرے پس ہر حالت میں صبر کا کڑوا گھونٹ پینا ضروری ہے۔

اسی طرح گناہوں کے سلسلے میں خواہش کا علاج کیا جائے مثلاً جب کسی نوجوان پر شہوت غالب ہو جائے اور وہ اپنی آنکھوں کی حفاظت پر قادر نہ ہو نہ دل کی حفاظت کر سکے اور نہ ہی شہوت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے اعضاء کو روک سکے تو اسے چاہیے کہ گناہ کے نقصان کا شعور حاصل کرے یعنی قرآن پاک اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جو تنبیہات آئی ہیں ان کو تلاش کرے پس جب خوف زیادہ ہو جائے تو شہوت کو ابھارنے والے اسباب سے دُوری اختیار کرے۔

شہوت کو برانگیختہ کرنے والے اسباب یا تو خارجی ہوتے ہیں مثلاً جس چیز کی خواہش ہے وہ سامنے ہو اور اسے دیکھ رہا ہو تو اس کا علاج اس سے بھاگنا اور کنارہ کش ہونا ہے اور کچھ اسباب داخلی ہوتے ہیں مثلاً لذیذ کھانے کھانا تو اس کا علاج بھوک اور دائمی روزہ ہے اور یہ تمام باتیں صرف صبر سے پوری ہو سکتی ہیں۔

صبر کے لیے خوف اور خوف کے لیے علم ضروری ہے اور علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جب بصیرت اور غور و فکر ہو یا سن کر اور تقلید کے ذریعے حاصل ہو۔ تو سب سے پہلے مجالس ذکر کی حاضری ہے۔

پھر دل کو تمام مشاغل سے خالی کر کے غور سے سننا ہے یعنی سماع کی طرف مصروف ہو پھر اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے غور و فکر کرے اس طریقے سے لامحالہ خوف پیدا ہو گا اور جب خوف مضبوط ہو جائے تو اس کی مدد سے صبر حاصل ہوتا ہے اور طلب علاج کے اسباب پیدا ہوتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق حاصل ہو گی اور اس کے بعد معاملہ آسان ہو جائے گا۔

تو جو شخص دل لگا کر سنے اور خوف کا شعور حاصل کر کے اللہ تعالیٰ سے ڈرے، ثواب کا انتظار کرے اور اچھی بات کی تصدیق کرے اللہ تعالیٰ اس کو آسانی تک پہنچا دیتا ہے لیکن جو شخص بخل سے کام لے اور بے نیاز ہو جائے اور اچھی بات کو جھٹلائے اللہ تعالیٰ اسے تنگی اور سختی کی طرف لے جائے گا پھر جب تک وہ اس میں مشغول رہے گا دنیا کی کوئی لذت اسے فائدہ نہیں دے گی جب وہ ہلاک ہو کر گڑھے میں گرے گا۔ انبیاء کرام کا کام تو صرف ہدایت کے راستے کو کھول کر بیان کرنا ہے باقی (دنیا اور آخرت کی بازپرس تو) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

سوال:

نتیجہ یہ ہوا کہ تمام معاملے کا رجوع ایمان کی طرف ہے کیونکہ گناہ کو اس وقت تک چھوڑنا ممکن نہیں جب تک اس سے صبر نہ کرے اور صبر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک خوف کی معرفت نہ ہو اور خوف علم کے بغیر حاصل نہیں ہوتا ہے اور علم کا حصول اس وقت ہوتا ہے جب گناہ کے ضرر کی زیادتی کی تصدیق ہو اور گناہ کے نقصان کی تصدیق دراصل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق ہے اور یہی ایمان ہے تو گویا جو شخص گناہ پر ڈٹ جاتا ہے وہ اسی لیے

اصرار کرتا ہے کہ وہ مومن نہیں ہے۔

جواب:

جان لو! یہ بات ایمان کے نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ اس کا باعث ایمان کی کمزوری ہے کیوں کہ ہر مومن اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ گناہ اللہ تعالیٰ سے دُوری اور آخرت میں اس کے عذاب کا باعث ہے۔ لیکن اس کے گناہ میں مبتلا ہونے کا سبب کچھ امور ہیں پہلی بات یہ ہے کہ جس عذاب سے ڈرایا گیا ہے وہ غائب ہے سامنے نہیں ہے اور فطرت انسانی موجودہ چیز سے متاثر ہوتی ہے تو موجودہ سے متاثر ہونے کے مقابلے میں موعود چیز سے متاثر ہونا ضعیف ہے دوسری بات یہ ہے کہ وہ خواہشات جو گناہوں کا سبب بنتی ہیں وہ فوری اور نقد ہیں اور وہ فی الحال گلے کا ہار بنتی ہیں اور عادت والفت کے سبب سے وہ قوی اور غالب ہو جاتی ہیں اور عادت پانچویں طبیعت ہے اور آنے والے خوف کے پیش نظر فوری لذت کو چھوڑنا نفس پر دشوار ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ۔ (۱)

ہرگز نہیں بلکہ تم (اے کافرو!) جلدی ملنے والے (دنیوی فائدے) کو پسند کرتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو۔

اور ارشاد فرمایا:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ (۲)

بلکہ تم دنیوی زندگی کو ترجیح دیتے ہو

اس شدت امر کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا۔

حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ۔ (۳)

جنت، ناپسندیدہ باتوں سے اور جہنم خواہشات سے گھیری گئی ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے آگ کو پیدا فرمایا پھر حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم دیا کہ جا کر اسے دیکھیں انہوں نے اسے دیکھا تو عرض کیا یا اللہ! تیری عزت کی قسم جو اس کے بارے میں سنے گا وہ اس میں نہیں جائے گا تو اللہ تعالیٰ نے اسے خواہشات کے ساتھ ڈھانپ دیا پھر فرمایا اب جا کر دیکھو انہوں نے دیکھنے کے بعد عرض کیا یا اللہ! تیری عزت کی قسم ڈر ہے کہ اس میں داخل ہونے سے کوئی بھی پیچھے نہیں رہے گا۔ اور اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا تو حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا جا کر اسے دیکھیں انہوں نے دیکھا تو عرض کیا یا اللہ!

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ القیامۃ آیت ۲۰

(۲) قرآن مجید، سورۃ الاعلیٰ آیت ۱۶

(۳) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۷۸ کتاب الجنۃ

تیری عزت کی قسم جو بھی اس کے بارے میں سنے گا اس میں داخل ہوگا تو اللہ تعالیٰ نے اسے ناپسندیدہ امور سے چھپادیا پھر فرمایا جاکر اسے دیکھو انہوں نے اسے دیکھنے کے بعد عرض کیا کہ مجھے ڈر ہے اس میں کوئی بھی داخل نہیں ہوگا۔(۱)

تو شہوت کا فی الحال موجود ہونا اور عذاب کا دیر سے ہونا (گناہوں پر) اصرار کے دو سبب ہیں اس کے باوجود کہ اصل ایمان موجود ہے۔ جو شخص بیماری کی حالت میں برف کا پانی پیتا ہے وہ اصل طب کو جھٹلاتا نہیں ہے اور نہ اس بات کی تکذیب کرتا ہے کہ یہ کام اس کے حق میں مضر ہے لیکن اس پر شہوت کا غلبہ ہوتا ہے اور صبر کی تکلیف بھی موجود ہوتی ہے تو آئندہ کی تکلیف اسے آسان معلوم ہوتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ مومن عام طور پر توبہ کے عزم وارادے سے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ نیکیوں کے ذریعے گناہوں کا کفارہ ادا کردے گا اور اس سے وعدہ کیا گیا ہے کہ نیکیاں، گناہوں کے زوال کا باعث بنتی ہیں۔

لیکن چونکہ طبیعتوں پر ڈھیل غالب ہوتی ہے اس لیے وہ توبہ میں تاخیر کرتا رہتا ہے تو توبہ کی توفیق کی امید میں وہ ایمان کے باوجود گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ ہر مومن یقیناً اس کا اعتقاد رکھتا ہے کہ گناہوں کی وجہ سے ایسی سزا واجب نہیں ہوگی جس سے معافی نہ ہو سکے پس وہ گناہ کرتا اور اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ کرتے ہوئے معافی کا منتظر رہتا ہے۔ تو ایمان کے باوجود گناہ پر اصرار کے یہ چار اسباب ہیں ہاں کوئی گناہ گار ایک پانچویں سبب سے بھی گناہ کرتا ہے جس سے اس کے اصل ایمان میں خرابی لازم آتی ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچا ہونے میں شک کرنا ہے اور یہ کفر ہے اور یہ اس شخص کی طرح ہے جسے طبیب بیماری کی حالت میں مضر چیز کھانے سے روکتا ہے۔

پس اگر وہ شخص جس کو ڈرایا جارہا ہے ان لوگوں میں سے ہو جو اس کے عالم طب ہونے پر یقین نہیں رکھتے تو وہ اسے جھٹلائے گا یا اس میں شک کرے گا تو اس کی پرواہ نہ کی جائے کیونکہ وہ منکر ہے۔

سوال:

ان پانچ اسباب کا علاج کیا ہے۔

جواب:

اس کا علاج غور وفکر ہے وہ یوں کہ پہلے سبب یعنی عذاب کے موخر ہونے کے بارے میں اپنے دل میں اس بات کو مضبوط کرے کہ جو چیز آنے والی ہے وہ ضرور آئے گی اور دیکھنے والوں کے لئے کل کا دن قریب ہے۔ اور موت ہر آدمی کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے اسے کیا معلوم کہ شاید قیامت قریب ہو اور جو چیز مؤخر ہو وہ جب واقع ہوتی ہے تو فوراً واقع ہوتی ہے وہ اپنے دل میں سوچے کہ اس نے دنیا میں فی الحال ایک ایسے کام کے خوف سے اپنے آپ کو تھکانا شروع کردیا ہے جو مستقبل میں واقع ہوگا مثلاً وہ اس نفع کے لیے جس کے بارے میں اس کا گمان ہوتا ہے کہ وہ دوسری

حالت میں اس کا محتاج ہو گا۔ بحری اور بری سفر کرتا ہے بلکہ اگر وہ بیمار ہو جائے اور کوئی عیسائی ڈاکٹر کہہ دے کہ ٹھنڈا پانی پینا اس کے لیے نقصان دہ ہے اور وہ اسے موت تک لے جا سکتا ہے حالانکہ ٹھنڈا پانی سب سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے لیکن وہ اسے چھوڑ دیتا ہے اور موت کی تکلیف تو ایک لحظہ کے لیے ہے جب اس کے بعد کا خوف نہ ہو، اور دنیا سے اس کا جدا ہونا ضروری ہے۔ اور دنیا کے وجود کو ازل و ابد کے ساتھ کیا نسبت ہے؟ تو غور کا مقام ہے کہ وہ ایک عیسائی کے کہنے پر لذت والی چیز چھوڑ دیتا ہے حالانکہ اس کے ڈاکٹر ہونے پر کوئی معجزہ قائم نہیں ہے

تو دل میں کہنا چاہیے کہ یہ بات میری عقل کے لائق کیسے ہو سکتی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام جن کی معجزات کے ساتھ تائید کی گئی ہے ان کا قول ایک عیسائی کے قول سے کم درجہ میں ہو جو ڈاکٹر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کی ڈاکٹری پر کوئی معجزہ مؤید نہیں ہے اس کی گواہی تو صرف عام لوگ دیتے ہیں۔ اور کس طرح جہنم کا عذاب میرے لیے بیماری سے ہلکا ہو سکتا ہے حالانکہ آخرت کا ہر دن دنیا کے پچاس ہزار دنوں کے برابر ہو گا۔

تو اسی سوچ بچار کے ساتھ اس لذت کا علاج کرے جو اس پر غالب آتی ہے نیز اپنے نفس کو اس کے چھوڑنے کا مکلف بنائے اور یوں سوچے کہ جب میں زندگی کے ان دنوں میں جو تھوڑے سے دن ہیں اپنی لذت کو چھوڑ نہیں سکتا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس پر کیسے قادر ہوں گا اور جب میں صبر کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا تو آگ کی تکلیف کیسے برداشت کروں گا۔ اور جب میں دنیا کی زیبائش نہیں چھوڑ سکتا حالانکہ اس میں گندھے اور اس کا صاف میل کچیل سے ملا ہوا ہے تو میں آخرت کی نعمتوں سے کیسے صبر کروں گا۔

جہاں تک توبہ میں ٹال مٹول کا تعلق ہے تو اس بات کو سوچے کہ دوزخیوں کی اکثر فریاد اسی وجہ سے ہو گی کیوں کہ ٹال مٹول کرنے والا اپنے معاملے کی بنیاد ایسی بات کو بناتا ہے جو اس کے اختیار میں نہیں ہے اور وہ باقی رہنا ہے ہو سکتا ہے وہ باقی نہ رہے اور اگر باقی رہے تو کل بھی گناہ چھوڑ نہ سکے جیسے آج نہیں چھوڑ سکتا۔ آج بھی وہ شہوت کے غلبہ کی وجہ سے توبہ کرنے سے عاجز ہے اور کل اس سے شہوت دور نہیں ہو گی بلکہ بڑھ جائے گی کیوں کہ عادت کے ذریعے یہ پکی ہو جاتی ہے اور جس شہوت کو انسان عادت کے ذریعے پکا کرتا ہے وہ اس کی طرح نہیں ہے جسے اس نے پکا نہیں کیا ہے اسی وجہ سے (توبہ میں) ٹال مٹول کرنے والے ہلاک ہوئے کیوں کہ وہ ایک جیسی دو چیزوں میں فرق سمجھتے ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے کہ تمام دن اس بات میں ایک جیسے ہیں کہ ان میں شہوات کو چھوڑنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔

توبہ میں آج کل کرنے والے شخص کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو ایک درخت کو اکھاڑنے پر مجبور ہے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ درخت مضبوط ہے سخت مشقت کے بغیر اکھاڑا نہیں جا سکتا تو کہتا ہے میں اسے ایک سال کے لیے مؤخر کر دیتا ہوں پھر اس کی طرف رجوع کروں گا حالانکہ وہ جانتا ہے کہ درخت باقی رہنے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور جوں جوں اس کی عمر بڑھتی ہے اس کی کمزوری میں اضافہ ہوتا ہے تو دنیا میں اس سے بڑی حماقت کوئی نہیں کہ وہ قوت کے باوجود ضعیف کا مقابلہ

کرنے سے عاجز رہا اور اس انتظار میں رہا کہ جب یہ خود کمزور ہو جائے گا اور کمزور، مضبوط ہو گا تو یہ اس پر غلبہ پائے گا۔

چوتھی بات یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کے انتظار کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کا علاج پہلے بیان ہو چکا ہے اور وہ اس آدمی کی طرح ہے جو اپنا تمام مال خرچ کر دیتا ہے اور اپنے آپ کو اور اہل و عیال کو فقیر بنا کر چھوڑ دیتا ہے اور وہ اس بات کا منتظر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اسے ویران جگہ میں خزانہ بتائے گا تو گناہ کی معافی کا امکان بھی اسی طرح ہے اور اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جسے معلوم ہے کہ یہاں لوٹ مار کرنے والے لوگ ہیں لیکن وہ اپنے مال کو چھپانے اور دفن کرنے پر قادر ہونے کے باوجود اسے مکان کے صحن میں رکھ دیتا ہے اور اس بات کا منتظر رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے لوٹنے والوں پر غفلت مسلط کر دے گا یا ظالم لیٹرے کو سزا دے گا۔ حتیٰ کہ وہ میرے گھر کی طرف آنے کے لیے فارغ ہی نہیں ہوگا یا جب وہ میرے گھر کے قریب پہنچے گا تو دروازے پر ہی مر جائے گا کیوں کہ موت اور غفلت دونوں ممکن ہیں۔

اور واقعات میں اس قسم کی باتیں منقول ہیں لہٰذا میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے اسی قسم کی بات کا انتظار کرتا ہوں تو اس قسم کا منتظر، ایک ممکن بات کا منتظر ہے لیکن وہ انتہائی درجے کا احمق اور جاہل ہے کیوں کہ بعض اوقات اس قسم کی بات ممکن نہیں رہتی اور عمل میں نہیں آتی۔

پانچویں بات یعنی شک کرنا کفر ہے اور اس کا علاج وہ اسباب ہیں جن سے صدق رسول کا پتہ چلتا ہے یہ ایک لمبی بات ہے لیکن اس کے لیے ممکن ہے کہ علم قریب سے اس کا علاج کرے جو اس کی حد عقل کے قریب ہے۔ تو اس سے کہا جائے گا کہ انبیاء کرام علیہم السلام جن کو معجزات سے تائید حاصل تھی جو کچھ انہوں نے فرمایا کیا اس کا صدق تمہارے نزدیک ممکن ہے یا تو کہتا ہے کہ پھر علم کے مطابق یہ محال ہے۔ جیسے میں اس بات کو محال جانتا ہوں کہ ایک شخص ایک ہی حالت میں دو جگہ میں ہو اگر وہ کہے کہ میں اسی طرح محال جانتا ہوں تو وہ شخص عقلمندوں کی فہرست سے خارج ہے اور اگر وہ کہے کہ مجھے اس میں شک ہے تو اسے کہا جائے گا اگر تجھے کوئی مجہول شخص یہ خبر دے کہ تم نے جو کھانا گھر میں چھوڑ رکھا ہے اس میں سانپ نے منہ مارا ہے اور اس میں اس کا زہر پڑ گیا ہے اور تجھے اس بات میں شک ہو کہ معلوم نہیں یہ سچ کہتا ہے کہ جھوٹ؟ تو کیا تم اسے کھاؤ گے یا چھوڑ دو گے اگرچہ وہ لذیذ ترین کھانا ہو تو وہ کہتا ہے میں یقیناً اسے ترک کر دوں گا کیوں کہ میں کہوں گا کہ اگر یہ شخص جھوٹ بولتا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ مجھ سے یہ کھانا چھوٹ جائے گا تو اس سے صبر کرنا اگرچہ مشکل ہے لیکن قریب ہے اور اگر وہ سچ کہتا ہے تو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑیں گے اور کھانے سے صبر کرنے اور اس کو ضائع کرنے کی تکلیف کے مقابلے میں موت کا سامنا کرنا زیادہ سخت ہے۔

تو ایسے شخص سے کہا جائے گا سبحان اللہ! تو کس طرح تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے سچ کو مستقبل کے لیے چھوڑتا ہے حالانکہ ان کے معجزات ظاہر ہوئے اور تمام اولیاء کرام، علماء و حکماء بلکہ تمام عقلمند لوگوں نے ان کی تصدیق کی ہے اور یہ لوگ عوام

جاہل تو نہ تھے بلکہ عقلمند تھے حالانکہ تو ایک مجہول آدمی کی بات کو سچ مانتا ہے ہو سکتا ہے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس میں اس کی کوئی غرض ہو ——— تو کوئی عقل مند آدمی ایسا نہیں جس نے یوم آخرت کی تصدیق نہ کی ہو یا ثواب و عذاب کو ثابت نہ کیا ہو اگرچہ اس کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ اگر یہ لوگ سچے ہیں تو تجھے ایسا عذاب ہو گا جو ہمیشہ باقی رہے گا اور اگر (معاذ اللہ) وہ جھوٹے ہیں تو تجھ سے صرف دنیا کی بعض خواہشات ہی چھوٹیں گی جو فنا ہونے والی اور کدورت سے بھرپور ہیں۔

اب اگر وہ شخص عقل مند ہے تو اس بیان کئے گئے فکر کے بعد اس کے لیے توقف کی گنجائش باقی نہیں رہے گی کیوں کہ زندگی کو ابد الآباد سے کوئی نسبت نہیں ہے بلکہ اگر فرض کیا جائے کہ دنیا چیونٹیوں (یا ذرات) سے بھری ہوئی ہے اور ہم ایک پرندہ تصور کرتے ہیں جو دس لاکھ سال کے بعد ایک چیونٹی (یا ذرہ) اٹھاتا ہے تو بھی وہ ختم ہو جائیں گے اور ابد الآباد میں سے کچھ بھی فنا نہیں ہو گا تو ایک عقلمند شخص کی رائے (مثلاً) ایک سو سال کی خواہشات سے کیسے کوتاہی کرے گی اور وہ اس کے لیے ابدی سعادت کو ترک کر دے گا اسی لیے ابو العلاء احمد بن سلیمان تنوخی معرّی نے کہا۔

قَالَ الْمُنَجِّمُ وَالطَّبِيْبُ كِلَاهُمَا لَا تُبْعَثُ الْأَمْوَاتُ قُلْتُ إِلَيْكُمَا إِنْ صَحَّ قَوْلُكُمَا فَلَسْتُ بِخَاسِرٍ أَوْ صَحَّ قَوْلِيْ فَالْخَسَارُ عَلَيْكُمَا۔

نجومی اور طبیب دونوں نے کہا کہ مُردوں کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا میں نے کہا اپنی بات اپنے پاس رکھو اگر تمہاری بات سچی ہو تو مجھے کوئی خسارہ نہیں ہو گا اور اگر میری بات ٹھیک ہوئی تو تم دونوں خسارے میں ہو گے۔

اسی لیے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس آدمی سے فرمایا جس کی عقل امور کی تحقیق سے قاصر تھی اور وہ شک کرتا تھا۔ "اگر تمہارا قول ٹھیک ہوا تو ہم سب نے چھٹکارا پا لیا اور اگر ہماری بات درست ہوئی تو ہم نجات پائیں گے اور تم ہلاک ہو گے۔ یعنی عقل مند آدمی تمام حالات میں امن کے راستے پر چلتا ہے۔

سوال:

یہ باتیں واضح ہیں لیکن غور و فکر کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں تو دلوں کو کیا ہوا کہ انہوں نے غور و فکر چھوڑ دیا اور اسے بھاری سمجھا اور دلوں کو فکر کی طرف لوٹانے کا علاج کیا ہے خصوصاً اس شخص کے لیے جو شریعت کی اصل اور اس کی تفصیل دونوں پر ایمان رکھتا ہے۔

جواب:

غور و فکر کے راستے میں رکاوٹ دو باتیں ہیں ایک یہ کہ نفع بخش فکر، عذاب آخرت میں اور اس کی سختیوں میں غور کرنا ہے نیز یہ کہ نافرمان لوگوں کی جنت کی نعمتوں سے محرومی اور حسرت کے بارے میں سوچے یہ فکر ایک ڈسنے والا ہے جو دل کو اذیت پہنچاتا ہے لہٰذا دل اس سے بھاگتا ہے اور دنیوی امور سے راحت اور فرحت کے ذریعے لذت اٹھاتا ہے اور دوسری رکاوٹ یہ ہے کہ غور و فکر فوری مشغولیت ہے جو دنیوی لذتوں اور خواہشات کی تکمیل سے روکتی ہے اور ہر شخص کے لیے ہر حال اور ہر گھڑی

میں ایک خواہش ہوتی ہے جو اس پر غالب ہوتی ہے اور اسے اپنا غلام بناتی ہے تو اس کی عقل خواہشات کے سامنے مسخر ہو جاتی ہے اور کوئی حیلہ سوچنے میں مشغول ہوتی ہے تو اس کی لذت طلبِ حیلہ یا تکمیل شہوت میں ہوتی ہے اور غور و فکر اس بات سے مانع ہے۔

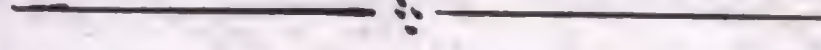
ان دو رکاوٹوں کا علاج یہ ہے کہ اپنے دل سے کہے کہ تو کس قدر غبی ہے تو موت اور اس کے بعد والے حالات کے بارے میں نہیں سوچتا اور اس کے ذکر سے تکلیف محسوس کرتا ہے اور اس کے آنے کی تکلیف کو حقیر جانتا ہے اور جب وہ واقع ہو گا تو کیسے صبر کرے گا حالانکہ تو موت اور اس کے مابعد کا تصور کر کے ہی پریشان ہو جاتا ہے۔

جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے کہ فکر کے باعث لذتِ دنیا کے فوت ہونے کا خوف ہوتا ہے تو ذہن میں یہ بات پکی طرح بٹھا لینی چاہیے کہ اُخروی لذت کا فوت ہونا زیادہ سخت اور بڑا نقصان ہے کیوں کہ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے اور اس میں کوئی کدورت بھی نہیں جب کہ دنیوی لذات فوری طور پر زائل ہونے والی بھی ہیں اور ان میں خرابیاں بھی ہیں کوئی بھی دنیوی لذت ایسی نہیں ہے جس میں گدلا پن نہ ہو اور دوسری بات یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کرنے اور اطاعت کی طرف متوجہ ہونے میں اللہ تعالیٰ سے مناجات کی لذت اس کی معرفت اور اطاعت کا سکون اور اس سے ایک طویل اُنس ہے اور اگر اطاعت کرنے والے کو اس کے عمل کی جزا نہ بھی ملے تو بھی عبادت کی حلاوت اور اللہ تعالیٰ سے مناجات کے اُنس کی رُوح جو اسے حاصل ہو رہی ہے، وہی کافی ہے تو کیا کیفیت ہو گی جب اسے اس کے ساتھ آخرت کی نعمتیں بھی ملیں گی۔ ہاں! یہ لذت توبہ کی ابتدا میں حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایک طویل مدت تک صبر کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے اب بھلائی اس کی عادت بن جائے گی جس طرح پہلے برائی اس کی عادت بن گئی تھی اور نفس اس بات کے قابل ہے کہ تم اسے جس بات کا عادی بناؤ گے اس کا عادی ہو جائے گا بھلائی ایک عادت ہے اور برائی دائمی دشمن ہے۔

تو اس وقت یہی افکار اس خوف کو ابھارتے ہیں جو لذات سے صبر کی قوت کو برانگیختہ کرتا ہے اور ان افکار کو واعظوں کا وعظ حرکت دیتا ہے نیز وہ تنبیہات ہیں جو اتفاقاً کبھی اسباب کے ساتھ دل پر واقع ہوتی ہیں اور وہ بے شمار ہیں اب فکر طبیعت کے موافق ہو جاتا ہے اور دل اس کی طرف مائل ہوتا ہے اور وہ سبب جو طبیعت اور فکر کے درمیان موافقت پیدا کرتا ہے اسے بھلائی کی توفیق کا سبب کہتے ہیں کیوں کہ توفیق سے ہی ارادہ اور وہ معنیٰ جو اطاعت ہے اور آخرت میں نفع دیتا ہے آپس میں ملتے ہیں۔

ایک طویل حدیث میں مروی ہے کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا اے امیر المومنین! بتائیے کہ کفر کی بنیاد کیا چیز ہے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کفر کی بنیاد چار ستون ہیں جفا، نابینائی، غفلت اور شک ——— کیونکہ جو شخص جفا (ظلم) کرتا ہے وہ حق کو حقیر جانتا ہے باطل کو ظاہر کرتا ہے اور علماء کو برا جانتا ہے، اور جو (دل کا) اندھا ہو گا وہ ذکر کو بھول جائے گا، غفلت کرنے والا راہ حق سے پھر جاتا ہے

اور شک کرنے والے کو آرزوئیں دھوکہ دیتی ہیں پس اسے حسرت اور ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے وہ کچھ ظاہر ہوتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا ــــــ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے یہ تفکر سے غفلت کے بارے میں کچھ باتیں ہیں اور توبہ کے سلسلے میں اتنی بات کافی ہے اور جب صبر، دوام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے تو صبر کا بیان بھی ضروری ہے تو ان شاء اللہ ہم اسے اگلے باب میں بیان کریں گے۔





۲۔ صبر اور شکر کا بیان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو حمد و ثنا کے لائق ہے، کبریائی کے لباس کے ساتھ یکتا ہے، بزرگی اور بلندی میں منفرد ہے خوشی اور تکلیف میں صبر اور انعامات پر شکر کے ساتھ اپنے دوستوں کی تائید کرتا ہے اور رحمت کاملہ حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ہو جو انبیاء کرام کے سردار ہیں اور آپ کے صحابہ کرام پر جو اصفیاء کے قائد ہیں اور آپ کی آل پر جو نیکوکار متقی ہیں ایسی رحمت جو دوام کے ذریعے فنا سے اور تسلسل کی وجہ سے ٹوٹنے سے محفوظ ہے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد ـــــ ایمان دو حصوں میں منقسم ہے ایک حصہ صبر ہے اور دوسرا حصہ شکر ہے (۱) جیسا کہ روایات میں آیا ہے اور اس پر احادیث مبارکہ شاہد ہیں اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کا وصف ہیں اور اس کے اسمائے حسنہ میں سے ہیں کیوں کہ اس نے اپنے آپ کو صبور اور شکور فرمایا۔

لہٰذا صبر اور شکر سے جہالت ایمان کے دونوں حصوں سے جاہل رہنا ہے علاوہ ازیں یہ رحمٰن کے اوصاف میں سے دو وصفوں سے غفلت ہے اور اللہ تعالیٰ کے قرب کے لیے ایمان کے علاوہ کوئی راستہ نہیں اور جب تک ایمان کے ارکان کی معرفت نہ ہو ایمان کے راستے پر چلنا کیسے متصور ہو سکتا ہے نیز یہ بھی معلوم ہونا ضروری ہے کہ کس پر ایمان لانا ضروری ہے لہٰذا صبر و شکر کی معرفت سے خاموش بیٹھ جانا اس کی معرفت کو چھوڑنا ہے جس پر ایمان لایا جاتا ہے نیز اس چیز کو چھوڑنا ہے جس کے ذریعے ایمان حاصل ہوتا ہے پس (ایمان کے) یہ دونوں حصے وضاحت اور بیان کے کس قدر محتاج ہوں گے ہم ان دونوں باتوں کو ایک ہی بیان میں ذکر کریں گے کیوں کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔

پہلا حصہ:

صبر کا بیان

اس میں مندرجہ ذیل امور کا بیان ہو گا۔

(۱) صبر کی فضیلت (۲) صبر کی تعریف اور حقیقت (۳) صبر، نصفِ ایمان ہے (۴) صبر کے متعلقات کے اعتبار سے اس کے مختلف نام (۵) قوت و ضعف کے اعتبار سے اس کی مختلف اقسام (۶) صبر کی ضرورت کا گمان کہاں کہاں ہے (۷) صبر کی دوا اور جس چیز سے اس پر مدد حاصل کی جا سکتی ہے

---

(۱) الفردوس بماثور الخطاب جلد اول ص ۱۱۱ حدیث ۳۷۸

یہ سات فصلیں ہیں جو ان شاء اللہ صبر کے تمام مقاصد پر مشتمل ہوں گی۔

فصل ۱

فضیلتِ صبر

آیات:

اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کے کئی اوصاف ذکر کئے ہیں اور قرآن مجید میں ستر سے زیادہ مقامات پر اس کا ذکر کیا گیا ہے اور اکثر درجات اور بھلائیوں کی نسبت صبر کی طرف کی گئی ہے اور ان کو اسی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا۔ (۱)

اور ہم نے ان میں سے کچھ راہنما بنائے جو ہمارے حکم سے راہنمائی کرتے ہیں جب انہوں نے صبر کیا۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (۲)

اور ہم صبر کرنے والوں کو ان کا اجر ضرور بضرور دیں گے جو ان کے اعمال سے زیادہ بہتر ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا۔ (۳)

اور تیرے رب کے اچھے کلمات بنی اسرائیل پر ان کے صبر کے سبب سے پورے ہو گئے۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا۔ (۴)

ان لوگوں کو ان کے صبر کی وجہ سے ان کا اجر دوبار دیا جائے گا۔

اور ارشاد فرمایا:

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ السجدہ آیت ۲۴

(۲) قرآن مجید، سورۃ نمل آیت ۹۶

(۳) قرآن مجید، سورۃ اعراف آیت ۱۳۷

(۴) قرآن مجید، سورۃ قصص آیت ۵۴

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّبِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (۱)

بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر کسی حساب کے بغیر دیا جائے گا۔

صبر کے سوا ہر نیکی کا اجر اندازے اور حساب سے ہوتا ہے

اور چونکہ روزے میں صبر ہوتا اور وہ نصفِ صبر ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا (حدیث شریف میں ہے)

اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ۔ (۲)

روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا اجر دوں گا۔

اللہ تعالیٰ نے باقی عبادات کو چھوڑ کر صرف اسے اپنی طرف منسوب کیا نیز صبر کرنے والوں سے وعدہ فرمایا کہ میں ان کے ساتھ ہوں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَاصْبِرُوا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ (۳)

اور صبر کرو بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اور مدد کو صبر کے ساتھ مشروط کیا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

بَلٰى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ۔ (۴)

ہاں کیوں نہیں اگر تم صبر کرو اور پرہیز گاری اختیار کرو اور وہ (کفار) تم پر فوری حملہ کر دیں تو اللہ تعالیٰ پانچ ہزار نشان والے فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد کرے گا۔

اور صبر کرنے والوں کے لیے وہ امور جمع فرمائے جو ان کے علاوہ کسی کے لیے جمع نہیں کیے ارشاد خداوندی ہے:

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ (۵)

ان لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے رحمتیں ہیں اور اور وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

تو ہدایت، رحمت اور صلوات کو صبر کرنے والوں کے لیے جمع کیا گیا۔ صبر کے سلسلے میں تمام آیات کا احاطہ طوالت کا تقاضا کرتا ہے۔

احادیث:

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ زمر آیت ۱۰

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۴۱۱ مرویات ابوہریرہ

(۳) قرآن مجید، سورہ انفال آیت ۴۶

(۴) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۱۲۵

(۵) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۱۵۷

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ۔ (۱)

صبر ایمان کا نصف ہے۔

اس کے نصف ہونے کی وجہ آگے بیان ہوگی۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مِنْ اَقَلِّ مَا اُوْتِیْتُمُ الْیَقِیْنُ وَعَزِیْمَۃُ الصَّبْرِ وَمَنْ اُعْطِیَ حَظَّہٗ مِنْھُمَا لَمْ یُبَالِ بِمَا فَاتَہٗ مِنْ قِیَامِ اللَّیْلِ وَصِیَامِ النَّھَارِ وَلَاَنْ تَصْبِرُوْا عَلٰی مَا اَنْتُمْ عَلَیْہِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ یُوَافِیَنِیْ کُلُّ امْرِئٍ مِنْکُمْ بِمِثْلِ عَمَلِ جَمِیْعِکُمْ وَلٰکِنِّیْ اَخَافُ اَنْ تُفْتَحَ عَلَیْکُمُ الدُّنْیَا بَعْدِیْ فَیُنْکِرُ بَعْضُکُمْ بَعْضًا وَیُنْکِرُکُمْ اَھْلُ السَّمَاءِ عِنْدَ ذٰلِکَ فَمَنْ صَبَرَ وَاحْتَسَبَ ظَفِرَ بِکَمَالِ ثَوَابِہٖ۔ (۲)

کم از کم چیز جو تمہیں دی گئی ہے وہ یقین اور صبر کی عزیمت ہے اور جس آدمی کو ان دونوں باتوں میں سے حصہ مل گیا اس کا قیام لیل اور دن کو روزہ رکھنا فوت بھی ہو جائے تو کوئی پرواہ نہیں اور تم جس حالت پر ہو اس پر تمہارا صبر کرنا مجھے اس بات سے زیادہ پسند ہے کہ کوئی شخص تم سب کے عمل کے برابر عمل میرے پاس لائے لیکن مجھے خوف ہے کہ تم پر دنیا کھول دی جائے تو تم ایک دوسرے سے اجنبی ہو جاؤ گے اس وقت آسمان والے بھی تمہیں نہیں پہچانیں گے جس نے صبر کیا اور ثواب کا ارادہ کیا وہ پورے ثواب کے ساتھ کامیاب ہوا۔

اس کے بعد آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔

مَا عِنْدَکُمْ یَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰہِ بَاقٍ وَلَنَجْزِیَنَّ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا اَجْرَھُمْ۔ (۳)

جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اور ہم ضرور بضرور صبر کرنے والوں کو ان کا اجر عطا کریں گے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا۔

اَلصَّبْرُ السَّمَاحَۃُ۔ (۴)

صبر کرنا سخاوت ہے۔

---

(۱) الترغیب والترہیب جلد ۴ ص ۲۷۷ کتاب الجنائز

(۲)

(۳) قرآن مجید، سورۃ النحل آیت ۹۶

(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۳۸۵ مرویات عمرو بن عبسہ

نیز آپ نے فرمایا۔

اَلصَّبْرُ كَنْزٌ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ۔ (۱) صبر، جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے

ایک مرتبہ آپ سے ایمان کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا صبر (ایمان) ہے (۲)

اور آپ کا یہ ارشاد گرامی، آپ کے اس قول کے مطابق ہے کہ آپ نے فرمایا۔

اَلْحَجُّ عَرَفَةُ۔ (۳) حج عرفہ (میں وقوف کا نام) ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ عرفات میں ٹھہرنا حج کا سب سے بڑا عمل ہے (رکن ہے)

آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔

اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ مَا اُكْرِهَتْ عَلَيْهِ النُّفُوْسُ۔ (۴) سب سے بہتر عمل وہ ہے جس پر نفسوں کو مجبور ہونا پڑے۔

کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے موصوف ہو جائیں اور میرے (اللہ تعالیٰ کے) اخلاق میں سے یہ ہے کہ میں بہت صبر کرنے والا ہوں۔

حضرت عطاء، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے پاس تشریف لے گئے تو فرمایا کیا تم مومن ہو؟ وہ خاموش رہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا۔ تمہارے ایمان کی علامت کیا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا ہم فراخی کی حالت میں شکر کرتے ہیں، آزمائش کے وقت صبر کرتے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رب کعبہ کی قسم! تم مومن ہو (۵)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فِي الصَّبْرِ عَلٰى مَا تَكْرَهُ خَيْرٌ كَثِيْرٌ۔ (۶) ناپسندیدہ بات پر صبر کرنے میں بہت بھلائی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

اِنَّكُمْ لَا تُدْرِكُوْنَ مَا تُحِبُّوْنَ اِلَّا بِصَبْرِكُمْ تم اپنی پسندیدہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں کر

---

(۱) الاسرار المرفوعۃ ص ۱۴۵ حدیث ۵۵

(۲) الفردوس بماثور الخطاب جلد ۲ ص ۴۱۴ حدیث ۳۸۴۰

(۳) سنن ابن ماجہ ص ۲۲۳، ابواب المناسک

(۴) یہ حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ کا قول ہے ابن ابی الدنیا نے "کتاب محاسبۃ النفس" میں نقل کیا ہے۔

(۵) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۱۱ ص ۱۵۳ حدیث ۱۱۳۲۶

(۶) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۳۰۷ مرویات ابن عباس

عَلٰی مَا تَکْرَهُوْنَ۔ سکتے جب تک ناپسندیدہ باتوں پر صبر نہ کرو۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَوْکَانَ الصَّبْرُ رَجُلاً لَکَانَ کَرِیْمًا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ۔ (۱)

اگر صبر مرد ہوتا تو وہ کریم آدمی ہوتا اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس سلسلے میں احادیث بے شمار ہیں۔

آثار:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو جو خط لکھا اس میں یہ الفاظ بھی ہیں عَلَیْکَ بِالصَّبْرِ (تم پر صبر لازم ہے) اور جان لو کہ صبر کی دو قسمیں ہیں (اور) ان میں سے ایک، دوسرے سے افضل ہے مصیبتوں میں صبر کرنا اچھا ہے لیکن جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے اس سے صبر کرنا افضل ہے اور جان لو کہ صبر ایمان کی اصل ہے کیوں کہ تقویٰ سب سے افضل نیکی ہے اور تقویٰ، صبر سے حاصل ہوتا ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایمان کی عمارت چار ستونوں (یعنی) یقین، صبر، جہاد اور عدل پر قائم ہے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ایمان کے ساتھ صبر کا تعلق اسی طرح ہے جس طرح سر کا جسم سے تعلق ہے اور جس کا سر نہ ہو اس کا جسم نہیں ہوتا اسی طرح صبر کے بغیر ایمان (کامل) نہیں ہوتا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے دو گٹھڑیاں کتنی اچھی ہیں اور صبر کرنے والوں کا بوجھ کتنا اچھا ہے دو گٹھڑیوں سے مراد نماز اور رحمت ہے اور صبر کرنے والوں کے بوجھ سے مراد ہدایت ہے العلاوہ وہ بوجھ ہوتا ہے جو اونٹ کی دو گٹھڑیوں کے اوپر ہوتا ہے اس سے انہوں نے قرآن پاک کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَاُولٰٓئِکَ عَلَیْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ (۲)

اور ان لوگوں پر ان کے رب کی طرف سے رحمتیں ہیں اور وہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔

حضرت حبیب بن ابی حبیب جب یہ آیت کریمہ پڑھتے۔

اِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ۔ (۳)

بے شک ہم نے ان (حضرت ایوب علیہ السلام) کو صبر کرنے والا پایا وہ کیا ہی اچھا بندہ ہے وہ بہت رجوع کرنے والا ہے۔

---

(۱) العلل المتناہیۃ جلد ۲ ص ۸۳۴ حدیث ۱۳۵۴

(۲) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۱۵۷

(۳) قرآن مجید، سورۂ ص آیت ۴۴

(یہ آیت پڑھ کر) آپ روتے اور فرماتے ہائے تعجب ہے اسی نے عطا کیا اور تعریف بھی کی یعنی وہی صبر کی توفیق دیتا ہے اور وہی تعریف کرتا ہے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا ایمان کی کوہان (چوٹی) الحکم پر صبر کرنا اور تقدیر پر راضی رہنا ہے۔

فضیلتِ صبر کا یہ بیان نقلی دلائل سے ہے جہاں تک عقل سے سمجھنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے پہلے صبر کی حقیقت اور اس کے معنیٰ کا سمجھنا ضروری ہے کیوں کہ فضیلت اور رتبہ کی معرفت، صفت کی پہچان ہے اور وہ موصوف کی معرفت سے پہلے حاصل نہیں ہوتی لہٰذا ہم صبر کی حقیقت اور اس کا معنیٰ بیان کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔

فصل ۲

صبر کی حقیقت اور اس کا معنیٰ

جان لو! صبر، دین کے مقامات میں سے ایک مقام اور سالکین کی منازل میں سے ایک منزل ہے اور دین کے تمام مقامات تین امور پر مشتمل ہیں (۱) معارف (۲) احوال (۳) اعمال پس معارف، اصول ہیں اور ان سے احوال پیدا ہوتے ہیں اور احوال کا نتیجہ اعمال ہیں لہٰذا معارف، درختوں کی طرح، احوال ٹہنیوں کی مثل اور اعمال پھلوں کی طرح ہیں اور یہ بات سالکین الی اللہ کی تمام منازل کو شامل ہے۔

اور لفظ ایمان کبھی تو صرف معارف کے لیے بولا جاتا ہے اور بعض اوقات ان تینوں باتوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے قواعدِ عقائد کے بیان میں ایمان اور اسلام کے نام میں اختلاف کے ضمن میں ذکر کیا ہے اور اسی طرح صبر کی تکمیل، معرفتِ سابقہ اور حالتِ قائمہ کے بغیر نہیں ہوتی اور حقیقت میں صبر اسی بات کا نام ہے اور عمل پھل کی طرح ہے جو اس سے حاصل ہوتا ہے اور اس کی پہچان کے لیے فرشتوں، انسانوں اور جانوروں کے درمیان ترتیب کی کیفیت کی معرفت ضروری ہے بیشک صبر، انسان کا خاصہ ہے اور یہ بات فرشتوں اور جانوروں میں نہیں پائی جاتی۔ جانوروں میں نقصان کی وجہ سے اور فرشتوں میں ان کے کمال کی وجہ سے۔

اس کی تفصیل یوں ہے کہ جانوروں پر خواہشات مسلط کی گئی ہیں اور وہ خواہشات کے سامنے مسخر ہیں تو ان کی حرکت و سکون کا باعث صرف شہوت ہی ہے ان میں ایسی قوت نہیں ہے جو خواہشات سے متصادم ہو اور ان کو ان کے تقاضوں سے پھیر دے حتیٰ کہ شہوت کے تقاضے کے مقابلے میں اس قوت کے باقی رہنے کو صبر قرار دیا جائے اور جہاں تک فرشتوں کا تعلق ہے تو ان کو صرف بارگاہ ربوبیت کی حاضری کا شوق عطا کیا گیا ہے اور یہ کہ وہ درجۂ قرب سے خوش رہیں اور ان کو شہوت نہیں دی گئی جو ان کو اس درجہ اور شوق سے روکے حتیٰ کہ وہ ایسی قوت کے محتاج ہوں جو ایک دوسرے لشکر کے ذریعے ان رکاوٹوں کو دور کرے۔

انسان کو ابتداء میں جانور کی طرح ناقص پیدا کیا گیا اور اسے صرف غذا کی خواہش عطا کی گئی جس کا وہ محتاج ہوتا ہے پھر اس میں کھیل کود اور زیب و زینت کی خواہش ظاہر ہوتی ہے پھر اسی ترتیب سے نکاح کی خواہش ہوتی ہے اور اسے (بچے کو) صبر کی قوت بالکل حاصل نہیں ہوتی کیوں کہ صبر کا مطلب ایک لشکر کے مقابلے میں دوسرا لشکر کھڑا کرنا ہے جب ان دونوں کے درمیان لڑائی واقع ہو کیوں کہ ان دونوں کے تقاضوں اور مطالبات میں تضاد ہے۔ اور بچے میں جانوروں کی طرف صرف اور صرف خواہش ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور جود و سخا کی وسعت کے تحت انسان کو عزت بخشی ہے اور جانوروں کے مقام سے ان کے درجات کو بلند فرمایا ہے پس بلوغت کے قریب اس کی شخصیت کمال کو پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ دو فرشتے مقرر کر دیتا ہے ان میں سے ایک اسے راہنمائی مہیا کرتا ہے اور دوسرا اسے قوت فراہم کرتا ہے چنانچہ وہ ان دو فرشتوں کی مدد سے جانوروں سے ممتاز ہو جاتا ہے اور اب وہ دو صفات کے ساتھ مختص ہو جاتا ہے۔

ایک صفت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی معرفت ہے نیز انجام سے متعلق جو مصالح ہیں ان کی معرفت بھی اس میں شامل ہے۔ اور یہ تمام باتیں اس فرشتے سے حاصل ہوتی ہیں جو ہدایت اور معرفت بہم پہنچانے پر مقرر ہے تو جانوروں کو کسی قسم کی معرفت نہیں ہوتی اور نہ ہی انہیں بہتر انجام کی معرفت ہوتی ہے بلکہ ان کو صرف اسی بات کا پتہ ہوتا ہے جو بالفعل ان کی خواہشات کی تکمیل کا باعث ہو۔ اسی لیے وہ صرف لذیذ چیزیں طلب کرتے ہیں اور نفع بخش دوا جو فی الحال مضر ہو وہ اسے پہچانتے بھی نہیں اور اس کا مطالبہ بھی نہیں کرتے۔

تو انسان نورِ ہدایت کے ذریعے اس بات کو جانتا ہے کہ خواہشات کی اتباع کا انجام برا ہے لیکن اس کے لیے صرف یہ ہدایت کافی نہیں جب تک اسے مضر اشیاء کو چھوڑنے کی طاقت حاصل نہ ہو۔ کتنی ہی نقصان دہ باتیں ہیں جن کا انسان کو علم ہے مثلاً اسے پہنچنے والی بیماری کا اسے علم ہوتا ہے لیکن وہ اسے دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا لہٰذا وہ ایسی قدرت اور قوت کا محتاج ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ خواہشات کے سینے پر دھکا دے اور اس قوت کے ذریعے اس سے لڑے حتیٰ کہ ان کی دشمنی کو اپنے نفس سے علیحدہ کرے تو اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرا فرشتہ مقرر کیا ہے جو اسے سیدھی راہ پر رکھتا اور اس کی مدد کرتا ہے نیز اسے ایسے لشکروں کے ذریعے طاقت فراہم کرتا ہے جن کو تم نہیں دیکھتے۔ اور اس لشکر کو خواہش سے لڑنے سے حکم دیتا ہے۔ تو بعض اوقات یہ لشکر کمزور ہو جاتا ہے اور بعض اوقات مضبوط ہوتا ہے اور یہ بات اللہ تعالیٰ کی تائید سے حاصل ہونے والی بندے کی امداد کے اعتبار سے ہوتی ہے جیسا کہ نورِ ہدایت مخلوق میں بہت زیادہ مختلف ہوتا ہے تو ہم اس صفت کو جس کے ذریعے انسان خواہشات کے قلع قمع اور ان پر غالب ہونے کے اعتبار سے جانوروں سے ممتاز ہوتا ہے، باعثِ دینی کہتے ہیں۔ اور خواہشات کے مطالبہ کو ان کے مقتضیات کے ساتھ باعث ہوائی (خواہش کا باعث) قرار دیتے ہیں۔

تو یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ دینی باعث اور باعثِ ہوئی میں جنگ جاری ہے اور اس جنگ میں کبھی ایک فاتح ہوتا ہے اور کبھی دوسرا، اور لڑائی کا میدان بندے کا دل ہے دینی باعث کو فرشتوں سے مدد ملتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی جماعت کی مدد کرتے ہیں اور شہوت کے باعث کو شیطانوں کی طرف سے مدد حاصل ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے مددگار ہیں۔

تو صبر، باعثِ شہوت کے مقابلے میں دینی باعث کو ثابت قدم رکھنے کا نام ہے پس اگر وہ ثابت قدم رہے حتیٰ کہ اس پر غالب آجائے اور شہوت کی مخالفت پر برقرار رہے تو اس نے اللہ تعالیٰ کی جماعت کی مدد کی، اور صبر کرنے والوں کے ساتھ مل گیا اور اگر اس کے مقابلے میں کمزور اور رسوا ہوا حتیٰ کہ اس پر شہوت غالب ہوگئی اور وہ اس کو دور کرنے پر صبر نہ کرسکا تو وہ شیطان کے پیروکاروں سے مل جاتا ہے۔

تو شہوت والے کاموں کو چھوڑنا ایسا عمل ہے جو حالتِ صبر کا نتیجہ ہے اور باعثِ دینی کا ثابت رہنا ہے جو باعثِ شہوت کے مقابلے میں ہے اور باعث دینی کا ثابت رہنا ایک ایسا حال ہے جو خواہشات کی عداوت اور اس کی ضد کو جاننے کا نتیجہ ہوتا ہے جو دنیا اور آخرت میں اسباب سعادت کی ضد ہیں اور جب اس کی معرفت کا یقین زیادہ ہوتا ہے اور ایسے ایمان کہا جاتا ہے اور وہ اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ شہوت دشمن ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے کی ڈاکو ہے تو اس سے باعثِ دینی کا ثبات مضبوط ہوجاتا ہے اور جب اس کا ثبات مضبوط ہوتا ہے تو شہوت کے تقاضے کے خلاف اعمال مکمل ہوجاتے ہیں تو شہوت کے ترک کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک دینی باعث کو جو باعثِ شہوت کی ضد ہے، قوت حاصل نہ ہو، اور معرفت و ایمان کی قوت، خواہشات کے برے انجام کو قبیح جانتی ہے۔

اور یہ دونوں فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے مسخر کرنے سے ان دونوں لشکروں کے کفیل ہوتے ہیں اور یہ دونوں کرام کاتبین فرشتوں میں سے ہیں اور وہ دونوں فرشتے ہر آدمی کے ساتھ مقرر ہیں۔

اور جب تمہیں معلوم ہوگیا کہ ہادی فرشتے کا درجہ، قوت دینے والے فرشتے سے اعلیٰ ہے تو تم پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ داہنی جانب جو افضل ہے مناسب ہے کہ وہ اسے سونپ دی جائے لہٰذا وہی ہادی فرشتہ دائیں جانب والا ہے اور دوسرا بائیں طرف والا ہے اور بندے کے لیے غفلت و فکر اور مجاہدے اور اس کے علاوہ کے حوالے سے دو طریقے ہیں اور وہ غفلت کی وجہ سے دائیں طرف والے سے اعراض کرنے والا اور اس سے برا سلوک کرنے والا ہوتا ہے لہٰذا اس پر گناہ لکھ دیا جاتا ہے اور مجاہدہ کے ذریعے وہ اس کے لشکر سے مدد حاصل کرتا ہے تو اس کے ذریعے اس کے لیے نیکی ثابت ہوتی ہے اور یہ نیکیاں اور برائیاں ان دونوں کے ثابت رکھنے سے ہوتی ہیں اسی لیے ان دونوں فرشتوں کو کراماً کاتبین کہا گیا ہے کرام اس لیے کہتے ہیں کہ بندہ ان کے کرم سے نفع حاصل کرتا ہے کیونکہ تمام فرشتے کرم والے اور نیکوکار ہیں اور کاتب اس لیے کہلاتے ہیں کہ وہ نیکیوں اور برائیوں کو درج کرتے ہیں اور وہ ان کو صحیفوں میں لکھتے ہیں جو دل کے سر (راز) میں لپٹے ہوتے ہیں اور سرِ قلب سے مخفی ہوتے ہیں حتیٰ کہ اس عالم میں ان پر اطلاع نہیں ہوتی کیوں کہ وہ دونوں فرشتے ان کا لکھنا،

ان کا خط، ان کے صحیفے اور جو کچھ ان دونوں سے متعلق ہوتا ہے اس کا تعلق عالم غیب اور ملکوت سے ہے ظاہری عالم سے نہیں ہے اور جن باتوں کا تعلق عالم ملکوت سے ہے آنکھیں اس عالم میں ان کا ادراک نہیں کر سکتیں پھر یہ صحیفے جو پلٹے ہیں دو مرتبہ کھلیں گے ایک مرتبہ قیامتِ صغریٰ میں اور دوسری مرتبہ قیامتِ کبریٰ میں اور قیامت صغریٰ سے موت کی حالت مراد ہے کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ۔ (۱) جو شخص فوت ہو گیا تو تحقیق اس کی قیامت قائم ہو گئی۔

اور اس قیامت میں بندہ اکیلا ہوتا ہے اور اس وقت کہا جاتا ہے۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ۔ (۲) اور بے شک تم ہمارے پاس اکیلے اکیلے آئے جیسا کہ ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ (اکیلا اکیلا) پیدا کیا۔

اور اسی کے بارے میں فرمایا گیا۔

كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ حَسِيبًا۔ (۳) آج تمہارا نفس حساب کرنے کے لیے کافی ہے۔

جب کہ قیامتِ کبریٰ جس میں تمام مخلوق جمع ہو گی اس وقت آدمی تنہا نہیں ہو گا بلکہ بعض صورتوں میں لوگوں کی ایک جماعت کے سامنے محاسبہ ہو گا اور اس میں متقی لوگوں کو جنت کی طرف اور مجرموں کو جہنم کی طرف جماعتوں کی صورت میں لے جایا جائے گا اکیلے اکیلے نہیں پہلا ہولناک منظر، قیامتِ صغریٰ کا ہے اور قیامتِ کبریٰ کے تمام ہولناک مناظر کی نظر قیامت صغریٰ میں موجود ہے مثلاً زمین میں زلزلے کا برپا ہونا کیوں کہ کسی کی موت کے وقت خاص وہ مقام زلزلے کی زد میں ہوتا ہے جب کسی شہر میں زلزلہ آتا ہے تو یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ ان کی زمین میں زلزلہ آیا اگرچہ اس کے ارد گرد دوسرے شہروں میں زلزلہ نہ آئے۔

بلکہ انسان کا مسکن حرکت کرے تو اس کے حق میں یہ زلزلہ ہی کہلاتا ہے کیوں کہ اسے تمام زمین کی حرکت کی وجہ سے اسی وقت نقصان ہوتا ہے جب خود اس کا اپنا مکان حرکت کرے دوسرے آدمی کے مکان کی حرکت سے نہیں۔

تو اسے اپنے حصے کا زلزلہ کسی نقصان کے بغیر حاصل ہوا اور جاننا چاہیے کہ مٹی سے پیدا ہونے والی مخلوق میں سے تم سب سے زیادہ پسندیدہ مخلوق ہو۔ اور مٹی سے تمہارا خصوصی حصہ صرف تمہارا بدن ہے۔ دوسروں کا بدن تمہارا حصہ نہیں ہے اور زمین کے جس حصے پر تم بیٹھے ہوئے ہو وہ تمہارے بدن کے لیے ظرف اور مکان ہے اور تم اس کے زلزلے سے اس لیے

---

(۱) الفردوس بماثور الخطاب جلد اول ص ۲۸۵ حدیث ۱۱۱۷

(۲) قرآن مجید، سورۃ انعام آیت ۹۴

(۳) قرآن مجید، سورۃ اسراء آیت ۱۴

خوف زدہ ہو کر اس کے باعث تمہارا بدن حرکت کرنے لگے۔ ورنہ ہوا ہر وقت زلزلے میں رہتی ہے لیکن اس سے تمہیں ڈر نہیں لگتا کیونکہ اس کی وجہ سے تمہارے جسم میں حرکت نہیں آتی تو تمام زمین کے زلزلے سے تمہارا حصہ صرف تمہارے بدن کا زلزلہ ہے اور وہ زمین اور مٹی کا وہ حصہ ہے جو خاص تمہارے ساتھ متعلق ہے۔ تمہاری ہڈیاں تمہاری زمین کے پہاڑ ہیں، تمہارا سر تمہاری زمین کا آسمان ہے تمہارا دل تمہاری زمین کا سورج ہے، تمہارے کان اور آنکھیں اور باقی تمام خواص تمہارے آسمان کے ستارے ہیں تمہارے بدن سے پسینے کا بہنا تمہاری زمین کا دریا ہے تمہارے بال تمہاری زمین کی سبزی ہے اور باقی اعضا اس زمین کے درخت ہیں اسی طرح تمام اعضا کا معاملہ ہے اور جب موت کی وجہ سے تمہارے بدن کے ارکان ختم ہو جائیں گے تو زمین میں زلزلہ بپا ہو گا اور جب ہڈیوں سے گوشت الگ ہو جائے گا تو زمین اور پہاڑ اٹھا لیے جائیں گے تو ایک چوٹ سے وہ گر کر برابر برابر ہو جائیں گے اور جب ہڈیاں گل جائیں گی تو پہاڑ اڑائے جائیں گے اور جب موت کے وقت دل پر تاریکی چھا جائے گی تو سورج لپیٹا جائے گا اور جب تیرے کان، آنکھ اور تمام حواس بیکار ہو جائیں گے تو گویا ستارے ٹوٹ جائیں گے اور جب تمہارا دماغ پھٹ جائے گا تو گویا آسمان پوری طرح پھٹ گیا اور جب موت کے خوف سے تیری پیشانی پر پسینہ آئے گا تو گویا دریا پوری طرح جاری ہو گئے اور جب تمہاری ایک پنڈلی دوسری پنڈلی پر لپٹے گی اور وہ دونوں تمہاری سواریاں ہیں تو گویا سواری معطل ہو گئی اور جب روح و جسم کی جدائی ہو گی تو گویا زمین کو پھیلا دیا گیا حتیٰ کہ جو کچھ اس میں تھا اس نے اسے باہر ڈال کر خالی ہو گئی۔

میں احوال و اہوال کے تمام موازنہ کا ذکر لمبا کرنا نہیں چاہتا لیکن یہ بات کہتا ہوں کہ محض موت سے تم پر قیامت صغریٰ قائم ہو جائے گی اور قیامت کبریٰ میں سے جو کچھ تمہارے ساتھ خاص ہے وہ بھی تجھ سے نہیں چھوٹے گا۔ بلکہ جو کچھ دوسروں کے ساتھ خاص ہے وہ تجھے نہیں ملے گا۔

مثلاً دوسروں کے حق میں ستاروں کا باقی رہنا مردے کو کیا فائدہ دیتا ہے جب کہ مرنے والے کے وہ حواس جن کے ذریعے ستاروں کو دیکھنے کا فائدہ حاصل کرتا ہے وہ بجھ گئے جیسے نابینا آدمی کے لیے دن اور رات نیز سورج کا چمکنا اور گرہن برابر ہیں کیوں کہ اس کے حق میں ایک ہی بار سورج کو گہن لگ گیا اور اس کا اسی قدر حصہ ہے اور جس آدمی کا سر پھٹ جائے اس کا آسمان پھٹ گیا کیوں کہ آسمان اس چیز کا نام ہے جو سر کی طرف ہے تو جس کا سر نہیں اس کا آسمان بھی نہیں تو دوسروں کے لیے آسمان کا باقی رہنا اسے کیا فائدہ دے گا۔

تو یہی قیامتِ صغریٰ ہے خوف اور دہشت تو اس کے بعد ہے اور یہ اس وقت ہو گا جب بڑی مصیبت آئے گی اور کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا زمین و آسمان تباہ ہو جائیں گے پہاڑ ختم ہو جائیں گے اور خوف و پریشانی اپنے کمال کو پہنچ جائے گی۔

جان لو کہ یہ قیامت صغریٰ ہے اگرچہ ہم نے اس کے اوصاف میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن ہم نے اس کے اوصاف

کا عشر عشیر بھی ذکر نہیں کیا۔ اور قیامت کبریٰ کی نسبت سے یہ اسی طرح ہے جیسے ولادتِ صغریٰ کو ولادت کبریٰ سے نسبت ہوتی ہے۔ کیوں کہ انسان کی دو پیدائشیں ہیں ایک وہ ہے جب وہ باپ کی پیٹھ سے ماں کے پیٹ میں آتا ہے اور وہ رحم میں ایک مقررہ مدت تک ایک ٹھکانے میں رہتا ہے اور اسے کمال تک پہنچنے کے لیے کئی مراحل طے کرنے پڑتے ہیں پہلے نطفہ (مادہ منویہ) ہوتا ہے پھر جما ہوا خون اور پھر لوتھڑا وغیرہ بنتا ہے یہاں تک کہ وہ رحم کے تنگ مقام سے وسعتِ عالم میں نکلا ہے تو قیامت کبریٰ کے عموم کی نسبت قیامتِ صغریٰ کے خصوص سے اسی طرح ہے جس طرح فضائے عالم کی وسعت کو فضائے رحم سے نسبت ہوتی ہے اور بندہ موت کے ذریعے جس عالم کی طرف جاتا ہے اس کی وسعت فضائے دنیا کی وسعت کی نسبت سے اسی طرح ہے جیسے فضائے دنیا، فضائے رحم کے مقابلے میں ہے۔ بلکہ یہ اس سے زیادہ وسیع اور بڑی ہے تو آخرت کو پہلی پر قیاس کرو۔ تمہارا پیدا کرنا اور اٹھانا ایک نفس کی طرح ہے اور دوسری بار پیدا کرنا پہلی پیدائش پر قیاس کی طرح ہے بلکہ پیدائشوں کا شمار دو میں محصور نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (۱) اور ہم تمہاری وہ صورتیں بنا دیں گے جن کی تمہیں خبر نہیں۔

تو وہی شخص دونوں قیامتوں کا اقرار کرتا ہے جو غیب و شہادت پر ایمان رکھتا ہے اور اسے ملک و ملکوت (ظاہری اور باطنی بادشاہی) پر یقین ہے اور جو شخص قیامت صغریٰ کو دیکھتا ہے، کبریٰ کو نہیں وہ دو جہانوں میں سے ایک کو بھینگی آنکھ سے دیکھتا ہے یہ جہالت اور گمراہی ہے نیز کانے دجال کی پیروی ہے تو اے مسکین! تو کتنا بڑا غافل ہے اور ہم سب اس میں برابر ہیں اور تمہارے سامنے یہ خوفناک منظر ہے اگر تم جہالت اور گمراہی کی وجہ سے قیامت پر ایمان نہیں رکھتے تو کیا قیامت صغریٰ کی دلالت تمہارے لیے کافی نہیں کیا تو نے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نہیں سنا۔

وَكَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا۔ (۲) اور موت، بطور واعظ کافی ہے۔

اور کیا تم نے وصال کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سختی کے بارے میں نہیں سنا تھی کہ آپ نے دعا مانگی۔

اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلٰى مُحَمَّدٍ سَكَرَاتِ الْمَوْتِ۔ (۳) یا اللہ! حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر موت کی سختیوں کو آسان کر دے۔

کیا تمہیں شرم نہیں آتی کہ موت کے آنے میں تاخیر سمجھ کر غافل بیوقوف لوگوں کی پیروی کرتے ہو جو ایک چیخ کی انتظار کرتے ہیں

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ واقعہ آیت ۶۱

(۲) شعب الایمان جلد ۷ ص ۳۵۳ حدیث ۱۰۵۵۶

(۳) سنن ابن ماجہ ص ۱۱۸، ابواب الجنائز

جوان کو پکڑے اس حال میں کہ وہ آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے اس وقت وہ نہ تو وصیت کر سکیں گے اور نہ ہی اپنے گھر والوں کی طرف لوٹیں گے ان کے پاس بیماری موت سے ڈرانے کے لیے آتی ہے لیکن وہ نہیں ڈرتے۔ اور ان کے پاس بڑھاپا موت کا پیغام لے کر آتا ہے لیکن وہ عبرت نہیں پکڑتے تو بندوں پر افسوس ہے ان کے پاس جو بھی رسول آتا ہے اسے جھٹلاتے ہیں کیا ان کا خیال ہے کہ وہ دنیا میں ہمیشہ رہیں گے کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی بستیوں کو ہلاک کیا اور وہ ان کی طرف نہیں لوٹیں گے یا ان کا خیال ہے کہ مردے ان کے پاس سے سفر کر گئے اور وہ معدوم ہیں؟ ہرگز نہیں۔

بلکہ سب کو ہمارے ہاں حاضر ہونا پڑے گا لیکن ان کے پاس ان کے رب کی آیات میں سے جو بھی آیت آتی ہے اس سے وہ منہ پھیر لیتے ہیں یہ اس لیے ہے کہ ہم نے ان کے آگے بھی رکاوٹ کھڑی کر دی اور ان کے پیچھے بھی، پس ہم نے ان کو ڈھانپ لیا تو وہ دیکھتے ہیں اور ان پر برابر ہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لاتے۔

اب ہم اصل غرض کی طرف آتے ہیں یہ تقریر ایسے امور کی طرف اشارہ کرتی ہے جو علوم معاملہ سے اعلیٰ ہیں تو ہم کہتے ہیں یہ بات ظاہر ہو گئی کہ باعثِ شہوت کے مقابلے میں دینی باعث کے ثابت و قائم رہنے کا نام صبر ہے اور یہ مقابلہ انسانوں کا خاصہ ہے کیوں کہ ان پر کراماً کاتبین مقرر ہیں اور وہ بچوں اور پاگلوں کے اعمال میں سے کچھ بھی نہیں لکھتے، کیوں کہ جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ اگر ان سے استفادہ کی طرف توجہ کی جائے تو نیکی اور اگر ان سے اعراض کیا جائے تو برائی لکھتے ہیں جب کہ بچوں اور پاگلوں کا استفادہ کی طرف کوئی راہ نہیں ہوتا پس ان سے توجہ اور اعراض کا تصور نہیں ہوتا۔ جب کہ فرشتے ان لوگوں کی توجہ اور اعراض کو نقل کرتے ہیں جو ان باتوں پر قادر ہوتے ہیں۔

ہاں بعض اوقات نورِ ہدایت کی چمک کا آغاز سن تمیز سے ہو جاتا ہے اور وہ بلوغت کی عمر تک بتدریج بڑھتا ہے جس طرح صبح کی روشنی ظاہر ہوتی ہے یہاں تک کہ سورج کی ٹکیہ طلوع ہو جاتی ہے لیکن یہ ہدایتِ قاصرہ ہے اس سے رُو گردانی اُخروی نقصان نہیں پہنچاتی البتہ دنیوی نقصان پہنچاتا ہے یہی وجہ ہے کہ (بچے کو) نماز چھوڑنے پر فوری سزا دی جاتی ہے اور اس کے ترک پر اسے اُخروی سزا نہیں ہوتی اور اس کا وہ نامۂ اعمال نہیں لکھا جاتا جو آخرت میں کھلے گا۔ بلکہ جو شخص بچے کا کفیل عادل ہو یا نیکوکار شفیق ولی ہو اور وہ کراماً کاتبین کی طرح نیکوکار ہو تو وہ اپنے دل کے صحیفے پر بچے کی نیکیوں اور برائیوں کو لکھتا ہے اور یاد کرتا ہے پھر وہ اس کے سامنے واضح کر کے اس کی سزا دیتا ہے تو جس ولی نے بچے کے بارے میں یہ طریقہ اختیار کیا وہ فرشتوں کے اخلاق کا وارث ہے اور اسے بچے کے حق میں استعمال کرتا ہے اور یوں اسے رب العالمین کی طرف سے ایک درجہ حاصل ہوتا ہے جیسا کہ فرشتوں کو یہ مقام ملتا ہے پس اسے انبیاء کرام مقربین اور صدیقین کی معیت حاصل ہوتی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد گرامی میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے آپ نے فرمایا۔

اَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيْمِ كَهَاتَيْنِ فِي ۔۔۔ میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح

الْجَنَّۃِ۔ (۱) ہوں گے۔

آپ نے یہ بات اپنی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمائی۔

فصل ۳۲:

صبر نصف ایمان ہے

جان لو! بعض اوقات ایمان کا اطلاق اصول دین پر ہوتا ہے اور کبھی یہ اعمال صالحہ کے ساتھ خاص ہوتا ہے جو حالتِ ایمان میں سرزد ہوتے ہیں اور بعض اوقات اس کا اطلاق ان دونوں پر ہوتا ہے تو معارف کی بھی بہت سی اقسام ہیں اور اعمال کے بھی کئی دروازے ہیں اور چونکہ لفظ ایمان ان دونوں کو شامل ہوتا ہے اس لیے ایمان کے شعبے ستر سے زائد ہیں ہم نے ان اطلاقات کا اختلاف قواعدِ عقائد کے بیان میں ذکر کیا ہے لیکن صبر دونوں اعتبار اور دونوں اطلاق سے نصفِ ایمان ہے۔

ایک یہ کہ تصدیقات اور اعمال دونوں پر اس کا اطلاق ہو پس اس طرح ایمان کے دو رکن ہوں گے ایک یقین اور دوسرا صبر، اور یقین سے مراد وہ معارف قطعیہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو اصول دین کی طرف راہنمائی سے حاصل ہوتے ہیں ـــ اور صبر سے مراد یقین کے مطابق عمل ہے۔

کیوں کہ یقین اسے اس بات کی پہچان کراتا ہے کہ گناہ نقصان دِہ ہے اور عبادت نفع بخش ہے اور گناہ کا ترک اور عبادت پر مواضبط (ہمیشگی) صبر کے بغیر ناممکن ہے اور وہ خواہش اور سستی کے باعث پر دین کے باعث کو غالب کرنا ہے تو اس اعتبار سے صبر، نصفِ ایمان ہے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو جمع فرمایا۔

مِنْ اَقَلِّ مَآ اُوْتِيْتُمُ الْيَقِيْنُ وَعَزِيْمَةُ الصَّبْرِ۔ تمہیں کم از کم جو چیز دی گئی ہے وہ یقین اور قصدِ صبر ہے۔

یہ ایک طویل حدیث کا کچھ حصہ ہے۔

دوسرا اعتبار: ان احوال کو ایمان کہا جائے جو اعمال کا نتیجہ ہیں، معارف پر اس کا اطلاق نہ ہو اس صورت میں بندے کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے اسے دنیوی اور اُخروی نفع یا دنیوی اور اُخروی نقصان میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اب نقصان دِہ امور کی نسبت سے حالتِ صبر اور نفع بخش امور کی طرف نسبت سے شکر کی حالت پیدا ہوتی ہے تو اس اعتبار سے شکر، ایمان کا ایک نصف ہے جس طرح پہلے اعتبار سے یقین نصفِ ایمان ہے اسی لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۹، کتاب الطلاق

ایمان کے دو حصے ہیں نصف ایمان صبر ہے اور نصف شکر، یہ حدیث مرفوعاً بھی بیان کی گئی ہے (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کو حدیث مرفوع کہتے ہیں) جب صبر کا مطلب یہ ہے کہ دینی باعث کو ثابت رکھتے ہوئے خواہش کے باعث سے صبر کیا جائے اور خواہش کا باعث دو باتیں ہیں یا تو یہ خواہش کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے یا غضب کی وجہ سے، خواہش لذیذ چیز کی طلب یا تکلیف دہ بات سے بھاگنا، اور روزہ محض شہوت کے تقاضے سے صبر کرنا ہے اور یہ پیٹ اور شرمگاہ کی شہوت ہے، اس میں غضب کا تقاضا نہیں ہوتا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " روزہ نصف صبر ہے" کیوں کہ کامل صبر، شہوت کو دعوت دینے والے امور اور غضب کے داعی امور دونوں سے بچنے کا نام ہے تو اس اعتبار سے روزہ ایمان کا چوتھا حصہ بن جاتا ہے۔

اسی طرح تقدیراتِ شرعیہ کو اعمال واحوال کی حدود کے ساتھ اور ایمان کی طرف نسبت سے سمجھنا چاہیئے اور اس میں اصل یہ ہے کہ ایمان کے بے شمار ابواب کو پہچانا جائے کیوں کہ ایمان کا اطلاق مختلف طریقوں پر ہوتا ہے۔

فصل ۴:

جن امور سے صبر کیا جاتا ہے ان کی نسبت سے صبر کے مختلف نام

جاننا چاہیے کہ صبر کی دو قسمیں ہیں ایک قسم بدنی صبر ہے جیسے بدنی مشقتیں برداشت کرنا اور ان پر ثابت قدم رہنا وہ یا تو فعل کے ذریعے ہوتا ہے جیسے سخت اعمال برداشت کرنا یا عبادات وغیرہ سے ہوتا ہے۔

یا اس کا تعلق برداشت سے ہوتا ہے مثلاً سخت مار بہت بڑی بیماری اور تکلیف دہ زخموں کو برداشت کرنا یہ صبر بعض اوقات قابلِ تعریف ہوتا ہے جب شریعت کے موافق ہو لیکن مکمل طور پر تعریف کے قابل دوسری قسم ہے اور طبعی خواہشات اور خواہش کے تقاضوں سے نفس کا صبر کرنا ہے اب اگر اس قسم میں پیٹ اور شرمگاہ کی خواہش سے صبر ہو تو اسے عفت کہتے ہیں۔

اور اگر بری بات سے ہو تو چوں کہ وہ مکروہ امور جن پر صبر غالب آتا ہے لوگوں کے نزدیک مختلف ہیں اس لیے ان کے نام بھی مختلف ہیں اگر وہ مصیبت میں ہو تو اسے صبر ہی کہا جاتا ہے اور اس کے خلاف حالت کو جزع فزع کہتے ہیں یعنی خواہش کے تقاضوں کو کھلی چھٹی دی جائے کہ وہ خوب آواز بلند کرے، رُخسار پیٹے اور گریبان پھاڑے نیز اس قسم کی دوسری حرکات کرے اور اگر مالداری کی برداشت میں صبر کرے تو اسے ضبطِ نفس کہتے ہیں اور اس کے خلاف حالت کو بطر (اکڑ) کہتے ہیں اگر یہ لڑائی اور جنگ میں ہو تو اسے بہادری کہا جاتا ہے جس کا مقابل نامردی اور بزدلی ہے اگر غصہ پی جانے کے سلسلے میں صبر ہو تو اسے بُردباری کہتے ہیں اور اس کے مقابلے میں غضبناکی ہے، اور اگر زمانے کی کسی آفت پر صبر ہو تو اسے دل کی کشادگی کہتے ہیں اور اس کی ضد کم حوصلگی دل کی تنگی اور رنج ہوتا ہے اگر کلام کو چھپانے کے سلسلے

ہیں صبر ہو تو اسے کتمان سر کہا جاتا ہے اور ایسے شخص کو کتوم (چھپانے والا) کہا جاتا ہے اگر ضروریات زندگی سے زائد سے صبر کیا جائے تو اسے زہد کہتے ہیں اور اس کے مقابلے میں حرص ہے اگر تھوڑے حصے پر صبر کیا جائے تو اسے قناعت کہتے ہیں اور اس کے مقابلے میں حرص ہے تو ایمان کے اکثر اخلاق صبر میں داخل ہیں اسی لیے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا وہ صبر ہے کیوں کہ یہی تمام اعمال سے زیادہ اور معزز ہے جیسے آپ نے فرمایا "حج عرفات (کا قیام) ہے" (یعنی تمام اعمال حج میں سے اہم ہے) (۱)

اور اللہ تعالیٰ نے اس کی اقسام کو جمع کر کے ان کا نام صبر رکھا ارشاد خداوندی ہے۔

وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔

اور وہ لوگ جو سختی فقر اور لڑائی کے وقت صبر کرتے ہیں وہی لوگ سچے ہیں اور وہی لوگ متقی ہیں۔ (۲)

(تو مصیبت، فقر اور جہاد سب صورتوں میں صبر کا ذکر کیا)

تو یہ صبر کی اقسام ہیں جو اپنے متعلقات کے اعتبار سے مختلف ہیں اور جو شخص الفاظ کے معانی پر نظر کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ احوال اپنی ذاتوں اور حقائق کے اعتبار سے مختلف ہیں کیوں کہ الفاظ مختلف ہیں اور جو آدمی صراط مستقیم پر چلتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے وہ پہلے معانی کو دیکھتا ہے اور ان کے حقائق پر مطلع ہوتا ہے پھر ان الفاظ (ناموں) کو دیکھتا ہے کیوں کہ وہ معانی پر دلالت کے لیے وضع کئے گئے ہیں تو معانی اصل ہیں اور الفاظ ان کے تابع ہیں۔ اور جو شخص توابع سے اصول تلاش کرتا ہے وہ یقیناً پھسل جاتا ہے اور قرآن مجید میں ان دونوں فریقوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا۔

اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (۳)

تو کیا وہ شخص ہے جو اپنے چہرے کے بل جھکا ہوا ہے وہ زیادہ ہدایت پر ہے یا وہ جو سیدھے راستے پر سیدھا چلتا ہے۔

اور کفار سے جو غلطی ہوئی وہ اسی تبدیلی کی وجہ سے ہوئی ہے ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے کرم و لطف کے ساتھ حسن توفیق کا سوال کرتے ہیں۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۲۲۳، ابواب المناسک

(۲) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۱۷۷

(۳) قرآن مجید، سورۂ ملک آیت ۲۲

فصل ۵:

قوت وضعف میں اختلاف کے اعتبار سے صبر کی اقسام

جان لو! خواہش کے باعث کی طرف نسبت کے حوالے سے دینی باعث کے تین احوال ہیں۔

ایک یہ کہ وہ خواہش کے داعی کو مغلوب کر دے اور اس کے لئے جھگڑے کی قوت باقی نہ رہے اور یہ بات دائمی صبر سے حاصل ہوتی ہے اسی موقعہ کے لیے کہا جاتا ہے کہ جس نے صبر کیا اس نے کامیابی حاصل کی۔ اس مرتبہ تک پہنچنے والے لوگ بہت کم ہیں اور وہ لازماً صدیقین مقربین ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے پھر اس پر ثابت قدم رہے ان لوگوں نے صراط مستقیم کو اختیار کیا اور اسی پر قائم رہے اور ان کے نفس باعث دینی کے تقاضے کے مطابق مطمئن ہوئے اور ایسے ہی لوگوں کو ندا دینے والا آواز دیتا ہے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ (۱)

اے نفسِ مطمئنہ! اپنے رب کی طرف اس طرح لوٹ جا کہ تو اُس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔

دوسری حالت یہ ہے کہ خواہش کی طرف بلانے والے امور غالب آجائیں اور باعث دینیہ کا جھگڑا بالکل ختم ہو جائے اور انسان اپنے نفس کو مکمل طور پر شیطان کے حوالے کر دے اور مجاہدے سے مایوس ہو کر جہاد بالنفس ترک کر دے یہ لوگ غافل ہیں اور بہت زیادہ ہیں یہی لوگ خواہشات کے غلام ہیں اور ان پر ان کی بدبختی غالب آگئی ہے اب ان کے دل جو اسرار خداوندی میں ایک سر اور امور الٰہیہ میں سے ایک امر ہیں دشمنان خداوندی کے سامنے مغلوب ہو گئے۔ اسی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ (۲)

اور ہم چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت عطا کر دیتے لیکن میری طرف سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ میں جہنم کو جنوں اور انسانوں سب سے بھر دوں گا۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیوی زندگی کو خرید لیا تو انہیں سودے میں نقصان ہوا اور جو لوگ ان کو ہدایت دینا چاہتے ہیں ان سے فرمایا گیا۔

فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا

اور ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے جو ہمارے ذکر سے منہ

---

(۱)

(۲) قرآن مجید، سورۂ سجدہ آیت ۱۳

وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ - (۱)

پھیرتے ہیں اور وہ صرف دنیا کا ارادہ کرتے ہیں یہ ان کا مبلغ علمی ہے۔

اس حالت کی علاوت مایوسی اور آرزوؤں کے ساتھ مغرور ہونا ہے اور یہ انتہائی درجہ کی بیوقوفی ہے۔

جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْاَحْمَقُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ۔ (۲)

دانا وہ ہے جو اپنے نفس کو دبا دے اور موت کے بعد کے لیے عمل کرے اور وہ شخص بیوقوف ہے جو اپنے نفس کو اس کی خواہش کے پیچھے لے جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر تمنا کرتا ہے۔

جو شخص اس حالت میں ہوتا ہے جب اسے وعظ کیا جائے تو کہتا ہے میں توبہ کا شوق رکھتا ہوں لیکن مجھ سے ہو نہیں سکتا اس لیے میں اس کی طمع بھی نہیں کرتا یا وہ توبہ کا اشتیاق نہیں رکھتا تو کہتا ہے اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے لہذا مجھے توبہ کی کوئی ضرورت نہیں اس بیچارے کی عقل خواہش کی غلام بن گئی لہذا وہ اپنی عقل کو صرف اس لیے استعمال کرتا ہے کہ اس کے ذریعے دقیق حیلے تلاش کرے جو تقاضائے شہوت تک پہنچا سکتے ہوں تو اس کی عقل اس کی خواہشات کے قبضے میں چلی گئی جیسے کوئی مسلمان کفار کے ہاتھوں میں قید ہو جائے اور وہ اس سے خنزیر چرائیں اور شرابوں کی حفاظت اور ان کو اٹھانے کا کام لیں۔ ایسے شخص کا حال اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص کسی مسلمان کو مغلوب کر کے اسے کفار کے سپرد کر دے اور ان کو ان کے ہاں قیدی بنا دے۔ کیوں کہ اس کا بڑا جرم یہی ہے کہ جس شخص کو مسخر نہیں ہونا چاہیے تھا اسے اس نے مسخر کر دیا اور جس کو مغلوب نہیں ہونا چاہیے تھا اسے مغلوب کر دیا۔

مسلمان کا حق تو یہ ہے کہ وہ مسلط ہو کیوں کہ وہ معرفت خداوندی اور باعث دینی کا حامل ہے اور کافر پر تسلط ہونا چاہیے کیوں کہ وہ دین سے جاہل ہے اور اس میں شیاطین کا باعث پایا جاتا ہے اور مسلمان کا اپنے نفس پر حق دوسرے دل کے اس پر حق سے زیادہ واجب ہے۔

تو جب شریف معنیٰ جو اللہ تعالیٰ کی جماعت اور فرشتوں کے لشکر میں سے ہے اس خسیس معنیٰ کے سامنے مسخر ہو جائے جو شیطانوں کی جماعت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والے ہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مسلمان کسی کافر کا غلام بن جائے بلکہ وہ اس آدمی کی طرح ہے جو کسی انعام عطا کرنے والے محسن بادشاہ پر چڑھائی کرکے اس کے سب سے عزیز

(۱) قرآن مجید، سورۃ النجم آیت ۲۹

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۲۴ روایات شداد بن اوس

بیٹے کو اس کے سبب سے ناپسندیدہ دشمن کے حوالے کردے۔

تو دیکھو کس طرح وہ کفرانِ نعمت کر رہا ہے اور وہ کتنے بڑے انتقام کا مستحق ہے۔ کیوں کہ خواہش ان میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ معبود ہے جن کی زمین میں پوجا کی جاتی ہے، اور عقل زمین پر سب سے زیادہ معزز مخلوق ہے۔

تیسری حالت یہ ہے کہ دونوں لشکروں کے درمیان جنگ جاری رہے کبھی ایک غالب آئے اور کبھی دوسری، اس قسم کا آدمی مجاہدین میں سے ہی شمار ہوتا ہے کامیاب لوگوں میں شمار نہیں ہوتا۔ اور اس حالت کے اہل لوگ وہ ہیں جنہوں نے اچھے اور برے اعمال کو ملا دیا امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے اور یہ قوت وضعف کے اعتبار سے ہے۔ اور جن باتوں سے صبر کیا جاتا ہے ان کے حوالے سے تین حالتیں اور بھی ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ تمام شہوات پر غالب آجائے یا بعض پر غالب آئے اور بعض پر غالب نہ آئے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کا نزول تیسری حالت والوں کے حق میں زیادہ مناسب ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا۔ (۱)

انہوں نے اچھے اور برے اعمال کو خلط ملط کر دیا۔

اور وہ لوگ جو شہوات کے باوجود مجاہدے کو مطلقاً چھوڑ دیتے ہیں وہ جانوروں کے مشابہ ہیں بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے ہیں کیوں کہ جانوروں میں معرفت اور وہ قدرت پیدا نہیں کی گئی جس کے ذریعے شہوتوں کے تقاضوں سے جہاد کیا جاتا ہے جب کہ انسان کے لیے یہ قوت پیدا کی گئی ہے لیکن اس نے اسے معطل کر رکھا ہے لہٰذا ایسا شخص یقیناً ناقص اور پیٹھ پھیرنے والا ہے اسی لیے کہا گیا ہے۔

وَلَمْ اَرَ فِیْ عُیُوْبِ النَّاسِ عَیْبًا کَنَقْصِ الْقَادِرِیْنَ عَلَی التَّمَامِ۔ (۲)

اور میں لوگوں کے عیوب میں ایسا عیب نہیں دیکھتا جو پورا کرنے کی قدرت رکھنے والوں نے ناقص چھوڑا ہو۔

آسانی اور تنگی کے اعتبار سے بھی صبر کی تقسیم ہوتی ہے ایک یہ کہ نفس پر شاق گزرے اور اس پر دوام ممکن نہ ہو جب تک سخت مشقت برداشت نہ کی جائے اور اسے تصبر (بزور صبر کرنا) کہتے ہیں اور دوسری قسم یہ ہے کہ اس میں سخت تھکاوٹ نہ ہو بلکہ تھوڑی سی محنت سے حاصل ہو جائے اسے صبر ہی کہتے ہیں اور جب تقویٰ دائمی ہو اور انجام کی بہتری کا یقین قوی ہو تو صبر کرنا آسان ہوتا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی۔ (۲)

پس جس نے دیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور اچھے کاموں کو اختیار کیا تو ہم اسے آسانی مہیا کریں گے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ توبہ آیت ۱۰۲ (۲) قرآن مجید، سورۃ اللیل آیت ۵

اس قسم کی مثال ایسے ہے جیسے پہلوان کو دوسرے آدمی پر طاقت ہوتی ہے کیوں کہ طاقت ور آدمی، ضعیف شخص کو ایک ادنیٰ حملے اور آسانی کے ساتھ پچھاڑنے پر قادر ہوتا ہے اسے پچھاڑتے وقت نہ تو وہ تھکاوٹ محسوس کرتا اور نہ ہی کمزوری بلکہ اس کا سانس بھی نہیں پھولتا۔ جب کہ سخت آدمی پچھاڑنے پر سخت تھکاوٹ اور مشقت کے بعد قادر ہوتا ہے اور پیشانی پر پسینہ بھی آتا ہے تو دینی باعث اور خواہش کے باعث کے درمیان اسی طرح مقابلہ ہوتا ہے اور یہ مقابلہ در حقیقت فرشتوں کے لشکر اور شیطانوں کے لشکر کے درمیان ہوتا ہے۔

اور جب شہوات بالکل ختم ہو جاتی ہیں ان کا قلع قمع ہو جاتا ہے اور دینی باعث مسلط اور غالب ہو جاتا ہے اور طویل عرصہ تک صبر کو اپنانے سے صبر کرنا آسان ہو جاتا ہے تو اس سے مقام رضا جنم لیتا ہے جیسے کتاب الرضا میں آئے گا تو صبر کے مقابلے میں رضا کا مقام بلند ہے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اُعْبُدُ اللّٰهَ عَلَى الرِّضَا فَاِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ فَفِي الصَّبْرِ عَلٰى مَا تَكْرَهُ خَيْرٌ كَثِيْرٌ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ کی عبادت حالت رضا میں کرو اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو ناپسندیدہ بات پر صبر کرنے میں بہت بھلائی ہے۔

بعض عارفین کا قول ہے کہ صبر کرنے والوں کے تین مقامات ہیں۔

(۱) شہوت کو چھوڑنا اور یہ توبہ کرنے والوں کا درجہ ہے۔

(۲) جو کچھ مقدر میں ہے اس پر راضی رہنا، اور یہ زاہدین کا درجہ ہے۔

(۳) اس سلوک کی چاہت جو اس کا مولیٰ اس سے کرتا ہے اور یہ صدیقین کا درجہ ہے۔

ہم عنقریب محبت کے بیان میں ذکر کریں گے کہ محبت کا مقام، رضا کے مقام سے اعلیٰ ہے جیسے مقام رضا، صبر کے مقام سے بلند ہے گویا یہ تقسیم خاص صبر میں جاری ہوتی ہے اور وہ مصیبتوں اور آزمائشوں پر صبر کرنا ہے۔

حکم کے اعتبار سے صبر کی اقسام

حکم کے اعتبار سے صبر کی چار قسمیں ہیں۔
فرض، نفل، مکروہ، اور حرام

ممنوع کاموں سے صبر کرنا فرض ہے ناپسندیدہ امور پر صبر کرنا نفل ہے شرعی طور پر ممنوع اذیت پر صبر کرنا ممنوع ہے جیسے کسی شخص یا اس کے بیٹے کا ہاتھ کاٹا جائے اور وہ اس پر صبر کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرے اور جیسے کوئی آدمی شہوت کے ساتھ اس کی بیوی کا قصد کرے اور اس سے اس کی غیرت جاگ اٹھے لیکن غیرت کے اظہار سے صبر کرے اور اس کی بیوی سے جو سلوک کیا جائے۔ اس پر خاموشی اختیار کرے تو یہ صبر حرام ہے اور مکروہ صبر وہ ہے جو ایسی اذیت پر ہو جو شرعی طور پر مکروہ طریقے سے پہنچے۔

---

(۱)

گویا صبر کی کسوٹی اور معیار شریعت ہے لہذا صبر کے نصف ایمان ہونے سے تمہیں یہ خیال نہیں ہونا چاہیے کہ ہر قسم کا صبر محمود ہے بلکہ اس سے صبر کی مخصوص انواع مراد ہیں۔

فصل ۶ :

صبر کی حاجت کا مقام اور بندہ کسی حال میں بھی صبر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا

اس زندگی میں بندے کو جو کچھ پہنچتا ہے وہ دو قسموں سے خالی نہیں ایک یہ کہ وہ اس کی خواہش کے مطابق ہو گا دوسرا وہ جو اس کی خواہش کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے مکروہ جانتا ہے اور وہ دونوں صورتوں میں صبر کا محتاج ہے نیز اسے ہر حال میں ان دو میں سے ایک یا دونوں سے واسطہ پڑتا ہے لہذا وہ کسی صورت میں بھی صبر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

پہلی قسم :

یعنی جو کچھ اسے حاصل ہے وہ اس کی خواہش کے مطابق ہے اور وہ صحت و سلامتی، مال، مرتبہ، خاندان کا بڑا ہونا، اسباب کی وسعت اور اتباع کرنے والوں اور مددگاروں کی کثرت اور تمام دنیوی لذات کا حصول ہے۔ اس حالت میں اسے صبر کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ اگر وہ ان لذات میں پڑ کر اپنے نفس کو مباح امور سے بھی نہیں روکے گا تو اس میں اکڑ اور سرکشی پیدا ہو گی۔ کیونکہ انسان سرکشی کرتا ہے کہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھے۔ حتیٰ کہ بعض عارفین نے فرمایا آزمائش پر ہر مومن صبر کرتا ہے لیکن عافیت پر صرف صدیق ہی صبر کر سکتا ہے۔

حضرت سہل رحمہ اللہ نے فرمایا عافیت پر صبر کرنا آزمائش پر صبر کرنے سے زیادہ سخت ہے اور جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر دنیا کے دروازے کھل گئے تو انہوں نے فرمایا ہم تکلیف کے فتنے میں مبتلا ہوئے تو ہم نے صبر کیا لیکن جب کشادگی کے فتنے میں مبتلا ہوئے تو ہم سے صبر نہ ہو سکا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مال عورت اور اولاد کے فتنے سے ڈرایا ارشاد خداوندی ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ۔ (۱)

اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہ کر دے۔

اور ارشاد فرمایا۔

إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ۔ (۲)

بے شک تمہاری بیویوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں پس ان سے بچو۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ منافقین آیت ۹

(۲) قرآن مجید، سورۃ التغابن آیت ۱۴

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَلْوَلَدُ مَبْخَلَۃٌ مَجْبَنَۃٌ مَحْزَنَۃٌ۔ (۱) اولاد، بخل، بزدلی اور غم کا سبب ہے۔

اور جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ قمیض میں اٹک کر گر رہے ہیں تو آپ منبر سے اتر گئے اور انہیں گود میں لے لیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا۔

اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ۔ (۲) بے شک تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں۔

میں نے جب اپنے لخت جگر کو دیکھا کہ وہ گرنے والا ہے تو میں ان کو اٹھانے سے رُک نہ سکا۔ (۳)

اس میں عقل مند لوگوں کے لیے عبرت ہے اور کامل مرد وہی ہے جو عافیت پر صبر کرتا ہے اور اس پر صبر کا مطلب یہ ہے کہ اس کی طرف جھکاؤ نہ ہو اور یہ خیال کرے کہ سب کچھ اس کے پاس امانت ہے اور ہو سکتا ہے کہ عنقریب یہ واپس ہو جائے اسے چاہیے کہ اس پر خوش ہونے میں نفس کو کھلی چھٹی نہ دے اور عیش و عشرت، لذت اور لہو ولعب میں مشغول نہ ہو جائے نیز اپنے مال میں اللہ تعالیٰ کے حقوق کا خیال رکھے کہ اسے خرچ کرے اور بدن میں بھی حقوق خداوندی کا خیال رکھے یعنی اسے مخلوق کی مدد کرنے میں استعمال کرے زبان کو سچائی کے لیے استعمال کرے اسی طرح ان تمام نعمتوں میں اللہ تعالیٰ کے حقوق کا خیال رکھے جو اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمائی ہیں یہ صبر، شکر کے ساتھ متصل ہے اور اس کی تکمیل اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ شکر کا حق ادا کرے جیسا کہ آگے آئے گا۔

خوشی کی حالت میں صبر کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے کیوں کہ یہ طاقت سے ملا ہوا ہوتا ہے اور قادر نہ ہونا بھی حفاظت ہے اگر کوئی دوسرا آدمی پچھنے لگائے تو خود لگانے کی صورت میں صبر کرنے سے یہ آسان ہوتا ہے بھوکے آدمی کے پاس کھانا نہ ہو تو اس صورت میں وہ اس حالت کی نسبت سے زیادہ صبر کرتا ہے، جب اس کے پاس نہایت عمدہ اور لذیذ کھانے موجود ہوں اسی وجہ سے خوشی کی حالت میں صبر کرنے کی عظمت زیادہ ہے۔

دوسری قسم:

یہ وہ قسم ہے جو خواہش اور طبیعت کے موافق نہ ہو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ بندے کے اختیار سے اس کا کوئی تعلق ہو جیسے عبادات اور گناہ دوسری صورت یہ ہے کہ بندے کے اختیار کے ساتھ اس کا کوئی رابطہ نہ ہو جیسے مصیبتیں اور تکالیف، لیکن اسے زائل کرنا اس کے اختیار میں ہوتا ہے جیسے موذی سے بدلہ لے کر دل کو تسلی دی جائے۔

---

(۱) کنز العمال جلد ۱۶ ص ۲۸۹ حدیث ۴۵۱۴۰

(۲) قرآن مجید، سورۂ تغابن آیت ۱۵

(۳) جامع ترمذی ص ۵۴۰، ابواب المناقب

تو اس کی تین اقسام ہیں۔

پہلی قسم:

جو کچھ اس کے اختیار میں ہو اور یہ اس کے وہ تمام افعال ہیں جن کو عبادت یا گناہ کہا جاتا ہے اور اس کی تین صورتیں ہیں پہلی صورت عبادت ہے اور بندہ اس پر صبر کا محتاج ہوتا ہے اور عبادت پر صبر کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے کیوں کہ نفس کو فطری طور پر بندگی سے نفرت ہوتی ہے اور وہ رب بننے کی خواہش رکھتا ہے، اسی لیے بعض عارفین نے فرمایا کہ ہر نفس میں وہ بات پوشیدہ ہے جو فرعون نے ظاہر کی اس نے کہا تھا۔

اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۱) (القرآن) — میں تمہارا بلند ترین رب ہوں

لیکن فرعون نے اس کے لیے میدان اور قبولیت پائی اس لیے اس بات کو ظاہر کر دیا جب اس نے قوم کو حقیر جانا تو انہوں نے اس کی اطاعت کی ہر شخص اپنے غلام، خادم، متبعین اور ان تمام لوگوں پر رب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے جو اس کے ماتحت اور مغلوب ہیں اگرچہ وہ اسے ظاہر نہیں کرتا۔ جب وہ اس کی خدمت میں کوتاہی کرتے ہیں تو اس وقت ان پر اس کا غصہ اسی تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے جو اس کے اندر چھپا ہوا ہے نیز اس کا سبب اس کا دعویٰ ربوبیت ہی تو ہے تو عبادت مطلقاً لوگوں پر گراں گزرتی ہے پھر بعض عبادات سستی کی وجہ سے ناپسند ہوتی ہیں جیسے نماز بعض بخل کی وجہ سے جیسے زکوٰۃ اور بعض ان دونوں باتوں کے باعث ناپسند ہوتی ہیں جیسے حج اور جہاد —— تو عبادت پر صبر کرنا سخت امور پر صبر کرنا ہے اور عبادت کرنے والا تین حالتوں میں صبر کا محتاج ہوتا ہے۔

پہلی حالت عبادت سے پہلے کی ہے اور یہ نیت کو صحیح رکھنا اور اخلاص ہے ریا کے شائبوں اور آفات کے دواعی سے صبر کرنا اور اخلاص ووفا کا عزم ہے اور جو شخص نیت اور اخلاص کی حقیقت نیز ریا کی آفات اور نفس کے مکر وفریب سے آگاہ ہے اسے معلوم ہے کہ اس پر صبر کس قدر مشکل ہے۔ اور اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں تنبیہ فرمائی ہے۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى۔ (۱) — بے شک اعمال (کے ثواب) کا دار و مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ — اور ان کو نہیں حکم دیا گیا مگر اس بات کا کہ وہ اللہ تعالیٰ

---

(۱) صحیح بخاری جلد اول ص ۲ کیف کان بدؤ الوحی

لَهُ الدِّيْنَ۔ (۱) کی عبادت کریں اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے صبر کو عمل پر مقدم کیا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ (۲) مگر جن لوگوں نے صبر کیا اور اچھے کام کئے۔

دوسری حالت، عمل کی حالت ہے تاکہ وہ عمل کے دوران اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو اور اس کے آداب و سنن کی بجاآوری میں سستی کا مظاہرہ نہ کرے اور آخری عمل تک ادب کی شرط پر قائم رہے اور جو امور عمل میں خلل ڈالتے ہیں ان سے صبر اختیار کرے اور یہ بھی سخت قسم کا صبر ہے اور شاید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے یہی بات مراد ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا۔ (۳) ان عمل کرنے والوں کا اجر کتنا اچھا ہے جنہوں نے صبر کیا۔

یعنی عمل کی تکمیل تک صبر کیا۔

تیسری حالت عمل سے فراغت کے بعد کی ہے کیوں کہ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ اسے افشاء کرنے اور ریا کاری کے لیے ظاہر کرنے سے صبر کرے نیز اس عمل کو خود پسندی کی نظر سے دیکھنے اور ہر اس بات سے صبر کرے جو اس کے عمل کو باطل کر دیتی اور اس کے اثر کو مٹا دیتی ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ۔ (۴) اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔

اور جیسے ارشاد فرمایا۔

وَلَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى۔ (۵) اور اپنے صدقات کو احسان جتانے اور تکلیف دینے کے ذریعے باطل نہ کرو۔

تو جو شخص صدقہ دینے کے بعد احسان جتانے اور اذیت پہنچانے سے صبر نہیں کرتا اس نے اپنا عمل باطل کر دیا۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ البینہ آیت ۵

(۲) قرآن مجید سورۃ ہود آیت ۱۱

(۳) قرآن مجید، سورۃ عنکبوت آیت ۵۸، ۵۹

(۴) قرآن مجید، سورۃ محمد آیت ۳۳

(۵) قرآن مجید سورہ بقرہ آیت ۲٦۴

عبادات فرض بھی ہیں اور نوافل بھی اور آدمی ان سب میں صبر کا محتاج ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان سب کو اس میں جمع فرما دیا۔

ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی (۱)

بے شک اللہ تعالیٰ انصاف، احسان اور قریبی رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔

عدل فرض، احسان نفل اور قرابت داروں کو دینا مروت اور صلہ رحمی ہے اور یہ تمام امور صبر کے محتاج ہیں۔

دوسری قسم گناہوں پر مشتمل ہے اور ان پر صبر کرنے کی بھی بہت زیادہ حاجت ہے اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے گناہوں کو اپنے اس ارشاد گرامی میں جمع فرمایا۔

وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ۔ (۲)

اور وہ (اللہ تعالیٰ) بے حیائی، برے کاموں اور سرکشی سے منع فرماتا ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلْمُھَاجِرُ مَنْ ھَجَرَ السُّوْءَ (۳) وَالْمُجَاھِدُ مَنْ جَاھَدَ ھَوَاہُ۔ (۴)

مہاجر وہ ہے جو برائی کو ترک کر دیتا ہے اور مجاہد وہ ہے جو اپنی خواہش سے لڑتا ہے۔

اور گناہ خواہش کے باعث کا تقاضا ہیں اور گناہوں سے سخت ترین صبر ان گناہوں سے صبر کرنا ہے جن سے عادت کے باعث الفت ہو گئی ہو کیوں کہ عادت پانچویں طبیعت ہے اور جب گناہوں کے ساتھ عادت مل جائے تو شیطان کے دو لشکر باہم مل کر اللہ تعالیٰ کے لشکر پر غالب آجاتے ہیں تو دینی باعث اس کے قلع قمع پر طاقت نہیں رکھتا۔

پھر اگر وہ کام ان کاموں میں سے ہو جن کا کرنا آسان ہوتا ہے تو اسے صبر کرنا نفس پر بہت گراں گزرتا ہے جیسے غیبت، جھوٹ، ریاکاری اور کنایتاً یا صراحتاً اپنی تعریف کرنا وغیرہ۔ اسی طرح مختلف قسم کے مذاق جو دلوں کو اذیت پہنچاتے ہیں اور ایسے کلمات جن سے دوسروں کی حقارت مقصود ہو۔ نیز مُردوں کا ذکر کر کے ان کی عیب جوئی کرنا یا ان کے علوم، سیرت اور مناصب پر انگشت نمائی کرنا کیوں کہ یہ باتیں ظاہری طور پر غیبت ہیں اور باطنی طور پر اپنی تعریف کرنا ہے تو نفس کے لیے دو خواہشیں ہیں ان میں سے

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ النحل آیت ۹۰

(۲) قرآن مجید، سورۃ النحل آیت ۹۰

(۳) مسند امام احمد بن حنبل ج ۲ ص ۲۰۶ مرویات فضالہ بن عبید۔

(۴) کنز العمال جلد ۴ ص ۴۳۰ حدیث ۱۱۲۶۲

ایک، دوسروں کی نفی کرنا اور دوسری خواہش اپنے آپ کو اچھا ثابت کرنا ہے اور اس سے وہ جذبۂ ربوبیت مکمل ہوتا ہے جو اس کی فطرت میں ہے اور یہ اس عبودیت کی ضد ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے نیز اس میں دو شہوتیں جمع ہونے زبان کی حرکت آسان ہونے اور محاورات میں اس کے عادت بن جانے سے ان امور سے صبر کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور یہ سب سے بڑی ہلاکت خیز بات ہے حتیٰ کہ دلوں سے اس کا انکار اور اسے قبیح قرار دینے کا خیال باطل ہو جاتا ہے کیوں کہ ان امور کا تکرار زیادہ ہوتا ہے اور ان سے اُنس بھی زیادہ ہوتا ہے مثلاً تم کسی انسان کو ریشمی لباس پہنے ہوئے دیکھتے ہو تو اسے بہت ہی ناپسند کرتے ہو لیکن وہ تمام دن لوگوں کو برا بھلا کہتا رہے تو اسے برا نہیں کہتے (۱) حالانکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ غیبت، زنا سے بھی زیادہ سخت گناہ ہے اور جو شخص گفتگو میں اپنی زبان کو کنٹرول نہ کر سکے اور اس سے صبر کرنے پر قادر نہ ہو تو اس پر گوشہ نشینی لازم ہے تاکہ کوئی اس سے گفتگو نہ کرے کیوں کہ میل جول کی صورت میں خاموشی سے صبر کرنا تنہائی اختیار کرنے پر صبر کرنے سے زیادہ آسان ہے اور گناہوں کی انفرادی صورت میں صبر کی شدت مختلف ہو جاتی ہے کیونکہ ان گناہوں کے داعی شدت و ضعف کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔

اسی طرح وسوسوں کے ساتھ دلوں کی حرکت زبان کی حرکت سے آسان ہے کیوں کہ دل کی گفتگو تو تنہائی میں بھی باقی رہتی ہے اور اس سے صبر کرنا بالکل ممکن نہیں ہے ہاں دل پر کوئی دوسرا دینی غم غالب ہو جائے جو اس کو اس طرف متوجہ کر دے جیسے کسی شخص کے تمام غم ایک ہی غم بن جائیں ورنہ جب تک فکر کو کسی معین بات کی طرف متوجہ نہیں کرے گا وسوسوں کا اس سے دور ہونا ممکن نہ ہوگا۔

دوسری قسم:

وہ افعال جن کا آنا اختیار میں نہ ہو لیکن ان کو دور کرنا اختیار میں ہو۔ جیسے کسی شخص کو کسی فعل یا عمل کے ذریعے اذیت دی جائے اور اسے مالی یا جانی نقصان پہنچایا جائے تو بعض اوقات اس پر صبر کرنا اور بدلہ نہ لینا واجب ہوتا ہے اور بعض اوقات صرف فضیلت کا باعث ہوتا ہے واجب نہیں ہوتا، بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے فرمایا ہم کسی مومن کے ایمان کو ایمان شمار نہیں کرتے تھے جب تک وہ اذیت پر صبر نہ کرتا اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ۔ (۲)

اور ہم ضرور بالضرور اس اذیت پر صبر کریں گے جو تم نے ہمیں پہنچائی اور توکل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پر ہی توکل کرنا چاہیے۔

---

(۱) مجمع الزوائد جلد ۸ ص ۹۱ کتاب الادب

(۲) قرآن مجید، سورۂ ابراہیم آیت ۱۲

ایک مرتبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال تقسیم فرمایا تو کسی مسلمان اعرابی نے کہا کہ اس تقسیم سے اللہ تعالیٰ کی رضا کا ارادہ نہیں کیا گیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی خبر دی گئی تو آپ کے رخسار مبارک سرخ ہو گئے۔

پھر آپ نے فرمایا۔

يَرْحَمُ اللّٰهُ أَخِي مُوسٰى لَقَدْ أُوذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ میرے بھائی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے بے شک ان کو اس سے زیادہ اذیت دی گئی لیکن انہوں نے صبر کیا۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ (۲)

اور ان کی اذیت کو نظر انداز کریں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا۔ (۳)

اور ان کی باتوں پر صبر کریں اور ان کو اچھی طرح چھوڑ دیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ۔ (۴)

اور بے شک ہم جانتے ہیں کہ آپ ان کی باتوں سے اپنے سینۂ مبارک میں تنگی محسوس کرتے ہیں پس آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کریں۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔ (۵)

اور تم ضرور بضرور ان اہل کتاب سے جو تم سے پہلے گزر گئے اور مشرکوں سے بے شمار اذیت ناک باتیں سنو گے اور اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری اختیار کرو تو یہ نہایت ہمت کے کاموں سے ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد اول ص ۴۸۳ کتاب الانبیاء

(۲) قرآن مجید، سورۂ احزاب آیت ۴۸

(۳) قرآن مجید، سورۂ مزمل آیت ۱۰

(۴) قرآن مجید، سورۂ الحجر آیت ۹۷

(۵) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۱۸۶

مطلب یہ ہے کہ بدلہ لینے سے صبر کرو اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے حقوق مثلاً قصاص وغیرہ معاف کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۔ (۱)

اور اگر تم بدلہ لو تو اتنی ہی تکلیف پہنچاؤ جتنی تمہیں پہنچی اور اور اگر تم صبر کرو تو یہ بات، صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَاَعْطِ مَنْ حَرَمَكَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ ۔

جو تم سے قطع تعلق کرے اس سے صلہ رحمی کرو جو تمہیں نہ دے اسے دو اور جو تم پر ظلم کرے اسے معاف کر دو۔

اور میں (امام غزالی رحمہ اللہ) نے انجیل میں دیکھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اس سے پہلے تم سے کہا گیا کہ دانت کے بدلے دانت اور ناک کے بدلے ناک لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ شر کا بدلہ شر سے نہ دو۔ بلکہ جو آدمی تمہارے دائیں رُخسار پر مارے تو بایاں رُخسار بھی اس کے سامنے کر دو۔ اور جو شخص تمہاری چادر لے لے اسے تہبند بھی دے دو اور جو آدمی تمہیں ایک میل تک اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور کرے تم اس کے ساتھ دو میل چلو، تو یہ سب باتیں اذیت پر صبر کے زمرے میں آتی ہیں اور لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی اذیت پر صبر کرنا صبر کے اعلیٰ مراتب میں سے ہے کیوں کہ اس صورت میں باعث دینی کے مقابلے شہوت اور غضب دونوں کا باعث ہوتا ہے۔

تیسری قسم :

وہ اعمال جن کی ابتدا اور انتہا کچھ بھی بندے کے اختیار میں نہیں ہوتا جیسے مصیبتیں ہیں مثلاً رشتوں کا فوت ہو جانا، مالوں کا ہلاک ہو جانا، بیماری کی وجہ سے صحت کا زائل ہونا، بینائی کا چلا جانا اعضاء کا خراب ہونا اور اس طرح کی تمام آزمائشوں پر صبر کرنا اعلیٰ درجہ کا صبر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں قرآن پاک میں صبر کی تین صورتیں مذکور ہیں ۔۔۔ (۱) اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد فرائض کی ادائیگی پر صبر کرنا اور اس کے لیے تین سو درجات ہیں، (۲) جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حرام کیا اس سے صبر کرنا اس کے چھ سو درجات ہیں اور (۳) مصیبت پر پہلے صدمہ کے وقت صبر کرنا اس کے نو سو درجات ہیں اور اس درجہ کو باوجود فضائل کے دوسرے درجے پر فضیلت دی گئی حالانکہ وہ فرض ہے، کیوں کہ حرام سے اجتناب پر ہر مومن صبر کر لیتا ہے لیکن مصیبت پر صرف انبیاء کرام ہی صبر کر سکتے ہیں کیوں کہ صدیقین کا سرمایہ ہے یہ صبر نفس پر بہت گراں ہوتا ہے اسی لیے نبی اکرم

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ النحل آیت ۱۲۶

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۱۴۸ مرویات عقبہ بن عامر

صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگی۔

أَسْأَلُكَ مِنَ الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ عَلَيَّ بِهِ مَصَائِبَ الدُّنْيَا۔ (۱)

(یا اللہ!) میں تجھ سے اس یقین کا سوال کرتا ہوں جس کے ذریعے مجھ پر دنیا کے مصائب آسان ہو جائیں۔

تو یہ وہ صبر ہے جس کا منشا حسن یقین ہے۔

حضرت ابو سلیمان رحمہ اللہ نے فرمایا! اللہ کی قسم! ہم اپنی پسندیدہ چیز پر صبر نہیں کر سکتے تو ناپسندیدہ بات پر کیسے صبر کریں گے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ إِذَا وَجَّهْتُ إِلَى عَبْدٍ مِنْ عَبِيْدِي مُصِيْبَةً فِي بَدَنِهِ أَوْ مَالِهِ أَوْ وَلَدِهِ ثُمَّ اسْتَقْبَلَ ذٰلِكَ بِصَبْرٍ جَمِيْلٍ اسْتَحْيَيْتُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنْ أَنْصِبَ لَهُ مِيْزَانًا أَوْ أَنْشُرَ لَهُ دِيْوَانًا۔ (۲)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جب میں اپنے کسی بندے کے بدن یا اس کے مال یا اس کی اولاد کی طرف کسی مصیبت کو متوجہ کرتا ہوں پھر وہ صبر جمیل کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہے تو قیامت کے دن مجھے اس سے حیا آئے گا کہ میں اس کے لیے میزان قائم کروں یا اس کا نامۂ اعمال کھولوں۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنْتِظَارُ الْفَرَجِ بِالصَّبْرِ عِبَادَةٌ۔ (۳)

صبر کے ساتھ کشادگی کا انتظار عبادت ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جب کسی بندے کو مصیبت پہنچے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم مطابق یہ کلمات کہے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔ (۴)

(بے شک ہم اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور ہم نے اسی کی لوٹنا ہے۔

اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيْبَتِي وَأَعْقِبْنِي خَيْرًا مِنْهَا۔ (۵)

یا اللہ! مجھے اس مصیبت میں اجر عطا فرما اور مجھے اس سے بہتر عطا فرما تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول فرماتا ہے۔

---

(۱) جامع ترمذی ص ۵۰۴، ابواب الدعوات

(۲) الفردوس بماثور الخطاب جلد ۳ ص ۱۷۲ حدیث ۴۴۵۹

(۳) الترغیب والترہیب جلد ۲ ص ۴۸۲ کتاب الذکر

(۴) قرآن مجید، سورۃ بقرہ آیت ۱۵۶

(۵) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۳۰۹ مرویات ام سلمہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا بے شک اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اے جبریل علیہ السلام! جس کی دو کریم چیزیں (آنکھیں) لے لی جائیں اس کا بدلہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا یا اللہ! تو پاک ہے ہمیں اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں سکھایا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کا بدلہ میرے گھر (جنت) میں ہمیشہ رہنا اور میری زیارت کرنا ہے۔ (۱)

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے جب میں اپنے بندے کو کسی آزمائش میں ڈالتا ہوں پھر وہ صبر کرتا ہے اور بیمار پرسی کرنے والوں سے شکایت نہیں کرتا تو میں اسے پہلے سے بہتر گوشت اور اس کے خون سے بہتر خون عطا کرتا ہوں اور جب میں تندرست کرتا ہوں تو اس کا کوئی گناہ باقی نہیں رہتا اور اگر اسے وفات دوں تو اپنی رحمت عطا کرتا ہوں۔ (۲)

حضرت داؤد علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا اے میرے رب! جو آدمی تیری رضا کے حصول کے لیے مصیبتوں پر صبر کرتا ہے اس پریشان اور غمگین آدمی کا بدلہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اس کا بدلہ یہ ہے کہ میں اسے ایمان کا لباس پہناؤں گا اور اس سے کبھی بھی نہیں اتاروں گا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے خطبہ میں فرمایا اللہ تعالیٰ کسی بندے پر انعام فرماتا ہے پھر اس سے وہ نعمت لے لیتا ہے اور اس کے بدلے اسے صبر عطا کرتا ہے تو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اسے عطا فرمایا وہ اس سے بہتر ہے جو اس سے لے لیا اور آپ نے یہ آیت پڑھی۔

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (۳)

بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے حساب دیا جاتا ہے۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ سے صبر کی حقیقت پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونا صبر ہے عرض کیا گیا یہ کیسے؟ فرمایا جو آدمی راضی ہوتا ہے وہ اپنے مقام سے اوپر کی تمنا نہیں کرتا۔

کہا گیا ہے کہ حضرت شبلی رحمہ اللہ بیمارستان کے قید خانے میں قید کیے گئے تو ان کے پاس ایک جماعت آئی انہوں نے پوچھا تم کون ہو؟ ان لوگوں نے جواب دیا آپ سے محبت کرنے والے ہیں جو آپ کی ملاقات کے لیے آئے ہیں آپ نے پتھر لے کر ان کو مارنا شروع کر دیا تو وہ بھاگنے لگے آپ نے فرمایا اگر تم میرے دوست ہوتے تو میری مصیبت پر صبر کرتے

(۱) مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۳۰۹ کتاب الجنائز
(۲) سنن الکبریٰ للبیہقی جلد ۳ ص ۳۷۵ کتاب الجنائز
(۳) قرآن مجید، سورۂ زمر آیت ۱۰

کسی بزرگ (عارف) کی جیب میں ایک رقعہ تھا وہ ہر وقت اسے نکال کر دیکھتے تھے اور اس میں لکھا تھا
وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ (۱) اور اپنے رب کے حکم پر صبر کر دبے شک تم ہمارے سامنے ہو (ہماری حفاظت میں ہو)

کہا جاتا ہے کہ فتح موصلی کی بیوی پھسل گئیں تو ان کا ناخن ٹوٹ گیا وہ ہنس پڑیں پوچھا گیا کہ کیا تمہیں درد نہیں ہوتا؟ اس نے کہا اس کے ثواب کی لذت نے میرے دل سے درد کی تلخی کو زائل کر دیا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے فرمایا کہ مومن کے تقویٰ پر تین باتوں سے استدلال کیا جاتا ہے (۱) جو کچھ نہیں ملا اس کے بارے میں اچھی طرح توکل کرنا (۲) جو کچھ حاصل ہوا اس کے سلسلے میں اچھی طرح راضی ہونا اور (۳) جو کھو گیا اس پر اچھی طرح صبر کرنا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مِنْ إِجْلَالِ اللهِ وَمَعْرِفَةِ حَقِّهِ أَنْ لَا تَشْكُوَ وَجَعَكَ وَلَا تَذْكُرَ مُصِيبَتَكَ۔ (۲) اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس کے حق کی معرفت کا تقاضا ہے کہ تو اپنے درد کی شکایت نہ کرے اور نہ ہی اپنی مصیبت کا تذکرہ کرے۔

ایک بزرگ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ باہر تشریف لائے اور ان کی آستین میں ایک تھیلی تھی پھر اسے تلاش کیا تو نہ ملی معلوم ہوا کہ وہ ان کی آستین سے چوری ہو گئی ہے۔ انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص (چور) کو اس میں برکت عطا فرمائے ہو سکتا ہے اسے مجھ سے زیادہ ضرورت ہو۔

ایک بزرگ کے بارے میں منقول ہے وہ فرماتے ہیں میں حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے غلام حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزرا وہ شہیدوں کے درمیان تھے اور ابھی ان میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی میں نے کہا میں آپ کو پانی پلاتا ہوں انہوں نے فرمایا مجھے تھوڑا سا دشمن کی طرف سرکا دو اور پانی میری ڈھال پر رکھ دو میں روزے سے ہوں اگر میں رات تک زندہ رہا تو پی لوں گا۔

تو اللہ تعالیٰ کے راستے میں چلنے والوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی آزمائشوں پر اس طرح صبر ہوتا تھا۔

سوال:

مصائب میں صبر کا درجہ کیسے پایا جا سکتا ہے جب کہ یہ بات بندے کے اختیار میں نہیں ہے اور وہ مجبور ہے مانے یا

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ طور آیت ۴۸

(۲)

انکار کرے، تو اگر صبر سے مراد یہ ہے کہ اس کے دل میں مصیبت کی کراہت (ناپسندیدگی) نہ ہو تو یہ بات اختیار میں نہیں ہے۔

جواب:

جان لو کہ آدمی جب روتا پیٹتا ہے، گریبان پھاڑتا اور چہرے پر ضربیں لگاتا ہے، بہت زیادہ شکایت کرتا ہے رنج کو ظاہر کرتا ہے لباس، بچھونے اور کھانے میں تبدیلی کرتا ہے تو وہ صابرین کے مقام سے خارج ہو جاتا ہے اور یہ باتیں اس کے اختیار میں ہیں لہذا اسے ان سب سے بچنا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر رضا کا اظہار کرے نیز اپنی عادت پر برقرار رہے اور یہ عقیدہ رکھے کہ یہ چیز اس کے پاس امانت تھیں پس واپس لے لی گئی۔ جیسے ایک روایت میں حضرت ام سلیم رمیصاء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں میرا بیٹا فوت ہو گیا اور میرے خاوند حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ موجود نہیں تھے میں اٹھی اور گھر کے ایک کونے میں اس پر کپڑا ڈال دیا حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو میں نے اٹھ کر افطاری کا انتظام کیا وہ کھانا کھا رہے تھے اور ساتھ ہی پوچھنے لگے بچے کا کیا حال ہے؟ میں نے کہا اللہ تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے اچھے حال میں ہے وہ جب سے بیمار ہوا اسے کسی رات بھی ایسا سکون نہیں ملا پھر میں نے ان کے لیے اپنے آپ کو اچھی طرح سنوارا حتیٰ کہ انہوں نے اپنی حاجت کو مجھ سے پورا کیا پھر میں نے کہا کیا آپ کو پڑوسیوں پر تعجب نہیں ہوتا؟ فرمایا ان کو کیا ہوا؟ میں نے کہا انہوں نے ایک چیز ادھار لی تھی جب ان سے واپس مانگی گئی تو وہ شور مچانے لگے فرمایا یہ تو انہوں نے برا کیا میں نے کہا آپ کا بیٹا بھی اللہ تعالیٰ کی امانت تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اٹھا لیا ہے اس پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا پھر دوسرے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو واقعہ کی اطلاع دی آپ نے ان کے حق میں یوں دعا مانگی "اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَھُمَا فِیْ لَیْلَتِہِمَا" یا اللہ! ان کے رات کے عمل میں برکت پیدا فرما۔

راوی کہتے ہیں میں نے اس کے بعد مسجد میں ان کے سات بیٹے دیکھے وہ سب کے سب قرآن پاک کے قاری تھے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ جنت میں داخل ہو رہا ہوں تو وہاں حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ رمیصاء موجود ہیں۔

کہا گیا ہے صبر جمیل یہ ہے کہ مصیبت زدہ دوسروں سے پہچانا نہ جائے دل کا دکھ اور آنسو بہانا اسے صبر کرنے والوں کے درجہ سے باہر نہیں نکالتا کیوں کہ موت کی وجہ سے وہ (دکھ) تمام حاضرین کے لیے ایک جیسا ہے کیوں کہ یہ بات بشریت کا تقاضا ہے اور موت تک انسان کے ساتھ رہتی ہے اسی لیے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ کی مبارک آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے عرض کیا گیا کہ کیا آپ ہمیں اس بات سے منع نہیں فرماتے؟ آپ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ ھٰذِہٖ رَحْمَۃٌ یَرْحَمُ اللّٰہُ مِنْ   بے شک یہ رحمت ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے

رحم کرنے والے بندوں پر رحم فرماتا ہے۔ (۱) عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ۔

بلکہ اس وجہ سے آدمی مقام رضا سے بھی نہیں نکلتا آدمی جب پچھنا لگواتا ہے تو اس سے پہلے وہ اس پر راضی ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اسے تکلیف ضرور ہوتی ہے اور بعض اوقات زیادہ درد کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ یہ بحث رضا کے بیان میں آئے گی ان شاء اللہ ابن نجیح نے بعض خلفاء کی تعزیت میں لکھا ہے کہ جو شخص اس بات کو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس سے لیا وہ اس کا حق تھا تو وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ جو کچھ اس کے پاس باقی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا حق زیادہ جانے۔

جان لو جو کچھ گزر گیا وہ تمہارے لیے باقی ہے اور جو کچھ تمہارے بعد رہے گا اس میں تمہیں ثواب ملے گا اور یہ بات بھی جان لو کہ صبر کرنے والوں کا اجر اس مصیبت میں جو ان کو پہنچی ہے اس نعمت سے بڑھ کر ہے جو مصائب سے بچنے کی صورت میں ہوتی ہے کیوں کہ جب وہ غور و فکر کے ذریعے ملنے والی ثواب کی نعمت کے ذریعے نفس کی کراہت کو ٹال دیتا ہے تو صبر کرنے والوں کا درجہ پاتا ہے ہاں مرض، فقر اور تمام مصیبتوں کو پوشیدہ رکھنا کمال صبر سے ہے اور یہ بھی کہا گیا کہ مصائب، تکالیف اور صدقہ پوشیدہ رکھنا نیکی کے خزانوں میں سے ہے۔

ان تقسیمات سے تمہارے سامنے واضح ہو گیا کہ تمام احوال و افعال میں صبر پایا جاتا ہے جو شخص تمام خواہشات سے بچایا گیا اور اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اسے بھی اس گوشہ نشینی پر صبر کی حاجت ہوتی ہے یہ تو ظاہر میں ہے اور باطنی طور پر شیطانی وسوسوں سے صبر کرنا ضروری ہے کیونکہ دل کا خلجان سکون پذیر نہیں ہے اور زیادہ قلبی پریشانیاں ان فوت شدہ چیزوں پر ہوتی ہیں جن کا تدارک نہیں ہو سکتا یا آئندہ چیزوں کے بارے میں ہوتا ہے حالانکہ جو مقدر میں ہے وہ ضرور ملے گا بہر حال جو بھی صورت ہو وقت کو ضائع کرنا ہے اور بندے کا آلہ دل ہے اور اس کا سرمایہ اس کی زندگی ہے اگر دل ایک گھڑی بھی اس ذکر سے غافل ہو جو اللہ تعالیٰ سے اُنس کا فائدہ دیتا ہے یا وہ فکر جو معرفت خداوندی کے لیے مفید ہے تاکہ اس معرفت کے ذریعے محبت خداوندی حاصل ہو تو ایسا شخص نقصان میں ہے۔

یہ اس صورت میں ہے جب اس کا فکر اور وسوسے مباح (جائز) امور میں ہوں اور اکثر ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ خواہشات کی تکمیل کے لیے مختلف حیلوں میں غور و فکر کرتا ہے کیوں کہ وہ عمر بھر اس آدمی سے جھگڑتا رہتا ہے جو اس کی غرض کے خلاف حرکت کرے یا جس کے بارے میں خدشہ ہو کہ وہ اس سے جھگڑے گا اور اس کی بات یا غرض کی مخالفت کرے گا بایں معنیٰ کہ اس سے کوئی علامت ظاہر ہوتی ہے بلکہ جو لوگ اس کے لیے مخلص ہوتے ہیں حتیٰ کہ بیوی بچے بھی، ان کو بھی مخالف فرض کرتا ہے پھر ان کو تنبیہ کرنے اور ان پر غصہ نکالنے اور ان کو جواب دینے کا طریقہ سوچتا ہے اور ہمیشہ اسی قسم میں مشغول رہتا ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۸۴۲ کتاب العقیقہ / حلیۃ الاولیاء جلد ۲ ص ۵۹، ۶۰ ترجمہ ۱۳۹

تو شیطان کے دو لشکر ہیں ایک لشکر اڑتا ہے اور دوسرا چلنے والا ہے وسوسے اڑنے والے لشکر کا نام ہے اور چلنے والے لشکر کی حرکت کو شہوت کہتے ہیں کیوں کہ شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور انسان کھنکھناتی مٹی سے جو ٹھیکری کی طرح ہے اور ٹھیکری میں گارے کے ساتھ آگ بھی جمع ہوتی ہے مٹی (گارے) کی طبیعت میں سکون ہے جب کہ آگ کی فطرت حرکت ہے اور ایسی آگ کا تصور نہیں کیا جا سکتا جو شعلہ زن نہ ہو بلکہ وہ اپنی فطرت کے مطابق ہمیشہ حرکت میں رہتی ہے وہ ملعون (شیطان) جسے آگ سے پیدا کیا گیا تھا اسے مٹی سے پیدا ہونے والے کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تاکہ اس کی حرکت رک جائے لیکن اس نے انکار کیا، تکبر اور نافرمانی کی اور اپنی اس نافرمانی کا سبب یوں بیان کیا۔

خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۔ (یا اللہ!) تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس (آدم علیہ السلام) کو مٹی سے پیدا کیا۔ (۱)

تو جب اس ملعون نے ہمارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا تو اس سے یہ امید بھی نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ آپ کی اولاد کو سجدہ کرے گا۔

اولادِ آدم کو شیطانی سجدے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کے دلوں سے وسوسوں اور حرکات سے باز آجائے اور یہی ان کے سامنے جھکنا ہے کیوں کہ سجدے کی روح تو یہی ہے پیشانی کا زمین پر رکھنا سجدے کا جسم اور اصطلاحاً ظاہری علامت ہے اگر پیشانی کو زمین پر رکھنا اصطلاحاً گستاخی کی علامت سمجھا جاتا تو اس کا تصور بھی ہو سکتا تھا جیسے کسی قابلِ تعظیم و احترام شخص کے سامنے منہ کے بل گرنا عادتاً گستاخی سمجھی جاتی ہے۔

تو یہ بات مناسب نہیں کہ جوہر کا ظاہر تمہیں اصل جوہر سے، روح کا جسم، روح سے اور مغز کا چھلکا، مغز سے غافل کر دے ایسا نہ ہو کہ ظاہری دنیا کو دیکھ عالمِ غیب سے بے خبر ہو جائے اور یہ بات ثابت ہے کہ شیطان کو مہلت دی گئی ہے تو وہ قیامت تک ایسا نہیں کرے گا کہ تمہارے دل میں وسوسے ڈالنے سے باز رہ کر تمہارے لیے تواضع اختیار کرے ہاں جب تمہارے تمام افکار صرف ایک فکر میں بدل جائیں اور تمہارا دل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں مشغول ہو جائے تو اب اس لعنتی کی کوئی مجال نہ ہو گی اس وقت تو اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں میں سے ہو گا جو اس لعین کے غلبے سے مستثنیٰ لوگوں میں داخل ہیں۔

اور یہ خیال بھی نہیں ہونا چاہیے کہ فارغ دل شیطان سے خالی ہوتا ہے بلکہ وہ تو انسان میں خون کی طرح گردش کرتا ہے اور اس کا چلنا پیالے میں ہوا کے چلنے کی طرح ہے اگر تم چاہو کہ پیالے میں پانی وغیرہ کچھ بھی نہ ہو اور پھر بھی پیالہ ہوا سے خالی ہو تو یہ طمع غلط ہے بلکہ پیالے کا جتنا حصہ پانی سے خالی ہو گا اس میں لامحالہ ہوا داخل ہو گی اسی طرح وہ دل جو اہم دینی فکر میں مشغول ہو وہ شیطان کی جولانگاہ بننے سے محفوظ رہتا ہے ورنہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ایک لحظہ بھی غافل ہو اس کے لیے اس ایک لحظہ میں شیطان ساتھی ہوتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِيْ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا اور جو شخص میرے ذکر سے منہ پھیرتا ہے ہم اس کے لیے

فَهُوَ لَہٗ قَرِیْنٌ ۔ (۱) ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں پس وہ اس کا ساتھی ہوتا ہے

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ یُبْغِضُ الشَّابَ الْفَارِغَ ۔ بے شک اللہ تعالیٰ بے کار نوجوان کو ناپسند کرتا ہے ۔

یہ اس لیے کہ جب کوئی نوجوان ایسا عمل نہ کرے جو اس کے دل کو ایسی بات میں مشغول کر دے جس کے ذریعے وہ اپنے دین پر مدد حاصل کرے تو اس کا ظاہر فارغ ہوگا لیکن اس کا دل فارغ نہ ہوگا بلکہ اس میں شیطان گھونسلا بنا کر انڈے دیتا اور بچے پیدا کرتا ہے پھر اس کے بچے جفتی کر کے دوبارہ انڈے دیتے ہیں اس طرح شیطان کی نسل حیوانات کی نسل سے جلدی بڑھتی ہے کیوں کہ اس کی سرشت میں آگ ہے اور جب آگ کے سامنے خشک گھاس آئے تو وہ خوب پھیلتی ہے اور آگ سے آگ نکلتی چلی جاتی ہے اور بجھتی نہیں ۔ بلکہ تھوڑی تھوڑی بڑھتی جاتی ہے تو نوجوان کے نفس میں شہوت اسی طرح ہوتی ہے جیسے آگ کے لیے خشک گھاس ـــــ اور جس طرح آگ کا ایندھن باقی نہ رہے تو وہ بھی باقی نہیں رہتی اسی طرح شہوت نہ ہو تو شیطان کا عمل دخل بھی ختم ہو جاتا ہے ۔

اور جب تم غور کروگے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن شہوت ہے اور وہ تمہارے نفس کی صفت ہے ۔ اسی لیے حضرت حسین بن منصور حلاج کو جب سُولی پر چڑھایا گیا تو تصوف کے بارے میں پوچھا گیا انہوں نے جواب دیا یہ تمہارا نفس ہے اگر تم اسے مشغول نہیں رکھوگے تو وہ تمہیں مشغول کر دے گا ۔

تو گویا صبر کی حقیقت اور اس کا کمال ہر مذموم حرکت سے صبر کرنا ہے اور باطنی حرکت سے صبر کرنا بدرجہ اولیٰ ضروری ہے اور یہ دائمی صبر ہے اسے صرف موت ہی ختم کر سکتی ہے ہم اللہ تعالیٰ کے احسان اور کرم کے باعث اس سے حُسنِ توفیق کے طالب ہیں ۔

فصل ۷ :

صبر کی دوا اور اس پر مدد

جان لو ! جس ذات نے بیماری اتاری ہے اس نے علاج بھی اتارا اور شفاء کا وعدہ بھی کیا ہے اگرچہ صبر کا حاصل کرنا بہت مشکل ہے لیکن علم و عمل کے معجون سے اسے حاصل کیا جا سکتا ہے علم اور عمل دو ایسی چیزیں ہیں جن سے تمام قلبی بیماریوں کی دوائی تیار ہوتی ہے لیکن ہر بیماری کے لیے جدا گانہ علم اور عمل ہے اور جس طرح صبر کی مختلف اقسام ہیں اسی طرح اس کے راستے میں رکاوٹ بننے والی علتیں بھی مختلف ہیں اور جب بیماریاں مختلف ہوں تو علاج بھی مختلف ہوتا ہے ، کیوں کہ علاج

(۱) قرآن مجید ، سورۃ زخرف آیت ۳۶

کا معنیٰ بیماری کی ضد اور اس کا قلع قمع کرنا ہے یہ ایک طویل بحث ہے لیکن ہم بعض مثالوں کے ذریعے اس کی پہچان حاصل کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں۔

مثلاً ایک شخص جماع کی شہوت سے صبر کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے اور اس پر شہوت غالب ہے کہ وہ اپنی شرمگاہ کو قابو میں نہیں رکھ سکتا یا شرمگاہ پر کنٹرول کر لیتا ہے لیکن آنکھیں اس کے قابو میں نہیں ہیں یا آنکھیں بھی قابو میں ہیں لیکن دل اور نفس پر کنٹرول نہیں ہے کیوں کہ وہ اس سے مسلسل شہوت کے تقاضوں کا ذکر کرتا ہے اور ذکر و فکر اور اعمال صالحہ سے اس کی توجہ ہٹا دیتا ہے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ جیسے پہلے بیان ہوا صبر باعث دینی اور باعث شہوت کے درمیان کشتی کا نام ہے ہم ان میں سے جس کی جیت چاہتے ہیں اسے مضبوط کرتے ہیں اس کا پلڑا بھاری اور دوسرے کو کمزور کر دیا جاتا ہے تو یہاں ہم پر لازم ہے کہ دینی باعث کو مضبوط کریں اور باعثِ شہوت کو کمزور کر دیں اور اس کو کمزور کرنے کے تین طریقے ہیں۔

۱۔ ہم اس کی قوت کے مادہ کو دیکھیں اور وہ ایسی غذا ہے جو شہوت کو حرکت دیتی ہے۔

یعنی اچھی قسم کی غذا ہونے یا زیادہ ہونے کے اعتبار سے شہوت پیدا کرتی ہے تو ضروری ہے کہ روزے کے ذریعے شہوت کو ختم کیا جائے اور افطاری کے وقت بھی تھوڑا اور معمولی قسم کا کھانا کھایا جائے گوشت اور ان کھانوں سے پرہیز کیا جائے جو شہوت کو ابھارتے ہیں۔

۲۔ فی الحال اسباب کو ختم کرنا ۔ جب آدمی شہوت کے مقامات کو دیکھتا ہے تو وہ برانگیختہ ہوتی ہے کیوں کہ نظر، دل کو حرکت دیتی ہے اور دل شہوت کو متحرک کرتا ہے اور یہ فائدہ گوشہ نشینی اختیار کرنے اور شہوت پیدا کرنے والی تصاویر سے نظر کو بچانے اور مکمل طور پر ان سے علیحدگی اختیار کرنے سے حاصل ہوتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلنَّظْرَۃُ سَھْمٌ مَسْمُوْمٌ مِنْ سِھَامِ اِبْلِیْسَ۔ (۱)

نظر شیطان کے زہر آلود تیروں میں سے ایک تیر ہے۔

اور یہ وہ تیر ہے جسے شیطان ملعون پھینکتا ہے اور اس کو روکنے والی کوئی ڈھال نہیں ہوتی البتہ یہ کہ آنکھیں بند کی جائیں یا جس طرف سے تیر آ رہا ہے آدمی ادھر سے بھاگ جائے وہ صورتوں کی کمان سے یہ تیر پھینکتا ہے تو جب آدمی ان صورتوں کی جانب سے ہٹ جائے گا تو اسے یہ تیر نہیں لگے گا۔

۳۔ جس بات کی خواہش ہے اس کی جنس سے مباح چیز کے ذریعے نفس کو تسلی دے اور یہ نکاح کے ذریعے ہو سکتا ہے کیوں کہ طبیعت جس چیز کی خواہش رکھتی ہے اس کی جنس سے مباح موجود ہوتی ہے جو ممنوعات سے بے نیاز کر دیتی ہے عام لوگوں کے حق میں یہ علاج زیادہ نفع بخش ہے کیوں کہ غذا کا چھوڑنا تمام اعمال سے کمزور کر دیتا ہے پھر عام لوگوں کے

---

(۱) مجمع الزوائد جلد ۸ ص ۶۳ کتاب الادب

حق میں شہوت ختم نہیں ہوتی اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

عَلَيْكُمْ بِالْبَاءَةِ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّ الصَّوْمَ لَهٗ وِجَاءٌ۔

تم پر نکاح کرنا لازم ہے پس جس کو اس کی طاقت نہ ہو اسے روزہ رکھنا لازم ہے کیوں کہ روزہ اس کے حق میں خصی ہوتا ہے۔ (۱)

تو یہ تین اسباب ہیں پہلا علاج کھانا چھوڑنا ہے اور یہ اسی طرح ہے جس طرح سرکش جانور اور ایذا رساں کتے سے گھاس اور کھانا چھڑوا دیتے ہیں تاکہ وہ کمزور ہو اور اس کی قوت ختم ہو جائے اور دوسرا علاج کتے سے گوشت اور جانور سے جو (اس کے دانے) غائب کرنا ہے تاکہ مشاہدہ کے سبب سے اس کے اندر حرکت پیدا نہ ہو۔ اور تیسرا علاج اس تھوڑی سی چیز کے ذریعے اسے تسلی دینا ہے جس کی طرف اس کی طبیعت مائل ہو تاکہ اس میں کچھ طاقت باقی ہو جس کے ذریعے وہ تادیب پر صبر کر سکے۔

دینی باعث کی تقویت کے دو طریقے ہیں۔ پہلا یہ کہ اسے مجاہدہ کے فوائد اور اس کے دینی و دنیوی ثمرات کی لالچ دینا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ان روایات میں غور و فکر کرے جو ہم نے صبر کی فضیلت اور دنیا اور آخرت میں اس کے انجام کے سلسلے میں ذکر کی ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ مصیبت پر صبر کا ثواب فوت شدہ چیز پر صبر کے ثواب سے زیادہ ہے اور اسی وجہ سے مصیبت پر وہ قابل رشک ہوتا ہے کیوں کہ فوت ہونے والی چیز تو صرف زندگی میں اس کے پاس رہتی ہے لیکن جو کچھ حاصل ہوا وہ موت کے بعد بھی اس کے پاس رہے گا اور جو شخص خسیس چیز کے بدلے میں نفیس چیز کی بیع سلم کرتا ہے (۱) اسے خسیس چیز کے فی الحال فوت ہونے پر غمگین نہیں ہونا چاہیے۔

یہ بات معرفت سے متعلق ہے اور اس کا تعلق ایمان سے ہے وہ کبھی کمزور ہوتا ہے اور کبھی طاقت ور۔ اگر مضبوط ہو جائے تو باعثِ دینی مضبوط ہوتا ہے اور اس میں بہت جوش پیدا ہوتا ہے اور اگر وہ کمزور ہو تو باعثِ دینی کمزور ہو جاتا ہے اور ایمانی قوت کو یقین سے تعبیر کیا جاتا ہے اور وہی صبر کے ارادے کو حرکت دیتا ہے۔ اور لوگوں کو یقین اور صبر کی عزیمت کم ہی حاصل ہوتی ہے دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے آہستہ آہستہ تھوڑا تھوڑا کر کے خواہش کے باعث کو پچھاڑنے کا عادی بنائے یہاں تک کہ اسے اس (پچھاڑنے) کی کامیابی کی لذت حاصل ہو جائے اور وہ اس پر دلیر ہو جائے اور اسے پچھاڑنے کی طاقت زیادہ ہو کیونکہ سخت اعمال کا عادی ہونا اور ان کی مہارت ان قویٰ کو مضبوط کر دیتی ہے جن سے یہ اعمال صادر ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بوجھ اٹھانے والوں کاشتکاری کرنے والوں اور لڑنے والوں کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ سخت کام

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۵۸ کتاب النکاح

(۲) بیع سلم اس سودے کو کہتے ہیں جس میں رقم پہلے دی جائے اور سامان ادھار ہو ۱۲ ہزاروی

کرنے والوں کو درزیوں، عطر بیچنے والوں، فقہاء اور صالحین کے مقابلے میں زیادہ طاقت حاصل ہوتی ہے۔
پہلا علاج تو ایسا ہے جیسے کسی پچھاڑنے والے پہلوان کو غالب آنے کی صورت میں خلعت دینے کا لالچ دیا جائے اور طرح کے اعزاز کا وعدہ کیا جائے جس طرح فرعون نے جادوگروں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلے میں جیت جاؤ گے تو تمہیں مقرب بنایا جائے گا۔ اس نے کہا۔

وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ۔ (۱) اور بے شک تم اس وقت مقرب لوگوں میں سے ہو گے۔

دوسرا علاج اس بات کی طرح ہے کہ جس بچے کو پہلوان یا مجاہد بنانا ہو اسے بچپن ہی سے اس عمل کے اسباب سے متعلق کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ اس عمل سے مانوس ہو اور اس پر اسے جرأت ہو اور اس کی قوت بڑھے تو جو شخص صبر کے ساتھ مجاہدے کو مکمل طور پر چھوڑ دے اس میں باعث دینی کمزور ہو جاتا ہے اور وہ شہوت پر قابو نہیں پا سکتا اگرچہ شہوت کم ہی کیوں نہ ہو اور جو آدمی اپنے نفس کو خواہش کی مخالفت کا عادی بناتا ہے وہ جب چاہے اس پر غالب آجاتا ہے۔
تو صبر کی تمام اقسام میں علاج کا منہاج یہی ہے اور اس کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں۔ ان میں سے سب سے سخت، باطن کو نفس کی باتوں سے روکنا ہے۔
اور یہ بات اس آدمی پر گراں ہوتی ہے جو اس کے لیے فارغ رہتا ہے مثلاً وہ ظاہری طور پر خواہشات کا قلع قمع کر دیتا ہے اور گوشہ نشینی کو ترجیح دیتا ہے وہ مراقبہ، ذکر اور فکر کے لیے بیٹھ جاتا ہے تو وسوسے اسے مسلسل ایک جانب سے دوسری جانب کھینچتے ہیں اور اس بات کا علاج یہی ہے کہ تمام ظاہری و باطنی تعلقات کو توڑ دے اہل و اولاد، مال، جاہ و مرتبہ دوست احباب سب سے بھاگے پھر معمولی سی غذا لے کر ایک کونے میں بیٹھ جائے اور اسی پر قناعت کرے۔
پھر یہ سب کچھ بھی اسی وقت ہو گا جب اس کا ایک ہی مقصد ہو اور وہ اللہ تعالیٰ (تک رسائی) ہے پھر جب یہ بات دل پر غالب آجائے تو بھی اس وقت تک کفایت نہیں کرے گی جب تک وہ فکر کے میدان میں نہ جائے آسمانوں اور زمین کی سلطنتوں میں باطنی سیر نہ کرے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے عجائبات اور معرفت خداوندی کے تمام دروازوں تک نہ چلا جائے حتیٰ کہ جب یہ بات اس کے دل پر غالب آئے گی تو اس سے شیطان کی کشش اور وسوسوں میں مشغولیت دور ہو جائے گی۔
اور اگر اسے باطنی سیر حاصل نہ ہو تو نجات کا راستہ صرف یہ ہے کہ مسلسل اوراد و وظائف یعنی قرآن پاک کی قرأت، اذکار اور نمازوں میں مشغول رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے دل کی حاضری کی بھی حاجت ہو گی کیوں کہ باطنی فکر ہی دل کو مشغول رکھتا ہے ظاہری وظائف نہیں۔
پھر جب یہ سب کام کرے تو اس کے لیے تھوڑا سا وقت بچے گا کیوں کہ تمام اوقات میں کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آتا رہتا ہے

(۱) قرآن مجید، سورۂ شعراء آیت ۴۲

جو ذکر و فکر کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے مثلاً بیماری، خوف، انسانی ایذا اور ملنے والے کی نافرمانی وغیرہ کیونکہ اسے ضرور کچھ لوگ ایسے ملتے ہیں جو گناہوں کے بعض اسباب میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ مشغولیت کی ایک قسم یہ ہے (جو ذکر کی گئی)

دوسری قسم میں وہ امور شامل ہیں جو پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہیں یعنی کھانے لباس اور دیگر اسبابِ معیشت میں مشغول ہونا۔ کیوں کہ خود ان کاموں میں مشغول ہونا بھی دل کو مشغول رکھنے کا ایک ذریعہ ہے اور اگر دوسروں کو ان کاموں کا کفیل بنائے تو دل کا شغل ضرور اس پر غالب آئے گا لیکن تمام تعلقات منقطع کرنے کے بعد اکثر اوقات صحیح سالم بچتے ہیں بشرطیکہ اس دوران کوئی عارضہ پیش نہ آئے ان اوقات میں دل صاف ہوتا ہے اور اس کے لیے غور و فکر آسان ہو جاتا ہے جس کی بنیاد پر زمین و آسمان کی سلطنت میں پائے جانے والے اسرار خداوندی منکشف ہوتے ہیں جب کہ دل دنیوی تعلقات میں مشغول ہو تو ایک طویل عرصہ میں بھی ان کا سواں حصہ بھی منکشف نہیں ہوتا اور اس مقام تک عارف کا پہنچنا انتہائی درجہ تک پہنچتا ہے جو جدوجہد کے بغیر مشکل ہے۔

اور جس قدر انکشاف ہوتا ہے اور احوال و اعمال میں اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم حاصل ہوتا ہے وہ شکار کی طرح ہے اور اس کی مثال رزق جیسی ہے بعض اوقات تھوڑی سی کوشش سے بڑا شکار مل جاتا ہے اور کبھی طویل جدوجہد کے بعد معمولی حصہ ملتا ہے اس میں کوشش کا دخل نہیں ہوتا صرف کشش خداوندی پر اعتماد ہوتا ہے وہ ثقلین کے اعمال کے مقابل ہے اور یہ بندے کے اختیار میں نہیں ہے ہاں بندے کا یہ اختیار ضرور ہے کہ وہ اس کشش کے لیے تیاری کرے یعنی دل سے دنیا کی کشش کی باتوں کو نکال دے کیونکہ جسے اسفل السافلین (سب سے نچلے گڑھے) کی طرف کھینچا جاتا ہے وہ اعلیٰ علیین (بلند مقام) کی طرف نہیں جاتا۔ اور دنیا کے تمام رشتے اسی (اسفل السافلین) کی طرف کھینچتے ہیں لہٰذا ان تعلقات کو قطع کر دیا جائے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے آپ نے فرمایا۔

إِنَّ لِرَبِّكُمْ فِي أَيَّامِ دَهْرِكُمْ نَفَحَاتٍ أَلَا فَتَعَرَّضُوا لَهَا۔
بے شک تمہارے رب کے تمہارے زمانے کے لیے نفحات (جھونکے) ہیں ان کے سامنے ہو جاؤ۔

کیوں کہ ان نفحات اور جذبات الٰہیہ کے لیے کچھ آسمانی اسباب ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ۔ (۱)
اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

اور یہ (معرفت خداوندی) سب سے اعلیٰ رزق ہے اور آسمانی امور ہم سے غائب ہیں اور ہم نہیں جانتے کہ کب اللہ تعالیٰ رزق کے اسباب آسان کرتا ہے جبن تو ان اسباب کے لیے جگہ فارغ رکھنا اور نزول رحمت کے لیے منتظر رہنا ہے نیز دقت

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ الذاریات آیت ۲۲

معین کا انتظار کیا جائے جیسے کوئی شخص زمین کو ٹھیک کرتا ہے اور اسے جڑی بوٹیوں سے پاک کر کے اس میں بیج ڈالتا ہے اور ان سب کے لیے بارش کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بارش کے اسباب کے لیے کون سا وقت مقرر کر رکھا ہے لیکن چوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحمت کی امید رکھتا ہے کہ کوئی بھی سال بارش سے خالی نہیں ہوتا اسی طرح کوئی بھی سال یا مہینہ یا دن اللہ تعالیٰ کشش و جذب رحمانی سے خالی نہیں ہوتا تو بندے کو چاہیئے کہ وہ شہوتوں کی جڑی بوٹیوں سے دل کو پاک کرے اور اس میں ارادت و اخلاص کا بیج بو کر رحمت کی ہواؤں کے لئے پیش کر دے جس طرح موسم بہار میں بارش کی قوی انتظار ہوتی ہے اور بادل ظاہر ہوں تو بارش کا برسنا یقینی ہوتا ہے اسی طرح اوقاتِ شریفہ میں اور جب ہمت اور قلوب کی مدد شامل ہو تو رحمت کی امید زیادہ ہوتی ہے مثلاً عرفہ کے دن، جمعۃ المبارک میں اور رمضان المبارک کے دنوں میں قبولیت کی زیادہ توقع ہوتی ہے۔

کیوں کہ ہمتیں اور انفاس (سانس) اللہ تعالیٰ کے حکم سے نزول رحمت کے اسباب ہیں حتیٰ کہ ان کے طفیل قحط سالی میں بھی بارش برس جاتی ہے اور مکاشفات اور لطائفِ معارف جو ملکوت کے خزانوں میں سے ہیں ان کو پانی کے قطرات سے زیادہ مناسبت ہے جب پہاڑوں اور سمندروں کے کناروں سے بادل اٹھتے ہیں بلکہ احوال اور مکاشفات تو تیرے پاس دل میں حاضر ہیں لیکن تو خواہشات وغیرہ کے ذریعے ان سے رُوگرداں ہے اور یہ بات تمہارے اور ان مکاشفات کے درمیان حجاب ہے پس تم اس بات کے محتاج ہو کہ شہوت کو توڑو اور پردہ اٹھاؤ تو دل کے اندر سے انوارِ معارف روشن ہوتے ہیں زمین کو کھود کر اس سے پانی نکالنا دُور سے اور بالخصوص پست جگہ سے لانے کی نسبت زیادہ آسان ہے۔

اور چوں کہ معارف ایمانی دل میں موجود ہوتے ہیں اور کسی مشغولیت کی نسبت بھولے ہوتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے تمام ایمانی معارف کو تذکر (یاد) سے تعبیر کیا ہے ارشاد خداوندی ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ۔ (۱) بے شک ہم نے ذکر اتارا اور بے شک ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اور ارشاد فرمایا۔

وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ۔ (۲) اور چاہیے کہ عقلمند لوگ نصیحت حاصل کریں۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ اور ہم نے ذکر کے لیے قرآن پاک کو آسان کیا تو کیا کوئی ہے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ حجر آیت ۹

(۲) قرآن مجید، سورۂ ابراہیم آیت ۵۲

مِنْ مُدَّكِرٍ۔ (۱)   جو یاد کرے۔

تو وسوسوں اور قلبی مشاغل سے صبر کا یہ علاج ہے اور یہ صبر کا آخری درجہ ہے اور تمام قلبی رکاوٹوں سے صبر دل کے خیالات سے صبر کے مقابلے میں مقدم ہے حضرت جنید رحمہ اللہ فرماتے ہیں دنیا سے آخرت کی سیر مومن کے لیے آسان ہے اور حق کی محبت میں مخلوق کو چھوڑنا مشکل ہے نفس سے اللہ تعالیٰ کی طرف جانا سخت مشکل ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صبر اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔

تو آپ نے پہلے قلبی مشاغل سے صبر کی شدت کا ذکر کیا پھر مخلوق کو چھوڑنے کی شدت بیان فرمائی اور نفس پر سب سے زیادہ سخت رکاوٹ مخلوق سے تعلق اور جاہ و مرتبہ کی محبت ہے کیوں کہ ریاست و حکومت کی لذت، غلبہ، بلندی کی طلب اور دوسروں کو اپنا متبع بنانا عقل مند لوگوں کے نفسوں پر سب سے زیادہ غالب آنے والی لذت ہے اور کیسے یہ سب سے زیادہ غالب لذت نہ ہوگی جب کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی ایک صفت یعنی ربوبیت مطلوب ہوتی ہے اور ربوبیت فطری طور پر دل کو محبوب اور مطلوب ہوتی ہے کیوں کہ اس میں امورِ ربوبیت سے مناسبت ہوتی ہے اسی سلسلے میں ارشاد خداوندی ہے۔

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔ (۱)   آپ فرما دیجئے کہ رُوح میرے رب کے حکم سے ہے۔

اور اس (ربوبیت) کی محبت پر دل قابلِ مذمت نہیں ہے بلکہ مذمت تو اس غلط طریقے کی ہے جو شیطانی دھوکے کی وجہ سے واقع ہوتی ہے اور وہ اسے عالم امر سے دُور کر دیتا ہے کیوں کہ وہ اسی وجہ سے حسد کرتا ہے کہ یہ دل عالم امر سے ہے پس وہ اسے گمراہ کرتا اور بھٹکاتا ہے اور طلب ربوبیت کیسے قابل مذمت ہوگی یہ تو اخروی سعادت کی طلب ہے کیوں کہ اس کا مطلب ایسی بقا کی طلب ہے جس میں فنا نہ ہو ایسی عزت جس میں ذلت نہ ہو، امن جس میں خوف نہ ہو، غنا جس میں فقر نہ ہو اور ایسا کمال جس میں نقصان نہ ہو۔ ـــــ اور یہ تمام باتیں ربوبیت کے اوصاف میں سے ہیں اور ان اوصاف کی طلب ممنوع نہیں ہے بلکہ ہر شخص کا حق ہے کہ وہ ایسی بادشاہی طلب کرے جس کی انتہا نہ ہو اور جو آدمی بادشاہی کا طالب ہوتا ہے وہ بلندی، عزت اور کمال کی طلب ضرور کرتا ہے لیکن حکومت دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ جو طرح طرح کی تکلیفوں سے بھرپور ہوتی ہے اور جلد ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کا حصول فوری ہوتا ہے اور یہ دنیا میں ہے۔ اور دوسری حکومت یا سلطنت دائمی ہے اس میں کوئی تکلیف یا کدورت نہیں ہے اور نہ ہی اسے کوئی چیز ختم کر سکتی لیکن وہ فوری طور پر حاصل نہیں ہوتی اور انسان کی فطرت میں عجلت رکھی گئی ہے وہ فوری ملنے والی چیز میں رغبت رکھتا ہے لہٰذا شیطان آکر اسے اس جلدی کے واسطے سے جو اس کی فطرت میں ہے، گمراہ کر دیتا ہے اور موجودہ سلطنت کو اس کے لیے مزین کر دیتا ہے اور اس کی بیوقوفی

---

(۱) قرآن مجید سورۃ القمر آیت ۱۷

(۲) قرآن مجید، سورۃ اسراء آیت ۸۵

کی وجہ سے اسے آخرت کے سلسلے میں دھوکہ دیتا ہے اور دنیوی بادشاہت کے ساتھ ساتھ اُخروی سلطنت کی توقع بھی اس کے دل میں ڈال دیتا ہے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

وَالْاَحْمَقُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ الْاَمَانِیَّ۔

اور بیوقوف وہ ہے جو اپنے نفس کو اس کی خواہش کے پیچھے لے جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر امیدیں رکھتا ہے۔

تو توفیق سے محروم شخص اس کے دھوکے میں پڑ کر بقدر امکان دنیوی عزت اور حکومت کی طلب میں مشغول ہو جاتا ہے اور جس کو توفیق کی دولت نصیب ہوتی ہے وہ اس کے دھوکے کے جال میں نہیں پھنستا کیوں کہ وہ اس (شیطان لعین) کی گھاتوں سے خوب واقف ہے اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے لوگوں کا حال یوں بیان فرمایا۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ۔ (۱)

ہرگز نہیں! بلکہ تم فوری نفع کو پسند کرتے اور آخرت کو چھوڑتے ہو۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ هٰۤؤُلَاۤءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَیَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ یَوْمًا ثَقِیْلًا۔ (۲)

بے شک یہ لوگ فوری نفع کو پسند کرتے ہیں اور بھاری دن کو اپنے پیچھے چھوڑتے ہیں۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ۔ (۳)

پس ان لوگوں سے منہ پھیر لیں جو ہمارے ذکر سے پھر جاتے ہیں اور صرف دنیا کا ارادہ کرتے ہیں ان کے علم کی پہنچ یہی ہے۔

اور جب شیطان کا مکر تمام مخلوق میں پھیل گیا تو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی طرف فرشتوں کو بھیجا اور ان کو بتایا گیا کہ دشمن مخلوق کو کس طرح ہلاک کرتا اور گمراہ کرتا ہے تو وہ مخلوق کو حقیقی سلطنت کی طرف بلانے اور مجازی حکومت کو چھوڑنے کی دعوت دینے لگے اور بتایا کہ دنیا فانی اور بے اصل ہے اس کے لیے دوام نہیں ہے تو انہوں نے یوں دعوت دی۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ

اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکلو تو تم زمین سے لگ جاتے

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ القیامۃ آیت ۲۰

(۲) قرآن مجید، سورۃ الدھر آیت ۲۷

(۳) قرآن مجید، سورۃ النجم آیت ۲۹، ۳۰

اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیَاۃِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَۃِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیْلٌ ۔ (۱)

ہو گیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے پس دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلے میں تھوڑا ہے ۔"

پس تورات، انجیل، زبور، قرآن پاک اور حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے صحیفے اور ہر وہ کتاب جو اتاری گئی ان سب کے اتارنے کا مقصد مخلوق کو ہمیشہ رہنے والی بادشاہی کی طرف دعوت دینا تھا مقصود یہی ہے کہ اس دنیا میں بھی بادشاہ رہیں اور آخرت میں بھی، دنیوی بادشاہی سے مراد اس میں زہد اختیار کرنا اور تھوڑے مال پر قناعت کرنا ہے اور آخرت کی بادشاہی اللہ تعالیٰ کے قرب کی وجہ سے ایسے بقا کا حصول ہے جس میں فنا نہ ہو اور ایسی عزت حاصل کرنا ہے جس میں ذلت نہ ہو اور آنکھوں کی ایسی ٹھنڈک جو اس عالم میں مخفی ہے کوئی بھی نفس اس کا علم نہیں رکھتا۔ شیطان دنیوی بادشاہی کی طرف بلاتا ہے کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ اس طرح وہ آخرت کی بادشاہی سے محروم ہوگا۔ اس لیے کہ دنیا اور آخرت دو سوتنیں ہیں اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ دنیا بھی اس کے پاس باقی نہیں رہے گی اگر دنیا باقی رہتی تو شیطان اس سے اس پر بھی حسد کرتا لیکن دنیا کی سلطنت جھگڑوں، خرابیوں اور تدبیروں کے سلسلے میں طویل پریشانیوں کی جگہ ہے تمام اسباب جاہ د مرتبہ کا یہی حال ہے پھر جب اسباب مکمل ہوتے ہیں اور سلامتی حاصل ہوتی ہے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے ارشاد خداوندی ہے ۔

حَتّٰی اِذَا اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَا اَنَّهُمْ قَادِرُوْنَ عَلَيْهَا اَتَاهَا اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ۔ (۲)

یہاں تک کہ جب زمین نے اپنا سنگھار لے لیا اور وہ مزین ہو گئی اور اس کے رہنے والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر قادر ہیں تو اس کے پاس ہمارا حکم رات یا دن کو آیا تو ہم نے اسے کٹی ہوئی کھیتی کی طرح کر دیا گویا کل وہ تھی ہی نہیں۔

تو اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے مثال بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ اَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا

اور ان کے لیے دنیوی زندگی کی مثال بیان کیجئے کہ یہ اس پانی کی طرح ہے جسے ہم نے آسمان سے اتارا پس اس سے زمین کی سبزی مل گئی پس وہ چورہ چورہ ہو گئی جسے ہوائیں

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ توبہ

(۲) قرآن مجید، سورۂ یونس آیت ۲۴

تَذْرُوْہُ الرِّیَاحُ۔ (۱) اڑاتی ہیں۔

اور دنیا میں زہد جب، موجودہ سلطنت ہے تو اس پر بھی شیطان نے حسد کیا اور اس سے انسان کو رد کا اور زہد کا معنیٰ یہ ہے کہ بندہ اپنی خواہش اور غصے کو قابو میں رکھے اور یہ دونوں دینی باعث اور اشارۂ ایمان کے سامنے جھک جائیں۔ اور حقیقتاً بادشاہی یہی ہے کیوں کہ اس طرح آدمی آزاد ہوتا ہے اور جب اس پر شہوت کا غلبہ ہو تو وہ اپنی شرمگاہ پیٹ اور تمام اغراض کا غلام ہوتا ہے وہ جانوروں کی طرح مسخر ہوتا ہے اور مملوک ہوتا ہے جسے شہوت کی لگام کھینچتی ہے اور اس نے اسے گلے سے پکڑا ہوا ہوتا ہے اور وہ جہاں چاہتی ہے اسے لے جاتی ہے تو انسان کا دھوکہ کتنا بڑا ہے جب وہ شہوت کا غلام بن کر اپنے آپ کو مالک خیال کرتا ہے اور غلامی کو ربوبیت (مالکیت) تصور کرتا ہے تو اس قسم کا آدمی دنیا میں بھی الٹا چلتا ہے اور آخرت میں بھی اوندھا ہوگا اسی لیے کسی بادشاہ نے کسی زاہد سے کہا کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟ انہوں نے فرمایا میں تم سے حاجت کا سوال کیسے کروں جب کہ میری حکومت تمہاری سلطنت سے بڑی ہے اس نے پوچھا وہ کیسے؟ انہوں نے فرمایا تم جس کے غلام ہو وہ میرا غلام ہے اس نے پوچھا وہ کیسے؟ فرمایا تم شہوت، غضب، شرمگاہ اور پیٹ کے غلام ہو اور میں ان تمام کا مالک ہوں تو یہ سب میرے غلام ہیں تو یہ دنیوی بادشاہی ہے جو اخروی بادشاہی کی طرف لے جاتی ہے پس جو لوگ شیطان کی دھوکہ دہی سے دھوکے میں ہیں وہ دنیا اور آخرت میں نقصان میں ہیں اور جن لوگوں کو صراطِ مستقیم پر سختی سے کار بند ہونے کی توفیق دی گئی وہ دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں کامیاب ہوئے اب جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ بادشاہی اور ربوبیت کا کیا مفہوم ہے نیز تسخیر اور غلامی کا کیا مطلب ہے اور اس میں غلطی کہاں واقع ہوتی ہے۔

نیز شیطان کس طرح اندھا کرتا اور دھوکہ دیتا ہے تو انسان کے لیے دنیوی سلطنت اور جاہ و مرتبے سے نکلنا اس سے اعراض کرنا اور اس کے فوت ہونے پر صبر کرنا آسان ہو گیا کیوں کہ وہ فوری حکومت کے چھوڑنے پر صبر کر کے آخرت میں ملنے والی حکومت کی امید رکھتا ہے۔

جس آدمی کو پہلے جاہ و مرتبہ سے انس ہو اور عادتاً اس کے اسباب سے تعلق مضبوط ہو جائے تو اسے علاج کے سلسلے میں محض علم اور کشف کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ساتھ عمل کو بھی ملائے اور اس کا عمل تین امور میں ہوتا ہے۔

۱۔ جاہ و مرتبہ کی جگہ سے بھاگے تاکہ اس کے اسباب کا مشاہدہ نہ کرے کیوں کہ اسباب کے ساتھ صبر کرنا مشکل ہو جاتا ہے جیسے وہ شخص جس پر شہوت کا غلبہ ہو وہ شہوت کو حرکت دینے والی تصاویر کے مشاہدہ سے بھاگتا ہے اور جس نے ایسا نہ کیا اس نے اللہ تعالیٰ کی زمین میں اس کی نعمت کی ناشکری کی ارشاد خداوندی ہے۔

اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰہِ وَاسِعَۃً فَتُھَاجِرُوْا کیا اللہ تعالیٰ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت

فِيهَا۔ (۱) کرتے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے نفس کو ان اعمال کا مکلف بنائے جو اس کی عادت کے خلاف ہیں پس تکلف کو عادت بنا دے تکلف کا لباس چھوڑ کر تواضع کا لباس اختیار کرے اسی طرح ہر صورت، حالت، فعل، رہائش، لباس، کھانے، اٹھنے بیٹھنے کے سلسلے میں جاہ و مرتبہ کے اعتبار سے جو عادت تھی اسے بدل ڈالے اور اسے چاہیئے کہ ان چیزوں کو ختم کر دے حتیٰ کہ جو باتیں پہلے بطور عادت پکی ہو چکی تھیں اب ان کے خلاف نئے امور عادت بن جائیں تو اسے علاج بالضد کہتے ہیں۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں نرمی اور تدریج کو ملحوظ رکھے اور یکدم انتہائی درجہ کی ذلت اختیار کرے کیوں کہ انسانی طبیعت میں نفرت و وحشت بھی ہوتی ہے اور وہ عادات کو تدریج سے ہی بدل سکتا ہے۔ پس بعض عادات کو چھوڑ دے اور بعض کے ذریعے نفس کو تسلی دے۔ پھر جب اس کا نفس ابتدائی طور پر ان بعض کے چھوڑنے پر قناعت کر لے تو ان میں سے بھی بعض کو چھوڑ دے یہاں تک کہ باقی عادات پر قناعت کرے اسی طرح کرتا رہے یہاں تک کہ وہ عادات جو اس میں جم چکی تھیں ان کا قلع قمع ہو جائے اسی تدریج کی طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں اشارہ ہے آپ نے فرمایا۔

إِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ مَتِيْنٌ فَأَوْغِلْ فِيْهِ بِرِفْقٍ وَلَا تُبَغِّضْ إِلَى نَفْسِكَ عِبَادَةَ اللّٰهِ فَإِنَّ الْمُنْبَتَّ لَا أَرْضًا قَطَعَ وَلَا ظَهْرًا أَبْقَى۔

بے شک یہ دین مضبوط ہے اس میں نرمی سے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے متنفر نہ کرو۔ (۲)

اور اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

لَا تُشَادُّوْا هٰذَا الدِّيْنَ فَإِنَّ مَنْ يُشَادِّهٖ يَغْلِبُهٗ۔ (۳)

اس دین کا مقابلہ نہ کرو جو کوئی اس کا مقابلہ کرے گا اس پر یہ غالب آجائے گا۔

تو ہم نے وسوسوں، شہوت اور جاہ و مرتبہ سے صبر کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اسے طرق مجاہدہ کے ان قوانین سے ملا لو جن کا ذکر ہم نے ریاضت نفس کے بیان میں کیا ہے اسے بنا دستور بنا لو تاکہ تمہیں ان تمام اقسام میں جن کا ہم نے ذکر کیا صبر کا علاج معلوم ہو جائے۔ ایک ایک بات کو تفصیل سے بیان کرنا طویل بات ہے اور جو آدمی تدریج کا خیال رکھتا ہے صبر اسے ایسے مقام تک پہنچائے گا کہ اب اس کے لیے صبر چھوڑنا مشکل ہو جائے گا جیسے پہلے صبر کرنا مشکل تھا تو معاملہ

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ نساء آیت ۹۷

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۱۹۹ مرویات انس

(۳) التمہید لابن عبد البر جلد اول ص ۱۹۵

پہلے کے برعکس ہو جائے گا اور وہ چیز جو پہلے محبوب تھی اب ناپسند ہو گی اور جو ناپسند تھی اب خوشگوار ہو جائے گی اور وہ اس سے صبر نہیں کر سکے گا اور یہ بات تجربے اور ذوق کے بغیر معلوم نہیں ہوتی اور عرف و عادت میں اس کی مثالیں ہیں مثلاً بچے کو ابتداً علم کے حصول پر مجبور کیا جاتا ہے اور اس کے لیے کھیل کو چھوڑنے اور علم حاصل کرنے پر صبر کرنا مشکل ہوتا ہے یہاں تک کہ جب اس کی بصیرت کھل جاتی ہے اور وہ علم سے مانوس ہو جاتا ہے تو معاملہ بدل جاتا ہے اب علم سے کنارہ کشی اور کھیل کود میں مشغولیت پر صبر کرنا مشکل ہو جاتا ہے بعض عارفین کی یہ حکایت اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ایک عارف نے حضرت شبلی رحمہ اللہ سے صبر کے بارے میں پوچھا کہ کونسا صبر زیادہ سخت ہے انہوں نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں صبر کرنا اس عارف نے کہا نہیں آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے لیے صبر کرنا اس نے کہا یہ بھی نہیں فرمایا اللہ تعالیٰ کے ساتھ صبر کرنا اس نے کہا نہیں آپ نے فرمایا پھر کونسا صبر زیادہ سخت ہے؟ اس نے کہا اللہ تعالیٰ سے صبر کرنا اس پر حضرت شبلی رحمہ اللہ نے ایک چیخ ماری قریب تھا کہ آپ کی روح پرواز کر جاتی۔

ارشاد خداوندی ہے۔

اِصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ (۱) صبر کرو اور صبر میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت کرو۔

اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں صبر کرو اللہ تعالیٰ کے ساتھ صبر کرو اور اس کے ساتھ رابطہ اور تعلق رکھو اور کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے صبر مالداری ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ صبر وفا ہے اور اس سے صبر جفا (ظلم) ہے اور اس کے معنیٰ کے سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے۔

وَالصَّبْرُ عَنْكَ فَمَذْمُوْمٌ عَوَاقِبُهٗ وَالصَّبْرُ فِي الْاَشْيَاءِ مَحْمُوْدٌ۔ (اے اللہ!) تجھ سے صبر کا انجام مذموم ہے اور (دنیوی) اشیاء میں صبر محمود ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے۔

اَلصَّبْرُ يُجْمَلُ فِي الْمَوَاطِنِ كُلِّهَا اِلَّا عَلَيْكَ فَاِنَّهٗ لَا يُجْمَلُ۔ صبر تمام مقامات پر اچھا ہے لیکن تجھ سے صبر اچھا نہیں ہے۔

صبر کے علوم اور اسرار کے سلسلے میں ہماری تشریح کا یہ آخر ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۲۰۰

دوسرا حصہ:

شکر کا بیان

ارکانِ شکر:

شکر کے تین ارکان ہیں۔

(۱) شکر کی فضیلت وحقیقت اور اقسام واحکام۔

(۲) نعمت کی حقیقت اور اس کی خاص وعام اقسام۔

(۳) شکر اور صبر میں سے افضل کونسی چیز ہے۔

پہلا رکن:

نفسِ شکر

شکر کی فضیلت

جان لو! اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں شکر کو ذکر کے ساتھ ملایا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا۔

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ (۱)

اور البتہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت بڑا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ۔ (۲)

پس مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ۔ (۳)

اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِينَ۔ (۴)

اور عنقریب ہم شکر کرنے والوں کو بدلہ دیں گے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ عنکبوت آیت ۴۵

(۲) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۱۵۲

(۳) قرآن مجید، سورۂ نساء آیت ۱۴۷

(۴) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۱۴۵

اور اللہ تعالیٰ نے ابلیس لعین کے بارے میں خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ (۱) (شیطان نے کہا) میں ضرور بضرور ان کے لیے تیرے سیدھے راستے پر بیٹھوں گا۔

کہا گیا ہے کہ اس سے شکر کا راستہ مراد ہے اور رتبۂ شکر کی بلندی کی وجہ سے اس لعین پر طعن کیا گیا شیطان نے کہا (اللہ تعالیٰ اس کا قول نقل کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے)

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ۔ (۲) اور تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہیں پائے گا۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ (۳) اور میرے بندوں میں سے شکر کرنے والے کم ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے مزید نعمت کے حصول کو شکر کے ساتھ قطعی طور پر بیان کیا اور اس میں استثناء نہیں کی۔ ارشاد فرمایا۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ۔ (۴) اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمہیں زیادہ دیں گے۔

حالانکہ پانچ دوسری نعمتوں کو استثناء (اگر چاہے) کے ساتھ بیان فرمایا۔ مالدار کرنے، دعا قبول کرنے، رزق، مغفرت اور توبہ میں استثناء فرمائی ارشاد خداوندی ہے۔

فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ اِنْ شَاءَ۔ (۵) پس عنقریب وہ تمہیں اپنے فضل سے مالدار کر دے گا اگر چاہے۔

اور ارشاد فرمایا:

فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَاءَ۔ (۶) پس وہ تم سے اس چیز کو دور کر دے گا جس کے لیے تم اسے پکارتے ہو۔

اور ارشاد فرمایا۔

يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (۷) جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق عطا فرماتا ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ اعراف آیت ۱۶
(۲) قرآن مجید، سورۂ اعراف آیت ۱۷
(۳) قرآن مجید، سورۂ سباء آیت ۱۳
(۴) قرآن مجید، سورۂ ابراہیم آیت ۷
(۵) قرآن مجید، سورۂ توبہ آیت ۲۸
(۶) قرآن مجید، سورۂ انعام آیت ۴۱ (۷) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۲۱۲

اور ارشاد خداوندی ہے:

وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ۔ (۱) اور اس (شرک) کے علاوہ جس کے لیے چاہتا ہے بخش دیتا ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَیَتُوْبُ اللّٰہُ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ۔ (۲) اور اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہے توبہ قبول کرتا ہے۔

اور شکر اللہ تعالیٰ کے اخلاق میں سے ایک خلق ہے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ۔ (۳) اور اللہ تعالیٰ شکر کا بدلہ دینے والا بردبار ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شکر کو اہل جنت کا ابتدائی کلام قرار دیا ارشاد فرمایا۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَہٗ۔ (۴) اور وہ کہیں گے اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا۔

اور فرمایا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَاھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ (۵) اور ان کا آخری قول یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جو تمام جہانوں کو پالنے والا ہے۔

احادیث مبارکہ:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَلطَّاعِمُ الشَّاکِرُ بِمَنْزِلَۃِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ۔ (۶) کھانا کھا کر شکر ادا کرنے والا صبر کرنے والے روزہ دار کی طرح ہے۔

حضرت عطا رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے سب سے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ نساء آیت ۴۸

(۲) قرآن مجید، سورۂ توبہ آیت ۱۵

(۳) قرآن مجید، سورۂ تغابن آیت ۱۷

(۴) قرآن مجید، سورۂ زمر آیت ۷۴

(۵) قرآن مجید، سورۂ یونس آیت ۱۰

(۶) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۳۴۳ مرویات سنان بن سنہ

تعجب خیز بتائیے جو آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دیکھی ہو اس پر ام المومنین رو پڑیں اور فرمایا آپ کی کونسی بات عجیب نہ تھی؟ آپ ایک رات تشریف لائے اور میرے ساتھ میرے بچھونے میں یا (فرمایا) میرے لحاف میں داخل ہوئے حتی کہ میرا جسم آپ کے جسم سے مل گیا پھر فرمایا اے ابوبکر کی بیٹی! (رضی اللہ عنہما) مجھے اجازت دو کہ میں اپنے رب کی عبادت کروں فرماتی ہیں میں نے عرض کیا میں آپ کا قرب پسند کرتی ہوں لیکن آپ کی خواہش کو ترجیح دیتی ہوں چنانچہ ام المومنین نے آپ کو اجازت دے دی پھر آپ پانی کے ایک مشکیزے کی طرف اٹھے اور وضو فرمایا لیکن زیادہ پانی نہیں ڈالا پھر کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی اس کے بعد آپ رونے لگے حتی کہ آپ کے آنسو سینہ مبارکہ پر بہنے لگے پھر رکوع کیا اور روتے رہے پھر سجدہ کیا اور روتے رہے سجدے سے سر اٹھایا تو روتے ہوئے، آپ اسی طرح مسلسل روتے رہے حتی کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حاضر ہو کر آپ کو نماز کی اطلاع کی میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! صلی اللہ علیک وسلم آپ کیوں روتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اوّل و آخر خلاف اولیٰ باتوں سے بھی محفوظ رکھا۔

آپ نے فرمایا کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں اور میں ایسا کیوں نہ کروں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل فرمایا (۱)

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۔ (۲)

بے شک آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے اور کشتی جو دریا میں لوگوں کے فائدے کے لیے چلتی ہے اور جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسا کر اس سے مردہ زمین کو زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کی گردش اور بادل جو آسمان و زمین کے درمیان قابو میں ہیں اس میں عقل مند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

یہ اس بات پر دلالت ہے کہ رونا کبھی ختم نہیں ہونا چاہیئے اور اس روایت میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک نبی علیہ السلام کسی پتھر کے پاس سے گزرے جس سے بہت سا پانی نکلتا تھا تو آپ اس سے متعجب ہوئے اس پر اللہ تعالیٰ نے اسے قوتِ گویائی عطا فرمائی تو اس نے کہا میں نے جب سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا ہے۔

وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۔ (۳)

اس (جہنم) کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

میں اس کے خوف سے رو رہا ہوں انہوں نے دعا مانگی کہ یا اللہ! اس کو جہنم سے بچالے تو اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ فرمایا۔

---

(۱) الترغیب والترہیب جلد ۲ ص ۲۳۷ کتاب قراۃ القرآن

(۲) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۱۶۴

(۳) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۲۴

پھر ایک مدت کے بعد اسی حالت میں دیکھا تو پوچھا۔ کیوں روتے ہو؟ اس نے کہا وہ خوف کا رونا تھا اور یہ شکر اور خوشی کا رونا ہے اور بندے کا دل پتھر کی طرح ہے یا اس سے بھی زیادہ سخت اور جب تک وہ خوف اور شکر دونوں حالتوں میں نہ روئے اس کی سختی زائل نہیں ہوتی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ نے ارشاد فرمایا۔

يُنَادِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لِيَقُمِ الْحَمَّادُوْنَ فَتَقُوْمُ زُمْرَةٌ فَيُنْصَبُ لَهُمْ لِوَاءٌ فَيَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قِيلَ وَمَنِ الْحَمَّادُوْنَ؟ قَالَ "الَّذِيْنَ يَشْكُرُوْنَ اللّٰهَ تَعَالٰى عَلٰى كُلِّ حَالٍ" وَفِي لَفْظٍ آخَر "الَّذِيْنَ يَشْكُرُوْنَ اللّٰهَ عَلَى السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ۔ (۱)

قیامت کے دن آواز دی جائے گی کہ حمادون (تعریف کرنے والے) کھڑے ہو جائیں تو ایک جماعت کھڑی ہو گی ان کے لیے جھنڈا قائم کیا جائے گا تو وہ جنت میں جائیں گے پوچھا گیا حمادون کون ہیں؟ فرمایا وہ لوگ جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور دوسری روایت میں ہے وہ لوگ جو خوشی اور سختی دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلْحَمْدُ رِدَاءُ الرَّحْمٰنِ۔ (۲)

حمد، رحمٰن کی چادر ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ میں اپنے دوستوں کے عمل کا بدلہ یوں دیتا ہوں کہ ان کی شکر کرنے پر راضی ہوتا ہوں (طویل گفتگو میں سے ایک حصہ ہے) اور اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کی صفت کے ضمن میں وحی فرمائی کہ ان کا گھر سلامتی کا گھر ہے جب وہ اس میں داخل ہوں گے تو میں ان کے دل میں شکر کا خیال ڈالوں گا اور وہ بہترین کلام ہے اور شکر کرنے پر انہیں زیادہ دوں گا اور وہ جس قدر زیادہ شکر کریں گے زیادہ دوں گا اور جب دفن شدہ خزانوں کے بارے میں حکم نازل ہوا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ہم کونسا مال حاصل کریں؟ تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لِيَتَّخِذْ اَحَدُكُمْ لِسَانًا ذَاكِرًا وَّقَلْبًا شَاكِرًا۔ (۳)

چاہیے کہ ذکر کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل اختیار کرو۔

تو آپ نے مال کے بدلے شکر کرنے والے دل کے حصول کا حکم دیا اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا "شکر نصفِ ایمان ہے"

---

(۱) شعب الایمان جلد ۴ ص ۱۰۹ حدیث ۴۳۷۴

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۴۱۲ مرویات ابوہریرہ

(۳) المطالب العالیہ جلد ۳ ص ۱۴۱ حدیث ۳۱۰۲

فصل :

شکر کی تعریف اور حقیقت

جان لو! شکر، سالکین کے مقامات میں سے ایک مقام ہے اور اس میں بھی علم، حال اور عمل شامل ہیں علم اصل ہے جو حال کو جنم دیتا ہے اور حال سے عمل پیدا ہوتا ہے علم کا مطلب یہ ہے کہ نعمت کو منعم کی طرف سے سمجھا جائے حال انعامات سے حاصل ہونے والی خوشی کا نام ہے اور عمل اس بات پر قائم ہونے کا نام ہے جو مُنعِم کا مقصود و محبوب ہے اور اس عمل کا تعلق دل، اعضاء اور زبان سے ہوتا ہے اور ان تمام کا بیان ضروری ہے تاکہ اس کے مجموعہ سے شکر کی حقیقت کا احاطہ حاصل ہو کیونکہ شکر کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس کے معانی کے کمال کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔

پہلا اصل یعنی علم تین امور کے علم پر مشتمل ہے ذات نعمت کا علم ہو، اس کے حق میں یہ نعمت کیوں ہے؟ اور منعم کی ذات کا علم ـــــ اور اس کی ان صفات کا علم جن کے ساتھ انعام کی تکمیل ہوتی ہے اور اس کی طرف سے اسے انعام ملتا ہے کیوں کہ نعمت، نعمت عطا کرنے والے اور جس کو نعمت دی گئی ان تینوں کا ہونا ضروری ہے جس کو نعمت ملتی ہے نعمت عطا کرنے والی ذات کے قصد و ارادے سے ملتی ہے۔ تو ان امور کی معرفت ضروری ہے یہ تو اللہ تعالیٰ کے غیر کے حق میں ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے حق کا تعلق ہے تو اس کی تکمیل کے لیے اس بات کی پہچان بھی ضروری ہے کہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں اور وہی مُنعِم (حقیقی) ہے اور وسائل اس کی طرف سے مسخر ہیں اور یہ معرفت توحید و تقدیس (خداوندی) کے بعد ہے کیوں کہ تقدیس و توحید کا بھی ان میں دخل ہے بلکہ معارف ایمان میں پہلا مرتبہ تقدیس کا ہے پھر جب اس مقدس ذات کی پہچان حاصل ہو جائے اور وہ اس بات کو جان لے کہ (حقیقتاً) تقدیس کے لائق وہی ذات ہے اس کے علاوہ کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہے اور یہی توحید ہے اس کے بعد سے جاننا چاہیئے کہ اس عالم میں جو کچھ موجود ہے وہ فقط اسی ذات واحد کی طرف سے ہے، تو سب کچھ اسی کی طرف سے ملنے والا انعام ہے پس یہ معرفت تیسرے مرتبہ میں حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ اس درجہ میں توحید و تقدیس کے ساتھ کمالِ قدرت اور عمل کی انفرادیت بھی پائی جاتی ہے۔ اسی بات کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا۔

مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللّٰهِ فَلَهُ عَشْرُ حَسَنَاتٍ وَمَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَلَهُ عِشْرُوْنَ حَسَنَةً وَمَنْ قَالَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ فَلَهُ ثَلَاثُوْنَ حَسَنَةً۔ (۱)

جس نے "سبحان اللہ" پڑھا اس کے لیے دس نیکیاں ہیں جس نے "لا الٰہ الا اللہ" پڑھا اس کے لیے بیس نیکیاں ہیں اور جس نے "الحمد للہ" پڑھا اس کے لیے تیس نیکیاں ہیں۔

---

(۱) الترغیب والترہیب جلد ۲ ص ۲۷۹ کتاب الذکر

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَفْضَلُ الدُّعَاءِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ (۱)

سب سے بہتر ذکر "لا الہ الا اللہ" ہے اور افضل دعا "الحمد للہ" ہے۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

لَيْسَ شَيْءٌ مِنَ الْأَذْكَارِ يُضَاعِفُ مَا يُضَاعِفُ الْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ (۲)

اذکار میں سے "الحمد للہ" (کا پڑھنا) جس قدر ثواب کو بڑھاتا ہے کوئی دوسرا ذکر نہیں بڑھاتا۔

تمہیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ محض زبان کو حرکت دے کر یہ کلمات پڑھنا کافی ہے اور دل میں ان کے معانی کا حصول ضروری نہیں ہے "سبحان اللہ" ایسا کلمہ ہے جو تقدیس پر دلالت کرتا ہے "لا الہ الا اللہ" توحید پر دلالت کرتا ہے اور "الحمد للہ" اس بات کی معرفت پر دلالت کرتا ہے کہ نعمت واحد حق ذات کی طرف سے حاصل ہوئی ہے تو نیکیوں کا حصول ان معارف کے مقابلے میں ہوتا ہے جو ایمان اور یقین کے ابواب سے ہیں۔ اس معرفت کی تکمیل افعال میں شرک کی نفی کرتی ہے کیوں کہ جس شخص پر کوئی بادشاہ انعام کرے پس اگر وہ اس کے وزیر یا وکیل کا بھی اس میں دخل سمجھے تو یہ نعمت میں اس کے ساتھ شرک ہے وہ مکمل طور پر بادشاہ کی طرف سے نہیں سمجھتا بلکہ کچھ بادشاہ کی طرف سے اور کچھ وزیر وغیرہ کی طرف سے سمجھتا ہے اس لیے اس کی خوشی بھی ان دونوں پر تقسیم ہو جاتی ہے تو وہ صرف بادشاہ کا حق جاننے والا نہیں ہوتا۔ ہاں اگر یہ سمجھے کہ مجھے جو نعمت ملی ہے وہ بادشاہ کے دستخط سے مجھ تک پہنچی ہے تو اس سے بادشاہ کی انفرادیت میں فرق نہیں پڑے گا۔ اور نہ ہی کمالِ شکر میں کوئی نقصان ہوگا کیوں کہ وہ کاغذ اور قلم پر خوش نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کا شکریہ ادا کرتا ہے کیوں کہ اس میں ان دونوں کا ذاتی طور پر دخل نہیں ہاں اس اعتبار سے دخل ہے کہ وہ بادشاہ کی قدرت کے سامنے مسخر ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ اس تک پہنچانے والا دلیل اور خزانچی بھی اس سلسلے میں بادشاہ کی طرف سے مجبور ہیں اگر یہ معاملہ وکیل کے اپنے اختیار میں ہوتا اور بادشاہ کی طرف سے کوئی ایسا حتمی حکم نہ ہوتا جس کی وجہ سے اسے اپنے انجام کا خوف ہو تو وہ اس تک کوئی چیز نہ پہنچاتا۔

تو اس صورت میں خازن کی طرف اس کی نظر اسی طرح ہے جس طرح کاغذ اور قلم کی طرف ہوتی ہے اور اس سے بادشاہ کی طرف نعمت کی نسبت کے سلسلے میں شرکت لازم نہیں آتی۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے اور اسے اس کے افعال کی پہچان بھی ہو جاتی ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ سورج، چاند اور ستارے اس کے حکم کے تحت مسخر ہیں جیسے کاتب کے ہاتھ میں قلم کا معاملہ ہے اور حیوانات جن کو کوئی اختیار حاصل ہوتا ہے وہ اپنے نفس کے تابع ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان پر

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۳۰۲ مرویات ابی ہریرہ

(۲) سنن ابن ماجہ ص ۲۷۸، ابواب الادب

افعال کے دواعی (افعال کی طرف لے جانے والے) مسلط کئے ہیں تاکہ وہ عمل کریں اگر چاہیں یا انکار کر دیں جس طرح خزانچی جو بادشاہ کی اطاعت پر مجبور ہے اس کی مخالفت نہیں کر سکتا اور اگر بادشاہ اسے کھلی چھٹی دے دے تو وہ ایک ذرہ بھی نہ دے اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی نعمت کسی دوسرے شخص کے ہاتھوں سے تمہارے پاس پہنچتی ہے تو وہ شخص بھی مجبور ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ارادے کو مسلط کر دیا اور اسباب کو جمع کر دیا اور اس کے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ دنیا و آخرت میں اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ اس نے جو کچھ تجھے دینا ہے، دے دے۔ اور اس کے بغیر اس کا فوری یا بعد کا مقصود حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اس عقیدے کی تخلیق فرمادی تو اس کے لیے اس کو چھوڑنے کا کوئی راستہ نہیں وہ اس صورت میں اپنی غرض کے لئے تمہیں دے رہا ہے تمہاری غرض کے لیے نہیں اگر اس میں اس کی اپنی غرض شامل نہ ہوتی تو تمہیں ہرگز نہ دیتا اور اگر اسے اس بات کا علم نہ ہوتا کہ اس کا نفع تجھے نفع پہنچانے میں ہے تو وہ تمہیں نفع نہ پہنچاتا۔ تو اس طرح وہ تمہارے نفع کے واسطے سے اپنا نفع طلب کرتا ہے اس لیے وہ انعام عطا کرنے والا نہیں ہے بلکہ اس نے تجھے ایک دوسری نعمت کے لیے وسیلہ بنایا اور وہ اس کی امید رکھتا ہے۔ جس ذات نے تمہیں نعمت عطا فرمائی ہے اسی نے اس شخص کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اور اس کے دل میں ایسا اعتقاد اور ارادہ ڈالا ہے جس کے باعث وہ اس نعمت کو تم تک پہنچانے میں مجبور ہو گیا۔

اگر تم امور کو اس طریقے پر جانو گے تو گویا تم نے اللہ تعالیٰ کو بھی پہچان لیا اور اس کے فعل کو بھی اور تم موحد ہو گئے اور اس کے شکر پر قادر بھی۔ بلکہ تم محض اس معرفت کی وجہ سے شاکر شمار ہوئے اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعا میں کہا تھا "الٰہی! تو نے آدم علیہ السلام کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور کیا کیا عمل ہوا تو انہوں نے کیسے تیرا شکر ادا کیا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جان لو کہ یہ سب کچھ میری طرف سے ہوا اور اس کی معرفت ہی شکر ہے تو اب ہم اسی صورت میں شکر ادا کر سکتے ہیں جب یہ بات جان لیں کہ سب کچھ اسی کی طرف سے ہے اور اگر اس کے سلسلے میں تمہیں کوئی شک ہو تو نہ تمہیں نعمت کی پہچان ہے اور نہ ہی منعم کی، اور اب تم صرف منعم پر خوش نہیں ہوتے بلکہ اس کے ساتھ اس کے غیر کو بھی شریک کر رہے ہو پس معرفت میں نقصان کے باعث فرحت و سرور کے سلسلے میں تیرا حال بھی ناقص ہے اور جب خوشی ناقص ہے تو تیرا عمل بھی ناقص ہوگا تو اس اصل (علم و معرفت) کا یہ بیان ہے۔

دوسرا اصل:

وہ حال ہے جو اصل معرفت سے حاصل ہوتا ہے اور یہ منعم کے ساتھ خوش ہونا اور اس کے ساتھ خشوع و خضوع کو اختیار کرنا ہے تو فی نفسہ یہ بھی شکر ہے جیسا کہ معرفت، شکر ہے لیکن یہ اسی وقت شکر قرار پاتا ہے جب اپنی شرط پر حاوی ہو اور اس کی شرط یہ ہے کہ تیری خوشی منعم کے ساتھ ہو نعمت یا عطائے نعمت کے ساتھ نہیں شاید اس بات کو سمجھنے سے تم قاصر ہو تو ہم اس سلسلے میں ایک مثال پیش کرتے ہیں ہم کہتے ہیں۔

ایک بادشاہ سفر پہ جانے کا ارادہ کرتا ہے تو کسی آدمی کو ایک گھوڑا دیتا تو اس صورت میں انعام یافتہ آدمی کی خوشی کی تین وجہ ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ صرف اس کے گھوڑا ہونے وجہ سے خوش ہو کہ وہ نفع بخش مال ہے سواری ہے جو اس کی غرض کے موافق ہے نیز وہ نہایت عمدہ گھوڑا ہے اس قسم کی خوشی کا بادشاہ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس کی غرض فقط گھوڑا ہے۔ اگر وہ اسے کسی جنگل میں پاتا تو بھی اسی طرح خوش ہوتا دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ محض اس کے گھوڑا ہونے کی وجہ سے خوش نہیں ہوتا بلکہ اس سے وہ اس کو بادشاہ کی عنایت اور اس کی شفقت سمجھ کر خوش ہوتا ہے اور اسی پہلو کا خیال رکھتا ہے حتی کہ اگر اسے یہ گھوڑا کسی صحرا سے ملا ہو یا بادشاہ کے غیر نے دیا ہو تو وہ اس پر بالکل خوش نہیں ہوتا کیوں کہ اسے گھوڑے کی بالکل ضرورت نہیں یا وہ اسے اس لیے حقیر سمجھتا ہے کہ اس کا مقصود تو بادشاہ کے دل میں اپنی جگہ بنانا تھا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ اس لیے خوش ہوتا ہے کہ اس پر سوار ہو کر بادشاہ کی خدمت کے لیے جائے گا اور سفر کی مشقت برداشت کرتا ہے تاکہ اس کی خدمت کے ذریعے مقامِ قرب حاصل کرے اور بعض اوقات وہ وزارت کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے یعنی وہ صرف اس بات پر قناعت نہیں کرتا کہ بادشاہ کے دل اس کے لیے جگہ ہے اور اس نے اسے گھوڑا دیا ہے اور یہ کہ بادشاہ جس کو جو کچھ دے وہ میرے واسطے سے دے۔ پھر وزارت کے حصول سے بھی اس کا مقصد وزارت نہیں ہوتی بلکہ بادشاہ کا مشاہدہ اور اس کا قرب حاصل کرنا ہوتا ہے حتی کہ اگر اسے قربِ بادشاہ اور وزارت کے درمیان اختیار دیا جائے تو وہ قرب کو اختیار کرتا ہے۔

تو یہ تین درجے ہیں پہلے درجہ میں شکر کا معنیٰ بالکل داخل نہیں ہوتا کیوں کہ اس شخص کی نظر گھوڑے تک محدود ہوتی ہے اور اس کی خوشی کا تعلق گھوڑے سے ہوتا ہے دینے والے سے نہیں اور یہی حال ہر اس شخص کا ہوتا ہے جو نعمت پر اس لیے خوش ہوتا ہے کہ وہ لذیذ ہے اور اس کی غرض کے موافق ہے تو یہ شکر کے معنیٰ سے بعید ہے۔

دوسرا درجہ شکر کے مفہوم میں داخل ہوتا ہے کیوں کہ وہ شخص نعمت دینے والے کی وجہ سے خوش ہوتا ہے لیکن محض اس کی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی عنایت کی معرفت کی وجہ سے جو اسے مستقبل میں انعام پر برانگیختہ کرتی ہے اور یہ صالحین کا حال ہے جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے خوف اور ثواب کی امید پر اس کی عبادت کرتے اور شکر بجالاتے ہیں۔

مکمل شکر تیسری صورت میں ہوتا ہے وہ یہ کہ بندے کی خوشی اللہ تعالیٰ کی نعمت کے ساتھ ہو اس اعتبار سے کہ یہ قربِ خداوندی تک رسائی اس کی بارگاہ کی حاضری اور دائمی زیارت کا وسیلہ ہے یہی سب سے بڑا رتبہ ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ دنیا پر صرف اس لیے خوش ہوتا ہے کہ یہ آخرت کی کھیتی ہے اور اس پر مدد کرتی ہے اور وہ ہر اس نعمت پر غمگین ہوتا ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کرے اور اس کے راستے سے روک دے کیوں کہ وہ اس نعمت کا ارادہ اس لیے نہیں کرتا کہ وہ لذیذ ہے جیسے گھوڑے والا اس کے حصول پر اس لیے خوش نہیں ہوتا کہ وہ عمدہ اور تیز رفتار ہے بلکہ اسے اس بات کی خوشی ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے اسے بادشاہ کی صحبت حاصل ہوتی ہے حتی کہ اسے دائمی مشاہدہ اور قربِ خداوندی کا

اعزاز حاصل ہوتا ہے اسی لیے حضرت شبلی رحمہ اللہ نے فرمایا شکر منعم کو دیکھنے کا نام ہے نعمت کو دیکھنے کا نہیں اور حضرت خواص رحمہ اللہ نے فرمایا عام لوگوں کا شکر کھانے، لباس اور مشروب پر ہوتا ہے جب کہ خاص لوگوں کا شکر قلبی واردات پر ہوتا ہے۔

اس درجے کا ادراک اس شخص کو نہیں ہوتا جس کے نزدیک لذات کا تعلق پیٹ، شرمگاہ اور حواس کے مدرکات مثلاً رنگ اور آوازوں وغیرہ سے ہو اور وہ قلبی لذت سے خالی ہو کیوں کہ دل حالتِ صحت میں ذکر خداوندی اور اللہ تعالیٰ کی معرفت و ملاقات کے سوا کسی چیز سے لذت نہیں پاتا دل کو دوسری چیزوں سے لذت اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ بری عادات کی۔ بیماری میں مبتلا ہو جس طرح بعض لوگ کیچڑ کھانے سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور جیسے بعض بیمار میٹھی چیزوں سے منہ بناتے اور کڑوی چیزوں کو میٹھا سمجھتے ہیں جیسے کہا گیا ہے۔

وَمَنْ يَكُنْ ذَا فَمٍ مُرٍّ مَرِيضٍ يَجِدْ مُرًّا بِهِ الْمَاءَ الزُّلَالَا ۔

اور جو شخص بیمار ہو اور اس کے منہ میں کڑواہٹ ہو تو وہ اس کی وجہ سے میٹھے پانی کو بھی کڑوا پاتا ہے۔

تو اب اللہ تعالیٰ کی نعمت پر خوشی کی یہ شرط ہے پس اگر اونٹ نہ مل سکے تو بکری ہی کافی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو دوسرا درجہ اپنانا چاہیئے پہلا درجہ تو ہر حساب سے خالی ہے ایک شخص بادشاہ کا ارادہ گھوڑے کے لیے کرتا ہے اور دوسرا گھوڑے کا ارادہ بادشاہ تک رسائی کے لیے کرتا ہے تو ان دونوں میں کس قدر فرق ہے اور ان دونوں میں بھی کس قدر فرق ہے جن میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا ارادہ صرف اس لیے کرتا ہے کہ وہ اسے انعام عطا فرمائے اور دوسرا اللہ تعالیٰ کی نعمت اس لئے چاہتا ہے کہ اس کے ذریعے اسے قربِ خداوندی حاصل ہو۔

تیسرا اصل :

" اس خوشی کے مطابق عمل کرنا ہے جو منعم کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے اور یہ عمل دل، زبان اور اعضاء سے تعلق رکھتا ہے۔ جہاں تک دل کا تعلق ہے تو اس کا عمل بھلائی کا ارادہ اور تمام لوگوں کے لیے اس ارادۂ خیر کو مخفی رکھنا ہے زبان کا عمل اللہ تعالیٰ کے لیے شکر کا اظہار ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی حمد کرے جو اس شکر پر دلالت کرتی ہے اور اعضاء کا عمل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اس کی اطاعت کے لیے استعمال کرے اور گناہوں پر مدد حاصل کرنے سے بچے حتیٰ کہ آنکھوں کا شکر یہ ہے کہ کسی مسلمان کا عیب دیکھے تو اس پر پردہ ڈالے کانوں کا شکر یہ ہے کہ جو عیب سنے اس پر پردہ ڈالے اللہ تعالیٰ کے انعامات کا اعضاء سے شکر ادا کرنے میں یہ باتیں داخل ہیں زبان سے شکر ادا کرنا ایسے کلمات ادا کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی ہونے پر دلالت کرتے ہوں اور اس بات کا اسے حکم دیا گیا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے پوچھا تم نے صبح کیسے کی؟ اس نے عرض کیا بھلائی کے ساتھ، آپ نے دوبارہ سوال کیا حتیٰ کہ اس نے تیسری مرتبہ کہا بھلائی کے ساتھ صبح کی اور میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا اور اس کا شکر ادا کرتا ہوں۔

(اَحْمَدُ اللهَ وَاَشْکُرُہٗ) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم سے یہی بات چاہتا تھا۔

پہلے بزرگ ایک دوسرے سے خیریت کا سوال اس مقصد کے تحت کرتے تھے کہ دوسرے سے اللہ تعالیٰ کے شکر کا اظہار کرائیں تاکہ وہ شکر کرنے والا مطیع ہو اور جس نے یہ کلمات کہلوائے وہ بھی اطاعت گزار قرار پائے، وہ اظہار شوق کے ذریعے ریا کاری کا ارادہ نہیں کرتے تھے۔

جس شخص سے اس کا حال پوچھا جائے وہ شکر کا اظہار کرتا ہے یا شکایت کرتا ہے یا خاموش رہتا ہے تو شکر ادا کرنا اطاعت ہے جب کہ شکوہ کرنا نافرمانی ہے جو اہل دین سے نہایت قبیح ہوتی ہے اور جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے اور ہر چیز اس کے قبضہ میں ہے اس کا شکوہ ایسے بندوں سے کرنا کیسے قبیح نہ ہوگا جو کسی چیز پر قادر نہیں تو بندے کے لیے زیادہ مناسب بات یہی ہے کہ اگر وہ آزمائش اور قضا پر اچھی طرح صبر نہیں کرسکتا اور اس کی کمزوری شکوہ کی راہ دکھاتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکایت کرے کیوں کہ اسی نے آزمائش میں ڈالا اور وہی اس آزمائش کو زائل کرنے پر قادر ہے اور بندے کا اپنے مولیٰ کے سامنے اظہارِ ذلت اس کی عزت ہے اور اس کے غیر سے شکایت کرنا ذلت ہے اور بندے کے سامنے ذلت کا اظہار جب کہ وہ بھی اس جیسا بندہ ہے قبیح ذلت ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْکُرُوْا لَهٗ۔ (۲)

بے شک وہ جن کی تم پوجا کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دیتے ہو وہ تمہارے لیے رزق کے مالک نہیں ہیں پس اللہ تعالیٰ کے ہاں رزق تلاش کرو اور اس کی عبادت کرو اور اسی کا شکر ادا کرو۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ۔ (۳)

بے شک وہ کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر تم ان کی پوجا کرتے ہو وہ تمہارے جیسے بندے ہیں۔

تو زبان سے شکر ادا کرنا بھی شکر گزاری میں داخل ہے ایک روایت میں ہے کہ ایک وفد حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو ایک نوجوان گفتگو کے لیے کھڑا ہوا حضرت عمر رحمہ اللہ نے فرمایا بڑے کو کلام کرنے دو اس سے کہا اے

---

(۱) مجمع الزوائد جلد ۸ ص ۴۶ کتاب الادب

(۲) قرآن مجید، سورۂ عنکبوت آیت ۱۷

(۳) قرآن مجید، سورۂ اعراف آیت ۱۹۴

امیرالمومنین اگر عمر کا معاملہ ہوتا تو مسلمانوں کا امیر آپ سے بڑی عمر کا کوئی شخص ہوتا آپ نے فرمایا گفتگو کرو اس نے کہا ہمارا وفد نہ تو کسی چیز کی رغبت رکھتا ہے اور نہ ہی خوف، جہاں تک رغبت کا تعلق ہے تو آپ کی سخاوت ہم تک پہنچ چکی ہے (مانگنے کی کیا ضرورت ہے) اور جہاں تک خوف کا تعلق ہے تو آپ کے انصاف نے ہمیں امن دے دیا ہے۔ ہم تو شکریہ ادا کرنے آئے ہیں ہماری حاضری کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی زبان سے آپ کا شکریہ ادا کریں اور واپس چلے جائیں۔

تو شکر کے معانی کے یہ اصول ہیں جو اس کی تمام حقیقت کا احاطہ کرتے ہیں۔

اور جس نے یہ کہا کہ شکر منعم کی نعمت کے اعتراف کا نام ہے جو خضوع کے ساتھ ہو تو یہ دل کے بعض احوال کے ساتھ زبان کے فعل کے حوالے سے ہے اور جس نے کہا کہ شکر محسن کے احسان کا ذکر کر کے اس کی تعریف کرنے کا نام ہے تو اس نے محض زبان کے عمل کو دیکھا ہے اور یہ کہنا کہ شکر، بساط شہود پر اعتکاف بیٹھنے اور حرمت منعم کی حفاظت کا نام ہے تو یہ شکر کے اکثر معانی کو جامع ہے اس سے صرف زبان کا عمل نکل جاتا ہے حضرت حمدون قصار نے کہا شکر یہ ہے کہ تم شکر میں اپنے نفس کو طفیلی سمجھو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شکر کے معانی میں صرف معرفت داخل ہے اور حضرت جنید رحمہ اللہ نے فرمایا شکر یہ ہے کہ تم اپنے نفس کو نعمت کا اہل نہ جانو تو یہ خاص طور پر احوالِ قلب میں سے ایک حال کی طرف اشارہ ہے۔

یہ سب اقوال ان لوگوں کی اپنی حالت کی خبر دیتے ہیں اسی لیے ان کے جوابات مختلف ہے ان میں کوئی اتحاد و اتفاق نہیں ہے۔

پھر ان کے جوابات میں اختلاف کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ وہ اپنی اس حالت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں جو ان پر غالب ہوتی ہے تاکہ وہ اہم بات میں مشغول ہوں بے مقصد بات میں نہیں یا وہ سائل کی حالت کے مطابق بات کرتے ہیں۔ یعنی صرف اسی بات پر اکتفا کرتے ہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے غیر ضروری بات سے اعراض کرتے ہیں۔

یہ گمان مناسب نہیں کہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا وہ ان پر طعن ہے اور وہ تمام معانی جو ہم نے ذکر کیے ہیں وہ ان کے سامنے آتے تو ان کا انکار کر دیتے بلکہ کوئی عقل مند آدمی ایسا گمان کرتا ہی نہیں البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ لفظی جھگڑا پیدا ہو جائے کہ کیا شکر کا لفظ لغوی اعتبار سے ان تمام معانی کو شامل ہوگا یا بعض معانی کو مقصوداً شامل ہوگا اور باقی معانی اس کے تابع اور لوازم میں سے ہوں گے اور اس کتاب میں ہمارا مقصود لغوی موضوعات کی تشریح نہیں ہے کیوں کہ یہ طریق آخرت کے علم میں سے نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اپنی رحمت سے توفیق عطا کرنے والا ہے۔

فصل:

اللہ تعالیٰ کے حق میں شکر کی وضاحت

شاید تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ شکر اسی انعام دینے والے کے حق میں سمجھا جا سکتا ہے جس کو شکر سے کوئی

فائدہ حاصل ہو ہم بادشاہوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی تعریف کرتے ہیں تاکہ دلوں میں ان کا مقام بڑھے اور لوگوں کے نزدیک ان کی عزت زیادہ ہو اس طرح ان کی شہرت اور مرتبہ زیادہ ہوگا۔ یا ہم خدمت کے ذریعے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو ان کے بعض مقاصد میں مدد ہوتی ہے یا ہم نوکروں کی طرح ان کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور اس طرح ان کا لشکر بڑھتا ہے اور ان کے جاہ و مرتبہ میں بھی اضافہ ہوتا ہے غرضیکہ شکر کے ذریعے انہیں ان باتوں میں سے کوئی بات حاصل ہوتی ہے اور یہ بات دو وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حق میں باطل ہے۔

ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فوائد اور اغراض سے پاک ہے اسے خادموں اور مدد کی حاجت نہیں ہے اور نہ ہی تعریف و توصیف کے ذریعے اس کے مقام و مرتبہ میں کوئی اضافہ ہوتا ہے اور اس کو ان خدام کی کثرت کی حاجت بھی نہیں ہے جو اس کے سامنے رکوع و سجود کی حالت میں کھڑے ہوں تو ہم اللہ تعالیٰ کا اس طرح شکر ادا کرتے ہیں کہ اس کی اس میں کوئی غرض نہیں ہوتی جیسے ہم کسی ایسے بادشاہ کا جو ہمیں انعام دیتا ہے، اس طرح شکریہ ادا کریں کہ اپنے گھروں میں سو جائیں یا سجدے اور رکوع میں مشغول ہوں کیوں کہ اس میں بادشاہ کا کوئی حصہ نہیں اور وہ غائب ہے اسے کوئی علم نہیں اور ہمارے افعال سے اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ یا غرض متعلق نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہم جو کچھ اپنے اختیار سے کرتے ہیں وہ انعامات خداوندی میں سے ایک دوسری نعمت ہے کیوں کہ ہمارے اعضاء، ہماری طاقت، ہمارا ارادہ اور عمل کا داعیہ نیز وہ تمام امور جو ہماری حرکت کا سبب ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اس کی نعمت کے مرہون منت ہیں تو ہم اسی کی نعمت سے اس کا شکر کیسے ادا کریں۔

اور اگر کوئی بادشاہ ہمیں ایک سواری دے اور ہم اسی کی ایک دوسری سواری لے کر اس پر سوار ہو جائیں یا بادشاہ ہمیں دوسری سواری دے تو دوسری سواری پہلی سواری کے لیے ہماری طرف سے شکریہ قرار نہیں پاتی۔

بلکہ دوسری کا شکریہ ادا کرنا بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح پہلی سواری پر شکریہ ادا کیا جاتا ہے پھر اس کے شکر کے لیے بھی ایک اور نعمت کی ضرورت ہوگی تو نتیجہ یہ ہوا کہ ان دو وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حق میں شکر محال ہے اور ہمیں ان دونوں باتوں میں کوئی شک نہیں ہے اور شریعت میں شکر ادا کرنے کا حکم آیا ہے تو ان دونوں باتوں کو جمع کرنے کی کیا صورت ہوگی؟ تو جاننا چاہیے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں بھی اسی قسم کا خیال آیا تھا، حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب! میں تیرا شکر کس طرح ادا کروں کیوں کہ جب تک دوسری نعمت مجھے حاصل نہ ہو میں شکر ادا نہیں کر سکتا اور دوسرے الفاظ میں اس طرح آیا ہے کہ میرا شکر ادا کرنا بھی تیری طرف سے مزید نعمت ہے جس کا شکر ادا کرنا مجھ پر واجب ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ جب آپ نے اس بات کو جان لیا تو شکر ادا ہو گیا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ جب آپ کو اس کی بات کی معرفت حاصل ہو گئی کہ یہ نعمت میری طرف سے ہے تو آپ کا اس کے میری طرف سے ہونے پر راضی ہونا شکر ہے۔

سوال :

ہمیں سوال کی سمجھ آگئی لیکن ان کی طرف جو وحی آئی اس کی سمجھ نہیں آئی یہ تو میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے شکر محال ہے لیکن شکر کے محال ہونے کا علم بھی شکر ہے یہ بات سمجھ نہیں آئی یہ علم بھی تو ایک نعمت ہے تو یہ شکر کیسے ہوگا۔ گویا حاصل کلام یہ ہے کہ جو شکر ادا نہیں کرتا گویا وہ بھی شکر ادا کر رہا ہے اور بادشاہ کی طرف سے دوسرا جوڑا قبول کرنا پہلے جوڑے کا شکریہ ہے اس میں جو راز ہے فہم اس کے ادراک سے عاجز ہے اگر مثال کے ذریعے اسے سمجھا جائے تو یہ اہم بات ہے۔

جواب :

جان لو! یہ معارف کا دروازہ کھٹکھٹانا ہے اور یہ علوم معاملہ میں سے اعلیٰ ہے لیکن ہم کچھ تشبیہات کی طرح اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں دو نظریں ہیں ایک محض توحید کی آنکھ سے دیکھنا اور یہ نظر تمہیں قطعی طور پر اس بات کی پہچان کراتی ہے کہ وہی شاکر ہے وہی مشکور اور وہی محب ہے وہی محبوب، اور یہ اس شخص کی نظر ہے جو اس بات کو جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی موجود نہیں اور یہ کہ اس کی ذات کے سوا سب ہلاک ہونے والے ہیں اور یہ بات ہر حال میں ازل و ابد کے اعتبار سے صحیح ہے کیوں کہ غیر وہ ہو سکتا جو خود بخود قائم ہو اور اس قسم کے غیر کا کوئی وجود نہیں بلکہ اس کا پایا جانا محال ہے کیوں کہ موجود ثابت وہی ہے جو بالذات قائم ہے اور جو ذاتی طور پر قائم نہ ہو وہ ذاتی طور پر موجود نہیں ہے بلکہ وہ غیر کے ساتھ قائم ہے اور غیر کے ساتھ ہی موجود ہے۔

اور جب اسی کی ذات کا اعتبار کیا جائے اور اس کے غیر کی طرف توجہ نہ کی جائے تو اس غیر کا وجود بالکل نہیں ہوگا کیوں کہ موجود تو اسے کہتے ہیں جو ذاتی طور پر قائم ہو اور قائم بنفسہ وہی ہوتا ہے کہ اگر اس کے غیر کو معدوم تصور کیا جائے تو اس کے وجود میں کوئی فرق نہ پڑے اور اگر قائم بالنفسہ اپنے وجود کے ساتھ ساتھ دوسروں کے وجود کو بھی قائم رکھتا تو وہ قیوم ہے اور قیوم ایک ہی ہے اس کے غیر کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تو نتیجہ یہ ہوا کہ حی قیوم کے علاوہ کسی کا وجود نہیں ہے اور وہ واحد بے نیاز ہے تو جب تم اس اعتبار سے دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ سب کے نکلنے کا مقام (مصدر) اور مرجع وہی پس وہی شاکر ہے وہی مشکور ہے وہی محب ہے اور وہی محبوب ہے اور حضرت حبیب بن ابی حبیب نے اسی نظر سے دیکھا جب انہوں نے یہ آیت پڑھی۔

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ۔ (۱)

بے شک ہم نے اسے (حضرت ایوب علیہ السلام کو) صبر کرنے والا پایا بے شک وہ بہت رجوع کرنے والے تھے

تو انہوں نے (حضرت حبیب نے) فرمایا "تعجب کی بات ہے خود دیتا ہے اور خود ہی تعریف بھی کرتا ہے" یہ اس بات کی

(۱) قرآن مجید، سورۂ ص آیت ۴۴

طرف اشارہ ہے کہ جب اس نے اپنے دینے پر ان کی تعریف کی تو گویا اپنے نفس کی تعریف کی تو گویا وہی تعریف کرنے والا ہے اور اسی کی تعریف کی گئی ہے۔

اور جب حضرت شیخ ابو سعید مہینی کے سامنے پڑھا گیا۔

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ۔ (۱) وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں

تو انہوں نے فرمایا "یقیناً" وہ ان کو چاہتا ہے اور اسے چاہنے دو کیوں کہ ان کو چاہنے کا اسے حق ہے کیوں کہ (اس طرح) وہ اپنے آپ کو چاہتا ہے انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ وہی محب ہے اور وہی محبوب،

اور یہ بلند مرتبہ ہے جب تک کوئی عام فہم مثال نہ بیان کی جائے سمجھ نہیں آتا تو تم پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جب کوئی مصنف اپنی تصنیف کو پسند کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو پسند کرتا ہے جب کوئی کاریگر اپنی مصنوع کو چاہتا ہے تو وہ اپنے آپ کو چاہتا ہے اور والد جب اپنے بیٹے سے محبت کرتا ہے تو وہ اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور جب وہ اپنے آپ کو ہی چاہتا ہے تو جو کچھ چاہتا ہے اسے چاہنے کا حق ہے۔ اور یہ سب کچھ اس وقت ہے جب توحید کی نظر سے دیکھے۔ صوفیاء کرام نے اس حالت کو فنائے نفس سے تعبیر کیا ہے کہ یعنی وہ اپنے آپ سے بھی اور غیر خدا سے بھی فنا ہوتا ہے اور اب وہ صرف اللہ تعالیٰ کو ہی دیکھتا سمجھتا ہے۔

اور جو آدمی اس بات کو نہیں سمجھتا وہ ان بزرگوں کے اس قول کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جس آدمی کا سایہ چار گز لمبا ہو اور شاید وہ ایک دن میں کئی کلو غلہ کھا جاتا ہو وہ کیسے فنا ہو سکتا ہے؟ تو جاہل لوگ ان صوفیاء کرام کے کلام کے معانی سمجھنے سے قاصر ہونے کی وجہ سے ان پر ہنستے ہیں اور یہ بات تو لازمی ہے کہ عارفین کا قول جاہلیں کے مذاق کا نشانہ بنے اس آیت کریمہ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ وَإِذَا انْقَلَبُوا إِلَى أَهْلِهِمُ انْقَلَبُوا فَكِهِينَ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَؤُلَاءِ لَضَالُّونَ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ۔ (۲)

بے شک وہ لوگ جو مجرم ہیں وہ ایمان والوں کی باتوں پر ہنستے ہیں اور جب ان کے قریب سے گزرتے ہیں تو ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے ہیں اور جب اپنے گھر والوں کی طرف لوٹتے ہیں تو خوشی مناتے ہوئے لوٹتے ہیں اور جب ان کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہی لوگ گمراہ ہیں اور وہ ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ مائدہ آیت ۵۴

(۲) قرآن مجید، سورۂ مطففین آیت ۲۹ تا ۳۵

پھر بیان فرمایا کہ کل (قیامت کے دن) عارفین ان پر زیادہ ہنسیں گے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ۔ (۱)

آج ایمان والے کفار پر ہنسیں گے اور وہ (مومن) تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی امت جب ان کو کشتی بنانے میں مشغول دیکھتی تو وہ ہنستے تھے۔ تو انہوں نے فرمایا۔

ارشاد خداوندی ہے۔

قَالَ إِن تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ۔ (۲)

فرمایا اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو بے شک ہم بھی تم پر ہنسیں گے جیسا تم ہنستے ہو۔

تو یہ دیکھنے والوں کی حد ہے۔

دوسری نظر اس شخص کی ہے جو اپنے نفس سے فنا کے مقام کو نہیں پہنچا ان لوگوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو صرف اپنا وجود ثابت کرتے ہیں اور اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی رب ہو جس کی عبادت کی جائے یہی لوگ اندھے اور اندھے ہیں اور ان کا اندھاپن دونوں آنکھوں میں ہے کیوں کہ انہوں نے اس بات کی نفی کی جو تحقیقاً ثابت ہے اور وہ قیوم جو بنفسہٖ قائم ہے اور ہر ایک کے عمل کو قائم رکھنے والا ہے اور جو بھی قائم ہے (اسی) کے ساتھ قائم ہے۔ ان بیوقوں نے صرف اسی بات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے آپ کو ثابت کیا اور اگر وہ سوچتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ ان کا وجود کے لیے بقا نہیں ہے اور نہ ہی ان کا کوئی وجود ہے اور ان کا وجود اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو وجود میں لایا اس اعتبار سے نہیں کہ وہ پائے گئے۔ موجود اور موجد میں فرق ہے اور موجود دو ہی ہیں ایک موجود اور دوسرا وہ جسے وجود میں لایا گیا پس (حقیقی) موجود حق ہے اور جسے وجود دیا گیا وہ ذاتی طور پر باطل ہے اور موجود قائم اور قیوم ہے جب کہ موجَد (جسے وجود عطا کیا گیا) ہلاک ہونے والا اور فانی ہے اور حسب حقیقت یہ ہے کہ۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ۔ (۳)

ہر ایک کے لیئے فنا ہے۔

تو صرف تیرے رب کی ذات ہی باقی رہے گی وہ جو جلال اور اکرام والا ہے دوسرا فریق اندھا نہیں بھینگا ہے کیوں کہ یہ لوگ ایک آنکھ سے موجود برحق کے وجود کو دیکھتے ہیں پس وہ اس کا انکار نہیں کرتے اور اگر دوسری آنکھ بالکل اندھی ہو چکی ہو تو وہ موجود برحق کے غیر کے فنا ہونے کو نہیں دیکھتے بلکہ اس کے ساتھ کسی اور کے وجود کو بھی دیکھتے ہیں ایسے لوگ یقیناً مشرک ہیں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ مطففین آیت ۲۹ تا ۳۵

(۲) قرآن مجید، سورۂ ہود آیت ۳۸

(۳) قرآن مجید، سورۂ رحمٰن آیت ۲۶

جیسا کہ پہلے گروہ نے انکار کیا اور اگر اندھا پن تجاوز کرکے چندھیا نے تک پہنچ جائے تو وہ دونوں موجودوں میں فرق ثابت کرتے ہیں ایک کو رب اور دوسرے کو بندہ کہتے ہیں تو اس قدر بات کہ دونوں میں فرق اور دوسرے موجود میں نقصان دیکھنا توحید کی حد میں داخل ہے پھر اگر آنکھ میں ایسا سرمہ لگائے تو اس کے انوار میں اضافہ کرتا ہے تو چندھیانا کم ہو جاتا ہے اور جس قدر آنکھ کی روشنی بڑھتی جائے گی اسی قدر اس چیز میں کمی نظر آئے گی جسے اللہ تعالیٰ کے سوا ثابت کیا ہے اگر وہ اسی راستے پر برقرار رہے تو یہ کمی دوسرے وجود کے خاتمے کا باعث بنے گی اب وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں دیکھے گا اور صرف اللہ تعالیٰ کو ہی دیکھے گا اور یوں اسے کامل توحید کا رتبہ حاصل ہوگا اور جب غیر خدا کے وجود میں نقص پاتا ہے تو توحید کے آغاز میں داخل ہو جاتا ہے اور ان دونوں کے درمیان بے شمار درجات ہیں۔ اسی لیے موحدین کے درجات میں تفاوت ہوتا ہے۔

وہ سرمہ جس سے آنکھوں کو انوار حاصل ہوتے ہیں وہ کتابیں ہیں جو رسولوں پر نازل کی گئیں انبیاء کرام سرمہ لگانے والے ہیں اور وہ توحید محض کی طرف بلانے کے لیے تشریف لائے ہیں جس کا مضمون "لا الٰہ الا اللہ" ہے اور اس کا معنیٰ یہ ہے کہ صرف واحد حق کو دیکھے اور کمالِ توحید تک پہنچنے والے بہت کم ہیں مشرک اور منکر بھی کم ہیں اور وہ توحید کے بالمقابل دوسری طرف ہیں جب بت پرستوں نے کہا۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ (۱) ہم ان (بتوں) کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے قریب کردیں۔

تو یہ توحید کے اوائل ہی کچھ ضعف کے ساتھ داخل ہوئے اور درمیانے درجے کے لوگ زیادہ ہیں ان میں سے بعض وہ ہیں جن کی بصیرت بعض حالات میں کھلتی ہے اور ان کے لیے توحید کے حقائق روشن ہوتے ہیں لیکن وہ بجلی کی طرح چمکتے ہیں باقی نہیں رہتے اور بعض کے لیے چمکتے ہیں اور ایک عرصہ تک باقی رہتے ہیں لیکن دائمی نہیں ہوتے ان کا دوام بہت کم ہوتا ہے۔

لِكُلٍّ اِلٰى شَأْوِ الْعُلَاءِ حَرَكَاتٌ وَلٰكِنْ عَزِيْزٌ فِى الرِّجَالِ ثَبَاتٌ۔ ہر ایک کے لیے جو کچھ وہ چاہتے ہیں حرکات ہیں لیکن لوگوں کا ثابت رہنا بہت نادر ہے۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو طلبِ قرب کا حکم دیا تو آپ سے فرمایا گیا۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ۔ (۲) اور سجدہ کریں اور قرب حاصل کریں

اس پر آپ نے سجدے میں یوں دعا مانگی۔

---

(۱) قرآن مجید، سورہ زمر آیت ۳

(۲) قرآن مجید، سورۂ علق آیت ۱۹

اَعُوْذُ بِعَفْوِكَ مِنْ عِقَابِكَ وَاَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ لَا اُحْصِی ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰی نَفْسِكَ ۔ (۱)

میں تیرے عفو کے ساتھ تیرے عذاب سے پناہ چاہتا ہوں۔ اور تیری رضا کے سبب تیری ناراضگی سے پناہ کا طالب ہوں اور تجھ سے تیرے ہاں پناہ کا طلب گار ہوں میں تیری تعریف کا حق ادا نہیں کرسکتا تو اسی طرح ہے جس طرح تو نے اپنی تعریف بیان کی۔

اس دعا کا پہلا جملہ "اعوذ بعفوك من عقابك"، صرف اللہ تعالیٰ کے افعال کے مشاہدہ کی صورت کہا گیا گویا آپ نے صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے افعال کو دیکھا تو اس کے فعل سے اس کے فعل کی پناہ طلب کی پھر جب قرب حاصل ہوا اور افعال کے مشاہدہ سے مقام فنا کا حصول ہو گیا اور مصادرِ افعال یعنی صفات کی طرف ترقی کی تو عرض کیا" اعوذ برضاك من سخطك" اور یہ دونوں صفتیں ہیں پھر توحید میں نقصان پایا تو مزید قرب حاصل کیا اور مشاہدہ صفات سے مشاہدہ ذات کی طرف ترقی کی اور عرض کیا " اعوذ بك منك"، تو یہ اللہ تعالیٰ کے فعل اور صفت کو دیکھے بغیر اس کی ذات کی طرف جانا ہے لیکن اپنے آپ کو اسی سے اسی کی طرف بھاگنے والا دیکھا اور استعاذہ اور ثناء کرتے ہوئے دیکھا تو اپنی ذات کے مشاہدہ سے مقام فنا حاصل کیا کیوں کہ اس میں بھی کمی دیکھی اور مزید قریب ہوئے تو عرض کیا " لا احصی ثناء عليك انت كما اثنيت على نفسك"، تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول " لا احصی"، فنائے نفس سے نیز مشاہدۂ نفس سے خروج کی خبر ہے اور " انت كما اثنيت على نفسك"، اس بات کا بیان ہے کہ وہی ثنا بیان کرنے والا ہے اور اسی کی ثنا بیان کی جاتی ہے اور ان سب باتوں کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے اور رجوع بھی اسی طرف ہوتا ہے اور یہ کہ اس کی ذات کے سوا سب کچھ ہلاک ہونے والا ہے۔ غرضیکہ جہاں موحدین کے مقامات کی انتہا ہوتی ہے وہاں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کا آغاز ہوتا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے افعال کے سوا کچھ نہ دیکھا تو آپ اسی کے فعل سے اسی کے فعل میں پناہ چاہتے ہیں۔ تو دیکھئے آپ کی انتہا کیا ہے جب آپ واحد برحق تک پہنچتے ہیں حتیٰ کہ آپ ذات حق کے سوا ہر قسم کے مشاہدہ سے بلندی تک پہنچ گئے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک درجہ سے دوسرے درجہ تک ترقی کرتے تو دوسرے کے مقابلے میں پہلے مرتبہ کو دوری خیال فرماتے تھے چنانچہ آپ پہلے مرتبہ سے استغفار کرتے تھے اور اسے اپنے سفر میں نقصان اور مقام میں کمی سمجھتے تھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

آپ نے فرمایا۔

اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ حَتّٰی اَسْتَغْفِرُ اللهَ — میرے دل پر کچھ پردہ سا آجاتا ہے یہاں تک کہ میں دن

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۵۸ مرویات عائشہ

فِی الْیَوْمِ وَاللَّیْلَةِ سَبْعِیْنَ مَرَّةً - (۱) اور رات میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔

اور یہ اس لیے ہوتا تھا کہ آپ ستر مقامات تک ترقی حاصل کریں جن میں سے بعض دوسرے بعض سے بلند ہیں ان میں سے پہلا مقام اگرچہ مخلوق کی طاقت سے نہایت بلند تھا لیکن دوسرے کی نسبت سے نقصان میں ہوتا تھا۔ تو آپ کے استغفار کا یہی مقصد تھا۔ اور جب ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام اگلی پچھلی خلاف اولیٰ باتوں سے محفوظ نہیں فرمایا تو یہ سجدے میں رونا اور یہ سخت محنت کس لئے ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔

اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا - (۲) کیا میں شکر گزار بندہ نہ ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ کیا میں مزید مقامات کا طلب گار نہ ہوں بے شک شکر مزید نعمت کے حصول کا سبب ہے ارشاد خداوندی ہے۔

لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ - (۳) اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں مزید عطا کروں گا۔

اب جب ہم مکاشفہ کے سمندر میں جا گھسے ہیں تو ہمیں لگام پکڑ لینی چاہیے اور ہم ان باتوں کی طرف رجوع کریں جو علم معاملہ کے مناسب ہیں تو ہم کہتے ہیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کو اس مقصد کے لیے بھیجا گیا کہ وہ لوگوں کو کمال توحید کی دعوت دیں جس کا ذکر ہم نے کیا ہے لیکن ان کے اور کمال توحید کے درمیان بہت دُور کی مسافت ہے اور سخت گھاٹیاں ہیں اور شریعت تمام کی تمام اس مسافت اور گھاٹیوں کو طے کرنے کا طریقہ بتاتی ہے تو اس وقت کسی اور مشاہدہ اور مقام کی طرف نظر ہوتی ہے پس اس مقام پر اس مشاہدے کی طرف اضافت کرتے ہوئے شکر، شاکر اور مشکور ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہ بات مثال کے ذریعے واضح ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں تمہارے لیے یہ بات سمجھنا ممکن ہے کہ فرض کیجیے ایک بادشاہ نے اپنے غلام کی طرف جو اس سے دور تھا، سواری، لباس اور نقد رقم بھیجی تاکہ وہ اسے راستے کے اخراجات میں استعمال کر کے دُور کا سفر طے کرے اور بادشاہ کے دربار کا قرب حاصل کرے پھر اس کی دو حالتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ وہ یہاں آ کر کچھ امور انجام دے گا اور اس کی خدمت سے فائدہ ہو گا دوسرا یہ کہ اس غلام کے آنے سے بادشاہ کو کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی اسے اس کی کوئی حاجت ہے بلکہ اس کے آنے سے اس کی حکومت میں کوئی اضافہ بھی نہیں ہوتا کیوں کہ اس کی خدمت سے بادشاہ کو کوئی ایسا فائدہ حاصل نہیں ہوتا کہ وہ بے فکر ہو جائے اور اس کی عدم موجودگی سے بادشاہی میں کوئی خرابی بھی پیدا نہیں ہوتی لہٰذا اسے سواری اور زادِ راہ دینے کا مقصد صرف یہ ہے کہ غلام اس کا قرب حاصل کرے اور اس کے دربار کی سعادت سے بہرہ ور ہو کر خود اپنے آپ کو نفع پہنچائے یہ مقصد

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۴۶ کتاب الذکر

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۱۱۵ مرویات عائشہ

(۳) قرآن مجید، سورۃ ابراہیم آیت ۷

نہیں کہ اس سے بادشاہ کو نفع حاصل ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بندوں کو دوسرے مرتبے میں آتارنا چاہیے پہلے مرتبے میں نہیں کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ پر محال ہے دوسرا محال نہیں ہے۔

پھر یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیئے کہ بندہ پہلی حالت میں محض سواری کے مل جانے اور بادشاہ تک پہنچ جانے سے شکر گزار نہیں ہو جاتا جب تک بادشاہ کی اس خدمت میں مصروف نہ ہو جائے جو اس (بادشاہ) کا مقصد ہے دوسری حالت میں خدمت کی حاجت بالکل نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود اسے شکر گزار یا ناشکری کرنے والا ہونا تصور کیا جا سکتا ہے شکر کی صورت یہ ہے کہ مالک نے اس کی جو ڈیوٹی لگائی ہے اس پر عمل کرے اور اس کی ذات کو سامنے رکھے اپنے لیے نہ کرے اور ناشکری اس کے خلاف ہے مثلاً یا تو وہ کام ہی نہ کرے یا ایسا کام کرے جو بادشاہ سے دُوری کا باعث ہو پس جب غلام کپڑا پہنے یا گھوڑے پر سوار ہو اور زاد راہ راستے میں ہی خرچ کرے تو اس نے اپنے مالک کا شکر ادا کیا کیوں اس نے اس کی دی ہوئی نعمت کو اسی کی محبت میں استعمال کیا یعنی جس طرح وہ غلام کا نفع چاہتا تھا اپنا نہیں اور اگر سوار ہو کر اس کے پاس نہ آئے بلکہ دُور چلا جائے تو اس نے اس کی نعمت کی ناشکری کی۔ یعنی اس نے اس نعمت کو اس کام کے لیے استعمال کیا جسے بادشاہ اسی غلام کی خاطر ناپسند کرتا تھا اپنے لئے نہیں۔

اور اگر وہ بیٹھ جائے اور بالکل سوار نہ ہو نہ تو طلب قرب کے لیے اور نہ ہی طلب بُعد کے لیے، تو بھی اس نے اس کی نعمت کی ناشکری کی۔ کیونکہ اسے بے کار چھوڑ دیا اگرچہ یہ اس کے مقابلے میں کم درجہ میں ہے جب اسے دُوری کے لیے استعمال کرے تو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح مخلوق کو پیدا فرمایا وہ ابتدائے فطرت میں خواہشات کے استعمال کے محتاج ہیں تاکہ ان کے بدن مکمل ہوں تو ان خواہشات کی وجہ سے وہ بارگاہ خداوندی کی حاضری سے محروم رہتے ہیں جب ان کی سعادت قرب میں ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے وہ نعمتیں تیار کیں وہ درجۂ قرب کے پانے میں ان کے استعمال پر قادر ہیں اور اسی قرب و بُعد کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح تعبیر فرمایا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ (۱)

بے شک ہم نے انسان کو نہایت اچھے سانچے میں پیدا فرمایا پھر اسے سب سے نچلے درجے کی طرف پھیر دیا مگر وہ لوگ جو ایمان لائے۔

تو اللہ تعالیٰ نے بطور انعام ایسے آلات عطا فرمائے جن کے ذریعے بندہ اسفل السافلین سے ترقی کر سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے وہ آلات بندے کے لیے پیدا فرمائے حتیٰ کہ وہ ان کے ذریعے قرب کی سعادت حاصل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بے نیاز ہے وہ قریب ہو یا بعید۔۔۔۔

(۱) قرآن مجید، سورۂ والتین آیت ۴، ۵، ۶

اور بندے کو اختیار ہے ان آلات کو اطاعت کے لیے استعمال کرے اگر ایسا کرے گا تو اپنے مولیٰ کی محبت کی موافقت کی وجہ سے اس نے شکر ادا کیا اور اگر گناہ میں استعمال کرتا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی کیوں کہ ان آلات کے ذریعے وہ کام کیا جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اور وہ اس پر راضی نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ بندے کے کفر اور نافرمانی کو پسند نہیں کرتا اور اگر وہ ان آلات کو معطل چھوڑ دیتا ہے نہ عبادت میں استعمال کرتا ہے اور نہ ہی گناہ میں تو نعمت کو ضائع کرنے کی وجہ سے یہ بھی ناشکری ہے اور دنیا میں جو کچھ پیدا کیا گیا ہے وہ بندے کے لئے بطور وسیلہ پیدا کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعے اُخروی سعادت تک پہنچے۔ اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے پس ہر اطاعت گزار اپنی اطاعت کی مقدار ان اسباب میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے جن کو اس نے اطاعت میں استعمال کیا اور وہ شخص جو سستی کرتے ہوئے ان اسباب کو استعمال نہیں کرتا یا گناہ گار جو ان اسباب کو اللہ تعالیٰ سے دُوری کے لیے استعمال کرتا ہے وہ ناشکرا ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے مطابق عمل نہ کرنے کی وجہ سے زیادتی کرنے والا ہے۔

تو نافرمانی اور اطاعت دونوں کو مشیئت شامل ہے لیکن ان کو محبت اور کراہت شامل نہیں ہے بلکہ بعض اوقات مراد محبوب ہوتی ہے اور کئی مرادیں ناپسندیدہ ہوتی ہیں اس دقیقہ سے آگے تقدیر کا راز ہے جس کے انشاء سے منع کیا گیا ہے اس سے پہلے مسئلہ حل ہو گیا وہ یہ کہ جب مشکور کا کوئی فائدہ نہیں تو شکر کا کیا مطلب؟

نیز اس سے دوسرا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے وہ یہ کہ شکر سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اس کی محبت کی جہت کی طرف پھیرا جائے اور جب نعمت اللہ تعالیٰ کے فضل سے جہت محبت کی طرف پھیری جائے گی تو مراد حاصل ہو جائے گی اور تمہارا فعل اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور چونکہ تم اس محل میں ہو لہٰذا تمہاری تعریف کی جاتی ہے اور اس کا تعریف کرنا اس کی طرف سے مزید ایک نعمت ہے وہی عطا کرتا ہے اور وہی تعریف بھی کرتا ہے اور اس کا ایک فعل دوسرے فعل کے لیے اس بات کا سبب ہے کہ وہ اس کی محبت میں کیا جائے تو ہر حال میں اس کا شکر ہے اور تم شکر کرنے کی صفت سے موصوف ہو۔ یعنی تم اس معنیٰ کا محل ہو جو شکر سے عبارت ہے یہ مطلب نہیں کہ تم اس کے موجد ہو جیسا کہ تمہاری یہ صفت ہے کہ تم عارف و عالم ہو یہ مطلب نہیں کہ تم علم کے خالق اور موجد ہو بلکہ تم اس کے محل ہو اور قدرت ازلی کے ذریعے آگہی میں ان صفات کا وجود پایا جاتا ہے پس تمہارا یہ وصف کہ تم شاکر ہو ایک چیز کو تمہارے لیے ثابت کرتا ہے اور تم بھی ایک چیز ہو کہ خالق اشیاء نے تمہیں بھی ایک شے بنایا ہے لیکن جب تم اپنے آپ کو ذاتی طور پر کچھ سمجھنے لگو تو تم کچھ بھی نہیں ہو لیکن جب اس ذات کی طرف نظر ہو جس نے اشیاء کو اشیاء بنایا تو تم ایک شے ہو کیوں کہ اس نے تمہیں ایک شے بنایا ہے لیکن جب یہ بات تمہارے پیش نظر نہ ہو تو تم کوئی چیز نہیں ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

اِعْمَلُوْا فَکُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ — عمل کرو جس کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے وہ کام

لہٗ ۔ (۱) اس کے لیے آسان کردیا گیا ہے۔

آپ نے یہ بات اس وقت ارشاد فرمائی جب آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ جب اس نے پہلے ہی اشیاء سے فراغت ہو چکی ہے تو عمل کی کیا ضرورت ہے۔

تو واضح ہوا کہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی قدرت کے جاری ہونے کی جگہ اور اس کے افعال کا محل ہے اگرچہ لوگ خود بھی اس کے افعال کا محل ہے اگرچہ لوگ خود بھی اس کے افعال میں سے ہیں لیکن بعض افعال، بعض کے لیے محل قرار پاتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی "اعملوا" (عمل کرو) اگرچہ آپ کی زبان پر جاری ہوا لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے ایک فعل ہے اور وہ مخلوق کے اس کا سبب ہے کہ عمل نفع بخش ہے اور ان کا علم اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے ایک فعل ہے اور علم اس داعیہ کو ابھارنے کا سبب ہے جو حرکت اور اطاعت کا باعث ہے اور اس داعیہ کا اٹھنا بھی اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے ہے اور وہ حرکت اعضاء کا سبب ہے اور یہ بھی افعالِ خداوندی میں سے ہے لیکن اس کے بعض افعال، دوسرے بعض کا سبب ہیں یعنی پہلا، دوسرے کے لیے شرط ہے جیسے جسم کی تخلیق، عرض کی تخلیق کا سبب ہے کیوں کہ عرض اس سے پہلے پیدا نہیں ہوتا اور حیات کی تخلیق، علم کی تخلیق کے لیے شرط ہے اور علم کی تخلیق ارادے کی تخلیق کے لیے شرط ہے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے افعال سے ہیں لیکن ان میں بعض، دوسرے بعض کا سبب ہیں یعنی شرط ہیں۔

اور شرط ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فعلِ حیات کی قبولیت کے لیے صرف جوہر تیار ہوتا ہے اور قبول علم کے لیے وہی تیار ہوتا ہے جس میں حیات ہو اور ارادے کو صرف علم والا ہی قبول کرتا ہے تو اس کے بعض افعال دوسرے بعض کے لیے اس اعتبار سے سبب بنے اس معنیٰ کے اعتبار سے نہیں کہ اس کے بعض افعال دوسروں کے لیے مُوجد نہیں بلکہ وہ غیر کے لیے شرطِ حصول کو تیار کرنے والے ہیں جب یہ بات ثابت ہو جائے تو آدمی توحید کے اس درجہ تک ترقی کرتا ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔

سوال:

اللہ تعالیٰ نے یہ کیوں فرمایا کہ عمل کرو ورنہ تمہیں سزا ہوگی اور نافرمانی پر تمہاری مذمت کی جائے گی حالانکہ ہمارے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں پس ہماری مذمت کیسے ہوتی ہے جب کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

جواب:

اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہمارے ایک عقیدے کا باعث بنتا ہے اور عقیدہ خوف پیدا کرنے کا سبب ہوتا ہے اور خوف کا پیدا ہونا خواہشات کو چھوڑنے اور دھوکے کے گھر (دنیا) سے کنارہ کشی کا سبب ہوتا ہے اور یہ بات بارگاہ خداوندی میں حاضری کا سبب بنتی ہے اور اللہ تعالیٰ اسباب کو پیدا کرنے والا اور ترتیب دینے والا ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۷۳۸، کتاب التفسیر

پس جس شخص کے لیے ازل میں سعادت سبقت لے گئی اس کے لیے یہ اسباب آسان ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ اسے اسی ترتیب اور سلسلہ کے ساتھ جنت میں پہنچا دیتے ہیں اور اسی سلسلے میں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کے لیے وہ کام آسان کر دیا گیا جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے اور جس شخص کے لیے ازل میں سعادت نے سبقت نہیں کی وہ اللہ تعالیٰ کے کلام، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ اور علماء کرام کے وعظ و نصیحت کو سننے سے دُور بھاگتا ہے تو جب سنے گا نہیں تو اسے علم نہیں ہوگا اور جب علم نہیں ہوگا تو ڈرے گا نہیں اور جب ڈرے گا نہیں تو دنیا کی طرف میلان کو ترک نہیں کرے گا اور جب دنیا کی طرف جھکاؤ کو نہیں چھوڑے گا تو شیطان کی جماعت میں رہے گا۔ اور ان سب کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

جب تمہیں یہ بات معلوم ہو گئی تو تمہیں اس بات پر تعجب ہوگا کہ ایک قوم زنجیروں کے ساتھ جنت کی طرف کھینچی جا رہی ہے اور وہ اسباب کی زنجیروں میں کھینچے جا رہے ہیں یعنی ان پر علم اور خوف مسلط ہے اور ہر ذلیل و رسوا شخص کو جہنم کی طرف کھینچا جا رہا ہے اور اس کے لیے بھی اسباب ہیں اور وہ غفلت، بے خوفی اور مغالطہ ہے تو متقی لوگوں کو جنت کی طرف زبردستی کھینچا جا رہا ہے اور مجرموں کو جہنم کی طرف بھی زبردستی کھینچا جا رہا ہے اور زور و زبردستی والا تو صرف اللہ تعالیٰ ہے جو واحد و قہار ہے اور اس جبار بادشاہ کے سوا کوئی قادر نہیں ہے۔

اور جب غافل لوگوں کی آنکھوں سے پردہ دُور ہوگا تو وہ اس کیفیت کو اسی طرح دیکھیں گے اس وقت ایک منادی کی ندا سنیں گے۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی ہے جو ایک ہے زبردست ہے۔ (۱)

حالانکہ وہ بادشاہ اللہ تعالیٰ واحد و قہار تو ہر دن موجود تھا صرف اسی دن تو نہیں ہوگا لیکن غافل اس ندا کو صرف اسی دن سنیں گے پس یہ اس بات کے بارے میں خبر ہے کہ غافلین کو نئے سرے سے کشفِ احوال ہوگا لیکن اس وقت وہ نفع نہیں دے گا۔ ہم جہالت اور اندھے پن سے اللہ تعالیٰ حلیم و کریم کی پناہ چاہتے ہیں کیوں کہ ہلاکت کے اصل اسباب یہی (جہالت اور غفلت) ہیں۔

فصل:

اللہ تعالیٰ کی پسند و ناپسند میں امتیاز

جب تک اس بات کی پہچان نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کو کیا پسند ہے اور کیا ناپسند اس وقت تک شکر بجا لانے اور ناشکری ترک کرنے کا عمل مکمل نہیں ہوتا کیوں کہ شکر کا معنیٰ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اس کے پسندیدہ مقامات میں استعمال کرنا ہے اور ناشکری کا مفہوم

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ غافر آیت ۱۶

اس کے برعکس ہے اور وہ یا تو نعمت کا استعمال بالکل چھوڑ دیتا ہے یا اسے اس جگہ استعمال کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔

اللہ تعالیٰ کی پسند و ناپسند کے درمیان تمیز کا ادراک دو باتوں سے ہوتا ہے ایک سماعت ہے جس کا تعلق آیات و احادیث سے ہے اور دوسری بات قلبی بصیرت ہے یعنی اعتبار کی نظر سے دیکھنا اور یہ دوسری بات مشکل ہے اسی لیے یہ نادر ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسل عظام کو مبعوث فرما کران کے ذریعے مخلوق کے لیے راستہ آسان کر دیا۔ اور اس بات کی پہچان بندوں کے افعال سے متعلق تمام احکام شرعیہ کی پہچان پر مبنی ہے تو جو آدمی اپنے تمام افعال میں احکام شرعیہ پر مطلع نہیں اس کے لیے شکر کا حق ادا کرنا بالکل ناممکن ہوتا ہے۔

دوسری بات یعنی غور و فکر اور اعتبار و قیاس کی نظر سے دیکھنا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو مخلوق موجود ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کا ادراک ہو جائے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس عالم میں جو کچھ پیدا فرمایا اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہے اور حکمت کے تحت مقصود ہے اور یہی مقصود محبوب ہے۔

پھر یہ حکمت دو قسموں یعنی جلی اور خفی میں تقسیم ہوتی ہے جلی (واضح) حکمت کی مثال یہ جاننا ہے کہ سورج کو پیدا کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعے رات اور دن میں امتیاز ہو جائے پس دن کمانے کے لیے ہو اور رات آرام کرنے کے لیے دیکھنے کے وقت حرکت آسان ہوتی ہے اور اندھیرے کے وقت سکون آسان ہوتا ہے سورج کی تمام حکمتیں یہی نہیں بلکہ یہ بھی اس کی حکمتوں میں سے ایک حکمت ہے اس میں دیگر گہری و دقیق حکمتیں ہیں اسی طرح بادلوں اور بارش برسنے کی حکمت کا علم ہے کہ ان کے ذریعے زمین میں سے طرح طرح کی سبزیاں نکلتی ہیں جو مخلوق کا کھانا اور جانوروں کا چارہ بنتی ہیں قرآن پاک نے ان حکمتوں کو بیان فرمایا ہے جو واضح ہیں اور لوگوں کے ذہنوں میں آسکتی ہیں دقیق و باریک حکمتیں جن تک ذہن کی رسائی نہیں ہوتی ان کو بیان نہیں فرمایا ارشاد خداوندی ہے۔

أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعِنَبًا وَقَضْبًا۔ (۱)

بے شک ہم نے اچھی طرح پانی بہایا (بارش برسائی) پھر زمین کو پوری طرح چیر کر اس میں سے غلہ اور انگور اور سبزی اگائے۔

تمام ستارے جن میں کواکب بھی ہیں اور ثوابت بھی، کی حکمت پوشیدہ ہے اس پر سب لوگ مطلع نہیں ہو سکتے مخلوق کے ذہن میں صرف اتنی بات آسکتی ہے کہ یہ آسمان کی زینت ہیں تاکہ ان کو دیکھنے سے آنکھیں لطف اندوز ہوں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ

بے شک ہم نے آسمان دنیا (پہلے آسمان) کو ستاروں کے

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ عبس آیات ۲۵ تا ۲۸

اُلکَوَاکِبِ - (۱) ساتھ زینت بخشی۔

تو عالم کے تمام اجزاء یعنی آسمان، ستارے، ہوائیں، سمندر پہاڑ، کانیں، نباتات، حیوانات اور حیوانات کے اعضاء بلکہ ایک ذرہ بھی بے شمار حکمتوں سے خالی نہیں ہے ایک حکمت، دس حکمتیں اور ہزار دس ہزار حکمتیں ہیں اسی طرح حیوان کے اعضاء کی بعض حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں جیسے اس بات کا علم کہ آنکھ دیکھنے کے لیے ہے پکڑنے کے لیے نہیں، ہاتھ پکڑنے کے لیے ہے چلنے کے لیے نہیں اور پاؤں چلنے کے لیے ہے سونگھنے کے لیے نہیں۔

لیکن باطنی اعضاء مثلاً آنتیں، پتہ، جگر، گردہ، رگیں، پٹھے عضلات (سخت گوشت) اور ان اعضاء میں سوراخ، خم، جال مڑا ہوا ہونا، نرمی سختی اور باقی تمام صفات کی حکمت کو سب لوگ نہیں جانتے اور جو لوگ جانتے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم کی نسبت بہت کم جانتے ہیں ارشاد خداوندی ہے۔

وَمَا اُوْتِیْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا - (۲) اور تمہیں علم سے تھوڑا سا حصہ دیا گیا ہے

تو جو شخص کسی چیز کو اس جہت کے غیر میں استعمال کرتا ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے اور اس طریقے پر استعمال نہیں کرتا جس کا ارادہ کیا گیا ہے وہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتا ہے جو شخص کسی کو اپنے ہاتھ سے مارتا ہے وہ ہاتھ کی نعمت کی ناشکری کر رہا ہے کیوں کہ ہاتھ کو پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہلاکت میں ڈالنے والی چیز کو دور کرے اور نفع بخش چیز کو پکڑے اس لیے نہیں کہ اس کے ذریعے دوسرے کو ہلاک کر دے۔

جو آدمی غیر محرم کے چہرے کو دیکھتا ہے وہ آنکھوں اور سورج کی صورت میں حاصل ہونے والی نعمت کی ناشکری کرتا ہے کیوں کہ دیکھنے کا عمل ان دونوں (آنکھ اور سورج) سے مکمل ہوتا ہے اور ان کو پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے ذریعے ان چیزوں کو دیکھے جو اسے دین و دنیا میں نفع دیں اور نقصان دہ امور سے محفوظ رہے لیکن اس نے ان کو غیر مقصود امور میں استعمال کیا کیوں کہ مخلوق کو پیدا کرنے اور دنیا اور اس کے اسباب کو پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ان چیزوں کی مدد سے اللہ تعالیٰ تک پہنچیں اور اللہ تعالیٰ کی محبت و انس کے بغیر اس تک پہنچنا ممکن نہیں نیز اس تک رسائی کے لئے دنیا کے دھوکے سے بچنا بھی ضروری ہے۔

نیز اُنس کے حصول کے لیے دائمی ذکر ضروری ہے اور محبت، اس معرفت کے بغیر نہیں ہو سکتی جو دوام فکر سے حاصل ہوتی ہے اور ذکر و فکر دوام اسی وقت ہو سکتا ہے جب بدن کو دوام حاصل ہو اور بدن کے بقا کے لیے غذا ضروری ہے اور غذا کی تکمیل زمین، پانی اور ہوا کے بغیر نہیں ہو سکتی اور اس امر کی تکمیل کے لیے آسمان و زمین اور تمام ظاہری و باطنی اعضاء کی تخلیق

---

(۱) قرآن مجید سورۂ الصافات آیت ۶

(۲) قرآن مجید سورۂ اسراء آیت ۸۵

ضروری ہے تو یہ سب چیزیں بدن کے لیے ہیں اور بدن نفس کی سواری ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا وہی نفس ہے جو طویل عبادت اور معرفت کے ذریعے نفس مطمئنہ بن جاتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَا أُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ۔ (۱)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا میں ان سے رزق نہیں چاہتا۔

تو جو آدمی کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے علاوہ میں استعمال کرتا ہے تو وہ ان تمام اسباب کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرنے والا ہوتا ہے جو اس گناہ کے ارتکاب کے لیے ضروری تھے ہم خفیہ حکمتوں کے سلسلے میں ایک مثال ذکر کرتے ہیں جو زیادہ خفی نہیں تاکہ اس پر قیاس کر کے نعمتوں پر شکر اور ناشکری کا طریقہ معلوم کیا جاسکے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت درہم اور دینار (روپے پیسے) کا پیدا کرنا بھی ہے اور ان دونوں کے ساتھ دنیا قائم ہے حالانکہ یہ دونوں پتھر ہیں جن کا ذاتی طور پر کوئی نفع نہیں لیکن انسان ان دونوں کا محتاج ہے کیوں کہ اسے بہت سی چیزوں مثلاً کھانے، لباس اور دیگر تمام حاجات میں ان کی ضرورت پڑتی ہے اور آدمی بعض اوقات اس چیز سے عاجز ہوتا ہے جس کا وہ محتاج ہوتا ہے اور ایسی چیز کا مالک ہوتا ہے جس کی اسے ضرورت نہیں ہوتی جیسے ایک شخص زعفران کا مالک ہے لیکن اسے اونٹ کی ضرورت ہے جس پر سوار ہو اور جو آدمی اونٹ کا مالک ہوتا ہے بعض اوقات اسے اس کی نہیں بلکہ اسے زعفران کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا دونوں کے درمیان معاوضہ کی ضرورت پڑتی ہے اور عوض کی مقدار مقرر کرنا ضروری ہے کیوں کہ اونٹ والا پورا اونٹ، زعفران کی پوری مقدار کے مقابلے میں خرچ نہیں کرسکتا کیوں کہ زعفران اور اونٹ کے درمیان کوئی مناسبت نہیں ہے کہ کہا جائے وزن اور صورت میں اس کی مثل دیا جائے اسی طرح جو آدمی کپڑے کے بدلے مکان خریدتا ہے یا موزے کے بدلے غلام یا گدھے کے بدلے میں آٹا خریدنا چاہتا ہے تو ان چیزوں کے درمیان کوئی مناسبت نہیں ہے اور معلوم نہیں کہ ایک اونٹ کتنے زعفران کے مقابلے میں ہوگا تو معاملات نہایت مشکل ہوگئے پس ان اشیاء کے درمیان جو ایک دوسرے سے دور اور متنفر ہیں ایک واسطہ کی ضرورت پڑی جو ان کے درمیان عدل کے ساتھ فیصلہ کرے اور ہر ایک کے رتبہ اور منزلت کی پہچان کرائے یہاں تک کہ جب منزلیں پکی اور رتبے مرتب ہوگئے تو اس کے بعد مساوی اور غیر مساوی کی پہچان ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے دینار اور درہم بطور حاکم پیدا فرمائے جو تمام احوال کے درمیان واسطے کا کام دیتے ہیں اور ان کے ذریعے مالوں کی قیمت کا اندازہ ہوتا پس کہا جاتا ہے کہ یہ اونٹ سو دینار کے برابر ہے اور اتنا زعفران ایک سو دینار کے برابر ہے تو اس اعتبار سے کہ یہ دونوں (اونٹ اور زعفران) ایک چیز کے ذریعے باہم برابر قرار دیئے گئے لہٰذا برابر ہوگئے۔

نقدین (درہم و دینار) کے ذریعے چیزوں کو برابر کرنا اس لیے ممکن ہوا کہ ذاتی طور پر ان کی کوئی غرض نہیں ہے اگر

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ الذاریات آیت ۵۶، ۵۷

ذاتی طور پر بھی ان کی کوئی غرض ہوتی تو جس مقصد کے لیے ہوئے اسی مطلب والے کے حق میں ان کو ترجیح ہوتی دوسرے کے حق میں نہ ہوتی اور یوں معاملہ درست نہ ہوتا۔

تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو پیدا فرمایا کہ یہ سب لوگوں کے ہاتھوں میں جائیں اور مالوں کے درمیان عادل کے ساتھ فیصلہ کریں اور ان میں ایک حکمت یہ بھی رکھی ہے کہ ان کے ذریعے تمام اشیاء تک رسائی ہوتی ہے کیوں کہ یہ دونوں ذاتی طور پر محبوب ہیں لیکن ان دونوں سے کوئی غرض متعلق نہیں ہے اور تمام اشیاء کی طرف ان کی نسبت برابر ہے تو جو آدمی ان دونوں کا مالک ہو گیا گویا وہ تمام چیزوں کا مالک ہو گیا وہ اس شخص کی طرح نہیں ہے جو صرف کپڑے کا مالک ہے کیوں کہ وہ تو صرف کپڑے کا مالک ہے اگر اسے کھانے کی حاجت ہو تو بعض اوقات غلے کا مالک کپڑے میں رغبت نہیں رکھتا کیوں کہ ہو سکتا ہے وہ جانور میں رغبت رکھتا ہو تو ایسی چیز کی حاجت ہوئی جو ظاہر میں تو کچھ نہیں لیکن معنوی طور پر سب کچھ ہے اور ایسی کسی چیز کی نسبت مختلف اشیاء کی طرف مساوی ہوتی ہے اور وہ خصوصی طور پر فائدہ دیتی ہے مثلاً آئینے کا اپنا رنگ نہیں ہوتا لیکن وہ ہر ایک کا رنگ ظاہر کرتا ہے اسی طرح سونے چاندی (درھم و دینار) سے ذاتی طور پر کوئی غرض نہیں ہوتی لیکن یہ ہر غرض کے لیے وسیلہ ہیں اور جیسے حرف کا اپنا کوئی معنیٰ نہیں ہوتا لیکن اس کے ذریعے دوسرے کلمات میں معانی ظاہر ہوتے ہیں تو یہ دوسری حکمت ہے۔

ان (درھم و دینار) میں ایک حکم مزید ہے جس کا ذکر طویل ہے تو جو کوئی روپے پیسے میں وہ عمل نہ کرے جو ان کے لائق ہے بلکہ غرض مقصود کے خلاف ہو تو اس نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کی لہٰذا جو آدمی ان کو خزانہ بنا کر رکھتا ہے وہ ان پر زیادتی کرتا ہے اور ان کی حکمت کو باطل کر رہا ہے۔ اور وہ اس طرح ہے جیسے کوئی مسلمانوں کے حاکم کو قید کرلے اور وہ اس قید کی وجہ سے کوئی حکم نہ دے سکے کیوں کہ جب مال جمع کر دیا گیا تو حکم ضائع ہو گیا اور غرض مقصود حاصل نہ ہوئی اور درھم و دینار کو کسی خاص آدمی زید، عمرو وغیرہ کے لیے نہیں پیدا کیا گیا کیوں کہ انفرادی طور پر اس میں کسی کی غرض نہیں ہے اس لیے کہ یہ تو پتھر ہیں یہ تو اس لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ لوگوں کے ہاتھوں میں گردش کریں اور لوگوں کے درمیان حاکم بن جائیں نیز مقداروں کی پہچان کی علامت بنیں اور مراتب کی قیمت متعین کریں پس اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے بارے میں بتایا جو موجودات کے صفحات پر لکھی گئی تحریر خداوندی کو پڑھنے سے عاجز ہیں وہ تحریر جو قدرتی خط سے منقوش ہے جس میں حرف ہے نہ آواز اسے ظاہری آنکھوں سے دیکھا نہیں جاتا بلکہ بصیرت کی آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اپنا کلام سنایا اور کلام حروف اور آواز کے ذریعے ان تک وہ معنیٰ پہنچا جس کے ادراک سے وہ عاجز ہیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ — اور وہ لوگ جو سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور
وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ — اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ہیں انہیں

بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ - (۱) دردناک عذاب کی خبر دیجئے۔

تو جو شخص درہم اور دینار سے سونے چاندی کے برتن بناتا ہے وہ نعمت کی ناشکری کر رہا ہے اور اس کا حال تو جمع کرنے والے سے بھی برا ہے کیوں کہ اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو حاکم کو قابو کرکے اس کو کپڑا بُننے یا جھاڑو پھیرنے پر لگا دیتا ہے یا دیگر گھٹیا قسم کے کام لیتا ہے قید تو اس سے آسان ہے سونے چاندی کے برتن اس لیے برے ہیں کہ برتن تو مائع چیزوں کی حفاظت کے لیے ہوتے ہیں اور اس مقصد کے لیے پیتل تانبا اور مٹی کے برتن کفایت کرتے ہیں لیکن درھم اور دینار کا مقصود مٹی اور لوہے سے حاصل نہیں ہوتا پس جس آدمی کے سامنے یہ حقیقت منکشف نہیں ہوتی اسے زبان رسالت سے اس کا ترجمہ سنا دیا اور اس کے لیے کہا گیا۔

مَنْ شَرِبَ فِیْ اٰنِیَةٍ مِنْ ذَهَبٍ اَوْ فِضَّةٍ فَكَاَنَّمَا یُجَرْجِرُ فِیْ بَطْنِهٖ - (۲) جو آدمی سونے یا چاندی کے برتن میں پیتا ہے گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ ڈال رہا ہے۔

اور جو آدمی درھم اور دینار سے ذریعے سودی کاروبار کرتا ہے وہ وہ بھی نعمت کی ناشکری اور ظلم کرتا ہے کیوں کہ یہ تو دوسرے مقاصد کے لیئے پیدا کیئے گئے اپنے لیے نہیں اس لیے کہ ان کی ذاتی غرض کوئی نہیں جب جب ان کی ذاتی تجارت کی گئی تو وضع حکمت کے خلاف کو مقصود بنایا گیا۔ کیوں کہ نقدی کو جس مقصد کے لئے وضع کیا گیا ہے اس کے غیر کے لیے طلب کرنا ظلم ہے اور جس آدمی کے پاس کپڑا ہو لیکن نقدی نہ ہو تو بعض اوقات وہ اس کے ذریعے کھانا اور جانور خریدنے پر قادر نہیں ہوتا کیوں کہ کبھی کھانے اور جانور کا سودا کپڑے کے بدلے نہیں ہوتا تو وہ اسے دوسری نقدی کے بدلے بیچنے پر مجبور ہوتا ہے تاکہ نقدی حاصل ہو اور اس کے ذریعے مقصود تک پہنچے۔

کیوں کہ نقدین (سونا چاندی) دوسری چیزوں تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں ذاتی طور پر ان کی کوئی غرض نہیں ہے اور احوال میں ان کا مقام وہی ہے جو کلام میں حرف کا مقام ہے جیسے

نحوی کہتے ہیں کہ حرف وہ (کلمہ) ہے جو اپنے غیر میں پائے جانے والے معنی کے لیے آیا ہے یا جس طرح رنگوں میں آئینہ ہے۔

لیکن جس شخص کے پاس نقدی ہے اگر اس کے لیے نقدی کا نقدی کے عوض سودا درست ہو تو وہ اسی کام کو اختیار کرے گا اور نقدی اس کے پاس قید ہو جائے گی اور خزانے کی طرح ہو گی حالاں کہ بادشاہ یا قاصد جو دوسروں تک پہنچتا ہے، کو قید کر دینا ظلم ہے لہٰذا نقدی کو نقدی کے بدلے بیچنے کا مقصد ذخیرہ بنانا ہی ہوتا ہے اور یہ ظلم ہے۔

سوال :

سونے اور چاندی کو ایک دوسرے کے بدلے بیچنا جائز اور درھم کو درھم کے بدلے اکی زیادتی کے ساتھ بیچنا ناجائز کیوں ہے ؟

جواب :

مقصود تک پہنچنے کے معاملے میں یہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں کیوں کہ بعض اوقات ان میں سے ایک کے ذریعے مقصود تک رسائی آسان ہوتی ہے کیوں کہ وہ زیادہ ہوتا ہے جیسے درھموں کو ضرورتوں میں تھوڑا تھوڑا خرچ کیا جاتا ہے اور اگر یہ سودا جائز نہ ہو تو خاص اسی سے مقصود کا حاصل کرنا مشکل ہو جائے اور مقصود اس کے ذریعے دوسرے تک پہنچتا ہے اور درھم کو درھم کے بدلے بیچنا جائز ہے کیوں کہ جب دونوں طرف کے درھم برابر ہوں تو عقل مند آدمی کو اس میں رغبت نہیں ہوتی اور کوئی بھی تاجر اس میں مشغول نہیں ہوتا کیوں کہ یہ ایک بے مقصد کام ہے جیسے درھم کو زمین پر رکھ کر پھر اسے ہی اٹھا لے اور ہمیں عقل مند لوگوں سے اس بات کا خطرہ نہیں ہے کہ وہ اپنا وقت درھم کو زمین پر رکھ کر پھر اسے اٹھانے پر صرف کریں اس لیے ہم اس چیز سے منع نہیں کرتے جس کی طرف نفس کا شوق نہ ہو البتہ یہ کہ ان میں سے ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ عمدہ ہو۔ اور اس کے رواج کا تصور بھی نہیں ہے کیوں کہ عمدہ درھم والا ردی قسم کا درھم لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا لہذا عقد کی کوئی صورت نہیں بنتی۔

اور اگر وہ ردی درھم زیادہ تعداد میں طلب کرے تو بعض اوقات اس کا قصد ہوتا ہے تو ہم یقیناً ایسے سودے سے منع کرتے ہیں اور یہ حکم دیتے ہیں کہ عمدہ اور ردی دونوں قسم کے درھم برابر ہیں یعنی کھرے پن اور کھوٹے پن کو اس چیزوں میں دیکھنا مناسب ہے جو ذاتی طور پر مقصود ہیں اور جن سے ذاتی طور پر کوئی غرض نہ ہو ان کی ایسی باریک تبدیلیوں کو دیکھنا مناسب نہیں ہے تو یہاں وہ شخص ظالم قرار پاتا ہے جو نقود کو کھوٹے اور کھرے میں تقسیم کرتا ہے حتی کہ وہ ذاتی طور پر مقصود بن جاتے ہیں حالانکہ ان کا حق تو یہ تھا کہ وہ مقصود نہ ہوں۔

اگر ایک درھم دوسرے درھم کے بدلے (برابر، برابر) بطور ادھار بیچا جائے تو یہ جائز نہیں کیوں کہ اس صورت میں احسان کا ارادہ کرتے ہوئے چشم پوشی سے کام لیا جاتا ہے اور قرض جس کی فضیلت ہے، کی صورت میں اس بیع کی حاجت باقی نہیں رہتی اس میں نہ تعریف ہے نہ اجر جب کہ قرض کی صورت میں تعریف بھی ہے اور اجر بھی، نیز یہ بیع ظلم بھی ہے کیوں کہ یہ خصوصی چشم پوشی کو ضائع کرنا اور اسے معاوضے کی صورت میں لانا ہے۔

اسی طرح غلہ غذا کے لیے پیدا کیا گیا ہے یا یہ کہ اسے علاج کے لیے استعمال کیا جائے لہذا اسے اس جہت سے پھیرنا نہیں چاہیے اگر اس میں معاملات کا دروازہ کھول دیا جائے تو یہ لوگوں کے ہاتھوں میں بند ہو کر رہ جائے گا اور کھانا جو اس سے مقصود ہے پیچھے رہ جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے طعام کو کھانے کے لیے پیدا کیا ہے اور کھانے کی ضرورت بہت شدید ہے لہذا اسے غیر محتاج کے ہاتھ سے نکل کر محتاج کے ہاتھ میں آنا چاہیے اور غلے کا سودا وہی کرتا ہے جسے اس کی ضرورت نہ ہو کیوں کہ جس کے پاس طعام ہو تو اگر ضرورت مند ہے تو اسے کیوں نہیں کھائے گا وہ اسے تجارتی سامان کیوں بناتا ہے اور اگر اس نے اسے سامان تجارت قرار دیا ہے تو اسے چاہیے کہ اس پر بیچے جو اسے غلے کے علاوہ کوئی چیز بطور معاوضہ دیتا ہے جو آدمی اسے اس کے بدلے میں بعینہ یہ غلہ دیتا ہے وہ بھی

اس کو کھانے سے بے نیاز ہے اسی لیے شریعت میں ذخیرہ اندوز پر لعنت آئی ہے اور سخت سزا کا ذکر آیا جیسے ہم نے آدابِ کسب کے بیان میں ذکر کیا ہے۔

ہاں کھجور کے بدلے گندم بیچی جاسکتی ہے کیوں کہ ان میں سے ایک چیز دوسری چیز کی غرض کو پورا نہیں کرسکتی گندم کا ایک صاع گندم کے صاع کے بدلے میں بیچنے والا معذور نہیں ہے لیکن وہ فضول کام کرتا ہے اس لیے اسے منع کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ایسی باتوں کو کوئی بھی گوارہ نہیں کرتا ہاں جب عمدگی میں تفاوت ہو لیکن جس کے پاس عمدہ غلہ ہو وہ اس کے برابر ردی غلہ لینے پر تیار نہیں ہوتا لیکن دو صاع ردی کے مقابلے میں ایک صاع جید (عمدہ) کا قصد کیا جاسکتا ہے لیکن جب غلہ ضروریات میں سے ہے اور اصل فائدہ میں عمدہ اور ردی میں کوئی فرق نہیں ہے البتہ لذت میں اختلاف ہے اس لیے شریعت نے لذت کی غرض کو ان چیزوں میں ساقط کردیا ہے جو انسانی قوام کا ذریعہ ہیں سود کو حرام قرار دینے میں شریعت نے اسی حکمت کو پیش نظر رکھا ہے فن فقہ سے اعراض کرنے کے بعد ہمیں (امام غزالی کو) اس حکمت کا انکشاف ہوا تو اسے بھی فقہیات میں شامل کرتے ہیں کیوں کہ جتنی باتیں ہم نے خلافیات کے سلسلے میں لکھی ہیں ان میں سے یہ سب سے زیادہ قوی ہے۔

اس سے حضرت امام شافعی رحمہ اللہ کے موقف کی ترجیح واضح ہوتی ہے کہ انہوں نے ربوا (سود) کے سلسلے میں (احادیث شریف میں مذکور اشیاء میں) اس بات کو علت قرار دیا کہ وہ کھانے کی چیزیں ہیں (لہٰذا امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی دو چیزوں کو کمی زیادتی کے ساتھ بیچنا سود ہے جو کھائی جانے والی ہوں جب کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک جو چیزیں تولی یا ماپی جاتی ہیں ان کو کمی زیادتی کے ساتھ بیچنا سود ہے چوں کہ حضرت امام غزالی رحمہ اللہ شافعی المسلک ہیں اس لیے انہوں نے اس مسلک کو ترجیح دی ہے ۱۲ ہزاروی)

(وہ فرماتے ہیں) اگر (تولے جانے کی وجہ سے) چونا سودی اشیاء میں داخل ہو تو کپڑے اور جانور بدرجہ اولیٰ داخل ہوں گے اور اگر حدیث شریف میں نمک کا ذکر نہ ہوتا تو حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا مذہب سب سے زیادہ قوی ہوتا کیوں کہ ان کے نزدیک سودی اشیاء کو اس بات سے خاص کیا ہے کہ وہ رزق ہے۔

لیکن شریعت نے جن جن معانی کی رعایت کی ہے ان کا کسی تعریف کے ساتھ منضبط ہونا ضروری ہے اور یہاں یہ حد ممکن ہے کہ وہ روزی ہو اور یہ قید لگانا بھی ممکن ہے کہ وہ کھائی جانے والی چیزیں ہوں اور شریعت نے کھائی جانے والی اشیاء کے ساتھ حد مقرر کرنا زیادہ مناسب سمجھا کیوں کہ بقا کے لیے یہ ضروری ہیں اور شریعت کا حد مقرر کرنا بعض اوقات ایسے اطراف کو محیط ہوتا ہے جن میں اصل معنیٰ جو حکم کا باعث ہے مضبوط نہیں ہوتا لیکن ضرورت کے تحت اس طرح کی تعریف کی جاتی ہے اور اگر حد مقرر نہ کی جائے تو لوگ جوہر معنیٰ کی اتباع میں حیران ہو جاتے کیوں کہ احوال واشخاص کے مختلف ہونے سے ایک ہی حکم بدل جاتا ہے اگرچہ وہ معنیٰ کتنا قوی ہی کیوں نہ ہو لہٰذا حد ضروری ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی حدود سے تجاوز کرتا ہے اس

نَفْسَہٗ ۔ (۱) نے اپنے نفس پر ظلم کیا۔

اور اس لیے کہ ان الفاظ کے معانی میں شریعتوں کا اختلاف نہیں ہے حد بندی میں اختلاف ہے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں شراب کی حرمت کی حد نشہ دینا ہے اور ہماری شریعت میں اس کا نشہ آور اشیا کی جنس سے ہونا ہے کیوں کہ اس کا قلیل استعمال، کثیر کی دعوت دیتا ہے اور جو اس کی تعریف میں داخل ہے وہ جنس ہونے کے اعتبار سے حرام ہونے میں شامل ہوگی جیسے اصل معنیٰ حرمت حکمتِ اصلیہ کے تحت ہے۔

تو نقدین (درہم و دینار) کی خفیہ حکمتوں میں سے یہ ایک مثال ہے لہٰذا اس مثال کے ذریعے نعمت کا شکر ادا کرنے اور ناشکری کو سمجھنا چاہیے تو جو چیز کسی حکمت کے تحت پیدا کی گئی ہے اس حکمت سے اسے پھیرنا مناسب نہیں اور اس بات کی پہچان اسے ہوتی ہے جو حکمت کی معرفت رکھتا ہے ارشاد خداوندی ہے۔

وَمَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا ۔ (۲) اور جسے حکمت دی گئی اسے بہت زیادہ بھلائی دی گئی۔

لیکن جس دل میں خواہشات کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں اور وہ شیطان کے کھیل کا میدان ہو اس میں حکمت کے جواہر نہیں آسکتے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَوْلَا اَنَّ الشَّیَاطِیْنَ یَحُوْمُوْنَ عَلٰی قُلُوْبِ بَنِیْ اٰدَمَ لَنَظَرُوْا اِلٰی مَلَکُوْتِ السَّمَاءِ ۔ (۳) اگر شیطان انسانوں کے دلوں کے گرد نہ گھومتے تو وہ آسمان کے ملکوت (اسرار غیبیہ) کو دیکھتے۔

جب تم نے اس مثال کو پہچان لیا تو اپنی حرکت و سکون اور بولنے نیز خاموش رہنے اور اپنے ہر عمل کو قیاس کرو کہ وہ شکر ہوگا یا ناشکری کیوں کہ ان دو باتوں کے علاوہ کوئی بات متصور نہیں ہوگی ہم عوام الناس کے سمجھنے کے لیے ان میں سے بعض کو فقہی زبان میں کراہت سے موصوف کرتے ہیں اور بعض کو خطر (ممنوع) کہتے ہیں لیکن اہل دل کے نزدیک یہ سب ممنوع و حرام ہیں میں کہتا ہوں مثلاً اگر کوئی شخص دائیں ہاتھ سے استنجاء کرتا ہے تو اس نے ہاتھوں کی نعمت کی ناشکری کی کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے دو ہاتھ پیدا فرمائے اور ان میں سے ایک کو دوسرے کے مقابلے میں قوی بنایا اور جو قوی ہے وہ زیادہ فضیلت اور شرف کا مستحق ہے جب کہ ناقص کو فضیلت دینا عدل کے خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ عدل ہی کا حکم دیتا ہے پھر جس ذات نے دو ہاتھ عطا فرمائے ہیں اس نے انسان کو ان دونوں ہاتھوں کا محتاج رکھا ہے کہ ان کو عمل میں

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ طلاق آیت ۱

(۲) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۲۶۹

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۳۵۳ مرویات ابوہریرہ

لائیں جن میں سے بعض اعمال اچھے ہیں جیسے قرآن پاک کو ہاتھ لگانا اور بعض گھٹیا ہیں جیسے نجاست کو دور کرنا اب اگر قرآن پاک کو بائیں ہاتھ سے چھُوا جائے اور نجاست کو دائیں ہاتھ سے دُور کیا جائے تو اس نے شریف کو خسیس کام پر لگا دیا تو اس طرح اس کے حق میں بھی ظلم کیا اور عدل سے منہ پھیرا۔ اسی طرح اگر قبلہ رُخ تھوکتا ہے یا قضائے حاجت کے لیے ادھر منہ کرتا ہے تو جہات اور وسعت عالم میں اللہ تعالیٰ نے جو نعمت پیدا کی ہے اس کی ناشکری کرتا ہے کیونکہ جہات کے پیدا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے لیے حرکت کرنے میں کشادگی ہو اور جہات کو اس طرح تقسیم کیا کہ بعض میں کچھ شرف رکھا اور بعض میں نہیں رکھا۔

مثلاً اس نے شرافت والی جہت میں ایک گھر بنا کر اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے تاکہ اس کی طرف دلوں کا میلان ہو اور دل اس کے ساتھ مقید ہو جائیں اور جب تم اپنے رب کی عبادت کرو تو اس کے سبب تمہارا بدن بھی اسی جہت کی طرف سکون اور وقار کے ساتھ مقید ہو پس جب تم اپنے افعال کو اچھے افعال جیسے عبادات اور خسیس افعال مثلاً قضائے حاجت اور تھوکنے کے درمیان تقسیم کرو گے تو اب اگر تم قبلہ کی طرف تھوک ڈالتے ہو تو گویا تم نے اس پر ظلم کیا اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کی کیوں کہ اس نے قبلہ کو کمالِ عبادت کے لیے بنایا تھا۔

اسی طرح جب تم موزے پہنتے ہوئے بائیں طرف سے ابتدا کرتے ہو تو گویا تم نے ظلم کیا کیونکہ موزہ پاؤں کی حفاظت کرتا ہے اور پاؤں کا اس میں حصہ ہے اور ان حصوں میں مناسب یہ ہے کہ اشراف سے شروع کریں یہی عدل ہے اور یہی حکمت کو پورا کرنا ہے جب کہ اس کے خلاف ظلم ہے اور موزوں اور پاؤں کے سلسلے میں حاصل ہونے والی نعمت کی ناقدری و ناشکری ہے اور عارفین کے نزدیک یہ بہت بڑا گناہ ہے اگرچہ فقیہ اسے مکروہ کہتے ہیں۔

حتیٰ کہ کسی عارف نے گیہوں کے بہت سے پیمانے جمع کئے اور ان کو صدقہ کرنے لگے اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا میں نے ایک مرتبہ بھول کر جُوتا بائیں پاؤں سے پہننا شروع کیا تو میں صدقہ کے ذریعے اس کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں ہاں فقیہ اس قسم کے بڑے بڑے امور نہیں لکھ سکتا کیوں کہ اس مسکین کے ذمہ عوام کی اصلاح ہے جو جانوروں کے درجہ میں ہیں اور وہ ایسے بڑے بڑے گناہوں میں غوطہ زن ہیں کہاں کہنے سامنے اس قسم کی معمولی باتوں کی کوئی حقیقت نہیں مثلاً جو آدمی بائیں ہاتھ میں پیالہ لے کر شراب پیئے تو اسے یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس نے دو گناہ کئے ایک یہ کہ شراب پی اور دوسرا یہ کہ پیالہ بائیں ہاتھ میں لیا یا کسی شخص نے نماز جمعہ کے وقت آزاد آدمی کا سودا کیا تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے دو وجہ سے شریعت کی مخالفت کی ایک تو اذانِ جمعہ کے وقت سودا کیا اور دوسرا آزاد آدمی کو بیچا۔

جس شخص نے مسجد کے محراب میں قبلہ رُخ ہو کر پاخانہ کیا تو یہ کہنا قبیح ہے کہ اس نے قضائے حاجت کے آداب کو نظر انداز کر دیا اور قبلہ کو اپنی دائیں طرف نہیں رکھا کیوں کہ قبلہ رُخ ہونے سے اتنا بڑا گناہ لازم نہیں آتا جتنا مسجد کے محراب میں پاخانہ پھرنا بڑا گناہ ہے (۱۲ ہزاروی) تو تمام گناہ اندھیریاں ہیں لیکن ان میں سے بعض دوسرے بعض کے مقابلے میں بڑے گناہ ہیں۔ لہٰذا بعض کے پہلو میں دوسرے بعض (چھوٹے گناہ) مٹ جاتے ہیں۔

مثلاً مالک بعض اوقات اپنے غلام کو اس بات پر جھڑکتا ہے کہ اس نے اس کی اجازت کے بغیر چھری استعمال کی اور اگر وہ اس (مالک) کے نہایت عزیز بیٹے کو اسی چھری سے قتل کر دے تو اجازت کے بغیر چھری کے استعمال کے لئے کوئی الگ حکم نہیں دے گا اور نہ ہی اسے اس پر سزا دے گا تو وہ تمام آداب کہ انبیاء کرام اور اولیاء عظام ان کی رعایت کرتے ہیں اور ہم فقہ کے سلسلے میں عوام سے چشم پوشی کرتے ہیں تو اس کا سبب یہی ضرورت ہے اور اس درجے میں نقصان جو بندے کو قرب کے درجات تک پہنچاتا ہے ہاں یہ ہے کہ بعض گناہ بندے کے قرب میں نقص ڈالنے اور مقام و مرتبے سے گرانے میں موثر ہیں جب کہ بعض گناہ اسے کلیتاً حدودِ قرب سے نکال کر عالمِ بُعد کی طرف لے جاتے ہیں جو شیطان کا ٹھکانہ ہے۔

اسی طرح جو شخص کسی فوری اور اہم ضرورت اور کسی غرض صحیح کے بغیر درخت کی ٹہنی توڑتا ہے وہ درختوں اور ہاتھوں کی تخلیق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتا ہے ہاتھ کے سلسلے میں اس طرح کہ اسے فضول کاموں کے لیے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ عبادت اور عبادت پر مددگار اعمال کے لیے پیدا کیا گیا اور درخت کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا اس کے رگیں بنائیں اس تک پانی پہنچایا اس میں غذا کے حصول بڑھنے کی قوت پیدا فرمائی تاکہ وہ مکمل طور پر نشوونما حاصل کرے اور اس سے بندے نفع اٹھائیں تو اس کی نشوونما کے مکمل ہونے سے اسے اس طرح توڑنا کہ اس سے بندوں کو نفع حاصل نہ ہو مقصودِ حکمت کے خلاف ہے اور عدل سے عدول بھی۔ اگر اس کو توڑنے میں کوئی صحیح غرض ہو تو توڑ سکتا ہے کیوں کہ درخت اور جانور انسانی اغراض پر فدا ہونے کے لیے بنائے گئے ہیں اور یہ دونوں فنا اور ہلاک ہونے والے ہیں پس اشرف کو کچھ مدت تک باقی رکھنے کے لیے ادنیٰ کو فنا کرنا اسے بے مقصد ضائع کرنے سے بہتر ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ۔ (۱)

اور تمہارے لیے مسخر کر دیا جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے یہ سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔

ہاں اگر دوسرے کی مِلک سے توڑے تو بھی وہ ظالم ہوگا اگرچہ محتاج ہو کیوں کہ ایک معین درخت سب لوگوں کی حاجتوں کو پورا نہیں کر سکتا بلکہ وہ صرف ایک شخص کی حاجت کو ہی پورا کرتا ہے اور اگر کسی وجہ ترجیح اور اختصاص کے بغیر ایک شخص کے لیے اسے خاص کر دیا جائے تو یہ ظلم ہے اور صاحبِ اختصاص تو وہ شخص ہے جس نے بیج حاصل کرکے زمین میں ڈالا اس کی طرف پانی چلایا اور اس کی نگرانی کی وہ دوسروں کی نسبت اس کا زیادہ حق رکھتا ہے اس طرح اسے ترجیح حاصل ہوگی۔

پھر اگر وہ درخت غیر مملوکہ زمین میں پیدا ہوا اور اس میں کسی خاص آدمی کی محنت شامل نہیں ہے جس نے اسے گاڑا تو اختصاص کی کوئی اور وجہ تلاش کرنا ہوگی اور وہ اسے لینے میں پہل کرنا ہے کیوں کہ پہل کرنے والے کو سبقت کی خصوصیت حاصل ہوتی ہے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہی اس کا زیادہ حقدار ہو فقہاء نے اس ترجیح کو ملک سے تعبیر کیا ہے۔

اور یہ محض مجازی ملکیت ہے حقیقی مالک تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے وہی آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اور بندہ کیسے کسی چیز کا مالک ہو سکتا ہے وہ اپنی ذات کا بھی (ذاتی طور پر) مالک نہیں بلکہ وہ تو غیر کی ملکیت ہے ہاں مخلوق

اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور زمین اللہ تعالیٰ کا دستر خوان ہے اور اس نے اپنے دستر خوان سے حسب حاجت کھانے کی اجازت دی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے غلاموں کے لیے دستر خوان بچھاتا ہے اب اگر ایک شخص دائیں ہاتھ میں لقمہ پکڑے اور انگلیوں میں دبا لے اور ایک دوسرا غلام آکر اس سے چھیننا چاہے تو یہ ممکن نہیں لیکن اس کی یہ وجہ نہیں کہ پکڑنے کی وجہ سے وہ اس لقمے کا مالک ہو گیا کیوں کہ ہاتھ اور ہاتھ کا مالک دونوں مملوک ہیں لیکن ایک معین لقمہ تمام غلاموں کی حاجت کو پورا نہیں کر سکتا تو تخصیص میں عدل اسی صورت میں ممکن ہے جب ترجیح اور اختصاص کی کوئی وجہ پائی جائے اور لقمہ اٹھانا اختصاص ہے جس میں وہ غلام منفرد ہے لہٰذا جس کو یہ اختصاص نہیں ہے اسے وہ مزاحمت سے روکے گا۔

تو بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے معاملے کو بھی اسی طرح سمجھنا چاہیے اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ جو شخص مال دنیا سے حاجت سے زائد لیتا ہے اور اسے خزانہ بناتا اور روک لیتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے بعض اس چیز کے محتاج ہیں تو وہ ظالم ہے اور یہ ان لوگوں میں سے ہے جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے اور اللہ کے راستے سے مراد اس کی اطاعت ہے اور اس کی اطاعت میں احوال دنیا کا اضافہ ہے کیوں کہ اس کے ذریعے ان کی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے اور ان کی حاجات پوری ہوتی ہیں۔

ہاں یہ فقہی فتاویٰ کی تعریف میں نہیں آتا کیوں کہ حاجت کی مقدار پوشیدہ ہے اور آئندہ زمانے میں پائے جانے والے فقر کے سلسلے میں نفوس کی سمجھ مختلف ہے اور زندگی کی انتہا معلوم نہیں اس لیے عوام کو ایسے امر کی تکلیف دینا ایسا ہے جیسے بچوں کو وقار اور سکون اختیار کرنے کی تعلیم دینا اور غیر ضروری کلام سے روکنا ہے کیوں کہ وہ نقصانِ عقل کی وجہ سے اس بات کی طاقت نہیں رکھتے اس لیے ہم ان کے کھیل کود پر اعتراض نہیں کرتے اور ان کے لیے اسے جائز قرار دیتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ لہو ولعب حق ہے۔

اسی طرح ہم نے عوام کے لیے مالوں کی حفاظت کو جائز قرار دیا اور زکوٰۃ کی مقدار خرچ کرنے پر اکتفا کیا کیوں کہ ان کی فطرت میں بخل رکھا گیا ہے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ حق کی انتہا یہی ہے قرآن پاک نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا۔ (۱) اور وہ تم سے ان (اموال) کو طلب کرے اور زیادہ طلب کرے تو تم بخل کرو گے۔

بلکہ جو بات کسی کدورت کے بغیر حق ہے اور ایسا عدل ہے جس میں ظلم نہیں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کے مال سے صرف اسی قدر لے جس قدر سامان سفر کوئی سوار لیتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام بندے اپنے بدنوں کی سواریاں ہیں

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ محمد آیت ۳۷

تاکہ حقیقی بادشاہ کے حضور حاضر ہوں لیکن جو شخص اس سے زیادہ لے اور دوسرے سوار کو محروم رکھے جو اس کا محتاج ہے تو ایسا شخص ظالم ہے اور عدل کو ترک کرنے والا اور مقصود حکمت سے باہر نکلنے والا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتا ہے قرآن پاک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور عقل سے بلکہ ان تمام اسباب سے ثابت ہے جن کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ مسافر کے زادراہ سے زائد اس کے لیے دنیا اور آخرت میں وبال ہے۔

تو جو شخص موجودات کی تمام انواع میں حکمتِ خداوندی کو سمجھتا ہے وہ شکر ادا کرنے کی ذمہ داری کو پورا کرنے پر قادر ہوتا ہے اس بات کے مکمل بیان کے لیے کئی جلدوں کی ضرورت ہے پھر بھی تھوڑا بیان ہی ہوگا ہم نے اس قدر لکھ دیا تاکہ اس سے اللہ تعالیٰ کے اس قول کی صداقت واضح ہو۔

ارشاد خداوندی ہے۔

وَقَلِيلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ ۔ (۱) اور میرے بندوں میں سے شکر گزار بندے بہت کم ہیں۔

اور یہ بھی معلوم ہو کہ شیطان کی خوشی کا باعث کیا ہے ارشاد خداوندی ہے۔

وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۔ (۲) (شیطان نے کہا) اور تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہیں پائے گا۔

اور جب تک کوئی شخص ان تمام (مذکورہ بالا) باتوں کو نہیں جانے گا وہ اس آیت کا معنی نہیں سمجھ سکتا اس کے علاوہ بھی کچھ امور ہیں جن کے مبادی (ابتدائی باتیں) بیان کرنے میں عمریں صرف ہو جائیں جہاں تک آیت کی تفسیر اور اس کے الفاظ کے معنیٰ کا تعلق ہے تو ہر وہ شخص اسے جان لیتا ہے جو لغت کا علم رکھتا ہے اس سے تمہارے سامنے معنیٰ اور تفسیر کا فرق واضح ہو گیا۔

سوال:

اس گفتگو کا مطلب یہ ہوا کہ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور اس نے بعض افعال کو اس حکمت کی تکمیل کے لیے رکھا ہے کہ مراد حکمت کی انتہا حاصل ہو اور بعض افعال کو حکمت کے پورا ہونے میں رکاوٹ قرار دیا پس جو فعل حکمت کے تقاضے کے موافق ہوتا ہے حتیٰ کہ وہ حکمت کو اس کی انتہا تک پہنچاتا ہے وہ شکر ہے اور جو مخالف ہو اور ان اسباب کے راستے میں رکاوٹ ہو جو غایت مقصود تک پہنچاتے ہیں تو یہ ناشکری ہے اور یہ سب باتیں سمجھ میں آگئی ہیں لیکن ایک اشکال باقی ہے وہ یہ کہ بندے کے افعال جب دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ایک قسم ان افعال کی ہے جو حکمت کی تکمیل کا باعث ہیں اور دوسری قسم ان افعال کی ہے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ سبا آیت ۱۳

(۲) قرآن مجید، سورۂ اعراف آیت ۱۷

جو اس کے خلاف ہیں اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو بندہ درمیان میں کہاں سے آگیا کہ کبھی وہ شکر گزار ہوتا ہے اور کبھی ناشکری کرتا ہے۔

جواب:

جان لو! اس کی مکمل تحقیق علوم مکاشفہ کا ایک بحر بے کنار ہے اور ہم نے گذشتہ صفحات میں اس کے مبادیات کی طرف کچھ اشارہ کیا ہے اب ہم ایک مختصر عبارت میں اس کا حال اور غایت بیان کر دیتے ہیں جو شخص پرندوں کی گفتگو سمجھتا ہے وہ اسے سمجھ لے گا اور جو شخص تیز نہیں چل سکتا وہ اس کا انکار کرے گا ملکوت کی فضا میں پرندوں کی طرح چکر لگانا تو الگ بات ہے تو ہم کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کے جلال اور کبریائی میں ایک صفت ہے جو تخلیق اور اختراع (بنانے) کا مصدر و مرکز ہے اور یہ صفت اس بات سے نہایت بلند اور عالی ہے کہ اس تک واضع لغت کی آنکھ پہنچ سکے کہ وہ اسے ایسی عبارت سے تعبیر کرے جو اس کے جلال کی گہرائی پر دلالت کرنے والی ہو اور اس کی حقیقت کی خصوصیت تک پہنچے لہٰذا اس کی بلندیٔ شان کی وجہ سے اس عالم میں اس کے لیے کوئی عبارت نہیں ہے اور چونکہ لغت کے واضعین کا مرتبہ اس کے اشراق کے مبادی کو سمجھنے سے بہت پست اور کمتر ہے اس لیے اس کی بلندی تک ان کی آنکھوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ جس طرح چمگادڑ کی آنکھ سورج کی روشنی تک نہیں پہنچتی۔

اس کی وجہ سورج کی روشنی میں کمی نہیں بلکہ چمگادڑوں کی بینائی میں کمزوری رکاوٹ بنتی ہے تو جن لوگوں کی آنکھیں اس کے جلال کے ملاحظہ کے لیے کھلی ہیں وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ وہ اہل لغات میں مروج کوئی ایسی عبارت بطور مجاز استعمال کریں جس سے اس حقیقت کے مبادی کا کچھ ضعیف حال معلوم ہو جائے تو انہوں نے لفظ قدرت استعمال کیا تو ان کے اس استعارہ (مجازی معنیٰ لینے) سے ہمیں بھی بولنے کی جرأت ہوئی تو ہم نے کہا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت قدرت ہے اور اسی سے تخلیق اور اختراع کا صدور ہوتا ہے۔

پھر وجود کے اعتبار سے مخلوق بہت سی اقسام اور مخصوص صفات میں تقسیم ہوتی ہے اور ان اقسام اور ان کے مخصوص صفات کے ساتھ اختصاص کا مرکز و مصدر ایک دوسری صفت ہے اور پہلی صفت کی طرح اس کے لیے بھی مجازی معنیٰ لینے کی ضرورت پڑی اور وہ صفت مشیئت ہے اور لغات جو حروف اور آواز کا نام ، کے ذریعے گفتگو کرنے والوں کے لیے اس کا مفہوم مجمل ہے اور لفظ مشیئت اس صفت کی گہرائی اور حقیقت تک پہنچنے سے قاصر ہے جس طرح لفظ قدرت کی اس صفت تک رسائی میں کوتاہی ہے۔

پھر وہ افعال جو قدرت سے وجود میں آتے ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو حکمت کی غایت تک پہنچتے ہیں اور یہ انتہا ہے اور بعض اس غایت سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو مشیئت سے نسبت ہے کیوں کہ ان کا رجوع اختصاصات کی طرف ہوتا ہے جن کے ذریعے تقسیم اور اختلاف کی تکمیل ہوتی ہے اور اس نسبت کو محبت سے تعبیر کیا جاتا ہے جو انتہا تک پہنچتی ہے اور جو اس سے پیچھے رہ جاتی ہے اسے کراہت کہا جاتا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ

دونوں وصف مشیئت میں داخل ہیں لیکن نسبت کے اعتبار سے دونوں کی خاصیتیں مختلف ہیں الفاظ اور لغات کے ذریعے سمجھنے والوں کو ان کی سمجھ محبت و کراہت کے الفاظ سے اجمالی طور پر آتی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کے بندے جو اسی کی تخلیق اور اختراع سے وجود میں آتے ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے بارے میں مشیئت ازلی یوں واقع ہوئی کہ ان سے ایسے کام لئے جائیں جو حکمت کی غایت سے پیچھے رہیں اور یہ ان کے حق میں جبر ہوتا ہے کیونکہ ان افعال کی دعوت دینے والے اور ان کے باعث امور ان پر مسلط کئے جاتے ہیں اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے بارے میں ازل میں فیصلہ کیا گیا کہ ان سے ایسے کام لیے جائیں گے جو ان کو بعض امور کی حکمت کی انتہا تک پہنچاتے ہیں۔

ان میں سے ہر فریق کو مشیئت کے ساتھ ایک خاص نسبت ہے جن کو حکمت کی غایت تک لے جانے والے کاموں میں استعمال کیا گیا ان کی نسبت، نسبتِ رضا کہلاتی ہے اور جن کے لیے اسباب حکمت تک رسائی رکھی گئی ان کو غایت تک نہیں پہنچایا گیا ان کی نسبت کو ناشکری کہا جاتا ہے اور اس کے پیچھے لعن طعن اور غضب کا اضافہ کیا گیا اور جس شخص کے لیے ازل میں رضا تھی اس کے لیے ایسا فعل ظاہر کیا گیا جس کے ذریعے حکمت اپنی غایت کو پہنچتی ہے اور اس کے لیے بطور مجاز شکر کا لفظ استعمال کیا گیا اور اس کے بعد تعریف و ثناء اور قبول و اقبال کا انعام رکھا گیا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ جمال عطا بھی فرماتا ہے پھر اس کی تعریف بھی کرتا ہے اور بدبخت بھی بناتا ہے پھر اس کو برا بھی کہتا ہے تو اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے غلام سے میل کچیل دور کرے پھر اسے اچھے کپڑے پہنا دے اور جب اس کی زینت مکمل ہو جائے تو کہے اے جمیل! تو کتنا خوبصورت ہے تیرے کپڑے کتنے اچھے ہیں اور تیرا چہرہ کتنا پاک صاف ہے تو حقیقت میں خود ہی خوبصورتی دیتا ہے اور خود ہی تعریف کرتا ہے گویا حقیقتاً وہ اپنی ہی تعریف کر رہا ہے بندہ ظاہری طور پر اور صورت کے اعتبار سے تعریف کا ہدف ہے۔

تو ازل میں امور کی یہی صورت تھی اسباب اور مسببات کا تسلسل رب الارباب اور مسبب الاسباب نے اسی طرح قائم فرمایا۔ یہ محض اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ اس کے ارادے، حکمت اور سچے حکم اور امر محکم کے تحت ہے اور اس کے لیے بطور مجاز لفظ قضا استعمال کیا جاتا ہے کہا گیا ہے کہ یہ پلک جھپکنے کی مقدار یا اس سے بھی جلدی ہوتا ہے تو اس محکم قضا کے حکم کے تحت تقدیر کے سمندر جاری ہوتے ہیں جو پہلے سے مقدر ہیں تو تقدیرات کا ایک دوسرے پر مرتب ہونے جانا لفظ قدر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

گویا لفظ قضا ایک امر کلی کے لیے اور لفظ قدر اس تفصیل کے لیے ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بات قضا و قدر سے خالی نہیں ہے تو بعض عبادت گزار لوگوں کو خیال ہوا کہ تقسیم اس تفصیل کا تقاضا کیوں کرتی ہے! اور اس تفاوت و تفصیل کی موجودگی میں عدل کا قیام کیسے ممکن ہوگا اور بعض حضرات اپنے قصور کی وجہ سے اس امر کی حقیقت

کو ملاحظہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے نہ یہ تفصیل ان کے احاطۂ خیال میں آسکتی ہے تو ان کو اس گہرائی میں غوطہ زن ہونے سے روک دیا گیا جس کی انہیں طاقت نہیں تھی۔ اور کہا گیا کہ ٹھہر جاؤ تمہیں اس مقصد کے لیے پیدا نہیں کیا گیا اور اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جائے گا لیکن لوگوں سے سوال ہوگا۔

اور بعض کے دل اس نور سے بھر گئے جو آسمانوں اور زمین میں انوار الٰہی کی چمک بن کر آیا اور ان کی سرشت شروع سے ہی صاف تھی اور قریب تھا کہ روشن ہو اگرچہ اسے آگ نہ پہنچے پس اسے آگ پہنچی تو نور کی تجلی دوبالا ہوگئی۔

اور ان کے سامنے اطراف عالم ملکوت روشن ہوگئے اور یہ نور ربانی کا فیضان تھا چنانچہ انہوں نے تمام امور کی حقیقت کو جان لیا پس ان سے کہا گیا کہ آداب خداوندی سے متصف ہو جاؤ اور خاموش رہو۔ کیوں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں (۱) اور تمہارے ارد گرد کمزور نظر والے لوگ ہیں تم بھی کمزوروں کے طریقے پر چلو اور چمگادڑوں کی آنکھوں کے لیے سورج کے حجاب کو نہ کھولو۔ یہ ان کی ہلاکت کا سبب بن جائے گا تم اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے موصوف ہو جاؤ اور اپنے علوم کی بلندی سے آسمانِ دنیا کی طرف اترو تاکہ کمزور لوگ بھی تم سے مانوس ہوں اور وہ تمہارے اس نور سے فیض حاصل کریں جو تمہارے حجاب کے پیچھے چمکتا ہے جس طرح چمگادڑ سورج کے بقایا نور اور ستاروں کی چمک سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور وہ اس زندگی کے ساتھ زندہ رہتے ہیں جسے ان کے وجود اور حالات برداشت کر سکتے ہیں اگرچہ ان کو اس قسم کی حیات میسر نہیں ہے جو سورج کی بھرپور روشنی میں آمد و رفت رکھنے والوں کو حاصل ہوتی ہے تم ایسے لوگوں کی مانند ہو جاؤ جن کے بارے میں کہا گیا۔

شَرِبْنَا شَرَابًا طَيِّبًا عِنْدَ طَيِّبٍ كَذَاكَ
شَرَابُ الطَّيِّبِيْنَ يَطِيْبُ شَرِبْنَا وَاَهْرَقْنَا
عَلَى الْاَرْضِ فَضْلَهٗ وَلِلْاَرْضِ مِنْ كَاْسِ
الْكِرَامِ نَصِيْبٌ۔

ہم نے پاک و طیب کے پاس طیب شراب پی پاک لوگوں کی شراب اسی طرح پاک ہوتی ہے ہم نے پینے کے بعد باقی ماندہ کو زمین پر بہا دیا اور زمین سخی لوگوں کے جام سے حصہ ملتا ہے۔

تو اس امر کے اول و آخر کی یہ صورت ہے اور تم اسے اسی وقت سمجھ سکتے ہو جب اس کے اہل ہو اور جب تم اس کے اہل بن جاؤ گے تو تو آنکھیں کھل جائیں گی اور تم دیکھ لو گے اور اب کسی راہنما کی ضرورت نہ ہوگی جو تمہاری راہنمائی کرے اندھے آدمی کو اپنے پیچھے لایا جا سکتا ہے لیکن اس کی ایک حد ہے جب راستہ تنگ ہو جائے اور وہ تلوار سے تیز اور بال سے زیادہ باریک ہو جائے تو پرندہ اس کے اوپر اوپر اڑ سکتا ہے لیکن اندھے آدمی کو اپنے پیچھے نہیں لا سکتا اور جب گزرگاہ تنگ ہو اور پانی بہت گہرا ہو (ملا ہوا ہو) اور تیرنے کے بغیر اسے عبور کرنا ممکن نہ ہو تو ماہر آدمی ذاتی طور پر تیر کر اسے پار کر سکتا ہے لیکن بعض اوقات

---

(۱) المطالب العالیہ جلد ۳ ص ۹، حدیث ۲۹۲۲

کسی کو اپنے پیچھے نہیں لا سکتا۔

تو ان لوگوں کی سیر کو عام لوگوں کی سیر کی طرف نسبت اسی طرح ہے جیسے پانی پر چلنے کو زمین پر چلنے سے نسبت ہوتی ہے اور تیراکی سیکھی جا سکتی ہے لیکن پانی پر چلنا سکھایا نہیں جا سکتا بلکہ اس کا حصول قوت یقین سے ہوتا ہے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آپ پانی پر چلتے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر یقین اور زیادہ ہوتا تو ہوا پر چلتے (۱)

تو کراہیت و محبت، رضا و غضب اور شکر و ناشکری کے سلسلے میں یہ رموز و اشارات ہیں جن میں سے اکثر کا علم معاملات سے کوئی تعلق نہیں اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو سمجھانے کے لیے ایک مثال بیان فرمائی ہے اس نے بتایا کہ انسانوں اور جنوں کو اس لیے پیدا کیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں تو ان کا عبادت کرنا ان کے حق میں حکمت کی غایت ہے پھر خبر دی کہ اس کے دو بندے ہیں جن میں سے ایک سے وہ محبت کرتا ہے اور وہ حضرت جبریل علیہ السلام ہیں وہ پاک روح اور امین ہیں وہ اس کے نزدیک محبوب ہیں مطاع ہیں (جن کی اطاعت کی جائے) اور امین اور مکین ہیں اور دوسرے کو وہ ناپسند کرتا ہے اور وہ ابلیس ہے وہ لعنت کا مستحق ہے اور اسے قیامت تک کے لیے مہلت دی گئی ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے راہ راست دکھانے کا سلسلہ حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف پھیرتے ہوئے فرمایا۔

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ۔ (۲)

آپ فرما دیجئے اس قرآن پاک کو روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اتارا۔

اور ارشاد فرمایا۔

يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ۔ (۳)

اللہ تعالیٰ روح (حضرت جبریل علیہ السلام) کو اپنے بندوں میں سے جس کے پاس چاہے بھیجتا ہے

اور گمراہی کی نسبت ابلیس کی طرف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِهِ۔ (۴)

تاکہ وہ اس کے راستے سے گمراہ کرے۔

گمراہی کا مطلب بندوں کو غایت حکمت تک پہنچنے سے روکنا ہے۔ تو دیکھ اللہ تعالیٰ نے اسے کس طرح اس بندے کی

---

(۱) کنز العمال جلد ۳ ص ۲۶۴ حدیث ۵۸۹۳ (کچھ الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ)

(۲) قرآن مجید، سورۃ نحل آیت ۱۰۲

(۳) قرآن مجید، سورۃ غافر آیت ۱۵

(۴) قرآن مجید، سورۃ زمر آیت ۸

طرف منسوب کیا جس پر اس نے غضب فرمایا۔ اور ہدایت دینا حکمت کی غایت تک پہنچانا ہے تو دیکھئے اللہ تعالیٰ نے کس طرح اسے اپنے محبوب بندے (جبریل علیہ السلام سے منسوب کیا عام عرف میں اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک بادشاہ کو ایسے آدمی کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو اسے اچھا سا مشروب پلائے اور ایسے آدمی کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو اس کی حجامت بنائے (یا خون نکالے) اور گھر کا صحن صاف کرے اور اس کے پاس دو غلام ہوں تو وہ حجامت اور صفائی کے لیے اس غلام کو مقرر کرے گا جو ان میں سے زیادہ قبیح اور خسیس ہوگا اور عمدہ مشروب کا اٹھانا ان میں سے اچھے غلام کے سپرد کرے گا جو اس کو محبوب بھی ہو اور کامل بھی۔

تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیے کہ یہ تو میرا فعل ہے اللہ تعالیٰ کا فعل کیسے بن گیا اگر تم اسے اپنی طرف منسوب کرو گے تو تم غلطی پر ہو گے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارے دل کو اس طرف پھیرتا ہے کہ مکروہ فعل، ناپسندیدہ شخص کے ذمہ لگاؤ اور اچھا کام پسندیدہ شخص کے سپرد کرو اور یہ عدل کو پورا کرنا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا عدل بعض اوقات ایسے امور سے پورا ہوتا ہے جس میں بندے کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور بعض امور میں بندے کا دخل بھی ہوتا کیوں کہ بندہ بھی تو اللہ تعالیٰ کا ایک فعل ہے لہذا اس کا کسی عمل کی طرف متوجہ ہونا، اس کی قدرت، علم اور عمل نیز تمام اسباب حرکات اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے کیوں کہ اس نے اسے عدل کے ساتھ ایسی ترتیب سے مرتب کیا جس سے عدل کے ساتھ ایسی ترتیب سے مرتب کیا جس سے مبنی بر اعتدال افعال صادر ہوتے ہیں۔ مگر بات یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو ہی دیکھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ عالم شہادت میں جو کچھ ظاہر ہوتا ہے اس کے لیے عالم غیب و ملکوت سے کوئی سبب نہیں ہے اس لیئے وہ اسے اپنی طرف منسوب کرتا ہے تم تو ایک بچے کی طرح ہو جو رات کے وقت شعبدہ باز کی طرف دیکھتا ہے جو پردے کے پیچھے سے کچھ صورتیں ظاہر کرتا ہے جو رقص کرتی ہیں اچھلتی کودتی اور اٹھتی بیٹھتی ہیں یہ پتلیاں کپڑے سے بنی ہوئی ہیں اور خود بخود حرکت نہیں کرتیں ان کو ایسے دھاگے حرکت دیتے ہیں جو بالوں سے بٹے ہوئے اور نہایت باریک ہوتے ہیں اور وہ رات کے اندھیرے میں نظر نہیں آتے ان دھاگوں کے سرے شعبدہ باز کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور بچوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں بچے اس تماشے سے خوش ہوتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کیوں کہ ان کے خیال میں یہ پتلیاں رقص کرتی اور اٹھتی بیٹھتی ہیں۔

لیکن عقل مند آدمی جانتے ہیں کہ انہیں حرکت دی جا رہی ہے وہ خود حرکت نہیں کرتیں لیکن بعض اوقات وہ اس کی تفصیلی کو نہیں جانتے اور جو اس کی بعض باتوں کو جانتا ہے وہ بھی اس شعبدہ باز کی طرح نہیں جانتا جس کے ہاتھ میں یہ کام ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے کھینچتا ہے۔

اسی طرح اہل دنیا کے بچوں کا معاملہ ہے اور (حقیقت یہ ہے کہ) علماء کے مقابلے میں باقی تمام لوگ بچے ہیں وہ لوگوں کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ یہی حرکت کر رہے ہیں لہذا وہ ان کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ لیکن علما جانتے ہیں کہ انہیں حرکت دی جا رہی ہے البتہ وہ حرکت کی کیفیت کو نہیں سمجھتے اور ایسے لوگ زیادہ ہیں جب کہ عارفین اور راسخ علما اپنی تیز نظر سے تنے ہوئے

جائے کے باریک دھاگوں کو دیکھتے ہیں بلکہ نہایت باریک دھاگے ہیں جو بہت زیادہ ہیں اور آسمان سے لٹک رہے ہیں اور زمین والوں کے ساتھ ان کے سرے ملے ہوئے ہیں وہ دھاگے اتنے باریک ہیں کہ ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتے پھر وہ ان دھاگوں کے دوسرے کنارے کو دیکھتے ہیں جو اپنی لٹکنے کی جگہوں کے ساتھ لٹک رہے ہیں اور وہ چیزیں جن کے ساتھ یہ لٹکے ہوئے ہیں فرشتوں کے ہاتھ میں ہیں جو آسمانوں کو حرکت دیتے ہیں اور یہ فرشتے ان فرشتوں کو دیکھنے میں مصروف ہیں جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں کہ بارگاہ خداوندی سے کیا حکم آتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہ کریں اور وہی عمل کریں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے قرآن پاک نے اس مشاہدہ کو یوں بیان فرمایا ہے۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ۔ (۱) اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

اور فرشتے جو حکم خداوندی کا انتظار کرتے ہیں اس کی تعبیر یوں فرمائی۔

خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے سات آسمان بنائے اور زمین بھی اسی طرح (سات زمینیں) بنائی ان کے درمیان حکم نازل ہوتا ہے تاکہ وہ جان لیں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کے علم نے گھیر رکھا ہے۔

ان امور کی تاویل کو اللہ تعالیٰ اور علم میں مضبوط لوگ جانتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے یہ آیت پڑھی۔

يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ۔ (۳) ان کے درمیان حکم نازل ہوتا ہے۔

تو انہوں نے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ علم میں راسخ لوگ، ایسے علوم کے ساتھ خاص ہیں جو عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے چنانچہ آپ فرماتے ہیں اگر میں اس آیت کا وہ مفہوم بیان کروں جس کی مجھے سمجھ ہے تو تم مجھے پتھر مارو۔ اور ایک روایت میں ہے کہ تم مجھے کافر کہنے لگو۔

ہم اتنی گفتگو پر ہی اکتفا کرتے ہیں گفتگو کی لگام اختیار کے قبضہ سے نکل گئی اور علم معاملہ دوسری باتوں سے مل گیا اب ہم شکر کے مقاصد کی طرف رجوع کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

جب شکر کی حقیقت یہ ہوئی کہ بندہ ایسا عمل کرے جس سے حکمت الٰہیہ کی تکمیل ہو تو سب سے شکرگزار بندہ اللہ تعالیٰ

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ الذاریات آیت ۲۲

(۲) قرآن مجید، سورۃ الطلاق آیت ۱۲

(۳) قرآن مجید، سورۃ الطلاق آیت ۱۲

کو سب سے زیادہ پسند اور اس کا سب سے زیادہ مقرب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے زیادہ قرب فرشتوں کو حاصل ہے اور ان کے لیے بھی ترتیب ہے نیز ان میں سے ہر ایک کا ایک معلوم مقام ہے فرشتوں میں جس کو سب سے زیادہ رتبہ، قرب حاصل ہے وہ حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں۔ (۱)

فرشتوں کے درجات کی بلندی کا سبب یہ ہے کہ وہ ذاتی طور پر معزز اور نیکو کار ہیں اور ان کے واسطے سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو قرب عطا فرمایا اور وہ (انبیاء کرام) زمین پر بسنے والی تمام مخلوق سے اشرف و اعلیٰ ہیں فرشتوں کے درجہ سے انبیاء کرام کا درجہ ملا ہوا ہے کیوں کہ یہ حضرات بھی ذاتی طور پر بھلائی اور خیر کے حامل ہیں ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کو ہدایت دی اور ان کے ذریعے اپنی حکمت کو مکمل کیا اور ان میں سے سب سے بڑے رتبہ والے ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے دین کو مکمل کیا اور آپ کو ختم نبوت کے تاج سے سرفراز فرمایا۔

انبیاء کرام علیہم السلام سے علماء کرام ملے ہوئے ہیں اور وہ انبیاء کرام کے وارث ہیں وہ بھی ذاتی طور پر مقرب ہیں اور ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کی اصلاح فرمائی ان میں سے ہر ایک کا درجہ اسی مقدار کے مطابق ہے جس قدر وہ اپنی اور دوسروں کی اصلاح کرتا ہے پھر علماء سے متصل عادل بادشاہوں کا درجہ ہے کیوں کہ وہ دنیوی اعتبار سے مخلوق کی اصلاح کرتے ہیں جیسے علماء ان کی دینی اصلاح کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں دین اور حکمرانی دونوں جمع تھیں تو آپ تمام انبیاء کرام سے افضل ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے لوگوں کی دینی اور دنیوی اصلاح فرمائی تلوار اور بادشاہی آپ کے علاوہ کسی نبی کو نہیں ملی پھر علماء و سلاطین کے ساتھ دوسرے نیک لوگوں کا درجہ ملا ہوا ہے جو لوگوں کے دین اور روح کی اصلاح کرتے ہیں اور بس ——— تو اللہ تعالیٰ کی حکمت ان کے ذریعے نہیں بلکہ ان میں پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے اور ان کے علاوہ لوگ محض چرواہے ہیں۔

اور جان لو کہ حکمران کے ذریعے دین قائم رہتا ہے لہٰذا اس کی تحقیر نہیں کرنی چاہیے اگرچہ وہ ظالم و فاسق ہی ہو۔ حضرت عمرو بن عاص رحمہ اللہ نے فرمایا ظالم حکمران دائمی فتنہ سے بہتر ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

سَيَكُونُ عَلَيْكُمْ أُمَرَاءُ تَعْرِفُونَ مِنْهُمْ وَتُنْكِرُونَ (۲) وَيُفْسِدُونَ وَمَا يُصْلِحُ اللّٰهُ بِهِمْ أَكْثَرُ فَإِنْ أَحْسَنُوا فَلَهُمْ

عنقریب تمہارے اوپر ایسے حکمران آئیں گے جن کی کچھ باتوں کو تم جانتے ہو گے اور بعض کی پہچان نہ ہو گی وہ فساد بھی کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے زیادہ

---

(۱)
(۲) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۲۸ کتاب الامارۃ۔

اَلْاَجْرُ وَعَلَیْکُمُ الشُّکْرُ وَاِنْ اَسَاءُوْا فَعَلَیْھِمُ الْوِزْرُ وَعَلَیْکُمُ الصَّبْرُ۔ (۱)

لوگوں کی اصلاح فرمائے گا پس اگر وہ اچھا کام کریں تو ان کے لیے اجر ہے اور تم پر شکر لازم ہے اور اگر وہ برائی کریں تو ان پر گناہ ہوگا اور تم پر صبر لازم ہے۔

حضرت سہل رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو آدمی حکمران کا انکار کرے وہ زندیق ہے اور جس کو حکمران بلائے اور وہ نہ جائے تو ایسا شخص بدعتی ہے اور جو بن بلائے حکمران کے پاس جائے وہ جاہل ہے۔

آپ سے پوچھا گیا کہ کونسا آدمی سب سے بہتر ہے آپ نے فرمایا "بادشاہ" کہا گیا کہ ہم بادشاہ کو سب سے زیادہ بُرا انسان سمجھتے تھے فرمایا رک جاؤ بے شک اللہ تعالیٰ ایک دن میں دو قسم کی نظر فرماتا ہے ایک نظرِ رحمت جو اموال مسلمین کی سلامت کے لیے ہے اور دوسری نظر ان کے بدنوں کی سلامتی کے لیے، وہ اپنے نامۂ اعمال کو دیکھتا تو اس کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں وہ کہتا ہے ۔۔ ان کے دروازے پر لٹکی ہوئی سیاہ لکڑیاں ستر قصہ گو لوگوں سے بہتر ہیں جو قصے بیان کرتے ہیں۔

دوسرا رکن :

شکر کے ارکان اور کس پر شکر واجب ہے

شکر کا رکن یا جس پر شکر ادا کیا جائے وہ نعمت ہے پس ہم اس بات میں نعمت کی حقیقت، اس کی اقسام، درجات، اصناف اور کہاں نعمت خاص ہے اور کہاں عام وغیرہ امور کا ذکر کریں گے۔ کیوں کہ بندوں پر اللہ تعالیٰ کے جس قدر انعام ہیں ان کا شمار بندوں کی طاقت سے باہر ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا۔ (۲)

اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کو شمار کرنا چاہو تو ان کو شمار نہیں کر سکتے۔

پس ہم چند قواعد بیان کرتے ہیں جو نعمتوں کی معرفت کے قوانین کی جگہ ہیں پھر ایک ایک کا ذکر کرنے میں مشغول ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ہی صحیح راستے کی توفیق دینے والا ہے۔

فصل ۱ :

نعمت کی حقیقت اور اقسام

جان لو! ہر بھلائی، لذت اور سعادت بلکہ ہر مطلوب و موثر کو نعمت کہا جاتا ہے لیکن حقیقی نعمت اُخروی سعادت ہے دوسری

---

(۱) الترغیب والترہیب جلد ۳ ص ۱۶۹ کتاب القضاء (۲) قرآن مجید، سورۂ نحل آیت ۱۸

چیزوں کو نعمت یا سعادت کہنا غلط ہے یا مجازی طور پر اسے نعمت کہتے ہیں جیسے دنیوی سعادت جو آخرت کے لیے معاون نہیں بنتی اسے نعمت کہنا محض غلط ہے اور کبھی کسی چیز کو نعمت کہنا سچ ہوتا ہے لیکن اُخروی سعادت کو نعمت کہنا بہت بڑا سچ ہے پس ہر وہ سبب جو اُخروی سعادت تک پہنچا تا اور اس پر مددگار ہوتا ہے چاہے ایک واسطہ سے ہو یا کئی واسطوں سے، اسے نعمت کہنا صحیح بھی ہے اور سچ بھی، کیوں کہ وہ حقیقی نعمت تک پہنچاتا ہے وہ اسباب جو مددگار ہیں اور لذات جن کو نعمت کہا جاتا ہے ہم کئی تقسیموں کے تحت اس کی تشریح کرتے ہیں

پہلی تقسیم:

تمام امور ہماری طرف اضافت کی وجہ سے چار صورتوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ (۱) وہ امور جو دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں فائدہ دیتے ہیں جیسے علم اور اچھے اخلاق۔ (۲) وہ امور جو دونوں جہانوں میں نقصان دہ ہیں جیسے جہالت اور بداخلاقی۔ (۳) وہ امور جو فی الحال فائدہ دیتے ہیں لیکن نتیجے کے اعتبار سے نقصان دہ ہیں جیسے خواہشات کی اتباع سے لذت حاصل کرنا (۴) وہ امور جو فی الحال نقصان پہنچاتے ہیں اور اذیت ناک ہیں لیکن نتیجے کے اعتبار سے نفع بخش ہیں جیسے خواہشات کا قلع قمع اور نفس کی مخالفت۔

تو جو امور دنیا اور آخرت میں نفع دیتے ہیں حقیقتاً وہی نعمت ہیں جیسے علم اور اخلاق، اور جو کام دنیا اور آخرت میں نقصان دیتے ہیں حقیقت میں وہ آزمائش ہیں اور وہ پہلے دو کی ضد ہیں (یعنی جہالت اور بداخلاقی) جو امور فی الحال نفع اور بعد میں نقصان دیں وہ عقلمند لوگوں کے نزدیک مصیبت اور آزمائش ہیں جب کہ جاہل لوگ ان کو نعمت سمجھتے ہیں اس کی مثال یہ ہے کہ ایک بھوکا شخص جب ایسا شہد پاتا ہے جس میں زہر ہے تو وہ اسے نعمت سمجھتا ہے اگر وہ ناواقف ہو۔ لیکن اسے علم ہو جائے تو وہ اسے ایک آفت سمجھتا ہے جو اس کی طرف چلائی گئی ہے وہ کام جو فوری طور پر نقصان دیتے ہیں لیکن مستقبل کے اعتبار سے نفع بخش ہیں وہ عقل مند لوگوں کے نزدیک نعمت ہیں جب کہ جاہلوں کے نزدیک مصیبت ہیں اس کی مثال وہ کڑوی دوائی ہے جس کا ذائقہ فی الحال بُرا معلوم ہوتا ہے لیکن وہ بیماریوں سے شفا دیتی ہے اور صحت و سلامتی لاتی ہے تو ناواقف بچے کو جب یہ دوائی پلائی جائے تو وہ اسے مصیبت سمجھتا ہے جب کہ عقل مند آدمی اسے نعمت سمجھتا ہے اور جو شخص اس کو یہ دوائی بتاتا ہے اور اس سے قریب کرتا نیز اس کے لیے اسباب مہیا کرتا ہے تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتا ہے اسی لیے ماں پچھنے لگانے کے ذریعے بچے کا خون نکالنے نہیں دیتی جب کہ باپ اس بات کی دعوت دیتا ہے کیوں کہ باپ کی عقل کامل ہوتی ہے اس لیے وہ انجام کار کو دیکھتا ہے اور ماں زیادہ محبت اور عقل کی کمی سے باعث موجودہ صورت کو دیکھتی ہے اور بچہ اپنی نادانی کی وجہ سے ماں کا احسان مند ہوتا ہے باپ کا نہیں وہ ماں سے مانوس ہوتا ہے اور اس کی شفقت حاصل کرتا ہے اور باپ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ اگر بچے کو عقل ہوتی تو اسے معلوم ہوتا کہ ماں دوست کی صورت میں دشمن ہے کیوں کہ خون نکلوانے سے روک کر وہ اسے بیماریوں اور اس تکلیف کی طرف لے جاتی ہے جو خون نکالنے سے بھی زیادہ سخت ہے لیکن

جاہل دوست عقل مند دشمن سے برا ہوتا ہے۔ ہر آدمی اپنے نفس کا دوست ہے یہ جاہل دوست ہے اسی لیے اس سے وہ سلوک کرتا ہے جو دشمن بھی نہیں کرتا۔

دوسری تقسیم:

دنیوی اسباب با مخلوط ہیں ان میں خیر و شر کا گٹھ جوڑ ہے اسبابِ خیر بہت کم صاف ہوتے ہیں جیسے مال، اہل و اولاد رشتہ دار، جاہ و مرتبہ وغیرہ لیکن ان کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جن کا نفع زیادہ ہوتا ہے جیسے مال و جاہ اور دیگر اسباب سے ضرورت کے مطابق حاصل کرنا دوسرے وہ جن کا نقصان اکثر لوگوں کے حق میں نفع سے زیادہ ہے۔ جیسے زیادہ مال اور بہت بڑا مرتبہ وغیرہ اور تیسری قسم ان امور کی ہے جن کا نفع و نقصان برابر ہیں اور یہ امور شخصیات کے حوالے سے مختلف ہوتے ہیں کئی نیک لوگ اچھے مال سے نفع حاصل کرتے ہیں اگرچہ وہ زیادہ ہو پس وہ اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں اور اچھے کاموں میں صرف کرتے ہیں اس توفیق کے ساتھ یہ حال ان کے حق میں نعمت ہے اور کئی لوگ تھوڑے مال سے بھی نقصان اٹھاتے ہیں کیوں کہ وہ اس (مال) کو ہمیشہ تھوڑا سمجھتے اور اپنے رب سے شکوہ کرتے ہوئے زیادہ طلب کرتے ہیں تو اس ذلت کے ساتھ یہ مال اس کے لیے مصیبت ہے۔

تیسری تقسیم:

ایک اور اعتبار سے نیکیوں کی تین قسمیں ہیں ایک قسم میں وہ نیکیاں شامل ہیں جو ذاتی طور پر موثر ہیں ان میں غیر کا دخل نہیں دوسری قسم ان نیکیوں پر مشتمل ہے جو کسی دوسری وجہ سے مؤثر ہیں اور تیسری قسم ان نیکیوں کی ہے جو ذاتی طور پر بھی موثر ہیں اور غیر کی وجہ سے بھی، پہلی قسم جو ذاتی طور پر موثر ہیں غیر کی وجہ سے نہیں اس کی مثال اللہ تعالیٰ کی زیارت کی لذت اور اس سے ملاقات کی سعادت ہے خلاصہ یہ ہے اُخروی سعادت جو کبھی ختم نہ ہو گی اس کی طلب اس لیے نہیں ہوتی کہ اس کے ذریعے کسی دوسرے مقصود تک رسائی ہو بلکہ وہ ذاتی طور پر مطلوب ہوتی ہے۔

دوسری قسم جو کسی اور مقصد کے لیے مقصود ہے اس کی ذات سے کوئی غرض نہیں ہوتی جیسے درہم اور دینار (روپیہ پیسہ) اگر ان کے ذریعے ضرورتیں پوری نہ ہوں تو ان میں اور کنکریوں میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ لیکن جب یہ لذتوں کا وسیلہ ہیں اور ان کے ذریعے لذات تک جلدی رسائی ہوتی ہے اس لیے جاہل لوگوں کے نزدیک یہ ذاتی طور پر محبوب ہیں حتیٰ کہ وہ ان کو جمع کر کے خزانہ بناتے ہیں اور ان کے ساتھ سودی کاروبار کرتے ہیں اور ان کے خیال میں یہی مقصود ہیں۔

ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو کسی آدمی سے محبت کرتا ہے اور اس کے سبب سے اس کے قاصد سے محبت کرتا ہے جو ان دونوں کو جمع کرنے کا سبب بنتا ہے پھر قاصد کی محبت میں اصل کی محبت کو بھول جاتا ہے اور عمر بھر اس سے منہ پھیرے رکھتا ہے وہ مسلسل اس قاصد سے تعلق رکھتا اور اس کا خیال رکھتا ہے اور یہ انتہائی درجہ کی جہالت اور گمراہی ہے تیسری قسم جو ذاتی طور پر اور غیر کی وجہ سے دونوں طرح

مقصود ہوتی ہے جیسے صحت وسلامتی اس کا قصد اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے ذکر وفکر پر قادر ہو جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا سبب ہیں یا ان کے ذریعے دنیوی لذات کے حصول کی راہ ہموار ہو، نیز صحت کا ذاتی طور پر بھی قصد کیا جاتا ہے کیوں کہ ایک شخص اس مقصود سے بے نیاز ہوتا ہے جس کے لیے پاؤں کی سلامتی ضروری ہے (مثلاً پیدل چلنا) پھر بھی وہ پاؤں کی سلامتی چاہتا ہے کیوں کہ وہ سلامتی ہے۔

تو نتیجہ یہ ہوا کہ جو بھلائی ذاتی طور پر مؤثر ہے حقیقتاً وہی خیر ہے اور نعمت بھی، اور جس کی تاثیر ذاتی طور پر بھی ہو اور غیر کی وجہ سے بھی وہ بھی نعمت ہے لیکن پہلی نعمت کے مقابلے میں اس کا درجہ کم ہے۔ اور جو چیز غیر کے لیے مؤثر ہو جیسے سونا چاندی تو وہ اس اعتبار سے کہ جوہر ہیں نعمت قرار نہیں پاتے بلکہ وسیلہ ہونے کے اعتبار سے اس آدمی کے حق میں نعمت ہیں جو کسی امر کا قصد کرتا ہے جس تک رسائی ان دونوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

پس جو شخص علم اور عبادت کا ارادہ کرتا ہو اور اس کے پاس ضروریاتِ زندگی بقدر کفایت موجود ہوں اس کے نزدیک سونا اور مٹی کا ڈھیلا برابر ہے اور ان دونوں (سونے چاندی) کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات ان کی موجودگی فکر و عبادت سے دور رکھتی ہے لہٰذا اس شخص کے حق میں یہ مصیبت ہوں گے نعمت نہیں۔

چوتھی تقسیم:

ایک اور اعتبار سے نعمت کی تین قسمیں ہیں (۱) نافع (۲) لذیذ (۳) اور جمیل — لذیذ وہ ہے جس کی راحت فوری طور پر حاصل ہو نافع وہ ہے جو مستقبل میں فائدہ دے اور جمیل اسے کہتے ہیں جو ہر حالت میں اچھی ہو۔

اسی طرح برائی بھی تین قسموں میں منقسم ہوتی ہے (۱) نقصان دِہ (۲) قبیح اور (۳) دردناک — پھر ان دونوں قسموں میں سے ہر ایک مطلق بھی ہے اور مقید بھی۔ مطلق وہ ہے جس میں تینوں اوصاف جمع ہوں بھلائی میں ان اوصاف کے جمع ہونے کی مثال علم وحکمت ہے علم وحکمت والے لوگوں کے نزدیک یہ نافع بھی ہے، جمیل بھی اور لذیذ بھی۔ اور شر کی مثال جہالت ہے یہ نقصان دِہ بھی ہے قبیح بھی اور ایذارساں بھی۔ جاہل آدمی کو جب اپنی جہالت کا پتہ چلتا ہے تو وہ اذیت محسوس کرتا ہے کیوں کہ جب وہ دوسرے کو عالم اور اپنے آپ کو جاہل دیکھتا ہے تو نقصان کی اذیت کا احساس ہوتا ہے چنانچہ اس علم کی لذیذ خواہش ابھرتی ہے پھر بعض اوقات اسے حسد، تکبر اور بدنی خواہشات سیکھنے سے روکتی ہیں اور دو متضاد قوتیں اسے اپنی اپنی طرف کھینچتی ہیں جس سے اس کو سخت تکلیف ہوتی ہے کیوں کہ اگر وہ علم کو چھوڑتا ہے تو جہالت اور نقص کی اذیت پہنچتی ہے اور اگر حصولِ علم میں مشغول ہوتا ہے تو خواہشات چھوڑنے کی اذیت ہوتی ہے یا تکبر کو چھوڑنے اور سیکھنے کے لیے ذلت اٹھانے کا رنج ہوتا ہے اس قسم کا آدمی یقیناً مستقل عذاب میں رہتا ہے۔

دوسری قسم یعنی مقید وہ ہے جس میں بعض اوصاف جمع ہوتے ہیں اور بعض نہیں ہوتے کئی نفع بخش باتیں اذیت ناک ہوتی ہیں جیسے اس انگلی کا کاٹنا جس کا ناسور بڑھتا ہے اور بدن سے باہر جلد کو نقصان دینے والے زخم کو کاٹنا اور کئی نفع بخش باتیں

قبیح ہوتی ہیں جیسے بیوقوفی بعض حالات میں نفع دیتی ہے چنانچہ کہا گیا ہے کہ جس کی عقل نہیں اس نے آرام پایا کیوں کہ اس کو انجام کار کا اہتمام نہیں ہوتا اس لیے وہ فی الحال آرام پاتا ہے حتیٰ کہ اس کی موت کا وقت آجائے۔ اور بعض باتیں کسی اعتبار سے نافع اور کبھی وجہ سے نقصان دہ ہوتی ہیں جیسے ڈوبنے کا خوف ہو تو مال دریا میں پھینک دینا یہ عمل مال کے لیے نقصان دہ ہے لیکن اس سے نجات کے اعتبار سے نفس کے لئے نافع ہے نافع کی دو قسمیں ہیں ایک ضروری ہے جیسے ایمان اور اچھے اخلاق جو اُخروی سعادت تک رسائی کا ذریعہ ہیں اور اس سے ہماری مراد علم و عمل ہے کیوں کہ کوئی بھی عمل ان دونوں جیسا نہیں ہو سکتا دوسری قسم وہ ہے جو ضروری نہیں ہے مثلاً صفرا کے خاتمے کے لیے سکنجبین کا استعمال، کیوں کہ صفرا کی تسکین کے لیے کوئی دوسری چیز بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔

تیسری تقسیم:

جان لو کہ ہر لذیذ چیز کو نعمت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور لذات کی انسان کی طرف نسبت کے اعتبار سے کہ وہ اس کے ساتھ خاص ہیں یا اس کے ساتھ کوئی دوسرا بھی شریک ہے تین قسمیں ہیں ایک عقلی دوسری وہ بدنی جس میں بعض حیوانات بھی شریک ہیں اور تیسری وہ بدنی جن میں انسان کے ساتھ تمام حیوانات شریک ہوتے ہیں۔

پہلی لذت یعنی عقلی لذات کی مثال علم و حکمت کی لذت ہے کیوں کہ ان دونوں باتوں کی لذت کا تعلق سننے، دیکھنے، سونگھنے اور چکھنے سے نہیں اور نہ ہی یہ پیٹ اور شرمگاہ سے متعلق ہے بلکہ ان باتوں کی لذت دل کو حاصل ہوتی ہے کیوں کہ یہ ایک صفت کے ساتھ خاص ہیں جسے عقل سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہ لذت بہت کم پائی جاتی ہے لیکن اس کا مرتبہ سب سے زیادہ ہے اس کی قلت یہ ہے کہ علم سے صرف عالم ہی لطف اندوز ہوتا ہے اور حکمت کی لذت صرف حکیم کو حاصل ہوتی ہے اور علم و حکمت والے لوگ بہت کم ہیں اگرچہ نام کے علماء اور حکماء بے شمار ہیں۔ اور اس لذت کی شرافت اس اعتبار سے ہے کہ یہ انسان کے ساتھ لازم رہتی ہے کبھی زائل نہیں ہوتی نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں بلکہ انسان اس سے اُکتاتا نہیں جب کہ آدمی کھانے سے سیر ہو جائے تو اُکتا جاتا ہے اور جماع کی خواہش پوری کرنے کے بعد بوجھ محسوس کرتا ہے لیکن علم و حکمت میں ملال اور بوجھ کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ اور جو آدمی ایسی چیز پر قادر ہو جو شرف کی حامل ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہتی ہے پھر وہ جلد فنا ہونے والی خسیس چیز پر راضی رہے تو اس کی عقل میں قصور ہے اور وہ اپنی بدبختی کی وجہ سے محروم ہے۔

اور سب سے کم بات یہ ہے کہ علم اور عقل کو مددگاروں اور حفاظت کرنے والوں کی حاجت نہیں ہوتی جب کہ مال کو ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ علم تمہاری حفاظت کرتا ہے اور تم مال کی حفاظت کرتے ہو علم، خرچ کرنے سے بڑھتا ہے جب کہ مال خرچ کرنے سے کم ہوتا ہے مال چوری ہو جاتا ہے اور اس سے معزولی بھی ہوتی ہے جب کہ علم تک چوروں کے ہاتھ نہیں پہنچتے کہ اسے اٹھا لیں اور نہ بادشاہوں کے ہاتھ پہنچتے ہیں کہ معزول کر دیں پس صاحب علم ہمیشہ روح امن میں ہوتا ہے

جب کہ مال اور دنیوی جاہ و مرتبے والا آدمی ہمیشہ خوف کے کرب میں مبتلا رہتا ہے پھر یہ کہ علم ہمیشہ نفع بخش، لذیذ اور جمیل ہوتا ہے جب کہ مال کبھی ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے اور کبھی نجات کی راہ پر گامزن کرتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کئی مقامات پر مال کی مذمت کی ہے اگرچہ کئی مقامات پر اس کو خیر (بھلائی) بھی قرار دیا ہے۔

اکثر لوگوں کا لذتِ علم کے ادراک سے کوتاہ رہنا یا تو عدم ذوق کی وجہ سے ہے کیوں کہ جس کو ذوق نہ ہو گا وہ تو نہ معرفت حاصل کرے گا اور نہ ہی اسے شوق پیدا ہو گا کیوں کہ شوق، ذوق کے بعد آتا ہے (ذوق چکھنے کو کہتے ہیں جب کوئی چیز چکھی جائے تو اس کے بعد اس کا شوق ہوتا ہے ۱۲ ہزاروی)

یا ان کو لذتِ علم کا ادراک اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ ان کے مزاج خراب ہیں اور دل مریض ہیں کیوں کہ وہ خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں جیسے وہ مریض جو شہد میں مٹھاس نہیں پاتا اور اسے کڑوا سمجھتا ہے اور تیسری وجہ ان کی ذہانت کی کمی ہے کیوں کہ ابھی تک ان کے لیے وہ صفت پیدا نہیں کی گئی جس کے ذریعے علم کی لذت حاصل ہوتی ہے جیسے دودھ پینے والا بچہ جسے شہد اور بھنے ہوئے پرندے کی لذت کا ادراک نہیں ہوتا وہ صرف دودھ سے لطف اندوز ہوتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ چیزیں لذیذ نہیں ہیں اور اس کا دودھ کو خوشی سے قبول کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ سب سے زیادہ لذت اسی میں ہے۔

تو لذتِ علم و حکمت کے ادراک سے قاصر لوگوں کی تین قسمیں ہیں (۱) جس کا باطن ابھی تک زندہ نہیں ہوا جیسے بچہ (۲) جس کا باطن ہے زندہ ہونے کے بعد مر گیا کیوں کہ وہ خواہشات کے پیچھے چل پڑا (۳) یا خواہشات کی اتباع کے باعث وہ بیمار ہو گیا۔

ارشاد خداوندی ہے:

فِی قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ (۱) ان کے دلوں میں بیماری ہے۔

اس آیت میں عقلی بیماری کی طرف اشارہ ہے اور ارشاد باری تعالیٰ ہے

لِیُنْذِرَ مَنْ کَانَ حَیًّا (۲) تاکہ وہ اس کو ڈرائیں جو زندہ ہے۔

اس میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو باطنی حیات کے ساتھ زندہ نہ ہوں۔ اور ہر وہ شخص جو بدن کے ساتھ زندہ ہے لیکن اس کا دل مردہ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مردہ شمار ہوتا ہے اگرچہ جاہل لوگوں کے نزدیک وہ زندہ ہو یہی وجہ ہے کہ شہداء اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں ان کو رزق دیا جاتا ہے اور وہ خوش خوش ہیں اگرچہ وہ بدن کے اعتبار سے فوت ہو

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۱۰

(۲) قرآن مجید، سورۂ یٰسین آیت ۷۰

چکے ہیں۔

دوسری لذت وہ ہے جس میں انسان کے ساتھ بعض حیوانات بھی شریک ہیں جس طرح حکومت، غلبہ اور برتری کی لذت شیر، چیتے اور بعض دوسرے حیوانات کو بھی حاصل ہے۔

تیسری لذت وہ ہے جس میں انسان کے ساتھ تمام حیوانات شریک ہیں جیسے پیٹ اور شرمگاہ کی لذت ہے اور یہ بہت زیادہ پائی جاتی ہے اور یہی سب سے زیادہ خسیس ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں تمام حیوانات شریک ہیں حتیٰ کہ کیڑے مکوڑے اور حشرات الارض میں بھی یہ لذت پائی جاتی ہے اور جو شخص اس مرتبہ سے آگے بڑھتا ہے تو وہ لذت غلبہ کا شکار ہو جاتا ہے اور وہ غافل لوگوں میں زیادہ پائی جاتی ہے اور اگر اس سے بھی آگے بڑھ جائے تو تیسری لذت تک جا پہنچتا ہے اور اب سب سے زیادہ غالب آنے والی لذت، علم و حکمت کی لذت ہوتی ہے خصوصاً معرفت خداوندی اور اس کی صفات و افعال کی معرفت کی لذت زیادہ حاصل ہوتی ہے اور یہ صدیقین کا درجہ ہے اور اسے مکمل طور پر اسی وقت حاصل کیا جاسکتا ہے جب دل سے اقتدار کی محبت کا غلبہ خارج ہو جائے اور صدیقین کے دماغ سے سب سے آخر میں یہی بات باہر نکلتی ہے پیٹ اور شرمگاہ کی حرص کو توڑنے پر تو صلحاء بھی قادر ہوتے ہیں جب کہ ریاست کی خواہش کو توڑنے پر صرف صدیقین قادر ہوتے ہیں اور جہاں تک اسے بالکل ختم کرنے کا تعلق ہے کہ کبھی بھی اور کسی حال میں بھی اس کا احساس نہ ہو تو غالب یہی ہے کہ وہ انسانی طاقت سے خارج ہے ہاں بعض حالات میں اللہ تعالیٰ کی معرفت کی لذت غالب آتی ہے تو اس صورت میں ریاست اور غلبہ کی لذت کا احساس نہیں ہوتا لیکن یہ عمل ہمیشہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں کمی آتی ہے تو بشری صفات لوٹ آتی ہیں اور یہ لذت موجود ہوتی ہے لیکن یہ مغلوب ہوتی ہے جو نفس کو عدل سے پھیرنے پر قادر نہیں ہوتی۔

دل کی اقسام:

اس صورت میں دل چار قسموں میں تقسیم ہوتے ہیں ایک وہ دل ہے جو صرف اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے اور اسے اسی صورت میں آرام ملتا ہے جب اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے بارے میں فکر زیادہ ہو۔

دوسری قسم کا دل وہ ہے جو لذت معرفت سے ناآشنا ہوتا ہے اور نہ سے یہ بھی معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُنس کا کیا معنی ہے وہ جاہ و مرتبہ، ریاست، مال اور تمام بدنی شہوات سے لذت حاصل کرتا ہے۔

تیسری قسم کا دل وہ ہے جو عام طور پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ مانوس ہوتا ہے اور اس کی معرفت و فکر سے لذت حاصل کرتا ہے لیکن بعض احوال میں وہ بشری صفات کی طرف رجوع کرتا ہے اور چوتھا وہ دل ہے جو عام طور پر بشری صفات سے لذت حاصل کرتا ہے البتہ بعض احوال میں وہ علم و معرفت سے لذت پاتا ہے۔

پہلی قسم کے دل کا وجود میں آنا اگرچہ ممکن ہے لیکن انتہائی بعید ہے دوسرے قسم کے دل سے دنیا پُر ہے تیسری اور چوتھی قسم کے دل موجود ہیں لیکن بہت نادر ہیں اور ان کا تصور شاذ و نادر ہوتا ہے اور با وجود ان کے نادر ہونے کے قلت و کثرت

کے اعتبار سے ان میں تفاوت ہوتا ہے اس کی کثرت ان زمانوں میں تھی جو انبیا کرام علیہم السلام کے زمانوں کے قریب تھے اور اب جس قدر وہ مبارک زمانہ دُور ہوتا جا رہا ہے اس قسم کے دل کم ہوتے جا رہے ہیں حتیٰ کہ قیامت ہو جائے اور اللہ تعالیٰ اس کام کا فیصلہ کر دے جس نے ہونا ہے۔

اس قسم کے دلوں کا نادر ہونا اس وجہ سے ہے کہ یہ سلطنت آخرت کا آغاز ہے اور بادشاہ زیادہ نہیں ہوا کرتے اور جس طرح بادشاہی اور حسن و جمال میں فوقیت رکھنے والے لوگ نادر ہوتے ہیں اور اکثر لوگ ان سے نچلے درجے میں ہوتے ہیں اسی طرح اُخروی مملکت کا حال بھی ہے کیوں کہ دنیا آخرت کا آئینہ ہے اس لیے کہ دنیا ظاہری عالم کا نام ہے اور آخرت عالم غیب کا عالم شہادت عالم غیب کے تابع ہوتا ہے جس طرح شیشے میں دیکھی جانے والی صورت دیکھنے والے کی صورت کے تابع ہوتی ہے اور شیشے میں جو صورت ہے وہ اگرچہ وجود کے مرتبہ میں دوسرے نمبر پر ہوتی ہے لیکن دیکھنے کے حق میں اول وہی ہوتی ہے کیوں کہ تم اپنے آپ کو دیکھ نہیں سکتے اور پہلے شیشے میں اپنی صورت دیکھتے ہو اور پھر اپنی اس صورت کو پہچانتے ہو جو تمہارے ساتھ قائم ہے تو جو چیز وجود میں تابع ہے وہ معرفت کے حق میں متبوع بن جاتی ہے اور جو پیچھے ہے وہ پہلے ہو جاتی ہے یہ ایک قسم کا تغیر ہے لیکن تغیر و تبدل اس دنیا کی ضرورت ہے پس اسی طرح عالم ملک و شہادت، عالم غیب و ملکوت کی حکایت کرتا ہے بعض لوگوں کے لیے عبرت سے دیکھنا آسان کر دیا گیا لہٰذا وہ عالم ملک (عالم شہادت) کی جس چیز کو دیکھتا ہے اس سے عالم ملکوت تک جانے والی راہ عبور کرتا ہے اور اس بات کو عبرت کہا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس بات کا حکم دیا ہے ارشاد خداوندی ہے۔

فَاعْتَبِرُوْا يَآاُولِي الْاَبْصَارِ ـ (۱) اے اصحاب بصیرت! عبرت حاصل کرو۔

اور ان میں سے بعض کی بصیرت اندھے پن کا شکار ہے لہٰذا وہ عبرت حاصل نہیں کرتے اور دنیا میں ہی پھنس کر رہ جاتے ہیں اور عنقریب ان کے اس قید خانے کی طرف جہنم کے دروازے کھلیں گے اور یہ قید خانہ ایسی آگ سے بھر جائے گا جو دلوں پر چڑھے گی لیکن اس کے اور اس کی تکلیف کے ادراک کے درمیان حجاب ہے اور جونہی موت کے ساتھ یہ حجاب اٹھے گا اسے اس بات کی سمجھ آ جائے گی اللہ تعالیٰ جن لوگوں کی زبانوں پر کلمہ حق جاری کرتا ہے انہی کی زبان سے اس حق کو ظاہر کرتا ہے چنانچہ انہوں نے کہا کہ جنت اور جہنم دونوں مخلوق ہیں لیکن جہنم کا ادراک کبھی ایسے علم کے ذریعے ہوتا ہے جسے علم الیقین کہتے ہیں اور بعض اوقات عین الیقین کے ساتھ ادراک ہوتا ہے اور عین الیقین آخرت میں ہو گا جب کہ علم الیقین کبھی دنیا میں ہوتا ہے لیکن یہ ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے نور یقین سے کامل حصہ حاصل کیا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ـ ہرگز نہیں! اگر تم علم الیقین کے ساتھ جانو تو جہنم کو ضرور بضرور دیکھو گے۔ (۲)

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ حشر آیت ۲

(۲) قرآن مجید، سورۂ تکاثر آیت ۵

یعنی دنیا میں ہی دیکھ لو گے۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ۔ (۱) پھر تم اسے ضرور بضرور یقین کی آنکھ سے دیکھ لو گے۔

اس سے مراد آخرت میں دیکھنا ہے۔

تو بات واضح ہو گئی کہ جو دل آخرت کے ملک کے لیے صلاحیت رکھتا ہے وہ بہت کم پایا جاتا ہے جس طرح دنیا میں نیک لوگ کم پائے جاتے ہیں۔

چھٹی تقسیم:

یہ تمام نعمتوں کو شامل ہے یعنی نعمتوں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو ذاتی طور پر مطلوب ہیں اور وہی غایت ہیں اور دوسری قسم ان نعمتوں کی ہے جو غایت کے لیے مطلوب ہیں غایت اُخروی سعادت کا نام ہے اور اس بات کا خلاصہ چار باتوں کی طرف لوٹتا ہے یعنی ایسا بقا جس کے لیے فنا نہیں، ایسا سرور جس میں غم نہ ہو، ایسا علم جو جہالت سے خالی ہو اور ایسی مالداری جس کے بعد فقر نہ ہو یہی حقیقی نعمت ہے۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ۔ (۲) حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

آپ نے یہ الفاظ ایک سختی کے وقت نفس کو تسلی دینے کے لیے فرمائے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب خندق کھودتے ہوئے شدت کی تکلیف تھی۔ اور ایک بار حالتِ سرور میں یہی الفاظ ارشاد فرمائے تاکہ نفس دنیوی خوشی کی طرف مائل نہ ہو جائے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب حجۃ الوداع کے موقعہ پر صحابہ کرام آپ کے گرد کھڑے تھے (۳)

ایک شخص نے کہا یا اللہ! میں تجھ سے تمام نعمت کا سوال کرتا ہوں تو آپ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو تمام نعمت کیا ہوتی ہے اس نے عرض کیا نہیں آپ نے فرمایا جنت میں داخلہ تمام نعمت ہے (۴)

وسائل کی چار قسمیں ہیں پہلی قسم جو سب سے زیادہ خاص اور سب سے زیادہ قریب ہوں جیسے نفس کے فضائل دوسری قسم ان وسائل کی ہے جو قرب میں ان سے ملے ہوئے ہیں جیسے بدن کے فضائل تیسری قسم جو قرب میں اس سے ملی ہوئی ہے اور بدن کے غیر کی طرف تجاوز کرتی ہے جیسے وہ اسباب جو بدن کے قریب ہیں مثلاً مال اہل و عیال اور خاندان اور چوتھی قسم میں نفس سے خارج اور نفس میں داخل دونوں قسم کے اسباب جمع ہوتے ہیں جیسے توفیق و ہدایت ہے تو اس طرح

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ تکاثر آیت نمبر ۷

(۲) صحیح بخاری جلد اوّل ص ۵۳۵ کتاب المناقب

(۳) السنن الکبریٰ للبیہقی جلد ۷، ص ۴۸ کتاب النکاح

(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۳۱ مرویات معاذ

یہ چار قسمیں ہیں۔

پہلی قسم جو سب سے خاص ہے نفس کے فضائل ہیں اگرچہ ان کے فروع بہت زیادہ ہیں لیکن ان کا ماحصل دو باتوں کی طرف لوٹتا ہے ایک ایمان اور دوسرا خلقِ حسن، ایمان کی دو قسمیں ہیں ایک کا تعلق علم مکاشفہ سے ہے اور وہ اللہ تعالیٰ، اس کی صفات اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں کا علم ہے اور دوسرا علم معاملہ ہے۔

حُسن خلق بھی دو قسموں میں منقسم ہوتا ہے شہوتوں اور غضب کے مقتضیٰ کو ترک کرنا اور اسے عفت کہا جاتا ہے اور خواہشات کو چھوڑنے یا ان پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں عدل کا لحاظ رکھنا یعنی نہ تو بالکل ہی رُک جائے اور نہ ایسا ہو کہ جس طرح چاہے اقدام کرے بلکہ اس کا خواہش کی تکمیل اور اس سے باز رہنا اس میزان عدل کے مطابق ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

اَنْ لَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ۔ (۱)

اور ترازو (تول) میں زیادتی نہ کرو اور انصاف کے ساتھ وزن قائم کرو اور تول میں کمی نہ کرو۔

تو جو شخص شہوتِ جماع کو زائل کرنے کے لیے اپنے آپ کو خصی بنا لیتا ہے یا نکاح نہیں کرتا حالاں کہ وہ آفات سے محفوظ بھی ہے اور طاقت بھی رکھتا ہے یا کھانا چھوڑ دیتا ہے حتیٰ کہ عبادت اور ذکر و فکر سے کمزور ہو جاتا ہے تو ایسا شخص میزان عدل میں کوتاہی کر رہا ہے اور جو شخص پیٹ اور شرمگاہ کی شہوت میں ہی مصروف ہو جاتا ہے وہ میزان میں حد سے بڑھتا ہے عدل تو یہ ہے وزن اور اندازہ کرنے میں زیادتی اور نقصان دونوں سے خالی ہو اور ترازو کے دونوں پلڑے برابر برابر ہوں۔

تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فضائل جو نفس کے ساتھ خاص ہیں اور اللہ تعالیٰ کے قریب کرتے ہیں وہ چار ہیں علم مکاشفہ، علم معاملہ، عفت اور عدالت، اور عام طور پر ان کی تکمیل دوسری قسم کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ بدنی فضائل ہیں اور وہ بھی چار ہیں یعنی صحت، قوت، جمال اور لمبی زندگی اور ان چاروں کو تیسری قسم تیار کرتی ہے اور یہ خارجی نعمتیں ہیں جو بدن کے قریب ہیں اور وہ بھی چار ہیں یعنی مال، اولاد، جاہ و مرتبہ اور خاندانی شرافت اور ان بدنی اور خارجی اسباب سے نفع اسی صورت میں ہوتا ہے جب چوتھی قسم پائی جائے اور وہ بدن کے داخلی اور خارجی اسباب کو جمع کرتی ہیں اور یہ بھی چار ہیں اللہ تعالیٰ کی ہدایت، رُشد، تسدید (سیدھا اور قائم رکھنا) اور اس کی مدد تو ان نعمتوں کی مجموعی تعداد سولہ ہے کیوں کہ ہم نے ان کو چار قسموں میں تقسیم کیا پھر ہر ایک کو مزید چار قسموں میں تقسیم کیا پھر ہر ایک کو مزید چار قسموں میں تقسیم کیا اور یہ سب ایک دوسرے کی محتاج ہیں چاہے حاجت ضروریہ کے ساتھ ہوں یا حاجتِ نافعہ کے ساتھ۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ رحمٰن آیت ۸ تا ۹

حاجت مزوریہ کی مثال اُخروی سعادت کی ایمان اور اخلاق حسنہ کی طرف حاجت ہے کیوں کہ ان دونوں کے بغیر اُخروی سعادت تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہیں اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے اور آخرت میں انسان کے لیے وہی کچھ ہوگا جو سامان اس نے دنیا سے حاصل کیا ہے پس اسی طرح نفسانی فضائل کے لئے ان علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے اور تہذیب اخلاق کے لیے بدن کی صحت ضروری ہے۔

اور جس حاجت میں کسی نہ کسی طرح کا فائدہ ہوتا ہے وہ نفس اور بدن کی یہ نعمتیں خارجی نعمتوں مثلاً مال، عزت اور اہل کی حاجت مند ہوتی ہیں کیوں کہ اگر یہ نہ ہوں تو بعض اوقات داخلی نعمتوں میں خلل واقع ہوتا ہے۔

سوال:

طریق آخرت کے لیے خارجی نعمتوں یعنی مال، اہل، جاہ و مرتبہ اور خاندان کی ضرورت کیوں ہوتی ہے؟

جواب:

جان لو کہ یہ اسباب بازو کے قائم مقام اور اس آلہ کی طرح ہیں جو مقصود کو آسان کر دیتا ہے مال کی حاجت اس لیے ہے کہ مفلس آدمی علم اور کمال کی طلب میں اسی طرح ہوتا جیسے کوئی شخص اسلحہ کے بغیر شکار کرے یا باز پروں کے بغیر شکار کو پکڑنے کی کوشش کرے۔

اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ۔ (۱) نیک شخص کے لیے اچھا مال کیا ہی اچھا ہے۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

نِعْمَ الْعَوْنُ عَلٰی تَقْوَی اللّٰہِ الْمَالُ۔ (۲) اللہ تعالیٰ سے ڈرنے پر بہترین مددگار مال ہے۔

اور ایسا کیوں نہیں ہوگا جب کہ مال سے محروم شخص اپنا تمام وقت روزی کی تلاش میں لباس، رہائش اور معیشت کی باقی تمام ضروریات میں صرف کر دیتا ہے پھر اسے طرح طرح کی اذیتیں پہنچتی ہیں جو اس کو ذکر و فکر سے دُور رکھتی ہیں اور وہ اپنا دفاع صرف مال سے کر سکتا ہے علاوہ ازیں مال نہ ہونے کی وجہ سے وہ حج، زکوٰۃ اور صدقات کی فضیلت اور دوسری نیکیوں کی انجام دہی سے محروم رہتا ہے کسی دانا سے پوچھا گیا کہ نعمت کیا چیز ہے؟ انہوں نے فرمایا "مالداری" کیوں کہ میں دیکھتا ہوں فقیر کی کوئی زندگی نہیں ہوتی کہا گیا مزید کچھ بتائیے فرمایا "امن" کیوں کہ میں دیکھتا ہوں خوف زدہ آدمی کی کوئی زندگی نہیں ہوتی کہا گیا مزید کچھ بتائیے فرمایا "صحت" کیوں کہ مریض کی کوئی زندگی نہیں ہے کہا گیا مزید کچھ بتائیں فرمایا جوانی کیوں کہ بڑھاپے کی کیا زندگی ہے

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۹۷ مرویات عمرو بن عاص

(۲) الفردوس بماثور الخطاب جلد ۴ ص ۲۵۶ حدیث ۶۷۵۶

گویا انہوں نے جو ذکر کیا وہ دنیوی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے لیکن اس اعتبار سے کہ یہ چیزیں آخرت پر مددگار ہوتی ہیں اس لیے نعمت ہیں اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مَنْ اَصْبَحَ مُعَافًى فِیْ بَدَنِهٖ آمِنًا فِیْ سِرْبِهٖ عِنْدَهٗ قُوْتُ یَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حِیْزَتْ لَهُ الدُّنْیَا بِحَذَافِیْرِهَا۔ (۱)

جو آدمی اس حالت میں صبح کرے کہ اس کا بدن صحیح سلامت ہو اسے اطمینانِ قلبی حاصل ہو اس کے پاس ایک دن کی روزی ہو گویا اس کے لیے دنیا اپنے تمام اطراف کے ساتھ جمع کر دی گئی۔

اور جہاں تک بیوی اور نیک اولاد کا تعلق ہے تو ان کی حاجت کی وجہ پوشیدہ نہیں ہے کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

نِعْمَ الْعَوْنُ عَلَى الدِّیْنِ الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ (۲)

دین پر بہترین مددگار نیک عورت ہے۔

اور اولاد کے بارے میں آپ نے ارشاد فرمایا۔

اِذَا مَاتَ الْعَبْدُ انْقَطَعَ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ وَلَدٌ صَالِحٌ یَدْعُوْ لَهٗ۔ (۳)

جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے البتہ تین کام باقی رہتے ہیں (ان میں سے ایک) نیک اولاد ہے جو اس کے لیے دعا کرتی ہے۔

ہم نے کتاب النکاح میں اہل وعیال کے فوائد ذکر کئے ہیں۔ جہاں تک قریبی رشتہ داروں کا تعلق ہے تو جب آدمی کی اولاد اور رشتہ دار زیادہ ہوں تو وہ اس کے لیے آنکھوں اور بازوؤں کی طرح ہوتے ہیں ان کے ذریعے اس کے لیے وہ دنیوی امور جو دین کے لیے ضروری ہیں، آسان ہو جاتے ہیں کیوں کہ اگر وہ اکیلا ہو تو کام لمبا ہو جاتا ہے اور جس کی وجہ سے آدمی کا دل ضروریاتِ دنیا سے فارغ ہو جائے وہ اس کے لیے دین پر مددگار ہوتا ہے پس اس اعتبار سے وہ نعمت ہے۔

جہاں تک عزت وجاہ کا تعلق ہے تو اس کے ذریعے انسان اپنے آپ سے ذلت اور ظلم کو دور کرتا ہے اور کوئی بھی مسلمان اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس کا کوئی نہ کوئی دشمن ہو گا جو اس کو اذیت پہنچاتا ہو گا یا کسی ظالم کی وجہ سے اس کے علم، عمل اور فراغت میں تشویش پیدا ہو گی اور اس کا دل اس طرف متوجہ ہو گا اور دل ہی اصل مال ہے جب کہ عزت اور مرتبہ ومقام کے ذریعے ان باتوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ دین اور حکمران جڑواں بھائی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۳۱۵، ابواب الزھد

(۲) صحیح مسلم جلد اول ص ۴۷۵ کتاب الرضاع

(۳) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۴۱ کتاب الوصیۃ

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْاَرْضُ ۔ (۱)
اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دُور نہ کرتا تو زمین میں فساد برپا ہو جاتا۔

اور جاہ و مرتبہ کا معنی دلوں پر حکومت کرنا ہے جیسے مالداری کا مطلب دراہم کا مالک ہونا ہے جو آدمی درھموں (روپے) کا مالک ہوتا ہے اس کے سامنے لوگ مسخر ہوتے ہیں اور اس سے اذیت کو دور کرتے ہیں تو جس طرح آدمی چھت کا محتاج ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے بارش سے بچے کوٹ کی حاجت ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے سردی سے محفوظ رہے اور کتے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے جانوروں کو بھیڑیئے سے بچائے اسی طرح اسے ایسی چیز کی ضرورت بھی ہوتی ہے جو اس سے شر کو دور کرے اسی مقصد کے تحت وہ انبیاء کرام جن کے پاس حکومت اور سلطنت نہ تھی وہ بادشاہوں کا خیال رکھتے تھے اور ان کے ہاں ان کو عزت حاصل ہوتی تھی اور اسی طرح علماء دین کا معاملہ ہے وہ بادشاہوں کے پاس ان کے خزانے لینے اور دنیوی مال جمع کرنے کے لیے نہیں جاتے تھے (بلکہ دین کی حفاظت مقصود تھی) اور تمہیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد فرمائی، آپ کے دین کو مکمل کیا تمام دشمنوں پر آپ کو غالب کیا اور لوگوں کے دلوں میں آپ کی محبت ڈال دی حتیٰ کہ آپ کی عزت و جاہ پھیل گئی تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی نعمت آپ پر زیادہ تھی اور جب آپ کو اذیت دی جا رہی تھی یہاں تک کہ آپ ہجرت پر مجبور ہو گئے (۲)

اس وقت کم تھی (ایسا نہیں بلکہ دونوں صورتوں میں یکساں تھی)

سوال:

خاندانی شرافت اور نسب کی عمدگی بھی نعمت ہے یا نہیں؟

جواب:

ہاں نعمت ہے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ ۔ (۳)
ائمہ قریش سے ہوں گے۔

اور اسی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بنو آدم کے سب سے اعلیٰ نسب سے تعلق ہے (۴)

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ بقرۃ آیت ۲۵۱

(۲) صحیح بخاری جلد اول ص ۵۰۸ کتاب بدء الخلق

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۱۸۳ مرویات انس

(۴) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۴۵ کتاب الفضائل

تَخَيَّرُوْا لِنُطَفِكُمُ الْاَكْفَاءَ۔ (۱) اپنے مادہ منویہ کے لئے ہم پلہ کو اختیار کرو۔

اور آپ نے فرمایا۔

اِيَّاكُمْ وَ خَضْرَاءَ الدِّمَنِ۔ اپنے آپ کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر اگنے والے سبزے سے بچاؤ۔

عرض کیا اس سبزے سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا برے خاندان کی خوبصورت عورت مراد ہے۔ (۲)

تو یہ بھی ایک نعمت ہے اس سے مراد ظالم لوگوں اور دنیا داروں سے منسوب ہونا نہیں بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرۂ مبارکہ، بڑے بڑے علماء صالحین اور نیک لوگ جو علم وعمل کی دولت سے مالا مال ہیں، کی طرف نسبت کرنا ہے۔

سوال:

بدنی فضائل کا کیا مفہوم ہے؟

جواب:

صحت، قوت اور طویل زندگی کی سخت ضرورت کوئی پوشیدہ بات نہیں ہے کیوں کہ ان باتوں سے ہی علم وعمل کی تکمیل ہوتی ہے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَفْضَلُ السَّعَادَاتِ طُوْلُ الْعُمُرِ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ۔ (۳) سب سے افضل سعادت لمبی زندگی ہے جو اللہ تعالی کی عبادت میں گزرے۔

ان امور میں سے حسن وجمال کے معاملے کو معمولی سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ بدن کا ایسی بیماریوں سے محفوظ ہونا کافی ہے جو نیکیوں کی تلاش سے مانع ہیں، یہ ٹھیک ہے جمال معمولی مالداری ہے لیکن یہ بھی اچھے امور میں سے ہے دنیا میں اس کا نفع مخفی نہیں ہے اور آخرت میں اس کی دو وجہ ہیں ایک تو یہ کہ بدصورت کو لوگ برا کہتے ہیں اور طبیعتیں اس سے نفرت کرتی ہیں جب کہ خوبصورت آدمی کی ضرورتیں جلدی پوری کی جاتی ہیں نیز لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت و مرتبہ زیادہ ہوتا ہے گویا اس اعتبار سے وہ مال و جاہ کی طرح مقصد تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے کیوں کہ یہ بھی ایک قسم کی قدرت ہے اور خوبصورت چہرے والے حاجتوں کی فوری تکمیل پر جس قدر قادر ہوتا ہے بدصورت کو اس قدر طاقت حاصل نہیں ہوتی۔ اور جو چیز دنیوی حاجات کو پورا کرنے پر مددگار ہو وہ اس کے واسطے سے آخرت میں بھی مددگار ہوگی۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۱۴۲، ابواب النکاح

(۲) کنز العمال جلد ۱۶ ص ۳۰۰ حدیث ۴۴۵۸۳

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۸۸ مرویات عبد اللہ ابن بسر

اور دوسری بات یہ ہے کہ عام طور پر حُسن و جمال نفس کی فضیلت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ جب نفس کا نور خوب چمکتا ہے تو وہ بدن پر ظاہر ہوتا ہے اور ظاہر و باطن اکثر یکساں ہوتے ہیں اسی لیے اصحاب فراست مکارم نفس کی معرفت میں بدن کا اعتبار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چہرہ اور آنکھیں باطن کا آئینہ ہیں اسی لیے اس میں غصے، خوشی اور غم کا ظہور ہوتا ہے۔ اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ چہرے کی بشاشت اندر کی خبر دیتی ہے اور کہا گیا ہے کہ دنیا میں جتنے بدصورت ہیں ان کے چہرے باطن کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ہیں۔

ایک دفعہ خلیفہ مامون کے سامنے کچھ لوگ فوج میں بھرتی ہونے کے لیے آئے ان میں ایک بدصورت شخص بھی تھا خلیفہ نے اس سے گفتگو کی تو اس کی زبان میں لکنت تھی اس نے اس کا نام فہرست سے نکال دیا اور کہا اگر روح کی چمک ظاہری بدن پر ہو تو خوبصورتی حاصل ہوتی ہے اور اگر باطن پر ہو تو فصاحت ہوتی ہے اس کا تو ظاہر و باطن کچھ بھی نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اُطْلُبُوا الْخَيْرَ عِنْدَ صِبَاحِ الْوُجُوْهِ۔ (۱) بھلائی خوبصورت لوگوں کے پاس تلاش کرو۔

اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب تم کوئی قاصد بھیجو تو اچھے چہرے اور اچھے نام والا تلاش کرو۔

اور فقہا فرماتے ہیں جب تمام نمازیوں کا درجہ ایک جیسا ہو تو ان میں سے زیادہ خوبصورت امامت کے زیادہ لائق ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس بات پر احسان جتاتے ہوئے فرمایا۔

وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔ (۲) اور اللہ تعالیٰ اسے (طالوت کو) علم و جسم میں زیادہ کشادگی عطا فرمائی۔

جمال سے ہماری مراد وہ حسن نہیں ہے جو شہوت کو حرکت دے یہ تو مونث ہوتا ہے ہماری مراد یہ کہ آدمی کا قد اعتدال پر ہو اس میں گوشت بھی مناسب انداز میں ہو اعضاء مناسب ہوں چہرہ ایسا ہو کہ لوگ اسے دیکھ کر نفرت نہ کریں۔

سوال:

آپ نے مال، جاہ و مرتبہ، نسب اور اہل و اولاد کو نعمتوں میں شامل کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے مال و جاہ کی مذمت فرمائی ہے (۴)

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ۔ (۳) بے شک تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے تمہارے دشمن ہیں پس ان سے بچو۔

---

(۱) شعب الایمان جلد ۳ ص ۲۷۸ حدیث ۳۵۴۱

(۲) قرآن مجید، سورۃ بقرہ آیت ۲۴۷

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۶۰ مرویات کعب بن مالک

(۴) قرآن مجید سورۃ تغابن آیت ۱۴

اور ارشاد فرمایا۔

اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ۔ (۱) بے شک تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نسب کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں لوگ اپنی نیکیوں کی اولاد ہیں اور ہر شخص کی قیمت وہی ہے جو اس کو اچھا کرتی ہے اور کہا گیا ہے کہ آدمی (کا مقام) اپنی ذات سے ہوتا ہے باپ کے ذریعے نہیں تو شرعی طور پر مذموم ہونے کی صورت میں اس کے نعمت ہونے کا کیا مطلب ہوا۔

جواب:

جو شخص الفاظ منقولہ مؤلہ اور عام مخصوص البعض سے علوم حاصل کرتا ہے اس پر گمراہی غالب ہوتی ہے جب تک اس کو اللہ تعالیٰ کے نور سے علوم کا اصل ماہیت پر ادراک نہ ہو پھر اس ادراک کے بعد وہ اسے منتقل کرے جس طریقے پر بھی ہو کبھی تاویل کے طریقے پر اور کبھی تخصیص کی صورت میں۔

تو اب جب ان چیزوں کو دیکھتے ہیں تو وہ امر آخرت پر مددگار ہیں اور اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس میں فتنہ اور خوف بھی ہے مال کی مثال اس سانپ جیسی ہے جس میں نفع بخش تریاق بھی ہے اور ضرر رساں زہر بھی اگر اسے منتر جاننے والا پکڑے جو اس کے زہر سے بچنے کا طریقہ جانتا ہے اور اس کا نفع بخش تریاق نکال سکتا ہے تو یہ نعمت ہے اور دیہاتی مغرور پکڑے تو اس کے حق میں مصیبت اور وبال ہے اور یہ ایک سمندر کی طرح ہے جس کی تہہ میں طرح طرح کے جواہر اور موتی ہوتے ہیں اب جو شخص تیراکی جانتا ہے اور غوطہ لگا سکتا ہے نیز سمندر کی آفات سے بچ سکتا ہے تو وہ اس کی نعمتوں کے ساتھ کامیابی حاصل کرتا ہے اور اگر اس کو علم نہ ہو اور غوطہ لگا دے تو ہلاک ہو جاتا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مال کی تعریف فرمائی اور خیر قرار دیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تعریف فرمائی اور ارشاد فرمایا۔

نِعْمَ الْعَوْنُ عَلٰی تَقْوَی اللّٰہِ الْمَالُ۔ (۱) اللہ تعالیٰ کے خوف پر بہترین مددگار مال ہے۔

اور اسی طرح عزت و جاہ کی تعریف فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر اس بات کا احسان فرمایا کہ آپ کو تمام ادیان پر غالب کر دیا اور مخلوق کے دلوں میں آپ کی محبت ڈال دی جاہ و عزت کا یہی مطلب ہے لیکن ان دونوں باتوں کی تعریف بہت کم آئی ہے جب کہ مال و جاہ کی مذمت زیادہ منقول ہے کیوں کہ ریاکاری کی مذمت فرمائی اور جاہ مرتبہ کی مذمت ہے اس لیے کہ ریاکاری کا مقصود لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنا ہے اور جاہ کا مطلب دلوں پر حکومت

---

(۱) قرآن مجید سورۂ تغابن آیت ۱۵

(۲) کنز العمال جلد ۳ ص ۲۴۱ حدیث ۶۳۴۲

کرنا ہے۔

ان کی مذمت کا زیادہ اور تعریف کا کم ہونا اس وجہ سے ہے کہ اکثر لوگ مال کے سانپ کا منتر نہیں جانتے اور جاہ کے سمندر میں غوطہ لگانے کے طریقے سے ناواقف ہیں اس لیے ان کو ڈرانا واجب ہے وہ مال کے تریاق تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کے زہر سے ہلاک ہو جاتے ہیں اور وہ سمندر کے جواہرات تک رسائی سے پہلے ہی اس کی موج انہیں برباد کر دیتی ہے اور اگر یہ دونوں باتیں ذاتی طور پر ہر ایک کے حق میں مذموم ہوتیں تو نبوت کے ساتھ حکومت کا کوئی تصور نہ ہوتا جیسے ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوئی اور نہ اس کے ساتھ مالداری ہوتی جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کو عنایت ہوئی۔

تو تمام لوگ بچے ہیں اور مال سانپ ہیں انبیاء کرام عارفین ہیں اور ان کا منتر جانتے ہیں اور وہ چیز جو منتر جاننے والے کو تکلیف نہیں پہنچاتی بعض اوقات بچے کو اذیت پہنچاتی ہے ہاں منتر جاننے والے کی اولاد ہو تو وہ اس کو باقی رکھنے اور اس کی بہتری کا ارادہ کرتا ہے اور بعض اوقات جب سانپ کو پاتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ اگر وہ اس کو تریاق کے لیے پکڑے گا تو اس کا بچہ بھی اس کی پیروی کرے گا اور اس کے ساتھ کھیلنے لگے گا اور ہلاک ہو جائے گا حالانکہ اس کی غرض تریاق حاصل کرنا بھی ہے اور بچے کو بچانا بھی۔

اب اس کے سامنے دو صورتیں ہیں اگر وہ تریاق کے حصول سے صبر کر سکتا ہے اور اسے کوئی زیادہ نقصان نہیں پہنچے گا۔ لیکن اس کو پکڑنے کی صورت میں بچہ بھی اس کو پکڑے گا اور بچے کی ہلاکت کے باعث زیادہ نقصان ہوگا تو اب اس پر واجب ہے کہ سانپ کو دیکھ کر اس سے بھاگے اور بچے کو بھی بھاگنے کا اشارہ کرے نیز اس کی نگاہوں میں اسے نہایت قبیح قرار دے اور اسے بتائے کہ اس میں ہلاک کرنے والا زہر ہے جس سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا نیز اس بچے کو ہرگز نہ بتائے کہ اس میں نفع بخش تریاق بھی ہے کیوں کہ ہو سکتا ہے بچہ واقفیت کے بغیر اس پر جرأت کر بیٹھے۔

اسی طرح غوطہ زن کا معاملہ ہے اگر وہ جانتا ہو کہ بچے کے سامنے غوطہ لگانے سے وہ بھی اس کے پیچھے آئے گا اور ہلاک ہو جائے گا تو اس پر واجب ہے کہ بچے کو دریا اور نہر کے کنارے پر جانے سے ڈرائے اور اگر بچہ محض ڈرانے سے نہ ڈرے جب وہ اپنے والد کو دریا کے کنارے چکر لگاتے ہوئے دیکھے تو اب ضروری ہے کہ خود بھی ساحل سے دور رہے اور بچے کو بھی دور رکھے اور اس کے سامنے دریا کے قریب نہ جائے۔

تو امت بھی اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کی شفقت کی گود میں ناواقف بچوں کی طرح ہے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّمَا اَنَا لَکُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ لِوَلَدِہٖ۔ (۱)

میں تمہارے لیے اس طرح ہوں جیسے اولاد کے لیے والد ہوتا ہے۔

---

(۱) سنن ابی داؤد جلد اول ص ۳ کتاب الطہارۃ

اور آپ نے ارشاد فرمایا،

إِنَّكُمْ تَتَهَافَتُونَ عَلَى النَّارِ تَهَافُتَ الْفَرَاشِ وَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ۔ (۱)

تم آگ پر پروانوں کی طرح گرتے ہو اور میں تمہیں کمر سے پکڑتا ہوں (اور پیچھے ہٹاتا ہوں)

اور انبیاء کرام علیہم السلام کا سب سے بڑا مقصد اپنی اولاد (امت) کو ہلاکت خیز باتوں سے بچانا ہی تھا اور وہ اسی مقصد کے لیے مبعوث ہوئے مال کے ساتھ ان کا تعلق بقدر کفایت تھا پس انہوں نے اسی قدر پہ گذارہ کیا اور جو بچ گیا اسے انہوں نے روکا نہیں بلکہ خرچ کر دیا کیوں کہ یہ خرچ کرنا ہی تریاق ہے اور روکنا زہر قاتل ہے اور اگر لوگوں کے لیے مال کمانے کا دروازہ کھول دیا جائے اور وہ اس میں رغبت کریں تو وہ روکنے کے زہر کی طرف مائل ہوں گے اور خرچ کرنے کے تریاق سے اعراض کریں گے اسی وجہ سے مالوں کو قبیح قرار دیا گیا اور اس سے مراد ان کو روکنے کی صورت میں قباحت ہے زیادہ مال حاصل کرنے کی حرص رکھنا اور نعمتوں کی وسعت جو دنیا اور اس کی لذات کی طرف مائل کرتی ہے لیکن بقدر ضرورت حاصل کرنا اور زائد مال اچھے کاموں میں خرچ کرنا مذموم نہیں ہے اور ہر مسافر کا حق ہے کہ وہ سفر میں ضرورت کے مطابق زادِ راہ اختیار کرے بشرطیکہ اس بات کا پختہ ارادہ ہو کہ وہ اپنے اوپر ہی خرچ کرے گا لیکن جب دوسروں کو کھانا کھلانا ہو اور رفقاء پر صرف کرنا مقصود ہو تو زیادہ لے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لِيَكُنْ بَلَاغُ أَحَدِكُمْ مِنَ الدُّنْيَا كَزَادِ الرَّاكِبِ (۲)

تمہارا دنیوی توشہ مسافر کے زادِ راہ کی طرح ہونا چاہیے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے ذاتی اخراجات کے لیے اتنا ہونا چاہیئے ورنہ اس حدیث کے راویوں میں سے ایسے لوگ بھی تھے کہ وہ اس پر عمل بھی کرتے لیکن ایک جگہ وہ ایک لاکھ درہم لے جاتے اور وہاں ہی خرچ کر کے کچھ بھی واپس نہ لاتے۔

اور جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مال دار لوگ جنت میں سختی کے ساتھ داخل ہوں گے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس بات کی اجازت مانگی کہ وہ اپنی تمام ملکیت صدقہ کر دیں تو آپ نے ان کو اجازت دے دی اس وقت حضرت جبریل علیہ السلام اترے اور عرض کیا کہ آپ ان کو حکم دیں کہ وہ مسکین کو کھانا کھلائیں، ننگے کو کپڑا پہنائیں اور مہمان کی مہمان نوازی کریں۔ (۳)

تو دنیوی نعمتوں میں ملاوٹ ہے ان کا علاج بیماری کے ساتھ ملا ہوا ہے اور امید وخوف بھی ساتھ ساتھ ہیں اسی طرح اس

---

(۱) صحیح بخاری جلد اول ص ۴۸۷ کتاب الانبیاء

(۲) سنن ابن ماجہ ص ۳۱۲، ابواب الزھد (۳) المستدرک للحاکم جلد ۳ ص ۳۱۱ کتاب معرفۃ الصحابۃ

کا نفع اور نقصان بھی ایک دوسرے سے متصل ہے پس جس شخص کو اپنی بصیرت اور کمالِ معرفت کی وجہ سے یقین ہو تو وہ اس کے قریب ہو سکتا ہے لیکن اس کی بیماری سے بچتے ہوئے اور اس کی دوا کی امید رکھتے ہوئے اور جسے یقین نہ ہو اسے خطرات کے مقام سے علیحدہ رہنا اور بھاگنا چاہیے ایسے لوگوں کے حق میں سلامتی ہی عمدہ ہے اور تمام لوگ اسی طرح کے ہیں مگر جس کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے اور اپنے راستے کی طرف راہنمائی فرمائے۔

سوال:

توفیقی نعمتیں جو ہدایت، رشد، تائید اور تسدید (سیدھا رہنا) کی طرف لوٹتی ہیں ان کا کیا مطلب ہے۔

جواب:

توفیق سے کوئی بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا اور اس کا مطلب بندے کے ارادے اور اللہ تعالیٰ کے قضاء و قدر کے درمیان ربط کا ہونا ہے اور یہ خیر و شر پر مشتمل ہوتا ہے نیز یہ کہ سعادت کیا ہے اور شقاوت کیا! لیکن عرف و عادت میں توفیق کا لفظ اسی بات کے ساتھ خاص ہے جو اللہ تعالیٰ کے قضاء و قدر میں سے سعادت کے موافق ہو جیسے الحاد لغوی طور پر میلان کو کہتے ہیں لیکن اب حق سے باطل کی طرف میلان کا نام الحاد ہے اور اسی طرح انذار کا معاملہ ہے اور توفیق کی حاجت میں کوئی پوشیدگی نہیں اسی لیے کہا گیا ہے۔

اِذَا لَمْ یَکُنْ عَوْنٌ مِنَ اللّٰہِ لِلْفَتیٰ فَاَکْثَرُ مَا یَجْنِیْ عَلَیْہِ اِجْتِھَادُہٗ۔

جب بندے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق و مدد حاصل نہ ہو تو اکثر اس کا اجتہاد ہی گناہ میں مبتلا کرتا ہے۔

اور ہدایت کے بغیر تو کوئی شخص سعادت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ انسان بعض اوقات ایسے کام کا ارادہ کرتا ہے جس میں اس کی اُخروی بھلائی ہو لیکن جب اسے معلوم نہ ہو کہ اس کی بہتری کس چیز میں ہے حتیٰ کہ وہ فساد کو بھی بہتری تصور کرتا ہو تو محض ارادہ اسے کیا نفع دے گا۔ لہٰذا ارادے قدرت اور اسباب میں فائدہ، ہدایت کے بعد ہی ہوتا ہے ارشاد خداوندی ہے۔

رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی۔ (۱)

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کر کے پھر اسے ہدایت دی۔

اور ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ مَازَکٰی مِنْکُمْ مِنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰکِنَّ اللّٰہَ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ۔ (۲)

اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تم میں کسی کو کبھی بھی پاکیزگی حاصل نہ ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ جسے چاہیے پاک کرتا ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ طٰہٰ آیت ۵۰ (۲) قرآن مجید سورۂ نور آیت ۲۱

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مَا مِنْ اَحَدٍ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ۔ کوئی شخص بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بغیر جنت میں نہیں جائے گا۔

یعنی اس کی ہدایت کے بغیر نہیں جائے گا عرض کیا گیا یا رسول اللہ! آپ بھی؛ فرمایا میں بھی نہیں جاؤں گا۔

منازل ہدایت:

ہدایت کی تین منزلیں ہیں پہلی منزل خیر وشر کے راستے کی معرفت ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ۔ (۱) اور ہم نے اسے (بچے کو) دو ابھری ہوئی چیزوں (ماں کے دودھ) کا راستہ بتایا۔

اور اللہ تعالیٰ نے اس ہدایت کے ذریعے اپنے تمام بندوں پر انعام فرمایا بعض کو عقل کے ذریعے اور بعض کو انبیاء کرام علیہم السلام کی زبان سے بتایا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى۔ (۲) اور قوم ثمود کو ہم نے ہدایت دی پس انہوں نے ہدایت کے مقابلے میں اندھے پن کو پسند کیا۔

تو ہدایت کے اسباب کتابیں، رسل عظام اور عقلی بصیرت ہے اور ان سے کسی کو رکاوٹ نہیں البتہ حسد، تکبر اور دنیا کی محبت اور دلوں کو اندھا کرنے والے اسباب رکاوٹ بنتے ہیں اگرچہ آنکھوں کی بینائی موجود ہو۔

ارشاد خداوندی ہے،

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۔ (۳) بے شک آنکھیں اندھی نہیں ہیں لیکن وہ دل جو سینوں میں ہیں، اندھے ہیں۔

اور اس اندھاپن میں مانوس ہونا، عادت اور تعلق کا ہونا ہے اسی سلسلے میں ارشاد خداوندی ہے:

اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰى اُمَّةٍ۔ (۴) بے شک ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راستے پر پایا۔

اور تکبر وحسد کے بارے میں فرمایا۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ بلد آیت ۱۰

(۲) قرآن مجید، سورۂ فصلت آیت ۱۷

(۳) قرآن مجید، سورۂ حج آیت ۴۶

(۴) قرآن مجید، سورۂ زخرف آیت ۲۲

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ۔ (۱)
اور وہ کہتے ہیں یہ قرآن پاک ان دو بستیوں (مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ) کی کسی عظیم شخصیت پر کیوں نازل نہیں ہوا۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ۔ (۲)
کیا ہم ایک ایسے آدمی کی پیروی کریں جو ہم میں سے ہے۔

تو یہ دل کے اندھاپن سے متعلق امور ہیں جو ہدایت حاصل کرنے اور ہدایت دینے کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔

ہدایت کی دوسری منزل اس عام ہدایت کے بعد ہے اور یہ وہ ہدایت ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ، بندے کی ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں مدد کرتا ہے اور یہ مجاہدے کا نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (۳)
اور وہ لوگ جو ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں انہیں کئی راستوں کی ہدایت دیتے ہیں۔

اور اس ارشاد خداوندی سے بھی یہی مراد ہے۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى۔ (۴)
اور وہ لوگ جو ہمارے راستے پر چلے ان کی ہدایت بڑھ گئی۔

اور تیسری قسم کی ہدایت دوسری ہدایت کے بعد ہے اور یہ وہ نور ہے جو کمالِ مجاہدہ کے بعد عالم نبوت و ولایت میں چمکتا ہے۔ اور اس کے ذریعے انسان وہ ہدایت حاصل کرتا ہے جس تک وہ عقل کے ذریعے رسائی حاصل نہیں کر سکتا وہ عقل جس پر عمل اور علوم کے سیکھنے کا دارومدار ہے۔

اور یہ ہدایتِ مطلق ہے اور اس کے بعد حجابات اور مقدمات ہیں اور اسی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت کے ساتھ مشرف فرمایا اگرچہ ہر قسم کی ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے ارشاد خداوندی ہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى۔ (۵)
آپ فرما دیجیے بے شک اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہی ہدایت ہے

اور اسی کو قرآن پاک میں زندگی قرار دیا گیا ہے ارشاد خداوندی ہے۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ
تو کیا وہ شخص جو مردہ تھا پس ہم نے اسے زندہ کیا اور

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ زخرف آیت ۳۱

(۲) قرآن مجید، سورۂ قمر آیت ۲۴

(۳) قرآن مجید، سورۂ عنکبوت آیت ۶۹

(۴) قرآن مجید، سورۂ محمد آیت ۱۷

(۵) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۱۲۰

نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى النَّاسِ۔ (۱)

اس کے لیے نور پیدا کیا جس کے ساتھ وہ لوگوں کے درمیان چلتا ہے۔

اور اس ارشاد خداوندی سے بھی یہی مراد ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ (۲)

تو کیا وہ شخص جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا پس وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے۔

رُشد سے مراد عنایتِ الٰہیہ ہے جب انسان اپنے مقاصد کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو یہ اس کی مدد کرتی ہے اور جس میں اس کی بھلائی ہو اس میں اسے طاقت دیتی ہے اور جس میں خرابی ہو اسے سست و کمزور کر دیتی ہے۔ اور یہ باطن میں ہوتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ۔ (۳)

اور بے شک ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس سے پہلے ہی ان کی رُشد عطا کر دی اور ہم ان کو جاننے والے ہیں۔

تو رُشد اس ہدایت کو کہتے ہیں جو سعادت کی جہت کا باعث اور اس کے لیے قوت محرکہ ہے تو جو بچہ اس حال میں بالغ ہو کہ وہ مال کی حفاظت، تجارت کے طریقے اور مال بڑھانے سے واقف ہو لیکن اس کے باوجود وہ اسراف کرے اور مال میں اضافہ نہ کرے تو اسے رشید نہیں کہا جاتا کیوں کہ سب طریقہ جاننے کے باوجود اس کے ارادے کے محرک میں ہدایت کی کمی ہے۔

کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو ایسے کام کی طرف بڑھتے ہیں جس کے بارے میں وہ جانتے ہیں کہ یہ اس کے لیے نقصان دہ ہے اور اس ہدایت کی وجہ سے وہ جاہل سے ممتاز ہوتا ہے لیکن اسے رُشد نہیں دی گئی تو اس اعتبار سے رُشد محض ہدایت کے مقابلے میں زیادہ کامل ہے اور یہ عظیم نعمت ہے۔

اور تسدید کا مطلب حرکات کو مطلوب کی طرف متوجہ کرنا اور ان کو آسان کرنا ہے تاکہ بہت جلد صحیح راستے کی طرف پختہ ہو جائے کیوں کہ محض ہدایت کفایت نہیں کرتی بلکہ ایسی ہدایت کی ضرورت ہے جو ارادے کو حرکت دے اور وہ رُشد ہے اور محض رُشد بھی کافی نہیں بلکہ اعضاء اور آلات کی مدد سے حرکات کا آسان ہونا ضروری ہے یہاں تک کہ وہ مراد پوری ہو جس کی طرف ارادے کی انگیخت ہوئی ہے تو ہدایت محض پہچان کا نام ہے رُشد ارادے کو بیدار کرنا ہے تاکہ وہ بیدار ہو کر حرکت کرے اور تسدید درستگی تک پہنچنے میں اعضاء کو حرکت

(۱) قرآن مجید، سورۂ انعام آیت ۱۲۲

(۲) قرآن مجید، سورۂ زمر آیت ۲۲

(۳) قرآن مجید، سورۂ انبیاء آیت ۵۱

دینے کے ذریعے اعانت و مدد کرنا ہے۔
اور تائید ان سب کی جامع ہے اور وہ اندر سے بصیرت کے ساتھ قوت دینا اور باہر سے اسباب کی موافقت سے مضبوطی ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے۔

اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ۔ (۱) جب میں نے پاک روح کے ساتھ تمہاری مدد کی۔

اور تائید کے قریب عصمت ہے یعنی انسان کے اندر وہ عنایت الٰہیہ ہو جس کے ذریعے آدمی خیر کی تلاش اور برائی سے اجتناب پر قادر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے یہی مراد ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ۔ (۲) اور اس (حضرت زلیخا) نے ان کا ارادہ کیا اور وہ (یوسف علیہ السلام) بھی اس کا ارادہ کرتے اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھتے۔

تو یہ نعمتوں کا مجموعہ ہے اور سب (نعمتیں) اسی وقت جمع ہوتی ہیں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے صاف فہم، یاد رکھنے والے کان، بصیرت و تواضع اور خیال رکھنے والا دل، ناصح معلم، اور اس قدر مال حاصل ہو جو ضروری امور سے کم نہ ہو اور زیادہ ہونے کی وجہ سے دین سے دُور نہ کرے نیز عزت حاصل ہو جو بیوقوفوں کی بیوقوفی اور دشمنوں کے ظلم سے محفوظ رکھے۔
ان میں سے ہر سبب سولہ اسباب کا تقاضا کرتا ہے پھر وہ اسباب مزید اسباب کے متقاضی ہوتے ہیں یہاں تک کہ یہ سلسلہ پریشان ہونے والوں کی دلیل مجبور ہونے والوں کی پناہ گاہ تک پہنچتا ہے اور وہ تمام ارباب کا رب ہے اور اسباب کو پیدا کرنے والا (مسبب الاسباب) ہے اور چوں کہ یہ اسباب بہت طویل ہیں یہ کتاب ان کا احاطہ نہیں کر سکتی تو ہم ان میں سے کچھ مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ اس آیت کا معنیٰ معلوم ہو جائے ارشاد خداوندی ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ (۳) اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو گن نہیں سکتے۔

اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق عطا فرمانے والا ہے۔

اس بات کے نمونہ کا بیان کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں

ہم نے نعمتوں کو سولہ قسموں میں جمع کیا ہے اور بدن کی صحت کو ان نعمتوں میں شمار کیا ہے جو دوسرے مرتبہ میں ہیں پس

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ مائدہ آیت ۱۱۰

(۲) قرآن مجید، سورۃ یوسف آیت ۲۴

(۳) قرآن مجید، سورۃ ابراہیم آیت ۳۴

یہ ایک نعمت ہے اگر ہم ان اسباب کا احاطہ کرنا چاہیں جن کے ذریعے یہ مکمل ہوتی ہے تو ہم ایسا نہیں کر سکتے لیکن کھانا صحت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے اب ہم ان اسباب میں سے کچھ کا ذکر کرتے ہیں جن کے ذریعے کھانے کی نعمت مکمل ہوتی ہے تو یہ بات مخفی نہیں ہے کہ کھانا ایک فعل ہے اور اس نوع کا ہر فعل حرکت ہے اور ہر حرکت کے لیے ایک متحرک جسم کی ضرورت ہوتی ہے جو اس حرکت کا آلہ ہوتا ہے اور حرکت پر قدرت بھی ضروری ہے نیز حرکت کے لیے ارادے کا ہونا بھی لازمی ہے علاوہ ازیں مراد کا علم اور ادراک بھی ضروری ہے کھانے والے کے لیے وہ چیز بھی ضروری ہے جسے وہ کھائے پھر اس کھانے کی کوئی اصل بھی ہوگی جس کے ذریعے وہ حاصل ہوتا ہے نیز اس کو بہتر بنانے والا کاریگر بھی ہوگا۔

تو ہم ادراک وعلم کے اسباب کا ذکر کرتے ہیں پھر ارادوں کے اسباب اس کے بعد قدرت کے اسباب پھر ماکول (کھائی جانے والی چیز) کے اسباب کو اجمال کے ساتھ بیان کریں گے تفصیل کے ساتھ نہیں۔

پہلا نکتہ:

اسباب ادراک کی تخلیق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

جان لو! اللہ تعالیٰ نے سبزیوں کو پیدا کیا اور ان کا وجود پتھر، ڈھیلے، لوہے تانبے اور تمام جواہرات جو بڑھتے ہیں نہ غذا حاصل کرتے ہیں، سے زیادہ کامل ہے کیوں کہ سبزیوں میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی قوت پیدا فرمائی ہے جس کے ذریعے وہ اپنی اصل اور ان جڑوں کے واسطے سے غذا کو جذب کرتی ہیں جو زمین میں ہیں اور یہ جڑیں اور رگیں ان میں آلات ہیں جو غذا حاصل کرتی ہیں اور وہ باریک باریک رگیں ہیں جن کو تم پتے میں دیکھتے ہو پھر وہ مضبوط جڑیں بن جاتی ہیں اور اس کے بعد شاخیں بنتی ہیں اور وہ مسلسل پتلی ہوتی اور پتوں میں پھیلتی ہیں حتیٰ کہ نظروں سے اوجھل ہوتی ہیں لیکن یہ سبزیاں اس کمال کے باوجود ناقص ہوتی ہیں کیوں کہ جو غذا ان تک پہنچتی ہے اگر وہ نہ پہنچے تو وہ خشک ہو جاتی ہیں اور کسی دوسری جگہ سے ان کو غذا پہنچانا مشکل ہوتا ہے کیوں کہ طلب، مطلوب کی معرفت اور اس کی طرف انتقال سے ہوتی ہے اور سبزیاں اس بات سے عاجز ہیں۔

تو یہ اللہ تعالیٰ کی تم پر نعمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے آلات احساس اور طلب غذا کے سلسلے میں آلہ حرکت پیدا کیا ہے۔

حواس خمسہ کی تخلیق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کی ترتیب دیکھو اور یہ حواس آلۂ ادراک ہیں سب سے پہلے چھونے والی حس ہے یہ انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہے یہاں تک کہ جب تمہیں جلانے والی آگ یا زخمی کرنے والی تلوار پہنچتی ہے تو تم اسے محسوس کرتے ہو اور بھاگ جاتے ہو۔

حیوان کے لیے پیدا کی جانے والی یہ پہلی حس ہے اور کوئی بھی حیوان ایسا نہیں ہے جس میں یہ حس نہ ہو کیوں کہ اگر وہ کسی چیز کو بالکل ہی محسوس نہ کرے تو اس میں حیات ہی نہیں ہے اور حس کا سب سے کم درجہ یہ ہے کہ جو چیز اس سے چھو جائے اسے محسوس کرے کیوں کہ دور سے احساس تو کامل احساس ہے اور یہ (ادنیٰ حس) ہر حیوان میں پائی جاتی ہے حتیٰ کہ کیڑے میں

پائے جانے والے کیڑے میں بھی ہوتی ہے اگر اسے سوئی چبھائی جائے تو وہ بھاگنے کے لیے سکڑ جاتا ہے سبزیوں کی طرح نہیں ہوتا کیوں کہ سبزی کو کاٹا جاتا ہے لیکن وہ سکڑتی نہیں کیوں کہ اسے کاٹنے کا احساس ہی نہیں ہوتا لیکن بات یہ ہے کہ اگر آدمی میں صرف یہی حس ہوتی تو وہ کیڑے کی طرح ناقص ہوتا اور غذا کے دور ہونے کی وجہ سے اسے تلاش نہ کر سکتا بلکہ صرف اتنی بات ہوتی کہ جو کچھ اس کے بدن سے لگتا وہ اسے محسوس کر کے اپنی طرف کھینچتا۔

لہٰذا انسان ایسی حس کا محتاج ہوا جس کے ذریعے وہ دور کی چیز کا بھی ادراک کر سکے لہٰذا (اے انسان) تمہارے لیے سونگھنے کی حس پیدا کی گئی لیکن اس سے تو صرف بو کا پتہ چلتا ہے تم نہیں جانتے کہ یہ کس طرف سے آئی ہے لہٰذا تم اس بات کی ضرورت محسوس کرتے کہ تمام اطراف کی طرف پھرو اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جس کھانے کی خوشبو محسوس کی اس تک نہ پہنچ سکتے اور کبھی پہنچ جاتے لہٰذا اگر صرف یہی حس ہوتی تو تم انتہائی نقصان ہی میں ہوتے پس تمہارے لیے بینائی پیدا کی گئی تاکہ تم دور کی چیزوں کا بھی ادراک کر سکو اور اس کی جہت معلوم ہو جائے اور صرف اسی جہت کا قصد کرو اگر صرف یہی حس ہوتی تو بھی نقصان ہوتا کیوں کہ دیواروں اور پردوں کے پیچھے نہ دیکھ سکتے اور ان چیزوں کا علم نہ ہوتا اب تم صرف وہی دیکھتے جو تم سے پردے میں نہیں ہے اور اسی دشمن کو دیکھ سکتے جو تمہارے سامنے ہوتا۔ لیکن جو چیز پردے کے پیچھے ہوتی تم اسے نہ دیکھ سکتے اور بعض اوقات پردہ اس وقت ہٹتا ہے جب دشمن قریب آجاتا ہے اور اس وقت تم دوڑ نہیں سکتے۔

تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے قوتِ سماعت پیدا کی تھی کہ تم اس کے ذریعے وہ آوازیں سنتے ہو جو دیواروں اور پردوں کے پیچھے سے حرکت کی صورت میں سنائی دیتی ہیں لیکن آنکھ سے تو صرف سامنے والی چیز کو دیکھ سکتے ہو جب کہ غائب چیز کی معرفت اس کلام کے ذریعے ہوتی ہے جو حروف اور آوازوں سے مرکب ہوتی ہے اور اس کا ادراک قوتِ سماعت سے ہوتا ہے۔

تو اس حاجت کے تحت تمہارے لیے کان پیدا کئے گئے اور تمہیں کلام سمجھنے کے ذریعے دوسرے تمام حیوانات سے ممتاز کر دیا گیا پھر بھی یہ سب کچھ تمہیں فائدہ نہیں دے سکتا جب تک تمہارے لیے چکھنے کی حس نہ ہو کیوں کہ غذا تم تک پہنچتی ہے اور تم نہیں جانتے کہ وہ تمہارے موافق ہے یا مخالف پس تم اسے کھا کر ہلاک ہو سکتے ہو جیسے درخت کے اُگنے کی جگہ پر سیال چیز ڈالی جاتی ہے لیکن اس کے پاس چکھنے کی حس نہیں ہے تو وہ اسے جذب کر لیتی ہے اور بعض اوقات وہ سیال چیز اسی درخت کی خشکی کا سبب بن جاتی ہے۔

اور یہ سب کچھ بھی ناکافی ہوتا اگر تمہارے دماغ کے اگلے حصے میں ایک اور ادراک نہ ہوتا جسے حس مشترک کہتے ہیں اور یہ پانچوں حواس اس تک پہنچاتے ہیں اور اس میں جمع ہوتے ہیں اگر وہ حس مشترک نہ ہوتی تو معاملہ طول پکڑ جاتا مثلاً جب تم پیلے رنگ کی چیز کھاتے ہو اور اسے کڑوی پاتے ہو تو اسے چھوڑ دیتے ہو پھر جب دوسری بار اسے دیکھتے ہو تو تمہیں اس کی معرفت نہیں ہوتی کہ یہ کڑوی اور مضر چیز ہے جب تک دوبارہ نہ چکھو اگر حس مشترک نہ ہوتی (تو یہ دقت پیش آتی) کیوں کہ آنکھ پیلے رنگ کو دیکھ سکتی ہے لیکن کڑواہٹ کا احساس نہیں کر سکتی تو تم اس سے کس طرح رکتے۔ ذائقہ کی حس سے کڑواہٹ کا ادراک

ہوتا ہے لیکن زردی کا پتہ نہیں چلتا لہذا ایک ایسی قوت حاکمہ کی ضرورت ہے جس کے پاس زردی اور کڑواہٹ دونوں جمع ہوں حتیٰ کہ جب اس کی زردی کا پتہ چلے تو وہ اس کی کڑواہٹ کا بھی فیصلہ کر دے اور دوسری بار اس کے کھانے سے وہ اجتناب کرے۔

ان تمام باتوں میں حیوانی بھی تمہارے ساتھ شریک ہوتے ہیں کیوں کہ بکری کے پاس بھی یہ تمام حواس ہوتے ہیں اور اگر تمہارے پاس بھی صرف یہی حواس ہوتے تو تم ناقص ہوتے جیسے جانور کو حیلے سے پکڑا جاتا ہے لیکن وہ اس سے اپنا دفاع کرنے کا طریقہ نہیں جانتا اور اسے معلوم نہیں کہ جب وہ قید ہو جائے تو اس سے کس طرح جان چھڑوائے۔ بعض اوقات جانور اپنے آپ کو کنویں میں گرا دیتا ہے لیکن اسے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کام اس کی ہلاکت کا باعث ہے اسی لیے جانور وہ چیز کھاتا ہے جو اسے فوری طور پر لذت پہنچاتی ہے لیکن دوسرے مرحلے میں وہ اس کو نقصان دیتی ہے اور وہ بیمار ہو کر مر جاتی ہے کیوں کہ اسے موجودہ چیز کا احساس ہوتا ہے لیکن وہ انجام سے بے خبر ہوتا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک اور صفت کے ذریعے ممتاز کیا اور عزت بخشی اور یہ صفت باقی تمام صفات سے اشرف ہے اور یہ عقل ہے اسی کے ذریعے کھانوں کے نقصان اور فی الفور یا مستقبل میں پائے جانے والے نفع کا ادراک ہوتا ہے عقل سے کھانے پکانے ان کو مرکب کرنے اور ان کے اسباب تیار کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے تو تم اپنی عقل کے ذریعے کھانے سے نفع حاصل کرتے ہو جو تمہاری صحت کا سبب ہے اور یہ عقل کا سب سے اچھا فائدہ ہے حالانکہ یہ سب سے ہلکا فائدہ ہے بلکہ اس کی حکمت کبریٰ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے افعال کی معرفت ہے نیز اس عالم میں اس کی حکمت کو جاننا ہے اس وقت حواس خمسہ تمہارے حق کی طرف لوٹتے ہیں پس حواس خمسہ جاسوسوں کی طرح اور ان مخبروں کی طرح ہوتے ہیں جن کو مملکت کے اطراف و اکناف میں مقرر کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک ایک ایسے امر کے ساتھ مقرر ہے جو اس کے ساتھ خاص ہے۔

ایک رنگوں کی خبر دینے کے ساتھ، دوسرا آوازوں کی خبر دینے کے ساتھ، تیسرا بُو کی خبر دینے کے ساتھ چوتھا ذائقوں کی خبر دینے کے ساتھ اور پانچواں گرمی، سردی، سختی نرمی، کھردرے پن اور ملائم ہونے کی خبر دینے کے ساتھ خاص ہے اور یہ جاسوس اور ڈاکئے مملکت کے تمام اطراف سے خبریں لے کر حِس مشترک تک پہنچاتے ہیں اور حِس مشترک دماغ کے اگلے حصے میں بیٹھی ہوئی ہے جیسے واقعات اور عرضی نویس بادشاہ کی ڈیوڑھی میں بیٹھے ہوتے ہیں وہ ان تمام واقعات کو جمع کرتے ہیں جو اطراف عالم سے آتے ہیں وہ ان کو لے کر اسی طرح مہر لگے ہوئے بادشاہ تک پہنچاتے ہیں کیوں کہ ان کو صرف ان اخبارات اور درخواستوں کے لینے، جمع کرنے اور حفاظت کا اختیار ہوتا ہے ان میں مذکورہ حقائق کی پہچان حاصل کرنے کا انہیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

لیکن جب وہ عقلمند دل ہوتا ہے اور وہی امیر اور بادشاہ ہے اور وہ مہر زدہ خطوط اس تک پہنچتے ہیں تو وہ ان کی تفتیش کرتا ہے اور ان کے ذریعے مملکت کے اسرار پر مطلع ہو کر عجیب احکام کا فیصلہ کرتا ہے اور اس مقام پر ان فیصلوں کا کامل بیان نہیں ہو سکتا ___ اور ان احکام و مصالح کے مطابق جو ظاہر ہوتے ہیں وہ لشکروں کو حرکت دیتا ہے اور اعضاء لشکر میں کبھی طلب کا حکم ہوتا ہے اور کبھی بھاگنے کا اور کبھی ان تدبیروں کو پورا کرنے کا جو اسے پیش آتی ہیں۔

غرضیکہ ادراکات (محسوس کرنا) کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اس طرح انتظام ہے اور یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ہم نے اس کا پورا بیان لکھ دیا ہے کیوں کہ ظاہری حواس تو بعض ادراکات ہیں اور تمام حواس میں سے ایک دیکھنے کی حس ہے اور اس کے لیے آنکھ آلہ ہے اور آنکھ دس طبقوں سے مرکب ہے جو مختلف ہیں بعض رطوبات ہیں بعض پردے ہیں اور پردوں میں سے بعض مکڑی کے جالے کی طرح ہیں اور بعض رحم کی جھلی کی طرح ہیں اور بعض رطوبات انڈے کی سفیدی کی طرح ہیں اور بعض برف کی مانند ہیں اور ان دس طبقات میں سے ہر ایک کے لیے ایک صفت ہے، صورت، شکل، ہیئت، چوڑائی گولائی اور خاص ترکیب ہے اگر ان دس طبقات میں سے ایک میں بھی خلل آجائے یا کسی طبقے کی کسی صفت میں گڑبڑ ہو جائے تو بینائی میں خلل واقع ہوتا ہے اور طبیب اور سرمہ لگانے والے سب عاجز ہو جائیں۔

یہ تو ایک حس کی بات ہے اس پر سننے اور باقی تمام حواس کو قیاس کر لو بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آنکھ میں اللہ تعالیٰ نے جس قدر حکمتیں رکھی ہیں نیز اس کے طبقات میں جو کچھ پوشیدہ ہے وہ کئی جلدوں میں بھی بیان نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ یہ سب کچھ مل کر چھوٹے سے اخروٹ سے زیادہ نہیں ہے تو پورے بدن اور تمام اعضاء کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے تو اللہ تعالیٰ نے ادراکات کی تخلیق کے اعتبار سے اپنی نعمتوں میں جو رموز رکھے ہیں یہ ان کا بیان ہے۔

دوسرا نکتہ:

ارادوں کی تخلیق میں نعمتوں کی اقسام

جان لو! اگر تمہارے لیے بینائی پیدا کی جاتی حتیٰ کہ تم دور سے غذا کا ادراک کر لیتے لیکن کھانے کی طرف میلان اور شوق پیدا نہ کیا جاتا اور نہ خواہش ہوتی جو تمہیں حرکت کرنے پر مجبور کرتی تو بینائی معطل ہو جاتی کتنے ہی مریض کھانا دیکھتے ہیں اور وہ ان کے لیے زیادہ نفع بخش ہوتا ہے لیکن خواہش نہ ہونے کی وجہ سے وہ اسے کھا نہیں سکتے تو اس طرح بینائی اور سماعت اس کے حق میں معطل ہو جاتی ہے لہٰذا تم اس بات پر مجبور ہو کہ موافق چیز کی طرف تمہارا میلان ہو۔ جسے خواہش کہتے ہیں اور مخالف چیز سے نفرت ہو جسے کراہت کہتے ہیں تاکہ تم خواہش کے ذریعے طلب کرو اور نفرت کی وجہ سے دور رہو تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر کھانے کی خواہش پیدا کر کے اسے تم پر مسلط کیا اور اسے تمہارے سپرد کر دیا کہ اشتہاء کے تقاضے سے کھانے کی طرف محتاج اور مجبور ہو حتیٰ کہ تم کھاؤ اور غذا کے ذریعے زندہ رہو اور یہ وہ چیز ہے جس میں تمہارے ساتھ حیوانات بھی شریک ہوتے ہیں البتہ سبزیاں اس میں شریک نہیں ہیں۔

پھر اگر ضرورت کی مقدار کھانے کے بعد بھی یہ خواہش نہ ٹھہرتی تو تم زیادہ کھا کر ہلاک ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ نے سیر ہونے کے وقت کراہت پیدا فرمائی تاکہ اس کے ذریعے تم کھانا چھوڑ دو کھیتی کی طرح نہیں کہ وہ پانی کو ہمیشہ جذب کرتی ہے حتیٰ کہ جب کہ اس کے نیچے تک چلا جاتا ہے تو وہ خراب ہو جاتی ہے لہٰذا ایک آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو ضرورت کے بعد اس (کھیتی) کی

غذا کا اندازہ کر کے کبھی اسے پانی سے سیراب کرے اور کبھی اس سے پانی روک لے۔

اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ خواہش پیدا کی کہ تم کھاتے ہو اور اس سے تمہارے بدن کو بقا حاصل ہوتی ہے اسی طرح اس نے جماع کی خواہش بھی پیدا کی ہے حتیٰ کہ تم جماع کرتے ہو تو اس کے ذریعے نسل باقی رہتی ہے اگر تمہارے سامنے رحم اور حیض کے خون کی تخلیق نیز مادہ منویہ اور خونِ حیض کے ملنے سے جنین کے بننے، خصیتین (کپوروں) ان ان رگوں کی تخلیق جو پیٹھ سے ان کی طرف گئی ہیں اور وہ (پیٹھ) نطفے کا مرکز ہے، کی کیفیت، عورت کے سینے سے رگوں کے ذریعے مادہ منویہ کے گرنے کی کیفیت پھر رحم کے اندر کے سانچوں کی کیفیت جن میں سے بعض میں نطفے کے ٹھہرنے سے لڑکا پیدا ہوتا ہے اور بعض میں ٹھہرنے سے لڑکی پیدا ہوتی ہے، یہ سب کچھ بیان کریں نیز یہ کہ تخلیق کن کن مراحل میں چکر لگاتی ہے پہلے وہ خون ہوتا ہے پھر لوتھڑا پھر ہڈی اور گوشت اور خون بنتا ہے پھر اس کے اجزا سر پاؤں پیٹ پیٹھ اور تمام اعضاء میں تقسیم ہوتے ہیں اگر یہ سب کچھ بیان کیا جائے تو تم اپنی ابتدائے آفرینش میں اللہ تعالیٰ کی طرح طرح کی نعمتوں کو دیکھ کر تعجب کرنے لگو چہ جائیکہ اب جب تندرست و توانا ہو لیکن ہم صرف کھانے سے متعلق اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں تاکہ کلام طویل نہ ہو جائے۔

تو کھانے کی خواہش ارادوں میں سے ایک ارادہ ہے اور یہ تمہیں کفایت نہیں کرتا کیوں کہ یہ ادھر ادھر سے مہلکات کو لاتا ہے اگر تمہارے اندر غصہ نہ رکھا ہو جس کے ذریعے تم ان چیزوں کو دور کرتے ہو جو تمہارے موافق نہیں ہیں تو تم آفات کا نشانہ بن جاتے اور تم نے جو غذا حاصل کی وہ تم سے چھین لی جاتی کیوں کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے ہر ایک اس کا حاجتمند ہے تو ایک ایسے ارادے کی ضرورت تھی جو دُور کرنے اور لڑنے میں کام آئے اور وہ غصہ ہے جس کے ذریعے تم ہر اس چیز کو دُور کرتے ہو جو تمہارے خلاف ہے اور موافق نہیں ہے۔

پھر یہ قوت بھی کافی نہیں ہے کیوں کہ خواہش اور غصہ صرف ان چیزوں تک لے جاتے ہیں جو وقتی طور پر نفع یا نقصان دیں مستقبل کے اعتبار سے نہیں تو اللہ تعالیٰ نے ایک اور ارادہ پیدا فرمایا جو اشارۂ عقل کے تابع ہے اور وہ انجام سے خبردار کرتا ہے جیسے خواہش اور غضب کو پیدا فرمایا جو اس حس کے تابع ہیں جو موجودہ حالت کا ادراک رکھتی ہے تو عقل کے ذریعے تمہارا نفع مکمل ہوتا ہے کیوں کہ محض اس بات کی معرفت کہ مثلاً یہ خواہش تمہیں نقصان دیتی ہے، اس سے بچنے میں تمہارے کام نہیں آسکتی جب تک تم معرفت کے مطابق عمل کی طرف مائل نہ ہو اور اس ارادے کی وجہ سے تم جانوروں سے ممتاز ہو ہم نے اس ارادے کا نام باعثِ دینی رکھا ہے اور صبر کے بیان میں اسے اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

تیسرا نکتہ:

قدرت اور آلاتِ حرکت کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

جان لو! حس صرف ادراک (علم) کا فائدہ دیتی ہے اور ارادہ طلب یا بھاگنے کی طرف میلان کا نام ہے اور یہ بات

اس وقت تک کافی نہیں ہو سکتی جب تک تمہارے اندر طلب اور بھاگنے کا آلہ نہ پایا جائے تو کتنے ہی مریض ایسے ہیں جو کسی چیز کا شوق رکھتے ہیں اور وہ ان سے دور ہوتی ہے وہ اس کا علم بھی رکھتے ہیں لیکن پاؤں نہ ہونے کی وجہ سے اس کی طرف جا نہیں سکتے یا ہاتھ نہ ہونے یا فالج زدہ اور بے حس ہونے کی وجہ سے اسے کھا نہیں سکتے۔

لہذا حرکت کے لیے آلات ضروری ہیں نیز یہ کہ ان آلات میں حرکت کی طاقت بھی ہو تا کہ ان کی حرکت خواہش کے مطابق طلب بن جائے اور کراہت کے مطابق اس کے ذریعے بھاگنا ممکن ہو اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اعضا پیدا فرمائے تم ان کے ظاہر کو دیکھتے ہو لیکن ان کے اسرار سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔

ان اعضاء میں سے بعض طلب اور بھاگ جانے کے لیے ہیں جیسے انسان کے پاؤں پرندوں کے پر اور جانوروں کے پاؤں، اور بعض (دشمن کے وار کو) روکنے کے کام آتے ہیں جیسے انسانوں کے لیے اسلحہ اور حیوانات کے سینگ ہیں اس اعتبار سے حیوانات مختلف ہوتے ہیں ان میں سے بعض کے دشمن زیادہ ہیں اور غذا دُور ہے لہذا وہ نیز حرکت کے محتاج ہوتے ہیں اس لیے ان کے لیے پر پیدا کئے گئے تاکہ وہ تیزی سے اُڑ سکیں۔ بعض کے لیے چار پاؤں بناتے اور بعض کے صرف دو پاؤں ہیں بعض وہ ہیں جو زمین پر رینگتے ہیں ان تمام باتوں کا ذکر طویل ہے ہم صرف ان اعضاء کا ذکر کرتے ہیں جن کے ساتھ صرف کھانے کا عمل مکمل ہوتا ہے تاکہ ان پر دوسرے اعضاء کو قیاس کیا جا سکے پس ہم کہتے ہیں۔

تم دُور سے کھانا دیکھتے ہو اور اس تک تمہاری حرکت کافی نہیں ہوتی جب تک تم اسے پکڑنے پر قادر نہ ہو لہذا تمہیں پکڑنے والے آلہ کی ضرورت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے ہاتھ پیدا کر کے تم پر احسان فرمایا۔ اور وہ لمبے ہیں جو اشیاء تک پہنچ جاتے ہیں نیز ان میں بہت سے جوڑ ہیں تاکہ مختلف جہات میں حرکت کر سکیں پس وہ آگے کی طرف بڑھتے ہیں اور واپس تمہاری طرف لوٹتے ہیں ایک کھڑی لکڑی کی طرح نہیں ہوتے پھر ہتھیلی کی پیدائش کے ذریعے ہاتھ کے سرے کو چوڑا بنایا پھر ہتھیلی کے اگلے حصہ کو پانچ قسموں یعنی انگلیوں میں تقسیم کیا، اور ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا یعنی انگوٹھے کو ایک طرف رکھا جو باقی چاروں انگلیوں پر چکر لگاتا ہے۔

اگر انگلیاں اکٹھی ہوتیں یا ایک دوسرے پر چڑھی ہوئی ہوتیں تو ان کے ذریعے مکمل فائدہ اور غرض حاصل نہ ہوتی تو ان کو ایسے طریقے پر بنایا کہ اگر تم ان کو کھولو تو بیلچے کا کام دیں اور اگر ان کو ملاؤ تو چلو کا کام دیں اور اگر ان کو اکٹھا کر لو تو مُکا بن کر ضرب (مارنے) کا کام دیں اور اگر ان کو کھول کر پھر اکٹھا کرو تو پکڑنے کا کام دیتی ہیں پھر انگلیوں کے ساتھ ناخن بھی بنائے اور ان کو انگلیوں کے سروں پر رکھا تاکہ ٹوٹنے نہ پائیں اور ان کے ذریعے ان باریک چیزوں کو چُنے جن تک محض انگلیاں نہیں پہنچ سکتیں پس تم ان کو ناخن کے سروں سے پکڑتے ہو۔

پھر جب تم ہاتھوں سے کھانا پکڑتے ہو تو یہ بات بھی کفایت نہیں کرتی جب تک وہ معدے میں نہ پہنچے اور وہ اندر ہوتا ہے لہذا ضروری ہے کہ اس کی طرف ایک دہلیز ہو یہاں تک کہ اس سے کھانا اندر داخل ہو تو منہ کا سوراخ رکھا جو معدے

کی طرف کھلتا ہے اس کے علاوہ بھی اس میں بے شمار حکمتیں ہیں صرف معدے تک کھانا پہنچانا ہی نہیں، پھر جب تم منہ میں کھانا رکھتے ہو اور وہ ایک ہی ٹکڑا ہے تو اس کا نگلنا آسان نہیں ہو لہٰذا ایک چکی کی ضرورت ہے جس سے کھانے کو پیسا جائے پس اللہ تعالیٰ نے تمہارے دو جبڑے بنائے جو دو ہڈیوں سے بنے ہیں اور ان میں دانت جڑ دیئے اور اوپر والے دانتوں کو نچلے دانتوں کے موافق اور برابر رکھا تاکہ کھانے کو اچھی طرح پیس سکیں پھر بعض اوقات کھانے کو توڑنے کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی کاٹنے کی اور اس کے بعد پیسنے کی حاجت ہوتی ہے تو دانتوں کو بھی مختلف صورتوں میں بنایا بعض چوڑے ہیں جو پیسنے کے کام آتے ہیں جیسے اخراس (داڑھیں) اور بعض کو دھار والے بنایا جو کاٹتے ہیں جیسے رباعیات (سامنے کے دانت) اور بعض توڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں جیسے انیاب (رباعیات کے ساتھ والے دانت) پھر جبڑوں کے جوڑوں کو ملیلا رکھا تاکہ نیچے والا جبڑا آگے پیچھے ہو سکے اور اوپر والے پر چکی کی طرح پھرے اگر یہ بات نہ ہوتی تو صرف ایک کی ضرب دوسرے پر پڑتی جیسے دونوں ہاتھوں سے تالی بجانا اور اس صورت میں پسائی کا عمل مکمل نہ ہوتا پس نیچے والے جبڑے کو متحرک رکھا وہ چکر کی صورت میں حرکت کرتا ہے اور اوپر والا جبڑا اپنی جگہ ٹھہرا رہتا ہے حرکت نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ کی عجیب صنعت دیکھو مخلوق کی بنائی ہوئی چکی کا نچلا پتھر ٹھہرا رہتا ہے اور اوپر والا پتھر حرکت کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی چکی کا نچلا پتھر حرکت کرتا ہے اور اوپر والا ٹھہرا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ پاک ہے اس کی شان کس قدر عظیم اور اس کی بادشاہی کتنی غالب ہے۔ اس کی برہان کس قدر کامل اور اس کا احسان کتنا وسیع ہے۔

پھر دیکھو کہ جب تم منہ کے صحن میں کھانا رکھتے ہو تو دانتوں کے نیچے کھانا کس طرح حرکت کر سکتا ہے یا دانت اس کو کس طرح اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں یا کس طرح انگلی کے ذریعے منہ کے اندر تصرف کیا جاتا ہے تو دیکھ اللہ تعالیٰ نے کس طرح انعام فرمایا کہ تمہارے لیے زبان پیدا کی وہ منہ کے اندر تمام اطراف میں چکر لگاتی اور کھانے کو درمیان والے حصے سے دانتوں کی طرف حسب ضرورت لے جاتی ہے جیسے چکی پیسنے والی عورت ایک ایک مٹھی چکی میں ڈالتی ہے علاوہ ازیں زبان چکھنے کا فائدہ بھی دیتی ہے اور بولنے کی قوت کے عجائب بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔ اور وہ حکمتیں بھی جن کے ذکر سے ہم بات کو لمبا کرنا نہیں چاہتے۔

پھر دیکھو تم نے کھانے کو کاٹا اور پیسا اور وہ خشک تھا تم اسے نگلنے پر قادر نہ تھے جب تک کسی قسم کی رطوبت کے ساتھ ملق تک نہ جاتا تو دیکھو اللہ تعالیٰ نے کس طرح زبان کے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا جس سے لعاب نکلتا ہے اور ضرورت کے مطابق پہنچتا ہے حتیٰ کہ اس کے ذریعے کھانے کو گوندھا جاتا ہے تو دیکھئے اللہ تعالیٰ نے اس (لعاب) کو کس طرح اس مقصد کے لیے مسخر کر دیا۔

تم دور سے کھانے کو دیکھتے ہو تو دونوں جبڑے خدمت کے لئے تیار ہو جاتے ہیں اور لعاب بھی تیاری پکڑتا ہے حتیٰ کہ باچھوں تک رال پہنچ جاتی ہے حالانکہ کھانا ابھی تم سے بہت دور ہے پھر یہ پسا ہوا اور گوندھا ہوا کھانا معدے تک کون پہنچاتا ہے جب کہ وہ منہ سے بھی اندر ہے نہ تو تم اسے ہاتھ سے دھکیل سکتے ہو اور نہ ہی معدے میں کوئی ہاتھ ہوتا ہے جو آگے بڑھ کر کھانے

کو کھینچ لے تو دیکھو اللہ تعالیٰ نے مری اور خنجرے (سانس کی دو نالیاں) کو تیار کیا اور ان کے اوپر کئی طبقات بنائے جو کھانے کو وصول کرتے ہیں۔ پھر وہ غذا کے لیے کھلتے اور بند ہوتے ہیں حتیٰ کہ ان کے بند ہونے کے سبب غذا لڑھکتی ہوئی معدے تک جا پہنچتی ہے اور معدہ مری (ایک رگ یا نالی) کی دہلیز پر واقع ہے جب کھانا معدے میں پہنچتا ہے اور وہ روٹی یا پھلوں کے ٹکڑوں کی صورت میں ہوتا ہے تو وہ اسی حالت میں گوشت، ہڈیاں اور خون بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ اسے پوری طرح پکانے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کے اجزا ایک جیسے ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ نے معدے کو ہنڈیا کی شکل میں بنایا اس میں کھانا پڑتا ہے تو اس پر دروازے بند ہو جاتے ہیں وہ اس میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک ہضم اور پختگی کا عمل مکمل نہ ہو جائے اور یہ اس حرارت سے ہوتا ہے جو اعضاء باطنی سے معدے میں موجود ہوتی ہے اور ان اعضا نے معدے کو گھیر رکھا ہوتا ہے کیوں کہ اس کی دائیں جانب جگر بائیں جانب تلی آگے چربی اور اور پیچھے پیٹھ کا گوشت ہوتا ہے تو اطراف سے ان اعضاء کی گرمی معدے تک پہنچتی ہے حتیٰ کہ کھانا پک جاتا ہے اور ایک جیسا مائع بن جاتا ہے جو رگوں کے اندر جاری ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے اس وقت وہ اپنے اجزاء اور پتلے پن میں آب جو کے پانی کے مشابہ ہو جاتا ہے لیکن ابھی تک وہ غذائیت کی صلاحیت نہیں رکھتا تو اللہ تعالیٰ نے معدے سے جگر تک رگوں کے ذریعے چند راستے بنائے ہیں اور ان کے لیے بہت سے منہ رکھے ہیں حتیٰ کہ کھانا ان میں جانے کے بعد جگر تک پہنچتا ہے۔

اور جگر گاڑھے خون سے بنا ہے گویا وہ خون ہی ہے اور اس میں بہت سی باریک رگیں ہیں جو جگر کے اجزاء میں پھیلی ہوئی ہیں تو رقیق کھانا ان میں ڈالا جاتا ہے اور وہ اس کے اجزاء میں پھیل جاتا ہے حتیٰ کہ جگر کی طاعت اس پر غالب آ جاتی ہے اور اس پر خون کا رنگ چڑھا دیتی ہے پس وہ جگر میں اتنی دیر ٹھہرتی ہے کہ دوسری بار پک جاتی ہے اور وہ صاف خون کی شکل میں بدل جاتی ہے جو اعضاء کی غذا بننے کی صلاحیت رکھتی ہے مگر جگر کی گرمی جو اسے پکاتی ہے یہی خون ہے تو اس خون سے دو قسم کی میل نکلتی ہے جس طرح دوسرے کھانوں سے نکلتی ہے جن کو پکایا جاتا ہے ان میں سے ایک تلچھٹ گدلے نیل) کی طرح ہوتی ہے اور یہ سوداوی ہے اور دوسری دودھ کی جھاگ کی طرح ہوتی ہے جسے صفراء کہتے ہیں اگر یہ دونوں قسم کی زائد میل الگ نہ ہو تو اعضاء کا مزاج خراب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے پتا اور تلی بنائی ہے اور ان دونوں کو لمبی گردن دی ہے جو جگر تک پہنچتی اور اس کے اندر داخل ہوتی ہے پتا صفراوی مادے کو جذب کرتا ہے اور تلی سوادی مادے کو جذب کرتی ہے تو اب صاف خون رہ جاتا ہے جو پتلا ہوتا ہے اور اس میں رطوبت ہی رطوبت ہوتی ہے کیوں اس میں مائع والا وصف ہوتا ہے اگر یہ رطوبت نہ ہو تو وہ باریک رگوں میں نہ جاتے اور نہ ہی وہاں سے نکل کر اعضاء کی طرف چڑھے تو اللہ تعالیٰ نے دو گردے پیدا کئے اور ان میں سے ہر ایک کو لمبی گردن عطا فرمائی جو جگر کی طرف جاتی ہے اور اللہ تعالےٰ کی عجیب حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ ہے کہ ان دونوں کی گردنیں جگر کے اندر داخل نہیں ہوتیں بلکہ وہ ان رگوں کے ساتھ ملی ہوتی ہیں جو جگر کے اوپر کو نکلی ہوئی ہیں تاکہ گردے اس خون کو اسی وقت جذب کر لیں جب وہ جگر کی باریک باریک

رگوں سے باہر نکلے کیوں کہ اگر وہ پہلے جذب کر یں تو خون گاڑھا ہو جائے اور رگوں سے باہر نہ نکلے پھر جب خون میں سے رطوبت بھی نکل جاتی ہے تو وہ تینوں فضلوں سے صاف ہو کر ان تمام چیزوں سے پاک ہو جاتا ہے جو غذا خراب کرتی ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے جگر سے کچھ رگیں نکالی ہیں وہ نکلنے کے بعد کئی قسموں میں تقسیم ہو جاتی ہیں اور قسم کئی شعبوں میں بٹ جاتی ہے اور یہ پورے بدن میں پھیل جاتی ہیں سر کی چوٹی سے پاؤں تک ظاہری طور پر بھی اور باطنی طور پر بھی۔ اب ان میں صاف خون جاری ہوتا ہے اور تمام اعضا تک پہنچ جاتا ہے حتیٰ کہ وہ منقسم رگیں ریشوں میں بدل جاتی ہیں جس طرح پتوں اور درختوں کی رگیں ہوتی ہیں جو آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتیں ان سے غذا چھن چھن کر تمام اعضا تک پہنچتی ہے اور اگر پتے میں کوئی آفت پیدا ہو جائے اور وہ صفراوی مادے کو جذب نہ کرے تو خون خراب ہو جاتا ہے اور اس سے صفراوی بیماریاں جیسے یرقان پھنسیاں اور سُرخ بادہ وغیرہ پیدا ہوتی ہیں اور اگر تلی پر کوئی آفت آجائے اور وہ سوداوی مادے کو جذب نہ کرے تو سوداوی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جیسے برص (سفید داغ) جذام (کوڑھ) اور مالیخولیا وغیرہ۔ اور اگر رطوبت گُردوں کی طرف نہ جائے تو اس سے استسقاء وغیرہ بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔

پھر اس پیدا کرنے والے حکیم کی حکمت دیکھو کس طرح ان تین خسیس فضلات پر منافع کو مرتب فرمایا پتا اپنی ایک گردن سے فضلات کو کھینچتا ہے اور دوسری سے اسے آنتوں کی طرف پھینک دیتا ہے تاکہ اس میں غذا کی آمد و رفت کے لیے چکناہٹ رہے اور آنتوں میں جلن پیدا کرے جس سے طبیعت میں قضائے حاجت کے لیے تحریک پیدا ہو اور چکناہٹ کے باعث فضلہ جلد نکلے پاخانے کی زردی اسی وجہ سے ہوتی ہے کہ اس میں صفرا کا میل ہوتا ہے جہاں تک تلی کا تعلق ہے تو وہ اپنے فضلے کو ایسا کر دیتی ہے کہ اس میں ترشی اور بستگی آجائے پھر وہ روزانہ کچھ نہ کچھ معدے کے منہ کی طرف بھیجتی ہے تاکہ ترشی کے باعث اشتہاء پیدا ہو اور وہ معدے کو غذا پر برانگیختہ کرے اور باقی فضلے کو پاخانے کے ساتھ باہر نکال دے اور گردہ اس میں سے اسی قدر غذا نکالتا ہے جس قدر اس میں خون ہوتا ہے اور باقی کو مثانے کی طرف بھیج دیتا ہے۔

کھانے کے سلسلے میں جو اسباب تیار کئے گئے ہیں ہم ان کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اسی قدر بیان پر اکتفا کرتے ہیں اور اگر ہم جگر کی دل و دماغ کی طرف حاجت کی کیفیت اور اعضاء رئیسہ میں سے ہر ایک کی دوسرے کی طرف حاجت بیان کریں اور دل سے نکلنے والی رگیں تمام جسم میں کس طرح پھیلتی ہیں جن کے واسطے سے اعضاء میں حس ہوتی ہے نیز جگر میں ٹھہری ہوئی رگیں تمام بدن تک کس طرح پہنچتی ہیں جو غذا کے پہنچنے کا وسیلہ ہیں، پھر اعضاء کی ترکیب کی کیفیت اور ان کی ہڈیوں، پٹھوں، رگوں، جوڑوں اور رطوبتوں وغیرہ کی تعداد ذکر کریں تو کلام طویل ہو جائے گا۔ اور کھانے کے سلسلے میں ان میں سے ہر ایک کی ضرورت ہے بلکہ اس کے علاوہ دوسرے امور کے لیے بھی ان کی حاجت ہوتی ہے بلکہ انسان میں کئی ہزار مختلف پٹھے، رگیں اور پٹھے چھوٹے بڑے پتلے اور موٹے موجود ہیں اور ان کی زیادہ اور کم تقسیم بھی ہے اور ان میں سے ہر ایک میں ایک یا دو یا تین یا چار، دس تک بلکہ اس سے بھی زیادہ حکمتیں ہیں اور یہ سب کچھ تم پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔

اگر ان میں سے کوئی متحرک رگ رک جائے یا ساکن رگ متحرک ہو جائے تو اے مسکین! تم ہلاک ہو جاؤ تو تم پہلے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو دیکھو تاکہ شکر کرنا تمہارے لیے آسان ہو جائے کیوں کہ تم تو اللہ تعالیٰ کی صرف ایک اور وہ بھی سب سے ہلکی نعمت کو دیکھتے ہو اور وہ کھانا ہے پھر اس میں بھی صرف اسی بات کو دیکھتے ہو کہ تم بھوکے ہوتے ہو تو کھانا کھاتے ہو یہ بات تو گدھا بھی جانتا ہے کہ وہ بھوکا ہوتا ہے تو کھاتا ہے تھکتا ہے تو سو جاتا ہے، شہوت آتی ہے تو جفتی کرتا ہے اٹھایا جاتا ہے تو اٹھ کر لاتیں مارتا ہے اگر تم اپنے نفس سے متعلق اتنی ہی بات جانتے ہو جس قدر گدھے کو علم ہوتا ہے تو تم کس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرو گے ہم نے جس بات کی طرف اختصار کے ساتھ اشارہ کیا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے انعام کے سمندروں میں سے ایک سمندر کا فقط ایک قطرہ ہے اور جو کچھ ہم نے طوالت کے ڈر سے چھوڑ دیا اسے بھی اسی پر قیاس کر لو اور نعمتوں کے بارے میں جو کچھ ہم نے بیان کیا اور وہ تمام مخلوق کو معلوم ہیں اگر ان کو ان نعمتوں کی نسبت دیکھیں جن کی پہچان ان کو نہیں ہے تو وہ سمندر کا ایک معمولی سا قطرہ ہے مگر جو آدمی اس سے تھوڑا سا بھی معلوم کر لے وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے معانی میں سے کچھ نہ کچھ جان لے گا۔

ارشاد خداوندی ہے:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ (۱) اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شمار کرنے لگو تو ان کو گن نہیں سکتے۔

پھر دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان اعضاء کا قوام ان کے منافع اور ادراکات اور قوتوں کا قیام ایک لطیف بخار سے منظم کر رکھا ہے جو اخلاط اربعہ سے چڑھتا ہے اور اس کا ٹھکانہ دل ہے پھر وہ تمام بدن میں پھیلی ہوئی رگوں کے ذریعے پورے جسم میں سرایت کرتا ہے اور بدن کے جس حصے تک پہنچتا ہے اس میں اس کی ضرورت کے مطابق حس، ادراک اور قوتِ حرکت وغیرہ پیدا کرتا ہے۔

یہ ایک چراغ کی مثل ہے جو گھر کے تمام کونوں میں پھرایا جاتا ہے تو وہ جس حصے میں پہنچتا ہے اس کے سبب سے گھر کے اجزاء روشن ہو جاتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور تخلیق سے ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے چراغ کو اپنی حکمت کے تحت روشنی کا سبب بنایا ہے اور یہ لطیف بخار وہی چیز ہے جسے طبیب روح کا نام دیتے ہیں اور اس کا محل دل ہے۔

اس کی مثال چراغ کی آگ کا وجود سمجھنا چاہیے اور اس کے لیے دل آلۂ چراغ کی طرح ہے اور سیاہ خون جو دل کے اندر ہے وہ بتی کی طرح ہے اور اس کے لیے غذا زیتون کے تیل کی طرح ہے اور بدن کے تمام اعضاء میں ظاہری حیات جو اس کے واسطے سے حاصل ہوتی ہے وہ چراغ کی اس روشنی کی طرح ہے جو تمام گھر میں ہوتی ہے اور جس طرح چراغ کا تیل ختم ہونے سے وہ بجھ جاتا ہے اسی طرح روح کا چراغ بھی غذا کے منقطع ہونے سے بجھ جاتا ہے اور جس طرح بتی جل جانے کی وجہ سے

(۱) قرآن مجید سورۃ نحل آیت ۱۸

راکھ بن جاتی ہے اور تیل کو قبول نہیں کرتی اور تیل کی کثرت کے باوجود چراغ بجھ جاتا ہے اسی طرح وہ خون جس کے ذریعے بخار پیدا ہو۔ بعض اوقات حرارت قلبی کی وجہ سے جل جاتا ہے اور غذا کے باوجود وہ گل ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ اس غذا کو قبول نہیں کرتا جس کے ذریعے رُوح کو بقا حاصل ہوتا ہے جیسے راکھ زیتوں کو اس طرح قبول نہیں کرتی جس سے شعلہ پیدا ہو۔

اور جس طرح چراغ بعض اوقات داخلی سبب سے بجھ جاتا ہے جیسا کہ ہم نے ذکر کیا اور بعض اوقات خارجی سبب سے بجھتا ہے جیسے تیز ہوا چلے اسی طرح رُوح بھی بعض اوقات داخلی سبب سے مر جاتی ہے اور کبھی خارجی سبب سے اس کی موت واقع ہوتی ہے اور وہ قتل ہے اور جس طرح چراغ کا بجھنا تیل کے ختم ہونے یا بتی کے خراب ہو جانے یا آندھی کے چلنے یا کسی انسان کے بجھا دینے سے ہوتا ہے اور یہ تمام اسباب اللہ تعالیٰ کے علم میں مقدر و مرتب ہیں اور یہ سب کچھ تقدیر کے مطابق ہوتا ہے تو روح کے فنا ہونے کا بھی یہی مسئلہ ہے اور جس طرح چراغ کا بجھ جانا اس کے وقتِ وجود کی انتہا ہے اور یہ اس کی اجل ہے جو لوح محفوظ میں لکھ دی گئی ہے اسی طرح رُوح کے فنا ہونے کا معاملہ بھی ہے اور جس طرح چراغ کے بجھنے سے تمام گھر میں اندھیرا ہو جاتا ہے اسی طرح رُوح کے مٹ جانے سے تمام بدن کے اندر تاریکی ہو جاتی ہے اور وہ انوار اس سے جدا ہو جاتے ہیں جو رُوح سے حاصل کئے گئے تھے اور یہ احساسات، قدرت اور ارادوں کے انوار ہیں نیز وہ امور جن کو لفظ حیات شامل ہے۔

یہ بھی ایک مختصر رمز ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی صنعت و حکمت کے عجائبات کا ایک عالم ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اگر سمندر اللہ تعالیٰ کے کلمات (لکھنے) کے لیے روشنائی بن جائیں تو میرے رب عزوجل کے کلمات ختم نہیں ہوں گے سمندر ختم ہو جائیں گے۔

پس جو شخص اللہ تعالیٰ کا منکر ہے اس پر ہلاکت ہے اور جو اس کی نعمت کا منکر ہے اس پر خوب پھٹکار ہے۔

سوال:

آپ نے رُوح کا ذکر کیا اور اس کی مثال بیان کی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رُوح کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے صرف اتنا فرمایا۔

ارشاد خداوندی ہے:

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔ (۱) آپ فرما دیجئے رُوح میرے رب کا ایک امر ہے

آپ نے اس کی تعریف و وضاحت کیوں فرمائی (حالاں کہ حضور علیہ السلام نے وضاحت نہیں فرمائی)

جواب:

---

(۱) قرآن مجید سورۃ اسراء آیت ۸۵

یہ سوال لفظ روح میں پائے جانے والے اشتراک سے غفلت کی بنیاد پر ہے روح کا اطلاق کئی معانی پر ہوتا ہے ہم ان کا ذکر کرکے بات کو طول دینا نہیں چاہتے ہم نے ان میں سے ایک جسم لطیف کا ذکر کیا ہے جسے اطباء رُوح قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے اس کی صفت، وجود، اعضاء میں اس کے جاری ہونے کی کیفیت اور اس کے ذریعے اعضاء میں احساس اور قوت کی کیفیت بیان کی ہے حتی کہ جب کوئی عضو بے حس ہو جاتا ہے تو وہ جان لیتے ہیں کہ اس پر بے حسی اس رُوح کے راستوں میں رکاوٹ واقع ہونے کی وجہ سے ہے تو وہ بے حس مقام کا علاج نہیں کرتے بلکہ اعصاب کے مراکز کا علاج کرتے ہیں کیوں کہ رکاوٹ کے مقامات وہاں ہی واقع ہیں اور وہ اس چیز کے ذریعے علاج کرتے ہیں جو رکاوٹ کو ختم کر دے بے شک یہ رُوح اپنی لطافت کی وجہ سے پٹھوں کے جال میں گھس جاتی ہے اور اس کے واسطے سے دل سے تمام اعضاء کی طرف پہنچتی ہے اور جس چیز تک اطباء کی معرفت جاتی ہے اس کا معاملہ آسان اترنے والا ہے۔

لیکن وہ رُوح جو اصل ہے اور اس کے فساد سے پورا جسم فاسد ہو جاتا ہے وہ اسرار الٰہیہ میں سے ایک سِر (راز) ہے ہم اس کا وصف بیان نہیں کرتے اور نہ ہی اس کا وصف بیان کرنے کی اجازت ہے صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ امر ربانی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا۔

قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔ (۱) آپ فرما دیجئے رُوح میرے رب کے حکم میں سے ہے۔

اور امور ربانی کا وصف بیان کرنا عقل کے دائرۂ قدرت میں نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں اکثر لوگوں کی عقلیں حیران و پریشان رہتی ہیں۔ جہاں تک وہم و خیالات کا تعلق ہے تو وہ لازماً نقصان میں ہیں جیسے قوت بینائی آوازوں کا ادراک نہیں کر سکتی غرضیکہ عقل کی گرہیں امور ربانیہ کے مبادی کے ذکر میں متزلزل ہوتی ہیں کیوں کہ وہ جوہر و عرض کی بیڑیوں میں مقید ہیں اس لیے عقل کے ذریعے اس کے وصف کا ادراک نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا ادراک ایک دوسرے نور سے ہوتا ہے جو عقل سے اعلیٰ واشرف ہے اور وہ نورِ عالم نبوت و ولایت میں چمکتا ہے عقل کی طرف اس کی نسبت اسی طرح ہے جس طرح عقل کی وہم و خیال کی طرف نسبت ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے لیے مختلف طریقے رکھے ہیں تو جس طرح بچہ محسوسات کا ادراک کر سکتا ہے لیکن معقولات کا ادراک نہیں کر سکتا کیوں کہ فی الحال اس طریقے تک اس کی رسائی نہیں ہوئی اسی طرح بالغ آدمی کو معقولات کا ادراک ہو سکتا لیکن اس کے اوپر کا ادراک نہیں ہوتا کیوں کہ ابھی تک وہ اس تک رسائی حاصل نہیں کر سکا۔ کیوں کہ وہ شریف مقام، میٹھا چشمہ اور عالی رُتبہ ہے اس میں ایمان و یقین کے نور کے ذریعے بارگاہ حق تعالیٰ کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے اور یہ چشمہ اس بات سے بلند و معزز ہے کہ ہر آنے والے کا راستہ بن جائے بلکہ اس پر ایک کے بعد دوسرا مطلع ہوتا ہے بارگاہِ حق

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ اسراء آیت ۸۵

کا ایک صدر مقام ہے اور اس میں ایک وسیع میدان ہے اور میدان کے شروع میں ایک آستان ہے جو امر ربانی کا ٹھکانہ ہے اور جس شخص کو اس آستان پر پہنچنے کی اجازت نہ ہو اور نہ ہی وہ اس آستان کے محافظ کو دیکھ سکتا ہو اس کے لیے اس میدان میں پہنچنا محال ہے۔ تو اس کے پیچھے جو مشاہداتِ عالیہ ہیں ان تک پہنچنا کیسے ممکن ہوگا اسی لیے کہا گیا ہے۔

"جو شخص اپنے آپ کو نہیں پہچانتا وہ اپنے رب کو بھی نہیں جان سکتا" یہ بات اطباء کی کتابوں میں کہاں پائی جا سکتی ہے اور طبیب اس کو کیسے ملاحظہ کر سکتا ہے بلکہ جس بات کو طبیب رُوح کہتے ہیں امر ربانی کی طرف اس کی نسبت اسی طرح ہے جیسے گیند کی بادشاہ کی طرف نسبت ہے اور بادشاہ ڈنڈے سے اسے حرکت دیتا ہے۔

پس جو شخص طبی رُوح کو جاننے کے بعد یہ خیال کرے کہ اس نے امر ربانی کو پا لیا وہ اس شخص کی طرح ہے جو اس گیند کو دیکھتا ہے جسے بادشاہ کے بلّے نے حرکت دی اور یہ خیال کرتا ہے کہ میں نے بادشاہ کو دیکھ لیا ہے بلاشبہ یہ واضح خطا ہے اور رُوح کے بارے میں یہ سوچ تو اس سے بھی بڑی خطا ہے اور جب وہ عقول جن کے ذریعے دنیا کے مصالح کا ادراک ہوتا ہے اور ان کی وجہ سے آدمی عبادات کا مکلف ہوتا ہے، اس امر کی حقیقت سے قاصر ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کے بارے میں گفتگو کی اجازت نہیں دی بلکہ آپ کو حکم دیا کہ لوگوں کی عقلوں کے مطابق ان سے گفتگو کریں اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس امر کی حقیقت کے بارے میں کچھ بھی ذکر نہیں کیا بلکہ اس کی نسبت و فعل کا ذکر کیا ذات کا ذکر نہیں فرمایا نسبت کا ذکر ان الفاظ میں ہے "مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" (یہ میرے رب کے امر سے ہے)

اور فعل کا ذکر اس آیت میں فرمایا۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي۔ (۱)

اے مطمئن نفس! اپنے رب کی طرف اس طرح لوٹ جا کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی پس تو میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

اب ہم اپنی غرض کی طرف لوٹتے ہیں کیونکہ مقصود کھانے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر ہے تو ہم نے کھانے کے آلات کے سلسلے میں بعض نعمتوں کا ذکر کیا ہے۔

چوتھا نکتہ:

جن چیزوں سے کھانے حاصل ہوتے ہیں ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان

یہ وہ اصول ہیں کہ ان کے ذریعے کھانا اس قابل ہوتا ہے کہ اب انسان اسے خود اپنے عمل سے تیار کر سکتا ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ فجر آیت ۲۷ تا ۲۹

جاننا چاہیے کہ کھانے بے شمار ہیں اور ان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ نے بے شمار عجائبات اور غیر متناہی باہم پیوست اسباب رکھے ہیں ہر کھانے کے ضمن میں ان کا ذکر ایک طویل بحث ہے کیوں کہ کھانے یا تو دوائی کی صورت میں ہوں گے یا غذا کی شکل میں، تو ہم غذاؤں کو لیتے ہیں کیوں کہ یہ اصل میں پھر ان سب میں سے گندم کے دانے کو موضوعِ سخن بناتے ہیں باقی تمام غذاؤں کو چھوڑ دیتے ہیں تو ہم کہتے ہیں۔

جب تم ایک دانہ یا چند دانے پاتے ہو پس اگر تم ان کو کھا لو تو وہ ختم ہو جاتے ہیں اور تم بھوکے ہی رہتے ہو تو تم کس قدر ایک دانے کو بڑھانے کے محتاج ہو حتیٰ کہ وہ تمہاری حاجت کو پورا کرے تو اللہ تعالیٰ نے گندم کے دانے میں اس قدر قوت پیدا کی ہے جس سے غذا حاصل کی جا سکے جس طرح تمہارے اندر قوت پیدا کی ہے نباتات تم سے حس و حرکت میں جدا ہیں اگر ان میں حس و حرکت نہیں ہوتی لیکن غذا میں تم سے جدا نہیں ہیں کیوں کہ وہ بھی پانی سے غذا حاصل کرتی ہیں اور جڑوں کے ذریعے وہ اسے اپنے اندر جذب کرتی ہیں جس طرح تم غذا کھاتے اور اپنے اندر جذب کرتے ہو۔

ہم نباتات کے ان آلات کا ذکر کر کے کلام کو طول نہیں دینا چاہتے جن کے ذریعے وہ غذا حاصل کرتے ہیں لیکن ہم صرف ان کی غذا کی طرف اشارہ کرتے ہیں پس ہم کہتے ہیں۔ کہ لکڑی اور مٹی تمہیں غذا نہیں پہنچاتی بلکہ تم ایک مخصوص طعام کے محتاج ہو اسی طرح (گندم کا) دانہ بھی ہر چیز سے غذا حاصل نہیں کرتا بلکہ ایک مخصوص چیز کا محتاج ہوتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر تم اسے گھر میں چھوڑ دو تو اس میں اضافہ نہیں ہوتا کیوں کہ یہاں تو اسے صرف ہوا پہنچتی ہے اور صرف ہوا اس کی غذا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اگر تم اسے ایسی زمین میں چھوڑ دو جس میں پانی نہ ہو تو بھی اس میں اضافہ نہ ہوگا بلکہ ایسی زمین کی ضرورت ہے جس میں پانی ہو اور وہ پانی زمین سے مل کر گارا بنے اور اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعِنَبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا۔ (۱)

پس انسان کو اپنے کھانے کی طرف دیکھنا چاہیئے کہ بیشک ہم نے پانی بہایا پھر زمین کو اچھی طرح پھاڑا پس ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور سبزی اور زیتون اور کھجور اگائی۔

پھر صرف پانی اور مٹی ہی کافی نہیں کیوں کہ اگر تم اس دانے کو ایک مرطوب زمین میں چھوڑ دو جو سخت اور باہم متصل ہے تو ہوا نہ ہونے کی وجہ سے غلہ نہیں اُگے گا تو اس بات کی حاجت ہے کہ دانا نرم زمین میں چھوڑا جائے جو ڈھیلی ہو اور اس میں ہوا داخل ہو سکے پھر ہوا خود بخود حرکت نہیں کرتی لہٰذا ایسی آندھی کی ضرورت ہے جو ہوا کو حرکت دے اور اسے زور زور سے زمین پر مارے تاکہ وہ اس کے اندر چلی جائے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ۔ (۲)

اور ہم نے پانی سے بھری ہوئی ہوائیں بھیجیں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ عبس آیت نمبر ۲۴ تا ۲۹ (۲) قرآن مجید سورۂ حجر آیت ۲۲

اور اس کا انقاح (پیوند) یہ ہے کہ وہ ہوا، پانی اور زمین کو ملا دے پھر یہ سب کچھ فائدہ نہیں دیتا اگر بہت زیادہ ٹھنڈک اور بہت سردی ہو لہذا ربیع (بہار) اور گرمی کی ضرورت ہوئی تو غلے کی غذا کی ان چار چیزوں کی طرف محتاجی ظاہر ہوئی تو دیکھو ان میں سے ہر ایک کس چیز کا محتاج ہے کیوں کہ پانی کو سمندروں (اور دریاؤں) چشموں نہروں اور نالیوں سے زرعی زمین کی طرف جانے کی ضرورت ہے تو دیکھو اللہ تعالیٰ نے کس طرح سمندر بنائے چشمے اور نہریں جاری کیں پھر بعض اوقات زمین بلندی پر ہوتی ہے اور پانی اس تک پہنچ نہیں سکتا تو دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے بادل بنائے اور ان پر کیسے ہوا کو مسلط کیا تاکہ وہ اذن خداوندی سے ان کو زمین کے مختلف کناروں تک لے جائے حالاں کہ بادل پانی سے بھرے ہوئے بھاری ہوتے ہیں پھر دیکھئے کس طرح اللہ تعالیٰ ضرورت کے مطابق ربیع اور خریف کے موسم میں برساتا ہے۔

اور دیکھو اللہ تعالیٰ نے کس طرح پہاڑ بنائے جو پانی کی حفاظت کرتے ہیں اور ان سے بتدریج پانی نکلتا ہے اگر یکدم پانی نکلے تو شہر غرق ہو جائیں اور کھیتی اور جانور ہلاک ہو جائیں پہاڑوں، بادلوں، سمندروں اور بارشوں میں جس قدر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں ان کا شمار کرنا ناممکن ہے۔

جہاں تک حرارت کا تعلق ہے تو وہ پانی اور زمین کے ملاپ سے حاصل نہیں ہوتی کیوں کہ یہ دونوں ٹھنڈے ہیں تو دیکھئے کس طرح سورج کو مسخر کیا اور باوجود اس کے کہ وہ زمین سے دور ہے، اسے ایسا بنایا کہ ایک وقت زمین کو گرم کرتا ہے دوسرے وقت میں نہیں تاکہ ٹھنڈک کی ضرورت ہو تو وہ ٹھنڈک دے اور گرمی کی حاجت ہو تو گرمی دے یہ سورج کا ایک مقصد ہے جب کہ اس کے مقاصد شمار سے باہر ہیں۔

پھر جب سبزی زمین سے بلند ہوتی ہے اور پھول پھلوں کی شکل اختیار کرتے ہیں اور سختی پیدا ہو جاتی ہے لہذا رطوبت کی ضرورت ہوتی ہے جو اسے پکائے تو دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے چاند کو پیدا کیا اور اس کی خاصیت مرطوب بنانا ہے جس طرح سورج کی خاصیت حرارت پہنچانا ہے تو وہ (چاند) پھلوں کو پکاتا اور رنگین کرتا ہے اور یہ سب کچھ پیدا کرنے والے حکیم کی طرف سے مقرر کردہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر درخت سائے میں ہوں اور ان پر سورج کی دھوپ اور چاند ستاروں کی چاندنی نہ پڑے تو وہ فاسد اور ناقص ہو جائیں۔

حتیٰ کہ جب چھوٹا درخت بڑے درخت کے سائے میں ہو تو وہ خراب ہو جاتا ہے اور چاند کے مرطوب بنانے کی پہچان اس طریقے سے ہوتی ہے کہ تم رات کے وقت ننگے سر کھڑے ہو تو تمہارے سر پر رطوبت غالب ہوگی جسے زکام کہا جاتا ہے تو جس طرح وہ تمہارے سر کو رطوبت پہنچاتا ہے اسی طرح پھلوں کو بھی رطوبت پہنچاتا ہے۔

جس بات کا احاطہ نہ ہو سکے اس میں طویل کلام کا کیا فائدہ ہے بلکہ ہم کہتے ہیں آسمان کے تمام ستاروں کو کسی نہ کسی فائدے کے لیے مسخر کیا گیا ہے جس طرح سورج کو حرارت دینے اور چاند کو رطوبت دینے کے لیے مسخر کیا گیا ہے پس ان میں سے ہر ایک میں بے شمار حکمتیں ہیں جن کا شمار کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کو پیدا کرنا عبث اور باطل ہوتا

اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول صحیح نہ ہوتا۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ (۱) اے ہمارے رب! تو نے اس کو بیکار پیدا نہیں کیا۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی بھی صحیح نہ ہوتا۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ۔ (۲) اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل نہیں بنایا۔

اور جس طرح تمہارے بدن کے ہر عضو کا کوئی نہ کوئی فائدہ ہے اسی طرح عالم کے جسم کا کوئی عضو بھی فائدے سے خالی نہیں اور پورا عالم ایک شخص کی طرح ہے اور اس کے اجسام اس کے اعضاء کی طرح ہیں اور یہ ایک دوسرے سے اسی طرح تعاون کرتے ہیں جیسے تمہارے جسم کے اعضاء ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں اور اس کی تشریح نہایت طویل ہے۔

اور تمہیں یہ گمان نہیں کرنا چاہیئے کہ ستاروں، سورج اور چاند کو جو اللہ تعالیٰ نے حکمت کے تحت بطور اسباب مسخر کیا ہے تو اس بات پر ایمان لانا خلافِ شریعت ہے کیوں کہ حدیث شریف میں علم نجوم اور ستاروں کا حال بتانے والوں کی تصدیق سے ممانعت آئی ہے (۳)

تو اس میں دو باتیں ممنوع ہیں۔

ایک بات یہ کہ ستارے اپنے آثار کے خود فاعل ہیں اور وہ کسی مدبّر کی تدبیر کے تحت نہیں ہیں جس نے ان کو پیدا کیا اور مغلوب کیا اور یہ عقیدہ کفر ہے اور دوسری بات ان خبروں کی تصدیق کرنا ہے جو علم نجوم والے ان آثار کے بارے میں دیتے ہیں جن کے علم میں دوسرے لوگ شریک نہیں ہیں کیوں کہ ان کی یہ باتیں جہالت پر مبنی ہوتی ہیں۔ اور اگر یہ بات جانتا ہو کہ ستاروں کے احکام کا علم بعض انبیاء کرام علیہم السلام کا معجزہ تھا پھر یہ علم مٹ گیا اور جو کچھ بچا ہے وہ مخلوط ہے اور اس میں صحیح اور غلط کی تمیز نہیں ہو سکتی پس ستاروں کو ان آثار کا سبب ماننا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین میں نباتات میں اور حیوانات میں پیدا ہوتے ہیں (یہ عقیدہ) دین میں کوئی خرابی پیدا نہیں کرتا بلکہ یہ حق ہے لیکن جہالت کے ساتھ ان آثار کے تفصیلی علم کا دعویٰ کرنا دین میں خلل ہے اسی لیے اگر تم کپڑا دھو کر اسے خشک کرنا چاہو اور کوئی شخص تمہیں کہے کہ دھوپ نکل چکی ہے نیز دن اور ہوا گرم ہو چکے ہیں لہٰذا تم کپڑے باہر ڈال دو تو تم پر اس کو جھٹلانا لازم نہیں ہے اور طلوعِ شمس کی وجہ سے ہوا کی گرمی کا جو اس نے ذکر کیا ہے تم اس پر اعتراض نہیں کر سکتے اور جب تم کسی آدمی سے اس کے چہرے کی تبدیلی کے بارے میں پوچھو اور وہ کہے کہ راستے میں سورج

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۱۹۱

(۲) قرآن مجید، سورۂ دخان آیت ۳۸

(۳) سنن ابن ماجہ ص ۲،۳ ،ابواب الادب

کی دھوپ کی وجہ سے اس طرح ہو گیا ہے تو اس وجہ سے تم اس کو جھٹلا نہیں سکتے (کیوں کہ یہ سبب ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا) باقی تمام آثار کو بھی اسی پر قیاس کر لو۔

البتہ بعض آثار معلوم ہیں اور بعض مجہول اور مجہول آثار کے بارے میں علم کا دعویٰ صحیح نہیں اور معلوم آثار میں سے بعض وہ ہیں جو تمام لوگوں کو معلوم ہوتے ہیں جیسے سورج کے طلوع ہونے سے روشنی اور گرمی کا حاصل ہونا اور بعض آثار صرف بعض لوگوں کو معلوم ہوتے ہیں جیسے چاند کے ہونے سے زکام کا لگنا کیوں کہ ستاروں کو بے فائدہ نہیں بنایا گیا۔ بلکہ ان میں بے شمار حکمتیں ہیں اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف دیکھ کر یہ آیت تلاوت فرمائی۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ (۱) اے ہمارے رب! تو نے اسے بیکار پیدا نہیں کیا۔

پھر آپ نے فرمایا۔

وَيْلٌ لِمَنْ قَرَأَ هٰذِهِ الْآيَةَ ثُمَّ مَسَحَ بِهَا سَبَلَتَهُ۔ (۲) اس شخص کے لیے خرابی ہے جو یہ آیت پڑھے پھر اپنی مونچھوں پر تاؤ دے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص یہ آیت پڑھے اور اس میں غور و فکر نہ کرے اور آسمانی سلطنت کے سلسلے میں صرف اسی بات پر اکتفا کرے کہ آسمان کا رنگ اور ستاروں کی روشنی کو ہی پہچانے یہ بات تو جانوروں کو بھی معلوم ہے تو جو شخص صرف اسی قدر علم پر اکتفا کرتا ہے وہی اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے لیے آسمانوں کی سلطنت میں آفاق میں، نفسوں اور حیوانات میں عجائبات ہیں جن کی معرفت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں کیونکہ جو شخص کسی عالم سے محبت کرتا ہے وہ ہمیشہ اس کی تصانیف کی طلب میں مشغول رہتا ہے تاکہ وہ اس کے عجائباتِ علم سے مزید آگاہی حاصل کرے اور وہ اس کی محبت میں ایسا کرتا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ کے عجائب صنعت کا معاملہ بھی اسی طرح یہ تمام جہاں اس کی تصنیف ہے بلکہ مصنفین کی تصانیف بھی اس کی تصنیف ہیں کہ اس نے اپنے بندوں کے دلوں کے واسطے سے بنائی ہیں پس اگر تمہیں کسی کی تصنیف اچھی لگے اور تمہیں تعجب ہو تو اس کے مصنف پر تعجب نہ کرو بلکہ اس ذات پر تعجب کرنا چاہیے جس نے مصنف کو اس کی تصنیف پر مسخر کیا اور اپنے انعام و اکرام سے اسے اس کی ہدایت دی اور اس کو سیدھے راستے پر رکھا اور تعریف کے قابل بنایا جیسے تم پتلیوں کا تماشہ دیکھتے ہو کہ وہ رقص کرتی اور موزوں و مناسب حرکات کرتی ہیں تو اس کھلونے پر تعجب نہ کرو وہ تو کپڑے کا ایک ٹکڑا ہے جسے حرکت دی جاتی ہے وہ خود بخود حرکت نہیں کرتا بلکہ بازیگر کی ذہانت و مہارت پر تعجب کرو جو ایسے باریک باریک دھاگے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۱۹۱

(۲) کنز العمال جلد اول ص ۵۰۷ حدیث ۲۵۲۶۱

باندھ کر اسے حرکت دیتا ہے جو نظر نہیں آتے۔

تو مقصود یہ ہے کہ سبزیوں سے غذا کی تکمیل پانی، ہوا، سورج، چاند اور ستاروں کے بغیر نہیں ہوتی اور ان کے افلاک کی ضرورت ہے جن میں یہ جڑے ہوئے ہیں اور افلاک کے لیے حرکت ہے اور ان کی حرکت آسمانی فرشتوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی جو ان کو حرکت دیتے ہیں اور اسی طرح یہ بات اسباب بعیدہ تک پہنچتی ہے ہم نے ان کا ذکر چھوڑ دیا تاکہ اس مذکورہ سے اس چھوڑے ہوئے پر آگاہی ہو ہم سبزیوں کی غذائیت کے اسباب کے ذکر پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

پانچواں نکتہ:

کھانوں کی انسان تک رسائی کے اسباب کے سلسلے میں انعامات خداوندی

تمام کھانے ہر جگہ نہیں پائے جاتے بلکہ ان کے لیے کچھ مخصوص شرائط ہیں جو بعض جگہ پائی جاتی ہیں اور بعض جگہ نہیں اور لوگ زمین پر پھیلے ہوئے ہیں بعض اوقات ان سے کھانے دور ہوتے ہیں اور ان کے درمیان سمندر اور جنگل حائل ہوتے ہیں تو دیکھو اللہ تعالیٰ نے کس طرح تاجروں کو مسخر کیا ان پر مال کی حرص اور نفس کی خواہش غالب کر دی حالانکہ عام طور پر انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ وہ جمع ہوتے ہیں اب یا تو وہ کشتیوں کے ساتھ ڈوب جاتے ہیں یا ڈاکو ان کو لوٹ لیتے ہیں یا وہ دوسرے شہروں میں مر جاتے ہیں تو وہ مال حاکموں کے قبضے میں آجاتا ہے اور اگر بہت اچھی حالت ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ ان کے ورثاء یہ مال لے لیتے ہیں حالانکہ وہ ان کے بڑے دشمن ہیں اگر ان کو اس بات کی سمجھ ہو۔

تو دیکھو اللہ تعالیٰ نے ان پر کس طرح جہالت اور غفلت مسلط کی ہے حتیٰ کہ وہ نفع کی طلب میں سختیاں برداشت کرتے اور خطرات کو سواری بناتے ہیں اور سمندری سفر میں ہواؤں سے دھوکہ کھاتے ہیں وہ مختلف کھانے اور انسانی ضرورت کی مختلف اشیاء مشرق بعید سے مغرب کی طرف تم تک پہنچاتے ہیں اور دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو کشتیاں بنانے اور ان میں سوار ہونے کا طریقہ سکھایا اور دیکھو کس طرح اس نے حیوانات کو پیدا کیا اور ان کو جنگلوں اور صحراؤں میں سواری اور بار برداری کے لیے مسخر کیا اونٹوں کو دیکھو ان کو کس انداز میں پیدا کیا گھوڑے کو دیکھا اسے کس طرح تیز رفتاری عطا کی نیز گدھے کی طرف نظر کرو کہ وہ کس طرح مشقت پر صبر کرتا ہے اور اونٹوں کو دیکھو کس طرح وہ بھوک اور پیاس برداشت کرتے ہوئے بھاری بوجھ کے ساتھ صحراؤں کو طے کر کے منزل تک پہنچتے ہیں دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ تاجروں کو کشتیوں اور حیوانات کے ذریعے خشکی اور سمندر میں سفر کراتا ہے تاکہ وہ تمہارے پاس کھانے اور باقی ضروریات کی چیزیں پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں حاجت کی حد تک بلکہ حاجت سے زیادہ پیدا کی ہیں جن کا شمار ناممکن ہے پھر یہ بے شمار خارجی امور تک پہنچاتے ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ہم ان امور کا ذکر نہیں کرتے۔

چھٹا نکتہ:

کھانوں کی اصلاح

جاننا چاہیئے کہ زمین سے جو سبزیاں نکلتی ہیں اور جو کچھ حیوانات سے پیدا ہوتا ہے ان کو اسی طرح چبانا اور کھانا ممکن نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک کی اصلاح پکانا، ترکیب اور بعض کو پھینکنے اور بعض کو باقی رکھنے کے ذریعے ان کی نظافت ضروری ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی بے شمار امور ہیں۔ ہر کھانے کے ضمن میں ان کا احاطہ ایک طویل کام ہے۔ اس لیے ہم صرف ایک روٹی کو لیتے ہیں تاکہ ہم دیکھیں کہ ایک روٹی کس کس عمل کی محتاج ہوتی ہے حتی کہ وہ گول ہو جاتی ہے اور کھانے کے قابل ہوتی ہے حالانکہ وہ بیج کی صورت میں زمین میں ڈالی گئی تھی۔

تو سب سے پہلے کسان کی ضرورت ہے تاکہ وہ زمین کو ٹھیک کر کے کھیتی باڑی کرے پھر بیل جو زمین میں ہل چلائیں اور ان کو جوتنے کی لکڑی اور اس کے تمام اسباب کی ضرورت ہوتی ہے پھر اس تیاری کے بعد ایک عرصہ تک اسے پانی دیا جاتا ہے پھر زمین سے جڑی بوٹیوں اور گھاس وغیرہ کو دور کیا جاتا ہے پھر گاہنے کے بعد اسے صاف کیا جاتا ہے اس کے بعد پسائی اور پھر گوندھنے کا مرحلہ ہوتا ہے اس کے بعد روٹی تیار ہوتی ہے تو ان کاموں کو شمار کیجیے جن کا ہم نے ذکر کیا اور بعض کا ذکر نہیں کیا اور ان لوگوں کی گنتی بھی کریں جو یہ سب کام کرتے ہیں نیز اس کام کے لیے لوہے، لکڑی اور پتھر وغیرہ کے جو آلات استعمال ہوتے ہیں ان کا شمار بھی کیجیے پھر جو کاریگر کھیتی باڑی کے آلات تیار کرتے ہیں جو گندم کو پیستے ہیں جو روٹی پکاتے ہیں بڑھئی لوہار اور نانبائی وغیرہ۔

پھر غور کرو لوہار کو لوہے پیسے اور تانبے کی ضرورت ہوتی ہے پھر یہ بھی دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑ، پتھر اور معدنیات کی کانیں کس طرح بنائی ہیں اور زمین کو کس طرح مختلف ٹکڑوں کی صورت میں بنایا جو آپس میں ملے ہوئے ہیں۔

اگر تم غور کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ ایک گول روٹی تمہارے کھانے کے لیے اس وقت تک تیار نہیں ہو سکتی جب تک اس میں ایک ہزار سے زیادہ کاریگر کام نہ کریں۔ پہلے تو اس فرشتے کو دیکھو جو بادلوں کو ہانکتا ہے تاکہ بارش اترے دیکھتے دیکھتے فرشتوں کے آخری عمل تک پہنچو حتی کہ انسانی عمل کی باری آجائے تو گویا سات ہزار کاریگروں نے کام کیا ہر کاریگر ایک ایسی اصل چیز بناتا ہے جس کے ساتھ مخلوق کی مصلحت مکمل ہوتی ہے پھر ان آلات میں انسان کے عمل کی کثرت کو دیکھو حتی کہ سوئی ایک چھوٹا سا آلہ ہے جس کا فائدہ لباس کی سلائی ہے اور لباس تم سے سردی کو دور کرتا ہے اس کی شکل بھی محض اس لوہے سے مکمل نہیں ہوتی جو سوئی بننے کی صلاحیت رکھتا ہے بلکہ سوئی بنانے والوں کے ہاتھوں سے پچیس مرتبہ گزرنا پڑتا ہے اور ہر دفعہ ایک کام کرنا پڑتا ہے اگر اللہ تعالیٰ شہروں کو جمع اور بندوں کو مسخر نہ کرتا اور تم نے صرف ایک درانتی بنانا ہوتی جس سے تم گندم کو کاٹتے تو تمہاری ساری عمر خرچ ہو جاتی اور تم پھر بھی عاجز رہتے۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے اس بندے کی راہنمائی فرمائی جسے ایک ناپاک نطفے سے پیدا فرمایا کہ وہ اس قسم کے عجیب و غریب کام کرنے مثلاً قینچی کو دیکھو کہ اس کے دو پلے ایک دوسرے پر منطبق ہوتے ہیں وہ دونوں بیک وقت ایک چیز کو اپنی گرفت میں لے کر جلدی جلدی اسے کاٹ دیتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کے بنانے کا طریقہ نہ بتاتا اور ہم اپنی سوچ سے اس کو بنانے پر مجبور ہوتے پھر پتھر سے لوہا نکالنا پڑتا اور ان آلات کی ضرورت بھی ہوتی جن کے ذریعے قینچی بنائی جاتی ہے اور ہم سے کسی ایک کو حضرت نوح علیہ السلام کی عمر حاصل ہوتی اور اسے نہایت کامل عقل بھی دی جاتی پھر بھی اس آلے کا طریقہ معلوم کرنے سے وہ عمر کم ہو جاتی دوسری چیزیں تو الگ رہیں۔

تو وہ ذات پاک ہے جس نے اندھوں کے ساتھ دیکھنے والے بھی رکھے اور وہ پاک ہے جس نے اس بیان کے ساتھ بیان کرنے سے منع کیا اب غور کرو اگر تمہارے شہر میں آٹا پیسنے والا کوئی نہ ہو یا لوہار نہ ہو یا خون نکالنے والے سے خالی ہو حالانکہ یہ خسیس ترین عمل ہے یا کوئی جولاہا نہ ہو یا کسی بھی کاریگر سے خالی ہو تو تمہیں کتنی پریشانی ہوگی اور تم تمام کاموں میں کس قدر مضطرب ہو گے تو وہ ذات پاک ہے جس نے بعض بندوں کو دوسرے بعض کے لیے مسخر کیا حتیٰ کہ اس کی مشیئت نافذ اور حکمت تام ہو گئی۔

اس سلسلے میں بھی ہم مختصر کلام کر رہے ہیں کیوں کہ ہماری غرض آگاہی ہے تمام نعمتوں کا احاطہ مقصود نہیں۔

ساتواں نکتہ:

اصلاح کرنے والوں کی اصلاح

یہ لوگ جو کھانا وغیرہ تیار کرتے ہیں اگر ان کی آراء مختلف ہوتیں اور وحشی جانوروں کی طرح ان کی طبیعتوں میں نفرت ہوتی تو وہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے اور دور رہتے اور ایک دوسرے کو نفع نہ پہنچا سکتے بلکہ وحشی جانوروں کی طرح ہوتے جو ایک جگہ پر نہیں رہ سکتے اور نہ ہی وہ ایک غرض پر اکٹھے ہو سکتے ہیں تو دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو جوڑ دیا اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے انس اور محبت ڈال دی۔

ارشاد خداوندی ہے:

لَوْ اَنْفَقْتَ مَافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ۔ (۱)

اگر آپ وہ سب کچھ خرچ کرتے جو زمین میں ہے تو ان کے دلوں میں باہمی الفت پیدا نہ کر سکتے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان محبت پیدا کر دی۔

اسی الفت اور ارواح کے باہمی تعارف کی وجہ سے یہ لوگ اکٹھے ہوئے ایک دوسرے سے ملے شہر اور ملک بنے رہائش گاہیں اور گھر اس طریقے پر بنے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب اور ملے ہوئے ہیں بازار اور دکانیں بنیں اور کئی قسم کے

کارخانے بنائے جن کا ذکر طویل ہے پھر جب ان کی اغراض ٹکراتی ہیں اور جھگڑے پیدا ہوتے ہیں تو یہ محبت زائل ہو جاتی ہے کیونکہ انسان کے فطرت میں غصہ، حسد، اور جنگ و جدل موجود ہے جس کی وجہ سے وہ لڑتے ہیں اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں تو دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے بادشاہوں کو مسلط کیا اور قوت اور سامان سے ان کی مدد کی پھر رعایا کے دلوں میں ان کا رعب ڈالا حتیٰ کہ وہ خوشی و ناخوشی ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے لگے اور اللہ تعالیٰ نے کس طرح بادشاہوں کو ممالک کی اصلاح کا راستہ بتایا حتیٰ کہ انہوں نے شہروں کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا جس طرح ایک شخص کے مختلف اجزا ہوتے ہیں اور وہ ایک غرض پر باہم تعاون کرتے ہیں اور بعض دوسرے بعض سے نفع حاصل کرتے ہیں پھر انہوں نے سردار قاضی، قید خانے اور بازار کے رئیس مقرر کئے اور لوگوں کو انصاف پر مبنی قانون کی طرف مجبور کیا نیز ان کو باہمی تعاون کا پابند بنایا حتیٰ کہ لوہار، قصاب اور نانبائی نفع حاصل کرتا ہے بلکہ تمام شہر والوں سے نفع اٹھاتا ہے اور وہ سب لوہار سے نفع حاصل کرتے ہیں اور یہ نفع اندوزی اسی ترتیب، اجتماع اور انضباط کے مطابق ہوتی ہے جو بادشاہ نے قائم کی ہے جس طرح تمام جسمانی اعضا ایک دوسرے سے تعاون کرتے اور نفع اٹھاتے ہیں۔

اور غور کیجئے کس طرح اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا حتیٰ کہ انہوں نے ان بادشاہوں کی اصلاح کی جو رعایا کی اصلاح کرتے ہیں اور انہوں نے مخلوق کے درمیان عدل کے حفظ کے بارے میں قوانین شریعت کی پہچان کرائی ان کی نظم و ضبط کے لیے سیاسی قوانین بتائے امامت و سلطنت کے احکام اور فقہ کے احکام واضح کئے تاکہ ان کو اصلاح دنیا کی راہنمائی حاصل ہو جب کہ اصلاح دین کی راہنمائی اس کے علاوہ ہے۔

اور دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعے اصلاح کی اور خود فرشتوں کی اصلاح ایک دوسرے کے ذریعے کی حتیٰ کہ اس ملک مقرب تک معاملہ پہنچ گیا کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔

روٹی پکانے والا گوندھے ہوئے آٹے سے روٹی پکاتا ہے پینے والا پینے کے ذریعے اصلاح کرتا ہے کسان کاٹنے کے ذریعے تیار کرتا ہے لوہار کاشتکاری کے آلات تیار کرتا ہے بڑھئی لوہے کے آلات بناتا ہے اسی طرح وہ تمام کاریگر کام کرتے ہیں جو کھانے کے آلات کی اصلاح کرتے ہیں سلطان کاریگروں کی اصلاح کرتا ہے اور انبیاء کرام، علماء کی اصلاح کرتے ہیں جو ان کے وارث ہیں علماء بادشاہوں کی اصلاح کرتے ہیں انبیاء کرام کی اصلاح فرشتوں کے واسطے سے ہوتی ہے حتیٰ کہ بارگاہ خداوندی تک معاملہ پہنچتا ہے جو تمام نظام کا سرچشمہ، تمام حسن و جمال کا مطلع اور ہر ترتیب و تالیف کے منبع ہے اور یہ سب تمام پالنے والوں کے پالنہار اور مسبب الاسباب کی نعمتیں ہیں اگر اللہ تعالیٰ کا فضل نہ ہوتا جس طرح اس نے اپنے کرم کو بیان فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (۱)

اور وہ لوگ جو ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں ہم ضرور بضرور ان کو اپنے راستے دکھائیں گے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ عنکبوت آیت ۶۹

تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے اس تھوڑی سی بات کی پہچان تک راہنمائی حاصل نہ ہوتی۔

اور اگر اس نے ہمیں اپنی نعمت کی گہرائی کے احاطہ سے متعلق طمع سے روکا نہ ہوتا تو ہمیں ان کے احاطہ کا شوق ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے غلبہ اور قدرت کے تحت ہمیں اس سے روک دیا ہے ارشاد خداوندی ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شمار کرنا چاہو تو ان کو شمار نہیں کر سکتے۔ (۱)

اگر ہم گفتگو کرتے ہیں تو اسی کی اجازت سے وسعت و کشادگی حاصل ہوتی ہے اور اگر ہم خاموش رہیں تو اسی کے غلبہ کے تحت خاموشی اختیار کرتے ہیں کیوں کہ جس چیز سے اللہ تعالیٰ روکے اسے کوئی دے نہیں سکتا اور جو کچھ عطا کرے اسے کوئی روک نہیں سکتا کیوں کہ ہم موت سے پہلے زندگی کے ہر لمحے میں دل کے کانوں سے جبار بادشاہ کی یہ آواز سنتے ہیں۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ آج کس کی بادشاہی ہے؟ اللہ واحد و قہار کی (بادشاہی ہے) (۲)

تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہمیں کفار سے ممتاز کرتے ہوئے زندگی کے اختتام سے پہلے یہ ندا سنا دی۔

آٹھواں نکتہ:

فرشتوں کی پیدائش میں اللہ تعالیٰ کی نعمت

جو کچھ پہلے گزر چکا ہے اس سے یہ بات تم پر مخفی نہیں رہی کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اس لیے پیدا کیا کہ انبیاء علیہم السلام کی اصلاح و ہدایت، اور ان تک وحی پہنچانے کا ان کو ذریعہ بنایا اور تمہیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ان کا صرف یہی کام ہے بلکہ فرشتے کثرت اور مراتب کی ترتیب کے اعتبار سے تین طبقات میں تقسیم ہوتے ہیں۔

فرشتوں کے طبقات:

فرشتوں کے تین طبقے ہیں۔

(۱) زمین کے فرشتے (۲) آسمانی فرشتے (۳) عرش کو اٹھانے والے فرشتے تو دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے کھانے اور غذا سے متعلق امور پر ان کو مقرر کیا جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ان کے علاوہ جو ہدایت و ارشاد پر مقرر ہیں ان کا ذکر ہم نہیں کرتے اور یہ بھی جان لو کہ تمہارے بدن کا ہر جزو بلکہ سبزیوں کے اجزاء ان کے حصول غذا کے لیے سات فرشتے مقرر ہیں اور یہ کم از کم ہیں یہ دس بلکہ سو بلکہ اس سے بھی زیادہ تک پہنچتے ہیں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ نحل آیت ۱۸

(۲) قرآن مجید، سورۂ غافر آیت ۱۶

اس کا بیان اس طرح ہے کہ غذا کا معنی ایک جزو کا دوسرے جزو کے قائم مقام ہونا ہے جو مٹ چکی ہے اور یہ غذا آخری مرحلے میں خون بنتی ہے پھر گوشت اور ہڈیاں بنتی ہیں اور جب یہ گوشت اور ہڈیوں کی شکل اختیار کرے تو اب تمہاری غذا مکمل ہوگی خون اور گوشت ایسے جسم ہیں جن کو کوئی طاقت، معرفت اور اختیار حاصل نہیں ہے وہ خود بخود حرکت نہیں کر سکتے اور نہ ہی خود بخود تبدیل ہو سکتے ہیں اور محض طبیعت ان کے طور طریقوں کو بدلنے کے لیے کفایت نہیں کرتی جس طرح گندم خود بخود پس کر اپنے آپ کو گوندھتی اور روٹی کی شکل اختیار نہیں کرتی اس کے لیے کاریگر کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح خون بھی اپنے آپ گوشت، ہڈیاں، رگیں اور پٹھے نہیں بنتے بلکہ کسی بنانے والے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ بنانے والے اندرونی فرشتے ہیں جس طرح ظاہری طور پر شہر والے کاریگر ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے تم پر ظاہری اور باطنی نعمتوں کا فیضان فرمایا تو تمہیں اس کی باطنی نعمتوں سے غافل نہیں ہونا چاہیے تو میں (امام غزالی) کہتا ہوں ایک ایسا فرشتہ ضروری ہے جو گوشت اور ہڈی کی طرف غذا کو کھینچے کیوں کہ غذا خود بخود حرکت نہیں کرتی اور ایک دوسرا فرشتہ ایسا ہو جو اس کے پہلو میں غذا کو روک رکھے اور تیسرا فرشتہ ایسا ہو جو غذا کے اوپر سے خون کی صورت کو دور کرے چوتھا فرشتہ اسے گوشت، رگوں اور ہڈی کا لباس پہنائے پانچواں فرشتہ حاجت غذا سے زائد کو دور کرے اور چھٹا فرشتہ ان چیزوں کو ان کے مناسب کے ساتھ ملائے جس میں ہڈی کی صفت ہے اسے ہڈی سے ملائے گوشت کی صفت والے کو گوشت سے ملائے تاکہ وہ جدا جدا نہ رہیں اور ساتویں فرشتے کی بھی ضرورت ہے جو ان کو ملانے میں مقدار اور اندازے کا خیال رکھے گول کے ساتھ اس قدر ملائے جس سے گولائی زائل نہ ہو چوڑائی والے سے اس قدر ملائے کہ اس کی چوڑائی باقی رہے اور جو اندر سے خالی ہے اس میں اس قدر ملائے کہ اس کی گہرائی اور خلا باقی رہے اور ان میں سے ہر ایک میں حاجت کے اندازے کی حفاظت کرے مثلاً بچے کے ناک پر اس قدر گوشت جمع کر دیا جو اس کی ران پر جمع ہونا چاہیے تھا تو اس کی ناک بڑی ہو جائے گی اور اس کا خلا ختم ہو جائے گا نیز اس کی شکل و صورت بگڑ کر ڈراؤنی ہو جائے گی۔

بلکہ جس کے جو مناسب ہے وہی اختیار کرے پلکوں میں پتلاپن (آنکھ کے) ڈھیلے میں صفائی، رانوں میں موٹاپا، ہڈیوں میں سختی مناسب ہے تو ہر ایک کے لیے اسی قدر غذا پہنچائے جو مقدار اور شکل میں اس کے مناسب ہو ورنہ صورت بگڑ جائے گی اور بعض جگہیں بڑھ جائیں گی اور بعض کم ہو جائیں گی بلکہ اگر یہ فرشتہ تقسیم میں عدل کا خیال نہ رکھے اور بچے کے سر اور باقی تمام بدن تک اس قدر غذا پہنچائے جس سے وہ بڑھ جائے لیکن اس کے پاؤں کو چھوڑ دے تو وہ پاؤں اسی طرح رہے گا جس طرح بچپن میں تھا اور باقی جسم بڑھ جائے گا اور تم ایسے آدمی کو دیکھو گے جو ضخامت میں پورا آدمی ہے لیکن اس کا ایک پاؤں بچے کے پاؤں کی طرح ہے تو وہ اپنے جسم سے نفع حاصل نہیں کر سکے گا تو اس انداز میں تقسیم کی رعایت کرنا ایک فرشتے کے سپرد ہے۔

اور یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ خون خود اپنی طبیعت کے اعتبار سے شکل بدل لیتا ہے کیوں کہ ایسے کاموں کو طبیعت سے منسوب کرنے والا جاہل ہے وہ جانتا ہی نہیں کہ کیا کہہ رہا ہے۔

یہ تو زمین کے فرشتوں کی بات تھی وہ تمہارے اندر عمل میں مشغول ہیں جب کہ تم نیند کی حالت میں آرام کر رہے ہو اور غفلت

میں ادھر اُدھر پھر رہے ہو اور وہ تمہارے باطن میں تمہاری غذا کی اصلاح کر رہے ہیں جب کہ تم ان سے بے خبر ہو اور یہ تمہارے جسم کے تمام اجزاء میں ہیں حتی کہ بعض اجزاء مثلاً آنکھ اور دل وغیرہ ایک سو سے زائد فرشتوں کے محتاج ہیں ہم نے اختصار کے پیش نظر اس تفصیل کو چھوڑ دیا ہے۔

اور زمین کے فرشتوں کو آسمانی فرشتوں سے ایک معلوم ترتیب پر مدد پہنچتی ہے اس کی حقیقت اور گہرائی کو اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں جانتا اور آسمانی فرشتوں کو عرش کے اٹھانے والے فرشتوں سے مدد حاصل ہوتی ہے اور ان سب پر تائید و ہدایت اور درستگی کے حوالے سے اس ذات کا انعام ہے جو حفاظت کرنے والا، پاک، ملک و ملکوت کا تنہا مالک عزت و جبروت والا زمین و آسمان میں قہر والا بادشاہی کا مالک اور عزت و جلال والا ہے۔

آسمانوں اور زمین، نباتات و حیوانات کے اجزاء حتی کہ بارش کے ہر قطرے اور بادل جو ایک طرف سے دوسری طرف کو جاتے ہیں ان سب پر مقرر فرشتوں کا شمار نہیں ہو سکتا اسی لیے ہم نے احادیث سے استدلال کو چھوڑ دیا ہے۔

سوال:

یہ تمام افعال ایک فرشتے کے حوالے کیوں نہیں کئے گئے سات فرشتوں کی ضرورت کیوں پڑی؟ گندم کے لیے بھی پہلے پیسنے کی ضرورت ہوتی ہے پھر آٹا چھاننے اور پھوگ نکالنے کی اس کے بعد اس میں پانی ڈالنے کی چوتھے نمبر پر گوندھنے والا چاہیے پھر پانچویں مرحلے میں اسے گول گول (پیڑے) بنانے کی اس کے بعد اسے روٹی کی شکل دینا ہے یہ چھٹا مرحلہ ہے ساتویں مرحلے میں جو اسے تنور میں لگائے لیکن ایک ہی آدمی یہ سب کام کر لیتا ہے تو فرشتوں کا باطنی عمل انسانوں کے اس ظاہری عمل کی طرح کیوں نہیں ہے

جواب:

فرشتوں کی تخلیق اور انسانوں کی تخلیق میں فرق ہے ان (فرشتوں) میں سے ہر ایک کو ایک صفت عطا کی گئی ہے جس میں کسی دوسری صفت کا اختلاط اور ترکیب نہیں ہے لہذا ان میں سے ہر ایک کے ذمہ ایک ہی کام ہے اور اللہ تعالی کے اس ارشاد گرامی میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ۔ (۲) اور ہم (فرشتوں) میں سے ہر ایک کے لیے ایک معلوم اور مقرر) مقام ہے۔

اسی لیے ان کے درمیان اختلاف نفرت اور لڑائی نہیں ہوتی بلکہ ہر ایک مرتبہ کے تعین میں حواس خمسہ کی مثل ہے

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۱۴۱ ۱۴۲ مرویات عبداللہ

(۲) قرآن مجید، سورۂ صافات آیت ۱۶۴

آوازوں کے حصول میں بینائی کا سماعت سے اور سونگھنے کی قوت کا ان دونوں سے کوئی جھگڑا نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ دونوں سونگھنے کی قوت سے جھگڑتے ہیں اور یہ ہاتھ اور پاؤں کی طرح بھی نہیں کیوں کہ بعض اوقات، تم پاؤں کی انگلیوں سے پکڑتے ہو اگرچہ یہ پکڑنا کمزور ہوتا ہے تو اس کا ہاتھ سے ٹکراؤ ہوا اور تم دوسروں کو سر کے ساتھ مارتے ہو تو سر کا ہاتھ سے اختلاف ہوا کیوں کہ ہاتھ مارنے کا آلہ ہے اور یہ ایک انسان کی طرح بھی نہیں کیوں کہ ایک ہی آدمی پیسا، گوندھتا اور روٹی پکاتا ہے اور یہ ایک قسم کی کجی اور اعتدال سے عدول ہے اور اس کا سبب انسانی صفات میں اختلاف ہے چوں کہ وہ ایک ہی صفت نہیں رکھتا اس لیے وہ ایک ہی عمل کا پابند نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ تم انسان کو دیکھتے ہوئے کبھی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتا ہے اور کبھی نافرمانی، کیوں کہ اس کے دواعی (ارادے) اور صفات میں اختلاف ہے جب کہ فرشتوں کی طبیعتوں میں یہ ممکن نہیں ہے بلکہ اطاعت خداوندی ان کی فطرت میں داخل ہے ان کو نافرمانی کی مجال ہی نہیں پس وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے وہ رات دن اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اس میں کوتاہی نہیں کرتے ان میں سے رکوع کرنے والے ہر وقت حالتِ رکوع میں رہتے ہیں سجدہ کرنے والے ہمیشہ سجدے کی حالت میں رہتے ہیں اور جو قیام کی حالت میں ہیں وہ ہمیشہ حالتِ قیام میں رہتے ہیں ان کے افعال میں نہ تو اختلاف ہے اور نہ ہی کوتاہی، ان میں سے ہر ایک کا ایک مقرر مقام ہے وہ اس سے تجاوز نہیں کرتا۔

وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اس طرح کرتے ہیں کہ اس میں مخالفت کی کوئی مجال نہیں تمہارے اعضاء کے ساتھ تشبیہ دینا ممکن ہے (یعنی جس طرح انسان کے اعضاء اس کی حکم عدولی نہیں کرتے فرشتے بھی اپنے رب کی حکم عدولی نہیں کرتے) تم جب پلکیں کھولنا چاہو تو صحیح پلکوں کو اس میں کوئی تردد اور اختلاف نہیں ہو سکتا ایسا نہیں ہوتا کہ کبھی وہ تمہاری بات مانیں اور کبھی اختلاف کریں بلکہ یوں ہوتا ہے کہ وہ تمہارے امر و نہی کی منتظر رہتی ہیں وہ تمہارے اشارے پر کھلتی اور فوراً بند ہو جاتی ہیں یہ ایک طرح کی تشبیہ ہے لیکن ایک وجہ سے دونوں میں فرق بھی ہے کیوں کہ پلکوں کو اس حرکت کا علم نہیں ہوتا جو ان سے صادر ہوتی ہیں کھلیں یا بند ہوں جب کہ فرشتوں میں حیات ہے اور وہ اپنے عمل کا علم رکھتے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے فرشتوں کے ذریعے تمہیں صرف کھانے میں اس قدر نعمت عطا فرمائی ہے باقی حرکات و حاجات اس کے علاوہ ہیں ہم ان کا ذکر کر کے کلام کو طول دینا نہیں چاہتے، یہ نعمتوں کے طبقات میں سے دوسرا طبقہ ہے اور تمام طبقات کا شمار ممکن نہیں ہے تو ان کے افراد کا شمار کیسے ممکن ہوگا۔

تو اللہ تعالیٰ نے تم پر ظاہری اور باطنی نعمتوں کی بارش برسائی پھر فرمایا۔

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ۔(۲) اور ظاہری و باطنی گناہ چھوڑ دو۔

---

(۱) مجمع الزوائد، جلد ۵ ص ۲۷۶ کتاب الجہاد

(۲) قرآن مجید، سورۂ انعام آیت ۱۲۰

باطنی گناہ جن کو لوگ نہیں جانتے یعنی حسد، بدگمانی، بدعت، اور لوگوں کے بارے میں برائی کو دل میں چھپانا وغیرہ دل کے گناہوں میں سے ہیں اور ان سے لوگ ناواقف ہیں ان کو چھوڑنا باطنی نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے اور ظاہری گناہ جو اعضاء سے ہوتے ہیں ان کو ترک کرنا ظاہری نعمتوں پر شکر ادا کرنا ہے۔

بلکہ میں (امام غزالی) کہتا ہوں جو شخص پلک جھپکنے کی صورت میں بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے مثلاً جہاں آنکھ کو بند رکھنا چاہیے تھا وہاں آنکھ کھول دے تو اس نے اللہ تعالیٰ کی ان تمام نعمتوں کا انکار کیا جو اللہ تعالیٰ نے اسے آسمانوں، زمین اور اس کے درمیان میں عطا فرمائی ہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا کیا ہے حتیٰ کہ ملائکہ، آسمان، زمین، حیوانات اور نباتات یہ سب کچھ بندوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ اس کا نفع ان سے پورا ہوتا ہے اگرچہ اس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی ان سے نفع اٹھاتے ہیں بے شک پلک جھپکنے میں اللہ تعالیٰ کی دو نعمتیں ہیں کیوں کہ ہر پلک کے نیچے کچھ پٹھے اور گوشت ہے جو دماغ کے اعصاب سے متصل ہے اس سے اوپر والی پلک کا جھکنا اور نیچے والی پلک کا اٹھنا ممکن ہوتا ہے اور ہر پلک پر سیاہ بال ہیں اور ان کے سیاہ ہونے میں اللہ تعالیٰ کی نعمت یہ ہے کہ وہ آنکھ کی روشنی کو جمع کرتی ہے کیوں کہ سفیدی روشنی کو بکھیرتی ہے اور سیاہی جمع کرتی ہے۔

اور ان بالوں کا ایک لائن میں ترتیب کے ساتھ ہونا اس اعتبار سے نعمت ہے کہ وہ کیڑے مکوڑوں کو آنکھوں کو اندر جانے سے منع کرتے ہیں۔ اور وہ گرد و غبار جو ہوا میں اڑتی ہے وہ آنکھوں میں نہ پڑے اور ہر بال میں دو نعمتیں ہیں کہ بالوں کی جڑیں نرم ہیں اور اس کے باوجود ان کو کھڑا رکھا اور دونوں پلکوں کے بال اوپر نیچے سے مل کر ایک بہت بڑی نعمت قرار پاتے ہیں وہ یوں کہ بعض اوقات ہوائی غبار آنکھ کے کھلنے میں رکاوٹ ہوتی ہے اور اگر وہ بند ہو جائے تو آدمی دیکھ نہ سکے اس لیے ایسے وقت میں اتنی مقدار میں آنکھ بند کر سکتا ہے کہ اوپر نیچے کی پلکوں کے بال مل جائیں اور وہ ان کی آڑ میں سے دیکھے تو بالوں کا ملنا خارج سے تنکوں وغیرہ کے آنکھوں میں داخل ہونے سے مانع ہوتا ہے لیکن اندر سے آنکھوں کے کھلنے سے مانع نہ ہو پھر اگر آنکھ کی پتلی تک غبار پہنچ جائے تو پلکوں کے کنارے اس ڈھیلے کے خادم کے طور پر پیدا کیے جو آئینے کو صاف شفاف کرنے والی چیز کی طرح ہیں ایک دو مرتبہ آنکھ بند کرنے سے ڈھیلا غبار سے صیقل (صاف) ہو جاتا ہے اور تنکا وغیرہ آنکھوں کے کناروں سے نکل جاتا ہے اور مکھی کے ڈھیلے کی چونکہ پلکیں نہیں ہیں تو اس کے لیے دو پاؤں زیادہ بنائے ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ وہ ان پاؤں سے آنکھوں کو ملتی رہتی ہے تاکہ ان کو غبار سے صاف کر دے ہم نے نعمتوں کا تفصیلی بیان چھوڑ دیا ہے کیوں کہ اس میں طول زیادہ ہے جو اس کتاب کی اصل پر اضافہ کا باعث ہے اگر زمانے نے ہمیں مہلت دی اور توفیق شامل حال ہوئی تو ہم ایک الگ کتاب لکھیں گے جس کا نام اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب صنعت رکھیں گے۔ ہم اب اصل غرض کی طرف لوٹتے ہوئے کہتے ہیں۔

جو شخص غیر محرم عورت کو دیکھتا ہے وہ پلکوں کی صورت میں ملنے والی نعمت خداوندی کا انکار کرتا ہے جب وہ آنکھ کھولتا ہے

اور پلکیں آنکھوں کے بغیر، آنکھیں سر کے بغیر، سر، باقی تمام بدن کے بغیر، بدن غذا کے بغیر اور غذا، پانی، زمین، ہوا، بارش، بادل، سورج اور چاند کے بغیر قائم نہیں ہوتی اور ان میں سے کوئی بھی چیز آسمانوں کے بغیر قائم نہیں ہوتی اور آسمان فرشتوں کے بغیر قائم نہیں ہوتے کیوں کہ یہ سب ایک چیز کی طرح ہیں اور بعض دوسری بعض کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں جس طرح بدن کے اعضاء ایک دوسرے کے ساتھ متصل ہیں تو گویا اس نے ثریا سے لے کر تحت الثریٰ تک موجود ہر نعمت کا انکار کیا اب کوئی فلک، کوئی حیوان بلکہ نباتات و جمادات میں سے کوئی چیز نہیں جو اس پر لعنت نہ بھیجتی ہو اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس حصہ زمین میں لوگ جمع ہوتے ہیں یا وہ ان پر لعنت بھیجتا ہے یا ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے" اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ الْعَالِمَ یَسْتَغْفِرُ لَہٗ کُلُّ شَیْءٍ حَتَّی الْحُوْتِ فِی الْبَحْرِ۔ (۱)

بے شک عالم کے لیے ہر چیز بخشش مانگتی ہے حتی کہ دریا کی مچھلیاں بھی۔

اور حدیث شریف میں ہے۔

اَنَّ الْمَلَآئِکَۃَ یَلْعَنُوْنَ الْعُصَاۃَ۔ (۲)

بے شک فرشتے نافرمان لوگوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔

متعدد اور بے شمار الفاظ میں لعنت، کا ذکر ہے جن کا احاطہ ممکن نہیں یہ تمام احادیث اس بات، کی طرف، اشارہ کرتی ہیں کہ نافرمانی کرنے والا پلک جھپکنے میں تمام ملک و ملکوت کا مجرم ٹھہرتا ہے اور اس نے اپنے آپ، کو ہلاک کیا البتہ یہ کہ وہ گناہ کے بعد نیکی کر کے اسے مٹا دے تو لعنت، استغفار میں بدل جاتی ہے قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرما کر اسے معاف فرما دے۔

اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اے ایوب علیہ السلام آدمیوں میں سے ہر بندے کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جب وہ میری نعمتوں پر میرا شکر ادا کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں یا اللہ! اسے مزید نعمتیں عطا فرما تو حمد و شکر کا اہل ہے (تو اے ایوب علیہ السلام! آپ بھی شکر کرنے والوں کے قریب ہو جائیں میرے نزدیک شکر کرنے والے کے بلند مرتبہ ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ میں ان کا شکر قبول کرتا ہوں اور میرے فرشتے ان کے لیے دعا مانگتے ہیں زمین ان سے محبت کرتی ہے اور پیچھے رہنے والے ان پر روتے ہیں جس طرح تمہیں معلوم ہوا کہ ایک پلک جھپکنے میں بے شمار نعمتیں ہیں تو جان لو کہ ہر سانس میں جب وہ نیچے جاتا یا باہر آتا ہے، دو نعمتیں ہیں کیوں کہ اس کے اوپر آنے سے جلا ہوا دھواں دل سے نکل جاتا ہے اگر وہ نہ نکلے تو آدمی ہلاک ہو جائے اور جب وہ نیچے جاتا ہے تو ہوا کی روح دل کی طرف جمع ہوتی ہے اور اگر اس کا سانس بند ہو جائے تو روح ہوا اور اس کی ٹھنڈک کے منقطع ہو جانے سے دل جل جاتے اور وہ

---

(۱) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۱۵۰ کتاب العلم

(۲) السنن الکبریٰ للبیہقی جلد ۸ ص ۲۳ کتاب الجنایات

ہلاک ہو جاتے۔

بلکہ دن اور رات میں چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں اور ہر گھنٹے میں تقریباً ہزار سانس ہوتے ہیں اور ہر سانس میں تقریباً دس لمحے ہوتے ہیں تو ہر لمحہ میں تقریباً تجھ پر تیرے بدن کے ہر جزء میں لاکھوں نعمتیں ہیں بلکہ عالم کے ہر جزء میں بے شمار نعمتیں ہیں تو دیکھو کیا ان کے شمار کا تصور کیا جا سکتا ہے یا نہیں!

اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کی حقیقت واضح ہوئی۔

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا۔ (۱) اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کو گننا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔

تو آپ نے عرض کیا یا اللہ! میں تیرا شکر کس طرح ادا کروں میرے جسم کے ہر بال میں تیری دو نعمتیں ہیں کہ تو نے اس کی جڑ کو نرم اور اس کے سر کو بلند کیا اور حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص صرف کھانے پینے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو پہچانتا ہے اس کا علم کم اور عذاب حاضر ہے یہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے یہ کھانے اور پینے سے متعلق ہے اس کے علاوہ نعمتوں کو ان پر قیاس کرو کیوں کہ دانا آدمی اس عالم میں کسی چیز کو جب دیکھتا ہے یا اس کے دل میں کسی موجود کا خیال آتا ہے تو وہ اس میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو دیکھتا ہے۔ اب ہم تفصیل کو چھوڑتے ہیں کیوں کہ یہ بے فائدہ طمع ہے

تیسرا بیان:

مخلوق کو شکر سے پھیرنے والا سبب

جان لیجئے کہ مخلوق کو شکر سے صرف جہالت اور غفلت باز رکھتی ہے کیونکہ وہ جہالت اور غفلت کی وجہ سے نعمتوں کی پہچان سے رک جاتے ہیں پھر اگر وہ نعمتوں کی پہچان حاصل کر بھی لیں تو بھی ان کے خیال میں شکر کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے "الحمد للہ"، "الشکر للہ"، اور وہ جانتے نہیں کہ شکر کا معنیٰ یہ ہے کہ نعمت کو اس حکمت کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جائے جس کا اس سے ارادہ کیا گیا ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری ہے۔

اب ان دو باتوں کا علم حاصل ہونے کے بعد شکر کے راستے میں رکاوٹ شہوت کا غلبہ اور شیطان کا تسلط ہوتا ہے جہاں تک نعمتوں سے غفلت کا تعلق ہے تو اس کے کئی اسباب ہیں اور ان میں سے ایک سبب یہ ہے کہ لوگ جہالت کی وجہ سے اس چیز کو نعمت نہیں سمجھتے جو تمام لوگوں کو اور ہر حالت میں حاصل ہوتی ہے اسی وجہ سے وہ ان نعمتوں کا شکر ادا نہیں کرتے جن کا ہم نے اس سے پہلے ذکر کیا ہے کیوں کہ یہ نعمتیں تمام لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں اور وہ ہر حال میں ان کو استعمال کرتے ہیں لہٰذا کوئی بھی شخص اس کو اپنے ساتھ خاص نہیں سمجھتا اس لیے وہ اسے نعمت شمار نہیں کرتا یہی وجہ ہے کہ تم ان کو ہر طرح ہوا

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ نحل آیت ۱۸

پر شکر کرتے ہوئے نہیں دیکھو گے حالانکہ اگر وہ ایک لحظہ کے لیے بھی ان کا گلا گھونٹ دے حتیٰ کہ ہوا بند ہو جائے تو وہ مر جائیں اور اگر وہ کسی حمام میں بند ہو جائیں جس میں گرم ہوا ہوتی ہے یا کنویں میں ہوں جس میں پانی کی رطوبت کی وجہ سے ہوا ثقیل ہوتی ہے تو دم گھٹنے سے مر جائیں اور اگر ان میں سے کوئی شخص اس امتحان میں ڈالا جائے پھر اسے نجات مل جائے تو وہ ہوا کو نعمت جان کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے گا۔ تو یہ انتہائی جہالت ہے کیونکہ ان کا شکر اس بات پر موقوف ہو گیا کہ ان سے نعمت چھن جائے پھر بعض حالات میں واپس کی جائے۔ حالانکہ نعمت پر ہر وقت شکر گزار رہنا چاہیے پس کسی سمجھدار کو اس طرح کرتے ہوئے نہیں دیکھو گے کہ وہ آنکھوں کی صحت کا اس طرح شکر ادا کرے کہ پہلے اس کی بینائی لے لی جائے پھر اگر بینائی لوٹائی جائے تو وہ اس کا احساس کرتے ہوئے شکر بجالائے اور اسے نعمت سمجھے۔

اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے اس لیے اس نے تمام مخلوق کو عطا فرمائی اور وہ ہر حال میں اس سے نفع اٹھاتے ہیں لیکن جاہل آدمی اسے نعمت نہیں سمجھتا اور یہ جاہل برے غلام کی طرح ہے اور وہ اس لائق ہے کہ اسے ہر وقت مار پڑتی رہے۔ حتیٰ کہ ایک ساعت مار موقوف کر دی جائے تو وہ احسان مند ہوتا ہے لیکن ہمیشہ کے لیے مار بند کر دی جائے تو اکڑنے لگتا ہے اور شکریہ ادا کرنا چھوڑ دیتا ہے تو لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اسی مال پر شکریہ ادا کرتے ہیں جو خاص ان کو حاصل ہو جاتا ہے وہ زیادہ ہو یا تھوڑا۔ اور اللہ تعالیٰ کی باقی تمام نعمتوں کو بھول جاتے ہیں۔

جس طرح کسی شخص نے کسی صاحبِ بصیرت سے اپنے فقر کی شکایت کی اور شدّتِ غم کا اظہار کیا تو اس سمجھدار آدمی نے جواب دیا کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ تم اندھے ہو اور تمہارے پاس دس ہزار درھم ہوں؟ اس نے کہا نہیں اس نے پوچھا کیا تمہیں یہ اچھی لگتی ہے کہ تم گونگے ہو اور تمہارے پاس دس ہزار درھم ہوں؟ اس نے کہا نہیں اس نے پوچھا کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ تمہارے دونوں ہاتھ اور پاؤں کٹے ہوئے ہوں اور تمہیں بیس ہزار درھم دیئے جائیں؟ اس نے کہا نہیں پوچھا کیا تم اس بات کو پسند کرتے ہو کہ تم پاگل ہو اور تمہیں دس ہزار درہم دیئے جائیں؟ اس نے کہا نہیں اس پر اس سمجھدار شخص نے کہا تمہیں حیا نہیں آتی کہ تم اپنے آقا و مولیٰ کی شکایت کرتے ہو حالانکہ تمہارے پاس اس کا پچاس ہزار کا سامان موجود ہے۔

منقول ہے کہ کسی قاری صاحب پر تنگدستی آگئی حتیٰ کہ وہ تنگدل ہو گیا پھر اس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے۔

اگر تم چاہو کہ ہم تمہیں ایک ہزار دینار دے دیں اور اس کے بدلے تمہیں سورۂ انعام بھلا دیں اس نے کہا نہیں، پوچھا سورۂ ہود؟ اس نے کہا نہیں سوال کیا سورۂ یوسف؟ کہا نہیں اس نے کئی سورتوں کے نام لیے پھر کہا تمہارے پاس ایک لاکھ دینار مالیت ہے اور تم شکوہ کرتے ہو صبح وہ اٹھا تو اس کا افلاس جاتا رہا۔

حضرت ابن سماک کسی خلیفہ کے پاس تشریف لے گئے اس کے ہاتھ میں پانی کا ایک کوزہ تھا کہنے لگا مجھے کوئی نصیحت کریں

ابن سماک نے فرمایا اگر تمہیں یہ پانی تمام مال خرچ کرنے پر ملتا ورنہ تم پیاسے رہتے تو کیا تم وہ مال دے دیتے؟ اس نے کہا جی ہاں میں دے دیتا انہوں نے پوچھا اگر اس پانی کے بدلے تمہیں اپنی تمام سلطنت دینا پڑتی تو کیا تم حکومت چھوڑ دیتے؟ اس نے کہا جی ہاں انہوں نے فرمایا تو اس بادشاہی پر خوش نہ ہو جس کی قیمت پانی کا ایک گھونٹ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ پانی کے ایک گھونٹ کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی نعمت پیاس کے وقت تمام زمین کی حکومت سے زیادہ بڑی ہے۔

اور جب طبیعتیں اس بات کی طرف مائل ہیں کہ وہ عام نعمتوں کی بجائے خاص نعمتوں کو شمار کرتی ہیں اور ہم نے عمومی نعمتوں کا ذکر پہلے کر دیا تو اب ہم خاص نعمتوں کی طرف ایک مختصر سا اشارہ کرتے ہیں پس ہم کہتے ہیں۔

اگر ہر آدمی اپنے احوال کو گہری نظر سے دیکھے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت یا کئی نعمتیں دیکھے گا جو اس کے ساتھ خاص ہیں ان نعمتوں میں اس کے ساتھ سب لوگ شریک نہیں ہیں بلکہ تھوڑے سے لوگ شریک ہیں بلکہ بعض اوقات تو اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں ہوتا۔ اور اس سلسلے میں ہر بندہ تین امور میں اعتراف کرتا ہے ایک عقل دوسری تخلیق اور تیسرا علم۔

عقل کی وضاحت یوں ہے کہ ہر بندے اپنی عقل کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقلمند سمجھتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے عقل کا سوال بہت کم کرتا ہے اور عقل کی شرافت سے یہ بات ہے کہ جو اس سے خالی ہے وہ بھی اس سے خوش ہے جیسا کہ عقل سے موصوف آدمی خوش ہوتا ہے اور جب اس کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ عقلمند ہے اس پر اس کا شکر واجب ہے کیوں کہ اگر حقیقت میں ایسا ہی ہے جیسا وہ خیال کرتا ہے تو تو شکر کرنا اس پر واجب ہے اور اگر ایسا نہیں ہے لیکن اسی کا عقیدہ یہی ہے تو یہ اس کے حق میں نعمت ہے جو شخص زمین میں خزانہ دبا دیتا ہے تو وہ اس پر خوش ہوتا اور شکر بجا لاتا ہے اور اگر کوئی شخص اس کا خزانہ نکال کر لے جائے اور اسے علم نہ ہو تو بھی عقیدے و خیال کے مطابق اس کی خوشی باقی رہتی اور شکر بھی باقی رہتا ہے۔ کیوں کہ اس کے حق میں وہ باقی کی طرح ہے۔

جہاں تک تخلیق کا تعلق ہے تو ہر آدمی دوسرے شخص میں ایسے عیب دیکھتا ہے جن کو وہ ناپسند کرتا ہے اور ایسی عادات جن کی وہ مذمت کرتا ہے اور وہ اس لیے مذمت کرتا ہے کہ اپنے آپ کو ان عیبوں سے پاک سمجھتا ہے پس جب وہ دوسروں کی مذمت میں مشغول نہ ہو تو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر میں مشغول ہو کہ اس نے اس کو اچھی صورت دی اور دوسروں کو بُری صورت میں مبتلا کیا۔

علم کا معاملہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اندر کے امور کو جانتا ہے اور خفیہ افکار کا بھی علم رکھتا ہے اور اس میں اس کے ساتھ کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا اور اگر پردہ اُٹھ جائے حتیٰ کہ مخلوق میں سے کوئی شخص ان باتوں پر مطلع ہو جائے تو اسے شرمندگی اٹھانا پڑے اور اگر سب لوگوں کو ان باتوں کا علم ہو جائے تو کیا صورت حال ہو گی؟

تو گویا ہر شخص کو ایک ایسا علم حاصل ہے جو اس کے ساتھ خاص ہے اس میں کوئی دوسرا بندۂ خدا اس کے ساتھ شریک نہیں ہے تو وہ اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیوں نہیں کرتا کہ اس نے اس کی برائیوں کی اچھی طرح پردہ پوشی فرمائی اس کے اچھے کاموں کو ظاہر کیا اور برائیوں پر پردہ ڈالا اور لوگوں کی نگاہوں سے ان کو پوشیدہ رکھا ان باتوں کا علم اسی تک محدود رکھا کہ کوئی دوسرا ان باتوں پر مطلع نہیں ہوتا۔

تو یہ تین نعمتیں خاص ہیں اور ہر بندہ ان کا اعتراف کرتا ہے اعترافِ مطلق ہو یا بعض امور میں ہو۔ اب ہم ایک اور طبقے کی طرف آتے ہیں جو ان کے مقابلے میں کچھ عام ہے تو ہم کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر بندے کو اس کی صورت، شخصیت، اخلاق، صفات اہل و اولاد، مسکن، شہر، دوست، اقارب، عزت وجاہ یا اس کے علاوہ پسندیدہ باتوں میں کچھ ایسے امور عطا فرمائے ہیں کہ اگر یہ اس سے سلب کر لیے جائیں اور وہ چیز دی جائے جو اس کے غیر کے ساتھ خاص ہے تو وہ اس پر راضی نہیں ہوگا۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے اسے مومن بنایا کافر نہیں بنایا، اس میں حیات رکھی ہے جمادات میں سے نہیں بنایا، انسان بنایا، جانور نہیں بنایا مرد بنایا عورت نہیں بنایا، تندرست رکھا بیمار نہیں بنایا، عیبوں سے محفوظ رکھا، عیب دار نہیں بنایا تو یہ سب خصائص ہیں اگرچہ ان سب امور میں بھی عموم ہے۔

اب اگر ان سب باتوں کو ان کی ضدوں میں بدل دیا جائے تو وہ راضی نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے کچھ ایسے امور بھی ہیں کہ وہ ان کو انسانوں کے احوال سے بھی بدلنا نہیں چاہتا ان میں سے بعض وہ ہیں کہ وہ ان کو ان امور سے نہیں بدلنا چاہتا جو مخلوق میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص ہیں یا ان کے ساتھ بدلنا نہیں چاہتا ہے جو اکثر لوگوں کے ساتھ خاص ہیں۔

تو جب وہ اپنی حالت کو دوسروں کی حالت سے بدلنا نہیں چاہتا تو گویا اس کی حالت دوسروں کی حالت سے بہتر ہے پس جب کوئی ایسا شخص معلوم نہیں ہے جو اپنی حالت کے بدلے کسی دوسری حالت پر عمومی طور پر یا کسی خاص حالت کے حوالے سے راضی ہو تو گویا اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسی نعمتیں عطا فرمائی ہیں جو اس کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں دی گئیں اور اگر وہ دوسرے لوگوں میں سے بعض کی حالت کے ساتھ اپنی حالت کو بدلنا چاہتا ہے بعض کی حالت سے نہیں تو اس کے نزدیک جو لوگ قابلِ رشک ہیں ان کی تعداد کو دیکھے یقیناً وہ دوسروں کے مقابلے میں ان کو کم دیکھے گا تو جو لوگ اس سے کم درجہ والی حالت میں ہیں وہ ان کے مقابلے میں زیادہ ہیں جن کی حالت بلند تر ہے تو اسے کیا ہوا کہ وہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کے انعام کو حقیر جاننے کے لیے اپنے سے اوپر والوں کو دیکھتا ہے اور اپنے سے کم تر کی طرف نہیں دیکھتا تاکہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو عظیم جانے اسے کیا ہوا کہ وہ دین کو دنیا کے برابر بھی نہیں سمجھتا کیا ایسا نہیں ہے کہ جب اس کا نفس اسے کسی گناہ پر ملامت کرتا ہے تو وہ یہ بہانہ کرتا ہے کہ دنیا میں فاسق لوگ بے شمار ہیں تو وہ دین کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے کمتر کی طرف دیکھتا ہے اوپر والوں کی طرف نہیں دیکھتا دنیوی معاملے میں وہ اس طرح کیوں نہیں دیکھتا جب دین کے معاملے میں اکثر لوگوں کا حال اس سے بہتر ہے اور دنیوی معاملات میں اس کا اپنا حال دوسروں کے حال سے بہتر ہے تو اس پر شکر کرنا کیوں لازم نہیں ہوگا

اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ نَظَرَ فِي الدُّنْيَا إِلَى مَنْ هُوَ دُوْنَهُ وَنَظَرَ فِي الدِّيْنِ إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ كَتَبَهُ اللهُ صَابِرًا وَشَاكِرًا وَمَنْ نَظَرَ فِي الدُّنْيَا إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ وَفِي الدِّيْنِ إِلَى مَنْ هُوَ دُوْنَهُ لَمْ يَكْتُبْهُ اللهُ صَابِرًا وَلَا شَاكِرًا۔ (۱)

جو شخص دنیوی معاملات میں اپنے سے کم لوگوں کی طرف دیکھے اور دینی معاملات میں اپنے سے اوپر والوں کی طرف نظر کرے تو اللہ تعالیٰ اسے صابر و شاکر لکھتا ہے اور جو شخص دنیا کے معاملات میں اپنے سے اوپر والوں کی طرف دیکھتا ہے اور دین کے معاملات میں اپنے سے کمتر کو دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے صابر و شاکر نہیں لکھتا۔

تو نتیجہ یہ ہوا کہ جو شخص اپنی حالت پر غور کر کے اس بات کا جائزہ لیتا ہے جو اس کے ساتھ خاص ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے بے شمار انعام ہیں خصوصاً وہ شخص جسے سنت (حدیث)، ایمان، علم، قرآن، فراغت، صحت اور امن وغیرہ کی دولت حاصل ہو۔ اسی لیے کہا گیا ہے۔

مَنْ شَاءَ عَيْشًا رَحِيْبًا يَسْتَطِيْلُ بِهِ فِي دِيْنِهِ ثُمَّ فِي دُنْيَاهُ إِقْبَالًا فَلْيَنْظُرَنَّ إِلَى مَنْ فَوْقَهُ وَرَعًا وَلْيَنْظُرَنَّ إِلَى مَنْ دُوْنَهُ مَالًا۔

جو شخص اپنی زندگی میں کشادگی چاہتا ہے جو دینی اور دنیوی اعتبار سے اس کی طرف متوجہ رہے اور دائمی ہو تو وہ تقویٰ میں اپنے سے اوپر والے کی طرف اور مال کے اعتبار سے نیچے والوں کی طرف دیکھے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مَنْ لَمْ يَسْتَغْنِ بِآيَاتِ اللهِ فَلَا أَغْنَاهُ اللهُ۔ (۲)

جو شخص اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ اپنے آپ کو غنی نہیں سمجھتا اللہ تعالیٰ اسے مالدار نہیں بناتا۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّ الْقُرْآنَ هُوَ الْغِنَى لَا غِنَى بَعْدَهُ وَلَا فَقْرَ مَعَهُ۔ (۳)

بے شک قرآن ہی مالداری ہے اس کے بعد مالداری نہیں اور اس کی موجودگی میں محتاجی نہیں۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

---

(۱) کنز العمال جلد ۳ ص ۲۲۱ حدیث ۶۲۸۴

(۲)

(۳) مجمع الزوائد جلد ۷ ص ۱۵۸ کتاب التفسیر

مَنْ اٰتَاہُ اللّٰہُ الْقُرْاٰنَ وَظَنَّ اَنَّ اَحَدًا اَغْنٰی مِنْہُ فَقَدِ اسْتَھْزَاءَ بِاٰیَاتِ اللّٰہِ۔ (۱)

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک (کا علم) عطا فرمایا پھر اس نے یہ خیال کیا کہ کوئی شخص اس سے زیادہ مالدار ہے تو بے شک اس نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق اڑایا۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَیْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ یَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ۔ (۲)

جو شخص قرآن پاک (کی دولت) سے اپنے آپ کو مالدار نہیں سمجھتا وہ ہم میں سے نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

کَفٰی بِالْیَقِیْنِ غِنًی۔ (۳)

مالداری کے لیے یقین کافی ہے۔

کسی بزرگ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی نازل کردہ کسی کتاب میں فرمایا اگر میں کسی بندے کو تین باتوں سے بے پرواہ کر دوں تو میں نے اس پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا۔ وہ بادشاہ کے پاس جانے کی حاجت نہ ہو، ڈاکٹر سے دوا لینے کی ضرورت نہ پڑے کسی دوسرے کے مال سے بے نیاز ہو جائے کسی شاعر نے اس کی یوں ترجمانی کی ہے۔

اِذَا مَا الْقُوْتُ یَاْتِیْکَ کَذَا الصِّحَّۃُ وَالْاَمْنُ
وَاَصْبَحْتَ اَخَا حُزْنٍ فَلَا فَارَقَکَ الْحُزْنُ۔

جب تمہیں رزق، امن اور صحت حاصل ہو پھر بھی تم غم کرو تو غم تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑے گا۔

بلکہ سیدھی اور واضح عبارات اور افصح کلمات اس ذات والا صفات کا کلام ہے جس نے حق کی ادائیگی کی یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ اَصْبَحَ اٰمِنًا فِیْ سِرْبِہٖ مُعَافًی فِیْ بَدَنِہٖ عِنْدَہٗ قُوْتُ یَوْمِہٖ فَکَاَنَّمَا حِیْزَتْ لَہُ الدُّنْیَا بِحَذَافِیْرِھَا۔ (۴)

جو شخص یوں صبح کرے قلبی سکون اور صحت بدن حاصل ہو ایک دن کی روزی اس کے پاس تو گویا دنیا اپنے تمام اطراف کے ساتھ اس کے پاس جمع ہو گئی۔

اگر تم لوگوں کے حالات میں غور و فکر کرو تم دیکھو گے کہ وہ ان تین باتوں کے علاوہ باتوں کا شکوہ کرتے اور پریشان ہوتے ہیں حالانکہ وہ چیزیں ان کے لیے وبال ہیں اور وہ تین نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے اور نہ اس ایمان پر شکر ادا کرتے ہیں جو

---

(۱) التاریخ الکبیر للبخاری جلد ۳ ص ۱۱۳ ترجمہ ۱۰۵۸

(۲) صحیح بخاری جلد دوم ۱۱۲۳ کتاب التوحید

(۳) مجمع الزوائد جلد ۱۰ ص ۲۰۸ کتاب الزھد

(۴) الترغیب والترھیب جلد ۲ اول ص ۵۹۰ کتاب الصدقات

ہمیشہ کی نعمتوں اور بہت بڑی بادشاہی تک پہنچنے کا وسیلہ ہے بلکہ سمجھدار آدمی کو چاہیے کہ وہ معرفت، یقین اور ایمان پر خوش ہو اور ہم تو ایسے علماء کو جانتے ہیں کہ اگر ان کو وہ مال نوکر چاکر اور مددگار دیئے جائیں جو مشرق سے مغرب تک کے بادشاہوں کے ماتحت ہیں اور کہا جائے کہ اپنے علم کے عوض یہ چیزیں لے لو بلکہ اپنے علم کے سویں حصہ (۱/۱۰۰) کے بدلے میں لے لو تو وہ نہیں لیں گے کیوں کہ ان کو یہ امید ہے کہ علم کی نعمت انہیں آخرت میں قرب خداوندی تک پہنچائے گی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جس چیز کی تم امید رکھتے ہو وہ تمہیں آخرت میں مکمل طور پر ملے گی لیکن یہ دنیوی لذات علم کی اس لذت کے بدلے لے لو جو تمہیں دنیا میں حاصل ہے اور جس پر تم خوش ہوتے ہو تو وہ نہیں لیں گے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ علم کی لذت دائمی ہے کبھی ختم نہ ہوگی باقی رہے گی چوری نہ ہوگی نہ غصب ہوگی نہ اس پر کوئی حسد کرے گا اور یہ نہایت صاف ہے اس میں کوئی گدلا پن نہیں ہے جب کہ دنیا کی تمام لذات ناقص ہیں گدلی ہیں تشویشناک ہیں ان کی توقع ان کے خوف کے برابر نہیں لذت، تکلیف کے مساوی اور خوشی غم کے برابر نہیں اب تک یہی صورت حال رہی ہے اور باقی زمانے میں بھی اسی طرح رہے گی۔ کیوں کہ دنیوی لذات صرف اس لیے پیدا کی گئیں کہ ناقص عقلیں ان کے دام میں پھنس جائیں اور دھوکہ کھائیں حتیٰ کہ جب وہ دھوکہ کھا لیتی ہیں اور ان کے جال میں پھنس جاتی ہیں تو وہ لذات انکار کرتی ہیں اور نزدیک نہیں آنے دیتیں جیسے کوئی حسینہ جمیلہ عورت کسی شہوت پرست مالدار نوجوان کے لئے بناؤ سنگھار کرتی ہے حتیٰ کہ جب اس کے دل کو قیدی بنا دیتی ہے تو اس کے قریب نہیں آتی اور پردہ کرتی ہے تو وہ مسلسل پریشانی اور غم کا شکار رہتا ہے اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ایک لحظہ اسے دیکھنے کی وجہ سے وہ شخص دھوکہ کھا گیا۔ اگر وہ عقل سے کام لیتا اور آنکھیں بند کر لیتا اور اس لذت کو حقیر جانتا تو ساری زندگی محفوظ رہتا۔

تو دنیا دار اس طرح دنیا کے جال اور رسیوں میں جکڑے جاتے ہیں اور یہ بات کہنا مناسب نہیں کہ دنیا سے اعراض کرنے والا اس سے صبر کی وجہ سے دکھوں کا شکار ہوتا ہے کیوں کہ دنیا کی طرف متوجہ ہونے والا بھی اس پہ صبر اور اس کی حفاظت کی وجہ سے دُکھ اٹھاتا ہے اسے حاصل کرنا اور پھر چوروں کو اس سے دُور کرنا بھی تو پریشانی کا باعث ہے حالانکہ اعراض کرنے والے کی پریشانی اُخروی لذت کی طرف لے جاتی ہے جب کہ اس کی طرف متوجہ ہونے والے کی پریشانی آخرت میں بھی پریشانی کا باعث ہے جو شخص دنیا سے اعراض کرتا ہے اسے یہ آیت پڑھنی چاہیئے۔

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ۔ (۱)

اور قوم کی تلاش میں سستی نہ کرو اگر تمہیں دُکھ پہنچا ہے تو تمہاری طرح ان کو بھی دُکھ پہنچا ہے جب کہ تم اللہ تعالیٰ سے اس چیز کی امید رکھتے ہیں جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں۔

تو لوگوں پر شکر کا دروازہ اس لیے بند ہو گیا کہ وہ ظاہری و باطنی اور خاص و عام قسم کی نعمتوں سے جاہل ہیں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورہ نساء آیت ۱۰۴

سوال :

تو ایسے غافل دلوں کا کیا علاج ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شعور حاصل کر کے شکر کریں۔

جواب :

سمجھدار دلوں کا علاج تو یہ ہے کہ جن عمومی نعمتوں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے وہ ان میں غور کریں لیکن غبی قسم کے دل جو صرف خاص نعمت کو ہی نعمت سمجھتے ہیں یا جب وہ مبتلا ہوتے ہیں تو ان کو سمجھ آتی ہے ان کے لیے راستہ یہ ہے کہ اپنے سے کم درجے کے لوگوں کو دیکھیں اور وہ کام کریں جو بعض صوفیاء کرام کرتے تھے۔ وہ بزرگ روزانہ ہسپتال اور قبرستان میں نیز ان مقامات پر جاتے جہاں مجرموں پر حدود نافذ کی جاتی تھیں ہسپتال میں اس لیے جاتے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی مختلف آزمائشوں کو دیکھیں پھر اپنی صحت و سلامتی کے بارے میں غور کریں تاکہ بیماریوں میں ابتلاء کو دیکھ کر دل کو صحت کی نعمت کا شعور حاصل ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور وہ ان لوگوں کے جنازے میں جاتے جن کو قتل کیا جاتا اعضاء کاٹے جاتے اور طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کئے جاتے تاکہ گناہوں اور ان سزاؤں سے محفوظ رہنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور امن کے حصول پر بھی شکر ادا کریں وہ قبرستان میں جاتے اور معلوم کرتے کہ فوت ہونے والوں کو سب سے زیادہ پسند یہ بات ہے کہ ان کو دوبارہ دنیا میں بھیج دیا جائے چاہے ایک دن کے لیے ہی ہو۔ اگر وہ گناہ گار ہے تو وہ گناہوں کا تدارک کرے اور اگر نیکوکار ہے تو عبادت اور نیکی میں اضافہ کرے کیوں کہ قیامت کا دن خسارے کا دن ہے اطاعت گزار کو خسارے کی صورت یہ ہے کہ جب وہ اپنی جزا دیکھتا ہے تو کہتا ہے میں اس سے زیادہ نیکیوں پر قادر تھا تو مجھے کتنا بڑا نقصان ہوا کہ میں نے وقت کا کچھ حصہ محض جائز کاموں پر خرچ کیا اور گناہ گار کا نقصان ظاہر ہے پس جب وہ قبرستان کو دیکھتے اور جان لیتے کہ ان (فوت شدہ لوگوں) کے نزدیک جو بات سب سے زیادہ پسندیدہ ہے وہ مجھے حاصل ہے کیوں کہ ابھی میری زندگی کے کچھ دن باقی ہیں تو وہ ان بقایا دنوں کو اس عمل پر خرچ کرتا ہے جس کے لیے اہل قبور واپسی کی خواہش رکھتے ہیں تاکہ اسے باقی عمر میں نعمتوں کی معرفت ہو بلکہ ایک ایک سانس کی مہلت بھی نعمت ہے پس جب وہ اس نعمت کو جان لے گا تو اس بات کا شکر ادا کرے گا کہ وہ زندگی کا باقی حصہ اس کام میں خرچ کرے جس کے لیے زندگی بنائی گئی ہے اور وہ دنیا سے آخرت کے لیے زاد راہ حاصل کرے۔

تو غافل دلوں کا علاج یہ ہے تاکہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شعور حاصل ہو اور ممکن ہے وہ شکر کریں حضرت ربیع ابن خیثم باوجود اس کے کہ صاحب بصیرت تھے اس طریقے سے مدد حاصل کرتے تھے تاکہ معرفت پکی ہو جائے انہوں نے اپنے گھر میں قبر کھود رکھی تھی اور اپنے گلے میں طوق ڈال کر اس قبر میں سو جاتے پھر کہتے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ نساء آیت ۱۰۴

رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا۔ (۱) اے میرے رب مجھے واپس لوٹا دے تاکہ میں نیک عمل کروں۔

پھر کھڑے ہوتے اور فرماتے اے ربیع! تمہیں وہ مل گیا جس کا تم نے سوال کیا تو اس سے پہلے کہ تم لوٹنے کا سوال کرو اور تمہیں واپس نہ کیا جائے، عمل کرو۔

وہ دل جو شکر سے دور رہتے ہیں ان کے علاج کے لیے مناسب ہے کہ اسے اس بات کی پہچان کرائی جائے کہ نعمت کا شکر ادا نہ کیا جائے تو وہ زائل ہو جاتی ہے اور واپس نہیں لوٹتی اسی لیے حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ فرماتے تھے۔

"تمہیں نعمتوں پر شکر ادا کرتے رہنا چاہیئے بہت کم نعمتیں ایسی ہیں جو کسی قوم سے زائل ہونے کے بعد دوبارہ ملی ہوں"

اور بعض بزرگوں نے فرمایا نعمتیں وحشی جانور کی طرح ہیں ان کو شکر کے ساتھ بیڑیاں ڈالو" اور حدیث شریف میں ہے۔

کسی بندے کو جتنی بڑی نعمت ملتی ہے اسی قدر لوگ اس کے زیادہ محتاج ہوتے ہیں تو جو آدمی اسے ہلکا جانے اس سے وہ نعمت زائل ہو جاتی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ۔ (۲) بے شک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود نہ بدلیں۔

یہ رکن مکمل ہوا۔

تیسرا رکن:

صبر و شکر کا باہمی تعلق و اشتراک

پہلا بیان:

صبر و شکر کا ایک چیز پر جمع ہونے کا سبب

شاید تم کہو کہ جن نعمتوں کا آپ نے ذکر کیا ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر موجود میں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مصیبت کا بالکل کوئی وجود نہیں تو صبر کا کیا مطلب ہوا؟ اور اگر مصیبت موجود ہے تو اس پر شکر کا کیا مطلب ہے؟ اور کچھ دعویٰ کرنے والوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہم تو مصیبت پر بھی شکر کرتے ہیں نعمت پر شکر کرنا

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ مومنون آیت ۹۹

(۲) قرآن مجید، سورۃ رعد آیت ۱۱

تو ایک طرف رہا تو مصیبت پر شکر کا کیا تصور ہوگا۔ اور جس بات پر صبر کرتا ہے اس پر شکر کیسے کرے گا اور مصیبت پر صبر دکھ اور درد کو چاہتا ہے جب کہ شکر خوشی کا داعی ہے اور یہ دونوں باتیں متضاد ہیں اور جو کچھ آپ نے ذکر کیا کہ ہر موجود میں اللہ تعالیٰ کی بندوں پر نعمت ہے اس کا کیا مطلب ہے؟

تو جان لو کہ مصیبت بھی موجود ہے جیسے نعمت موجود ہے اور نعمت کے اثبات کا قول مصیبت کو ثابت کرنے کے قول کو واجب کرتا ہے کیوں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں پس مصیبت کا نہ ہونا نعمت ہے اور نعمت کا نہ ہونا مصیبت ہے لیکن یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ نعمت دو قسموں میں تقسیم ہوتی ہے ایک وہ جو ہر اعتبار سے مطلقاً نعمت ہے آخرت میں اس کی صورت یہ ہے کہ بندے کو بارگاہ خداوندی میں حاضری کی سعادت حاصل ہوگی اور دنیا میں اس کی مثال ایمان، اچھے اخلاق اور وہ باتیں جو ان دونوں پر مددگار ہوتی ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جو مقید ہے یعنی ایک اعتبار سے نعمت ہے اور دوسری اعتبار سے مصیبت، جیسے مال جو ایک لحاظ سے دین کی اصلاح کرتا ہے اور کسی اعتبار سے اس کے فساد کا باعث ہوتا ہے۔

اسی طرح مصیبت بھی مطلق و مقید میں تقسیم ہوتی ہے آخرت کے حوالے سے مطلق یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے کچھ مدت یا ہمیشہ کے لیے دور رہے اور دنیا میں اس کی مثال کفر، نافرمانی اور بداخلاقی ہے اور یہ مطلق مصیبت تک پہنچاتی ہے مقید مصیبت کی مثال فقر، بیماری، خوف اور دیگر مختلف قسم کے مصائب ہیں جو دینی اعتبار سے نہیں بلکہ دنیوی اعتبار سے مصیبت ہیں۔

تو مطلق شکر، مطلق نعمت پر ہوتا ہے اور دنیا میں مطلق مصیبت پر بعض اوقات صبر کا حکم نہیں دیا جاتا کیوں کہ کفر مصیبت ہے لیکن اس پر صبر کا کوئی مطلق مطلب نہیں اور یہی حال گناہ اور نافرمانی کا ہے بلکہ کافر اور گناہ گار پر لازم ہے کہ کفر اور گناہ کو ترک کردیں ہاں بعض اوقات، کافر کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کافر ہے پس وہ اس بیمار کی طرح ہوتا ہے جسے کوئی درد نہیں ہوتا مثلاً غشی وغیرہ تو اسی پر صبر بھی نہیں ہوتا اور گناہ گار کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ گناہ گار ہے تو اس پر گناہ کو چھوڑنا لازم ہے بلکہ ہر وہ گناہ جسے انسان ترک کر سکتا ہے اس پر اسے صبر کا حکم نہیں دیا جاتا اگر ایک طویل پیاس کے باوجود آدمی پانی نہ پیئے اور اس کی تکلیف اور درد بہت زیادہ ہو جائے تو اسے اس پر صبر کا حکم نہیں دیا جاتا بلکہ اس درد کے ازالے کا حکم دیا جاتا ہے صبر تو اس تکلیف پر ہوتا ہے جسے آدمی زائل نہ کر سکے۔

تو نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں صبر اس مصیبت کی طرف نہیں لوٹتا جو مطلقاً مصیبت ہے بلکہ جائز ہے کہ وہ من وجہ نعمت ہو اسی اعتبار سے صبر اور شکر دونوں کی ذمہ داری یکجا ہو سکتی ہے مثلاً مالداری انسان کی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے حتیٰ کہ اس کے مال کی وجہ سے اس کا قصد کیا جاتا ہے اور اس کو نیز اس کی اولاد کو قتل کیا جاتا ہے اور صحت کا معاملہ بھی اسی طرح ہے تو ان دنیوی نعمتوں میں سے ہر نعمت مصیبت بھی بن سکتی ہے لیکن یہ اس شخص کے حوالے سے ہے اسی طرح ہر مصیبت نعمت بھی بن سکتی ہے لیکن یہ بھی اس آدمی کے حال کی طرف اضافت کرتے ہوئے ہوگی۔

تو کئی لوگ ایسے ہیں جن کی بھلائی فقر اور مرض کے اندر ہے اگر ان کا بدن صحیح اور مال زیادہ ہو تو وہ تکبر اور سرکشی کریں ارشاد خداوندی ہے:

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ۔ (۱)

اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے رزق کشادہ کر دے تو وہ زمین میں بغاوت کرنے لگیں۔

اور ارشاد فرمایا۔

كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى۔ (۲)

ہرگز نہیں بے شک انسان سرکشی کرتا ہے جب اپنے آپ کو مالدار دیکھتا ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَيَحْمِيْ عَبْدَهُ الْمُؤْمِنَ مِنَ الدُّنْيَا وَهُوَ يُحِبُّهٗ كَمَا يَحْمِيْ اَحَدُكُمْ مَرِيْضَهٗ۔ (۳)

بے شک اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو دنیا سے بچاتا ہے حالانکہ وہ اسے پسند کرتا ہے جیسا کہ تم میں سے کوئی ایک اپنے مریض کی حفاظت کرتا ہے۔

یہی حال بیوی، اولاد اور قریبی رشتہ داروں کا ہے۔

اور ہم نے ایمان اور اخلاق حسنہ کے علاوہ نعمتوں کی جو سولہ قسمیں بیان کی ہیں تو وہ بعض لوگوں کے حق میں مصیبت بھی ہو سکتی ہیں تو اس صورت میں ان نعمتوں کی ضد ان کے حق میں نعمت قرار پائے گی کیوں کہ یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ معرفت کمال اور نعمت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے لیکن بعض امور میں بندے کے لیے مصیبت ہوتی ہے اور اس کا نہ ہونا نعمت قرار پاتا ہے مثلاً انسان کا اپنی موت کے وقت سے لاعلم ہونا اس کے لیے نعمت ہے کیوں اگر اس کو اس بات کا علم ہو تو اس کی زندگی دوبھر ہو جائے اور غم بڑھ جائے اسی طرح لوگ جو اس کے بارے میں معلومات کو سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں ان باتوں سے ناواقفیت بھی اس کے حق میں نعمت ہے کیوں کہ پردہ اٹھنے اور اس کے ان باتوں پر مطلع ہونے کی صورت میں اس کا دکھ، کینہ، حسد اور انتقام میں مشغولیت بڑھ جائے اسی طرح دوسروں کی صفات مذمومہ سے اس کی جہالت بھی اس کے حق میں نعمت ہے کیوں کہ اگر وہ ان باتوں سے آگاہ ہو جائے تو ان سے بغض رکھے اور ان کو اذیت پہنچائے اور یہ اس پر دنیا اور آخرت میں وبال ہے بلکہ بعض اوقات دوسروں کی اچھی صفات سے لاعلمی بھی

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ شوریٰ آیت ۲۷

(۲) قرآن مجید، سورۃ العلق آیت ۶

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۴۲۷ مرویات محمود بن لبید

اس کے لیے نعمت قرار پاتی ہے کیوں کہ ہو سکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہو اور یہ اسے ایذا پہنچانے اور اس کی توہین کرنے پر مجبور ہو جائے اور اگر اسے ان صفات کا علم ہو اور اس کے باوجود اذیت پہنچائے تو یقیناً یہ بہت بڑا گناہ ہے جو شخص علم کے باوجود کسی نبی یا ولی کو اذیت پہنچائے اس میں اور اس شخص میں فرق ہے جو لاعلمی میں تکلیف پہنچاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے یہ بھی ایک نعمت ہے کہ اس نے قیامت کے معاملے لیلۃ القدر، یوم جمعہ کی قبولیت والی ساعت اور بعض کبیرہ گناہوں کو مخفی رکھا یہ اِخفاء نعمت ہے کیوں کہ اس لاعلمی کی وجہ سے طلب اور کوشش زیادہ ہوتی ہے۔

تو جہالت کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی یہ وجوہ ہیں تو علم کی صورت میں کیسا ہوگا؟ اور ہم نے جو یہ کہا ہے کہ ہر موجود میں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے تو یہ حق ہے اور یہ بات ہر آدمی کے حق میں پائی جاتی ہے محض گمان سے استثناء نہیں ہو سکتی مگر تکالیف کی استثناء ہو سکتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں میں پیدا کی ہیں یہ بھی بعض اوقات اس آدمی کے حق میں جسے (اس سے) تکلیف پہنچی ہے نعمت قرار پائی ہیں۔

اگرچہ اس جرم کرنے والے کے حق میں نعمت نہ ہو جیسے گناہ کے سبب سے حاصل ہونے والا درد مثلاً خود اپنا ہاتھ کاٹ لے اور اپنے چہرے کو گوندے تو وہ تکلیف بھی اٹھاتا ہے اور گناہ گار بھی ہوتا ہے کفار کا جہنم میں تکلیف اٹھانا بھی نعمت ہے لیکن دوسروں کے حق میں، اس کے اپنے حق میں نہیں کیوں کہ ایک قوم کے مصائب، دوسری قوم کے حق میں فوائد ہوتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ عذاب کو پیدا نہ کرتا اور اس میں ایک جماعت کو مبتلا نہ کرتا تو نعمت والوں کو نعمت کی قدر معلوم نہ ہوتی اور نہ ہی وہ نعمت پر زیادہ خوش ہوتے تو اہل جنت کی خوشی اس وقت دو چند ہوتی ہے جب وہ جہنمیوں کی تکالیف میں غور و فکر کرتے ہیں۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ دنیا والے سورج کی روشنی میں زیادہ خوش نہیں ہوتے حالانکہ ان کو اس کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس لیے کہ عام طور پر اس سے فائدہ حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح آسمانی زینت کی طرف دیکھ کر بھی وہ زیادہ خوش نہیں ہوتے حالانکہ وہ ہر اس باغ سے زیادہ خوبصورت ہے جس کے بنانے کے لیے وہ دنیا میں جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن چوں کہ آسمان کی زینت عام ہے اس لیے ان کو اس کا شعور نہیں اور اس کے سبب سے وہ خوش نہیں ہوتے۔

تو اب یہ بات صحیح قرار پائی جو ہم نے ذکر کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو بھی پیدا فرمایا اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور ہے اور اسی طرح ہر مخلوق نعمت ہے یا تو سب بندوں کے لیے یا بعض کے لیے تو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں مصیبت بھی نعمت ہے یا تو اس کے لیے جو اس میں مبتلا ہے یا دوسروں کے لیے لہٰذا ہر حالت کو نہ تو مطلقاً مصیبت کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی مطلقاً نعمت کہا جا سکتا ہے تو اس صورت میں صبر و شکر دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال:

یہ دونوں متضاد ہیں تو کس طرح جمع ہو سکتے ہیں کیوں کہ صبر غم پر اور شکر خوشی پر ہونا ہے؟

جواب:

جان لو کہ ایک چیز بعض وجوہ سے غمگین کرتی ہے اور بعض دوسری وجوہ سے خوشی کا باعث ہوتی ہے تو غم کے اعتبار سے صبر اور خوشی کے حوالے سے شکر ادا کرنا ہوتا ہے اور ہر فقر، بیماری، خوف اور دنیوی آفات میں پانچ امور ہیں عقل مند آدمی کو ان پر خوش ہونا اور شکر کرنا چاہیے۔

(۱) ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر مصیبت اور مرض کے بارے یہ سوچے کہ اس سے بڑی بیماری بھی ہے کیوں کہ اللہ تعالےٰ کی قدرت کے تحت جو کچھ داخل ہے اس کی کوئی انتہا نہیں اگر اللہ تعالیٰ ان کو بڑھا دے اور اضافہ کرے تو اسے کیا چیز روکے گی اور رکاوٹ بنے گی۔ پس اسے شکر کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے بڑی بیماری نہیں بھیجی۔

(۲) دوسری بات۔ یہ کہ ممکن ہے اس کی یہ مصیبت دنیوی ہو (دینی نہیں ہے) ایک شخص نے حضرت سہل رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ ایک چور میرے گھر میں داخل ہوا اور میرے گھر کا سارا سامان لے گیا آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اگر شیطان تمہارے دل میں داخل ہو کر تمہارے عقیدۂ توحید کو بگاڑ دیتا تو تم کیا کرتے؟

یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی دعا میں پناہ مانگتے ہوئے یوں عرض کیا۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتِيْ فِيْ دِيْنِيْ۔ یا اللہ! میرے دین میں کوئی مصیبت پیدا نہ کرنا۔

اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں جس آزمائش میں ڈالا گیا اس میں اللہ تعالیٰ کے مجھ پر چار انعام ہوئے ایک یہ کہ وہ مصیبت و آزمائش میرے دین میں نہ تھی دوسرا یہ کہ اسی مقدار پر ہوئی اس سے زیادہ نہ ہوئی تیسرا یہ کہ میں اس پر راضی ہونے کی دولت سے محروم نہ ہوا اور چوتھا یہ کہ مجھے ثواب کی امید ہے۔

کسی اہل دل کا ایک دوست تھا اسے بادشاہ نے قید کر دیا اس نے اپنے بزرگ دوست کو اطلاع کی اور شکوہ بھی کیا انہوں نے پیغام بھیجا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو پھر ایک مجوسی کو لا کر اس کے پاس قید کر دیا گیا جسے پیچش کی بیماری تھی اسے قید کر کے دونوں کو ایک ہی زنجیر ڈال دی گئی پھر اس نے پیغام بھیجا تو جواب ملا اللہ تعالیٰ کا شکر کرو مجوسی کو حاجت کے لیے کئی بار اٹھنا پڑتا اور اس کو مجبوراً ساتھ ہی اٹھنا پڑتا اور وہ اس کی قضائے حاجت تک اس کے سر پہ کھڑا رہتا پھر اس نے لکھا تو جواب ملا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر اس نے کہا کب تک؟ اس سے بڑی مصیبت کیا ہو سکتی ہے؟ بزرگ نے جواب دیا اگر وہ زنار جو اس مجوسی کی کمر میں ہے تمہاری کمر میں ہوتا تو تم کیا کرتے۔

تو جس انسان کو بھی جو مصیبت پہنچتی ہے اگر وہ اس میں اچھی طرح غور کرے کہ اس کو یہ مصیبت اپنے مولیٰ کی ظاہری یا باطنی طور پر کی گئی بے ادبی کی وجہ سے پہنچی ہے تو وہ اس بات کو سمجھے گا کہ وہ فوری طور پر یا مستقبل میں اس سے بھی بڑی مصیبت اور ابتلاء کا مستحق ہے اور جس نے تمہیں سو کوڑے مارنے ہوں اگر وہ دس کوڑے مارنے پر اکتفا کرے تو وہ شکر کا مستحق ہوتا ہے اور جس کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ دے لیکن وہ تمہارا ایک ہاتھ چھوڑ دے تو وہ بھی شکر کا مستحق ہے یہی وجہ ہے کہ ایک بزرگ ایک سڑک سے گزر رہے تھے تو ان کے سر پر راکھ کا ایک تھال گرا دیا گیا

تو وہ بارگاہ خداوندی میں سجدہ شکر بجا لائے پوچھا گیا کہ اس سجدے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا میں تو اس انتظار میں تھا کہ مجھ پر آگ ڈالی جائے گی تو صرف راکھ کا ڈالا نا نعمت ہے۔

کسی بزرگ سے کہا گیا کہ آپ نماز استسقاء کے لیے باہر نہیں جاتے کیوں کہ بارش بند ہوگئی ہے انہوں نے فرمایا تم سے تو بارش روکی گئی ہے مجھ سے تو پتھر روکے گئے ہیں۔

سوال:

میں کیسے خوش ہوں جب کہ ایک جماعت جن کے گناہ میرے گناہوں سے زیادہ ہیں اور ان کو وہ مصیبت نہیں پہنچی جو مجھے پہنچی ہے حتیٰ کہ کافر (جو منکر ہیں لیکن ان کو مصیبت نہیں پہنچی)

جواب:

کافر کے لیے تو بہت زیادہ مصائب پوشیدہ ہیں اسے مہلت اس لیے دی گئی ہے کہ اس کے گناہ زیادہ ہوں اور اس وجہ سے عذاب زیادہ دیا جائے۔ جیسے ارشاد خداوندی ہے۔

إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا۔ بے شک ہم ان کو مہلت دیتے ہیں تاکہ ان کے گناہوں میں اضافہ ہو۔ (۱)

جہاں تک گناہ گار کا تعلق ہے تو تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ دنیا میں کوئی تم سے بھی زیادہ گناہ گار ہے کئی دل اللہ تعالے اور اس کی صفات میں بے ادبی کی وجہ سے شراب نوشی، زنا کاری اور اعضاء کے ساتھ کئے گئے باقی گناہوں سے بھی بڑے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا۔

وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ عَظِيمٌ۔ اور تم اسے معمولی (گناہ) سمجھتے ہو جب کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ بہت بڑا گناہ ہے۔ (۲)

تو تمہیں کیسے معلوم ہو کہ دوسرے لوگ تم سے زیادہ گناہ گار نہیں، ہو سکتا ہے ان کی سزا آخرت تک مؤخر کر دی گئی ہو اور تمہیں دنیا میں ہی سزا دی جا رہی ہو تو تم اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر کیوں ادا نہیں کرتے۔

۳۔ تو شکر کے سلسلے میں یہ تیسری وجہ ہے یعنی ہو سکتا ہے کہ سزا کو آخرت تک مؤخر کر دیا گیا ہو اور دنیا کی سزا تو بعض اسباب تسلی سے آسان بھی ہو سکتی ہے لیکن آخرت کی مصیبت دائمی ہے اور اگر دائمی نہ بھی ہو تو بھی تسلی کے ذریعے اس کی تخفیف نہیں ہوگی کیوں کہ آخرت میں عذاب میں مبتلا لوگوں سے تسلی کے اسباب بالکل منقطع ہوں گے اور جس کو دنیا میں سزا دے دی گئی

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۱۷۸

(۲) قرآن مجید، سورۂ نور آیت ۱۵

اسے دوبارہ آخرت میں سزا نہیں دی جائے گی۔ کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ (۱)
بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے پھر اسے دنیا میں کوئی سختی یا مصیبت پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ سزا دینے سے بہت بے نیاز ہے۔

۴۔ مصیبت اور آزمائش لوح محفوظ میں مکتوب ہے اور اس کا پہنچنا ضروری ہے اور وہ پہنچ گئی اور فراغت ہو گئی اب اس کے بعض یا کل سے راحت حاصل ہو گئی اور یہ بھی نعمت ہے۔

۵۔ اس مصیبت کی نسبت اس کا ثواب زیادہ ہے کیوں کہ دینوی مصیبتیں دو وجہ سے آخرت کی طرف راستے ہیں ان میں سے ایک وجہ وہی ہے جس کی بنیاد پر مریض کے حق میں ناپسند دوا نعمت بن جاتی ہے اور بچے کے حق میں کھیلنے کے اسباب سے روکنا نعمت ہے کیوں کہ اگر اسے کھیلنے کی کھلی چھٹی دی جائے تو وہ علم وادب (کے حصول) کو چھوڑ دے گا تو یوں وہ عمر بھر خسارے میں رہے گا اسی طرح مال، اہل و اولاد، اقارب، اعضاء حتیٰ کہ آنکھ جو سب سے زیادہ معزز سمجھی جاتی ہے بعض اوقات یہ تمام چیزیں انسان کی ہلاکت کا باعث بنتی ہیں بلکہ عقل جو سب سے زیادہ قیمتی ہے بعض اوقات اس کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے چنانچہ ملحدین کل قیامت کے دن یہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ پاگل یا بچے ہوتے اور دین خداوندی میں اپنی عقلوں کو استعمال نہ کرتے۔

ان اسباب میں جو سبب بھی بندے کی طرف سے پایا جائے اس کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس میں اس کی دینی بھلائی ہو تو اس پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اچھا گمان رکھے اور اس میں بھلائی کا خیال کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے بے شک اللہ تعالیٰ کی حکمت وسیع ہے اور بندوں کی نسبت وہ ان کی بھلائی کو زیادہ جانتا ہے اور کل بروز قیامت جب لوگ مصیبتوں پر ملنے والے ثواب کو دیکھیں گے تو اس کا شکر ادا کریں گے، جس طرح بچہ عقل مند اور بالغ ہونے کے بعد اپنے استاذ اور باپ کے مارنے پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے ادب سکھایا کیوں کہ انہوں نے جو اس کی تربیت اور تادیب کی ہے اس کا پھل وہ اس وقت پاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش بھی تادیب ہے اور بہت بڑی عنایت ہے جب کہ ماں باپ کی طرف سے اولاد پر اس قدر عنایت نہیں ہو سکتی ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا مجھے کوئی نصیحت فرمائیں آپ نے فرمایا۔

لَا تَتَّهِمِ اللّٰهَ فِيْ شَيْءٍ قَضَاهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ۔ اللہ تعالیٰ نے تیرے بارے میں جو فیصلہ فرمایا اس پر اسے تہمت نہ لگا۔ (۲)

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۱۹۰، ابواب الحد

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۳۱۹ مرویات عبادہ بن صامت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرائے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا۔
میں مومن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر متعجب ہوں اگر وہ اس کے لیے آسانی کا فیصلہ فرمائے تو وہ راضی ہوتا ہے اور یہ اس کے لیے بہتر ہے اور اگر سختی کا فیصلہ کرے تو بھی راضی ہوتا ہے اور یہ اس کے لیے بہتر ہے دوسری وجہ۔ ہلاک کرنے والی خطاؤں کا منبع دنیا کی محبت ہے اور نجات کی بنیاد دھوکے والے گھر (دنیا) سے دل کے ساتھ الگ ہونا ہے اور اگر دنیا کی نعمتیں کسی ابتلاء اور مصیبت کے بغیر حاصل ہوں تو اس سے دل کا دنیا اور اس کے اسباب کی طرف میلان ہوگا اور وہ اس سے مانوس ہوگا حتی کہ دنیا اس کے حق میں جنت کی طرح ہو جائے گی اور موت کے وقت دنیا کو چھوڑنا اس کے لیے بہت بڑی مصیبت ہوگی لیکن جب اس پر مصائب زیادہ آئیں گے تو اس کا دل بے قرار ہو جائے گا نہ تو اس کے ذریعے اسے سکون ملے گا اور نہ ہی وہ اس سے مانوس ہوگا بلکہ دنیا اس کے لیے قید خانہ بن جائے گی اور اس سے نجات میں بہت زیادہ لذت ہوگی جس طرح قید خانے سے چھوٹنے میں ہوتی ہے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ۔ دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔

اور کافر وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے منہ پھیرتا ہے اور صرف دنیا کا ہی ارادہ کرتا ہے اسی پر راضی اور مطمئن ہوتا ہے اور مومن ہر وہ شخص ہے جس کا دل دنیا سے منقطع ہوتا ہے اور اس سے نکلنے کے لیے وہ بہت زیادہ روتا ہے اور کفر کا کچھ حصہ ظاہر ہے اور بعض پوشیدہ، اور دل میں جس قدر دنیوی محبت ہوتی ہے اسی کے مطابق اس میں شرک خفی سرایت کرتا ہے بلکہ موحّد مطلق تو وہ ہوتا ہے جو صرف واحد حق سے محبت کرتا ہے۔

تو اس اعتبار سے مصیبتوں میں بھی نعمتیں ہیں لہٰذا اس پر بھی خوش ہونا چاہیے جہاں تک درد کا تعلق ہے تو وہ ضروری ہے اور یہ اسی طرح ہے جیسے تمہیں پچھنے لگوانے کی ضرورت ہو اور مفت پچھنے لگانے والا مل جائے تو تم خوش ہوتے ہو یا کوئی شخص نفع بخش کڑوی دوائی مفت میں پلا دے تو اس سے تمہیں درد بھی ہوتا ہے اور تم خوش بھی ہوتے ہو بس تکلیف پر صبر کرتے ہو اور خوشی کے باعث شکر کرتے ہو تو دنیوی امور میں تمام مصیبتوں کی مثال وہ دوائی ہے جو فی الحال تکلیف دیتی ہے لیکن مستقبل میں نفع پہنچاتی ہے بلکہ جو شخص بادشاہ کا محل دیکھنے کے لئے اس کے اندر جاتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ وہاں سے لامحالہ نکلنا پڑے گا پھر وہ وہاں کسی خوبصورت (عورت) کو دیکھ لے جو اس کے ساتھ نکلنے والی نہیں تو یہ اس پر وبال اور مصیبت ہوگی کیوں کہ اس کی وجہ سے اسے مکان کے ساتھ انس پیدا ہو گیا جس میں اس کے لیے ٹھہرنا ممکن نہیں اور اگر اس کے دل میں یہ بات آ جائے کہ اگر بادشاہ کو معلوم ہو گیا تو وہ اسے سزا دے گا تو وہ اس خطرے کی جہت سے اس مقام سے نفرت کرے گا تو یہ اس کے لیے نعمت ہے اور دنیا بھی ایک مکان ہے اس میں لوگ رحم (عورت کا پیٹ) سے

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۴۰۷ کتاب الزہد

داخل ہونے اور قبر کے دروازے سے نکلنے ہیں تو جو چیز مکان سے اُنس کا باعث ہو وہ مصیبت ہے اور جو چیز ان کے دلوں کو اس مکان سے اچاٹ کر دے اور ان کے اُنس کو ختم کر دے وہ نعمت ہے اور جس شخص کو یہ بات معلوم ہو گئی اس سے مصیبتوں پر شکر کا تصور کیا جا سکتا ہے لیکن جو شخص اس بات کو نہیں سمجھا کہ ان مصیبتوں میں نعمتیں بھی ہیں اس سے شکر کا تصور نہیں ہو سکتا کیوں کہ شکر لازماً نعمت کی معرفت کے بعد ہوتا ہے اور جس آدمی کا اس بات پر ایمان ہو کہ مصیبت کے مقابلے میں اس کا ثواب، زیادہ ہوتا ہے اس سے مصیبت پر شکر متصور نہیں ہو سکتا منقول ہے کہ ایک دیہاتی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے والد کی وفات ایک تعزیتی قطعہ پیش کیا۔

اِصْبِرْ نَكُنْ بِكَ صَابِرِيْنَ فَاِنَّمَا صَبْرُ الرَّعِيَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّأْسِ خَيْرٌ مِنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُكَ بَعْدَهُ وَاللّٰهُ خَيْرٌ مِنْكَ لِلْعَبَّاسِ۔

صبر کیجئے تاکہ ہم بھی آپ کے ساتھ صبر کریں رعایا کا صبر سردار کے صبر کے بعد ہوتا ہے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بعد آپ کو ان سے بہتر اجر ملے گا اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے اللہ تعالیٰ آپ سے بہتر ہے۔

۞ ۞ ۞

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں مجھ سے اس شخص کی تعزیت سے بہتر کسی نے تعزیت نہیں کی۔ اور مصائب پر صبر کے بارے میں بے شمار احادیث آئی ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّصِبْ مِنْهُ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ جس کے لیے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِذَا وَجَّهْتُ اِلٰى عَبْدٍ مِنْ عَبِيْدِيْ مُصِيْبَةً فِيْ بَدَنِهٖ اَوْ مَالِهٖ اَوْ وَلَدِهٖ ثُمَّ اسْتَقْبَلَ ذٰلِكَ بِصَبْرٍ جَمِيْلٍ اسْتَحْيَيْتُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَنْ اَنْصُبَ لَهٗ مِيْزَانًا اَوْ اَنْشُرَ لَهٗ دِيْوَانًا۔ (۲)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جب میں اپنے بندوں میں سے کسی بندے کے بدن، مال یا اولاد کی طرف مصیبت کو متوجہ کرتا ہوں پھر وہ صبر جمیل کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہے تو قیامت کے دن مجھے حیا آئے گی کہ میں اس کے لیے میزان نصب کروں یا اس کے نامہ اعمال کو کھولوں۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

مَا مِنْ عَبْدٍ اُصِيْبَ بِمُصِيْبَةٍ فَقَالَ كَمَا اَمَرَهُ

جس شخص کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے پھر وہ اللہ تعالیٰ کے

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۸۴۳ کتاب المرضیٰ

(۲) الفردوس بماثور الخطاب جلد ۳ ص ۱۷۲ حدیث ۴۴۵۹

اللہ تعالیٰ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) اَللّٰھُمَّ اٰجُرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَاَعْقِبْنِیْ خَیْرًا مِّنْھَا اِلَّا فَعَلَ اللّٰہُ ذٰلِکَ بِہٖ۔

حکم کے مطابق یوں کہتا ہے" اناللہ وانا الیہ راجعون" (بے شک ہم اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور ہم نے اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے) یا اللہ اس مصیبت کا مجھے اجر عطا فرما اور اس کے بعد مجھے بہتر عطا فرما تو اللہ تعالیٰ اس کی خواہش کو پورا فرماتا ہے۔

(۱)

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی مَنْ سَلَبْتُ کَرِیْمَتَیْہِ فَجَزَاؤُہٗ الْخُلُوْدُ فِیْ دَارِیْ وَالنَّظَرُ اِلٰی وَجْھِیْ۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں جس کی دو کریم چیزیں (آنکھیں) لے لیتا ہوں تو اس کی جزا میرے گھر میں ہمیشہ رہنا اور میری زیارت کرنا ہے۔

(۲)

ایک روایت میں ہے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے مال چلا گیا اور میں بیمار ہوں آپ نے فرمایا۔

لَا خَیْرَ فِیْ عَبْدٍ لَا یَذْھَبُ مَالُہٗ وَلَا یَسْقَمُ جِسْمُہٗ اِنَّ اللّٰہَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا اِبْتَلَاہُ وَاِذَا ابْتَلَاہُ صَبَّرَہٗ۔

اس بندے میں کوئی بھلائی نہیں جس کا مال نہ جائے اور وہ بیمار نہ ہو بے شک اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت فرماتا ہے تو اسے آزمائش میں ڈالتا ہے اور جب اسے آزماتا ہے تو صبر کی توفیق دیتا ہے۔

(۳)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ الرَّجُلَ لَتَکُوْنُ لَہُ الدَّرَجَۃُ عِنْدَ اللّٰہِ تَعَالٰی لَا یَبْلُغُھَا بِعَمَلٍ حَتّٰی یُبْتَلٰی بِبَلَاءٍ فِیْ جِسْمِہٖ فَیَبْلُغُھَا بِذٰلِکَ۔

بے شک ایک شخص کا اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک درجہ ہوتا ہے اور وہ اپنے عمل کے ذریعے وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تو اس کو جسمانی طور پر آزمائش میں ڈال دیا جاتا ہے تو وہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے۔

(۴)

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے کعبۃ اللہ کے سائے میں اپنی چادر مبارک سے تکیہ لگا رکھا تھا ہم نے آپ کی خدمت میں کوئی شکایت پیش کی اور عرض کیا آپ

---

(۱) کنز العمال جلد ۳ ص ۳۰۲ حدیث ۶۶۴۹

(۲) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۲ ص ۳۰۲ حدیث ۲۲۶۳

(۳) کنز العمال جلد ۱۱ ص ۱۰۱ حدیث ۳۰۷۹۳ (کچھ تبدیلی کے ساتھ)

(۴) المطالب العالیہ جلد ۲ ص ۳۲۷ حدیث ۲۴۱۴

اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے مدد کی دعا کیوں نہیں فرماتے؟ یہ سن کر آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور آپ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے پھر فرمایا۔

"تم سے پہلے زمانے میں ایک شخص کو لایا جاتا اور اس کے لیے ایک گڑھا کھودا جاتا پھر ایک آرا لا کر اس کے سر پہ رکھا جاتا اور اسے دو ٹکڑے کر دیا جاتا لیکن یہ تکلیف اسے اس کے دین سے نہ پھیرتی (۱)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں جس شخص کو بادشاہ ظلم کے طور پر قید کر دے اور وہ مر جائے تو وہ شہید ہے اور اگر وہ اس کے مارنے سے مر جائے تو بھی شہید ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کی بزرگی اور اس کے حق کی معرفت کا تقاضا یہ ہے کہ تو اپنی تکلیف کی شکایت نہ کر اور نہ ہی اپنی مصیبت کا تذکرہ کر۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تمہیں موت کے لیے پیدا کیا جاتا ہے اور تم عمارات برباد ہونے کے لیے بناتے ہو تم اس چیز کی حرص کرتے ہو جو فنا ہو جائے گی اور جو کچھ باقی رہنے والا ہے اسے چھوڑ دیتے ہو سنو! تین ناپسندیدہ چیزیں کتنی ہی اچھی ہیں فقر، بیماری اور موت۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اور اسے پاک کرنا چاہتا ہے تو اس پر مصیبتیں ڈال دیتا ہے اور حوادث میں مبتلا کر دیتا ہے پھر جب وہ دعا کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں یہ تو جانی پہچانی آواز ہے اور اگر وہ دوبارہ دعا کرے اور کہے اے میرے رب! تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے! میں موجود ہوں تو جس چیز کا سوال کرے گا عطا کروں گا اور اگر کوئی اچھی چیز تجھ سے دور رکھوں گا تو اس سے افضل چیز اپنے پاس تیرے لیے ذخیرہ کروں گا۔ پھر جب قیامت کا دن ہو گا تو عمل والوں کو لا کر میزان کے ساتھ ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا وہ نمازی ہوں روزے دار ہوں صدقہ کرنے والے یا حج کرنے والے ہوں۔ پھر ان لوگوں کو لایا جائے گا جو آزمائشوں میں مبتلا ہوئے تو ان کے لیے نہ تو میزان قائم کیا جائے گا اور نہ ہی ان کا نامۂ اعمال کھولا جائے گا ان پر اجر اس طرح انڈیلا جائے گا جیسے ان پر مصیبتیں ڈالی جاتی تھیں یہ دیکھ کر وہ لوگ جن کو دنیا میں عافیت رہی اس بات کی تمنا کریں گے کہ کاش (دنیا میں) ان کے جسموں کو قینچیوں سے کاٹا جاتا ہے وہ مصیبت والوں کو اجر دیے جاتے ہوئے دیکھ کر یہ خواہش کریں گے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۔ (۲) بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بغیر حساب کے دیا جائے گا۔

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۴ ص ۶۲ حدیث ۳۶۲۰

(۲) الدر المنثور جلد ۵ ص ۳۲۳ تحت آیت انما یوفی الصابرون

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ایک نبی علیہ السلام نے اپنے رب کی بارگاہ میں شکایت کرتے ہوئے عرض کیا اے میرے رب! مومن بندہ تیری فرمانبرداری کرتا ہے اور تیری نافرمانی سے بچتا ہے (لیکن) تو اس سے دنیا لپیٹ لیتا ہے اور اس کو آزمائشوں میں ڈالتا ہے اور کافر تیری فرمانبرداری نہیں کرتا بلکہ تجھ پر اور تیری نافرمانی پر جرأت کرتا ہے لیکن تو اس سے مصیبت کو دور رکھتا اور اس کے لیے دنیا کشادہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ بندے بھی میرے ہیں اور مصیبت بھی میرے اختیار میں ہے اور سب میری حمد کے ساتھ میری تسبیح کرتے ہیں مومن کے ذمہ گناہ ہوتے ہیں تو میں اس سے دنیا کو دور کر کے اسے آزمائش میں ڈالتا ہوں تو یہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے حتیٰ کہ وہ مجھ سے ملاقات کرے گا تو میں اسے نیکیوں کا بدلہ دوں گا اور کافر کی (دنیوی اعتبار سے) کچھ نیکیاں ہوتی ہیں تو میں اس کے لیے رزق کشادہ کرتا ہوں اور مصیبت کو اس سے دور رکھتا ہوں تو اس کی نیکیوں کا بدلہ دنیا میں ہی دے دیتا ہوں حتیٰ کہ جب وہ مجھ سے ملاقات کرے گا تو میں اس کے گناہوں کی سزا دوں گا۔

ایک روایت میں ہے جب یہ آیت نازل ہوئی۔

مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ۔ (۱) جو شخص برا عمل کرتا ہے اسے اس کا بدلہ دیا جائے گا۔

تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا اس آیت کے بعد کیسی خوشی؟

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اے ابوبکر! اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے کیا تم بیمار نہ ہو گے کیا تمہیں کوئی اذیت نہیں پہنچے گی کیا تم غمگین نہ ہو گے تو یہی تمہارا بدلہ ہے۔ (۲)

مطلب یہ ہے کہ یہ سب تکالیف جو تمہیں پہنچتی ہیں تمہارے گناہوں کا کفارہ ہیں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا۔

"جب تم کسی آدمی کو دیکھو کہ اللہ تعالیٰ اسے عطا فرماتا ہے حالانکہ وہ اپنے گناہ پر قائم ہوتا ہے تو جان لو کہ یہ مہلت ہے پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِہٖ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ۔ (۳) پس جب انہوں نے اس چیز کو بھلا دیا (چھوڑ دیا) جس کی ان کو نصیحت کی گئی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ نساء آیت ۱۲۳

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۱۱ مرویات ابی بکر

(۳) قرآن مجید، سورۂ انعام آیت ۴۴

یعنی جب انہوں نے ہمارے حکم پر عمل کو ترک کر دیا تو ہم نے ان پر بھلائی کے دروازے کھول دیئے۔ (۱)

حَتّٰىٓ اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا ۔ یہاں تک کہ جب وہ اس چیز پر خوش ہوئے جوان کو دی گئی۔ (۲)

اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً ۔ (تو) ہم نے ان کو اچانک پکڑا۔ (۳)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک صحابی نے ایک عورت کو دیکھا جسے وہ دور جاہلیت سے جانتے تھے انہوں نے اس سے کلام کیا پھر اسے چھوڑ دیا لیکن چلتے ہوئے اسے مڑ مڑ کر دیکھتے تھے اسی دوران سامنے ایک دیوار سے ٹکرائے اور چہرے پر نشان پڑ گیا وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ عرض کیا تو آپ نے فرمایا۔

اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا عَجَّلَ لَهٗ عُقُوْبَةَ ذَنْبِهٖ فِي الدُّنْيَا ۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے گناہ کی سزا اسے دنیا ہی میں فوری طور پر دے دیتا ہے۔ (۴)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا میں تمہیں قرآن پاک کی وہ آیت نہ بتاؤں جو بہت زیادہ امید دلاتی ہے پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْ عَنْ كَثِيْرٍ ۔ اور تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے اور وہ بہت کچھ معاف کر دیتا ہے۔ (۵)

تو دنیا میں پہنچنے والی مصیبتیں گناہوں کی وجہ سے ہوتی ہیں جب اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں عذاب دیتا ہے تو وہ اسے دوبارہ عذاب دینے سے بے نیاز ہے اور اگر اسے دنیا میں معاف کر دے تو قیامت کے دن عذاب دینا اس کے کرم کا تقاضا نہیں ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندہ دو گھونٹوں سے زیادہ پسندیدہ گھونٹ نہیں پیتا غصے کا گھونٹ جسے وہ بردباری سے رد کرتا ہے اور مصیبت کا گھونٹ جسے وہ صبر کے ساتھ پی جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قطرہ خون کے اس قطرے سے زیادہ پسند نہیں جو اللہ تعالیٰ کے

---

(۱) شعب الایمان جلد ۴ ص ۱۲۸ حدیث ۴۵۴۰

(۲،۳) قرآن مجید، سورۃ انعام آیت ۴۴

(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۸۷ مرویات عبداللہ بن مغفل

(۵) قرآن مجید، سورۃ شوریٰ آیت ۳۰

راستے میں بہایا جاتا ہے یا رات کے اندھیرے میں حالتِ سجدہ میں نکلنے والا آنسو کا قطرہ جسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں دیکھتا اور بندہ جو قدم اٹھاتا ہے اللہ تعالیٰ کو ان میں سے دو قدموں سے زیادہ کوئی قدم پسند نہیں ہے ایک فرض نماز کی طرف جانے کے لیے اٹھنے والا قدم اور دوسرا صلہ رحمی کے لیے اٹھنے والا قدم۔ (۱)

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کا ایک بیٹا فوت ہو گیا اس سے آپ کو سخت پریشانی ہوئی تو دو فرشتے حاضر ہوئے اور آپ کے سامنے مدعی، مدعی علیہ کی صورت میں دو زانو ہو کر بیٹھ گئے ان میں سے ایک نے کہا میں نے بیج ڈالا جب کھیتی تیار ہو گئی تو اس نے اسے خراب کر دیا آپ نے دوسرے شخص سے پوچھا تم کیا کہتے ہو؟ اس نے کہا میں راستے پر چلا تو ایک کھیتی کے پاس آیا میں نے دائیں بائیں دیکھا تو وہ کھیتی راستے پر ہی تھی حضرت سلیمان علیہ السلام نے پوچھا تم نے راستے میں بیج کیوں بویا؟ تمہیں معلوم نہیں کہ لوگوں کے لیے راستہ ضروری ہوتا ہے اس نے کہا آپ اپنے بیٹے کی جدائی پر کیوں غمگین ہیں آپ نہیں جانتے کہ موت آخرت کا راستہ ہے؟ تو یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے رب کے حضور توبہ کی اور اس کے بعد بیٹے کی وفات پر افسوس کا اظہار نہ کیا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ اپنے مریض صاحبزادے کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا اے بیٹے! اگر تم میرے ترازو میں ہو تو مجھے یہ بات اس سے زیادہ پسند ہے کہ میں تمہارے ترازو میں ہوں بیٹے نے عرض کیا ابا جان! جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ مجھے اس بات سے زیادہ پسند ہے جو میں چاہتا ہوں۔ (یعنی تمہاری وفات پر میں صبر کروں تو اچھا ہے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ان کی ایک صاحبزادی کی وفات کی خبر ان کو دی گئی تو انہوں نے "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھنے کے بعد فرمایا اللہ تعالیٰ نے ایک قابلِ ستر کو ڈھانپ دیا اور ایک مشقت تھی اسے دور کر دیا اور ثواب پہنچایا۔ پھر اتر کر دو رکعتیں پڑھیں اور فرمایا ہم نے اللہ تعالیٰ کے امر کو ضائع کر دیا ارشاد خداوندی ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔ (۲) اور صبر و نماز کے ذریعے مدد طلب کرو۔

حضرت ابن مبارک رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ان کے ایک صاحبزادے کا انتقال ہو گیا تو ایک مجوسی جو آپ کو جانتا تھا تعزیت کرتے ہوئے کہنے لگا عقل مند آدمی کو آج وہ کام کرنا چاہیے جو جاہل شخص پانچ دن بعد کرتا ہے حضرت ابن مبارک رحمہ اللہ نے فرمایا اس سے یہ بات لکھ لو۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو آزمائش کے بعد آزمائش میں ڈالتا ہے حتیٰ کہ وہ زمین پر یوں چلتا ہے کہ اس کے ذمہ کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۱۲۸ مرویات ابن عمر

(۲) قرآن مجید، سورۃ بقرہ آیت ۴۵

حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو آزمائش میں ڈالتا رہتا ہے جس طرح آدمی اپنے گھر والوں سے اچھا سلوک کرتا رہتا ہے۔

حضرت حاتم اصم رحمہ اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن چار قسم کے لوگوں کے خلاف چار آدمیوں سے استدلال کرے گا مال دار لوگوں کے خلاف حضرت سلیمان علیہ السلام سے، فقراء کے خلاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے، غلاموں پر حضرت یوسف علیہ السلام سے اور بیماروں پر حضرت ایوب علیہ السلام سے ـــ (مطلب یہ ہے کہ تم نے ان لوگوں کی راہ کیوں نہیں اپنائی)

ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل کے کفار لوگوں سے بھاگ کر ایک درخت میں چھپ گئے تو ان کو معلوم ہو گیا اور وہ ایک آرا لے کر آئے اور درخت کو پھاڑ دیا حتی کہ آرا حضرت زکریا علیہ السلام کے سر مبارک تک پہنچ گیا تو آپ نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ اے زکریا علیہ السلام اگر آپ نے دوبارہ آہ نکالی تو میں نبوت کے رجسٹر سے آپ کا نام نکال دوں گا تو حضرت زکریا علیہ السلام نے صبر اختیار کیا حتی کہ آپ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔

حضرت ابو مسعود بلخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس شخص کو مصیبت پہنچے اور وہ کپڑے پھاڑے یا سینہ پیٹے تو گویا وہ نیزہ لے کر اللہ تعالیٰ سے لڑنے کے لیے تیار ہوا۔

حضرت لقمان حکیم رحمہ اللہ نے اپنے بیٹے سے فرمایا اے بیٹے! سونے کا امتحان آگ کے ذریعے ہوتا ہے اور نیک بندے کی آزمائش مصائب کے ذریعے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو پسند کرتا ہے تو ان کو آزمائش میں ڈال دیتا ہے جو راضی ہو اس کے لیے رضا ہے اور جو اس پر ناراض ہوا اس کے لیے ناراضگی ہے۔

حضرت احنف بن قیس فرماتے ہیں ایک دن میری داڑھ میں درد ہوا تو میں نے اپنے چچا سے کہا میں داڑھ کے درد کی وجہ سے گذشتہ رات سو نہیں سکا حتی کہ میں نے یہ بات تین بار کہی تو میرے چچا نے کہا تم نے ایک رات میں درد کی اتنی زیادہ شکایت کردی میری آنکھ تیس برس ہو گئے ضائع ہو گئی لیکن اس کا کسی کو علم نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی (ارشاد فرمایا) جب آپ پر کوئی مصیبت نازل ہو تو میری مخلوق سے شکایت نہ کرنا مجھ سے شکایت کرنا جیسے آپ کی خطائیں میرے پاس آتی ہیں تو میں آپ کی شکایت فرشتوں سے نہیں کرتا۔

(لغزش اور خلافِ اولیٰ بات مراد ہے انبیاء کرام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں ۱۲ ہزاروی)

فصل ۲

مصیبت پر نعمت کی فضیلت

شاید تم کہو کہ ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں نعمتوں کے مقابلے میں مصیبتیں زیادہ بہتر ہیں تو کیا ہم اللہ تعالے سے مصیبتوں کا سوال کر سکتے ہیں؟ تو میں (امام غزالی) کہتا ہوں اس سوال کی کوئی وجہ نہیں ہے کیوں کہ حدیث شریف میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ اپنی دعا میں دنیا اور آخرت کی مصیبتوں سے پناہ مانگا کرتے تھے۔(۱)

آپ اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام یوں عرض کرتے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ (۲)

اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کرنا اور ہمیں جہنم کے عذاب سے بچانا۔

اور انبیاء کرام علیہم السلام مصیبت پر دشمنوں کی خوشی وغیرہ سے پناہ مانگا کرتے تھے (۳)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے یوں دعا مانگی اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الصَّبْرَ (یا اللہ! میں تجھ سے صبر کا سوال کرتا ہوں) تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَقَدْ سَاَلْتَ اللّٰہَ الْبَلَاءَ فَاسْئَلْہُ الْعَافِیَۃَ۔ (۴)

آپ نے اللہ تعالیٰ سے مصیبت کا سوال کیا ہے پس اس سے عافیت کا سوال بھی کریں۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا۔

سَلُوا اللّٰہَ الْعَافِیَۃَ فَمَا اُعْطِیَ اَحَدٌ اَفْضَلَ مِنَ الْعَافِیَۃِ اِلَّا الْیَقِیْنَ۔ (۵)

اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کرو کسی شخص کو یقین کے علاوہ عافیت سے افضل چیز نہیں دی گئی۔

اور یقین سے آپ نے اس عافیت کی طرف اشارہ فرمایا جو جہالت اور شک کی بیماری سے دل کو حاصل ہوتی ہے

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۱۴۴ مرویات عائشہ

(۲) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۲۰۱ / صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۴۹ کتاب التفسیر

(۳) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۷۰ کتاب القدر

(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۸۳ مرویات علی المرتضیٰ

(۵) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۸ مرویات ابی بکر

تو دل کی عافیت بدن کی عافیت سے اعلیٰ ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا وہ خیر جو شر سے خالی ہے وہ شکر کے ساتھ عافیت ہے کتنے ہی انعام یافتہ لوگ شکر نہیں کرتے۔

حضرت مطرف بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے عافیت حاصل ہو اور میں شکر کروں یہ بات مجھے اس بات سے زیادہ پسند ہے کہ میں مصیبت میں مبتلا ہو کر صبر کروں۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں فرمایا یا اللہ تیری طرف سے ملنے والی عافیت مجھے زیادہ پسند ہے (۱)

یہ بات دلیل و استشہاد کی محتاج نہیں ہے کیوں کہ مصیبت دو اعتبار سے نعمت بنتی ہے ان میں سے ایک بات اس کا اپنے سے بڑی مصیبت کی طرف اضافت سے چاہے دنیا میں ہو یا دین کے حوالے سے، اور دوسری وجہ ثواب کی امید کی طرف نسبت ہے تو آدمی کو چاہیے کہ دنیا میں پوری نعمت مانگے اور اس مصیبت سے زائد کو دور کرنے کا سوال کرے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت پر شکر کے آخروی ثواب کا سوال کرے کیوں کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ شکر پر وہ کچھ عطا فرمائے جو صبر پر نہ دے۔

سوال :۔

بعض بزرگوں نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ جہنم کے اوپر پل بنوں اور لوگ مجھ سے گزر کر پار ہو جائیں اور نجات پائیں اور میں جہنم میں چلا جاؤں اور حضرت سمنون رحمہ اللہ نے فرمایا۔

وَلَیْسَ لِیْ فِیْ سِوَاکَ حَظٌّ فَکَیْفَمَا شِئْتَ فَاخْتَبِرْنِیْ۔

میرے لیے تیرے غیر میں کوئی حصہ نہیں پس تو جس طرح چاہے مجھے آزمالے تو ان لوگوں کی طرف سے یہ آزمائش کا سوال ہے۔

جواب :۔

منقول ہے کہ اس شعر کے بعد حضرت سمنون محب رحمہ اللہ نفس کی بیماری میں مبتلا ہو گئے اور اس کے بعد وہ مکتبوں کے دروازوں پر جاتے اور بچوں سے کہتے اپنے جھوٹے چچا کے لیے دعا کیا کرو۔

جہاں تک انسان کی اس چاہت کا تعلق ہے کہ صرف وہی جہنم میں ہو دوسرا کوئی نہ ہو تو یہ ممکن نہیں لیکن بعض اوقات محبت دل پر غالب آجاتی ہے حتیٰ کہ محب اپنے آپ کو اس قسم کا سمجھتا ہے جو شخص محبت کا پیالہ پیتا ہے وہ نشے میں ہوتا ہے اور جو نشے میں ہو وہ بہت زیادہ باتیں کرتا ہے اور اس کا نشہ زائل ہو جائے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اس پر غالب تھا اس کی کوئی حقیقت نہیں اور جو کچھ تم نے اس سلسلے میں سنا وہ عشاق لوگوں کا کلام ہے جو محبت میں بڑھے ہوئے ہیں اور عشاق کے کلام سے کانوں کو لذت حاصل ہوتی ہے لیکن قابل اعتبار نہیں ہوتا۔

جیسے ایک حکایت میں ہے کہ ایک فاختہ کا نر اس کے قریب ہونا چاہتا تھا لیکن وہ اس کو روکتی تھی اس نے پوچھا تمہیں مجھ سے کس نے روکا؟ اگر تو چاہے کہ میں تیرے لیے دونوں جہانوں کو سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے ساتھ اُلٹ دوں تو تیرے لیے یہ کام بھی کر ڈالوں گا حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ بات سنی تو اس کو بلا کر جھاڑ پلائی اس نے کہا اے اللہ کے نبی! عاشقوں کے کلام کو بیان نہیں کیا جاتا جیسے کسی شاعر نے کہا۔

اُرِیْدُ وِصَالَہٗ وَیُرِیْدُ ھِجْرِیْ
فَاَتْرُکُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

میں اس کے وصال کا ارادہ کرتا ہوں اور وہ مجھے چھوڑنا چاہتا ہے تو میں اس کے ارادے کی خاطر اپنا ارادہ ترک کرتا ہوں۔

اور یہ بھی محال ہے مطلب یہ ہے کہ میں اس بات کا ارادہ کرتا ہوں جس کا وہ ارادہ نہیں کرتا کیوں کہ جو آدمی وصال کا ارادہ کرے وہ ھجر و فراق کا ارادہ نہیں کرتا تو اس نے اس ہجر کا ارادہ کیسے کیا جس کا اس نے ارادہ کیا ہی نہیں تھا دو تاویلوں کے ساتھ اس کلام کی تصدیق کی جا سکتی ہے ایک تو یہ کہ یہ بعضِ احوال کی بات ہے تاکہ اس کی رضا حاصل ہو جس کے واسطے سے مستقبل میں وصال کی مراد تک پہنچتا ہے تو فراق، رضا کا وسیلہ ہے اور رضا وصالِ محبوب کا وسیلہ ہے اور محبوب کی طرف وسیلہ بھی محبوب ہوتا ہے۔

اس کی مثال مال سے محبت کرنے والے کی مثل ہے جب وہ ایک درھم کے بدلے دو درھموں کی بیع سلم کرتا ہے تو وہ دو درھموں کی محبت میں ایک درھم فی الحال چھوڑ دیتا ہے (بیع سلم میں رقم پہلے دیتے ہیں اور سودا ادھار ہوتا ہے)

اس کلام کی تصدیق کے لیے دوسری تاویل یہ ہے کہ اس کے نزدیک محبوب کی رضا صرف اس لیے مطلوب ہے کہ وہ اس کی رضا ہے اور اس کو محبوب کی رضا کے شعور سے لذت حاصل ہوتی ہے اور ناپسندیدگی کے باوجود جب اس کا مشاہدہ کرتا ہے تو لذت بڑھ جاتی ہے تو اس وقت یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس میں پائی جانے والی رضا کا ارادہ کر رہا ہو یہی وجہ ہے کہ بعض محبت کرنے والوں کی حالت یہاں تک پہنچی کہ وہ آزمائش سے لطف اندوز ہوتے ہیں جب انہیں پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں راضی ہے اور یہ لذت اس عافیت سے زیادہ ہوتی ہے جو رضا کے شعور کے بغیر ہوتی ہے اور یہ لوگ جب ابتلاء و آزمائش میں راضی رہنے پر قادر ہوں تو ان کے نزدیک عافیت سے یہ آزمائش زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے۔

تو محبت کے غلبہ کی صورت میں اس حالت کا وقوع کوئی بعید بات نہیں ہے لیکن یہ باقی نہیں رہتی اور اگر دائم رہے تو کیا یہ حالتِ صحیحہ ہے یا یہ ایسی حالت ہے جس کا تقاضا ایک دوسری حالت کرتی ہے جو دل پر وارد ہوتی ہے اور اس وجہ سے دل راہِ اعتدال سے دور ہو جاتا ہے؟ تو یہ بات محلِ غور ہے اور اس کی تحقیق کا ذکر ہمارے موضوع کے مناسب نہیں ہے اور گزشتہ بحث سے ظاہر ہوا کہ عافیت، مصیبت سے بہتر ہے ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ تمام مخلوق

کو دنیا اور آخرت میں عفو و عافیت عطا فرمائے ہمیں بھی اور تمام مسلمانوں کو بھی۔

فصل ۳

صبر اور شکر میں سے افضل کیا ہے

اس سلسلے میں اہل علم کا اختلاف ہے بعض نے کہا کہ صبر، شکر سے افضل ہے اور دوسرے حضرات نے فرمایا شکر افضل ہے کچھ دوسرے حضرات نے کہا کہ دونوں برابر ہیں بعض دوسرے حضرات نے فرمایا کہ احوال کے اختلاف سے حکم میں اختلاف ہوتا ہے اور ہر فریق کے استدلال میں اضطراب ہے جو حصول مقصد سے بعید ہے۔ ان سب باتوں کو نقل کر کے کلام کو طویل کرنا لبے مقصد ہے بلکہ اظہار کی طرف جلدی کرنا ہی بہتر ہے تو ہم کہتے ہیں اس کے بیان میں دو مقام ہیں۔

پہلا مقام:

تساہل کے طریقے پر بیان کرنا یعنی ظاہری امر کو دیکھنا اور حقیقت کی تلاش نہ کرنا۔ اور یہ وہ بیان ہے جس سے عوام کو خطاب کرنا مناسب ہے کیوں کہ وہ حقیقت کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے اور یہ وہ فن کلام ہے جس پر واعظوں کو اعتماد کرنا چاہیئے کیوں کہ عوام کو خطاب سے ان کے کلام کا مقصد ان کی اصلاح کرنا ہے۔ اور شفقت کرنے والی دایہ کے لیے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ بچے کو موٹے موٹے پرندے اور میٹھی چیزیں کھلا کر اس کی اصلاح کرے بلکہ وہ اسے نہایت لطیف دودھ پلاتی ہے۔ اس پر لازم ہے کہ عمدہ کھانے اس وقت تک مؤخر رکھے جب بچہ ان کے کھانے کے قابل ہو جائے اور اس میں پائی جانے والی کمزوری ختم ہو جائے۔

تو اس مقام بیان پر ہم کہتے ہیں کہ یہاں بحث و تفصیل کی گنجائش نہیں اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ شرعی دلائل سے صرف ظاہری مفہوم نکالے اور یہ بات صبر کا تقاضا کرتی ہے کیوں کہ شکر کی فضیلت کے بارے میں اگرچہ بہت سی روایات آئی ہیں لیکن صبر کی فضیلت میں وارد احادیث کو دیکھیں تو صبر کے فضائل زیادہ ہیں بلکہ اس سلسلے میں فضیلت کے لیے صریح الفاظ ہیں۔

جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مِنْ اَفْضَلِ مَا اُوْتِیْتُمُ الْیَقِیْنُ وَعَزِیْمَۃُ الصَّبْرِ (۱) — سب سے افضل چیز جو تمہیں دی گئی وہ یقین اور صبر کرنا ہے۔

---

(۱)

اور ایک دوسری حدیث شریف میں ہے۔

(قیامت کے دن) زمین والوں میں سے سب سے زیادہ شکر کرنے والے کو لایا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے شکر کرنے والوں کی جزا عطا فرمائے گا اور زمین والوں میں سے سب سے زیادہ صبر کرنے والے کو لایا جائے گا تو اس سے کہا جائے گا کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ تمہیں اس شاکر کی طرح جزا دی جائے وہ کہے گا ہاں میرے رب! اللہ تعالیٰ فرمائے گا ہرگز نہیں! میں نے اس پر انعام کیا تو اس نے شکر ادا کیا اور تجھے ابتلا و آزمائش میں ڈالا تو تو نے صبر کیا میں تجھے اس سے دوگنا اجر دوں گا چنانچہ اسے شکر کرنے والوں کے اجر سے دوگنا اجر دیا جائے گا۔ (۱)

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ (۲)

بے شک صبر کرنے والوں کو ان کا اجر حساب کے بغیر دیا جائے گا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلطَّاعِمُ الشَّاکِرُ بِمَنْزِلَةِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ۔ (۳)

شکر ادا کرتے ہوئے کھانے والا صبر کرنے والے روزے دار کی طرح ہے۔

یہ حدیث بھی اس بات کی دلیل ہے کہ صبر میں فضیلت ہے کیوں کہ اس کا ذکر درجۂ شکر کی بلندی کے سلسلے میں مبالغہ کے طور پر ہوا اور اس کو صبر کے ساتھ ملا تو گویا یہ اس کے درجہ کی انتہا ہے اور اگر شریعت کی جانب سے درجۂ صبر کی بلندی سمجھی نہ جاتی تو شکر کا اس کے ساتھ الحاق شکر کی تعریف میں مبالغہ نہ ہوتا جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلْجُمُعَةُ حَجُّ الْمَسَاکِیْنِ وَجِهَادُ الْمَرْاَةِ حُسْنُ التَّبَعُّلِ۔ (۴، ۵)

جمعۃ المبارک مساکین کا حج ہے اور عورت کا جہاد خاوند کے ساتھ اچھی طرح رہنا ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

---

(۱)

(۲) قرآن مجید، سورۂ زمر آیت ۱۰

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۳۴۳ مرویات سنان بن سنتہ

(۴) کنز العمال جلد ۷، ص ۷۰۷، حدیث ۲۱۰۳۱

(۵) کنز العمال جلد ۵ ص ۸۶۲ حدیث ۱۴۵۶۹

شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدِ اُوَثْنٍ۔ (۱) شراب پینے والا بت پرست کی طرح ہے۔

اور مشبہ بہ (جس کے ساتھ تشبیہ دی جائے) اعلیٰ رتبہ کا ہونا چاہیے۔

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ۔ صبر نصف ایمان ہے۔

یہ اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ بھی اس (صبر) کی طرح ہے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے۔

اَلصَّوْمُ نِصْفُ الصَّبْرِ۔ (۲) روزہ نصف صبر ہے۔

جو چیز دو حصوں میں تقسیم ہو اس کے ہر حصے کو نصف کہتے ہیں اگرچہ ان میں تفاوت ہو جیسے کہا جاتا ہے ایمان، علم و عمل کا نام ہے پس عمل نصف ایمان ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عمل، علم کے مساوی ہے۔

اور حدیث شریف میں ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے آپ نے فرمایا۔

آخِرُ الْاَنْبِيَاءِ دُخُوْلًا الْجَنَّةَ سُلَيْمَانُ بْنُ دَاوُدَ عَلَيْهِمَا السَّلَامُ لِمَكَانِ مُلْكِهٖ وَآخِرُ اَصْحَابِيْ دُخُوْلًا الْجَنَّةَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ لِمَكَانِ غِنَاهُ۔ (۳)

انبیاء کرام علیہم السلام میں سے سب سے آخر میں سلیمان بن داؤد علیہما السلام جنت میں داخل ہوں گے اور یہ ان کی بادشاہی کی وجہ سے اور صحابہ کرام میں سے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سب سے آخر میں جنت میں جائیں گے اور یہ ان کی مالداری کی وجہ سے ہے۔

اور ایک دوسری حدیث میں ہے۔

يَدْخُلُ سُلَيْمَانُ بَعْدَ الْاَنْبِيَاءِ بِاَرْبَعِيْنَ خَرِيْفًا۔ (۴)

حضرت سلیمان علیہ السلام دوسرے انبیاء کے چالیس سال بعد جنت میں جائیں گے۔

ایک دوسری حدیث شریف میں ہے۔

اَبْوَابُ الْجَنَّةِ كُلُّهَا مِصْرَاعَانِ اِلَّا بَابَ الصَّبْرِ فَاِنَّهٗ مِصْرَاعٌ وَاحِدٌ وَاَوَّلُ مَنْ

جنت کے تمام دروازوں کے دو دو کواڑ ہیں لیکن صبر کے دروازے کا ایک ہی کواڑ ہے اور سب سے پہلے جنت

---

(۱) المطالب العالیہ جلد ۲ ص ۵۰ حدیث ۱۷۷۷

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۲۶۰ حدیث رجل من بنی سلیم

(۳) الفردوس بماثور الخطاب جلد ۵ ص ۵۰۸ حدیث ۸۹۱۴

(۴) کنز العمال جلد ۱۱ ص ۱۲۷ حدیث ۲۲۴۹۹

يَدْخُلُ اَهْلُ الْبَلَاءِ اَمَا مَهُمْ اَيُّوْبُ عَلَيْهِ السَّلَامُ، آزمائشوں میں مبتلا لوگ جائیں گے اور حضرت ایوب علیہ السلام ان کی قیادت کر رہے ہوں گے۔ (۱)

فقر کی فضیلت کے سلسلے میں جو کچھ وارد ہوا ہے وہ صبر کی فضیلت پر دلالت ہے کیوں کہ یہ فقیر کی حالت ہے اور شکر مالدار کی حالت — یہی وہ مقام ہے جس پر عوام قناعت کریں اور ان کے لائق وعظ میں اسی پر اکتفا کیا جائے اور یہ اس بات کی تعریف ہے جس میں ان کی دین کی اصلاح ہے

دوسرا مقام :-

یہ وہ بیان ہے جس کے ذریعے ہم اہل علم اور اصحاب بصیرت کو بطور حقائق امور سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں ہم کہتے ہیں ہر وہ امر جو دو مبہم باتوں کے درمیان ہو تو ابہام کی موجودگی میں ان کے درمیان موازنہ ممکن نہیں جب تک ان میں سے ہر ایک کی حقیقت منکشف نہ ہو۔ اور مکشوف کئی قسموں پر مشتمل ہے۔ ان میں اجتماعی طور پر برابری ممکن نہیں لہذا ایک ایک کا مقابلہ و موازنہ کیا جائے تاکہ ترجیح کا تعین ہو جائے۔

صبر و شکر کی اقسام اور شعبے بے شمار ہیں اس لیے اجمالی صورت میں ترجیح و نقصان کے حوالے سے ان کا حکم واضح نہیں ہو سکتا۔ پس ہم کہتے ہیں ہم نے ذکر کیا کہ یہ مقامات تین امور یعنی علوم، احوال اور اعمال سے مرکب ہوتے ہیں اور شکر، صبر اور تمام مقامات اسی طرح ہیں اور ان تین امور میں سے بعض کا بعض سے موازنہ کیا جائے تو ظاہر بین لوگوں کے لیے ظاہر ہوتا ہے کہ علوم احوال کے لیے مراد ہوتے ہیں اور احوال کا ارادہ اعمال کے لیے ہوتا ہے اور اعمال ہی افضل ہیں۔

لیکن ارباب بصیرت کے لیے معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے کیوں کہ اعمال کا مقصد احوال اور احوال سے مقصود علوم ہوتے ہیں پس علوم افضل ہیں پھر احوال اور اس کے بعد اعمال — کیوں کہ جس چیز اس سے افضل ہوتی ہے لیکن ان تینوں میں سے ایک ایک کو دیکھا جائے تو بعض اوقات اعمال مساوی ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تفاوت ہوتا ہے جب ان میں سے بعض کی دوسرے بعض کی طرف نسبت کی جائے ایک ایک عمل کا بھی یہی ہے جب ایک دوسرے کی طرف ان کی اضافت ہو اور معارف کا معاملہ بھی انفرادی طور پر اسی طرح ہے معارف میں سے افضل، علوم مکاشفہ ہیں اور یہ علوم معاملہ سے ارفع و اعلیٰ ہیں بلکہ علوم معاملہ تو معاملات سے بھی کم درجہ میں ہیں کیوں کہ ان کا مقصد معاملہ ہے اس کا فائدہ اصلاحِ عمل ہے۔ اور معاملہ کی وجہ سے عالم کو عابد پر فضیلت حاصل ہے جب اس کے علم کا نفع عام ہو پس ایک خاص عمل کی طرف نسبت کی وجہ سے یہ افضل ہے۔ درنہ عمل کے بارے میں علمِ قاصر، عملِ قاصر سے افضل نہیں ہے تو ہم کہتے ہیں عمل کی اصلاح کا فائدہ حالِ دل کی اصلاح ہے اور حالِ قلب کی اصلاح کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ

---

(۱) صحیح مسلم جلد اول ص ۱۱۱، ۱۱۲، کتاب الایمان

کی ذات، صفات اور افعال میں اس کی جلالت کا انکشاف ہو۔ تو علوم مکاشفہ میں سے ارفع علم اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے اور یہی مطلوب بالذات بات ہے کیوں کہ اس کے ذریعے سعادت حاصل ہوتی ہے بلکہ یہی عینِ سعادت ہے لیکن بعض اوقات دنیا میں دل کو اس بات کا شعور نہیں ہوتا کہ یہ عینِ سعادت ہے بلکہ اسے آخرت میں اس بات کا شعور حاصل ہوتا ہے یہ آزاد معرفت ہے جس پر کوئی قید نہیں لہٰذا یہ غیر کی قید میں نہیں جب کہ اس کے علاوہ جتنے معارف ہیں وہ اس کی طرف نسبت کرتے ہوئے غلام اور خادم ہیں کیوں کہ یہ تو خود مقصود ہوتا ہے اور جب یہ ذاتی طور پر مراد ہے تو اب اس کے نفع میں تفاوت ہوگا اور وہ معرفتِ خداوندی تک پہنچاتا ہے کیوں کہ بعض معارف دوسرے معارف تک ایک واسطے یا کئی واسطوں سے پہنچاتے ہیں پس جب بندے اور معرفتِ خداوندی کے درمیان واسطے کم ہوں تو یہ افضل ہے۔

احوال سے ہماری مراد دل کے احوال ہیں یعنی اس کی صفائی اور دنیوی تعلقات سے اس کی طہارت ہو اور مخلوق سے مشغولیت نہ ہو حتیٰ کہ جب وہ پاک صاف ہو جاتا ہے تو اس کے لیے حقیقتِ حق واضح ہو جاتی ہے تو احوال کے فضائل دل کی اصلاح اور تطہیر کے سلسلے میں ان کی تاثیر کی مقدار سے ہوتا ہے نیز اس کا علوم مکاشفہ کے لیے تیار ہونا ہے اور جس طرح شیشے کو کامل طور پر صاف کرنے اور جلا بخشنے میں اس کے احوال کو مقدم کیا جاتا ہے کہ اس کو صاف کرنے کے اعتبار سے بعض دوسرے بعض کی نسبت زیادہ قریب ہوتے ہیں اسی طرح دل کا حال ہے۔

تو وہ حالت جو قلبی صفائی کے قریب ہو یا قریب کرنے والی ہے وہ نچلے درجے والی سے لامحالہ افضل ہے کیوں کہ وہ مقصود کے قریب ہے پس اعمال کی ترتیب بھی اسی طرح ہے کیوں کہ ان کی تاثیر دل کی صفائی اور احوال کو اس کے قریب کرنے میں ہوتی ہے اور ہر عمل کی دو حالتیں ہیں یا وہ تو دل کی طرف ایسی حالت ہے جو مکاشفہ میں رکاوٹ ہے اور دل کی تاریکی کا باعث ہے وہ دنیوی زینتوں کی طرف لی جاتی ہے یا وہ عمل دل کی طرف ایسی حالت کو کھینچتا ہے جو مکاشفہ کی راہ ہموار کرتی اور دل کی صفائی کا موجب ہے اور اس سے دنیوی علائق کو دور کرتی ہے پہلی حالت کو معصیت اور دوسری کو اطاعت کہتے ہیں۔

اور دل کو تاریک اور سخت کرنے میں تاثیر کے حوالے سے گناہوں میں تفاوت ہے اسی طرح دل کو روشن اور صاف کرنے میں اطاعت کی حالت ہے تو احوال کے اختلاف سے درجات تاثیر کی بنیاد پر اطاعت کے درجات بھی مختلف ہوتے ہیں۔

مثلاً ہم مطلقاً کہہ سکتے ہیں کہ نفلی نماز ہر نفلی عبادت سے افضل ہے حج، صدقہ سے افضل ہے اور قیام لیل اپنے غیر سے افضل ہے لیکن تحقیق یہ ہے کہ وہ مالدار جس کے پاس مال ہو اور اس پر بخل اور مال روکنے کی محبت غالب ہو اس کا ایک درہم خرچ کرنا کئی راتوں کے قیام اور کئی دنوں کے روزے سے افضل ہے کیوں کہ روزہ اس آدمی کے لائق ہے جس پر پیٹ کی شہوت غالب ہو اور وہ اس کو توڑنے کا ارادہ کرے یا سیر ہو کر کھانا اسے علوم مکاشفہ میں خالص فکر سے مانع ہو

پس وہ بھوک کے ذریعے دل کو صاف کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

لیکن اس شخص کی یہ حالت نہیں ہے اس لیے اسے پیٹ کی شہوت نقصان نہیں دیتی اور نہ وہ اس قسم کے فکر میں مشغول ہے جس کے راستے میں شکم سیری رکاوٹ بن رہی ہو لیں اس کا روزے میں مشغول ہونا اپنی حالت سے نکل کر دوسرے کی حالت میں جانا ہے اور وہ اس بیمار کی طرح ہے جسے پیٹ کی بیماری ہو اور وہ سر درد کا علاج کرے تو اسے نفع نہیں ہوتا بلکہ اس کو چاہیئے کہ وہ اس مہلک بیماری کو دیکھے جو اس پر غالب ہے اور بخل جس کی اطاعت کی جائے مہلکات میں سے ہے اور اسے ایک سال کے روزے اور ایک ہزار رات کا قیام بھی دُور نہیں کر سکتا بلکہ اس کا ازالہ مال خرچ کرنے سے ہوتا ہے لہٰذا اس پر صدقہ کرنا لازم ہے ہم نے اس کی تفصیل مہلکات کے بیان میں ذکر کی ہے وہاں دیکھی جا سکتی ہے۔

خلاصہ یہ ہو کہ اطاعت و فرمانبرداری کی تاثیر حالات کے اعتبار سے ہوتی ہے اور اس وقت سمجھدار آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ مطلق جواب خطا ہے کیوں کہ کوئی شخص پوچھے کہ روٹی افضل ہے یا پانی ؟ تو اس میں صحیح جواب یہی ہوگا کہ بھوک کے لیے روٹی اور پیاسے کے لیے پانی افضل ہے اور اگر دونوں باتیں جمع ہوں تو غالب کو دیکھے اگر پیاس غالب ہو تو پانی افضل ہے اور اگر بھوک غالب ہو تو روٹی افضل ہے اگر دونوں باتیں مساوی ہوں تو دونوں چیزیں برابر ہوں گی۔

اسی طرح جب پوچھا جائے کہ سکنجبین افضل ہے یا نیلوفر کا شربت ؟ تو مطلق جواب صحیح نہ ہوگا ہاں اگر ہم سے یہ پوچھا جائے کہ سکنجبین افضل ہے یا صفرا کا نہ ہونا تو ہم کہیں گے صفرا کا نہ ہونا افضل ہے کیوں کہ سکنجبین کی ضرورت اسی کے لیے ہوتی ہے اور جو چیز کسی دوسرے کے لیے مقصود ہو تو دوسری چیز افضل ہوتی ہے۔ تو مال کا خرچ کرنا بھی ایک عمل ہے اور اس سے ایک حالت حاصل ہوتی ہے اور وہ بخل کا زوال اور دل سے دنیا کی محبت کو نکالنا ہے اور اس محبت سے دل کو فارغ کر کے اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت و محبت کے لیے تیار کرنا ہے تو معرفت افضل ہے حال اس سے کم اور عمل اس سے بھی کم درجے میں ہے۔

سوال :

شریعت نے اعمال کی ترغیب دی ہے اور اس کی فضیلت مبالغہ کے ساتھ بیان کی ہے حتیٰ کہ صدقہ دینے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا۔ (۱) کون شخص اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دیتا ہے۔

اور ارشاد فرمایا۔

وَیَاْخُذُ الصَّدَقَاتِ۔ (۲) اور وہ صدقات لیتا ہے

(۱) قرآن مجید، سورۃ بقرہ آیت ۲۴۵

(۲) قرآن مجید، سورۃ توبہ آیت ۱۰۴

تو کس طرح فعل اور مال کا خرچ کرنا افضل نہ ہوگا۔

جواب :۔

طبیب کا دوائی کی تعریف کرنا اس مقصد کے سبب نہیں ہوتا کہ بعینہ دوائی مراد ہوتی ہے بلکہ صحت و شفا سے افضل ہوتی ہے لیکن اعمال دلوں کے مرض کا علاج ہیں اور قلبی بیماریوں کا عام طور پر پتہ نہیں چلتا جیسے کسی شخص کے چہرے پر سفید داغ ہوں اور اس کے پاس شیشہ نہ ہو تو اسے معلوم نہیں ہوتا اور اگر اسے بتایا جائے تو وہ سچ نہیں جانتا تو ایسے شخص کے سامنے گلاب کے پانی سے پتہ دھونے کا مبالغہ کے ساتھ ذکر کیا جائے اگر گلاب کا پانی ان داغوں کو زائل کرتا ہو حتی کہ بہت زیادہ تعریف اسے مسلسل منہ دھونے پر مجبور کر دے گی اور یوں اس کا مرض زائل ہو جائے گا کیوں کہ اگر اسے کہا جائے کہ مقصود تمہارے چہرے سے برص کے داغ کو زائل کرنا ہے تو ہو سکتا ہے وہ علاج چھوڑ دے اور یہ خیال کرے کہ اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اب ہم اس سے بھی قریب تر مثال بیان کرتے ہیں۔

ایک شخص جس نے اپنے بیٹے کو علم اور قرآن سکھایا اور وہ چاہتا ہے کہ یہ اسے ہمیشہ یاد رہے زائل نہ ہو اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اگر وہ اسے تکرار کرنے یا پڑھنے کے لیے کہے گا تاکہ محفوظ رہے تو وہ کہے گا مجھے یاد ہے اور مجھے تکرار کرنے اور پڑھنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس کا خیال ہے کہ جو کچھ اسے اس وقت یاد ہے وہ ہمیشہ اسی طرح رہے گا اور اس کے غلام بھی ہوں اور وہ بچے کو کہے کہ تم ان کو پڑھاؤ اور اس پر اچھے انعام کا وعدہ بھی کرے تاکہ سکھانے کے ذریعے وہ زیادہ تکرار کر سکے تو بعض اوقات بچہ بیچارہ سمجھتا کہ مقصود غلاموں کو قرآن پاک کی تعلیم دینا ہے اور وہ تعلیم کے ذریعے ان کی خدمت کر رہا ہے تو وہ پریشان ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ میرا باپ مجھ سے ان غلاموں کی خدمت لے رہا ہے حالانکہ میں والد کے نزدیک زیادہ معزز و محترم ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ اگر میرے والد کا مقصد غلاموں کو تعلیم دینا ہوتا تو مجھے یہ کام سپرد کیے بغیر بھی مقصد حاصل ہو سکتا تھا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان غلاموں کے چلے جانے سے میرے والد کو کوئی نقصان نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ قرآن پاک پڑھنا نہ جانتے ہوں تو بعض اوقات وہ سستی کرتا ہے اور باپ کی بے نیازی کی وجہ اور درگزر کرنے کے سلسلے میں اس کے کرم پر اعتماد کرتے ہوئے ان کو پڑھانا چھوڑ دیتا ہے یوں وہ علم اور قرآن کو بھول جاتا ہے اور وہ محروم ہو جاتا ہے حالانکہ اسے اس بات کا شعور بھی نہیں ہوتا۔

اس قسم کے خیال سے بعض لوگوں کو دھوکہ ہوا اور انہوں نے اباحت کا طریقہ اختیار کیا وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کو ہماری عبادت کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی وہ ہم سے قرض لینے کا محتاج ہے لہٰذا اس آیت کا کیا مطلب ہوا۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۔(۱) کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو اچھا قرض دے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۲۴۵

اور اگر اللہ تعالیٰ ان مساکین کو کھانا دینا چاہتا تو دے دیتا لہٰذا ہمیں ان پر اپنا مال خرچ کرنے کی ضرورت نہیں ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے کفار کی بات نقل کرتے ہوئے فرمایا۔ (۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے اس چیز سے خرچ کرو جو اللہ تعالیٰ نے تم کو عطا فرمائی ہے تو کافر لوگ، ایمان والوں سے کہتے ہیں کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں جن کو اللہ تعالیٰ چاہتا تو کھلا دیتا۔

اور وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

لَوْشَاءَ اللّٰہُ مَا اَشْرَکْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا۔ (۲)

تو دیکھو وہ اپنے کلام میں کس قدر سچے ہیں اور کس طرح وہ اپنی (اس) سچائی کی وجہ سے ہلاک ہوئے تو وہ ذات پاک ہے جو چاہے تو سچ بولنے پر بھی ہلاک کر دے اور جب چاہے تو جہالت کے باوجود سعادت مندی کی دولت سے مالا مال کر دے اور اس (قرآن) کے ذریعے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرتا اور بہت سے لوگوں کو ہدایت دیتا ہے۔

تو ان لوگوں نے سمجھا کہ ان سے مساکین اور فقراء کی خدمت لی جا رہی ہے یا اللہ تعالیٰ کے لیے دینا ہے پھر کہنے لگے نہ تو ہمیں مساکین سے کچھ ملتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو ہم سے اور ہمارے مالوں سے کچھ حاصل ہوتا ہے ہمارا خرچ کرنا اور نہ کرنا برابر ہے ـــــ چنانچہ وہ ہلاک ہوئے۔ جیسے وہ بچہ ہلاک ہوا جب اس نے سوچا کہ اس کے والد کا مقصد غلاموں کی خدمت لینا ہے اور اسے یہ بات معلوم نہ ہوئی کہ مقصود تو صفتِ علم کو اس کے دل میں قائم رکھنا اور پکا کرنا ہے تاکہ یہ اس کے لیے دنیا میں سعادت کا سبب بنے اور باپ، اس کو شفقت کے طور پر اس بات کی طرف کھینچ رہا ہے جس میں اس کی سعادت ہے۔ اس مثال کے ذریعے تمہارے سامنے ان لوگوں کی گمراہی واضح ہو گئی جو اس طریقے سے گمراہ ہوتے ہیں۔

تو نتیجہ یہ ہوا کہ جو مسکین تیرا مال لے جاتا ہے وہ اس مال کے واسطے سے تیرے دل سے بخل کی خباثت اور دنیوی محبت کو نکالتا ہے کیوں کہ یہ دونوں باتیں تمہارے لیے ہلاکت کا باعث ہیں مسکین خون نکالنے والے کی طرح ہے وہ تم سے خون نکال کر تمہارے اندر سے مہلک بیماری کو نکالتا ہے تو خون نکالنے والا تمہاری خدمت کرتا ہے تم اس کی خدمت نہیں کرتے۔ اور اگر وہ خون نکالنے پر کچھ لیتا ہے تو بھی خادم ہونے سے نہیں نکلتا۔

اور جب صدقات، باطن کی طہارت اور بری صفات سے تزکیہ کا باعث ہیں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات،

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ یٰسین آیت ۴۷

(۲) قرآن مجید، سورۂ انعام آیت ۱۴۸

پہننے سے احتراز فرمایا اور صدقہ نہ لیا جیسا کہ پچھنے لگانے والے کی کمائی سے منع فرمایا (۱)
اور اس کا نام لوگوں کی میل رکھا اور اپنے اہل بیت کو اس سے محفوظ رہنے کا شرف عطا فرمایا (۲)

مقصود یہ ہے کہ اعمال دل میں اثر کرتے ہیں جیسا کہ مہلکات کے بیان (تیسری جلد) میں گزر چکا ہے اور دل اعمال کی تاثیر کے حوالے سے ہدایت اور نورِ معرفت کو قبول کرنے کے لیے مستعد ہوتے ہیں یہ ایک جامع بات اور ایسا اصل ضابطہ ہے کہ اعمال، احوال اور معارف کے فضائل کے سلسلے میں اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اب ہم خاص طور پر اپنی بحث یعنی صبر و شکر کے بیان کی طرف آتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ ان دونوں میں سے ہر ایک میں معرفت، حال اور عمل ہے لہٰذا ایک میں پائی جانے والی معرفت کا دوسرے میں پائے جانے والے حال اور عمل کے ساتھ تقابل نہ کیا جائے بلکہ ہر ایک کا مقابلہ اس کی مثل کے ساتھ کیا جائے تاکہ مناسب ظاہر ہو اور اس کے بعد فضیلت واضح ہو۔

اور جب شاکر کی معرفت کا صبر کرنے والے کی معرفت کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو بعض اوقات دونوں کی معرفت ایک ہی ہو جاتی ہے مثلاً معرفت شاکر یہ ہے کہ آنکھوں کی نعمت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھے اور صابر کی معرفت یہ ہے کہ اندھے پن کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھے اور یہ دونوں معرفتیں ایک دوسرے کو لازم اور مساوی ہیں اور یہ اس وقت ہے جب ہم (صبر کو) ابتلاء و مصائب میں اعتبار کریں اور ہم نے بیان کیا ہے کہ صبر کبھی عبادت پر اور کبھی گناہوں سے رُکنے پر ہوتا ہے اور اس میں صبر و شکر متحد ہیں کیوں کہ عبادت پر صبر کرنا عین شکر ادا کرنا ہے کیوں کہ شکر کا معنیٰ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اس مقصود کی طرف پھیرنا ہے جو اس نعمت کی حکمت کا مقتضیٰ ہے اور صبر کا مطلب باعث خواہش کے مقابلے میں دینی باعث کو ثابت و قائم رکھنا ہے تو صبر اور شکر ایک مستی کے دو نام ہیں جن میں اعتباری اختلاف ہے پس باعثِ دین کو باعثِ ہوی کے خاتمے کے لیے ثابت و قائم رکھنا باعث ہوی کی نسبت سے صبر کہلاتا ہے اور باعثِ دین کی طرف نسبت کے حوالے سے اسے شکر کہتے ہیں کیوں کہ دینی باعثِ شہوت کو پچھاڑا جائے اور اس نے اسے مقصود کی طرف پھیرا ہے تو یہ ایک مفہوم کے لیے دو عبارتیں ہیں تو ایک چیز اپنے آپ سے کیسے افضل ہو سکتی ہے تو صبر تین کاموں میں جاری ہوتا ہے ایک اطاعت، دوسری معصیت اور تیسری آزمائش اور مصیبت، اطاعت و معصیت میں اس کا حکم ظاہر ہو گیا۔

جہاں تک مصیبت کا تعلق ہے تو وہ عدم نعمت کا نام ہے اور نعمت یا تو ضروری ہوتی ہے جیسے آنکھیں، یا محلِ حاجت میں ہوتی ہے جیسے ضرورت سے زیادہ مال ہے آنکھوں سے نابینا آدمی کا صبر یہ ہے کہ وہ شکوہ ظاہر نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر رضامندی کا اظہار کرے اور اندھے پن کو بعض گناہوں کے لیے اجازت نہ سمجھے اور بینائی والے کا شکر

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۲۹۹ مرویات ابی ہریرہ
(۲) صحیح مسلم جلد اول ص ۳۴۴ کتاب الزکوٰۃ

عمل کے اعتبار سے دو باتوں کے ذریعے ہوتا ہے ایک یہ کہ آنکھوں کو گناہ پر مدد کے لیے استعمال نہ کرے اور دوسرا یہ کہ ان کو عبادت واطاعت میں استعمال کرے اور یہ دونوں باتیں صبر کی متقاضی ہیں کیوں کہ نابینا آدمی کو خوبصورت شکلیں دیکھنے سے خود بخود صبر حاصل ہے کیوں کہ وہ ان کو دیکھ ہی نہیں سکتا اور دیکھنے والے کی نگاہ کسی خوب صورت پر پڑھے اور وہ صبر کرے تو وہ آنکھوں کی نعمت پر شکر کرنے والا ہے اور اگر وہ دیکھتا رہے تو اس نے آنکھوں کی نعمت پر ناشکری کی۔ تو صبر، شکر میں داخل ہو گیا اسی طرح جب عبادت واطاعت پر آنکھوں سے مدد لیتا ہے تو اس میں بھی اطاعت پر صبر کا پایا جانا ضروری ہے۔

پھر بعض اوقات عجائباتِ خداوندی کو دیکھنے کے ذریعے شکر کرتا ہے تاکہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت تک پہنچے تو یہ شکر، صبر سے افضل ہے۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو حضرت شعیب علیہ السلام جن کی آنکھوں میں بینائی نہیں تھی موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام سے ان کا رتبہ بڑا ہوتا. کیوں کہ انہوں نے بینائی کے نہ ہونے پر صبر کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے مثلاً اس بات پر صبر نہیں کیا اور کمال یہ ہوتا کہ انسان تمام اعضاء سے محروم ہو اور وہ گوشت کا ایک لوتھڑا ہوتا اور یہ بالکل محال ہے کیوں کہ ہر عضو ایک دینی آلہ ہے اور اس کے فوت ہونے سے دین کا کوئی رکن فوت ہو جائے اور ان اعضاء پر اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ہے کہ ان کو دین کے سلسلے میں بطور آلہ استعمال کرے پس جب اسے صرف ضرورت کے مطابق ملا اور اس سے زائد کا محتاج ہے تو اس (زائد) سے صبر کرنا مجاہدہ ہے اور یہ جہادِ فقر ہے جب کہ زائد کا پایا جانا نعمت ہے اور اس کا شکر یہ ہے کہ اسے اچھے کاموں میں خرچ کرے یا گناہ میں استعمال نہ کرے۔

پس جب صبر کی شکر کی طرف اضافت کی جائے جو اطاعت میں صرف کرنے کا نام ہے تو شکر افضل ہے۔ کیوں کہ اس میں صبر بھی شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت پر خوش ہونا بھی ہے اور اسے فقراء پر خرچ کرتے کے دُکھ کا بھی امکان ہے نیز اسے جائز خوشیوں میں صرف کرتے سے باز رکھنا بھی ہے۔

گویا خلاصہ کلام اس بات کی طرف لوٹتا ہے کہ دو چیزیں، ایک چیز سے افضل ہوتی ہیں اور کل، بعض کے مقابلے میں اعلیٰ رتبہ رکھتا ہے اور اس بات میں بھی خلل ہے کیوں کہ کُل اور اس کے بعض اجزاء کے درمیان موازنہ نہیں ہو سکتا۔

اور اگر شکر کی یہ صورت ہو کہ اس (نعمت) کے ذریعے گناہ پر مدد حاصل نہ کرے بلکہ اس کو جائز خوشی پر خرچ کرے تو اس صورت میں صبر، شکر سے افضل ہے اور فقیر صابر، اس مالدار سے افضل ہے جو اپنا مال روک کر رکھتا ہے اور اسے محض جائز کاموں پر خرچ کرتا ہے اس مالدار سے افضل نہ ہوگا جو اپنا مال نیک کاموں پر خرچ کرتا ہے کیوں کہ فقیر بعض اوقات اپنے نفس سے مجاہدہ کرتا اس کی حرص کو توڑتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی آزمائش پر اچھی طرح صبر کرتا ہے اور یہ

حالت، لازماً قوت، کا تقاضا کرتی ہے اور مالدار آدمی حرص کے پیچھے چلنا اور خواہش کی اطاعت کرتا ہے لیکن اس نے مباح اور جائز کام پر اکتفا کیا اور مباح کام میں حرام کام کے مقابلے میں گنجائش ہے لیکن حرام سے بچنے کے لیے بھی قوت چاہیے لیکن جس قوت کے تحت فقیر صبر کرتا ہے وہ اس قوت سے اعلیٰ اور کامل ہے جس کے تحت محض مباح کام سے خوشی اور لذت حاصل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے اور شرف اسی قوت کو حاصل ہوتا ہے جس پر عمل دلالت کرے کیوں کہ اعمال، احوال قلوب کے لیے مقصود ہوتے ہیں اور یہ قوت، دل کی حالت ہے جو یقین و ایمان کی قوت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے تو جو چیز ایمان میں قوت کے اضافے کا باعث بنے وہ لامحالہ افضل ہے۔

اور قرآنی آیات، و احادیث مبارکہ میں صبر و شکر کے اجر کے بارے میں جو تفصیل آئی ہے اس سے یہی رتبہ حاصل کرنا مقصود ہے کیوں کہ لوگوں کے ذہنوں میں نعمت کا تصور مال اور مالداری کے حوالے سے آتا ہے اسے اطاعت پر خرچ کرنا نہیں لہٰذا صبر، شکر سے افضل ہوگا۔ یعنی وہ صبر جسے عام لوگ صبر سمجھتے ہیں وہ اس شکر سے افضل ہے جو عام لوگوں کے ذہن میں ہے حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ نے خاص اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے جب آپ سے پوچھا گیا کہ صبر و شکر میں سے افضل کیا ہے؟ آپ نے فرمایا مال دار کی تعریف مال کے ہونے سے اور فقیر کی تعریف مال کے نہ ہونے سے نہیں ہوتی بلکہ دونوں کی تعریف ان شرائط کو پورا کرنے سے ہوتی ہے جو ان پر لازم ہیں تو مال دار کی حالت کی شرائط میں سے ایسی باتیں ہیں جو اس کی صفت، نفع اندوزی اور لطف اندوزی کے مطابق ہیں اور فقیر کی شرائط میں ایسی باتیں ہیں جو اس کو ایذا دیتی اور بے قرار کرتی ہیں اور جب یہ دونوں اللہ تعالیٰ (کی رضا) کے لیے ان شرائط کو قائم کرتے ہیں تو جو شخص اپنے آپ کو تکلیف دے گا اور بے قرار کرے گا وہ اس سے کامل حال والا ہوگا جو اسے عیش میں رکھے گا اور بات وہی ہے جو حضرت جنید رحمہ اللہ نے فرمائی ہے لیکن یہ بات صبر و شکر کی اقسام میں سے صرف آخری قسم پر صادق آتی ہے جو اقسام ہم نے ذکر کی ہیں اور انہوں نے اس کے علاوہ کا ارادہ نہیں فرمایا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت ابو العباس بن عطا اس سلسلے میں ان کی مخالفت کرتے تھے انہوں نے فرمایا مالدار شاکر، صابر فقیر سے افضل ہے اس پر حضرت جنید رحمہ اللہ نے ان کے خلاف بددعا کی تو ان کو اولاد کے قتل، مال کے ضیاع اور عقل کے زوال کے حوالے سے چودہ سال تک سخت ابتلاء میں رہنا پڑا وہ فرمایا کرتے تھے مجھے حضرت جنید رحمہ اللہ کی بددعا لگ گئی چنانچہ انہوں نے اپنی بات سے رجوع کیا اور فقیر صابر کو مالدار شاکر پر ترجیح دینے لگے۔

اور جب تم ان معانی پر غور کرو جو ہم نے ذکر کئے ہیں تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ دونوں قولوں کے لیے بعض حالات میں ایک وجہ ہے کئی صابر فقیر، شاکر غنی سے افضل ہوتے ہیں جیسا کہ گزر گیا اور کئی شاکر مالدار صابر فقیر سے افضل ہوتے ہیں اور یہ وہ غنی ہے جو اپنے آپ کو فقیر کی طرح جانتا ہے کیونکہ وہ اپنے لیے حسب ضرورت مال روکتا ہے اور باقی مال اچھے کاموں پر خرچ کرتا ہے یا اس لیے جمع کرتا ہے کہ یہ محتاجوں اور مساکین کے لیے جمع ہے وہ دیکھتا رہتا ہے جب کوئی حاجت مند

ہوتا ہے تو اس پر خرچ کرتا ہے پھر اس کا خرچ کرنا شہرت اور عزت کی طلب کے لیے نہیں ہوتا نہ احسان جتاتا ہے بلکہ بندوں پر مہربانی کر کے اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی کرتا ہے تو ایسا مالدار، صبر کرنے والے فقیر سے افضل ہے۔

سوال:۔

یہ بات نفس پر مشقت کا باعث نہیں ہوتی جب کہ فقیر پر محتاجی گراں گزرتی ہے کیوں کہ یہ قدرت کی لذت کا شعور دیتا ہے جب کہ فقر صبر کے دکھ سے آگاہ کرتا ہے اور اگر اسے مال کی جدائی کا دُکھ ہو تو یہ دُکھ خرچ کرنے پر قدرت کی لذت سے زائل ہو جاتا ہے۔

جواب:۔

جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ جو شخص رغبت اور خوش دلی سے اپنا مال خرچ کرتا ہے اس کا حال اس سے زیادہ کامل ہوتا ہے جو بخل کے ساتھ خرچ کرتا ہے اور نفس پر جبر کر کے مال کو جدا کرتا ہے ہم نے توبہ کے بیان میں اس کی تفصیل ذکر کی ہے تو نفس کو دکھ پہنچانا ذاتی طور پر مقصود نہیں بلکہ یہ اس کو ادب سکھانے کے لیے ہوتا ہے اور یہ شکاری کتے کو مارنے کی طرح ہے اور سدھایا ہوا کتا اس کتے سے زیادہ کامل ہوتا ہے جو مار کھانے کا محتاج ہو اگرچہ وہ مار پر صبر کرتا ہے اسی لیے وہ شروع میں تکلیف اور مجاہدے کا محتاج ہوتا ہے اور آخر میں اسے ان دونوں باتوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ آخر میں وہ بات جو تکلیف دہ تھی اس کے نزدیک لذیذ بن جاتی ہے جس طرح عقلمند بچے کے نزدیک حصول علم لذیذ ہو جاتا ہے حالانکہ شروع شروع میں اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ لیکن جب سوائے تھوڑے سے لوگوں کے سب لوگ شروع میں بلکہ بہت پہلے سے بچوں کی طرح تھے تو حضرت جنید رحمہ اللہ نے مطلقاً فرمایا کہ جو شخص اپنے نفس کو تکلیف دے وہ افضل ہے تو عام مخلوق کے اعتبار سے ان کی بات صحیح ہے۔

تو اس صورت میں جب تفصیلی جواب مقصود نہ ہو بلکہ اکثر مخلوق کے اعتبار سے مطلق بیان کرنا ہو کہ صبر، شکر سے افضل ہے تو یہ اس معنی کے اعتبار سے صحیح ہے جسے عوام سمجھتے ہیں اور جب تحقیق کا ارادہ ہو تو تفصیل سے بیان کرو کیوں کہ صبر کے کئی درجے ہیں سب سے کم درجہ ناپسندیدگی کی حالت میں شکایت نہ کرنا ہے اور ان درجات سے اوپر مقام رضا ہے جو صبر سے اوپر ہے اور اس سے آگے مصیبتوں پر شکر کرنا ہے جو رضا سے بھی اوپر ہے کیوں کہ صبر دکھ اور تکلیف کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ رضا اس صورت میں بھی ممکن ہے جس میں دُکھ اور خوشی دونوں نہ ہوں اور شکر صرف پسندیدہ صورت میں ہوتا ہے جس پر خوشی حاصل ہوتی ہے اسی طرح شکر کے بھی کئی درجات ہیں ہم نے اعلیٰ درجہ ذکر کیا ہے اور ان میں کچھ ایسی باتیں بھی ہیں جو ان مراتب کی نسبت سے کمتر ہیں۔

بندے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلسل آنے والی نعمتوں سے حیا کرنا شکر ہے، شکر میں کوتاہی کی معرفت بھی شکر ہے، قلتِ شکر سے عذر پیش کرنا بھی شکر ہے اللہ تعالیٰ کی عظیم بُردباری اور اس کی طرف سے پردہ پوشی کی معرفت بھی شکر ہے

اس بات کا اعتراف کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمتیں اس کے استحقاق کے بغیر عطا فرمائی ہیں، شکر ہے، اس بات کا علم بھی شکر ہے کہ شکر بھی ایک نعمت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے نعمتوں میں اچھی طرح تواضع اور انکساری بھی شکر ہے، جو شخص نعمت ملنے کا واسطہ ہو اس کا شکر ادا کرنا بھی شکر ہے کیوں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔

مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللهَ۔ جو شخص بندوں کا شکر یہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا۔ (۱)

اور اس کی حقیقت ہم نے اسرارِ زکوٰۃ کے بیان میں ذکر کی ہے منعم کے ساتھ اعتراض کم کرنا اور حُسن ادب اختیار کرنا بھی شکر ہے نعمتوں کو اچھی طرح قبول کرنا اور چھوٹی نعمتوں کو بڑا سمجھنا بھی شکر ہے۔

شکر و صبر کے تحت جو اعمال آتے ہیں ان کو ایک ایک کر کے شمار کرنا مشکل ہے اور ان کے مختلف درجات ہیں تو اجمالی طور پر کس طرح ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی جاسکتی ہے۔ ہاں عام لفظ بول کر خاص مراد لیا جائے جس طرح احادیث و آثار میں آیا ہے ایک بزرگ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے کسی سفر میں ایک بوڑھے بزرگ کو دیکھا جس کی عمر بہت زیادہ ہو چکی تھی میں نے ان کی حالت پوچھی تو انہوں نے فرمایا میں بچپن میں اپنے چچا کی بیٹی پر عاشق تھا وہ بھی مجھ سے محبت کرتی تھی اتفاق ایسا ہوا کہ اس نے مجھ سے شادی کر لی شبِ زفاف میں نے اس سے کہا اٹھو یہ رات ہم اللہ تعالیٰ کے شکر میں گزاریں کہ اس نے ہمیں اکٹھا کیا پس ہم رات بھر نوافل پڑھتے رہے اور ہم میں سے ایک بھی دوسرے کے لیے فارغ نہ ہوا۔ دوسری رات ہوئی تو بھی ہم نے یہی کہا اور رات بھر نماز پڑھتے رہے۔ ہم ستر یا اسی سال سے ہر رات اسی حالت پر ہوتے ہیں پھر اس نے بڑھیا سے پوچھا کہ کیا یہی بات نہیں ہے؟ بڑھیا نے کہا جس طرح یہ بزرگ فرماتے ہیں اسی طرح ہوا ہے تو تم ان دونوں کو دیکھو اگر اللہ تعالیٰ ان دونوں کو جمع نہ کرتا اور وہ جدائی کی مصیبت پر صبر کر لیتے اور اس صبر کو اس انداز میں حاصل وصال کی طرف نسبت کی جاتی تو مخفی نہیں کہ یہ شکر افضل ہے تو نتیجہ یہ ہوا کہ کس کو کس پر فضیلت حاصل ہے، تفصیل کے بغیر اس کا علم نہیں ہو سکتا۔

اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۲۵۸ مرویات ابی ہریرہ

۲:- خوف اور امید کا بیان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس کے لطف و ثواب کی امید رکھی جاتی ہے اور اس کے عذاب سے خوف کھایا جاتا ہے جس نے اولیاء کرام کے دلوں کو اپنی امید کی رُوح سے آباد کیا حتی کہ اس نے اپنی رحمتوں کے لطائف سے ان کو اپنی بارگاہ میں اتارا اور ان کو مصیبتوں کے گھر سے پھیر دیا جو اس کے دشمنوں کا ٹھکانہ ہے اس نے ڈرانے کے کوڑوں اور سخت جھڑک کے ساتھ منہ پھیرنے والوں کے چہروں کو اپنے ثواب و کرامت والے گھر کی طرف پھیر دیا نیز ان کو اپنی ناراضگی اور عذاب کا نشانہ بننے سے بچایا مختلف قسم کی مخلوق کو قہر کی زنجیروں اور نرمی اور لطف کی لگاموں کے ذریعے اپنی جنت کی طرف چلایا۔

اور رحمتِ کاملہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو جو اس کے انبیاء کرام کے سردار اور مخلوق میں سے سب سے بہتر ہیں اور آپ کے آل و اصحاب اور اولاد پر بھی رحمت ہو۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد —— امید اور خوف دو ایسے پَر ہیں جن کے ذریعے مقربین ہر مقام محمود کی طرف پرواز کرتے ہیں اور ایسی دو سواریاں ہیں جن کے ذریعے وہ ہر مشکل اور پیچیدہ گھاٹی سے گزر کر آخرت کا سفر طے کرتے ہیں۔ تو رحمٰن کے قرب اور جنتوں کی رُوح جس کی امید بہت بعید اور سامان بہت بھاری ہے دلوں کی ناپسندیدگی اور اعضاء کی مشقتوں سے ڈھانپی ہوتی ہے، اس تک امید کی لگاموں کے ذریعے ہی پہنچا جا سکتا ہے۔

اور نارِ جہنم اور دردناک عذاب جو لطیف خواہشات اور عجیب لذتوں سے گھری ہوتی ہے اس سے رکاوٹ ڈرانے اور سختی کے کوڑوں کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

لہٰذا ان دونوں (خوف اور امید) کی حقیقت اور فضیلت اور ان دونوں کے تضاد کے باوجود ان کو جمع کرنے تک رسائی کا حصول کیسے ہو سکتا، کا بیان کرنا ضروری ہے ہم ان کو ایک ہی بیان میں جمع کریں گے جو دو حصوں پر مشتمل ہوگا پہلا بیان امید کا اور دوسرا خوف کا ہوگا۔

پہلے بیان میں امید کی حقیقت اس کی فضیلت، اس کی دوا اور اس طریقے کا بیان ہوگا جس کے ذریعے امید حاصل کی جا سکتی ہے۔

فصل ۱۰

امید کی حقیقت

جان لو! امید (رجاء) سالکین کے مقامات اور طالبین کے احوال میں سے ہے جب کوئی وصف ثابت و قائم ہو تو اسے مقام کہا جاتا ہے اور جب وہ (وصف) عارضی ہو جلد زائل ہونے والا ہو تو اسے حال کہتے ہیں جس طرح زردی کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو ثابت و قائم ہے جیسے سونے کی زردی، دوسری وہ جو جلدی زائل ہوتی ہے جیسے خوف کی وجہ سے چہرے کا زرد ہو جانا اور تیسری ان دونوں کے درمیان ہے جیسے مریض کی زردی۔

اسی طرح دل بھی ان اقسام میں تقسیم ہوتا ہے جو ثابت نہیں ہوتا اسے حال کہتے ہیں کیوں کہ وہ فوری طور پر بدل جاتا ہے اور یہ دل کے تمام اوصاف میں جاری ہوتا ہے اور اس وقت ہماری غرض امید کی حقیقت بیان کرنا ہے تو رجاء (امید) بھی حال، علم اور عمل سے مکمل ہوتی ہے تو علم، حال کا سبب ہے اور حال عمل کو چاہتا ہے اور امید ان تینوں کے مجموعے کا نام ہے اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ تمہیں جو کچھ پیش آتا ہے وہ مکروہ ہوگا یا محبوب پھر وہ اس وقت موجود ہوگا یا ماضی میں تھا یا مستقبل میں اس کا انتظار ہے۔

اگر تمہارے دل میں وہ بات کھٹکے جو ماضی میں موجود تھی تو اسے ذکر اور تذکر کہا جاتا ہے اور اگر اس وقت موجود ہے تو وجد، ذوق اور ادراک ہے اسے وجد اس لیے کہتے ہیں کہ یہ حالت اس وقت تمہارے دل میں پائی جاتی ہے اور اگر مستقبل میں کسی چیز کے پائے جانے کا احتمال ہے اور تمہارے دل پر غالب ہے تو اسے انتظار اور توقع کہتے ہیں اور جس کا انتظار ہے اگر وہ مکروہ ہے جس سے دل میں دکھ اور تکلیف پیدا ہوتی ہے تو اسے خوف اور اشفاق کہتے ہیں اور اگر وہ پسندیدہ ہے اس کا انتظار ہے اور دل کا اس سے تعلق پیدا ہو چکا ہے اور اس سے دل کو لذت اور آرام پہنچ رہا ہے تو اسے رجاء (امید) کہتے ہیں تو گویا رجاء دل کی راحت کا نام ہے جو محبوب چیز کے انتظار سے حاصل ہوتی ہے۔

لیکن یہ محبوب جس کی توقع کی جا رہی ہے اس کا کوئی سبب ہونا چاہیے اب اگر اس کا انتظار اکثر اسباب کے ساتھ ہے تو اس پر رجاء کا لفظ صادق آتا ہے اور اگر اسباب بالکل نہ ہوں یا اضطراب کے ساتھ ہوں تو اس پر دھوکے اور بیوقوفی کا لفظ رجاء کے مقابلے میں زیادہ صادق آتا ہے اور اگر اسباب کا وجود بھی معلوم نہ ہو اور ان کی نفی کا علم بھی نہ ہو تو اس کے انتظار پر تمنا کا نام زیادہ صادق آتا ہے کیوں کہ یہ انتظار کسی سبب کے بغیر ہے کوئی بھی حالت ہو رجاء اور خوف کا نام اسی پر صادق آتا ہے جس میں تردد ہو جس کے بارے میں یقین ہو اس پر نہیں کیوں کہ طلوع آفتاب کے وقت

یہ نہیں کہا جاتا کہ مجھے طلوعِ آفتاب کی امید ہے اور وقتِ غروب یہ نہیں کہا جاتا کہ مجھے غروب آفتاب کا خوف ہے کیوں یہ دونوں باتیں قطعی ہیں۔

ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجھے بارش کے نزول کی امید اور اس کے نہ ہونے کا ڈر ہے اور اربابِ قلوب جانتے ہیں کہ دنیا، آخرت کی کھیتی ہے اور دل زمین کی طرح ہے ایمان اس میں بیج کی حیثیت رکھتا ہے اور عبادت زمین کو الٹ پلٹ کرنے، صاف کرنے اور نہریں کھودنے اور ان (زمینوں) کی طرف پانی جاری کرنے کی طرح ہیں اور وہ دل جو دنیا میں غرق اور ڈوبا ہوا ہے اس بنجر زمین کی طرح ہے جس میں بیج، ثمر آور نہیں ہوتا اور قیامت کا دن فصل کاٹنے کا دن ہے اور ہر شخص وہی کچھ کاٹے گا جو اس نے بویا ہوگا اور کھیتی کا بڑھنا ایمان کے بیج کے بغیر ناممکن ہے اور جب دل میں خباثت اور برے اخلاق ہوں تو ایمان بہت کم نفع دیتا ہے۔ جیسے بنجر زمین میں بیج سے فصل پیدا نہیں ہوتی۔

تو مناسب یہی ہے کہ بندے کی امیدِ مغفرت کو کھیتی والے پر قیاس کیا جائے جو شخص اچھی زمین حاصل کرتا ہے اور اس میں عمدہ بیج ڈالتا ہے جو نہ تو خراب ہوتا ہے اور نہ ہی بدبودار، اور پھر اس کی تمام ضروریات کو پورا کرتا ہے اور وہ وقت پر پانی دیتا پھر زمین کو کانٹوں اور گھاس پھونس نیز ان تمام خرابیوں سے پاک کرتا ہے جو بیج کو بڑھنے سے روکتی ہیں یا خراب کر دیتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ کے فضل کا منتظر ہو کر بیٹھ جائے کہ وہ زمین کو بجلی کی گرج اور دیگر مفسد آفات سے بچائے گا یہاں تک کہ کھیتی اپنی تکمیل کو پہنچ جائے تو اس کو انتظار اور رجاء کہتے ہیں۔

اور اگر سخت زمین میں بیج ڈالے جو شور زدہ ہو اور بلندی پر ہو جس تک پانی نہیں پہنچ سکتا اور بیج کی پرواہ بھی نہ کرے پھر اس کے کٹنے کا انتظار کرے تو اس انتظار کو بیوقوفی اور دھوکہ کہتے ہیں امید نہیں کہتے اور اگر اچھی زمین میں بیج ڈالا لیکن اس میں پانی نہیں ہے اب وہ بارش کے انتظار میں ہے اور یہ ایسا وقت ہے جس میں عام طور پر بارش نہیں برستی اور نہ ہی اس میں کوئی رکاوٹ ہوتی ہے تو اس انتظار کو تمنا کہتے ہیں رجاء نہیں کہتے۔

تو گویا رجاء کا لفظ کسی ایسی محبوب چیز کے انتظار پر صادق آتا ہے جس کے لیے وہ تمام اسباب تیار کر دیئے گئے جو بندے کے اختیار میں ہیں صرف وہی اسباب باقی رہ گئے جو بندے کے اختیار میں نہیں ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کی وجہ سے تمام نقصان دہ اور فاسد کرنے والے اسباب کھیتی سے دور ہو جاتے ہیں پس جب بندہ ایمان کا بیج ڈالتا ہے اور اس کو عبادات کا پانی پلاتا ہے دل کو بداخلاقی کے کانٹوں سے پاک کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل کا مرتے دم تک منتظر رہتا ہے حسنِ خاتمہ جو مغفرت تک پہنچاتا ہے اس کا انتظار کرتا ہے تو یہ انتظار حقیقی رجاء (امید) ہے۔ یہ ذاتی طور پر قابلِ تعریف ہے اور موت تک اسبابِ ایمان کے مطابق اسبابِ مغفرت کی تکمیل کے لیے قیام اور دوام کا باعث ہے اور ایمان کے بیج کو عبادات کا پانی نہ دیا جائے یا دل کو برے اخلاق سے ملوث چھوڑ دیا جائے اور دنیاوی لذت میں منہمک ہو جائے پھر مغفرت کا انتظار کرے تو اس کا انتظار ایک بیوقوف اور دھوکے میں مبتلا شخص کا انتظار ہے نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

الاَحْمَقُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَ تَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ الْجَنَّةَ ۔ (۱)

بیوقوف وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کے پیچھے لاتا ہے اور (اس کے باوجود) اللہ تعالیٰ سے جنت کی تمنا کرتا ہے

ارشاد خداوندی ہے :

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۔ (۲)

پس ان لوگوں کے بعد کچھ ناخلف آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات کے پیچھے پڑ گئے پس عنقریب وہ گمراہی سے مل جائیں گے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۔ (۳)

پس ان کے بعد کچھ ناخلف آئے جو کتاب خداوندی کے وارث ہوئے وہ اس دنیا کا سامان لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عنقریب ہماری بخشش ہو جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اس باغ والے کی مذمت فرمائی جو باغ داخل ہوتے وقت کہتا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ وَّ مَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّ لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۔ (۴)

میں نہیں سمجھتا کہ یہ کبھی فنا ہو گا اور میرا خیال نہیں کہ قیامت قائم ہو گی اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا تو میں ضرور اس سے اچھی جگہ لوٹنے کی پاؤں گا۔

تو وہ بندہ جو عبادات میں کوشش کرتا اور گناہوں سے بچتا ہے وہ اس لائق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے نعمت کے پورا ہونے کی توقع رکھے اور نعمت کی تکمیل جنت میں داخل ہونے سے ہو گی، جہاں تک گناہوں کا تعلق ہے تو جب وہ توبہ کرے اور کوتاہی کا تدارک کر لے تو وہ اس لائق ہے کہ قبولیتِ توبہ کی امید رکھے اور جہاں تک اس صورت میں توبہ کی قبولیت کا تعلق ہے جب وہ گناہ کو ناپسند کرتا ہو برائی اسے بری لگتی ہو اور نیکی سے خوش ہوتا ہو نفس کی مذمت کرے اور اس

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۲۴ مرویات شداد بن اوس

(۲) قرآن مجید، سورۂ مریم آیت ۵۹

(۳) قرآن مجید، سورۂ اعراف آیت ۱۶۹

(۴) قرآن مجید، سورۂ کہف آیت ۳۵

کو ملامت کرے نیز توبہ کی خواہش رکھے اور اس کا مشتاق ہو تو اس لائق ہے کہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کی توفیق کی امید رکھے کیوں کہ اس گناہ کو ناپسند کرنا اور توبہ پر حریص ہونا اس سبب کے قائم مقام ہے جو توبہ تک لے جاتا ہے۔ اور امید، سبب کے پکا ہونے کے بعد ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ۔ (۱)

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہجرت کی اور جہاد کیا وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید کے مستحق ہیں اس سے خاص امید کا پایا جانا مراد نہیں ہے کیوں کہ دوسرے لوگ بھی امید رکھتے ہیں لیکن ان کو امید کے استحقاق کے ساتھ خاص کیا۔

لیکن جو شخص ان کاموں میں منہمک ہو جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں وہ اپنے نفس کی مذمت بھی نہ کرے اور نہ ہی توبہ اور رجوع کا قصد کرے تو اس شخص کا مغفرت کی امید رکھنا بیوقوفی ہے جیسے وہ شخص جو شور زدہ زمین میں بیج ڈالتا ہے اور اسے پانی دینے اور صاف کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتا۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں میرے نزدیک سب سے بڑا دھوکہ یہ ہے کہ معافی کی امید پر ندامت کے بغیر آدمی گناہوں میں بڑھتا جائے اطاعت کے بغیر اللہ تعالیٰ کے قرب کی توقع رکھے جہنم کا بیج ڈال کر جنت کی کھیتی کا منتظر رہے گناہوں کے ساتھ عبادت گزار لوگوں کے گھر کا طالب ہو، عمل کے بغیر جزا کا انتظار کرے اور زیادتی کے باوجود اللہ تعالیٰ سے تمنا کرے۔

تَرْجُو النَّجَاةَ وَلَمْ تَسْلُكْ مَسَالِكَهَا ۔ إِنَّ السَّفِينَةَ لَا تَجْرِي عَلَى الْيَبَسِ۔

ہم نجات کی امید رکھتے ہیں لیکن اس کے راستوں پر نہیں چلتے یقیناً کشتی خشکی پر نہیں چلتی۔

جب تمہیں امید کی حقیقت معلوم ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ ایک حالت ہے جو اکثر اسباب کے جاری ہونے کے بعد علم کے نتیجہ کے طور پر سامنے آتی ہے اور یہ حالت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ جس قدر ممکن ہو باقی اسباب کے لیے بھی کوشش کی جائے کیوں کہ جو شخص اچھا بیج ڈالتا ہے زمین کو ٹھیک کرتا ہے پانی اچھی طرح دیتا ہے تو اس کی امید سچی ہوتی ہے اور وہ سچی امید اسے ہمیشہ زمین کی دیکھ بھال اور اس میں اگنے والے کانٹوں کو صاف کرنے کی طرف متوجہ کرتی رہتی ہے پس وہ اس کو کاٹنے تک اس کی خبر گیری میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا کیوں کہ امید، ناامیدی کی ضد ہے اور ناامیدی اس کی خبر گیری کی راہ میں رکاوٹ ہوتی ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ بقرہ آیت ۲۱۸

توجس شخص نے اس بات کو مان گیا کہ زمین کلّر اور شور زدہ ہے پانی بھی کم ہے جو بیج اگانے کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ یقینی طور پر اس کی نگرانی اور دیکھ بھال چھوڑ دیتا ہے اور اس کے لیے آپ کو تھکاتا نہیں اور امید محمود ہے کیوں کہ وہ (نیکی کا) باعث ہے اور ناامیدی مذموم ہے اور وہ امید کی ضد ہے کیوں کہ وہ عمل سے دُور رکھتی ہے جب کہ خوف امید کی ضد نہیں ہے بلکہ اس کا رفیق ہے جیسے آگے بیان ہوگا بلکہ وہ ڈر کے اعتبار سے (عمل کا) دوسرا باعث ہے جس طرح امید بطور رغبت باعثِ عمل ہے۔

تو نتیجہ یہ ہوا کہ امید کی حالت اعمال کے ساتھ طولِ مجاہدہ کو جنم دیتی ہے اور حالات جس طرح بھی بدلیں اطاعت پر مواظبت ہوتی ہے اور اس کے آثار میں سے ایک علامت یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے اور اس کے ساتھ مناجات سے لطف اندوز ہوتا ہے نیز نرمی کے ساتھ اس کی خوشامد کرتا ہے یہ وہ احوال ہیں جو ہر اس شخص پر لازماً ظاہر ہوتے ہیں جو کسی بادشاہ یا کسی بھی شخص سے امید رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے حق میں ان احوال کا ظہور کیوں نہیں ہوگا اور اگر حالات کا ظہور نہیں ہوتا تو وہ مقامِ امید سے محروم اور دھوکے اور تمنا کی پستی میں گرا ہوا ہے۔

تو امید کے حال کا یہ بیان ہے اور یہ علم سے پیدا ہوتی ہے اور خود عمل کو جنم دیتی ہے اور اس سے اعمال کے پیدا ہونے پر حضرت زید الخیل رضی اللہ عنہ کی یہ روایت دلالت کرتی ہے انہوں نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا میں آپ سے اس شخص کی علامت پوچھوں جس سے اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اور اس کی علامت، جس کے لیے وہ اس بات کا ارادہ نہیں کرتا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تم نے صبح کس حالت میں کی ہے؟ انہوں نے عرض کیا میں نے اس حال میں صبح کی ہے کہ میں بھلائی اور اہلِ خیر سے محبت کرتا ہوں اور جب میں کسی نیکی پر قادر ہوتا ہوں تو اس کی طرف جلدی کرتا ہوں نیز ثواب (کے ملنے) پر یقین رکھتا ہوں اور جب مجھ سے کوئی عمل چھوٹ جاتا ہے تو اس پر غمگین ہوتا ہوں اور اس کا مشتاق ہوتا ہوں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے اس کی یہی علامت ہے اور اس کا ارادہ دوسرا ہو تو وہ تمہیں اس کے لیے آمادہ کرتا پھر وہ اس بات کی پرواہ نہ کرتا کہ تم کس وادی میں ہلاک ہوتے ہو (۱)

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی علامت بیان کی جس کے ساتھ وہ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو جو آدمی ان علامات کے علاوہ بھلائی کے لیے مراد بننے کی امید رکھے وہ دھوکے میں ہے۔

فصل ۲

امید کی فضیلت اور ترغیب

جاننا چاہیے کہ امید کے ساتھ عمل کرنا، خوف کے ساتھ عمل کرنے سے اعلیٰ ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں

(۱) کنز العمال جلد ۱۱ص ۱۰۴، ۱۰۵ حدیث ۳۰۸۰۸

ہیں سے وہ لوگ اس کے زیادہ قریب ہیں جو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں اور محبت، امید پر غالب آتی ہے اور اسے دو بادشاہوں پر قیاس کیجئے ان میں سے ایک کی خدمت اس کی سزا کے خوف سے کی جاتی ہے اور دوسرے کی خدمت انعام ملنے کی امید پر ہوتی ہے اسی لیے امید اور حسن ظن کے بارے میں بہت زیادہ ترغیب آئی ہے بالخصوص موت کے وقت ایسے کرنے کی بہت زیادہ ترغیب آئی ہے

ارشاد خداوندی ہے :۔

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ ۔ (۱) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہ ہو۔

تو نا امیدی اصلاً حرام ہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی خبروں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی اور پوچھا کیا آپ جانتے ہیں کہ میں نے کیوں آپ کے اور آپ کے بیٹے کے درمیان جدائی ڈالی ؟ (خود ہی فرمایا) اس لیے کہ آپ نے فرمایا مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ اسے بھیڑیا کھا لے گا اور تم اس غافل ہو گئے آپ نے بھیڑیئے کا ڈر کیوں محسوس کیا اور مجھ سے امید قائم نہ کی اور آپ نے ان کے بھائیوں کی غفلت کو کیوں دیکھا اور میری حفاظت کا انتظار نہ کیا۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَا یَمُوْتَنَّ اَحَدُکُمْ اِلَّا وَھُوَ یُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰہِ تَعَالٰی ۔ (۲) تم میں کسی کو ہرگز موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو۔

اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ فَلْیَظُنَّ بِیْ مَاشَاءَ (۳) بندہ مجھے اپنے گمان کے مطابق پاتا ہے تو میرے بارے میں جو گمان چاہے کرے (یعنی اچھا گمان کرے)

ایک شخص جانکنی کی حالت میں تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے آپ نے پوچھا اپنے آپ کو کیسا پاتے ہو ؟ اس نے عرض کیا میں اپنے آپ کو یوں پاتا ہوں کہ مجھے اپنے گناہوں کا خوف بھی ہے اور اپنے رب کی رحمت کی امید بھی رکھتا ہوں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ زمر آیت ۵۳

(۲) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۸۷ کتاب الجنۃ

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۳۱۵ مرویات ابی ہریرہ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَا اجْتَمَعَا فِیْ قَلْبِ عَبْدٍ فِیْ ھٰذَا الْمَوْطِنِ اِلَّا اَعْطَاہُ اللّٰہُ مَا رَجَا وَ اٰمَنَہٗ مِمَّا یَخَافُ۔ (۱)

اس وقت (وقتِ موت) میں کسی بندے کے دل میں یہ دونوں باتیں (امید اور خوف) جمع نہیں ہوتیں مگر اللہ تعالیٰ اسے اس کی امید کے مطابق عطا فرماتا ہے اور جس سے اس کو خوف ہوتا ہے اس سے اسے محفوظ رکھتا ہے۔

ایک شخص جو گناہوں کی کثرت کے باعث خوف کی وجہ سے مایوسی کا شکار ہو گیا تھا اس سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے فلاں! تمہارا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید ہونا تمہارے گناہوں سے بھی بڑا جرم ہے۔

اور حضرت سفیان رحمہ اللہ نے فرمایا جو شخص کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے پھر وہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس پر قدرت دی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشش کی امید رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخش دیتا ہے وہ فرماتے ہیں یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کا عیب یوں ذکر فرمایا۔

وَذٰلِکُمْ ظَنُّکُمُ الَّذِیْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّکُمْ اَرْدٰکُمْ۔ (۲)

اور یہ ہے تمہارا وہ گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تو اس نے تمہیں ہلاک کر دیا۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَکُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا۔ (۳)

اور تم نے برا گمان کیا اور تم ہلاک ہونے والے لوگ تھے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بندے سے پوچھے گا کہ جب تم نے برائی دیکھی تو تجھے کس چیز نے اس کو روکنے سے منع کیا پھر اگر اللہ تعالیٰ اسے اس کی دلیل سکھائے گا تو وہ کہے گا یا اللہ! مجھے تیری رحمت کی امید تھی اور لوگوں سے ڈرتا تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے تجھے بخش دیا۔ (۴)

صحیح حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا تو وہ مال دار سے درگزر کرتا اور تنگ دست کو معاف

---

(۱) کنز العمال جلد ۳ ص ۱۴۲ حدیث ۵۸۶۸

(۲) قرآن مجید، سورۂ فصلت آیت ۲۳

(۳) قرآن مجید، سورۂ فتح آیت ۱۲

(۴) السنن الکبریٰ للبیہقی جلد ۱۰ ص ۹۰ کتاب آداب القاضی

کر دیا جب اس نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تو اس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا تھا اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہم سے زیادہ اس بات کے کون لائق ہے ـــــ اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے حسن ظن اور معافی کی امید کی وجہ سے اسے معاف کر دیا حالاں کہ وہ عبادات کے اعتبار سے مفلس تھا۔ (۱)

ارشاد خداوندی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّن تَبُورَ۔ (۲)

بے شک وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پڑھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا اس میں پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں گھاٹا نہیں۔

اور جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا وَلَخَرَجْتُمْ إِلَى الصُّعُدَاتِ تَلْدِمُونَ صُدُورَكُمْ وَتَجْأَرُونَ إِلَى رَبِّكُمْ، (۳)

اگر تمہیں وہ بات معلوم ہوتی جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنستے اور زیادہ روتے اور تم گھاٹیوں کی طرف چڑھتے تمہارے سینے مضطرب ہوتے اور تم اپنے رب کے سامنے گڑگڑاتے۔

تو حضرت جبریل علیہ السلام اترے اور عرض کیا آپ کا رب فرماتا ہے کہ آپ میرے بندوں کو کیوں ناامید کرتے ہیں چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور صحابہ کرام کو امید اور شوق دلایا۔

ایک روایت میں ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ سے محبت کریں اور جو لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں ان سے بھی محبت کریں اور لوگوں کے دلوں میں میری محبت پیدا کریں انہوں نے عرض کیا اے میرے رب! میں لوگوں کے دلوں میں تیری محبت کیسے ڈالوں؟ فرمایا میرا اچھا تذکرہ کریں اور میری نعمتوں اور احسان کا ذکر کریں اور ان کو یہ بات یاد دلاتے رہیں کیوں کہ وہ مجھ سے صرف احسان کو ہی جانتے ہیں۔

حضرت ابان بن ابی عیاش رحمہ اللہ امید کا زیادہ ذکر کرتے تھے تو کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کر کے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کرتے تھے؟ انہوں نے عرض کیا میں چاہتا تھا کہ تیری مخلوق کے دل میں تیری محبت ڈالوں اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے تمہیں بخش دیا۔

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۸ اکتاب المساقاق

(۲) قرآن مجید سورۂ فاطر آیت ۲۹

(۳) مجمع الزوائد جلد ۱۰ ص ۲۳۰ کتاب الزھد

اور حضرت یحییٰ بن اکثم رحمہ اللہ کے وصال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور فرمایا اے بوڑھے! تو نے فلاں فلاں کام کیا فرماتے ہیں مجھ پر اس قدر رعب طاری ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے پھر میں نے عرض کیا اے میرے رب! حدیث شریف کے ذریعے مجھے تیرا یہ حال نہیں بتایا گیا فرمایا تیرے سامنے میرے بارے میں کیا بیان کیا گیا؟ میں نے کہا مجھ سے حضرت عبدالرزاق نے بیان کیا وہ حضرت معمر سے وہ حضرت زہری (رحمہم اللہ) سے وہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اور وہ تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ حضرت جبریل علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ تو نے فرمایا کہ بندہ میرے بارے میں جو گمان کرتا ہے مجھے اسی طرح پاتا ہے پس وہ جو چاہے گمان کرے اور میرا گمان یہ تھا کہ تو مجھے عذاب نہیں دے گا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا حضرت جبریل علیہ السلام نے سچ کہا میرے نبی نے بھی سچ کہا حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضرت زہری، حضرت معمر اور حضرت عبدالرزاق (رحمہم اللہ) نے بھی سچ کہا ہے ۔ حضرت یحییٰ بن اکثم رحمہ اللہ فرماتے ہیں پھر مجھے لباس پہنایا گیا اور جنت تک میرے آگے آگے غلام چلے تو میں نے کہا یہ خوشی کی بات ہے۔

حدیث شریف میں ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص لوگوں کو مایوس کرتا اور ان پر سختی کرتا تھا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا آج تو میری رحمت سے مایوس ہوگا جس طرح تو میرے بندوں کو اس سے مایوسی کا شکار کرتا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ایک شخص جہنم میں جائے گا تو وہاں ایک ہزار سال رہے گا وہ پکارے گا اے حنان! اے منان! تو اللہ تعالیٰ حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمائے گا جاکر میرے بندے کو لے آؤ چنانچہ وہ اسے لاکر اس کے رب کے سامنے کھڑا کریں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے اپنی جگہ کو کیسا پایا؟ وہ عرض کرے گا بہت بری جگہ ہے اللہ تعالیٰ فرمائے گا اسے دوبارہ وہیں لے جاؤ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں وہ چلے گا اور پیچھے مڑ کر بھی دیکھے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو کیا دیکھتا ہے؟ وہ عرض کرے گا مجھے امید تھی کہ تو مجھے وہاں سے نکالنے کے بعد دوبارہ وہاں نہیں بھیجے گا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اسے جنت میں لے جاؤ۔ (۱)

تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی امید ہی اس کی نجات کا سبب بنی ہم اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کے ساتھ اس سے حسنِ توفیق کا سوال کرتے ہیں۔

فصل ۳

امید کی دوا اور حالتِ رجاء کیسے حاصل ہوتی ہے

جاننا چاہیے کہ اس دوا کے محتاج دو (قسم کے) آدمی ہوتے ہیں ایک وہ جس پر مایوسی غالب آجائے اور وہ عبادت

---

(۱) شعب الایمان جلد اول ص ۲۹۲ حدیث ۱۰۲۰۔

کرنا چھوڑ دے اور دوسرا وہ جس پر خوف غالب ہو جائے اور وہ عبادت کی پابندی میں حد سے بڑھ جائے حتیٰ کہ اس کے ذریعے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو تکلیف دے یہ دونوں (قسم کے) آدمی راہ اعتدال سے ہٹ کر افراط و تفریط کا شکار ہو گئے لہٰذا یہ ایسے علاج کے محتاج ہیں جو ان کو اعتدال کی طرف لے جائے لیکن وہ شخص جو گناہ کا مرتکب ہے اور دھوکے میں ہے وہ عبادت سے منہ پھیرنے اور گناہوں کے ارتکاب کے باوجود اللہ تعالیٰ سے تمنا کرتا ہے تو اس کے حق میں امید کی دوائیں ہلاکت خیز زہر ہیں اور وہ شہد کی طرح ہیں جو اس شخص کے لیے شفا ہے جس پر سردی غالب ہو جب کہ اس شخص کے لیے مہلک زہر ہے جس پر حرارت غالب ہو بلکہ دھوکے کے شکار شخص کے لیے صرف خوف کی دوائیں استعمال کرنی چاہیں اور وہ اسباب جو خوف پیدا کریں۔

اسی لیے مخلوق کو وعظ کرنے والے کو نرمی برتنے والا اور بیماریوں کے مقامات سے آگاہ ہونا چاہیے وہ ہر بیماری کا علاج اس کی ضد سے کرے ایسی دوائی نہ دے جس سے بیماری بڑھ جائے کیوں کہ مقصود تو صفات و اخلاق میں اعتدال پیدا کرنا ہے اور بہترین امور وہی ہوتے ہیں جن میں میانہ روی ہو۔ لیکن جب اعتدال کسی ایک طرف کو جھک جائے تو ایسی دوائی کے ساتھ علاج کیا جائے جو اس کو اعتدال کی طرف پھیر دے ایسی دوائی نہیں جو اس کو اعتدال سے کسی ایک طرف کو پھیر دے اور یہ وہ زمانہ ہے جس میں مخلوق کے ساتھ امید (رجاء) کے اسباب استعمال نہ کئے جائیں بلکہ ڈرانے میں مبالغہ بھی ممکن ہے ان کو راہ حق کی طرف نہ لائے۔

لیکن امید کے اسباب کا ذکر تو ان کو بالکل ہی تباہ کر دیتا ہے لیکن چونکہ امید کے اسباب دلوں پر زیادہ ہلکے اور نفوس کے لیے زیادہ لذیذ ہوتے ہیں اور واعظوں کی غرض لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کرنا ہوتی ہے اور ہر حال میں ان کا ثنا خواں رہنا ہوتا ہے اس لیے وہ امید دلانے کی طرف مائل ہوتے ہیں حتیٰ کہ فساد میں اضافہ ہو جاتا ہے اور سرکشی میں منہمک لوگ اپنی سرکشی میں بڑھ جاتے ہیں۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا عالم وہ شخص ہے جو نہ تو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید کرے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے ان کو بے خوف کرے۔

ہم امید کے اسباب ذکر کرتے ہیں تاکہ وہ مایوس لوگوں کے حق میں استعمال ہوں یا ان کے حق میں جن پر خوف غالب ہے ہم کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں ایسا کر رہے ہیں۔ کیوں کہ قرآن و سنت دونوں خوف اور امید پر مشتمل ہیں اس لیے کہ یہ دونوں مختلف قسم کے مریضوں کی شفاء کے حق میں جامع ہیں تاکہ علماء کرام جو انبیاء کرام کے وارث ہیں ان دونوں کو حسب ضرورت استعمال کریں وہ ماہر طبیب کا طریقہ اختیار کریں بے وقوف معالج کی طرح نہیں جس کے خیال میں ہر دوائی ہر قسم کے مریض کے لیے کارگر ہے جو بھی بیماری ہو۔

حالتِ رجاء کے غالب ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک قیاس اور دوسری آیات و احادیث اور آثار کی تلاش۔

قیاس یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے شکر کے باب میں مختلف نعمتوں کا ذکر کیا ہے ان میں غور و فکر کرے حتی کہ جب اسے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے لطائف کا علم ہو جائے جو اس نے دنیا میں اپنے بندوں کے لیے رکھے ہیں اور اس کی حکمتوں کے وہ عجائب جن کی فطرتِ انسانی میں رعایت فرمائی ہے حتی کہ اس نے اس کے لیے دنیا میں ہر وہ چیز تیار کی ہے جو اس کے بقائے وجود کے لیے ضروری ہے جس طرح آلاتِ غذاء، اور جن کا وہ محتاج ہے جیسے انگلیاں، ناخن اور جو کچھ انسان کے لیے زینت ہے جیسے ابروؤں کا قوس کی شکل میں ہونا آنکھوں کے رنگوں میں اختلاف اور ہونٹوں کی سرخی وغیرہ جن کے نہ ہونے سے انسانی غرض میں خلل واقع نہ ہوتا صرف حسن و جمال میں فرق پڑتا۔

تو اللہ تعالیٰ کی عنایت جب اس قسم کی باریک باتوں میں اس کے بندوں سے کوتاہ نہیں ہوتی حتی کہ وہ اس بات پر راضی نہیں کہ ان سے زوائد چھوٹ جائیں اور زینت و حاجت کی اشیاء باقی نہ رہیں تو وہ ان کو ابدی ہلاکت کی طرف لے جانے کو کیسے پسند فرمائے گا بلکہ اگر انسان شافی نظر سے دیکھے تو اسے معلوم ہو گا کہ اکثر مخلوق کے لیے دنیا میں اسبابِ سعادت تیار کئے گئے ہیں حتی کہ وہ موت کے ذریعے دنیا سے منتقل ہونا پسند نہیں کرتا اگرچہ اسے بتایا جائے کہ موت کے بعد اسے کبھی بھی عذاب نہیں ہو گا یا وہ بالکل زندہ ہی نہیں کیا جائے گا تو ان کا موت کو پسند کرنا معدوم ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ نعمتوں کے اسباب لامحالہ غالب ہیں اور موت کی تمنا کرنے والے لوگ بہت کم ہیں پھر یہ تمنا بھی نادر حالت اور عجیب حادثہ کے وقت ہوتی ہے۔

تو جب دنیا میں اکثر لوگوں کی غالب حالت خیر و سلامتی ہے تو تم اللہ تعالیٰ کے طریقے میں تبدیلی نہیں پاؤ گے تو غالب یہی ہے کہ آخرت کا معاملہ بھی اسی طرح ہو گا کیوں کہ وہ دنیا اور آخرت کی تدبیر کرنے والا تو ایک ہی ہے اور وہ غفور ہے رحیم ہے بندوں پر مہربان ہے تو جب اچھی طرح غور کیا جائے تو اس سے امید کے اسباب قوی ہو جاتے ہیں۔ حکمت شریعت میں غور کرنا بھی قیاس ہے نیز مصالح دینوی کو بروئے کار لانے اور ان کے ذریعے بندوں پر رحمت کی وجہ بھی پیش نظر رکھی جائے حتی کہ بعض عارفین سورۂ بقرہ کی قرض سے متعلق آیت کو بھی امید کے مضبوط اسباب میں سے دیکھتے تھے پوچھا گیا کہ اس میں امید کا پہلو کہاں ہے، تو انہوں نے فرمایا تمام دنیا قلیل ہے اور اس میں سے انسان کا رزق تھوڑا ہے اور قرض اس رزق سے بھی تھوڑا ہے تو دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں نہایت طویل آیت نازل فرمائی تاکہ بندہ اپنے دین کی حفاظت میں احتیاط کے طریقے کی راہنمائی حاصل کرے تو جس دین کا کوئی عوض نہیں اس کی احتیاط نہیں کرے گا؟

دوسری صورت آیات و احادیث کی تلاش ہے تو امید کے بارے میں بے شمار آیات و احادیث وارد ہوئی ہیں۔

آیات:-

ارشاد خداوندی ہے:-

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (۱)

آپ فرما دیجئے اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی کہ تم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو بے شک اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو بخش دے گا بے شک وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک قرأت میں ہے۔

وَلَا یُبَالِیْ اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔ (۲)

اور وہ پرواہ نہ کرے بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے

اور ارشاد خداوندی ہے:

وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّہِمْ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِی الْاَرْضِ۔ (۳)

اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں۔ اور زمین والوں کے لیے بخشش طلب کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے خبر دی کہ اس نے جہنم اپنے دشمنوں کے لیے تیار کیا ہے اور اپنے دوستوں کو اس سے ڈرایا ہے۔ پس فرمایا۔

لَہُمْ مِّنْ فَوْقِہِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِہِمْ ظُلَلٌ ذٰلِکَ یُخَوِّفُ اللّٰہُ بِہٖ عِبَادَہٗ۔ (۴)

ان کے لیے ان کے اوپر آگ کے سائبان ہیں اور نیچے بھی اور اللہ تعالیٰ اسے اپنے بندوں (مسلمانوں) کو ڈراتا ہے

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ۔ (۵)

اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

فَاَنْذَرْتُکُمْ نَارًا تَلَظّٰی لَا یَصْلٰھَآ اِلَّا

پس میں نے تم کو ڈرایا روشن ہونے والی آگ سے اس

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ زمر آیت ۵۳

(۲) جامع ترمذی ص ۴۶۶، ابواب التفسیر

(۳) قرآن مجید سورۃ شوریٰ آیت ۵

(۴) قرآن مجید سورۃ زمر آیت ۱۶

(۵) قرآن مجید سورۃ آل عمران آیت ۱۳۱

اُلاَشْقَی الَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی ۔ (۱) ہیں وہی بدبخت داخل ہوگا جس نے جھٹلایا اور پھر گیا۔

اور ارشاد خداوندی ہے ۔

اِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ مَغْفِرَۃٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِھِمْ ۔ (۲) بے شک تمہارا رب لوگوں کے لیے ان کے ظلم پر بخشش فرمانے والا ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لیے مسلسل دعا مانگتے رہے یہاں تک کہ کہا گیا کہ کیا آپ اب بھی راضی نہیں حالانکہ آپ پر یہ آیت نازل کی گئی ۔

وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ مَغْفِرَۃٍ لِّلنَّاسِ عَلٰی ظُلْمِھِمْ ۔ (۳) ، (۴) اور بے شک آپ کا رب لوگوں کے گناہ بخشنے والا ہے ۔

اور اس آیت کریمہ ۔

وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی ۔ (۵) اور عنقریب آپ کو آپ کا رب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہوجائیں گے ۔

کی تفسیر میں آپ نے فرمایا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک آپ کا ایک بھی امتی جہنم میں ہوگا ۔

حضرت ابوجعفر محمد بن علی رحمہ اللہ فرماتے تھے اے اہل عراق تم اس آیت کو زیادہ امید والی آیت قرار دیتے ہو ۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ ۔ (۶) آپ فرما دیجئے اے میرے بندو جنہوں نے اپنے نفسوں پر زیادتی کی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو

اور ہم اہل بیت کے نزدیک یہ آیت زیادہ امید دلاتی ہے

وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ اور عنقریب آپ کا رب آپ کو وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ

---

(۱) قرآن مجید ، سورۃ اللیل آیت ۱۴ ، ۱۵

(۲) قرآن مجید ، سورہ رعد آیت ۶

(۳) قرآن مجید ، سورۃ رعد آیت ۶

(۴) تفسیر لاحکام القرآن جلد ۹ ص ۲۸۵ تحت آیت وان ربک لذو مغفرہ للناس

(۵) قرآن مجید ، سورۃ والضحیٰ آیت ۵

(۶) قرآن مجید ، سورۃ زمر آیت ۵۳

فَتَرضیٰ ۔ (۱) آپ راضی ہو جائیں گے۔

احادیث مبارکہ:

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا۔
میری امت، امتِ مرحومہ ہے اسے آخرت میں عذاب نہیں ہو گا اللہ تعالیٰ نے زلزلوں اور فتنوں کی شکل میں اسے دنیا میں ہی سزا دے دی اور جب قیامت کا دن ہو گا تو میری امت کے ہر فرد کو اہل کتاب میں سے ایک شخص دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ جہنم میں تمہارا فدیہ ہے (۲)
اور ایک روایت میں اس طرح ہے کہ اس امت میں ہر ایک یہودی یا نصرانی کو جہنم کی طرف لایا جائے گا اور وہ کہے گا کہ جہنم میں یہ میرا فدیہ ہے پس اسے اس میں ڈالا جائے گا۔ (۳)
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَلحُمّٰی مِنْ فَیحِ جَهَنَّمَ وَهِیَ حَظُّ المُؤْمِنِ مِنَ النَّارِ ۔ (۴)
بخار جہنم کی بھاپ ہے اور یہ مومن کا آگ سے حصہ ہے۔

اور آیت کریمہ

یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۔ (۵)
جس دن اللہ تعالیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان لوگوں کو جو ان پر ایمان لائے، رسوا نہیں کرے گا۔

کی تفسیر میں مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے آپ کی امت کا حساب آپ کے حوالے کیا آپ نے عرض کیا اے رب! نہیں بلکہ میرے مقابلے میں تو آن پر زیادہ مہربان ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا! جب یہ بات ہے تو ہم ان کے بارے میں آپ کو رسوا نہیں کریں گے (۶)
حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے اپنی امت کے گناہوں کے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ والضحیٰ آیت ۵
(۲) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۲۳۲، کتاب الفتن (اختصار کے ساتھ) کنز العمال جلد ۱۲ ص ۱۷۰ حدیث ۳۴۵۲۴
(۳) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۶۰ کتاب التوبہ
(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۵۲ مرویات ابی امامہ
(۵) قرآن مجید، سورۂ تحریم آیت ۸
(۶) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۳۹۳

بارے میں یوں عرض کیا کہ یا اللہ! ان کا حساب میرے حوالے کرنا تاکہ ان کی برائیوں پر میرے علاوہ کوئی مطلع نہ ہو تو اللہ تعالے نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ وہ آپ کی امت ہیں اور میرے بندے ہیں اور میں ان پر آپ سے زیادہ رحیم ہوں۔ میں ان کا حساب کسی کے حوالے نہیں کروں گا کہ آپ یا کوئی دوسرا ان کی برائیوں کو دیکھے۔ (۱)

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

حَیَاتِیْ خَیْرٌ لَّکُمْ وَمَوْتِیْ خَیْرٌ لَّکُمْ اَمَّا حَیَاتِیْ فَاَسُنُّ لَکُمُ السُّنَنَ وَاَشْرَعُ لَکُمُ الشَّرَائِعَ وَاَمَّا مَوْتِیْ فَاِنَّ اَعْمَالَکُمْ تُعْرَضُ عَلَیَّ فَمَا رَاَیْتُ مِنْهَا حَسَنًا حَمِدْتُ اللّٰهَ عَلَیْهِ وَمَا رَاَیْتُ مِنْهَا سَیِّئًا اَسْتَغْفَرْتُ اللّٰهَ تَعَالٰی لَکُمْ (۲)

میری (ظاہری) زندگی بھی تمہارے لیے بہتر ہے اور میرا وصال بھی تمہارے لیے بہتر ہے زندگی اس لیے کہ میں تمہیں سنتیں اور شرعی احکام دیتا ہوں اور وفات اس لیے کہ تمہارے اعمال مجھ پر پیش کیے جائیں گے تو میں ان میں سے اچھے اعمال دیکھ کر ان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کروں گا اور جو برائی دیکھوں گا تو اللہ تعالیٰ سے تمہاری بخشش کا سوال کروں گا۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن فرمایا "یَا کَرِیْمَ الْعَفْوِ" تو حضرت جبریل علیہ السلام نے پوچھا کیا آپ کو اس کی تفسیر معلوم ہے؟ (اس کی تفسیر یہ ہے کہ) اگر وہ گناہوں کو اپنی رحمت کے تحت معاف کر دے تو اپنے کرم سے ان کو نیکیوں سے بدل دیتا ہے (۳)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے سنا وہ کہہ رہا تھا یا اللہ! میں تجھ سے نعمت کی تکمیل کا سوال کرتا ہوں آپ نے پوچھا تمہیں معلوم ہے نعمت کی تکمیل کیا ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں آپ نے فرمایا جنت میں داخل ہونا۔ (۴)

بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ہم پر اپنی نعمت کو مکمل کر دیا کہ ہمارے لیے اسلام کو پسند فرمایا۔

ارشاد خداوندی ہے۔

وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (۵)

اور میں نے تم پر اپنی نعمت کو مکمل کر دیا اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔

---

(۱) المطالب العالیہ جلد ۴ ص ۲۲، ۲۳ حدیث ۳۸۵۳

(۲) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور وصال دونوں امت کے لیے خیر ہیں اسی لیے مسلمان آپ کی وفات نہیں مناتے بلکہ ولادت کی خوشی عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مناتے ہیں ۱۲ ہزاروی

(۳) یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نہیں بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت جبریل علیہ السلام کے درمیان مکالمہ ہے۔

(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۳۵ مرویات معاذ

(۵) قرآن مجید سورۃ مائدہ آیت ۳

حدیث شریف میں ہے۔

إِذَا أَذْنَبَ الْعَبْدُ ذَنْبًا فَاسْتَغْفَرَ اللّٰهَ يَقُولُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لِمَلَائِكَتِهِ انْظُرُوا إِلَى عَبْدِي أَذْنَبَ ذَنْبًا فَعَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ وَيَأْخُذُ بِالذَّنْبِ أُشْهِدُكُمْ أَنِّي قَدْ غَفَرْتُ لَهُ۔ (۱)

جب بندہ کوئی گناہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے دیکھو میرے بندے نے گناہ کیا اور اسے معلوم ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہوں کو بخش دیتا ہے اور گناہوں پر مواخذہ بھی فرماتا ہے میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ اس نے اسے بخش دیا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔

لَوْ أَذْنَبَ الْعَبْدُ حَتّٰى تَبْلُغَ ذُنُوبُهُ عَنَانَ السَّمَاءِ غَفَرْتُهَا لَهُ مَا اسْتَغْفَرَنِي وَرَجَانِي۔ (۲)

اگر بندہ گناہ کرے حتیٰ کہ اس کے گناہ آسمان کی بلندی تک پہنچ جائیں تو میں اسے بخش دوں گا جب تک وہ مجھ سے بخشش مانگتا رہے اور مجھ سے امید رکھے۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

لَوْ يَلْقَانِي عَبْدِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ ذُنُوبًا لَقِيتُهُ بِقُرَابِ الْأَرْضِ مَغْفِرَةً۔ (۳)

اگر میرا بندہ مجھ سے زمین بھر کی مقدار گناہوں کے ساتھ ملاقات کرے تو میں زمین بھر مغفرت کے ساتھ اس سے ملاقات کرتا ہوں۔

ایک حدیث شریف میں ہے۔

إِنَّ الْمَلَكَ لَيَرْفَعُ الْقَلَمَ عَنِ الْعَبْدِ إِذَا أَذْنَبَ سِتَّ سَاعَاتٍ فَإِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ لَمْ يَكْتُبْهُ عَلَيْهِ وَإِلَّا كَتَبَهَا سَيِّئَةً۔ (۴)

بندہ جب گناہ کرتا ہے تو بے شک فرشتہ اس سے چھ ساعتیں قلم اٹھا دیتا ہے پس اگر وہ توبہ کرے اور اپنے لیے بخشش مانگے تو اس پر گناہ نہیں لکھتا ورنہ ایک گناہ لکھتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے۔

فَإِذَا كَتَبَهَا عَلَيْهِ وَعَمِلَ حَسَنَةً قَالَ

پس جب وہ فرشتہ گناہ لکھ دیتا ہے پھر وہ شخص نیک عمل

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۴۹۲ مرویات ابوہریرہ۔
(۲) الترغیب والترہیب جلد ۲ ص ۴۶۷ کتاب الذکر
(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۱۵۳ مرویات ابوہریرہ
(۴) مجمع الزوائد جلد ۱۰ ص ۲۰۷ کتاب التوبہ

صَاحِبُ الْيَمِيْنِ لِصَاحِبِ الشِّمَالِ وَهُوَ اَمِيْرٌ عَلَيْهِ اَلْقِ هٰذِهِ السَّيِّئَةَ حَتّٰى اَلْقِيَ مِنْ حَسَنَاتِهٖ وَاحِدَةً تَضْعِيْفَ الْعَشْرِ وَاَدْفَعَ لَهٗ تِسْعَ حَسَنَاتٍ فَتُلْقٰى عَنْهُ السَّيِّئَةُ ۔ (۱)

کرتا ہے تو دائیں طرف والا فرشتہ بائیں جانب والے سے کہتا ہے اور وہ (دائیں طرف والا) اس (بائیں طرف والے) پر امیر ہے، کہ اس گناہ کو نکال دو یہاں تک کہ میں اس کی نیکیوں میں سے ایک نیکی نکال دوں گا جو دس گنا بڑھی تھی اور اس کیلئے نو نیکیاں اوپر بھیجوں گا تو اس سے برائی دور کر دی جاتی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث میں روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے تو وہ اس کے ذمہ لکھ دیا جاتا ہے ایک دیہاتی نے عرض کیا اگر اس سے توبہ کر لے تو؟ فرمایا اس سے مٹا دیا جاتا ہے اس نے پوچھا اگر وہ دوبارہ کرے تو؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر اس پر لکھ دیا جاتا ہے اعرابی نے پوچھا پھر توبہ کر لے تو؟ فرمایا اس کے نامۂ اعمال سے مٹا دیا جاتا ہے اس نے پوچھا کب تک؟ فرمایا۔ یہاں تک کہ وہ بخشش طلب کرے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرے بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے سے نہیں تھکتا بندہ بخشش مانگنے سے تھک جاتا ہے جب کوئی بندہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو دائیں طرف والا فرشتہ ایک نیکی لکھ دیتا ہے حالانکہ ابھی تک اس نے عمل نہیں کیا پھر اگر وہ اس پر عمل کرتا ہے تو اس کے نامۂ اعمال میں دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ اسے بڑھا کر سات سو گنا کر دیتا ہے اور جب وہ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے ذمہ لکھی نہیں جاتی اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو ایک گناہ لکھا جاتا ہے اور اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچھی طرح معاف کرتا ہے (۲)

ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں صرف ایک مہینے کے روزے رکھتا ہوں اس پر اضافہ نہیں کرتا اور میں صرف پانچ نمازیں پڑھتا ہوں اس سے زیادہ نہیں پڑھتا اور میرے مال میں زکوٰۃ فرض نہیں ہے اور نہ ہی مجھ پر حج فرض ہے اور نہ ہی نفل حج کرتا ہوں میں مرنے کے بعد کہاں جاؤں گا؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ہاں تم میرے ساتھ ہو گے جب تم اپنے دل کو دو باتوں یعنی خیانت اور حسد سے بچاؤ اپنی زبان سے دو باتوں یعنی غیبت اور جھوٹ سے اور آنکھوں کو دو باتوں سے بچاؤ یعنی جس کی طرف نظر کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کی طرف نہ دیکھو اور کسی مسلمان کو حقارت سے نہ دیکھو تو میرے ساتھ بلکہ میری ان دو ہتھیلیوں پر جنت میں جاؤ گے (۳)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں ہے ایک اعرابی نے عرض کیا یا رسول اللہ! مخلوق کے حساب

---

(۱) کنز العمال جلد ۴ ص ۲۱۴ حدیث ۱۰۲۱۲

(۲) شعب الایمان جلد ۵ ص ۳۰۷ حدیث ۷۰۹۰، کنز العمال جلد ۴ ص ۲۲۴ حدیث ۱۰۳۱۴

میں کون مبتلا ہوگا! آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ خود حساب لے گا اس نے پوچھا وہ ذاتی طور پر حساب لے گا؟ آپ نے فرمایا ہاں (یہ سن کر) اعرابی ہنس پڑا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا اے اعرابی! تم کیسے ہنسے ہو؟ اس نے عرض کیا کریم کی شان ہے کہ جب قادر ہو تو معاف کرتا ہے اور جب حساب لیتا ہے تو چشم پوشی کرتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اعرابی صحیح کہتا ہے سنو! اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی کریم نہیں وہ سب کریموں سے بڑا کریم ہے پھر فرمایا اعرابی سمجھ گیا۔ اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کعبۃ اللہ کو شرافت و عظمت عطا فرمائی اور اگر کوئی شخص اس کا ایک ایک پتھر اکھاڑ دے پھر اسے جلا دے تو اس کا جرم اس شخص کے جرم کو نہیں پہنچ سکتا جو اللہ تعالیٰ کے کسی ولی کی توہین کرتا ہے اعرابی نے پوچھا اللہ تعالیٰ کے ولی کون ہیں؟ آپ نے فرمایا تمام مومن اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی نہیں سنا۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ مومنوں کا دوست ہے وہ ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے۔

بعض روایات میں ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ اَفْضَلُ مِنَ الْكَعْبَةِ۔ (۲)

مومن، کعبۃ اللہ سے افضل ہے۔

اور یہ بھی ہے۔

وَالْمُؤْمِنُ طَیِّبٌ طَاهِرٌ۔ (۳)

اور مومن طیب و طاہر (پاک) ہے۔

اور یہ بھی آیا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُ اَكْرَمُ عَلَی اللّٰهِ تَعَالٰی مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ۔ (۴)

اور مومن اللہ تعالیٰ کے ہاں فرشتوں سے زیادہ معزز ہے۔

ایک حدیث شریف میں ہے۔

خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالٰی جَهَنَّمَ مِنْ فَضْلِ رَحْمَتِهٖ سَوْطًا لِیَسُوْقَ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهُ الْجَنَّةَ۔ (۵)

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے جہنم کو ایک کوڑا بنایا جس کے ذریعے وہ اپنے بندوں کو جنت کی طرف ہانکتا ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ بقرہ آیت ۲۵۷

(۲) سنن ابن ماجہ ص ۲۹۰، ابواب الفتن

(۳) صحیح بخاری جلد اول ص ۱۶۷، کتاب الجنائز

(۴) سنن ابن ماجہ ص ۲۹۱، ابواب الفتن

(۵) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۳۰۲ مرویات ابوہریرہ، (الفاظ متبادل ہیں)

ایک دوسری حدیث شریف میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

إِنَّمَا خَلَقْتُ الْخَلْقَ لِيَرْبَحُوا عَلَيَّ وَلَمْ أَخْلُقْهُمْ لِأَرْبَحَ عَلَيْهِمْ۔

بے شک میں نے مخلوق کو اس لیے پیدا کیا اس لیے پیدا نہیں کیا کہ

ایک دوسری حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا۔

مَا خَلَقَ اللّٰهُ تَعَالَىٰ شَيْئًا إِلَّا جَعَلَ لَهُ مَا يَغْلِبُهُ وَجَعَلَ رَحْمَتَهُ تَغْلِبُ غَضَبَهُ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو بھی پیدا فرمایا اس کے لیے اس پر غالب آنے والی کوئی چیز بھی بنائی ہے اور اس نے اپنی رحمت کو اپنے غضب پر غالب آنے کے لیے بنایا۔

ایک دوسری مشہور روایت میں ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَىٰ كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ الْخَلْقَ إِنَّ رَحْمَتِي تَغْلِبُ غَضَبِي۔ (۲)

بے شک اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے اپنے ذمۂ کرم پر رحمت لکھدی (اور فرمایا) بے شک میری رحمت، میرے غضب پر غالب ہے۔

حضرت معاذ بن جبل اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (۳)
وَمَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ لَمْ تَمَسَّهُ النَّارُ (۴)

جس نے "لا الہ الا اللہ" پڑھا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس کا آخری کلام "لا الہ الا اللہ" ہو اس کو آگ نہیں چھوئے گی۔

اور فرمایا۔

وَمَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا حُرِّمَتْ عَلَيْهِ النَّارُ۔ (۵)

اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے اس طرح ملاقات کرے کہ اس نے اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو تو اس پر جہنم کی آگ حرام کردی گئی۔

---

(۱) مجمع الزوائد جلد ۱۰ ص ۲۱۳، کتاب التوبہ
(۲) صحیح بخاری جلد اول ص ۴۵۳ کتاب بدء الخلق
(۳) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۵ ص ۱۹۷ حدیث ۵۰۷۴
(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۳۳ مرویات معاذ
(۵) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۱۷۰ مرویات ابن عمرو

اور یہ بھی فرمایا۔

وَلَا يَدْخُلُهَا مَنْ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ اِيْمَانٍ۔ (۱)

اور وہ شخص اس (جہنم) میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ بھر بھی ایمان ہو۔

ایک دوسری حدیث میں ہے۔

لَوْ عَلِمَ الْكَافِرُ سَعَةَ رَحْمَةِ اللهِ مَا الْيَسَ مِنْ جَنَّتِهٖ۔ (۲)

اگر کافر اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو جان لے تو اس کی جنت سے کوئی بھی مایوس نہ ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی۔

اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ۔ (۳)

بے شک قیامت کا زلزلہ بہت بڑی چیز ہے۔

تو آپ نے فرمایا۔

کیا تم جانتے یہ کون سا دن ہے؟ یہ وہ دن ہے جب حضرت آدم علیہ السلام سے کہا جائے گا اٹھیے اور اپنی اولاد میں سے جہنم کے مستحقین کو بھیجیں وہ پوچھیں گے کتنے لوگوں کو؟ کہا جائے گا ہر ہزار میں سے نو سو ننانوے کو جہنم کی طرف اور ایک کو جنت میں بھیجیں۔ یہ سن کر سب لوگ (صحابہ کرام) حیران غمگین ہو گئے اور رونا شروع کر دیا اور اس دن انہوں نے کچھ کام نہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور پوچھا کیا ہوا کام نہیں کرتے؟

انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! جو کچھ آپ نے ہم سے بیان کیا ہے اس کے بعد کون کام میں مشغول ہو سکتا ہے؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام امتوں میں تمہاری کتنی تعداد ہے؟ تاویل، تاریس، منسک اور یاجوج و ماجوج ایسی قومیں ہیں جن کا شمار صرف اللہ تعالیٰ کر سکتا ہے تم باقی تمام امتوں میں اس طرح ہو جس طرح سیاہ رنگ کے بیل میں ایک سفید بال ہو اور جانور کے پاؤں میں ایک الگ رنگ ہوتا ہے (۴)

تو دیکھئے کس طرح آپ نے مخلوق کو خوف کے کوڑوں کے ساتھ چلایا اور امید کی لگاموں کے ساتھ پیچھے لائے پہلے ان کو خوف کے کوڑوں کے ذریعے ہانکا اور جب وہ بہت زیادہ مایوسی کی وجہ سے حدِ اعتدال سے نکلنے لگے تو امید کی دوا کے ساتھ ان کا علاج کیا اور ان کو اعتدال اور میانہ روی کی طرف لوٹایا اور دوسری بات، پہلی بات کے خلاف نہیں ہے۔ لیکن

---

(۱) صحیح مسلم جلد اول ص ۶۵ کتاب الایمان

(۲) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۵۸ کتاب الرقاق

(۳) قرآن مجید، سورۃ حج آیت ۱

(۴) جامع ترمذی ص ۴۵۴، ابواب التفسیر

پہلے پہلے اس بات کا ذکر کیا جو شفاء کا سبب ہے اور اسی پر اکتفا کیا پھر جب وہ امید کے ذریعے معالجہ کے محتاج ہوئے تو پورا معاملہ ذکر کر دیا۔ تو واعظ کو چاہیے کہ وہ واعظوں کے سردار صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار کرے اور خوف و امید کے بارے میں مروی روایات کے استعمال میں نرمی سے حاجت کے مطابق کام لے اور پہلے باطنی علتوں کو دیکھ لے اور اگر اس بات کی رعایت نہیں کرے گا تو اس کا وعظ اصلاح کے مقابلے میں فساد کا باعث زیادہ ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے۔

لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَخَلَقَ اللّٰهُ خَلْقًا يُذْنِبُوْنَ فَيَغْفِرُ لَهُمْ۔ (۱)

اگر تم سے گناہ سرزد نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ کوئی اور مخلوق پیدا فرمائے گا جو گناہ کے مرتکب ہو تو ان کو بخش دیا جائے گا۔

دوسرے الفاظ میں اس طرح ہے۔

لَذَهَبَ بِكُمْ وَجَاءَ بِخَلْقٍ آخَرَ يُذْنِبُوْنَ فَيَغْفِرُ لَهُمْ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ۔ (۲)

تو اللہ تعالیٰ تمہیں لے جائے گا اور دوسری مخلوق کو لے آئے گا جن سے گناہ سرزد ہو تو ان کو بخش دیا جائے گا بے شک وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

ایک حدیث شریف میں ہے۔

لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَخَشِيْتُ عَلَيْكُمْ مَا هُوَ شَرٌّ مِّنَ الذُّنُوْبِ قِيْلَ مَا هُوَ قَالَ الْعُجْبُ۔ (۳)

اگر تم سے گناہ نہیں ہوگا تو مجھے تم پر گناہوں سے بھی زیادہ بری بات کا ڈر ہے عرض کیا گیا وہ کیا ہے فرمایا خود پسندی (تکبر)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَلّٰهُ اَرْحَمُ بِعَبْدِهِ الْمُؤْمِنِ مِنَ الْوَالِدَةِ الشَّفِيْقَةِ بِوَلَدِهَا۔ (۴)

اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے البتہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے پر شفیق ماں کے اپنے بچے پر مہربان ہونے سے بھی بڑھ کر مہربان ہے۔

حدیث شریف میں ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۵۵ کتاب التوبۃ

(۲) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۵۵ کتاب التوبۃ

(۳) الترغیب والترہیب جلد ۳ ص ۷۱ کتاب الادب

(۴) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۸۷ کتاب الادب

لَيَغْفِرَنَّ اللّٰهُ تَعَالٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَغْفِرَةً مَا خَطَرَتْ عَلٰى قَلْبِ اَحَدٍ حَتّٰى اَنَّ اِبْلِيْسَ لَيَتَطَاوَلُ لَهَا رَجَاءَ اَنْ تُصِيْبَهُ ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس قدر بخشش فرمائے گا جس کا کسی دل میں تصور بھی نہ ہوگا حتیٰ کہ ابلیس بھی اس کا منتظر ہوگا کہ شاید مجھے بخش دیا جائے۔

حدیث شریف میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى مِائَةَ رَحْمَةٍ اَدَّخَرَ مِنْهَا عِنْدَهُ تِسْعًا وَتِسْعِيْنَ رَحْمَةً وَاَظْهَرَ مِنْهَا فِى الدُّنْيَا رَحْمَةً وَاحِدَةً فَبِهَا يَتَرَاحَمُ الْخَلْقُ فَتَحِنُّ الْوَالِدَةُ عَلٰى وَلَدِهَا وَتَعْطِفُ الْبَهِيْمَةُ عَلٰى وَلَدِهَا فَاِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ ضَمَّ هٰذِهِ الرَّحْمَةَ اِلَى التِّسْعِ وَالتِّسْعِيْنَ ثُمَّ بَسَطَهَا عَلٰى جَمِيْعِ خَلْقِهٖ وَكُلُّ رَحْمَةٍ مِنْهَا طِبَاقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قَالَ فَلَا يَهْلِكُ عَلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ اِلَّا هَالِكٌ ۔ (۲)

بے شک اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک سو رحمتیں ہیں اس نے ان میں سے ننانوے رحمتوں کو جمع کیا اور ایک کو دنیا میں ظاہر کیا اسی کے سبب لوگ ایک دوسرے پر رحم کرتے ہیں ماں اسی کے سبب اپنے بچے پر اور جانور اپنے بچوں پر شفقت کرتے ہیں اور جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس رحمت کو ننانوے رحمتوں کے ساتھ ملا دے گا پھر اسے تمام مخلوق پر پھیلا دے گا اور ان میں سے ہر رحمت آسمانوں اور زمین کے طبقات کے برابر ہوگی پس اس دن اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی ہلاک ہوگا جس کے مقدر میں ہلاکت ہے۔

ایک دوسری حدیث شریف میں ہے۔

مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ يُدْخِلُهُ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ وَلَا يُنْجِيْهِ مِنَ النَّارِ، قَالُوْا وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ يَتَغَمَّدَنِىَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ ۔ (۳)

کسی شخص کو محض اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرے اور نہ ہی جہنم سے نجات دے گا صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کو بھی؟ آپ نے فرمایا ہاں مجھے بھی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِعْمَلُوْا وَاَبْشِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ اَحَدًا

عمل کرو اور خوش ہو جاؤ اور جان لو کہ کسی کو بھی (محض)

(۱) الدر المنثور جلد ۲ ص ۱۳۰ تحت آیت واکتب لنا فی ہذہ الدنیا حسنۃ

(۲) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۵۶ کتاب التوبۃ

(۳) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۵۷ کتاب الرقاق

لَمْ یُنْجِدِ الْعَمَلُ۔ (۱) عمل نجات نہیں دے گا۔

(ان احادیث سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ عمل کی ضرورت نہیں عمل تو حکم خداوندی کی تعمیل ہے مطلب یہ ہے کہ عمل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید رکھی جائے ۱۲ ہزاروی)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اِنِّی اخْتَبَاْتُ شَفَاعَتِی لِاَھْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ اَتَرَوْنَھَا لِلْمُطِیْعِیْنَ الْمُتَّقِیْنَ بَلْ ھِیَ لِلْمُتَلَوِّثِیْنَ الْمُخَلِّطِیْنَ۔ (۲)

میں نے اپنی شفاعت کو اپنی امتوں کے کبیرہ گناہ کرنے والوں کے لیے چھپا رکھا ہے کیا تم اسے اطاعت کرنے والے متقی لوگوں کے لیے سمجھتے ہو بلکہ یہ تو ان لوگوں کے لیے ہے جو گناہوں سے لتھڑے ہوئے ہیں۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

بُعِثْتُ بِالْحَنِیْفِیَّۃِ السَّمْحَۃِ السَّھْلَۃِ۔ (۳)

مجھے نہایت صاف ستھرے بخشش و سخاوت والے اور آسان دین کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اُحِبُّ اَنْ یَّعْلَمَ اَھْلُ الْکِتَابَیْنِ اَنَّ فِیْ دِیْنِنَا سَمَاحَۃً۔ (۴)

میں چاہتا ہوں کہ اہل کتاب (تورات و انجیل والے) اس بات کو جان لیں کہ ہمارے دین میں بخشش ہے۔

اور اس بات کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی دعا قبول فرمائی ارشاد خداوندی ہے۔

وَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَا اِصْرًا۔ (۵) اور ہم پر بوجھ نہ ڈالنا۔

اور ارشاد فرمایا۔

وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ۔ (۶)

اور وہ ان سے ان کے بوجھ اور ان کے طوق جو ان پر تھے، اتار دیتا ہے۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۵۷ کتاب الرقاق

(۲) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۱۱۳ کتاب التوحید

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۶۶ مرویات ابوامامہ

(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۱۱۶ مرویات عائشہ

(۵) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۲۸۶ (۶) قرآن مجید، سورۂ اعراف آیت ۱۵۷

حضرت محمد بن حنفیہ رضی اللہ عنہ، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ۔ (۱) پس اچھی طرح درگزر کرو۔

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے جبریل "صفح جمیل" کیا ہے؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا جب آپ اس شخص کو معاف کر دیں جس نے آپ پر زیادتی کی اور آپ اس کو نہ جھڑکیں (تو یہ صفح جمیل ہے) آپ نے فرمایا اے جبریل! اللہ تعالیٰ تو بہت بڑا کریم ہے وہ جس کو معاف کرے پھر اس کو عذاب نہیں دے گا (۲)

یہ سن کر حضرت جبریل علیہ السلام رو پڑے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی رونے لگے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی طرف حضرت میکائیل علیہ السلام کو بھیجا اور فرمایا کہ تمہارا رب تم دونوں کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے میں جس کو معاف کر دوں اسے کیسے عذاب میں مبتلا کروں گا۔ یہ بات میرے کرم کے لائق نہیں۔

امید کے بارے میں مروی احادیث بے شمار ہیں۔

آثار:

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص گناہ کرے پھر دنیا میں اس پر پردہ ڈال دے تو اللہ تعالیٰ اس بات سے زیادہ بے نیاز ہے کہ قیامت کے دن اس کی پردہ دری کرے اور جو شخص کسی گناہ کا مرتکب ہو اور اسے دنیا میں عذاب دیا جائے تو اللہ تعالیٰ بہت بڑا عادل ہے وہ آخرت میں دوبارہ اسے عذاب نہیں دے گا۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ میرا حساب میرے والدین کے حوالے کیا جائے کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر ان دونوں کی نسبت زیادہ رحم کرنے والا ہے بعض بزرگوں نے فرمایا جب مومن اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے فرشتوں کی نظروں سے چھپاتا ہے تاکہ وہ اسے دیکھ کر اس کے خلاف گواہی دیں۔

حضرت محمد بن مصعب نے حضرت اسود بن سالم رحمہما اللہ کو لکھا کہ جب بندہ اپنے نفس پر زیادتی کرتا ہے پھر وہ ہاتھ اٹھا کر دعا کرتا ہے اور پکارتا ہے اے میرے رب! تو اس کی آواز کو فرشتے چھپاتے ہیں اسی طرح دوسری اور تیسری بار بھی۔ حتیٰ کہ جب چوتھی مرتبہ کہتا ہے اے میرے رب! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے کی آواز مجھ سے کب تک چھپاتے رہو گے میرے بندے کو معلوم ہے کہ میرے سوا اس کا کوئی رب نہیں جو گناہوں کو بخش دے میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسے بخش دیا۔

---

(۱) قرآن مجید، سورہ حجر آیت ۸۵

(۲) الدر المنثور جلد ۴ ص ۱۰۴ تحت آیت فاصفح الصفح الجمیل

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک رات میں نے تنہا طواف کیا اور وہ رات اندھیری بھی تھی اور بارش بھی برس رہی تھی میں خانہ کعبہ کے دروازے کے پاس ملتزم میں کھڑا ہوا اور میں نے عرض کیا اے میرے رب مجھے بچا لے تاکہ میں کبھی بھی تیری نافرمانی نہ کروں تو مجھے بیت اللہ شریف سے ہاتف غیبی نے آواز دی اے ابراہیم! تو مجھ سے عصمت کا سوال کرتا ہے میرے تمام بندے مجھ سے اسی بات کا سوال کرتے ہیں اگر میں سب کو گناہوں سے محفوظ کر لوں تو میں کس پر اپنا فضل کروں گا۔ اور کسے بخشوں گا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے تھے اگر مومن سے گناہ سرزد نہ ہو تو وہ آسمانوں کی بادشاہی میں اڑتا پھرے لیکن اللہ تعالیٰ نے گناہوں کے ذریعے اس کے پر کاٹ دیئے۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر کرم کی نظر ظاہر ہو گی تو وہ بُروں کو نیکوں کے ساتھ ملا دے گی۔

حضرت مالک بن دینار نے حضرت ابان (رحمہما اللہ) سے ملاقات کی تو ان سے فرمایا آپ کب تک لوگوں کو رخصت کی احادیث سناتے رہیں گے انہوں نے فرمایا اے ابو یحییٰ مجھے امید ہے کہ آپ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قدر معافی دیکھیں گے جو آپ کی چادر کو جلا دے گی اور یہ خوشی کی وجہ سے ہو گا۔

حضرت ربعی بن خراش اپنے بھائی سے نقل کرتے ہیں وہ بڑے بڑے تابعین میں سے تھے اور وہ ان لوگوں میں سے تھے جو موت کے بعد بھی کلام کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں جب میرے بھائی کا انتقال ہوا تو ان کو کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا انہوں نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا میں نے اپنے رب عزوجل سے ملاقات کی تو اس نے راحت و آرام کے ساتھ میری خاطر تواضع کی اور میرا رب غصے میں نہ تھا اور میں نے معاملہ اس سے آسان دیکھا جو تم گمان کرتے ہو لہٰذا سستی نہ کرو اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام میرے منتظر ہیں لہٰذا میں ان کی طرف لوٹ کر جا رہا ہوں راوی فرماتے ہیں یہ کہہ کر وہ گر پڑے گویا وہ ایک کنکری تھی جو ایک پلیٹ میں رکھی گئی تو ہم نے ان کو اٹھا کر دفن کر دیا۔

حدیث شریف میں ہے۔ کہ بنی اسرائیل کے دو آدمی ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے ان میں سے ایک اپنے نفس پر زیادتی کرتا تھا (گناہ گار تھا) اور دوسرا عابد تھا وہ اسے وعظ و نصیحت کرتا اور جھڑکتا رہتا وہ کہتا مجھے میرے رب پر چھوڑ دو کیا تم مجھ پر نگہبان مقرر کئے گئے ہو حتیٰ کہ اس نے ایک دن اسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا تو اس کو غصہ آیا اس نے کہا اللہ تعالیٰ تجھے نہ بخشے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا کسی کو طاقت ہے کہ وہ میری رحمت کو میرے بندوں سے روک دے جاؤ میں نے تمہیں بخش دیا پھر اللہ تعالیٰ اس عابد سے فرمائے گا میں نے تمہارے لیے جہنم واجب کر دی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم اس (عابد) نے ایسی گفتگو کی جس نے اس کی دنیا اور آخرت تباہ کر دی۔ (۱)

---

(۱) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۳۱۵ کتاب الادب

یہ بھی مروی ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک چور تھا اس نے چالیس سال تک ڈاکہ ڈالا حضرت عیسٰی علیہ السلام کا اس پر گزر ہوا آپ کے پیچھے آپ کے حواریوں میں سے ایک عابد شخص تھا چور نے دل میں کہا اللہ تعالیٰ کے نبی گزر رہے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ان کے ایک حواری ہیں اگر میں اتر کر ان کے ساتھ ہو جاؤں تو ہم تین ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ اترا اور حواری کے قریب ہونے لگا۔ وہ حواری کی تعظیم میں اپنے آپ کو حقیر جانتا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا میرے جیسا آدمی اس قسم کے عابد کے ساتھ نہیں چل سکتا فرماتے ہیں حواری نے یہ بات محسوس کر لی اور دل میں کہا کہ یہ شخص میرے ساتھ چل رہا ہے چنانچہ اس نے علیحدہ ہو کر حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا اب چور اکیلا پیچھے رہ گیا اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ ان دونوں سے فرمائیں دونوں اپنا اپنا عمل نئے سرے سے شروع کریں کیوں کہ ان دونوں کا پہلا عمل باطل ہو گیا حواری نے چونکہ تکبر کیا اس لیے اس کی پہلی نیکیاں ضائع ہو گئیں اور دوسرے کی برائیاں زائل ہو گئیں کیوں کہ اس نے آپ کو حقیر جانا تو آپ نے ان دونوں کو اس بات کی خبر دی اور چور کو آپ نے اپنی اس سیاحت میں ساتھ لے لیا اور اسے اپنا حواری بنا لیا۔

حضرت مسروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے ایک نبی حالتِ سجدہ میں تھے کہ کسی نافرمان شخص نے ان کی گردن پر پاؤں رکھا حتیٰ کہ ان کی پیشانی میں ایک کنکری چبھ گئی راوی فرماتے اس نبی علیہ السلام نے غصے کی حالت میں اپنا سر اٹھایا اور فرمایا جا تجھے اللہ تعالیٰ ہرگز نہ بخشے اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی میرے بندے کے بارے میں مجھ پر قسم کھاتے ہو میں نے اپنے بندوں کو بخش دیا۔

اسی کے قریب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے خلاف قنوت نازلہ (بددعا) پڑھتے تھے اور نماز میں ان پر لعنت بھیجتے تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی نازل ہوا۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ (۱) آپ کے اختیار میں (عذاب میں سے) کوئی چیز نہیں ہے (۲)

تو آپ نے ان کو بددعا دینا چھوڑ دیا (۳) اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے عام لوگوں کو ہدایت سے مشرف فرمایا۔

ایک روایت میں ہے کہ دو آدمی عابدین میں سے تھے اور عبادت میں مساوی تھے فرماتے ہیں جب ان دونوں کو جنت

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۱۲۸

(۲) بعض لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے اس آیت کے تحت حضور علیہ السلام کو بے اختیار ثابت کرتے ہیں حالانکہ یہ آیت تو صرف اتنا بتاتی ہے کہ حضور علیہ السلام ان کے لیے بددعا نہ فرمائیں کیوں کہ آپ رحمۃ للعالمین ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ خود آپ کی طرف سے بدلہ لینے والا ہے ۱۲ ہزاروی

(۳) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۵۵ کتاب التفسیر

میں داخل کیا گیا تو ان میں سے ایک کے درجات دوسرے کے مقابلے میں بہت زیادہ بلند کئے گئے تو قیامت کے دن وہ کہے گا یا اللہ! دنیا میں یہ شخص مجھ سے زیادہ عبادت نہیں کرتا تھا علیین کے اندر تو نے اس کا درجہ بلند کر دیا اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا اس شخص نے دنیا میں مجھ سے بلند درجات کا سوال کیا تھا اور تو جہنم سے نجات کا سوال کرتا تھا میں تو ہر بندے کو اس کے سوال کے مطابق عطا کرتا ہوں۔

یہ اس بات پر دلالت ہے کہ امید افضل ہے کیوں کہ ڈرنے والے کے مقابلے میں امید کرنے والے پر محبت زیادہ غالب ہوتی ہے بادشاہوں کی خدمت کرنے والے دو قسم کے غلام ہوتے ہیں ایک اس کی سزا سے بچنے کے لیے خدمت کرتے ہیں اور دوسرے اس کے انعام و اکرام کی امید کرتے ہوئے خدمت کرتے ہیں تو دونوں کی خدمت میں کتنا فرق ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حسن ظن کا حکم دیا اور اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

سَلُوا اللّٰهَ الدَّرَجَاتِ الْعُلٰى فَاِنَّمَا تَسْأَلُوْنَ كَرِيْمًا۔ (۱)

اللہ تعالیٰ سے بلند درجات کا سوال کرو کیوں کہ تم کریم ذات سے سوال کر رہے ہو۔

اور ارشاد فرمایا۔

اِذَا سَأَلْتُمُ اللّٰهَ فَاَعْظِمُوا الرَّغْبَةَ وَاسْأَلُوا الْفِرْدَوْسَ الْاَعْلٰى فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى لَا يَتَعَاظَمُهٗ شَيْءٌ۔ (۲)

جب اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو بڑی رغبت رکھو اور فردوس اعلیٰ کا سوال کرو کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چیز بڑی نہیں۔

حضرت بکر بن سلیم صواف رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم شام کے وقت حضرت مالک بن انس رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسی شام آپ کا انتقال ہوا تھا ہم نے عرض کیا اے ابو عبداللہ! آپ اپنے آپ کو کیسا پاتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا میں نہیں جانتا کہ تمہیں کیا جواب دوں؟ البتہ یہ کہ عنقریب تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قدر معافی دیکھو گے جو تمہارے لیے حساب وکتاب میں نہیں ہوگی پھر ہم مسلسل وہاں رہے حتیٰ کہ ہم نے ان کی آنکھیں بند کیں (یعنی ان کا وصال ہو گیا)

حضرت یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ اپنی دعا میں یوں کہتے گناہوں کے باوجود میری تجھ پر امید قریب ہے اور اعمال کے باوجود میری تجھ پر امید غالب ہے کیوں کہ اعمال میں میرا اعتماد اخلاص پر ہے اور میں اسے کہاں سے لاؤں میں تو آفت کے ساتھ معروف ہوں۔ اور میں گناہوں میں اپنے آپ کو یوں پاتا ہوں کہ تیرے عفو پر اعتماد کرتا ہوں اور تو میرے گناہوں کو کیسے نہیں بخشے گا جب کہ تو جود و سخا کے ساتھ موصوف ہے۔

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۱۰ ص ۱۲۵ (الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ)

(۲) صحیح بخاری جلد اول ص ۳۹۱ کتاب الجہاد

کہا گیا ہے کہ ایک مجوسی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مہمان بننا چاہا تو آپ نے فرمایا اگر تم اسلام لے آئے تو میں تمہاری مہمان نوازی کروں گا۔ (یہ سُن کر) مجوسی چلا گیا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ آپ نے اسے کھانا نہ دیا اس لیے کہ اس نے اپنا دین تبدیل نہ کیا اور ہم ستر سال سے اس کے کفر کے باوجود اسے کھانا دے رہے ہیں اگر آپ اسے ایک رات مہمان بنا لیتے تو آپ کا کیا نقصان ہوتا چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس مجوسی کے پیچھے دوڑے اور اسے واپس لاکر اپنا مہمان بنایا مجوسی نے پوچھا اس تبدیلی کا سبب ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے واقعہ بتایا تو مجوسی نے کہا کیا آپ میرے ساتھ اس طرح معاملہ کرتے ہیں پھر کہنے لگا مجھ پر اسلام پیش کیجئے پس وہ اسلام لے آیا۔

حضرت استاذ ابوسہل صعلوکی نے حضرت ابوسہل زجاجی (رحمہما اللہ) کو خواب میں دیکھا اور وہ اس بات کے قائل تھے کہ اگر کسی گناہ پر اللہ تعالیٰ نے سزا کا ذکر کیا تو وہ ضرور ملے گی انہوں نے پوچھا آپ کا کیا حال ہے انہوں نے فرمایا ہمارا جو وہم تھا ہم نے معاملہ اس سے آسان پایا اور ان میں سے بعض نے ابوسہل صعلوکی رحمہ اللہ کو خواب میں اتنی اچھی حالت میں دیکھا جو بیان نہیں کی جاسکتی اس نے پوچھا اے استاذ! آپ نے کس وجہ سے یہ اعزاز پایا انہوں نے فرمایا اپنے رب کے بارے میں اچھا گمان کرنے کی وجہ سے (مجھے یہ اعزاز ملا)

منقول ہے کہ حضرت ابوالعباس بن سریج رحمہ اللہ نے اپنی مرض الموت میں خواب کی حالت میں دیکھا کہ گویا قیامت قائم ہوگئی اور اللہ تعالیٰ جو جبار ہے فرماتا ہے علماء کہاں ہیں فرمایا پس علماء آئے پھر فرمایا تم نے کیا عمل کیا؟ فرماتے ہیں ہم نے عرض کیا یا اللہ! ہم سے کوتاہی ہوئی اور ہم نے گناہ کیا فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے دوبارہ سوال کیا گویا وہ پہلے سوال پر راضی نہ ہوا اور کسی دوسرے جواب کا ارادہ کیا میں نے کہا جہاں تک میرا تعلق ہے تو میرے نامۂ اعمال میں شرک نہیں ہے اور تو نے وعدہ فرمایا کہ تو شرک کے علاوہ سب کچھ بخش دے گا اللہ تعالیٰ نے فرمایا جاؤ میں نے تم سب کو بخش دیا اس بیان کے تین دن بعد ان کا انتقال ہوگیا۔

کہا گیا کہ ایک شخص بہت بڑا شرابی تھا اس نے اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کو جمع کرکے اپنے غلام کو چار درہم دیئے اور اسے حکم دیا کہ مجلس کے لیے کچھ پھل خرید لائے غلام منصور بن عمار کی مجلس کے دروازے سے گزرا اور وہ کسی فقیر کے لیے کچھ مانگ رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ جو شخص اسے چار درہم دے گا میں اس کے لیے چار دعائیں مانگوں گا فرماتے ہیں غلام نے اسے چار درہم دے دیئے منصور نے پوچھا تم مجھ سے کیسی دعا چاہتے ہو؟ اس نے کہا میرا ایک آقا ہے میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں منصور نے دعا مانگی اور کہا دوسری کون سی دعا ہے؟ اس نے کہا اللہ تعالیٰ مجھے ان دراہم کا اچھا بدلہ دے انہوں نے دعا مانگی پھر پوچھا اور کونسی دعا؟ غلام نے کہا اللہ تعالیٰ میرے مالک کی توبہ قبول فرمائے منصور نے دعا مانگی اور چوتھی دعا کے بارے میں سوال کیا اس نے کہا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے میرے آقا اور باقی قوم کو بھی بخش دے منصور نے دعا مانگی اور غلام واپس ہوگیا اس کے مالک نے پوچھا تم نے دیر کیوں کی؟ اس نے

پورا واقعہ سنایا اس نے پوچھا منصور نے کیا دعا مانگی غلام نے کہا میں نے اپنے لیے آزادی کا سوال کیا اس نے کہا جا تو آزاد ہے پوچھا دوسری دعا کیا مانگی؟ اس نے کہا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان دراہم کا اچھا بدلہ دے اس نے کہا تیرے لیے چار ہزار درہم ہیں اور تیسری دعا کیا تھی؟ اس نے کہا یہ دعا مانگی کہ اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول فرمائے اس نے کہا میں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کی اور چوتھی دعا کس چیز کے بارے میں تھی؟ اس نے کہا یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے تجھے اور قوم اور منصور کو بخش دے اس نے کہا یہ ایک بات میرے بس میں نہیں ہے جب وہ رات کو سویا تو اس نے خواب میں دیکھا گویا کوئی کہہ رہا ہے تم نے وہ سب کام کئے جو تمہارے بس میں تھے اور تمہارا کیا خیال ہے میں وہ کام نہیں کروں گا جو میرے اختیار میں ہے میں نے تجھے، غلام کو، منصور بن عمار اور حاضرین کو بخش دیا۔

حضرت عبدالوہاب بن عبدالحمید ثقفی رحمہ اللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں میں نے تین مردوں اور ایک عورت کو دیکھا انہوں نے ایک جنازہ اُٹھا رکھا تھا فرماتے ہیں عورت کی جگہ میں نے جنازہ اٹھایا اور ہم قبرستان کی طرف چلے گئے اور نماز جنازہ پڑھ کر میت کو دفن کر دیا میں نے عورت سے پوچھا تمہارا اس میت کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ اس نے کہا یہ میرا بیٹا ہے میں نے پوچھا تمہارے پڑوسی نہیں ہیں؟ اس نے کہا پڑوسی ہیں لیکن انہوں نے اس کے معاملے کو معمولی سمجھا میں نے کہا وہ کیا اس نے کہا وہ مخنث تھا فرماتے ہیں مجھے اس عورت پر رحم آیا اس لیے میں اسے اپنے گھر لے آیا اور اسے کچھ درہم، گندم اور کپڑے دیئے فرماتے ہیں میں نے اسی رات دیکھا کہ گویا کوئی آنے والا میرے پاس آیا وہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چودھویں رات کا چاند ہے اور اس پر سفید کپڑے ہیں وہ میرا شکریہ ادا کرنے لگا میں نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا وہ ہیجڑا ہوں جس کو تم نے آج دفن کیا ہے لوگوں کے مجھے حقیر جاننے کی وجہ سے میرے رب نے مجھ پر رحم فرمایا۔

حضرت ابراہیم اطروش رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم، حضرت معروف کرخی رحمہ اللہ کے ہمراہ بغداد شریف میں دریائے دجلہ کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے کہ کچھ نوجوان چھوٹی سی کشتی میں گزرے وہ دف (ایسا ڈھول جو ایک طرف سے خالی ہو) بجا رہے تھے اور شراب نوشی کرنے اور لہو ولعب میں مشغول تھے حاضرین مجلس نے حضرت معروف کرخی رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ کیا آپ ان کو کھلم کھلا گناہ کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں؟ ان کے خلاف بددعا کیجئے۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا یا اللہ! جس طرح تو نے ان کو دنیا میں خوش کیا ہے۔ ان کو آخرت میں بھی خوش کرنا قوم نے کہا ہم نے آپ سے سوال کیا تھا کہ ان کے لیے بددعا کریں انہوں نے فرمایا اللہ تعالیٰ جب ان کو آخرت میں خوش کرے گا تو ان کی توبہ قبول فرمائے گا۔

بعض بزرگ اپنی دعا میں یوں کہتے اے میرے رب! کس زمانے میں لوگوں نے تیری نافرمانی نہیں کی پھر ان پر تیری رحمت کا فیضان ہوا اور تو نے ان کو اپنا رزق عطا کیا تو پاک ہے تو کس قدر حلیم اور عزت والا ہے تیری نافرمانی کی جاتی ہے پھر تو ان کو وسیع نعمت اور رزق عطا فرماتا ہے اے ہمارے رب! گویا تجھے غصہ نہیں آتا۔

تو یہ وہ اسباب ہیں جن کے ذریعے امید کی رُوح کو ڈرنے والوں اور نا امید لوگوں کے دلوں کی طرف کھینچا جاتا ہے

لیکن جو لوگ بیوقوف مغرور ہیں مناسب یہ ہے کہ وہ ان باتوں میں سے کوئی بات نہ سنیں بلکہ وہ ان باتوں کو سنیں جو ہم اسباب خوف کے ضمن میں ذکر کریں گے کیوں کہ اکثر لوگوں کی اصلاح خوف کے ذریعے ہوتی ہے جیسے بُرے غلام اور شرارتی بچے کو کوڑے اور لاٹھی نیز سخت کلامی کے بغیر راہ راست پر نہیں لایا جاسکتا لیکن اس کے خلاف امور ان پر دینی اور دینوی اصلاح کا دروازہ بند کر دیتے ہیں۔

دوسرا حصہ :

خوف کا بیان

اس حصے میں درجِ ذیل باتوں کا بیان ہوگا۔

(۱) حقیقتِ خوف

(۲) درجاتِ خوف

(۳) خوف کی اقسام

(۴) فضیلتِ خوف

(۵) خوف ورجاء میں سے کیا افضل ہے؟

(۶) خوف کی دوا۔

(۷) بُرے خاتمے کا مفہوم۔

(۸) انبیاء کرام اور صالحین میں خائفین کے احوال (اللہ تعالیٰ ان سب پر رحمت نازل فرمائے) اور ہم اللہ تعالیٰ سے حُسنِ توفیق کا سوال کرتے ہیں۔

فصل ۱

حقیقتِ خوف

جاننا چاہیئے کہ خوف دل کے درد اور جلنے کا نام ہے اور اس کا سبب مستقبل میں مکروہ بات کی توقع ہوتی ہے اور یہ بات رجاء (امید) کے بیان میں ظاہر ہو چکی ہے۔ اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے مانوس ہو جائے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد کے سوا کچھ نہ ہو اور وہ اپنے وقت کے تابع ہو جائے اور مسلسل جمال حق کا مشاہدہ کرنے والا ہو تو مستقبل کی طرف اس کی توجہ نہیں رہتی اب اس کے لیے خوف اور امید کچھ بھی باقی نہیں رہتا بلکہ اس کی حالت خوف ورجاء سے بلند ہو جاتی ہے کیوں کہ یہ تو دو زمانے ہیں جو نفس کو اس کی رعونت (تیزی سے حرکت) کی طرف نکلنے سے روکتے ہیں حضرت واسطی

نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

خوف اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان حجاب ہے اور انہوں نے یہ بھی فرمایا جب دلوں پر حق غالب آجائے تو ان میں امید اور خوف کا فضلہ باقی نہیں رہتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب محب فراق کے خوف سے اپنے دل کو مشاہدۂ محبوب میں مشغول کر دے تو یہ شہود میں نقص ہے کیوں کہ دوام شہود مقامات کی غایت و انتہا ہے لیکن ہم اس وقت مقامات کی ابتدا کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں پس ہم کہتے ہیں۔

خوف کا حال بھی علم، حال اور عمل سے منظم ہوتا ہے علم سے مراد اس سبب کا علم ہے جو مکروہ (ناپسندیدہ) بات کی طرف لے جاتا ہے جیسے کوئی شخص کسی بادشاہ کا مجرم ہو پھر وہ اس کے قابو میں آجائے تو اسے قتل کا ڈر ہوتا ہے اگرچہ معافی کا حاصل ہونا اور بھاگنا بھی ممکن ہے لیکن اس کے دل میں پریشانی اس کی علمی قوت کے اعتبار سے ہوتی ہے قتل تک پہنچانے والے اسباب کا علم ہے اور وہ جرم کا بڑا ہونا اور بادشاہ کا ذاتی طور پر کینہ پرور، غضبناک اور منتقم مزاج ہوتا ہے۔ اور یہ کہ انتقام کی ترغیب موجود ہو لیکن اس غلام کے حق میں سفارش کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اور یہ ڈرنے والا شخص ہر قسم کے وسیلے اور ایسی نیکی سے خالی ہو جو بادشاہ کے ہاں اس کے جرم کے اثر کو مٹا دے پس ان اسباب کے ظہور کا علم قوتِ خوف اور دل کی سخت پریشانی کا سبب بنتا ہے اور جس قدر اسباب کمزور ہوں گے خوف بھی کم ہوگا اور بعض اوقات خوف کسی جنایت کے سبب سے نہیں ہوتا جس کا ارتکاب اس خائف نے کیا ہو بلکہ جس سے ڈر رہا ہے اس کی کوئی صفت خوف کا سبب بنتی ہے۔ جیسے کوئی شخص کسی درندے کے پنجے کے نیچے آجائے تو وہ درندے سے اس کی ذات میں پائی جانے والی صفت کی وجہ سے ڈرتا ہے اور وہ (صفت) اس کی حرص اور عام طور پر چیر پھاڑ کرنا ہے اگر چیرنا پھاڑنا اس درندے کا اختیار وصف ہے اور بعض اوقات جس چیز سے خوف پیدا ہوتا ہے اس کی فطری صفت خوف کا باعث ہوتی ہے جیسے کوئی شخص سیلاب میں گھر جائے اور جلانے والی آگ میں پڑ جائے کیوں کہ پانی سے اس لیے ڈر لگتا ہے کہ بہا کر لے جانا اور ڈبو دینا اس کی فطرت میں داخل ہے اسی طرح آگ کی فطرت جلانا ہے۔

تو مکروہ بات کے اسباب کا علم دل کو جلانے اور پریشان کرنے کا سبب ہے اور یہ جلانا ہی خوف ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا خوف بعض اوقات اس کی اور اس کی صفات کی معرفت کی وجہ سے ہوتا ہے کہ اگر وہ تمام جہانوں کو ہلاک کر دے تو اسے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں اور نہ ہی اسے کوئی روکنے والا ہے اور بعض اوقات اس کا سبب بندے کے بہت زیادہ جرائم ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے باعث پیدا ہوتے ہیں اور بعض اوقات یہ دونوں باتیں ہوتی ہیں اور یہ خوف اسی قدر ہوتا ہے جس قدر اسے اپنے نفس کے عیبوں کی پہچان ہوتی ہے اور جس قدر اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کے استغنا کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اسے معلوم ہوتا کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں اس

سے سوال نہیں کیا جا سکتا لیکن بندوں سے پوچھا جائے گا تو اسی معرفت کے حساب سے خوف کی قوت ہوتی ہے لہٰذا وہی شخص اپنے رب سے زیادہ ڈرتا ہے جو اپنے آپ کو اور اپنے رب کو زیادہ پہچانتا ہے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَنَا اَخْوَفُكُمْ لِلّٰهِ۔ (۱) میں تم سے زیادہ خوف خدا رکھتا ہوں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے اس سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں۔ (۲)

پھر جب معرفت پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے تو وہ خوف کا جلال اور دل کی جلن پیدا کرتی ہے پھر اس گرمی کے اثر کو دل سے بدن اعضاء اور صفات پر ڈالتی ہے۔

بدن میں اس کا اثر بدن کا زردی، غشی چیخ و پکار اور رونا ہے اور بعض اوقات اس سے پتا پھٹ جاتا ہے تو موت واقع ہو جاتی ہے یا دماغ تک اثر پہنچتا ہے تو عقل میں خرابی واقع ہو جاتی ہے یا زیادہ ہو جائے تو نا امیدی پیدا ہوتی ہے۔

اعضاء میں اس خوف کے اثر کی علامت یہ ہے کہ وہ ان کو گناہوں سے روک دیتا ہے اور عبادات میں مقید کر دیتا ہے اور یوں گذشتہ کوتاہیوں کی تلافی ہو جاتی ہے اور مستقبل کے لیے استعداد پیدا ہوتی ہے اسی لیے کہا گیا ہے ڈرنے والا وہ نہیں جو روئے اور آنکھیں پونچھے بلکہ وہ شخص حقیقتاً خائف ہوتا ہے جو اس عمل کو چھوڑتا ہے جس پر عذاب کا خوف ہو۔

حضرت ابو القاسم حکیم نے فرمایا جو آدمی کسی چیز سے ڈرتا ہے وہ اس سے بھاگتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہ اس کی طرف بھاگتا ہے۔ حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ سے کہا گیا بندہ خوف زدہ کب ہوتا ہے؟ انہوں نے فرمایا جب بندہ اپنے آپ کو بیمار کی طرح سمجھے جو بیماری کے بڑھنے کے خوف سے پرہیز کرتا ہے صفات میں خوف کے اثر کی صورت یہ ہے کہ خواہشات کا قلع قمع کرے اور لذتوں کو گدلا کر دے پس وہ گناہ جو اسے پسند تھے، ناپسندیدہ ہو جائیں گے جس طرح کسی شخص کو شہد پسند ہو لیکن جب اسے معلوم ہو جائے کہ اس میں زہر ہے تو وہ اسے ناپسند کرتا ہے تو خوف کی وجہ سے خواہشات جل جاتی ہیں اور اعضاء مؤدب ہو جاتے ہیں نیز دل میں انکساری، خشوع، ذلت اور جھکاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے تکبر، کینہ اور حسد دور ہو جاتا ہے بلکہ وہ خوف کی وجہ سے غم کا شکار ہو جاتا ہے اور خطرات انجام کو دیکھتا ہے اب وہ غیر کے لیے فارغ ہی نہیں ہوتا اب اس کا شغل صرف مراقبہ، محاسبہ، مجاہدہ ہوتا ہے وہ ایک ایک سانس کے

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۰۱ کتاب الادب

(۲) قرآن مجید، سورۂ فاطر آیت ۲۸

ساتھ بخل کرتا ہے اور خطرات قلبی، قدم اٹھانے اور کلمات کے ذریعے نفس کا مواخذہ کرتا ہے اس کا حال اس شخص کی طرح ہوتا ہے جو درندے کا شکار ہو جاتا ہے اسے معلوم نہیں کہ وہ (درندہ) اس سے غافل ہوگا اور یہ اس سے چھوٹ جائے گا یا وہ اس پر حملہ کر کے اسے ہلاک کر دے گا تو اب اس کا ظاہر و باطن اسی کے ساتھ مشغول ہوتا ہے جس سے وہ ڈرتا ہے کسی اور کی وہاں گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ اس کا حال ہے جس پر خوف غالب ہو اور اس کو قابو کرے صحابہ کرام اور تابعین کی ایک جماعت کا یہی حال تھا اور جس قدر خوف ہوتا ہے اسی حساب سے مراقبہ، محاسبہ اور مجاہدہ بھی ہوتا ہے اور خوف دل کی پریشانی اور جلنے کا نام ہے اور قوتِ خوف کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے جلال، اس کی صفات اور افعال کی معرفت نیز نفس کے عیوب اور پیش آمدہ خطرات کی معرفت کی قوت ہے اور خوف کا کم از کم درجہ جس کا اثر اعمال پر ظاہر ہوتا ہے، یہ ہے کہ وہ ممنوعات سے روک دے اور ممنوعات سے حاصل ہونے والی یہ رکاوٹ ورع (پرہیزگاری) کہلاتی ہے اگر اس کی قوت زیادہ ہو تو وہ ان کاموں سے بھی رکتا ہے جن میں تحریم زیادہ ہوتی ہے تو جن کی حرمت یقینی ہے ان کاموں سے کیسے باز نہیں رہے گا اور اس کا نام تقویٰ ہے کیوں کہ تقویٰ کا مفہوم یہ ہے کہ شک والے کام کو چھوڑ کر اس کام کی طرف جائے جس میں شک نہ ہو اور تقویٰ بعض اوقات اسے ان کاموں کو چھوڑنے پر بھی مجبور کرتا ہے جن میں کوئی حرج نہیں ہوتا اور اس کی وجہ ان کاموں میں پڑنے کا خوف ہوتا ہے جن میں کوئی حرج ہو۔ اور تقویٰ میں صدق کہلاتا ہے پھر جب اس کے ساتھ عبادت کے لیے گوشہ نشینی کا اضافہ ہوتا ہے تو وہ ایسی عمارت نہیں بناتا جس میں رہائش اختیار نہ کرے اور نہ ہی کھانے کے علاوہ کچھ جمع کرتا ہے وہ دنیا کی طرف توجہ نہیں کرتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اسے چھوڑ دے گی اور اس کا کوئی سانس غیر خدا کے لیے استعمال نہیں ہوتا یہ صدق ہے اور ایسے شخص کو صدیق کہنا زیادہ مناسب ہے تو صدق میں تقویٰ، تقویٰ میں ورع اور ورع میں عفت داخل ہوتی ہے کیوں کہ عفت کا مطلب خاص طور پر خواہشات کے تقاضوں سے بچنا ہے۔

تو نتیجہ یہ ہوا کہ خوف اعضاء میں اس طرح اثر کرتا ہے کہ آدمی کسی کام سے رکتا ہے اور کسی کا اقدام کرتا ہے اور اس رکاوٹ کی وجہ سے اس کے لیے عفت کا نام بار بار پیدا ہوتا ہے اور وہ شہوت کے تقاضوں سے بچتا ہے اور اس سے اعلیٰ ورع ہے کیوں کہ اس میں عموم ہے کیوں کہ یہ ہر ممنوع سے رکنا ہے اور اس سے اعلیٰ تقویٰ ہے کیوں کہ یہ ممنوع اور مشتبہ دونوں قسم کے کاموں سے رکنے کا نام ہے اور اس سے اوپر والے درجہ پر فائز آدمی کو صدیق اور مقرب کہا جاتا ہے ہر دوسرا مرتبہ پہلے مرتبہ کے مقابلے میں اسی طرح ہے جس طرح اخص، اعم کے مقابلے میں ہوتا ہے جب اخص کا ذکر کیا تو کل کا ذکر کر دیا جیسے تم کہو کہ انسان عربی ہوگا یا عجمی اور عربی قریشی ہوگا یا غیر قریشی اور قریشی، ہاشمی ہوگا یا غیر ہاشمی، پھر ہاشمی علوی ہوگا یا غیر علوی اور علوی حسنی ہوگا یا حسینی۔

اگر تم ذکر کرو کہ وہ حسنی ہے تو تم نے تمام اوصاف کے ساتھ اس کا ذکر کر دیا اور اگر تم کہو کہ وہ علوی ہے تو تم نے اس سے اوپر والی صفات کے ساتھ ذکر کیا جو اس سے عام ہیں اسی طرح جب تم کہو کہ وہ صدیق ہے تو تم نے کہا کہ وہ متقی، پرہیزگار اور

عفیف ہے تو یہ گمان مناسب نہیں ہے کہ ان ناموں کی کثرت، بہت سے باہم مخالف معانی پر دلالت کرتی ہے تو تمہارے لیے معانی باہم خلط ملط ہو جائیں گے جیسے اس آدمی پر مخلوط ہو جاتے ہیں جو الفاظ سے معانی طلب کرتا ہے اور الفاظ، معانی کے تابع نہیں ہوتے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خوف کے تمام معانی جمع ہو جاتے ہیں اور وہ جو اوپر والی جانب سے متضمن ہے جیسے معرفت جو خوف کو واجب کرتی ہے اور وہ جو نیچے والی جانب جیسے وہ اعمال جو اس سے رکنے یا اقدام کے اعتبار سے صادر ہوتے ہیں۔

فصل ۲

خوف کے درجات اور قوت وضعف کے اعتبار اسکا مختلف ہونا؟

جان لو کہ خوف قابل تعریف چیز ہے اور بعض اوقات گمان کیا جاتا ہے کہ ہر خوف محمود ہوتا ہے اور جو اس سے زیادہ قوی اور بکثرت ہوگا وہ زیادہ قابلِ تعریف ہوگا اور یہ بات غلط ہے بلکہ خوف تو اللہ تعالیٰ کا ایک کوڑا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے بندوں کو علم وعمل پر مواظبت (ہمیشگی) کی طرف لے جاتا ہے تاکہ ان دونوں کے ذریعے وہ قرب خدا وندی کا رتبہ حاصل کریں اور جانوروں کے لیے زیادہ بہتر بات یہی ہے کہ وہ کوڑے سے خالی نہ ہوں اور یہی حال بچے کا ہے لیکن یہ اس بات پر دلالت نہیں ہے کہ مارنے میں مبالغہ محمود ہے اسی طرح خوف کے لیے قصور بھی ہوتا ہے افراط بھی اور اعتدال بھی ہوتا ہے اور محمود وہ خوف ہے جو اعتدال پر مبنی ہے۔

قاصر خوف عورتوں کی رقت (نرمی) کی طرح ہوتا ہے جب قرآن پاک کی کوئی آیت سنی جاتی ہے تو دل میں خوف پیدا ہوتا ہے اس سے رونے کی صورت پیدا ہوتی ہے اور آنسو جاری ہوتے ہیں اسی طرح جب کسی پریشان کن سبب کا مشاہدہ ہوتا ہے جب یہ سبب حس سے غائب ہوتا ہے تو دل غفلت کی طرف لوٹ آتا ہے تو یہ خوف قاصر ہے اس کا عطیہ قلیل اور نفع کمزور ہوتا ہے جیسے کسی کمزور کانے سے طاقتور جانور کو مارا جائے وہ اسے کوئی زیادہ تکلیف نہیں پہنچاتا اور نہ ہی مقصد تک لے جاتا ہے اور وہ اس کی ریاضت کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا اور تمام لوگوں کا خوف بھی اسی قسم کا ہے البتہ عارفین اور علماء کا معاملہ الگ ہے اور علماء سے میری مراد رسمی علماء نہیں ہیں جو محض نام کے علماء ہیں کیوں کہ وہ خوف سے تمام لوگوں سے بڑھ کر دور ہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ، اس کے ایام اور اس کے افعال کا علم رکھتے ہیں اور ایسے لوگ اس زمانے میں کمیاب ہیں۔

اسی لیے حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا اگر تم سے پوچھا جائے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہو، تو تم خاموش رہو کیونکہ اگر تم کہو گے نہیں تو یہ کفر ہے اور اگر تم ہاں کہو گے تو جھوٹ ہوگا انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ خوف ہی اعضاء کو گناہوں سے روکتا اور ان کو عبادات کی زنجیروں میں جکڑتا ہے اور جو بات اعضاء میں موثر نہ ہو وہ محض دل کی بات اور

قلبی حرکت ہے وہ خوف کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔

اور جو آدمی خوف کے سلسلے میں مفرط ہے وہ مضبوط ہے اور حدِ اعتدال سے تجاوز کرتا ہے حتیٰ کہ وہ مایوسی کی طرف نکل جاتا ہے اور یہ بھی مذموم ہے کیوں کہ وہ عمل سے مانع ہے اور بعض اوقات خوف بھی مرض اور کمزوری نیز عقل کی کمزوری، دہشت اور زوالِ عقل کی طرف نکل جاتا ہے تو خوف سے مراد کوڑا ہے یعنی جو عمل پر مجبور کرتا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو خوف کمال نہ ہوتا کیوں کہ حقیقت میں یہ نقصان ہے کیوں کہ اس کا منشا جہالت اور عجز ہے، جہالت اس اعتبار سے ہے کہ وہ انجام کار سے واقف نہیں ہے کیوں کہ اگر وہ واقف ہوتا تو خائف نہ ہوتا کیوں کہ جس چیز کا خوف ہوتا ہے اسی میں تردد ہوتا ہے اور عجز اس اعتبار سے کہ ایک ممنوع چیز اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے جسے وہ دور نہیں کر سکتا تو آدمی کے نقصان کی نسبت سے یہ محمود ہے جب کہ ذاتی طور پر محمود علم اور قدرت ہے نیز ہر وہ بات جو اللہ تعالیٰ کا وصف بن سکتی ہے وہ بھی محمود ہے اور جو چیز اللہ تعالیٰ کا وصف نہیں بن سکتی وہ ذاتی طور پر کمال نہیں ہے وہ ایسے نقص کی طرف اضافت کی وجہ سے محمود ہوتی ہے جس سے یہ بڑا ہے جیسے دوائی کی تکلیف کا احتمال محمود ہے کیوں کہ وہ موت اور مرض کی تکلیف سے آسان ہے اور جو بات ناامیدی کی طرف لے جائے وہ مذموم ہوتی ہے۔

اور بعض اوقات خوف بھی بیماری، کمزوری دہشت اور زوالِ عقل کی طرف لے جاتا ہے اور بعض اوقات خوف موت تک پہنچاتا ہے اور یہ سب کچھ مذموم ہے اور یہ ایسی ضرب کی طرح ہے جو بچے کو ہلاک کر دیتی ہے اور وہ کوڑا جو جانور کو ہلاک یا بیمار کر دیتا ہے یا اس کے کسی عضو کو توڑ دیتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امید کے اسباب بہت زیادہ بیان کئے تاکہ ان کے ذریعے حد سے متجاوز خوف کا علاج کیا جائے جو مایوسی یا مندرجہ بالا امور میں سے کسی ایک بات کی طرف لے جاتا ہے اور ہر وہ بات جو کسی دوسری بات کے لیے مراد ہو تو اس سے محمود وہی ہو جو مقصود تک پہنچائے اور جو اس سے کوتاہ رہے یا تجاوز کر جائے تو وہ مذموم ہے اور خوف کا فائدہ بچنا، ورع، تقویٰ، مجاہدہ، عبادت فکر، ذکر اور وہ تمام اسباب ہیں جو اللہ تعالیٰ تک پہنچاتے ہیں اور یہ سب باتیں صحتِ بدن اور عقل کی سلامتی کے ساتھ زندگی کی داعی ہیں پس جو بات ان اسباب میں خرابی کا باعث بنے وہ مذموم ہے۔

سوال :۔

جو شخص خوف زدہ ہو کر مر جائے تو وہ شہید ہوتا ہے تو اس کی حالت مذموم کیسے ہو سکتی ہے؟

جواب :۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو شہید کا رتبہ ملتا ہے کیوں کہ اس کی موت کا سبب خوف ہے اگر وہ اس وقت نہ مرتا تو اسے یہ مرتبہ حاصل نہ ہوتا یہ مطلب نہیں کہ اس کی شہادت کا سبب خوف ہے تو وہ اس اضافت کی وجہ سے فضیلت ہے جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا اور طویل عمر پاتا جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے راستوں پر چلنے

میں گزارتا تو اس اعتبار سے یہ بات فضیلت کا باعث نہیں ہے۔

بلکہ جو شخص فکر و مجاہدے کے طریقے سے اللہ تعالیٰ کی طرف چلتا ہے اور معارف کے درجات میں ترقی کرتا ہے اس کے لیے ہر لحظہ شہید بلکہ شہداء کا رتبہ ہوتا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو قتل ہونے والے بچے یا جس مجنون کو کسی درندے نے ہلاک کیا اس کا رتبہ اس نبی یا ولی کے درجہ سے زیادہ ہوتا جو طبعی موت سے انتقال کرتے ہیں اور یہ بات محال ہے پس ایسا گمان بھی نہیں کرنا چاہیئے بلکہ سب سے افضل سعادت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے طویل عمر حاصل ہو تو جو چیز عمر کو ختم کر دے یا عقل کو زائل کر دے یا اس صحت کو ختم کر دے جس کی وجہ سے زندگی معطل ہو کر رہ جاتی ہے تو وہ کچھ امور کی طرف نسبت سے نقصان ہی نقصان ہے اگرچہ بعض دوسرے امور کی نسبت سے اس کی بعض اقسام فضیلت قرار پائی ہیں جیسے شہادت اپنے سے نچلے درجے کی طرف اضافت کی وجہ سے فضیلت ہے متقین اور صدیقین کے درجہ کی طرف نسبت کریں تو یہ فضیلت نہیں ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اگر خوف عمل میں مؤثر نہ ہو تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے جیسے وہ لاٹھی جو جانور کو حرکت نہیں دے سکتی اور اگر وہ اثر کرے تو اثر کے ظہور کے اعتبار سے اس کے کئی درجات ہیں اگر صرف عفت پر ہی محمول کیا جائے اور وہ شہوات کے تقاضوں سے رکنا ہے تو اس کے لیے ایک درجہ ہے اور جب ورع پیدا کرے تو وہ اعلیٰ درجہ ہے اور سب سے انتہائی درجہ یہ ہے کہ صدیقین کے درجات تک پہنچائے وہ یہ کہ ظاہر و باطن میں ماسوی اللہ سے قطع تعلق کر لے حتیٰ کہ اس میں غیر خدا کی کوئی گنجائش نہ رہے اور یہ انتہائی درجہ ہے جو قابل تعریف ہے اور اس کے لیے صحت و عقل کا باقی رہنا ضروری ہے اور اگر یہ عقل و صحت کے ازالے کی طرف تجاوز کر جائے تو وہ مرض ہے اگر ہو سکے تو اس کا علاج کیا جائے اور اگر یہ محمود ہوتا تو امید کے اسباب وغیرہ سے اس کا علاج واجب نہ ہوتا کہ وہ زائل ہو جائے اسی لیے حضرت سہل رحمہ اللہ نے اپنے ان مریدوں سے جنہوں نے کئی دن تک بھوک کو اختیار کیے رکھا، فرمایا اپنی عقلوں کی حفاظت کرو کیوں کہ کوئی بھی ناقص العقل اللہ تعالیٰ کا ولی نہیں ہوتا۔

فصل ۳

جس چیز کا خوف ہوتا ہے اس کی نسبت سے اقسامِ خوف

جاننا چاہیئے کہ خوف کا تحقق کسی ناپسندیدہ بات کے انتظار کی وجہ سے ہوتا ہے اور ناپسندیدہ بات یا تو ذاتی طور پر ناپسند ہوگی جیسے آگ یا اس لیے کہ وہ کسی ناپسندیدہ (مکروہ) بات تک پہنچاتی ہے جیسے گناہوں کا ارتکاب آخرت میں ناپسندیدہ امر تک پہنچائے گا اس لیے وہ ناپسند ہیں اور جس طرح بیمار نقصان دہ پھلوں کو ناپسند کرتا ہے کیوں کہ وہ موت تک پہنچاتے ہیں لہذا ہر خوف رکھنے والے کے لیے لازمی ہے کہ وہ اپنے دل میں ان دو قسموں میں سے کسی ایک کی مثالی شکل بنائے اور دل میں

اس کا قوت سے انتظار ہو حتی کہ اس مکروہ بات کے شعور کی وجہ سے اس کا دل جل جائے۔

اور خائفین کے دلوں پر جو مکروہات غالب آتے ہیں اور وہ ممنوعات ہیں تو اس اعتبار سے ان لوگوں کے مقامات بھی مختلف ہیں پس وہ لوگ جن کے دلوں پر وہ چیز غالب ہو جو ذاتی طور پر نہیں بلکہ کسی دوسری وجہ سے مکروہ ہے وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جن کا خوف یا وعدہ کے ٹوٹنے کا خوف غالب آتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے تمام حقوق کی ادائیگی کی قوت کمزور پڑ جانے یا دل کی نرمی کے ختم ہو کر اس کی سختی میں تبدیلی کا خوف، یا سیدھے راستے سے بھٹکنے کا خوف یا جن خواہشات سے الفت ہے ان کی اتباع میں عادت کے غالب آنے کا خوف یا اس بات کا خوف کہ اللہ تعالیٰ ان نیکیوں کے بارے میں گفتگو فرمائے گا جن پر بھروسہ کر لیا اور ان کے ذریعے لوگوں کے درمیان عزت حاصل کی یا اللہ تعالیٰ کے نعمتوں کی کثرت کے باعث اکڑنے کا خوف، یا اس بات کا خوف کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اس کے غیر کے ساتھ مشغول ہو جائے یا یہ خوف ہو کہ نعمتوں کے تواتر کی وجہ سے آہستہ آہستہ پکڑے جانے کا خوف یا یہ ڈر ہو کہ عبادات کی مکر وفریب ظاہر نہ ہو جائیں جب اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ بات ظاہر ہو جس کا اسے گمان بھی نہ تھا یا یہ خوف کہ لوگ غیبت، خیانت، دھوکے اور دل میں برائی چھپانے کے ذریعے اس کا پیچھے نہ لگ جائیں یا اس برائی کا خوف جس کا اسے علم نہیں کہ وہ باقی زندگی میں پیدا ہو گی یا دنیا میں فوری طور پر عذاب کے پہنچنے اور موت سے پہلے رسوائی کا ڈر ہو یا دنیوی زیب وزینت کے ذریعے دھوکے کا شکار ہونے کا خوف یا اس بات کا ڈر ہو کہ اللہ تعالیٰ تو میری خفیہ باتوں پر مطلع ہے اور میں غافل ہوں یا موت کے وقت برے خاتمے کا ڈر ہو یا یہ خوف کہ ازل میں اس کے لیے کیا فیصلہ ہوا۔

تو عارفین کو ان تمام باتوں کا خوف رہتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کا خصوصی فائدہ ہے یعنی وہ اس چیز سے بچنے کا راستہ اختیار کرتا ہے جس کا اسے خوف ہوتا ہے۔

جسے عادت کے غالب آنے کا خوف ہوتا ہے وہ عادت کو ترک کرنے کی کوشش کرتا ہے جسے اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی خفیہ باتوں پر اطلاع ہے وہ دل کو وسوسوں سے پاک کرنے کی کوشش کرتا ہے باقی اقسام کی بھی یہی صورت ہے۔

اور ان مقاماتِ خوف میں سے سب سے زیادہ یقین کے ساتھ غالب خوف برے خاتمے کا خوف ہے کیوں کہ یہ معاملہ بہت خطرناک ہے اور سب سے اعلیٰ اور کمال معرفت پر سب سے زیادہ دلالت کرنے والی قسم ازلی فیصلے کا خوف ہے کیونکہ خاتمہ تو اس کے تابع ہے اور یہ (خاتمہ) ایک فرع ہے جو کئی اسباب کے بعد پیدا ہوتا ہے پس خاتمہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے جو قضاء کے سلسلے میں پہلے سے لوحِ محفوظ میں موجود ہے تو خاتمے سے ڈرنے والا اس شخص کی نسبت سے جو ازلی فیصلے سے ڈرتا ہے ان دو آدمیوں کی طرح ہے جن کے حق میں بادشاہ نے دستخط کر کے دیئے اس بات کا احتمال ہے کہ اس کی گردن زدنی کا حکم ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس کو وزارت سونپنے کا حکم دیا ہو۔ اور ابھی تک ان دونوں کے پاس

وہ پروانہ نہیں پہنچا اب جس وقت وہ پروانہ (حکومتی آرڈر) پہنچتا ہے تو ایک سوچتا ہے کہ معلوم نہیں اس میں کیا ہوگا اور دوسرے کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ جب بادشاہ مہر لگا کر دستخط کر رہا تھا تو اس وقت اس کی کیا کیفیت تھی اور معلوم دستخط کرتے وقت میرے لیے بادشاہ کی کونسی حالت ظاہر ہوئی رحمت یا غضب ؟ اور یہ سبب کی طرف توجہ ہے اور یہ فرع کی طرف توجہ کے مقابلے میں اعلیٰ ہے اسی طرح قضائے ازلی جو قلم کے ساتھ جاری ہوئی اس کی طرف توجہ اس کی طرف توجہ سے بہتر ہے جو بعد میں ظاہر ہوتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا جب آپ نے منبر شریف پر خطبہ دیتے ہوئے دائیں ہاتھ کو اکٹھا کر کے مٹھی کی صورت بناتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

"یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جس میں تمام جنتیوں کے نام اور ان کے آباؤ اجداد کے نام لکھے ہیں ان میں نہ اضافہ ہوگا اور نہ ہی کمی"، پھر بائیں ہتھیلی کو اکٹھا کر کے فرمایا "یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جس میں جہنمیوں اور ان کے آباؤ اجداد کے نام ہیں ان میں کوئی کمی زیادتی نہ ہوگی اور اہل سعادت کو ضرور بضرور بدبخت لوگوں کے اعمال کا علم ہو حتیٰ کہ کہا جائے گا گویا کہ وہ ان میں سے ہیں بلکہ وہ تو وہی ہیں پھر اللہ تعالیٰ ان کو موت سے پہلے بچا لیتا ہے اگرچہ اونٹنی کی دو دھاروں کے درمیان وقفے جتنا وقت ہو اور بدبخت لوگوں کو بھی، نیکبخت لوگوں کے اعمال کا علم ہوگا حتیٰ کہ کہا جائے گا گویا کہ وہ ان میں سے ہیں بلکہ وہ تو وہی ہیں پھر اللہ تعالیٰ ان کو موت سے پہلے نکال لے گا اگرچہ اونٹنی کو دوہتے وقت دودھاروں کے درمیان جتنا وقت ہو نیکبخت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے ساتھ نیک بخت ہوا اور بدبخت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے ذریعے بدبخت ہوا اور اعمال کا اعتبار خاتمے سے ہوتا ہے (۱)

یہ اسی طرح ہے جیسے دو ڈرنے والے ہوں اور ان میں سے ایک اپنے رب کی معصیت اور جرم کی وجہ سے ڈرتا ہے اور دوسرا اللہ تعالیٰ کی ذات سے اس کی صفت وجلال اور ان صفات کی وجہ سے ڈرتا ہے جو لامحالہ معصیت کا تقاضا کرتی ہیں اور یہ اعلیٰ رتبہ ہے اسی لیے اس کا خوف باقی رہتا ہے اگرچہ وہ صدیقین کی طرح اطاعت کرتا ہو لیکن دوسرا شخص غرور کے میدان میں رہتا ہے اور جو شخص بے خوف ہو اگر وہ ہمیشہ عبادت میں مصروف رہتا ہے تو معصیت سے خوف صالحین کا خوف ہے اور اللہ تعالیٰ سے خوف موحدین صدیقین کا خوف ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا نتیجہ ہے جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کو جان لیتا ہے وہ اس کی صفات میں سے اس صفت کو جان لیتا ہے جو اس لائق ہے کہ کسی گناہ کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرا جائے بلکہ گناہ گار شخص اگر صحیح طور پر اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لے تو وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اس کی نافرمانی سے نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات سے ڈر نہ ہوتا تو وہ اسے گناہ کے لیے مسخر نہ کرتا اور نہ ہی اس کے لیے اس کا راستہ آسان کرتا اور اس کے اسباب تیار کرتا۔ کیوں کہ اسباب گناہ کا آسان کر دینا اپنے آپ سے دور کرنا ہے

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۱۶۷ مرویات عبداللہ بن عمرو۔

حالانکہ اس معصیت سے بھی اس سے کوئی نافرمانی سرزد نہیں ہوئی جس کی وجہ سے وہ اس بات کا مستحق ہوتا کہ اسے گناہ کے لیے قابو کیا جائے اور اس پر اسبابِ معصیت کو جاری کر دیا جائے اور عبادت سے پہلے کوئی وسیلہ نہیں تھا جسے وہ شخص وسیلہ بناتا جس کے لیے عبادات کو آسان کیا گیا اور عبادات کا راستہ اس کے لیے تیار کیا گیا تو گناہ کرنے والے کے لیے گناہ کا فیصلہ کر دیا گیا وہ چاہے یا نہ اسی طرح اطاعت کرنے والے کا مسئلہ ہے تو وہ ذات جس نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعلیٰ علیین تک بلندی عطا فرمائی حالانکہ آپ کے وجودِ مسعود سے پہلے کوئی وسیلہ نہ تھا اور ابوجہل کے پیدا ہونے سے پہلے اس کے لیے اسفل السافلین رکھ دیا حالاں کہ اس وقت اس کے لیے کوئی وسیلہ نہ تھا وہ ذات اس لائق ہے کہ اس کی صفتِ جلال کی وجہ سے اس سے ڈرا جائے پس جو شخص اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرتا ہے وہ اس لیے اطاعت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر ارادۂ اطاعت مسلط کر دیا اور اسے طاقت عطا فرمائی اور پختہ ارادے اور قدرتِ تامہ کے بعد فعل ضروری ہو جاتا ہے اور جس نے نافرمانی کی اس نے اس وجہ سے کی کہ اس پر مضبوط اور پختہ ارادہ مسلط کر دیا گیا اور اس کے پاس اسباب اور قدرت آگئی اور ارادے اور طاقت کے بعد فعل ضروری ہو گیا۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ کون ہے جس نے اس کا اکرام واجب کیا اور اس پر ارادۂ طاعت کو مسلط کرنے کے ذریعے اسے خاص کر دیا اور وہ کون ہے جس نے اس دوسرے کی ذلت و اہانت کو واجب کیا اور اس پر معصیت کے اسباب مسلط کر کے اس کو دُور کر دیا؟ یہ بات بندے کی طرف کیسے پھیری جا سکتی ہے تو جب یہ بات ازلی فیصلہ کی طرف لوٹتی ہے جب کوئی گناہ اور وسیلہ نہ تھا تو اس سے ڈرنا جو جیسا چاہے فیصلہ کرے اور جو چاہے حکم دے ہر عقلمند پر لازم ہے اور اس معنیٰ کے بعد ایک ایسا راز ہے جس کا افشاء جائز نہیں ہے (۱)

اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے حوالے سے خوف کو سمجھنے کے لیے ایک مثال ذکر کی جاتی ہے اس کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں اگر شریعت کی اجازت نہ ہوتی تو کوئی بھی صاحبِ بصیرت شخص اس کے ذکر کی جرأت نہ کر سکتا حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی اے داؤد! مجھ سے اس طرح ڈرو جس طرح پھاڑنے والے درندے سے ڈرتے ہو، اس مثال سے تمہیں حاصل معنیٰ کی سمجھ آجائے گی اگرچہ یہ تمہیں اس کے سبب سے آگاہی نہیں دے سکتی کیوں کہ سبب سے آگاہی تقدیر کے پوشیدہ راز پر آگاہی ہے اور وہ صرف اس کے اہل لوگوں پر منکشف ہوتا ہے۔

---

(۱) حضرت امام غزالی رحمہ اللہ کا اشارہ غالباً اس بات کی طرف ہے کہ تقدیر کے بارے میں بحث جائز نہیں ہے لہٰذا ہمیں صرف اتنی بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے عبادت اور گناہ کے سلسلے میں ازل میں فیصلہ فرمایا اس نے ہمیں مجبور نہیں کیا بلکہ ہمیں اختیار دیا گیا اور جو کچھ ہم نے کرنا تھا وہ لکھا یہ نہیں کہ ہمیں پابند کیا گیا ۱۲ ہزاروی

حاصل کلام یہ ہوا کہ درندے سے اس لیے نہیں ڈرتے کہ ہم نے پہلے اس کا کوئی جرم کیا ہے بلکہ اس کی صفت، اس کی پکڑ، اس کے رعب و دبدبہ اور ہیبت وغیرہ کی وجہ سے ڈرتے ہیں اور اس لیے کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اس کی پرواہ نہیں کرتا اگر درندہ کسی کو ہلاک کر دے تو اس کے دل میں کوئی نرمی پیدا نہیں ہوتی اور نہ ہی وہ اس قتل پر دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دیتا ہے تو تم پر شفقت کرتے ہوئے اور تمہاری روح کو باقی رکھنے کے لیے نہیں چھوڑتا بلکہ تم اس کے نزدیک زیادہ خسیس شمار ہوتے ہو تم زندہ ہو یا مردہ وہ تمہاری طرف توجہ نہیں کرتا بلکہ اس کے نزدیک تمہارے جیسے ایک ہزار افراد کو ہلاک کرنا اور ایک چیونٹی کو قتل کرنا ایک جیسا ہے کیوں کہ اس سے اس کی درندگی میں کوئی عیب پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی صفت مثلاً طاقت اور دبدبے میں کوئی فرق آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے اعلیٰ مثال ہے۔

لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کو باطنی مشاہدے کے ساتھ پہچان لیتا ہے اور یہ مشاہدہ زیادہ قوی، زیادہ باوثوق اور ظاہری مشاہدے سے زیادہ روشن ہے تو اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس قول میں سچا ہے کہ یہ لوگ جنت کے لیے ہیں اور مجھے اس کی پرواہ نہیں اور یہ جہنم کی طرف جائیں گے اور مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں اور اس کی ہیبت و خوف کے بارے میں اتنا جاننا کافی ہے کہ وہ مستغنی اور بے پرواہ ذات ہے ڈرنے والوں کے دوسرے طبقے کو چاہیے کہ وہ اپنے دل میں اس مکروہ بات کی مثالی شکل رکھیں جیسے موت کی سختیاں، منکر نکیر کے سوالات، عذاب قبر یا قیامت کا خوف یا اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے کی ہیبت، پردہ دری سے حیا چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں سوال، پل صراط اور اس کی تیزی کا خوف اس کو عبور کرتے کا خوف جہنم اس کے جوش مارتے اور اس کے ہولناک منظر کا خوف جنت جو نعمتوں کا گھر اور ہمیشہ رہنے والی حکومت ہے، سے محرومی کا خوف درجات کی کمی کا خوف یا اللہ تعالیٰ سے حجاب کا خوف۔

یہ تمام اسباب ذاتی طور پر ناپسند ہوتے ہیں اور یہ بھی لازماً مقاماتِ خوف ہیں اس سلسلے میں بھی خوف کھانے والوں کے حالات مختلف ہیں اور سب سے بڑا مرتبہ فراق اور اللہ تعالیٰ سے حجاب میں ہونے کا خوف ہے اور یہ عارفین کا خوف ہے اور جو کچھ اس سے پہلے ہے وہ عاملین، صالحین، زاہدین اور عام لوگوں کا خوف ہے اور جس شخص کی معرفت کامل نہ ہو اس کے لیے بصیرت نہیں کھلتی، اسے لذت وصال کا شعور حاصل نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے بُعد و فراق سے پہنچنے والے دکھ کا شعور ہوتا ہے اور جب اس کے سامنے ذکر کیا جائے کہ عارف جہنم سے نہیں ڈرتا وہ تو حجاب سے ڈرتا ہے تو وہ اس بات کو دل سے ناپسند کرتا ہے اور اس پر دل ہی دل میں تعجب کرتا ہے اور ہو سکتا ہے بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی زیارت کی لذت کا انکار ہی کر دے اگر شریعت نے اس کو منع نہ کیا ہوتا تو اس کا زبان سے اعتراف کرنا ضرورتِ تقلید کے تحت ہے ورنہ اس کا باطن اس کی تصدیق نہیں کرتا کیوں کہ وہ تو پیٹ شرمگاہ اور آنکھ کی لذت کو ہی جانتا ہے جب وہ طرح طرح کے رنگوں اور خوبصورت چہروں کو دیکھتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہر وہ لذت جس میں حیوانات بھی شریک ہوتے ہیں وہ اسی میں شامل ہے۔

لیکن عارفین کو جو لذت حاصل ہوتی ہے اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا اور جو لوگ اس بات کے اہل نہیں ہیں ان کے سامنے اس بات کی تفصیل اور تشریح بیان کرنا حرام ہے اور جو اہل ہے وہ خود بخود دیکھ لیتا ہے اسے کسی دوسرے کی طرف سے تشریح کی حاجت نہیں ہے۔

یہ اقسام خائفین کے خوف کی طرف لوٹتی ہیں ہم اللہ تعالیٰ کے کرم کے صدقے اس سے توفیق کا سوال کرتے ہیں۔

فصل ۴

فضیلت خوف اور اس کی ترغیب

جاننا چاہیے کہ خوف کی فضیلت بعض اوقات غور و فکر سے معلوم ہوتی ہے اور بعض اوقات آیات و احادیث سے واضح ہوتی ہے۔

جہاں تک قیاس اور غور و فکر کا تعلق ہے تو اس کا راستہ یہ ہے کہ کسی چیز کی فضیلت اسی اندازے کے مطابق ہے جس قدر وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی ملاقات کی سعادت تک پہنچانے میں بے نیاز کرتی ہے کیوں کہ سعادت کے سوا کوئی مقصود نہیں اور بندے کی سعادت یہی ہے کہ اسے اپنے مولیٰ سے ملاقات اور قرب کا شرف حاصل ہو۔ تو جو عمل اس سعادت پر معاون ہو اس کے لیے فضیلت ہوتی ہے اور فضیلت بقدر غایت ہوتی ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ آخرت میں ملاقات کے ذریعے سعادت تک پہنچنے کے لیے محبت کا حصول نیز دنیا میں اس سے مانوس ہونا ضروری ہے اور محبت کا حصول معرفت کے بغیر نہیں ہوتا اور حصولِ معرفت کے لیے دائمی فکر ضروری ہے اور اُنس کے حصول کے لیے محبت اور دائمی ذکر لازمی ہے اور ذکر و فکر پر مواظبت اسی وقت ہو سکتی ہے جب دل سے دنیا کی محبت منقطع ہو جائے اور اس انقطاع کے لیے لذاتِ دنیا اور خواہشات کا ترک ضروری ہے اور شہوت والے کاموں کو اسی وقت چھوڑنا ممکن ہے جب خواہشات کا قلع قمع کیا جائے اور جس قدر شہوت کا خاتمہ خوف کی آگ سے ہوتا ہے کسی دوسری چیز کے ذریعے نہیں ہوتا پس خوف، شہوات کو جلانے والی آگ ہے اور وہ جس قدر شہوات کو جلاتا ہے اسی قدر اس کی فضیلت ہوتی ہے اسی طرح جس قدر وہ گناہوں سے روکتا اور عبادات کی رغبت پیدا کرتا ہے اسی قدر اس کی فضیلت ہوتی ہے اور یہ خوف کے درجات سے مختلف ہوتی ہے جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ اور خوف میں فضیلت کیوں نہ ہو گی جب کہ اس کے ذریعے عفت، ورع، تقویٰ اور مجاہدہ حاصل ہوتا ہے اور یہ اچھے اور قابل تعریف اعمال ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہیں۔ اور آیات و احادیث کے ذریعے اس کی فضیلت کے بیان کے سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہے کہ خوف کی فضیلت میں بے شمار آیات و احادیث آئی ہیں اور خوف کی فضیلت کے سلسلے میں تمہارے لیے اتنی بات کافی ہے کہ خائفین کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہدایت، رحمت، علم اور رضوان کو جمع فرمایا اور یہ تمام امور اہل جنت کے مقامات کو جمع کرنے ہیں۔

آیاتِ کریمہ:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ۔ (۱)

یہ (تورات) ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

اور ارشاد فرمایا۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ۔ (۲)

بے شک اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی خشیت وخوف کی وجہ سے ان کو علم سے موصوف فرمایا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ۔ (۳)

اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے یہ اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرا۔

تو جو باتیں فضیلت علم پر دلالت کرتی ہیں وہ خوف کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں کیوں کہ خوف، علم کا ثمرہ ہے اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خبر میں آیا ہے کہ خائفین کے لیے رفیق اعلیٰ ہے جس میں ان کے ساتھ کوئی شریک نہ ہوگا۔ تو دیکھو کس طرح اللہ تعالیٰ نے رفیق اعلیٰ (اللہ تعالیٰ) کی رفاقت کے سلسلے میں ان کو منفرد رکھا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ علماء ہیں اور علماء کو انبیاء کرام علیہم کی رفاقت کا مرتبہ حاصل ہے کیوں کہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں اور رفیق اعلیٰ کی رفاقت انبیاء کرام علیہم السلام کے وارث ہیں اور رفیق اعلیٰ کی رفاقت انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے اور ان لوگوں کے لیے ہے جو ان کے ساتھ ملحق ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض الموت میں دنیا میں باقی رہنے اور بارگاہ خداوندی میں حاضری کے درمیان اختیار دیا گیا تو آپ نے فرمایا۔

اَسْاَلُكَ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى۔ (۴)

یا اللہ! میں تجھ سے رفیق اعلیٰ کا سوال کرتا ہوں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ اعراف آیت ۱۵۴

(۲) قرآن مجید، سورۃ فاطر آیت ۲۸

(۳) قرآن مجید، سورۃ البینہ آیت ۸

(۴) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۶۲ کتاب الرقاق

اب اگر خوف کی بنیاد کو دیکھا جائے تو وہ علم ہے اور اس کے نتیجے کو دیکھیں تو وہ ورع اور تقویٰ ہے اور ان دونوں باتوں کی فضیلت کے سلسلے میں جو کچھ آیا ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے حتیٰ کہ عاقبت، تقویٰ کے ساتھ مختص کردی گئی۔

جیسا کہ حمد اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور صلوٰۃ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے حتیٰ کہ کہا جاتا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاٰلِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں اور عافیت (اچھا انجام) پرہیزگار لوگوں کے لیے اور صلوٰۃ (رحمت) ہمارے سردار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تمام آل پر ہو۔

اور اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کو اپنے ساتھ خاص کیا (یعنی قبولیت کے اعتبار سے)

ارشاد خداوندی ہے۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ تک ان قربانیوں کا گوشت اور خون ہرگز نہیں پہنچتا بلکہ اس تک تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

اور تقویٰ ان چیزوں سے رکنے کا نام ہے جو خوف کا مقتضیٰ ہیں۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ۔ (۲)

بے شک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اولین وآخرین کو تقویٰ کا حکم دیا ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ۔ (۳)

اور بے شک ہم نے ان لوگوں کو جو تم سے پہلے گزر گئے اور تمہیں (بھی) حکم دیا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔ (۴)

اور مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

تو اللہ تعالیٰ نے خوف کا حکم دیا اور اسے واجب قرار دیا بلکہ ایمان میں شرط قرار دیا اسی لیے یہ تصور نہیں ہوسکتا کہ کوئی مومن خوف سے خالی ہو اگرچہ کتنا ہی کمزور ہو اور خوف کا ضعف ایمان ومعرفت کی کمزوری کے مطابق ہوتا ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ حج آیت ۳۷

(۲) قرآن مجید، سورۂ حجرات آیت ۱۳

(۳) قرآن مجید، سورۂ نساء آیت ۱۳۱

(۴) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۱۷۵

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تقویٰ کی فضیلت کے بارے میں بیان فرمایا۔
جب معلوم دن (قیامت کے دن) اللہ تعالیٰ پہلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا تو اس وقت ان کو ایک آواز آئے گی جسے ان کے دور والے بھی اسی طرح سنیں گے جس طرح قریب والے سنیں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے لوگو! میں نے جب سے تمہیں پیدا کیا اس دن سے آج تک میں تمہاری باتیں سنتا رہا آج تم میری بات غور سے سنو یہ تمہارے اعمال تمہاری طرف لوٹائے جا رہے ہیں اے لوگو! ایک نسب میں نے بنایا اور ایک نسب تم نے قرار دیا تم نے میرے نسب کو پست کیا اور اپنے نسب کو بلند کیا میں نے کہا تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے اور تم نے انکار کیا تم نے کہا فلاں، فلاں شخص سے زیادہ غنی ہے آج میں تمہارے نسب کو پست اور اپنے نسب کو بلند کروں گا متقی لوگ کہاں ہیں؟ تو ایک قوم کے لیے جھنڈا بلند کیا جائے گا تو لوگ اپنے جھنڈے کے پیچھے چل کر اپنی منازل تک جائیں گے اور کسی حساب کے بغیر جنت میں جائیں گے (۱)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللهِ۔ (۲) حکمت کی اصل اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

إِنْ اَرَدْتَ اَنْ تَلْقَانِيْ فَاَكْثِرْ مِنَ الْخَوْفِ بَعْدِيْ۔ (۳) اگر تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو تو میرے بعد خوف زیادہ رکھنا۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو یہ خوف ہر بھلائی کی طرف اس کی راہنمائی کرتا ہے۔
حضرت شبلی رحمہ اللہ نے فرمایا میں جس دن اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں اسی دن حکمت و عبرت کا ایسا دروازہ دیکھتا ہوں جو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔
حضرت یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو شخص کوئی برائی کرتا ہے اسے دو اچھائیاں ملتی ہیں ایک عذاب کا خوف اور دوسری معافی کی امید جیسا کوئی لومڑی دو شیروں کے درمیان ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے متعلق حدیث میں ہے کہ جہاں تک ورع والوں (پرہیزگاروں) کا تعلق ہے تو ہر شخص سے حساب ہوگا اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس کی چھان بین ہوگی سوائے اہل ورع کے، کیوں کہ مجھے ان سے حیا آتا ہے اور ان کی اجل یہ ہے کہ میں ان کو حساب کے لیے کھڑا کروں۔

---

(۱) المستدرک للحاکم جلد ۲ ص ۴۶۴ کتاب التفسیر
(۲) شعب الایمان جلد اول ص ۴۷۰ حدیث ۷۴۳
(۳)

ورع اور تقویٰ ایسے نام ہیں جو ان معانی سے مشتق ہیں جن کے لیے خوف شرط ہے اگر تم خوف سے خالی ہو تو تم ان ناموں کے ساتھ موسوم نہیں ہو سکتے ۔ اسی طرح فضائلِ ذکر بھی مخفی نہیں ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اسے خائفین کے ساتھ خاص کیا۔

ارشاد خداوندی ہے ۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۔ (۱)

پس نصیحت وہ مانے گا جو ڈرتا ہے ۔

اور ارشاد خداوندی ہے ۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ ۔ (۲)

اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے اس کے لیے دو جنت ہیں ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ۔

لَا اَجْمَعُ عَلٰى عَبْدِىْ خَوْفَيْنِ وَلَا اَجْمَعُ لَهٗ اَمْنَيْنِ فَاِنْ اَمِنَنِيْ فِي الدُّنْيَا اَخَفْتُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَاِنْ خَافَنِيْ فِي الدُّنْيَا اَمَّنْتُهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔ (۳)

مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے میں اپنے بندے پر دو خوف جمع نہیں کروں گا اور نہ اس کے لیے دو امن جمع کروں گا اگر وہ دنیا میں مجھ سے بے خوف رہے تو میں قیامت کے دن اسے خوف میں مبتلا کروں گا اور اگر وہ دنیا میں مجھ سے ڈرتا ہے تو میں قیامت کے دن اسے امن میں رکھوں گا ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔

مَنْ خَافَ اللّٰهَ خَافَهٗ كُلُّ شَيْءٍ وَمَنْ خَافَ غَيْرَ اللّٰهِ خَوَّفَهُ اللّٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ (۴)

جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے ہر چیز اس سے ڈرتی ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے غیر سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ہر چیز سے خوف زدہ کرتا ہے ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ۔

اَتَمُّكُمْ عَقْلًا اَشَدُّكُمْ خَوْفًا لِلّٰهِ وَاَحْسَنُكُمْ فِيْمَا اَمَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى بِهٖ وَنَهٰى عَنْهُ نَظَرًا ۔ (۵)

تم میں سے سب سے زیادہ کامل عقل والا وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی میں غور کرتا ہے وہ تم سب سے اچھا ہے ۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ الاعلیٰ آیت ۱۰

(۲) قرآن مجید، سورۂ رحمٰن آیت ۴۶

(۳) شعب الایمان جلد اول ص ۴۸۳ حدیث ۷۷۷

(۴) کنز العمال جلد ۳ ص ۱۴۱ حدیث ۵۹۱۵

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے مسکین انسان اگر جہنم سے اسی طرح ڈرے جس طرح فقر سے ڈرتا ہے تو جنت میں داخل ہو۔

حضرت ذوالنون رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس کا دل پگھل جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی محبت مضبوط ہو جاتی ہے نیز اس کے لیے اسکی عقل صحیح ہو جاتی ہے۔

حضرت ذوالنون رحمہ اللہ نے ہی فرمایا کہ خوف کا امید کے مقابلے میں زیادہ بلیغ ہونا مناسب ہے کیوں کہ جب امید غالب ہو تو دل میں تشویش پیدا ہوتی ہے۔

حضرت ابوالحسن الضریر (نابینا) رحمہ اللہ فرماتے تھے نیک بختی کی علامت بدبختی سے ڈرنا ہے کیوں کہ خوف اللہ تعالےٰ اور بندے کے درمیان ایک لگام ہے جب اس کی لگام ٹوٹ جائے تو وہ ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ہلاک ہو جاتا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ کل (بروز قیامت) مخلوق میں سے کون زیادہ بے خوف ہوگا؟ انہوں نے فرمایا جو آج زیادہ ڈرتا ہے حضرت سہل رحمہ اللہ فرماتے ہیں تم اس وقت تک خوف تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے جب تک حلال نہ کھاؤ۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے پوچھا گیا اے ابوسعید! ہم کیا کریں ہم کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھتے ہیں جو ہمیں ڈراتے ہیں حتیٰ کہ ہمارے دل اڑنے کے قریب ہو جاتے ہیں انہوں نے فرمایا اللہ کی قسم اگر تم ایسے لوگوں کے ساتھ مل جاؤ جو تمہیں ڈراتے ہیں حتیٰ کہ تمہیں امن حاصل ہو جائے تو یہ بات تمہارے لیے اس بات سے بہتر ہے کہ تم ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرو جو تمہیں بے خوفی کی راہ دکھاتے ہیں حتیٰ کہ تمہیں خوف آ پکڑے۔

حضرت سلیمان دارانی رحمہ اللہ نے فرمایا جس دل سے خوف دور ہو جاتا ہے وہ خراب (ویران) ہو جاتا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ! اس آیت سے چور اور زانی مراد ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

اَلَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ۔ (۱) — اور وہ جو دیتے ہیں جو کچھ دیں اور ان کے دل ڈر رہے ہوتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

لَا بَلِ الرَّجُلُ یَصُوْمُ وَیُصَلِّیْ وَیَتَصَدَّقُ وَیَخَافُ اَنْ لَّا یُقْبَلَ مِنْهُ۔ (۲) — نہیں، بلکہ وہ شخص مراد ہے جو روزہ رکھتا، نماز پڑھتا اور صدقہ کرتا ہے اور اسے ڈر ہو کہ اس سے (یہ عبادت) قبول نہ ہو۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ مومنون آیت ۶۰

(۲) جامع ترمذی ص ۵۵۴، ابواب التفسیر

اور اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر اور عذاب سے امن کے بارے میں وارد وعیدات بے شمار ہیں اور یہ سب خوف کی تعریف ہے کیوں کہ کسی چیز کی مذمت اس کی ضد کی تعریف ہے جو اس کی نفی کرتی ہے اور خوف کی ضد امن ہے جیسے امید کی ضد مایوسی ہے اور جس طرح مایوسی کی مذمت، امید کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے اسی طرح بے خوفی کی مذمت، خوف کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے جو اس کی ضد ہے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ جو کچھ امید کی فضیلت میں وارد ہے وہ فضیلتِ خوف کی دلیل ہے کیوں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو لازم ہیں اس لیے کہ جو شخص کسی محبوب چیز کی امید رکھتا ہے ضروری ہے کہ وہ اس کے فوت ہونے سے ڈرے اور اگر اسے اس کے فوت ہونے کا خوف نہ ہو تو وہ اس سے محبت ہی نہیں کرتا پس وہ اس کے انتظار کی وجہ سے امیدوار نہیں کہلا سکتا۔

تو خوف اور امید لازم و ملزوم ہیں ایک دوسرے سے ان کی جدائی محال ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں کے جمع ہونے کی صورت میں ایک، دوسرے پر غالب ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دل ان میں سے ایک میں مشغول ہو اور فی الحال دوسرے کی طرف متوجہ نہ ہو کیوں کہ اس سے غافل ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ امید اور خوف کی ایک شرط یہ ہے کہ ان دونوں کا تعلق اس چیز کے ساتھ ہوتا ہے جس میں شک ہو کیونکہ جو چیز یقینی ہو اس کی نہ تو امید ہوتی ہے اور نہ ہی خوف۔ پس وہ محبوب جس کے وجود کا امکان ہو اس کا عدم بھی لامحالہ جائز ہوتا ہے پس اس کے وجود کی تقدیر دل کو راحت پہنچاتی ہے اور یہی امید ہے اور اس کے عدم کی تقدیر دل کو پریشان کرتی ہے اور اسی کو خوف کہتے ہیں اور جب وہ بات جس کا انتظار کیا جاتا ہے مشکوک ہو تو دونوں تقدیریں لازماً ایک دوسرے کے مقابلے میں ہوتی ہیں ہاں شک کی دو طرفوں میں سے ایک بعض اوقات بعض اسباب کی موجودگی کے باعث راجح ہوتی ہے اور اسے ظن کہتے ہیں اور یہ بات، ایک کے دوسرے پر غلبہ کا سبب ہوتی ہے اور جب وجودِ محبوب کا غالب گمان ہو تو امید قوی ہو جاتی ہے اور اس کے مقابلے میں خوف پوشیدہ ہوتا ہے اور اسی طرح اس کے برعکس بھی ہوتا ہے اور دونوں صورتوں میں یہ دونوں ایک دوسرے کو لازم و ملزوم ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا۔ (۱) اور وہ ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے ہیں۔

اور ارشاد فرمایا۔

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔ (۲) وہ اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں۔

اسی لیے اہل عرب خوف کو رجاء سے تعبیر کرتے ہیں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ انبیاء آیت ۹۰

(۲) قرآن مجید، سورۂ سجدہ آیت ۱۶

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا۔ (۱)

تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سامنے عزت حاصل کرنے کی آرزو نہیں کرتے۔

یعنی تم کیوں نہیں ڈرتے اور قرآن پاک میں بے شمار مقامات پر رجاء خوف کے معنی میں آیا ہے کیوں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کو لازم ہیں اس لیے کہ عربوں کی عادت ہے کہ وہ کسی چیز کی تعبیر اس کے لازم سے کرتے ہیں۔

بلکہ میں کہتا ہوں کہ جو کچھ خشیت الہٰی کی وجہ سے رونے کی فضیلت کے سلسلے میں آیا ہے وہ خشیت کی فضیلت کا اظہار ہے کیوں کہ رونا خشیت کا نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا۔ (۲)

پس چاہیئے کہ وہ تھوڑا ہنسیں اور زیادہ روئیں۔

اور ارشاد خداوندی ہے،

يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا۔ (۳)

وہ روتے ہیں اور ان کا خشوع بڑھتا ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ وَاَنْتُمْ سَامِدُوْنَ۔ (۴)

تو کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو اور روتے نہیں حالاں کہ تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

وَمَا مِنْ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ تَخْرُجُ مِنْ عَيْنَيْهِ دَمْعَةٌ وَاِنْ كَانَتْ مِثْلَ رَأْسِ الذُّبَابِ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى ثُمَّ تُصِيْبُ شَيْئًا مِنْ حَرِّ وَجْهِهِ اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ۔ (۵)

جس مومن کی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کے خوف سے آنسو نکلتا ہے اگرچہ مکھی کے سر کے برابر ہو پھر اسے اس کے چہرے کی گرمی کی وجہ سے کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جہنم پر حرام کر دیتا ہے۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

---

(۱) قرآن مجید، سورہ نوح آیت ۱۳

(۲) قرآن مجید، سورہ توبہ آیت ۸۲

(۳) قرآن مجید، سورہ اسرا آیت ۱۰۹

(۴) قرآن مجید، سورہ النجم آیت ۵۹

(۵) شعب الایمان جلد اول ص ۴۹۱ حدیث ۸۰۲

اِذَا اقْشَعَرَّ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ تَحَاتَّتْ عَنْهُ خَطَايَاهُ كَمَا يَتَحَاتُّ مِنَ الشَّجَرَةِ وَرَقُهَا۔ (۱)

جب مومن کا دل اللہ تعالیٰ کے خوف سے لرزتا ہے تو اس سے خطائیں جھڑ جاتی ہیں جس طرح درخت سے اس کے پتے جھڑتے ہیں۔

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَا يَلِجُ النَّارَ اَحَدٌ بَكٰى مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى حَتّٰى يَعُوْدَ اللَّبَنُ فِي الضَّرْعِ۔ (۲)

جو شخص اللہ تعالیٰ کے خوف سے روتا ہے وہ ہرگز جہنم میں داخل نہیں ہوگا حتیٰ کہ دودھ (جانور کے) تھن میں واپس آ جائے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) نجات کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا۔

اَمْسِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ وَابْكِ عَلٰى خَطِيْئَتِكَ۔ (۳)

اپنی زبان کو روک رکھو، تمہارا گھر تمہیں کفایت کرے (بلا ضرورت باہر نہ جاؤ) اور اپنے گناہوں پر روؤ۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ کی امت میں سے کوئی شخص بغیر حساب کے جنت میں جائے گا؟ آپ نے فرمایا۔

نَعَمْ مَنْ ذَكَرَ ذُنُوْبَهٗ فَبَكٰى۔ (۴)

ہاں جو شخص اپنے گناہوں کو یاد کر کے روئے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَا مِنْ قَطْرَةٍ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى مِنْ قَطْرَةِ دَمْعٍ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى اَوْ قَطْرَةِ دَمٍ اُهْرِيْقَتْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰى۔ (۵)

اللہ تعالیٰ کو اس قطرے سے بڑھ کر کوئی قطرہ پسند نہیں جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے بہتا ہے یا خون کا وہ قطرہ جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں بہایا جاتا ہے۔

اور آپ نے یوں دعا مانگی ہے

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ عَيْنَيْنِ هَطَّالَتَيْنِ تَشْفِيَانِ

یا اللہ! مجھے ایسی دو آنکھیں عطا فرما جو کثرت سے پانی

---

(۱) شعب الایمان جلد اول ص ۴۹۱ حدیث ۸۰۲

(۲) الترغیب والترہیب جلد ۲ ص ۲۷۱ کتاب الجہاد

(۳) الترغیب والترہیب جلد ۲ ص ۲۳۲ کتاب التوبہ

(۴)

(۵) المصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱۲ ص ۲۷۱ حدیث ۱۶۲۵۶

يُذْرُوْنِ الدَّمْعَ قَبْلَكَ اَنْ تَصِيْرَ الدَّمُوْعُ دِمَاءً وَالْاَضْرَاسُ جَمْرًا ـ (۱)

بہاتی ہوں اور آنسو گرانے سے تسکین دیں اس سے پہلے کہ آنسو، خون بن جائیں اور داڑھیں، انگاروں میں بدل جائیں۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

جس دن اللہ تعالیٰ کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا سات آدمی اس کے سائے میں ہوں گے، اور ان میں اس شخص کا بھی ذکر فرمایا جو علیحدگی میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں (۲)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص رو سکتا ہو وہ روئے اور جو رو نہ سکتا ہو وہ بتکلف روئے ــــــ اور حضرت محمد بن منکدر رحمہ اللہ جب روتے تو اپنے چہرے اور داڑھی سے آنسو صاف کرتے اور فرماتے مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آگ اس جگہ تک نہیں پہنچتی جس پر آنسو گرے ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں روؤ اگر رونا نہیں آتا تو بتکلف روؤ پس اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر تم میں سے کوئی ایک جانتا تو وہ چلاتا حتی کہ اس کی آواز ٹوٹ جاتی اور نماز پڑھتا حتی کہ اس کی پیٹھ ٹوٹ جاتی۔

حضرت ابوسلیمان دارانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس آنکھ آنسوؤں سے ڈبڈبائے گی اس آنکھ والے کے چہرے پر قیامت کے دن غبار اور ذلت نہیں چڑھے گی اگر اس کے آنسو جاری ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کے پہلے قطرے کے ساتھ آگ کے کئی سمندروں کو بجھا دیتا ہے اور جس امت میں کوئی شخص (خوف خدا سے) روتا ہے اس امت کو عذاب نہیں ہوتا۔

حضرت ابوسلیمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں رونا، خوف سے اور امید اور خوشی سے جھومنا شوق کی وجہ سے ہوتا ہے ــــ حضرت کعب احبار رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے روؤں حتی کہ میرے آنسو میرے رخساروں پر جاری ہوں تو یہ بات مجھے اس بات سے زیادہ پسند ہے کہ میں سونے کا ایک پہاڑ صدقہ کروں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے خوف سے ایک آنسو کا بہنا میرے نزدیک ایک ہزار دینار صدقہ کرنے سے زیادہ پسند ہے۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے تو آپ نے ہمیں ایک وعظ فرمایا جس سے دل نرم ہو گئے، آنسو بہنے لگے اور ہم سے اپنے نفسوں کو پہچان لیا پھر میں اپنے گھر کی طرف لوٹا اور میری بیوی میرے قریب ہوئی اور ہمارے درمیان دنیوی گفتگو ہونے لگی تو ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جس صورت پر تھے اسے بھول گئے اور دنیا میں مشغول ہو گئے پھر مجھے وہ بات یاد آئی میں نے دل میں کہا میں تو منافق ہو گیا کیوں کہ جو خوف

---

(۱) حلیۃ الاولیاء جلد ۲ ص ۱۹۶، ۱۹۷ ترجمہ ۱۷۷

اور رقت میرے اندر تھی وہ بدل گئی ہیں باہر نکلا اور پکارنے لگا کہ حنظلہ منافق ہوگیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سامنے سے تشریف لائے اور فرمایا ہرگز نہیں حنظلہ منافق نہیں ہوا پھر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں کہہ رہا تھا کہ حنظلہ منافق ہوگیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں حنظلہ منافق نہیں ہوا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم آپ کے پاس تھے آپ نے ایک ایسا وعظ فرمایا جس سے دل دہل گئے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور ہم نے اپنے آپ کو پہچان لیا پھر میں اپنے گھر والوں کی طرف لوٹا اور ہم دنیوی باتوں میں مشغول ہوگئے اور آپ کے ہاں جو حالت پیدا ہوتی تھی میں اسے بھول گیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے حنظلہ! اگر تم ہمیشہ اسی حالت پر رہتے تو فرشتے راستوں میں اور تمہارے بچھونے پر تم سے مصافحہ کرتے لیکن اے حنظلہ! وقت وقت کی بات ہوتی ہے (۱)

تو نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ امید اور رونے کی فضیلت، تقویٰ اور ورع کی فضیلت علم کی فضیلت اور بے خوفی کی مذمت کے بارے میں آیا ہے وہ خوف کی فضیلت پر دلالت ہے کیوں کہ یہ سب کچھ خوف سے متعلق ہے چاہے سبب کا تعلق ہو یا مسبب کا۔

فصل ۵

غلبۂ خوف افضل ہے یا غلبہ رجاء یا اعتدال

جان لو! خوف اور امید کے بارے میں بے شمار روایات آئی ہیں بعض اوقات کوئی شخص ان دونوں کو دیکھتا ہے تو اسے شک ہو جاتا ہے کہ ان دونوں میں سے کیا افضل ہے اور کسی قائل کا یہ قول کہ خوف افضل ہے یا امید، ایک فاسد سوال ہے یہ کسی شخص کی اس بات کی طرح ہے کہ روٹی افضل ہے یا پانی؛ اس کا جواب یہ ہے کہ بھوکے کے لیے روٹی افضل ہے اور پیاسے کے لیے پانی افضل ہے اور اگر پیاس غالب ہو تو پانی افضل ہے اور اگر دونوں برابر ہوں تو روٹی اور پانی دونوں مساوی ہوں گے اس لیے کہ جو چیز کسی مقصود کے لیے مراد ہو تو اس کی فضیلت مقصود کی طرف اضافت کے اعتبار سے ہوتی ہے ذاتی طور پر نہیں اور خوف و امید دو دوائیں ہیں جن کے ساتھ دلوں کا علاج کیا جاتا ہے لہٰذا ان کی فضیلت اس بیماری کے اعتبار سے ہوگی جو موجود ہے اگر دل پر اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خوفی اور غرور کی بیماری غالب ہو تو خوف افضل ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی غالب ہو تو امید افضل ہے اسی طرح اگر بندے پر گناہ غالب ہو تو خوف افضل ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مطلقاً خوف افضل ہے جس اعتبار سے یہ کہا جاتا ہے کہ روٹی، سکنجبین سے افضل ہے کیوں کہ روٹی کے ساتھ بھوک کی بیماری کا علاج کیا جاتا ہے اور سکنجبین کے ساتھ صفراء کی بیماری کا علاج کرتے ہیں اور بھوک کی بیماری زیادہ بھی ہے اور غالب بھی ہے لہٰذا روٹی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے پس وہ افضل ہے اس اعتبار سے غلبۂ خوف افضل ہے کیوں کہ گناہ اور مخلوق سے دھوکے میں ہونا زیادہ پایا جاتا ہے۔

اور اگر ان کے منبع کو دیکھا جائے تو امید افضل ہے کیوں کہ اسے بحرِ رحمت سے سیراب کیا جاتا ہے اور خوف غضب

کے سمندر سے سیراب ہوتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی طرف نظر کرتا ہے جو لطف و رحمت کو چاہتی ہیں تو اس پر محبت غالب ہوتی ہے اور محبت سے اوپر کوئی مقام نہیں جہاں تک خوف کا تعلق ہے تو اس کی نسبت ان صفات کی طرف ہوتی ہے جو نفرت کو چاہتی ہیں تو محبت جس طرح امید سے ملتی ہے اس سے نہیں ملتی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جو چیز کسی غیر کے لیے مراد ہوتی ہے اس کے لیے لفظ اصلح (زیادہ صلاحیت والا) استعمال کرنا مناسب ہے لفظ افضل نہیں، پس ہم کہتے ہیں کہ اکثر لوگوں کے لیے امید کے مقابلے میں خوف زیادہ صلاحیت رکھتا ہے کیوں کہ گناہوں کا غلبہ ہے لیکن متقی شخص جس نے ظاہری اور باطنی پوشیدہ اور واضح گناہ ترک کر دیئے تو زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس کا خوف اور امید اعتدال پر ہوں اسی لیے کہا گیا ہے کہ اگر مومن کے خوف اور امید کا وزن کیا جائے تو دونوں برابر ہوں گے۔

مروی ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنے کسی صاحبزادے سے فرمایا اے میرے بیٹے! اللہ تعالیٰ سے اس طرح خوف کھاؤ کہ تمہارے خیال میں اگر تم تمام زمین والوں کی نیکیاں بھی اس کے پاس لاؤ تو وہ تم سے ان کو قبول نہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے امید اس طرح رکھو کہ تم سمجھو اگر تمام اہل زمین کی برائیاں بھی اس کے پاس لاؤ تو وہ تمہیں بخش دے گا۔

اسی لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر آواز دی جائے کہ ایک آدمی کے سوا سب لوگ جہنم میں داخل ہو جائیں تو مجھے امید ہے کہ وہ آدمی میں ہوں گا اور اگر آواز دی جائے کہ ایک آدمی کے علاوہ سب لوگ جنت میں چلے جائیں تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ ایک شخص میں نہ ہوں ــ یہ انتہائی درجہ کے خوف اور امید سے عبارت ہے اس میں اعتدال بھی اور غلبے میں بھی دونوں برابر ہیں لیکن ان کے درمیان مساوات کے طریقے پر ہوتا ہے)

تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں کے خوف اور امید کا مساوی ہونا مناسب ہے لیکن جب کوئی گناہ گار شخص یہ گمان کرے کہ جہنم میں داخلے کے حکم سے اسے مستثنیٰ قرار دیا گیا تو یہ اس کے دھوکے کی دلیل ہے۔

سوال:

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے لوگوں کا خوف اور امید ایک جیسا نہیں ہونا چاہیے بلکہ مناسب یہ ہے کہ ان کی امید غالب ہو جیسا کہ امید کے بیان کے آغاز میں گزر چکا ہے اور امید کی قوت اس کے اسباب کے اعتبار سے ہونا مناسب ہے جیسے کھیتی اور بیج کی مثال ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ جو شخص اچھی زمین میں صحیح بیج ڈالتا ہے اور اسے مسلسل تیار کرتا ہے اور زراعت کی تمام شرائط کو پورا کرتا ہے اس کے دل میں فصل حاصل کرنے کی امید غالب ہوتی ہے اور اس کا خوف اس کی اس کی امید کے مساوی نہیں ہوتا تو متقی لوگوں کے احوال کا اسی طرح ہونا مناسب ہے۔

جواب جان لو! جو شخص معارف کو الفاظ اور مثالوں کے ذریعے حاصل کرتا ہے وہ زیادہ پھسلتا ہے اگر ہم اس کی مثال پیش کریں تو وہ ہمارے زیر بحث مسئلہ کی طرح کسی صورت میں نہیں ہوگا۔ کیوں کہ غلبۂ امید کا سبب وہ علم ہے جو تجربہ سے حاصل ہوتا ہے کیوں کہ اس نے تجربہ سے زمین کا صحیح اور صاف ہونا، بیج کی صحت، ہوا کا صحیح ہونا اس زمین میں اور اس کے

علاوہ ہلاک کرنے والی بجلیوں کو جان لیا ہمارے اس مسئلہ کی مثال میں ایک ایسا بیج ہے جس کی جنس کا تجربہ نہیں ہوا وہ عجیب و غریب زمین میں ڈالا گیا کاشتکار نے اس زمین کی دیکھ بھال نہیں کی اور نہ ہی اسے آزمایا۔ اور یہ ان شہروں میں ہے جن کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں گرج زیادہ ہوگی یا نہیں تو اس کاشتکار کی مثال یہ ہے کہ اگرچہ اس نے انتہائی بھرپور کوشش کی اور جو کچھ اس کے بس میں تھا اسے عمل میں لایا تو اس کی امید، خوف پر غالب نہیں ہوتی اور ہمارے اس مسئلہ میں بیج، ایمان ہے اور اس کے صحیح ہونے کی شرائط نہایت دقیق ہیں زمین دل ہے اس کی پوشیدہ کاخباثتیں اور صفات یعنی شرک خفی، منافقت ریاکاری اور پوشیدہ عادتیں بہت دقیق ہیں اور اس زمین کی آفات خواہشات ہیں اور دنیا کی زیبائش اور دل کا مستقبل میں اس کی طرف متوجہ ہو جانا ہے اگرچہ سر دست نہ ہو۔ اور یہ ان باتوں میں سے ہے جن کی تحقیق نہیں ہو سکتی اور نہ ہی تجربہ سے ان کی پہچان ہوتی ہے اس لیے کہ بعض اوقات ایسے اسباب پیش آتے ہیں جن کی مخالفت انسانی طاقت سے باہر ہے اور اس قسم کے امور کا تجربہ نہیں ہو سکتا اور بجلیاں نیز سکرات موت کی ہولناکی اور اس وقت اعتقاد کا مضطرب ہونا ہے اور یہ ان امور میں سے ہے جو تجربات کے تحت نہیں آتے پھر اسے کاٹنا اور حاصل کرنا قیامت سے جنت کی طرف جانا ہے اور یہ بات بھی تجربے سے باہر ہے۔

پس جو شخص ان امور کے حقائق کو پہچان لیتا ہے پس اگر اس کا دل کمزور ہو اور وہ فی نفسہٖ بزدل ہو تو لامحالہ اس کا خوف، امید پر غالب آتا ہے جیسے عنقریب ڈرنے والے صحابہ کرام اور تابعین عظام رضی اللہ عنہم کے احوال میں بیان ہوگا اور اگر اس کا دل مضبوط اور پکا ہو معرفت مکمل ہو تو اس کا خوف اور امید برابر ہوتے ہیں امید غالب نہیں ہوتی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دل کی تفتیش میں مبالغہ کرتے تھے حتیٰ کہ آپ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھتے کہ کیا وہ ان کے دل میں منافقت کی کوئی علامت دیکھتے ہیں کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو منافقین کو پہچاننے کے ساتھ خاص کیا تھا (۱)

تو کون شخص ہے جو اپنے دل کو منافقت کے خفیہ امور اور شرک خفی سے پاک کرنے پر قادر ہو اور اگر اس کا اعتقاد ہو کہ اس کا دل پاک ہو چکا ہے تو حال دل کے تغیر کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے کیسے بے خوف ہوگا۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے عیب مخفی ہیں اور اس بات کا بھی یقین ہو تو اس بات کا یقین کہاں سے آئے گا کہ حسن خاتمہ تک وہ اسی طرح باقی رہے گا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ عَمَلَ اَھْلِ الْجَنَّۃِ — بے شک ایک شخص پچاس سال تک جنتیوں والے اعمال کرتا ہے

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۶۲ کتاب صفات المنافقین۔

خَمْسِينَ سَنَةً حَتّٰى لَا يَبْقٰى بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ اِلَّا شِبْرٌ وَ فِي رِوَايَةٍ اِلَّا قَدْرُ فُوَاقِ نَاقَةٍ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيُخْتَمُ لَهٗ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ۔ (۱)

حتی کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے (اور ایک روایت میں ہے) مگر اونٹنی کی دو دھاروں کے درمیان والی مقدار باقی رہ جاتی ہے کہ اس پر تقدیر غالب آتی ہے تو اس کا خاتمہ جہنمیوں والے کام پر ہوتا ہے۔

اور اونٹنی کے دودھ دوہنے کی مقدار اعضاء کے عمل کا احتمال نہیں رکھتی وہ موت کے وقت دل میں پیدا ہونے والے کھٹکے کی مقدار ہے پس وہ برے خاتمہ کا تقاضا کرتی ہے تو وہ کس طرح بے خوف ہوگا۔

تو مومن کی انتہائی غرض و غایت یہی ہے کہ اس کا خوف اور امید اعتدال پر ہوں عام لوگوں میں امید کا غلبہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ دھوکہ کھا جاتے ہیں اور ان کو معرفت کم حاصل ہوتی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں باتوں کو ان لوگوں کے وصف میں جمع کیا جن کی تعریف کی گئی۔

ارشاد خداوندی ہے :

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا (۲)

وہ اپنے رب کو خوف اور طمع دونوں کے ساتھ پکارتے ہیں۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا۔ (۳)

اور وہ ہمیں رغبت اور خوف دونوں کے ساتھ پکارتے ہیں۔

اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسا شخص کہاں ہے ؟۔

پس اس زمانے میں جتنے لوگ موجود ہیں ان کے لیے زیادہ بہتر غلبۂ خوف ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ (خوف) ان کو ناامیدی ترک عمل اور مغفرت کی طمع ختم کرنے کی طرف نہ لے جائے پس یہ عمل سے سستی کا سبب بن جاتے گا۔ اور گناہوں میں انہماک کی دعوت دے گا یہ تو ناامیدی ہے خوف نہیں ہے خوف تو وہ ہے جو عمل کی ترغیب دیتا ہے اور تمام خواہشات کو گدلا کر دیتا ہے نیز دل کو دنیا کی طرف میلان سے ہٹا دیتا ہے وہ دھوکے والے گھر۔(دنیا) سے دور رہنے کی دعوت دیتا ہے یہ خوف پسندیدہ ہے محض دل کی بات نہیں جو گناہوں سے روکنے اور عمل صالح کی ترغیب میں موثر نہ ہو اور نہ وہ ناامیدی جو مایوس کر دیتی ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ نے فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت محض خوف سے کرتا ہے وہ افکار کے سمندروں میں غرق

---

(۱) صحیح مسلم، جلد ۲ ص ۳۳۲ کتاب القدر، مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۳۸۲ مرویات عبد اللہ

(۲) قرآن مجید، سورۃ السجدہ آیت ۱۶

(۳) قرآن مجید، سورۃ انبیاء آیت ۹۰

ہو جاتا ہے اور جو شخص اس کی عبادت محض امید سے کرتا ہے وہ دھوکے کے جنگل میں سرگشتہ رہے گا اور جو آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت خوف اور امید دونوں کے ساتھ کرتا ہے وہ ذکر کے طریق میں سیدھا کھڑا ہوتا ہے۔

حضرت مکحول دمشقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت محض خوف کی وجہ سے کرتا ہے وہ حروری (خارجی) ہے اور جو امید کے ساتھ عبادت کرتا ہے وہ مرجی ہے (یہ وہ فرقہ ہے جن کے خیال میں مومن جہنم میں نہیں جائے گا چاہے وہ برے اعمال کرے) جو محبت کی وجہ سے عبادت کرتا ہے وہ زندیق (بے دین) ہے اور جو شخص خوف، امید اور محبت (تینوں باتوں) کے پیش نظر عبادت کرتا ہے وہ موحّد ہے۔

تو ان تینوں امور کو جمع کرنا ضروری ہے اور غلبۂ خوف زیادہ بہتر ہے لیکن موت سے پہلے پہلے اور موت کے وقت زیادہ بہتر امید اور حُسنِ ظن کا غلبہ ہے کیوں کہ خوف اس کوڑے (ڈنڈے) کے قائم مقام ہے جو عمل پر ابھارتا ہے اب عمل کا وقت ختم ہو گیا اور موت کے لیے پیش ہونے والا عمل پر قادر نہیں ہے پھر وہ خوف کے اسباب کی طاقت بھی نہیں رکھتا کیوں کہ اس وقت اس کی زیادہ دل شکنی ہوتی ہے اور موت کی جلدی پہ مددگار ہوتا ہے لیکن امید دل کو مضبوط کرتی ہے اور اسے اس رب سے محبت ہوتی ہے جس سے امید باندھی ہے۔

اور کسی آدمی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ دنیا سے اللہ تعالیٰ کی محبت کے بغیر جائے تاکہ اسے اللہ تعالیٰ کی ملاقات محبوب ہو کیوں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے ملاقات کو پسند فرماتا ہے اور امید کے ساتھ محبت ملی ہوئی ہوتی ہے اور جس کے کرم کی امید ہو وہ محبوب ہوتا ہے اور تمام علوم و اعمال کا مقصد اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے حتیٰ کہ معرفت سے محبت پیدا ہوتی ہے کیوں کہ اسی کی طرف جانا ہے اور موت کے ذریعے اسی کی طرف بڑھنا ہے اور جو آدمی اپنے محبوب کی طرف جاتا ہے اس کا سرور بقدر محبت بڑھتا ہے اور جو شخص اپنے محبوب سے جدا ہو جائے اس کی تکلیف اور سختی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

پس جب موت کے وقت دل پر اہل و عیال، مال، مکان، زمین، دوستوں اور ساتھیوں کی محبت غالب ہو تو اس شخص کا مرکزِ محبت دنیا میں ہے پس دنیا اس کی جنت ہے کیوں کہ جنّت اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں تمام محبوب جمع ہوں پس اس کی موت جنت سے نکلنا اور اس کے اور اس کی خواہشات کے درمیان رکاوٹ کا نام ہے اور ایسے آدمی کا حال مخفی نہیں ہے۔

پس جب اس کے لیے اللہ تعالیٰ اس کے ذکر، معرفت اور فکر کے سوا کوئی محبوب نہ ہو جب کہ دنیا اور اس کے تعلقات محبوب سے پھیرنے والے ہوں تو یہ دنیا قید خانہ ہے کیوں کہ قید خانہ وہ ہوتا ہے جو قیدی کو اس کی محبوب چیز سے راحت کے حصول میں مانع ہو پس اس کی موت محبوب کی طرف جانا اور قید خانے سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے اور جو شخص قید خانے سے آزاد ہو جائے اور اس کے اور اس کے محبوب کے درمیان تخلیہ ہو اور کسی قسم کی رکاوٹ اور خرابی باقی نہ رہے اس کا حال بھی پوشیدہ نہیں ہے۔

تو جو شخص دنیا سے رخصت ہوتا ہے وہ موت کے بعد سب سے پہلے یہ فائدہ حاصل کرتا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لیے تیار کر رکھا ہے وہ اس کے علاوہ ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی دل میں اس کا خیال پیدا ہوا اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے پیدا کیا جو دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اس پر راضی اور مطمئن ہوتے ہیں ان کے لیے سزا، زنجیریں اور بیڑیاں پیدا کیں اور طرح طرح کی ذلت ہے وہ الگ ہے ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمیں حالت اسلام میں موت دے اور نیک لوگوں کے ساتھ ملا دے۔

اور اس دعا کی قبولیت کی طرح اسی وقت ہو سکتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کی جائے اور محبتِ خداوندی کے حصول کے لیے اس کے غیر کی محبت کو دل سے نکالنا اور اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے یعنی جاہ و مرتبہ، مال اور وطن وغیرہ سے قطع تعلق کرنا ضروری ہے زیادہ مناسب یہی ہے کہ ہم وہی دعا مانگیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگی ہے۔

آپ نے یوں دعا مانگی۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ اَحَبَّكَ وَحُبَّ مَا يُقَرِّبُنِيْ اِلٰى حُبِّكَ وَاجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَيَّ مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ۔ (۱)

یا اللہ! مجھے اپنی محبت اور جو تجھ سے محبت کرتے ہیں ان کی محبت، اس عمل کی محبت جو مجھے تیری محبت کے قریب کر دے، عطا فرما اور اپنی محبت کو میرے نزدیک ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنا دے۔

غرض یہ ہے کہ موت کے وقت امید، زیادہ بہتر ہے کیوں کہ وہ محبت کو زیادہ کھینچنے والی ہے اور موت سے پہلے غلبۂ خوف زیادہ بہتر ہے کیوں کہ وہ خواہشات کی آگ کو زیادہ جلانے والا اور دل سے دنیا کی محبت کو زیادہ ختم کرنے والا ہے اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا يَمُوْتَنَّ اَحَدُكُمْ اِلَّا وَيُحْسِنُ الظَّنَّ بِرَبِّهٖ۔ (۲)

تم میں سے کوئی شخص ہرگز نہ مرے مگر وہ اپنے رب کے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا (حدیث شریف میں ہے)

اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ فَلْيَظُنَّ بِيْ مَا شَاءَ۔ (۳)

میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوتا ہوں تو اسے چاہیے کہ میرے بارے میں اچھا گمان کرے۔

جب حضرت سلیمان تیمی رحمہ اللہ کی وفات کا وقت آیا تو انہوں نے اپنے بیٹے سے فرمایا اے میرے بیٹے! مجھ سے رخصتوں

---

(۱) مشکوٰۃ شریف ص ۲۱۹ باب جامع الدعا

(۲) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۸۷ کتاب الجنۃ (۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۱۵۱ مرویات ابی ہریرہ

کا بیان کرنا اور امید یاد دلانا تاکہ میں اللہ تعالیٰ سے حُسنِ ظن کے ساتھ ملاقات کروں۔

اسی طرح جب حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کے وصال کا وقت ہوا اور ان کا جزع فزع زیادہ ہوا تو انہوں نے اپنے اردگرد علماء کو جمع کیا جو ان کو امید یاد دلاتے تھے ــــ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے وصال کے وقت اپنے بیٹے سے فرمایا مجھے وہ احادیث یاد دلاؤ جن میں امید اور حُسنِ ظن کا ذکر ہے۔

ان تمام کا مقصود یہ ہے کہ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ میرے بندوں کے دلوں میں میری محبت ڈال دیں انہوں نے پوچھا کس طرح ؟ فرمایا ان کو میری نعمتیں اور نوازشات یاد دلائیں۔تو انتہائی سعادت یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی محبت میں دنیا سے رخصت ہو اور محبت کا حصول معرفت اور دل سے محبت دنیا کو نکالنے کے ذریعے ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کے نزدیک تمام دنیا اس قید خانے کی طرح ہو جائے جو محبوب کے راستے میں رکاوٹ ہے یہی وجہ ہے کہ بعض صالحین نے حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ کو خواب میں اڑتے ہوئے دیکھا تو فرمایا اب وہ رخصت ہو گئے صبح ہوئی تو ان کے بارے میں معلوم کیا بتایا گیا کہ وہ گذشتہ رات انتقال فرما گئے ہیں۔

فصل ۶

حالتِ خوف میں کیا علاج کیا جائے

ہم نے صبر کی دوا کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا اور صبر و شکر کے بیان میں جو تشریح کی ہے وہ اس غرض کے لیے کافی ہے کیوں کہ صبر اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب خوف اور امید حاصل ہو کیوں کہ دین کا پہلا مقام یقین ہے جو اللہ تعالیٰ آخرت، جنت اور دوزخ پر ایمان کی قوت کا نام ہے اور یہ یقین لازمی طور پر جہنم سے خوف اور جنت کی امید کو ابھارتا ہے اور امید اور خوف صبر پر طاقت دیتے ہیں کیوں کہ جنت ناپسندیدہ امور سے ڈھانپی گئی اور ان کو اٹھانے پر صبر امید کی قوت کے بغیر نہیں ہو سکتا اور جہنم خواہشات کے ساتھ ڈھانپی گئی اور ان شہوات کے قلع قمع کے لیے قوتِ خوف کی ضرورت ہے۔اسی لیے حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے فرمایا جو شخص جنت کا شوق رکھتا ہو وہ خواہشات سے نکل جائے اور جو جہنم سے ڈرتا ہو وہ حرام کاموں سے باز رہے۔

پھر خوف اور امید سے حاصل ہونے والا صبر مقام مجاہدہ، ذکرِ خداوندی کے لیے علیحدگی اور دائمی فکر تک پہنچاتا ہے اور دائمی ذکر اُنس پیدا کرتا ہے جب کہ دائمی فکر کمالِ معرفت تک لے جاتا ہے اور کمالِ معرفت اور اُنس محبت تک لے جاتے ہیں اور محبت کے بعد مقام رضا و توکل بلکہ تمام مقامات ہیں تو منازلِ دین کو طے کرنے میں اس ترتیب کو سامنے رکھا جائے اور اصل یقین (ایمان) کے بعد خوف اور امید کے سوا کوئی مقام نہیں اور ان دونوں کے بعد صبر کے علاوہ کوئی مقام نہیں اور اسی

سے مجاہدہ اور ظاہری و باطنی طور پر اللہ تعالیٰ کے لیے تنہائی نصیب ہوتی ہے اور جس کے لیے راستہ کھل جائے اس کے لیے مجاہدہ کے بعد صرف ہدایت اور معرفت ہے اور معرفت کے بعد صرف محبت اور اُنس کا مقام اور محبت کی ضرورت سے محبوب کے فعل پر راضی ہونا اور اس کی عنایت پر یقین رکھنا ہے تو ہم نے جو کچھ صبر کے علاج کے سلسلے میں لکھا ہے وہ کفایت کرتا ہے لیکن ہم خوف کے سلسلے میں مستقل طور پر ایک اجمالی گفتگو کرنا چاہتے ہیں پس ہم کہتے ہیں۔

خوف دو مختلف طریقوں سے حاصل ہوتا ہے ان میں سے ایک، دوسرے سے اعلیٰ ہے اور اس کی مثال یہ ہے کہ جب گھر میں کوئی بچہ ہو اور اس کے پاس کوئی درندہ یا سانپ آجائے تو بعض اوقات وہ نہیں ڈرتا اور بعض دفعہ وہ سانپ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ اسے پکڑ کر اس سے کھیلے لیکن جب اس کے ساتھ اس کا باپ بھی ہو اور وہ عقلمند ہو تو وہ سانپ سے ڈر کر بھاگ جاتا ہے اور جب بچہ اپنے باپ کو دیکھتا ہے کہ اس کے جسم پر لرزہ طاری ہے اور وہ بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور اس پر خوف غالب ہو جاتا ہے وہ بھاگنے میں باپ کی موافقت کرتا ہے تو باپ کا خوف بصیرت اور سانپ کی صفت کو جاننے کے باعث ہے کہ اس میں زہر ہے اور اس کی فلاں خاصیت ہے، درندے کا غلبہ، اس کی پکڑ اور پرواہ نہ کرنا وغیرہ سب باتیں سامنے ہوتی ہیں۔

لیکن بیٹے کا خوف محض تقلیدی ایمان کی بنیاد پر ہے کیوں کہ وہ باپ کے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ باپ کے خوف کا کوئی سبب ہے جو ذاتی طور پر ڈرانے والا ہے پس اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ درندے سے ڈرنا چاہیے لیکن بچے کو اس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔

جب تمہیں یہ مثال معلوم ہو گئی تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ سے خوف دو جگہوں پر ہوتا ہے ایک اس کے عذاب سے خوف اور دوسرا خود اس کی ذات سے ڈرنا، اس سے خوف، علماء اور اربابِ قلوب کا خوف ہے جو جانتے ہیں کہ اس کی صفات میں سے بعض صفات کا تقاضا ہیبت، خوف اور پرہیز ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے راز پر مطلع ہیں۔

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ۔ (۱) اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے

اور ارشاد خداوندی ہے۔

اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ۔ (۲) اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے

لیکن پہلا خوف عام مخلوق کا خوف ہے اور وہ جنت و دوزخ کے وجود نیز ان دونوں کے فرمانبرداری اور نافرمانی کا بدلہ ہونے پر ایمان لانے سے حاصل ہوتا ہے اور اس کی کمزوری غفلت اور ایمان کی کمزوری کے باعث ہوتی ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۲۸

(۲) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۱۰۲

اور غفلت کو تذکیر، وعظ اور روز قیامت کے ہولناک مناظر اور طرح طرح کے اُخروی عذاب میں ہمیشہ غور کرنے کے ذریعے دُور کیا جا سکتا ہے نیز اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کی طرف دیکھنے ان کی مجالس میں حاضر ہونے اور ان کے احوال کا مشاہدہ بھی غفلت کو دور کر دیتا ہے اگر مشاہدہ نہ ہو سکے تو سماع (ان کی باتیں سننا) بھی تاثیر سے خالی نہیں ہے۔

دوسرا خوف اعلیٰ ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے حوالے سے خوف ہو یعنی اس سے دوری اور حجاب کا خوف ہو نیز اس کے قرب کی امید رکھے حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں فراق کے خوف کے وقت جہنم کا خوف ایک گہرے سمندر میں قطرے کی طرح ہے اور یہ علماء کی خشیت و خوف ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ۔ بے شک اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں۔ (۱)

اس خوف سے عام مومنوں کو بھی حصہ ملتا ہے لیکن وہ محض تقلیدی ہوتا ہے جو بچے کے خوف کے مشابہ ہے جو اپنے باپ کو دیکھ کر سانپ سے ڈرتا ہے اس کی نسبت بصیرت کی طرف نہیں ہوتی لہٰذا یہ کمزور بھی ہو سکتا ہے اور فوری طور پر زائل بھی —— حتیٰ کہ بعض اوقات بچہ کسی سپیرے کو دیکھتا ہے جو سانپ کو پکڑنے کا ارادہ کرتا ہے تو بچہ اس کو دیکھ کر دھوکہ کھا جاتا ہے لہٰذا اس کی تقلید میں سانپ کو پکڑنے کی جرأت کرتا ہے جس طرح وہ باپ کی تقلید میں اس کو پکڑنے سے احتراز کرتا ہے۔ اور عقائد تقلیدیہ عام طور پر کمزور ہوتے ہیں ہاں جب ان کے اسباب کا مشاہدہ کیا جائے جو ان کو پکا کرتے ہیں یعنی جب ان میں دوام ہو اور عبادات کی کثرت اور گناہوں سے طویل مدت تک اجتناب کی صورت میں ان کے تقاضوں پر ہمیشہ عمل کیا جائے۔

لہٰذا جو شخص معرفت کی چوٹی پر چڑھ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس سے ضرور ڈرتا ہے پس حصول خوف کے لیے اس کے علاج کی ضرورت نہیں ہوتی جیسے کوئی شخص درندے کو پہچانتا ہے اور اپنے آپ کو اس کے چنگل میں پھنسا ہوا دیکھتا ہے تو اس کے دل میں خوف ڈالنے کے لیے علاج کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ اس سے لازماً ڈرتا ہے چاہے یا نہ چاہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ مجھ سے اس طرح ڈریں جس طرح ہلاک کرنے والے درندے سے ڈرتے ہیں اور ہلاک کرنے والے درندے سے خوف پیدا کرنے کے لیے کسی حیلے کی ضرورت نہیں ہوتی صرف اس کی اور اس کے شکنجے میں آنے کی معرفت ضروری ہے کسی دوسرے حیلے کی احتیاج نہیں ہے۔

پس جو شخص اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کر لیتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے اسے کوئی پرواہ نہیں وہ جو چاہے فیصلہ کرے اسے کوئی خوف نہیں اس نے کسی سابقہ وسیلے کے بغیر فرشتوں کو اپنے قریب کیا اور کسی گذشتہ جرم کے بغیر شیطان کو

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ فاطر آیت ۲۸

اپنے آپ سے دور کر دیا بلکہ اس کی صفت تو وہی ہے جو (گذشتہ صفحات میں مذکور حدیث میں) بیان ہوئی اس نے فرمایا:
یہ لوگ جنت میں جائیں گے اور مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں اور یہ جہنم میں جائیں گے اور مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں۔

اگر تمہارے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ وہ صرف گناہ پر عذاب دیتا ہے اور اطاعت پر ہی ثواب عطا فرماتا ہے تو غور کرو اس نے اطاعت کرنے والے کو اسباب اطاعت کے حوالے نہیں کیا کہ وہ اطاعت کرے چاہے یا نہ، اور نہ ہی نافرمانی کرنے والے کو گناہ کے اسباب کی طرح کھینچا کہ وہ گناہ کرے چاہے یا نہ —— جب اس نے غفلت شہوت اور قضائے شہوت پر قدرت کو پیدا کیا تو ان امور کے ذریعے فعل ضرور واقع ہو گا اگر اس نے اسے اس لیے دور کیا کہ اس نے نافرمانی کی ہے تو اس نے اسے گناہ کی طرف کیوں متوجہ کیا کیا یہ کسی سابقہ گناہ کی سزا ہے کہ یہ ایک غیر متناہی سلسلہ رہے یا پہلے گناہ پر ہی ٹھہر جائے جس کے لیے بندے کی طرف سے کوئی علت نہیں ہے بلکہ اس نے تو ازل میں ہی فیصلہ فرما دیا تھا۔ اسی مفہوم کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا آپ نے فرمایا۔

"حضرت آدم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام دونوں نے اپنے رب کے ہاں ایک دوسرے سے اختلاف کیا تو حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ پر غالب آگئے (ان کی دلیل غالب آگئی) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا آپ آدم علیہ السلام ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا اور آپ میں اپنی رُوح پھونکی فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور آپ کو اپنی جنت میں ٹھہرایا۔ پھر آپ کی لغزش کے باعث لوگوں کو زمین پر اترنا پڑا حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا آپ موسیٰ علیہ السلام ہیں آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت اور کلام کے لیے منتخب فرمایا اور آپ کو تختیاں عطا فرمائیں جن میں ہر چیز کا بیان تھا آپ کو کلام کے لیے اپنے قریب کیا تو آپ کا کیا خیال ہے اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے کتنے سال پہلے تورات لکھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا چالیس سال، حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کیا آپ نے اس میں لکھا ہوا پایا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی اور آپ بھٹک گئے انہوں نے فرمایا ہاں لکھا ہوا پایا ہے فرمایا کیا آپ مجھے اس عمل پر ملامت کر رہے ہیں جو میرے عمل کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا کہ میں وہ عمل کروں گا اور میری تخلیق سے چالیس سال پہلے لکھا۔ (۱)

تو جو شخص اس معاملے میں نورِ ہدایت سے سبب کو پہچان لے گا وہ ان خاص عارفین میں سے ہے جو تقدیر کے راز پر مطلع ہوتے ہیں اور جو آدمی یہ بات سن کر ایمان لائے اور محض سننے کے ذریعے تصدیق کرے وہ عام مومنوں میں سے ہے اور دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کو خوف حاصل ہوتا ہے کیوں کہ ہر بندہ قبضۂ قدرت میں اس طرح واقع ہوتا ہے جس طرح ایک کمزور بچہ درندے کے پنجے میں ہوتا ہے درندہ بعض اوقات اتفاقی طور پر غافل ہو کر اسے چھوڑ دیتا ہے اور کبھی اس پر حملہ کر کے

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۱۰۹ کتاب التوحید۔

اسے چیر پھاڑ دیتا ہے اور یہ بھی اتفاقیہ ہوتا ہے اور اس اتفاق کے لیے اسباب ہیں جو ایک معلوم مقدار کے ساتھ مرتب ہوتے ہیں لیکن جب ان کی اضافت اس کی طرف ہوتی ہے جس کو علم نہیں ہوتا تو اسے اتفاق کہا جاتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف اضافت ہو تو اسے اتفاقیہ کہنا جائز نہیں اور جو شخص درندے کے پنجے میں پھنستا ہے اگر اس کی معرفت مکمل ہو تو وہ درندے سے نہیں ڈرتا کیوں کہ درندہ بھی مسخر ہے اگر اس پر بھوک مسلط ہو تو وہ چیرتا پھاڑتا ہے اور اگر اس پر غفلت مسلط ہو تو اس کا راستہ چھوڑ دیتا ہے وہ درندے کے خالق اور اس کی صفات کے خالق سے ڈرتا ہے۔ میں (امام غزالی) یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ سے خوف کی مثال وہ خوف ہے جو درندے سے ہوتا ہے بلکہ جب پردہ ہٹتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ درندے سے خوف بعینہٖ اللہ تعالیٰ سے خوف ہے کیوں کہ درندے کے واسطے سے ہلاک کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے تو جان لو کہ آخرت کے درندے دنیا کے درندوں کی طرح ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ثواب و عذاب کے اسباب کو پیدا فرمایا اور ہر ایک کے لیے اس کا اہل پیدا کیا جسے تقدیر جو ازلی پختہ جزم کی فرع ہے، اس کی طرف چلاتی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا کیا اور اس کے اہل لوگ پیدا کئے اور وہ اس کے اسباب کے لیے مسخر کئے گئے وہ چاہیں یا نہ، اور جہنم کو پیدا کر کے اس کے اہل پیدا کئے جو اس کے اسباب کے لیے مسخر کئے گئے وہ چاہیں یا نہ۔

پس جب کوئی شخص اپنے آپ کو تقدیر کی موجوں میں غوطہ زن دیکھتا ہے تو اس پر لازماً خوف غالب آتا ہے۔ پس تقدیر کے اسرار کی پہچان رکھنے والوں کے یہ مقامات خوف ہیں پس جس شخص کی کوتاہی اسے دیکھنے کے بلند مقام تک پہنچنے سے بٹھا رکھے (اور اوپر نہ جانے دے) اس کے لیے راستہ یہ ہے کہ وہ آیات و آثار سن کر اپنا علاج کرے ڈرنے والے عارفین کے حالات اور اقوال کا مطالعہ کرے پھر ان کی عقول اور مناصب کو ان لوگوں کے منصب سے نسبت جو امید کے دھوکے میں ہیں تو اس بارے میں شک نہ کرے کہ ان لوگوں کی اقتدا زیادہ بہتر ہے کیونکہ وہ انبیاء کرام اولیاء عظام اور علماء ہیں اور جو لوگ بے خوف ہیں وہ فرعون جاہل اور غبی ہیں ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو پہلوں اور پچھلوں کے سردار ہیں۔ (۱)

اور آپ سب لوگوں سے زیادہ خوف کھانے والے تھے (۲)

حتیٰ کہ ایک روایت میں ہے آپ ایک بچے کی نماز جنازہ پڑھا رہے تھے اور ایک روایت میں ہے کہ آپ سے اس کے لیے دعا میں سنا گیا۔

اَللّٰهُمَّ قِهِ عَذَابَ الْقَبْرِ وَعَذَابَ النَّارِ۔ (۳) یا اللہ! اسے عذاب قبر سے اور عذاب جہنم سے بچا۔

ایک دوسری روایت میں ہے آپ نے ایک شخص کو کہتے ہوئے سنا کہ اے بچے تجھے مبارک ہو تو جنت کی چڑیوں

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۴۵ کتاب الفضائل

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۱۸۱ مرویات عائشہ

(۳) مجمع الزوائد جلد ۳ ص ۳۴ کتاب الجنائز۔

میں سے ایک چڑیا ہے، تو آپ کو غصہ آیا آپ نے فرمایا تمہیں کیا معلوم کہ وہ اس طرح ہے۔
اللہ کی قسم میں اللہ کا رسول ہوں اور میں (اپنے آپ) نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔ (۱)
بے شک اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا اور اس کے کچھ اہل پیدا کئے ان میں اضافہ اور کمی نہ ہوگی (۲)
ایک روایت میں ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے جنازے پر بھی یہی بات فرمائی اور وہ مہاجرین اولین میں سے تھے جب ان کا انتقال ہوا تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا اللہ کی قسم میں عثمان کے بعد کسی کی پاکیزگی بیان نہیں کروں گی۔ (۳)
حضرت محمد بن خولہ حنفیہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کی پاکیزگی بیان نہیں کروں گا بلکہ جس باپ نے مجھے جنا اس کی پاکیزگی بھی نہیں بیان کروں گا۔ فرماتے ہیں اس پر شیعہ نے ان پر دباؤ ڈالا تو آپ نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فضائل و مناقب بیان کرنا شروع کر دیئے۔
ایک دوسری حدیث میں مروی ہے اصحاب صفہ میں سے ایک صحابی شہید ہو گئے ان کی ماں نے کہا تمہیں مبارک ہو تم جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہو تم نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی اور اس کے راستے میں شہید ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
تمہیں کیا معلوم ہو سکتا ہے انہوں نے کوئی ایسی بات کہی ہو جو نفع بخش نہیں اور ایسی بات سے رُکے ہوں جو نقصان نہیں دیتی[۴]۔
ایک دوسری حدیث میں ہے ایک صحابی بیمار تھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے آپ نے ایک عورت سے سنا وہ کہہ رہی تھی تمہیں جنت مبارک ہو۔
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ کون عورت ہے جو اللہ تعالیٰ پر قسم کھاتی ہے بیمار نے کہا یہ میری ماں ہے یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا (اے خاتون!) تمہیں کیا معلوم شاید فلاں نے بے مقصد گفتگو کی ہے اور ایسی چیز میں بخل کیا ہو جو اسے فائدہ نہیں دیتی۔ (۵)

---

(۱) حدیث شریف میں "لا ادری" کے الفاظ آئے ہیں اور درایت کا معنیٰ اندازے سے جاننا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کا مطلب یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر محض اندازے سے نہیں جانتا علم کی نفی نہیں لہٰذا جو لوگ کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے انجام کا علم نہ تھا وہ جاہل ہی نہیں بدبخت بھی ہیں جو آپ کے مقام محمود کے بارے میں اس قسم کے عقیدے کے حامل ہیں اللہ تعالیٰ ایسے گمراہوں سے محفوظ رکھے آمین ۱۲ ہزاروی
(۲) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۳۷ کتاب القدر
(۳) صحیح بخاری جلد اول ص ۱۶۶ کتاب الجنائز (نوٹ) یہ الفاظ ام خارجہ کے ہیں ام سلمہ کے نہیں۔
(۴) جامع ترمذی ص ۳۳۶، ابواب الزھد
(۵) تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۲۷۳ ترجمہ ۲۰۷۳

اور تمام مومن کس طرح نہ ڈریں جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

شَیَّبَتْنِیْ ھُوْدٌ وَاَخَوَاتُھَا سُوْرَۃُ الْوَاقِعَۃِ وَاِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ وَعَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ۔ (۱)

مجھے سورۂ ہود اور اس جیسی دوسری سورتوں یعنی سورۂ واقعہ، اذا الشمس کورت اور "عم یتساءلون" نے بوڑھا کر دیا۔

علماء فرماتے ہیں شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ سورۂ ہود میں رحمت سے دور کرنے کا ذکر ہے۔

جیسے ارشاد خداوندی ہے۔

اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ ھُوْدٍ۔ (۲)

سنو! حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد کے لیے دوری ہے

اور فرمایا۔

اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ۔ (۳)

سنو! ثمود (قوم صالح علیہ السلام) کے لیے دوری ہے

اور ارشاد فرمایا۔

اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ کَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ۔ (۴)

سنو قوم مدین کے لیے دوری ہے جیسے قوم ثمود کے لیے دوری ہے۔

اس کے باوجود کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے اس لیے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ہر نفس کو ہدایت دے دے۔

اور سورۂ واقعہ میں ہے۔

لَیْسَ لِوَقْعَتِھَا کَاذِبَۃٌ خَافِضَۃٌ رَّافِعَۃٌ۔ (۵)

اس (قیامت) کے وقوع کو کوئی چیز جھٹلا نہیں سکتی وہ جھکانے والی اور بلند کرنے والی ہے۔

یعنی جو کچھ ہونے والا ہے اسے لکھ کر قلم خشک ہو گیا اور گذشتہ بھی مکمل ہو گیا حتی کہ واقعہ (قیامت) آگئی یعنی وہ ان لوگوں کو پست کرنے والی ہے جو دنیا میں بلند کیے گئے تھے اور جن لوگوں کو دنیا میں پست کیا گیا تھا ان کو اٹھانے والی ہے۔

اور سورۃ تکویر میں قیامت کی ہولناکی اور خاتمہ کے انکشاف کا بیان ہے اور وہ ارشاد خداوندی ہے۔

---

(۱) جامع ترمذی ص ۵۱۷، الواب الشمائل

(۲) قرآن مجید، سورۂ ہود آیت ۶۰

(۳) قرآن مجید، سورۂ ہود آیت ۶۸

(۴) قرآن مجید، سورۂ ہود آیت ۹۵

(۵) قرآن مجید، سورۂ واقعہ آیت ۲، ۳

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ۔ (۱)

اور جب جہنم کو بھڑکایا جائے گا اور جنت کو قریب لایا جائے گا ہر نفس کو معلوم ہو جائے گا جو اس نے حاضر کیا (آگے بھیجا)

اور سورۂ "عم یتساءلون" میں ہے:

يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ۔ (۲)

جس دن ہر نفس دیکھ لے گا کہ اس کے ہاتھوں نے آگے کیا بھیجا ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا۔ (۳)

وہ کلام نہیں کریں گے مگر جسے رحمٰن اجازت دے اور وہ اچھی بات کہے

اور قرآن پاک میں اول سے آخر تک ڈر سنانے والی آیات ہیں لیکن اس شخص کے لیے جو اسے غور و فکر سے پڑھے اور اگر اس میں صرف یہی درج ذیل آیت ہوتی تو بھی کافی تھی کیوں کہ مغفرت کو چار شرطوں سے مشروط کر دیا گیا جن میں سے ہر ایک شرط ایسی ہے جس سے بندہ عاجز رہے۔

وہ آیت یہ ہے۔

وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى۔ (۴)

اور بے شک میں بہت بخشنے والا ہوں اس شخص کو جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور اچھے کام کرے پھر ہدایت پر رہے۔

اور اس سے بھی زیادہ سخت اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے۔

فَاَمَّا مَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ۔ (۵)

پس جس نے توبہ کی اور اچھے کام کئے تو قریب ہے کہ وہ فلاح پانے والوں میں سے ہو۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ تکویر، آیت ۱۲، ۱۳

(۲) قرآن مجید، سورۂ النبا، آیت ۴۰

(۳) قرآن مجید، سورۂ النبا، آیت ۳۸

(۴) قرآن مجید، سورۂ طٰہٰ آیت ۸۲

(۵) قرآن مجید سورۂ قصص آیت ۶۷

يَسْأَلَ الصَّادِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ۔ (۱) — تاکہ وہ سچے لوگوں سے ان کی سچائی کے بارے میں پوچھے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَا الثَّقَلَانِ۔ (۲) — عنقریب ہم تمہاری طرف توجہ فرمائیں گے اے جن وانس۔

اور ارشاد فرمایا۔

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ۔ (۳) — تو کیا وہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہیں۔

اور ارشاد خداوندی ہے :

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ۔ (۴) — اور اسی طرح تمہارے رب کی پکڑ ہے جب وہ بستیوں (والوں) کو پکڑتا ہے اس حال میں کہ وہ ظلم کرنے والے ہوں بے شک اس کی پکڑ دردناک (اور) سخت ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا۔ (۵) — وہ دن جب ہم اکٹھا کریں گے رحمٰن کے حضور میں (معزز و مکرم مہمان بنا کر)

اور ارشاد خداوندی ہے :

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا۔ (۶) — اور ہر ایک نے اس (دوزخ) پر سے گزرنا ہے۔

اور فرمایا۔

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ۔ (۷) — جو چاہو عمل کرو (جواب دینا ہوگا)

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے :

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ۔ (۸) — جو شخص آخرت کی کھیتی کا ارادہ کرے ہم اس کے لیے اس کی کھیتی کو بڑھا دیتے ہیں۔

اور ارشاد فرمایا۔

---

(۱) قرآن مجید سورۃ احزاب آیت ۸ — (۲) قرآن مجید سورۃ رحمٰن آیت ۳۱

(۳) قرآن مجید، سورۃ اعراف آیت ۹۹ — (۴) قرآن مجید سورۃ ہود آیت ۱۰۲

(۵) قرآن مجید، سورۃ مریم آیت ۸۵ — (۶) قرآن مجید سورۃ مریم آیت ۷۱

(۷) قرآن مجید، سورۃ فصلت آیت ۴۰ — (۸) قرآن مجید سورۃ شوریٰ آیت ۲۰

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ (۱)

پس جو شخص ایک ذرّے کے برابر بھی نیکی کرے وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جو آدمی ذرہ بھر برائی کرے وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَقَدِمْنَا اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ۔ (۲)

اور ہم متوجہ ہوں گے ان کے کاموں کی طرف۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (۳)

زمانے کی قسم بے شک انسان البتہ نقصان میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور صبر کی تاکید کی۔

تو یہ چار (ایمان، اعمال صالحہ، حق کی تلقین اور صبر کی تلقین) شرائط ہیں جن کی وجہ سے انسان نقصان سے بچ سکتا ہے انبیاء کرام علیہم السلام باوجود اس کے کہ ان پر نعمتوں کا فیضان ہوا، خوف رکھتے تھے کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف نہیں ہوتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے وہی لوگ بے خوف ہوتے ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں حتیٰ کہ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل علیہ السلام دونوں رونے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ آپ دونوں کیوں روتے ہیں؟ میں نے تم دونوں کو امن عطا کیا ہے انہوں نے عرض کیا یا اللہ! تیری خفیہ تدبیر سے کون بے خوف ہو سکتا ہے۔ (۴)

گویا جب ان دونوں کو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ تمام غیبوں کو جاننے والا ہے اور انہیں (اللہ تعالیٰ کے بتائے بغیر) امور کی غایت سے آگاہی نہیں ہو سکتی تو وہ اس بات سے بے خوف نہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ میں نے تم دونوں کو امن دیا ان کے لیے ابتلاء و آزمائش کے طور پر ہو اور ان کے لیے خفیہ تدبیر ہو حتیٰ کہ اگر ان کا خوف ٹھہر جائے تو ظاہر ہو جائے کہ وہ خفیہ تدبیر خداوندی سے بے خوف ہیں اور انہوں نے اپنی بات کو پورا نہیں کیا۔

جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق میں رکھا گیا تو انہوں نے فرمایا "حَسْبِيَ اللّٰهُ" (اللہ تعالیٰ مجھے کافی ہے) اور یہ بہت بڑی بڑی دعاؤں میں سے تھی پس آپ کا امتحان لیا گیا اور ہوا میں حضرت جبریل علیہ السلام کو پیش کیا گیا حتیٰ کہ انہوں

---

(۱) قرآن مجید سورۃ زلزال آیت ۷، ۸

(۲) قرآن مجید سورۃ فرقان آیت ۲۳

(۳) قرآن مجید سورۃ العصر کمل۔ (۴)

نے کہا کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؛ فرمایا آپ سے کوئی حاجت نہیں ہے، تو آپ نے اپنے قول "حسبی اللہ" کے ساتھ اس طرح وفا کی اللہ تعالیٰ نے اسی بات کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰىٓ - (۱) اور ابراہیم علیہ السلام وہ ہیں جنہوں نے اپنی بات کو پورا کیا۔

یعنی اپنے قول "حسبی اللہ" کے موجب پر عمل کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی اسی قسم کی بات بتائی گئی ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَا اَوْ اَنْ يَّطْغٰى قَالَ لَا تَخَافَا اِنَّنِىْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى - (۲) بے شک ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے یا وہ سرکشی کرے فرمایا تم نہ ڈرو بے شک میں تمہارے ساتھ ہوں سنتا اور دیکھتا ہوں۔

اور اس کے باوجود جب جادوگروں نے اپنے جادو کا مظاہرہ کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا کیوں کہ آپ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف نہ تھے تو آپ پر معاملہ مشتبہ ہو گیا حتیٰ کہ دوبارہ آپ کو امن کی خوشخبری دی گئی اور ارشاد فرمایا۔

لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى - (۳) آپ نہ ڈریں آپ ہی بلند رہیں گے۔

اور جب بدر کے دن مسلمانوں کی شوکت کمزور پڑی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دعا مانگی۔

اَللّٰهُمَّ اِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةُ لَمْ يَبْقَ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ اَحَدٌ يَّعْبُدُكَ - یا اللہ! اگر یہ جماعت ہلاک ہو گئی تو زمین پر کوئی ایسا شخص نہیں رہے گا جو تیری عبادت کرے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اپنے رب سے مزید دعا نہ کریں وہ آپ سے کئے گئے وعدے کو پورا کرے گا۔ (۴)

تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر یقین کا مقام تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے ڈرنے کے مقام پر تھے اور یہ زیادہ کامل ہے کیوں کہ اس کا صدور اللہ تعالیٰ کے اسرار اور خفیہ امور نیز اس کی ان بعض صفات کے معانی کی کامل معرفت سے ہوتا ہے جن سے صادر ہونے والے بعض امور کو خفیہ تدبیر کہا جاتا ہے اور کسی انسان کے بس

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ النجم آیت ۳۷

(۲) قرآن مجید، سورۂ طٰہٰ آیت ۴۵، ۴۶

(۳) قرآن مجید، سورۂ طٰہٰ آیت ۶۸

(۴) صحیح جلد ۲ ص ۵۶۴ کتاب المغازی

میں نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی گہرائی سے آگاہ ہو سکے۔
اور جو شخص حقیقتِ معرفت کو جان لے اور اسے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ امور کی گہرائی کا احاطہ کرنے سے اس کی معرفت کوتاہ ہے تو لامحالہ اس کا خوف زیادہ ہوتا ہے اسی لیے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا جائے گا۔

أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ۔ (۱)

کیا آپ نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو تو وہ فرمائیں گے اے اللہ تو پاک ہے میرے لیے مناسب نہیں کہ میں وہ بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں ہے اگر میں نے یہ بات کہی ہوتی تو تیرے علم میں ہوتی تو جانتا ہے جو کچھ میرے دل میں ہے اور میں نہیں جانتا جو کچھ تیرے علم میں ہے۔

اور ارشاد فرمایا۔

وَإِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ (۲)

اور اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے تو بے شک تو ہی غالب حکمت والا ہے۔

آپ نے اس معاملے کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سپرد کر دیا اور اپنے آپ کو درمیان سے مکمل طور پر باہر نکال دیا کیوں کہ آپ جانتے تھے کہ (بخشش اور عذاب میں سے) کوئی بات آپ کے اختیار میں نہیں اور بے شک اُمور مشیتِ خداوندی سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ عقل والفت سے ان کا کوئی تعلق نہیں لہٰذا ان پر قیاس اور وہم و گمان سے بھی کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا تحقیق اور یقین تو ایک طرف رہے۔
اسی بات نے عارفین کے دل توڑ دیئے کیوں کہ قیامت کبریٰ یہ ہے کہ تمہارا معاملہ اس ذات کی مشیت سے ملا ہوا ہے کہ اگر وہ تمہیں ہلاک کر دے تو اسے کوئی پرواہ نہیں اس نے تمہارے جیسے بے شمار لوگ ہلاک کر دیئے اور وہ ان کو دنیا میں طرح طرح کی تکلیفوں اور بیماریوں کے ذریعے مسلسل عذاب دے رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے دلوں میں کفر اور منافقت کی بیماری بھی ہے پھر وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے پھر ان کے بارے میں یوں خبر دی۔

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ

اور اگر ہم چاہتے تو ہر نفس کو اس کی ہدایت دیتے لیکن میری طرف سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ میں جنوں اور انسانوں

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ مائدہ آیت ۱۱۶

(۲) قرآن مجید، سورۂ مائدہ آیت ۱۱۸

الۡجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ۔ (۱) سب سے جہنم کو بھر دوں گا۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

وَتَمَّتۡ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمۡلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ۔ اور تمہارے رب کی بات پوری ہو گئی کہ میں جہنم کو ضرور بھر دوں گا۔ (۲)

تو جو قول ازل میں ثابت ہو چکا ہے اس کا خوف کیسے نہ کیا جائے حالانکہ اس کے تدارک کی طمع نہیں ہو سکتی اگر معاملہ ابھی کا ہوتا تو طمع اس میں حیلہ کی طرف بڑھتی لیکن اب تو صرف تسلیم ہے اور سابقہ مخفی بات کو دل اور اعضاء پر ظاہر ہونے والے واضح اسباب سے تلاش کرنا ہے پس جس کے لیے اسباب شر آسان ہو جائیں اور وہ بندے اور نیکی کے درمیان حائل ہو جائیں اور دنیا کے ساتھ اس کا تعلق مضبوط ہو جائے گویا اس کے لیے حقیقتاً سابقہ راز منکشف ہو گیا جو اس کے لیے بدبختی کے ساتھ سبقت کر گیا۔

کیوں کہ جس شخص کو جس کام کے لیے پیدا کیا گیا وہ کام اس کے لیے آسان کر دیا گیا اور اگر ہر قسم کی نیکی آسان کر دی گئی ہو اور دل مکمل طور پر دنیا سے قطع تعلق کر چکا ہو اور وہ ظاہری و باطنی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو تو یہ بات تخفیفِ خوف کا تقاضا کرتی ہے اگر اس پر دائمی یقین ہو لیکن ایک حال پر جمار ہنا مشکل ہے اور خاتمے کا خطرہ خوف کی آگ کو شعلہ زن کرتا ہے اور اسے بجھانا ممکن نہیں اور حال کی تبدیلی سے بے خوفی کیسے ہو سکتی ہے جب کہ مومن کا دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہے (کنٹرول میں ہے) اور دل تو ہنڈیا کے جوش مارنے سے بھی زیادہ اُلٹ پلٹ ہوتا ہے اور دلوں کو پھیرنے والے نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمۡ غَيۡرُ مَاۡمُوۡنٍ۔ (۳) بے شک ان کے رب کے عذاب سے بے خوفی نہیں ہے۔

تو وہ شخص زیادہ جاہل ہے جو اس سے بے خوف ہو حالانکہ وہ بے خوفی سے پرہیز کا اعلان کر رہا ہے اگر اللہ تعالیٰ اپنے عارف بندوں پر مہربانی کرتے ہوئے رُوحِ امید کے ساتھ ان کے دلوں کو راحت نہ پہنچاتا تو خوف کی آگ سے ان کے دل جل جاتے پس امید کے اسباب اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کے لیے رحمت ہیں اور غفلت کے اسباب ایک اعتبار سے عام لوگوں کے لیے رحمت ہیں اس لیے کہ اگر پردہ اٹھ جائے تو جان نکل جائے اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اسباب دلوں کو بدلنے والے کے خوف سے ہوتا ہے۔

بعض عارفین کا قول ہے کہ جس شخص کو میں پچاس سال سے توحید پر جانتا ہوں اگر اس کے اور میرے درمیان ایک ستون

---

(۱) قرآن مجید سورۃ سجدہ آیت ۱۳

(۲) قرآن مجید سورۃ ہود آیت ۱۱۹

(۳) قرآن مجید، سورۃ المعارج آیت ۲۸

حائل ہو جائے اور وہ مر جائے تو میں اس کے عقیدۂ توحید کے بارے میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ اس کی حالت میں شاید کوئی تبدیلی آئی ہو۔

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں اگر شہادت گھر کے دروازے پر ملے اور اسلام پر موت حجرے کے دروازے پر ہو تو میں اسلام پر موت کو ترجیح دوں گا کیوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ حجرے کے دروازے اور حویلی کے دروازے کے درمیان میرے دل کی کیا کیفیت ہو جائے۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص موت کے وقت ایمان کے سلب ہو جانے سے بے خوف ہو اس کا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ اور حضرت سہل رحمہ اللہ فرماتے ہیں صدیقین کا خوف یہ ہے کہ وہ ہر خطرے اور ہر حرکت کے وقت برے خاتمے سے ڈرتے ہیں اور انہی لوگوں کا وصف اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا۔

وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ۔ (۱) اور ان کے دل دہل جاتے ہیں۔

جب حضرت سفیان رحمہ اللہ کے وصال کا وقت آیا تو انہوں نے رونا اور چیخنا شروع کر دیا ان سے کہا گیا کہ اے ابو عبداللہ! آپ کو اللہ تعالیٰ پر امید رکھنی چاہیے بے شک اللہ تعالیٰ سے امید آپ کے گناہوں سے بھی بڑی ہے انہوں نے فرمایا کیا میں اپنے گناہوں پر روتا ہوں؟ اگر مجھے معلوم ہو کہ میری موت عقیدۂ توحید پر آئے گی تو مجھے کوئی پرواہ نہیں اگرچہ میں پہاڑوں کے برابر گناہوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کروں۔

خوف کھانے والے کسی بزرگ کے بارے میں بیان کیا گیا کہ انہوں نے اپنے ایک بھائی کو وصیت کرتے ہوئے کہا کہ جب میری وفات ہو جائے تو تم میرے سرہانے بیٹھ جانا اگر تم دیکھو کہ میری رُوح توحید پر پرواز کر گئی تو میرا تمام مال لے کر اس سے بادام اور شکر لے کر شہر کے بچوں میں تقسیم کر دینا اور کہنا کہ یہ قید سے چھوٹنے والے فلاں شخص کی طرف سے شیرنی ہے اور اگر میں توحید پر نہ مروں تو لوگوں کو بتا دینا تاکہ وہ دھوکے سے میرے جنازے میں شریک نہ ہوں اور وہی شخص جنازے میں آئے جو بصیرت کے ساتھ آنا چاہیے اور مجھے وفات کے بعد ریاکاری لاحق نہ ہو اس نے پوچھا توحید کی علامت کیا ہو گی؟ اس بزرگ نے اسے ایک علامت بتائی چنانچہ اس شخص نے ان کی وفات کے وقت وہ علامت دیکھی اور شکر اور بادام خرید کر تقسیم کئے۔

حضرت سہل رحمہ اللہ فرماتے ہیں مرید کو گناہوں میں مبتلا ہونے کا ڈر ہوتا ہے جب کہ عارف کو کفر میں ابتلاء کا خوف ہوتا ہے اور حضرت ابو یزید رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے جب میں مسجد کی طرف جاتا ہوں تو گویا میری کمر میں زنار ہوتا ہے اور مجھے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں وہ مجھے گرجے اور آتش پرستی کی جگہ نہ لے جائے یہاں تک کہ جب میں مسجد میں داخل ہوتا ہوں تو زنار مجھ سے کٹ جاتا ہے میرے ساتھ یہ عمل روزانہ پانچ مرتبہ ہوتا ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ مومنون آیت ۶۰

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مروی ہے کہ آپ نے فرمایا اے حواریوں کے گروہ! تمہیں گناہوں کا ڈر ہوتا ہے اور ہم گروہ انبیاء کو کفر کا خوف ہوتا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات میں مروی ہے کہ ایک نبی علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھوک، جوؤں اور ننگے پن کی شکایت کی اور ان کا لباس اُونی تھا اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی اے میرے بندے! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ میں تمہارے دل کو کفر سے بچالوں کہ تم مجھ سے دنیا کا سوال کرتے ہو چنانچہ انہوں نے مٹی لے کر اپنے سر پر ڈالی اور عرض کیا ہاں میرے رب میں راضی ہوں تو مجھے کفر سے بچالے۔

تو عارفین قدموں کی مضبوطی اور قوتِ ایمان کے باوجود بُرے خاتمے سے ڈرتے تھے تو کمزور لوگوں کو اس (برے خاتمے) کا خوف کیوں نہیں ہوگا۔

اور برے خاتمے کے کچھ اسباب ہیں جو موت سے پہلے ہوتے ہیں جیسے بدعت، منافقت اور تمام بری صفات ہیں اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم منافقت سے بہت زیادہ ڈرتے تھے حتیٰ کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا اگر مجھے علم ہو کہ میں منافقت سے پاک رہوں گا تو یہ بات مجھے ان تمام چیزوں سے زیادہ پسند ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے انہوں نے منافقت سے وہ منافقت مراد نہیں لی جو اصل ایمان کے خلاف ہے بلکہ وہ منافقت مراد ہے جو ایمان کے ساتھ جمع ہوتی ہے پس وہ مسلمان بھی ہوتا ہے اور منافق بھی۔ اور اس کی بہت سی علامات ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ فَهُوَ مُنَافِقٌ خَالِصٌ وَإِنْ صَلّٰى وَصَامَ وَزَعَمَ اَنَّهُ مُسْلِمٌ وَإِنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ فَفِيهِ شُعْبَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا مَنْ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔ (۱)

چار باتیں ایسی ہیں کہ جس میں پائی جائیں وہ خالص منافق (عملی منافق) ہوتا ہے اگرچہ نماز پڑھے اور روزہ رکھے اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھے اور اگر اس میں ان میں سے ایک خصلت ہو تو اس میں منافقت کا ایک شعبہ پایا جاتا ہے حتیٰ کہ اسے چھوڑ دے جو بات کرتے وقت جھوٹ بولے وعدہ کرے تو اسے پورا نہ کرے اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے اور جب جھگڑا ہو تو گالی گلوچ سے کام لیتا ہے۔

اور دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں۔

وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ۔

اور جب وعدہ کرتا ہے تو دھوکہ دیتا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے منافقت کی مختلف تفاسیر کی ہیں صدیقین کے علاوہ لوگوں میں ان میں سے کوئی نہ کوئی بات ضرور

---

(۱) صحیح مسلم جلد اول ص ۵۶ کتاب الایمان

پائی جاتی ہے حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں ظاہر و باطن کا اختلاف زبان اور دل کا اختلاف، دخول وخروج کا اختلاف منافقت میں سے ہے اور ان باتوں سے کون خالی ہے بلکہ یہ کام لوگوں کے درمیان بطور عادت محبوب بن گئے ہیں۔ اور ان کو مکمل طور پر کوئی بھی برا نہیں جانتا بلکہ یہ کام لوگوں میں زمانۂ نبوت کے قریب ہی جاری ہو گئے تھے تو ہمارے زمانے کے بارے میں کیا گمان ہوگا؟ حتی کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ زمانہ نبوت میں کوئی شخص ایک بات کہنے سے منافق ہو جاتا تھا لیکن آج میں وہی بات گیارہ مرتبہ سنتا ہوں۔ (۱)

اور صحابہ کرام فرمایا کرتے تھے کہ تم بعض اعمال کو جانتے ہو جو تمہاری نگاہ میں بال سے زیادہ باریک ہیں لیکن ہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ان باتوں کو گناہ کبیرہ میں سے سمجھتے تھے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا منافقت کی علامت یہ ہے کہ تم، لوگوں سے اس بات کو ناپسند کرو جس کا خود ارتکاب کرتے ہو اور تم ظلم میں سے کسی چیز کو پسند کرو اور حق میں سے کسی بات کو ناپسند کرو اور کہا گیا ہے کہ نفاق میں سے ایک بات یہ ہے کہ جب کسی آدمی کی تعریف اس بات پر کی جائے جو اس میں نہیں ہے تو وہ اس پر خوش ہو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا کہ ہم ان امراء کے پاس جاتے ہیں تو ان کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں اور جب ہم وہاں سے نکلتے ہیں تو ان کے بارے میں کلام کرتے ہیں آپ نے فرمایا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم ان باتوں کو منافقت خیال کرتے ہیں۔ (۲)

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک شخص کو حجاج بن یوسف کے خلاف باتیں کرتے ہوئے سنا تو پوچھا بتاؤ کیا حجاج کی موجودگی میں بھی تم ایسی گفتگو کرتے؟ اس نے جواب دیا نہیں۔ فرمایا ہم عہد رسالت میں اس قسم کی باتوں کو منافقت سمجھتے تھے۔

اس سے بھی زیادہ سخت بات یہ ہے کہ کچھ لوگ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے دروازے پر بیٹھ کر ان کا انتظار کر رہے تھے اور وہ آپ کے بارے میں کچھ باتیں بھی کرتے تھے جب آپ باہر تشریف لائے تو آپ سے حیا کرتے ہوئے وہ لوگ خاموش ہو گئے آپ نے فرمایا اپنی گفتگو جاری رکھو لیکن وہ خاموش رہے آپ نے فرمایا اس قسم کے عمل کو ہم عہد رسالت میں منافقت شمار کرتے تھے۔

اور یہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ منافقین اور اسبابِ نفاق کے علم کے ساتھ مخصوص تھے اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ دل پر ایک ایسی گھڑی آتی ہے کہ وہ ایمان سے بھر جاتا ہے حتی کہ اس میں سوئی کے سوراخ جتنی جگہ بھی نفاق کے لیے

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۳۹۰ مرویات حذیفہ

(۲) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۶۱ کتاب الرقاق

(۳) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۲ ص ۲۰۱ حدیث ۱۳۵۴۸

نہیں رہتی اور اس پر ایک ساعت ایسی آتی ہے کہ وہ منافقت سے بھر جاتا ہے اور اس میں سوئی کے سوراخ جتنی جگہ بھی ایمان کے لیے باقی نہیں رہتی۔

اس سے تمہیں معلوم ہو گیا کہ عارفین کو برے خاتمے کا خوف ہوتا ہے اور اس کا سبب خاتمے سے پہلے پائے جانے والے کچھ اسباب ہوتے ہیں جن میں بدعت، گناہ اور منافقت شامل ہے اور ان باتوں سے کوئی شخص کب خالی ہو سکتا ہے اور اگر کوئی شخص یہ گمان کرتا ہے کہ وہ ان باتوں سے خالی ہے تو یہ بھی منافقت ہے کیوں کہ کہا گیا ہے کہ جو شخص منافقت سے بے خوف ہو وہ بھی منافق ہے۔

کسی شخص نے ایک عارف سے کہا کہ مجھے اپنے نفس پر منافقت کا خوف ہے انہوں نے فرمایا اگر تم منافق ہوتے تو تمہیں منافقت کا خوف نہ ہوتا تو عارف ہمیشہ سابقہ (پہلی حالت) اور خاتمہ کے درمیان متوجہ رہتا ہے کیوں کہ اسے ان دونوں کا خوف ہوتا ہے۔

اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ بَیْنَ مَخَافَتَیْنِ بَیْنَ اَجَلٍ قَدْ مَضَی لَا یَدْرِیْ مَا اللّٰہُ صَانِعٌ فِیْہِ وَ بَیْنَ اَجَلٍ قَدْ بَقِیَ لَا یَدْرِیْ مَا اللّٰہُ قَاضٍ فِیْہِ فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ مِنْ مُسْتَعْتَبٍ وَلَا بَعْدَ الدُّنْیَا مِنْ دَارٍ اِلَّا الْجَنَّۃُ اَوِ النَّارُ۔ (۱)

مومن بندہ دو خوفوں کے درمیان رہتا ہے اس اجل کے درمیان جو گزر گئی کہ اسے معلوم نہیں اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کیا کرنے والا ہے اور وہ اجل جو باقی ہے کہ اسے معلوم نہیں اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں کیا فیصلہ فرمایا تو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے موت کے بعد طلب رضا کا کوئی موقعہ اور دنیا کے بعد کوئی گھر نہیں سوائے جنت یا دوزخ کے ـــــ اور اللہ تعالیٰ سے ہی مدد طلب کی جاتی ہے۔

فصل ۷:

برے خاتمہ کا مفہوم

سوال:

آپ نے جو کچھ لکھا ہے ان تمام باتوں کا رجوع برے خاتمے کی طرف ہے تو برا خاتمہ کیا ہے؟

---

(۱) کتاب الزھد والرقائق ص ۱۰۲ حدیث ۳۰۴/ الفردوس بماثور الخطاب جلد ۲ ص ۹۲ حدیث ۲۶۱۴

جواب:

برے خاتمہ کے دو مرتبے ہیں ان میں سے ایک، دوسرے سے بڑا ہے، بڑا اور پریشان کن رتبہ یہ ہے کہ موت کی سختیوں اور اس کی ہولناکیوں کے ظہور کے وقت شک یا انکار پایا جائے پس انکار یا شک کے غلبہ کی صورت میں رُوح قبض ہو اور اس انکار کی وجہ سے جو دل پر غالب ہو گیا بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب پیدا ہو جاتا ہے اور یہ حجاب دائمی بُعد اور ہمیشہ کے برے خاتمہ کا دوسرا مرتبہ پہلے سے کم ہے اور وہ موت کے وقت دل پر امور دنیا میں سے کسی امر کی محبت یا کسی خواہش کا غالب آنا ہے اب یہ بات دل میں بیٹھ جاتی ہے اور اسے گھیر لیتی ہے حتی کہ اس حالت میں کسی دوسری چیز کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اسی حالت میں رُوح پرواز کر جاتی ہے اب اس کے دل کا استغراق یوں ہوتا ہے کہ اس کا دل دنیا کی طرف جھکا ہوا ہوتا ہے اور اس کا رُخ بھی ادھر ہی ہوتا ہے اور حبیب اللہ تعالیٰ کی طرف سے رُخ پھر جائے تو حجاب پیدا ہو جاتا ہے اور حجاب پیدا ہو گیا تو عذاب نازل ہوتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی جلانے والی آگ انہی لوگوں کو پکڑتی ہے جو اس سے پردے میں ہوتے ہیں لیکن وہ مومن جس کا دل دنیا کی محبت سے محفوظ ہو اور اس کی تمام تر توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اس سے جہنم کی آگ کہتی ہے اے مومن! دُور ہو جا تیرے نور نے میری لپٹ کو بجھا دیا ہے۔

پس جب رُوح کا قبض ہونا ایسی صورت میں ہو کہ اس پر دنیا کی محبت غالب ہو تو معاملہ خطرناک ہوتا ہے کیوں کہ آدمی اسی حالت پر مرتا ہے جس پر وہ زندہ تھا اور موت کے بعد دل کے لیے کوئی ایسی صفت حاصل کرنا ممکن نہیں جو اس پر غالب صفت کی ضد ہو کیوں کہ دل کا بدلنا اعضاء کے عمل کے ساتھ ہوتا ہے اور موت کے ذریعے اعضاء باطل ہو گئے پس اعمال بھی باطل ہو گئے لہٰذا اب کسی عمل کا طمع باقی نہیں ہے اور دنیا میں واپسی کی طمع بھی نہیں کہ اس کا تدارک کیا جا سکے لہٰذا اس وقت بہت زیادہ حسرت ہوتی ہے۔

البتہ جب اصل ایمان اور اللہ تعالیٰ کی محبت ایک طویل مدت تک دل میں راسخ ہو چکی ہو اور اچھے اعمال کے ساتھ پکی ہو گئی ہو وہ موت کے وقت پیش آنے والی اس حالت کو مٹا دیتی ہے اگر اس کا ایمان ایک مثقال کے برابر بھی ہو تو وہ بھی اس کو جلد ہی آگ سے نکال دیتا ہے اور اگر اس سے کم ہو تو وہ جہنم میں زیادہ مدت تک ٹھہرتا ہے اور اگر دانے کے برابر بھی ہو تو وہ اسے ضرور بضرور جہنم سے نکالے گا اگرچہ کئی ہزار سال کے بعد ہو۔

سوال:

جو کچھ آپ نے ذکر کیا ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ موت کے فوراً بعد آگ اس تک پہنچ جاتی ہے تو اسے قیامت تک مؤخر کرنے اور طویل عرصہ تک مہلت دینے کا کیا فائدہ ہے۔

عذاب قبر: جواب: جو شخص عذاب قبر کا منکر ہے وہ بدعتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے نور سے پردے میں ہے بلکہ نور

قرآن اور نورِ ایمان سے بھی حجاب میں ہے بلکہ اصحابِ بصیرت کے نزدیک صحیح بات وہ ہے جو صحیح احادیث سے ثابت ہے۔ وہ یہ ہے۔

اَلْقَبْرُ اِمَّا حُفْرَۃٌ مِّنَ النَّارِ اَوْ رَوْضَۃٌ مِّنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ۔ (۱) قبر یا تو جہنم کا ایک گڑھا ہے یا وہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔

اور جس کو عذاب دیا جا رہا ہے اس کی قبر کی طرف جہنم کے ستر دروازے کھلتے ہیں جیسا کہ احادیث میں ہے (۲) پس جونہی اس کی روح جدا ہوتی ہے اس پر مصیبتوں کا نزول شروع ہو جاتا ہے اگر وہ برے خاتمہ کی وجہ سے بدبختی کا شکار ہو چکا ہو اور مختلف اوقات میں مختلف قسم کا عذاب ہوتا ہے جب اسے قبر میں رکھا جاتا ہے تو منکر نکیر کے سوالات ہوتے ہیں (۳) اس کے بعد عذاب ہوتا ہے (۴) پھر حساب کا مناقشہ ہے (۵) اور گواہوں کی ایک جماعت کے سامنے قیامت کے دن کی رسوائی ہے (۶) اس کے بعد پل صراط کا خطرہ ہے (۷) اور دوزخ کے فرشتوں کی مصیبت و سختی (۸) اور وہ تمام امور جو احادیث میں مذکور ہیں۔

تو بدبخت آدمی طرح طرح کے عذاب میں اپنے تمام احوال میں تردد میں رہتا ہے اور وہ تمام حالات میں عذاب میں رہے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے اور تمہیں یہ گمان نہیں کرنا چاہیئے کہ محلِ ایمان کو مٹی کھا جاتی ہے بلکہ مٹی تمام ظاہری اعضاء کو کھا کر جدا جدا کر دیتی ہے یہاں تک کہ مقررہ وقت آپہنچے تو تمام متفرق اجزاء جمع ہو جائیں گے اور ان کی طرف روح لوٹ آئے گی جو محلِ ایمان ہے اور یہ روح وقتِ موت سے لوٹنے تک موجود رہتی ہے یا تو ان سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہوتی ہے جو عرش کے نیچے لٹک رہے ہیں اگر وہ نیک بخت ہے اور اگر وہ بدبخت ہے تو اس کے خلاف کسی بری حالت میں ہوتی ہے، ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

سوال:-

برے خاتمے کی طرف لے جانے والا سبب کیا ہے؟

جواب:-

جان لو! ان امور کے اسباب کا احاطہ تفصیلی طور پر ممکن نہیں البتہ اجمالاً ان پر اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک شک اور انکار کی صورت میں خاتمے کا تعلق ہے تو اس کا سبب دو باتوں میں منحصر ہے۔

---

(۱) الترغیب والترہیب جلد ۴ ص ۲۴۸ کتاب التوبہ

(۲)

(۳) جامع ترمذی ص ۳۷۱، ابواب الجنائز

(۴) " " " "

(۵) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۶۷ کتاب الرقاق۔

(۶) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۲۶ مرویات ابن عمر

(۷) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۷۳ مرویات ابن عمر کتاب الرقاق

(۸) کنز العمال جلد ۱۰ ص ۱۹۱ حدیث ۲۹۰۰۵

ایک وہ ہے جو مکمل پرہیز گاری اور اعمال کی درستگی کے باوجود متصور ہوتا ہے جیسے بدعتی زاہد، اس کا خاتمہ بہت خطرے میں ہے اگرچہ اس کے اعمال اچھے ہوں ـــــ اس سے ہماری مراد کوئی خاص مذہب نہیں جسے بدعت قرار دیں کیوں کہ اس کا بیان بہت طویل ہے بلکہ بدعت سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال میں خلافِ حق عقیدہ رکھنا ہے یعنی جیسے صورت حال ہے اس کے خلاف عقیدہ ہو چاہے وہ اس کی رائے سے ہو یا عقل و فکر جس کے ذریعے وہ مخالف سے جھگڑتا ہے ایسی عقل پر اعتماد کرتا اور اس کے دھوکے میں ہے یا جو اس حالت پر ہے اس کی تقلید کرتا ہے۔

پس جب موت قریب آتی ہے اور ملک الموت کی پیشانی اس کے سامنے ظاہر ہوتی ہے اور دل اپنے تمام خیالات سمیت بدلتا ہے تو بعض اوقات حالتِ سکراتِ موت میں اس کے سامنے اس عقیدے کا بطلان منکشف ہوتا ہے جسے اس نے جہالت کی وجہ سے اختیار کر رکھا تھا کیوں کہ موت کی حالت پردہ اٹھنے کی حالت ہے اور سکرات کی ابتدائی حالت اسی سے ہے پس اس سے بعض امور واضح ہو جاتے ہیں پس جب اس کا عقیدہ باطل ہو جاتا ہے اور اس سے پہلے وہ اس پر یقین رکھتا اور اسے قطعی سمجھتا تھا تو وہ یہ گمان نہیں کرتا کہ اس سے خاص اس عقیدے میں خطا ہوئی ہے جس کا دارومدار اس کی فاسد رائے اور عقل ناقص پر تھا بلکہ اس کے خیال میں اس کے تمام عقائد بے اصل ہوتے ہیں کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نیز تمام عقائد صحیحہ اور فاسد عقیدے میں فرق نہیں کرتا پس بعض مبنی پر جہالت اعتقادات کا انکشاف باقی عقائد کے بطلان کا سبب بنتا ہے یا وہ ان میں شک کرتا ہے۔

اب اگر اسی حالت میں رُوح پرواز کرتی ہے اور وہ اصل ایمان کی طرف نہیں لوٹتا تو اس کا خاتمہ بُرا ہوتا ہے اور اس کی روح شرک پر نکلتی ہے ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں اس ارشاد خداوندی سے یہی لوگ مراد ہیں

وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ۔ (۱)

اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ بات ظاہر ہوئی جس کا وہ گمان بھی نہیں کرتے تھے۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔ (۲)

آپ فرما دیجئے کیا ہم تمہیں ان لوگوں کی خبر دیں جو اعمال کے اعتبار سے بہت خسارے میں ہیں وہ لوگ جن کی کوشش دنیوی زندگی میں ضائع ہوگئی اور ان کا خیال یہ ہے کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ زمر آیت ۴۷

(۲) قرآن مجید، سورۂ کہف آیت ۱۰۳

اور جس طرح نیند کی حالت میں مستقبل میں پیش آنے والے امور منکشف ہوتے ہیں کیوں کہ اس وقت دل پر دنیوی مشغولیت کا بوجھ کم ہوتا ہے اسی طرح سکراتِ موت کی حالت میں بعض امور واضح ہوتے ہیں کیوں کہ دنیوی مشاغل اور بدن کی خواہشات دل کو ملکوت کی طرف دیکھنے سے مانع نہیں لہٰذا اب وہ لوحِ محفوظ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا مطالعہ کرتا ہے تاکہ وہ امور اپنی اصل حقیقت کے ساتھ منکشف ہو جائیں تو اس قسم کی حالت کشف کا سبب بنتی ہے اور یہ کشف باقی اعتقادات میں شک کا سبب بنتا ہے۔

تو جو شخص تقلیدی طور پر یا رائے اور عقل کے ذریعے اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات و افعال کے بارے میں خلافِ حقیقت اعتقاد رکھتا ہے اسے اس خطرے کا سامنا ہوتا ہے اور زہد نیز اعمال کا صالح ہونا اس خطرے کو دور کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں بلکہ اس سے نجات کے لیے سچے عقیدے کی ضرورت ہے۔

اور بھولے بھالے آدمی اس خطرے سے دور ہیں یعنی وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آخرت پر مجمل لیکن مضبوط ایمان لائے جس طرح دیہاتی، جنگلوں میں رہنے والے اور عام لوگ جو بحث مباحثہ میں نہیں پڑتے نہ کلام کا آغاز کرتے ہیں اور نہ ہی متکلمین کے مختلف اقوال کی تقلید میں ان کی باتوں پر کان دھرتے ہیں۔

اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَكْثَرُ اَهْلِ الْجَنَّةِ الْبُلْهُ۔ (۱) جنت میں جانے والے زیادہ لوگ سیدھے سادے ہوں گے

اسی لیے بزرگوں نے بحث و نظر اور کلام میں غور و خوض نیز ان امور میں تفتیش سے منع فرمایا اور لوگوں کو حکم دیا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اس سب پر ایمان لائیں اور بس اور جو کچھ ظاہر میں سمجھ آتا ہے اس پر بھی ایمان لائیں اور یہ اعتقاد رکھیں کہ کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے مشابہ نہیں ہے لوگوں کو تاویل میں غور و فکر کرنے سے روکا گیا ہے کیوں کہ صفاتِ خداوندی میں بحث کرنے سے بہت بڑے خطرے کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی گھاٹیاں سخت اور راستے دشوار گزار ہیں اور عقلیں اللہ تعالیٰ کے جلال کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں اور چوں کہ دل محبتِ دنیا پر پیدا کئے گئے ہیں اس لیے نورِ یقین سے ملنے والی ہدایت ان سے دور رہے اور جو کچھ بحث کرنے والے کہتے ہیں وہ ایک دوسرے کے خلاف ہے اور دل انہی باتوں کے ساتھ اُلفت رکھتے ہیں جو ابتدائے نشو و نما میں ان میں ڈالی جاتی ہیں اور مخلوق کے درمیان جو تعصبات پھیلے ہوئے ہیں وہ موروثی عقائد کی مضبوط جڑیں ہیں یا اوّل اوّل مسلمانوں سے حسنِ ظن کے طور پر لیے گئے ہیں پھر طبیعتیں دنیا کی محبت میں مصروف و مشغوف ہیں اور اس کی طرف متوجہ ہیں اور دنیوی خواہشات نے ان کا گلا دبا رکھا ہے لہٰذا وہ ان کو مکمل طور پر سوچ و بچار کرنے نہیں دیتیں۔

پس جب اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے سلسلہ میں رائے اور عقل کے ساتھ کلام کا دروازہ کھلتا ہے اور طبیعتوں

---

(۱) مجمع الزوائد جلد ۸ ص ۷۹، کتاب الادب

کا اختلاف بھی موجود ہے نیز ہر جاہل اس بات کی حرص رکھتا ہے کہ وہ کمال اور حق کی گہرائی کا احاطہ کرنے کا دعویٰ کرے تو جس کو جو سمجھ آتی ہے بول پڑتا ہے اور جو شخص جس بات کو سنتا ہے اسی کا معتقد ہو جاتا ہے اور ان کی باہمی الفت کی وجہ سے یہ عقیدہ پکا ہو جاتا ہے اور اب نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی ۔ لہٰذا سلامتی اسی میں ہے کہ لوگ اچھے اعمال میں مشغول ہوں اور جو کچھ ان کی طاقت کی حد سے باہر ہے اس کے پیچھے نہ پڑیں ۔

لیکن اب تو لگام ڈھیلی پڑ گئی اور بیہودگی پھیل گئی اور ہر جاہل اس بات کی طرف اُتر آیا جو ظن اور گمان کے اعتبار سے اس کی طبیعت کے موافق ہے اور وہ اسے ہی علم اور یقینی بات جانتا ہے اور اس کے خیال میں یہی خالص ایمان ہے اور اس کا گمان یہ ہے کہ یہ جو کچھ اندازے اور تخمینے سے کہا گیا ہے یہی علم الیقین اور عین الیقین ہے حالانکہ کچھ دن بعد اسے اس کا علم ہو جائے گا اور پردہ اٹھنے کے بعد ان لوگوں کے بارے میں یہ شعر پڑھنا زیادہ مناسب ہے ۔

اَحْسَنْتَ ظَنَّكَ بِالْاَيَّامِ اِذْ حَسُنَتْ
وَلَمْ تَخَفْ سُوْءَ مَا يَاْتِيْ بِهِ الْقَدَرُ
وَسَالَمَتْكَ اللَّيَالِيْ فَاغْتَرَرْتَ بِهَا
وَعِنْدَ صَفْوِ اللَّيَالِيْ يَحْدُثُ الْكَدَرُ

جب دن اچھے گزرے تو تُو نے زمانے کے بارے میں اچھا گمان کیا اور آنے والی مقدر برائی سے تو نے خوف نہ کھایا
راتوں نے تجھے سلامت رکھا تو تجھے ان کی وجہ سے دھوکہ ہوا
اور جب راتیں صاف ہوں تو گدلا پن آ جاتا ہے ۔

اور جان لو کہ جو شخص اللہ تعالیٰ ، اس کے رسول اور کتابوں پر خالص ایمان سے جدا ہو جاتا ہے اور بحث میں پڑتا ہے وہ اپنے آپ کو اس خطرے کے لیے پیش کرتا ہے اور اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس کی کشتی ٹوٹ جائے اور وہ موجوں کی نذر ہو جائے ایک موج اسے دوسری موج کی طرف پھینک دے بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ اسے ساحل کی طرف پھینک دیتی ہے لیکن یہ بہت بعید بات ہے اور ہلاکت کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے ۔

اور جو لوگ دوسروں سے عقیدہ لیتے ہیں جنہوں نے عقل کے ذریعے اس میں بحث کی تو اس کی دو صورتیں ہیں یا تو وہ دلائل کے ساتھ ہے جو انہوں نے نقل کئے اور اس میں ان کا تعصب شامل ہے یا دلیل کے بغیر ہیں پس اگر اسے اس میں شک ہے تو اس سے دین فاسد ہو جاتا ہے اور اگر اسے اس پر یقین ہے تو اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف ہے اور اپنی ناقص عقل کے دھوکے میں پڑا ہوا ہے اور جو شخص بھی کسی بحث میں پڑتا ہے وہ ان دو حالتوں سے خالی نہیں ہوتا ہاں عقل کی حد سے گزر کر اس نور مکاشفہ کی طرف چلے جو عالم ولایت و نبوت میں چمکتا ہے اور یہ کبریت احمر (سرخ سونا) ہے لیکن کہاں میسر ہے ، ہاں سادہ لوح مسلمان اس خطرے سے محفوظ ہیں یا جن لوگوں کو جہنم کے خوف نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مشغول کر دیا اور وہ ان فضول باتوں میں مشغول نہیں ہوتے ـــــ تو یہ بُرے خاتمے کے خطرے سے متعلق ایک سبب ہے ۔

اور دوسرا سبب اصل میں ایمان کی کمزوری ہے پھر دل پر دنیوی محبت کا غالب آ جانا اور جب ایمان کمزور ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں بھی کمزوری واقع ہو جاتی ہے اور دنیا کی محبت مضبوط ہو جاتی ہے اور یوں ہوتا ہے کہ گویا دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت

کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے البتہ قلبی خطرات اور وسوسے ہوتے ہیں لیکن مخالفتِ نفس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ شیطان کے راستے سے پھر سکتا ہے اس سے خواہشات کی اتباع میں انہماک پیدا ہوتا ہے حتی کہ دل پر اندھیرا چھا جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ سخت بھی ہو جاتا ہے اور سیاہ بھی اور نفسانی ظلمات دل پر چڑھ جاتی ہیں اور جو کمزور ایمان دل میں موجود ہوتا ہے اس میں بھی کمی ہوتی رہتی ہے حتی کہ مہر لگ جاتی ہے اور دل زنگ آلود ہو جاتا ہے اور جب موت کی سختیاں آنا شروع ہوتی ہیں تو یہ محبت بڑھ جاتی ہے مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی محبت مزید کمزور ہو جاتی ہے کیوں کہ اب اسے دنیا سے جدائی کا شعور ہوتا ہے اور یہی دنیا اس کا محبوب تھی جو دل پر غالب آچکی تھی تو دنیا سے جدائی کا سوچ کر اسی کے دل کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھتا ہے لہٰذا جو موت اس کے مقدر میں تھی اس کا ضمیر اس کے انکار کی راہ دکھاتا ہے اور یہ اس لیے ناپسند ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے تو اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کی بجائے بغض جوش نہ مارے۔

جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے سے معمولی محبت کرتا ہو اور وہ لڑکا اس سے اس کا وہ مال لے جو اسے اولاد سے بھی زیادہ پسند ہو اور وہ اس مال کو جلا دے تو یہ کمزور محبت، بغض میں بدل جاتی ہے۔ تو اگر اس حالت میں انسان کی روح نکلے جب اس کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا تو یہ برا خاتمہ ہے اور وہ مکمل طور پر ہلاک ہو گیا اور اس قسم کے خاتمہ تک جو سبب لے جاتا ہے وہ دنیوی محبت کا غلبہ اور اس کی طرف جھکاؤ ہے نیز اس کے اسباب پر خوش ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ایمان کی کمزوری جو اللہ تعالیٰ کی محبت کی کمزوری کا موجب ہے پس جو شخص اپنے دل میں دنیا کی محبت کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی محبت کو زیادہ غالب پاتا ہے وہ اگرچہ دنیا سے بھی محبت کرتا ہو، وہ اس خطرے سے زیادہ دور ہوتا ہے۔

اور دنیا کی محبت ہر گناہ کی اصل ہے اور وہ لاعلاج مرض ہے اور ہر قسم کے لوگ اس میں مبتلا ہیں اور اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کا کم ہونا ہے کیوں کہ اس سے وہی محبت کرتا ہے جو اسے پہچانتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّى يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ۔ (۱)

آپ فرما دیجیے (اے لوگو!) اگر تمہارے باپ دادا اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمایا اور وہ تجارت جس کے نقصان کا تمہیں ڈر ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ تعالیٰ، اور اس کے رسول اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ پسند ہیں تو انتظار کرو حتی کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ توبہ آیت ۲۴

تو نتیجہ یہ ہوا کہ جس شخص کی رُوح دنیا سے اس طرح جاتی ہے کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے انکار کا خطرہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے اس عمل (موت) کو دل سے برا سمجھتا ہو کہ اس نے اس کے اور اس کے اہل و مال اور تمام محبوب چیزوں کے درمیان تفریق ڈال دی تو اس کی موت یوں واقع ہوتی ہے کہ جدھر وہ جا رہا ہے اسے ناپسند کرتا ہے اور جس سے جدا ہو رہا ہے اسے پسند کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس غلام کی طرح حاضر ہو رہا ہے جو آقا سے بُغض رکھتا ہو اور بھاگا ہوا ہو اور اسے زبردستی لایا جا رہا ہو اب وہ جس قدر ذلت اور سزا کا مستحق ہے وہ پوشیدہ نہیں ہے۔

لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی محبت پر انتقال کرتا ہے وہ بارگاہ خداوندی میں اس غلام کی طرح حاضر ہوتا ہے جو نیکوکار ہے اور اپنے آقا کا مشتاق ہے جس نے مشکل کام اور سفر کی مشقت اس سے ملاقات کی طمع میں برداشت کی اب اسے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ بھی مخفی نہیں ہے اور یہ تو محض حاضری اور ملاقات کی خوشی ہے اور جو طرح طرح کے انعام و اکرام اسے ملتے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔

دوسری قسم کا خاتمہ پہلی قسم کے مقابلے میں ہلکا ہے اور اس سے ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہنا لازم نہیں آتا اور اس کے بھی دو سبب ہیں ایک گناہوں کی کثرت ہے اگرچہ ایمان مضبوط ہو اور دوسرا سبب ایمان کی کمزوری ہے اگرچہ گناہ کم ہوں کیوں کہ گناہوں کے ارتکاب کا سبب خواہشات کا غلبہ اور دل میں ان کا راسخ ہو جانا ہے جس کی وجہ الفت اور عادت ہے۔ اور انسان اپنی زندگی میں جن جن چیزوں سے اُلفت رکھتا ہے موت کے وقت اس کے دل میں ان کا ذکر لوٹ آتا ہے اگر اس کے دل کا زیادہ میلان عبادات کی طرف ہو تو حالتِ نزع میں اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی یاد زیادہ ہوتی ہے اور اگر اس کا زیادہ میلان گناہوں کی طرف ہو تو موت کے وقت اس کے دل میں گناہوں کی یاد ہوتی ہے پس جب اس کی رُوح قبض ہوتے وقت دنیوی خواہش اور کسی گناہ کا غلبہ ہو تو دل اس کی قید میں ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے حجاب میں ہوتا ہے اور جو شخص کبھی کبھی گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے وہ اس خطرے سے بہت دُور ہوتا ہے اور جس پر گناہوں کا غلبہ ہو اور عبادات کے مقابلے میں گناہ زیادہ ہوں اور عبادات کی نسبت گناہوں پر دل زیادہ خوش ہوتا ہو تو اس کے حق میں یہ بہت بڑا خطرہ ہے۔

ہم یہ بات ایک مثال کے ذریعے معلوم کرتے ہیں یعنی یہ بات واضح ہے کہ انسان اپنے خواب میں جو کچھ دیکھتا ہے وہ زندگی کی کسی نہ کسی حالت میں دیکھتا ہے حتیٰ کہ وہ وہی چیز دیکھتا ہے جو بیداری کی حالت میں مشاہدہ کی گئی چیز کی مثل ہو یہاں تک کہ وہ قریب البلوغ بچہ جسے احتلام آتا ہو وہ خواب میں حالتِ جماع کو ملاحظہ نہیں کرتا جب تک اس نے بیداری کی حالت میں جماع کا مشاہدہ نہ کیا ہو اور اگر وہ ایک مدت تک اسی حالت میں رہے تو احتلام کے وقت اسے جماع کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔

پھر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ جس شخص نے اپنی زندگی فقہ میں گزاری ہو تو وہ علم و علماء سے متعلق احوال کو اس شخص سے زیادہ دیکھتا ہے جس نے اپنی زندگی تجارت میں گزاری اور تاجر تجارت سے متعلق احوال اور ان کے اسباب کو طبیب اور فقیہ کے مقابلے میں زیادہ دیکھتا ہے کیوں کہ نیند کی حالت میں وہ چیز ظاہر ہوتی ہے جس کے ساتھ دل ایک عرصے سے الفت

رکھتا ہو یا کسی دوسرے سبب سے قلبی تعلق پیدا ہوا ہو۔
اور موت، نیند کے مشابہ ہے لیکن اس سے اوپر ہے البتہ موت کی سختیاں (سکراتِ موت) اور اس سے پہلے جو غشی آتی ہے وہ نیند کے قریب ہوتی ہے لہٰذا یہ مالوف و محبوب چیز کے تذکرے کا تقاضا کرتی ہے اور دل کی طرف اس کے رجوع کی متقاضی ہوتی ہے اور دل میں اس کے ذکر کو ترجیح دینے والے اسباب میں سے ایک سبب ایک عرصہ تک اس سے مانوس رہنا ہے پس گناہوں اور عبادات کے ساتھ طویل اُنس بھی وجہ ترجیح ہے اسی طرح نیک لوگوں کی خواہیں، فاسق لوگوں کی خوابوں کے خلاف ہوتی ہیں تو اُنس و اُلفت کا غلبہ اس بات کا سبب بنتا ہے کہ اس کے دل میں ایک فاحشہ صورت متشکل ہو اور اس کی طرف اس کے نفس کا میلان ہو پس بعض اوقات اسی حالت میں اس کی رُوح قبض ہوتی ہے اور یہ اس کے برے خاتمے کا سبب ہوتا ہے اگرچہ اصلِ ایمان باقی ہو جس کی وجہ سے نجات کی امید ہو۔
اور جس طرح بیداری کی حالت میں دل میں پیدا ہونے والا خیال ایک خاص سبب سے ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے اسی طرح ہر خواب کا اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک سبب ہوتا ہے جس کے بعض کو ہم جانتے ہیں اور بعض کا علم ہمیں نہیں ہوتا جیسے ہم جانتے ہیں کہ دل کا وسوسہ اور خیال ایک چیز سے دوسری مناسب چیز کی طرف مشابہت یا ضد یا ملنے کی وجہ سے منتقل ہوتا ہے کہ اس سے اس کا احساس پیدا ہو۔
مشابہت کی صورت یہ ہے کہ کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر دوسری خوبصورت چیز کا خیال آجائے، ضد کی صورت یہ ہے کہ خوبصورت کو دیکھ کر بدصورت کی یاد آجائے اور وہ ان دونوں کے درمیان بہت زیادہ تفاوت میں غور کرے اور مقارنت (ملنا) یہ ہے کہ مثلاً اس نے ایک گھوڑے کو دیکھا جسے اس سے پہلے کسی انسان کے ساتھ دیکھ چکا تھا تو اس گھوڑے کو دیکھنے سے انسان کا خیال آجائے۔
اور بعض اوقات ذہن ایک چیز کی طرف سے دوسری چیز کی طرف منتقل ہوتا ہے لیکن دونوں کے درمیان وجہِ مناسبت معلوم نہیں ہوتی اور یہ ایک اور دو واسطوں سے ہوتا ہے مثلاً ذہن ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف اور اس سے تیسری چیز کی طرف منتقل ہو پھر دوسری چیز کو بھول جائے پہلی اور تیسری چیز کے درمیان کوئی مناسبت نہیں ہوتی البتہ اس کے اور دوسری چیز کے درمیان مناسبت ہوتی ہے جب کہ دوسری اور پہلی چیز کے درمیان مناسبت ہوتی ہے اسی طرح خوابوں میں خیالات کے لیے اس جنس کے اسباب ہیں اور سکراتِ موت کے وقت بھی اسی طرح ہوتا ہے۔
اس بنیاد پر جو شخص اکثر سلائی کا کام کرتا ہے تم اسے دیکھو گے وہ اپنے سر کی طرف اشارہ کرتا ہے گویا وہ اپنی سوئی کو پکڑتا ہے تاکہ اس کے ساتھ سلائی کرے اور اپنی انگلی کو تر کرتا ہے۔ اور چادر کو اوپر سے پکڑ کر بالشت سے ناپتا ہے گویا اس کا ناپ کرتا ہے پھر اپنا ہاتھ قینچی کی طرف بڑھاتا ہے۔
اور جو شخص چاہتا ہو کہ اس کا خیال گناہوں اور خواہشات کی طرف نہ جائے اس کے لیے یہی راستہ ہے کہ وہ عرصہ دراز تک

اپنے نفس کو ان سے دُور رکھے اور دل سے شہوتوں کا قلع قمع کرے یہی مقدار اختیار کے تحت داخل ہے اور نیکی پر طویل عرصہ تک قائم رہنا اور فکر کو شر سے الگ رکھنا سکرات موت کی حالت کے لیے تیاری اور ذخیرہ ہے کیوں کہ آدمی اسی حالت پر مرتا ہے جس پر زندگی گزارتا ہے۔

اسی لیے ایک سبزی فروش کے بارے میں منقول ہے کہ موت کے وقت اسے کلمہ شہادت کی تلقین کی گئی تو وہ کہنے لگا پانچ، چھ، چار، گویا وہ اسی حساب میں مشغول تھا جس کے ساتھ وہ موت سے پہلے مانوس تھا۔

اسلاف میں سے کسی عارف نے فرمایا عرش ایک جوہر ہے جو نور سے چمک رہا ہے جو بندہ جس حال پر ہوتا ہے اسی حالت میں اس کی صورت عرش پر منقش ہوتی ہے جب وہ سکراتِ موت کی حالت میں ہوتا ہے تو بعض اوقات اپنے آپ کو گناہ کی صورت میں دیکھتا ہے اسی طرح قیامت کے دن اس کے لیے کشف ہوگا اور وہ اپنے نفس کے احوال کو دیکھے گا تو اس وقت اسے جو حیا اور خوف ہوگا اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ واقعی انہوں نے صحیح فرمایا۔

سچے خواب کا سبب بھی اس کے قریب ہے کیوں کہ سونے والا لوح محفوظ کو دیکھ کر اس بات کا ادراک کرتا ہے جو مستقبل میں پیش آنے والی ہے اور (سچا خواب) نبوت کے اجزا میں سے ایک جز ہے۔

تو برا خاتمہ دل کے احوال اور خلجان کی طرف لوٹتا ہے اور دلوں کو بدلنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے اور وہ اتفاقات جو برے خیالات کا تقاضا کرتے ہیں وہ مکمل طور پر اختیار میں نہیں ہیں اگرچہ طویل اُنس والفت کی اس میں تاثیر ہوتی ہے اسی وجہ سے عارفین کو برے خاتمے کا بہت زیادہ خوف ہوتا ہے اس لیے اگر انسان ارادہ کرے کہ خواب میں نیک لوگوں کے احوال اور عبادات واطاعت کے احوال دیکھے تو اس کے لیے یہ بات مشکل ہے اگرچہ اصلاح کی کثرت اور اس پر مواظبت ان چیزوں میں سے ہے جو اسباب میں موثر ہیں لیکن خیال کا بہک جانا مکمل طور پر کنٹرول میں نہیں اگرچہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ خواب میں وہی چیز نظر آتی ہے جو حالتِ بیداری میں غالب ہوتی ہے حتیٰ کہ میں نے شیخ ابو علی فارندی سے سنا جو مجھ سے بیان کر رہے تھے کہ مرید پر شیخ کا حُسنِ ادب واجب ہے اور جو کچھ شیخ کہے اس سے اس کے دل میں انکار نہ ہو، اور نہ زبان سے جھگڑا کرے انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے اپنے شیخ ابوالقاسم کرمانی سے خواب بیان کیا اور عرض کیا کہ میں نے آپ کو دیکھا آپ مجھے فلاں بات فرما رہے ہیں اور میں پوچھتا ہوں ایسا کیوں ہے۔ فرماتے ہیں انہوں نے مجھے ایک مہینہ چھوڑ دیا اور مجھ سے کلام نہ کیا اور فرمایا اگر تمہارے دل میں میرے قول کا انکار نہ ہوتا تو خواب میں یہ بات تمہاری زبان پر جاری نہ ہوتی ——— اور فی الواقع ان کا قول درست ہے کیوں کہ جو کچھ حالتِ بیداری میں انسان کے دل پر غالب ہوتا ہے خواب میں بہت کم اس کے خلاف دیکھتا ہے علم معاملہ میں خاتمہ کے اسرار کے سلسلے میں ہم اسی قدر بیان کر سکتے ہیں اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ علم مکاشفہ میں داخل ہے۔

اس گفتگو سے تمہارے لیے واضح ہو گیا کہ برے خاتمہ سے امن یہ ہے کہ تم اشیاء کو کسی جہالت کے بغیر اسی طرح دیکھو

جس طرح وہ ہیں اور اپنی تمام زندگی کسی گناہ کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں گزارو اور اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ بات محال یا مشکل ہے تو ضروری ہے کہ تم پر وہی خوف غالب ہو جو عارفین پر غالب ہے حتیٰ کہ اس کے سبب تمہارا رونا اور پیٹنا طویل ہو جائے اور تم ہمیشہ غمگین اور پریشان رہو جس طرح ہم انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے واقعات بیان کریں گے تاکہ یہ بات ان اسباب میں سے ایک سبب بن جائے جو تمہارے دل میں خوف کی آگ بھڑکاتے ہیں۔

اس سے تمہیں معلوم ہو گیا کہ اگر آخری سانس جس میں روح نکلتی ہے سلامت نہ ہو تو تمام عمر کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور قلبی خیالات کی موجوں کے اضطراب کی موجودگی میں یہ سلامتی نہایت مشکل ہے اسی لیے حضرت مطرف بن عبداللہ رحمہ اللہ فرماتے تھے مجھے ہلاک ہونے والے پر تعجب نہیں ہوتا کہ وہ کیسے ہلاک ہوا بلکہ مجھے نجات پانے والے پر تعجب ہوتا ہے کہ اس نے کیسے نجات پائی۔

اسی لیے حضرت حامد اللفاف رحمہ اللہ نے فرمایا جب فرشتے اس مومن بندے کی روح لے کر جاتے ہیں جو بھلائی اور اسلام پر فوت ہوا تو اس سے فرشتوں کو تعجب ہوتا ہے اور وہ کہتے ہیں یہ شخص دنیا سے کیسے نجات پا گیا جب کہ اس میں ہمارے اچھے اچھے بگڑ گئے —— اور حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ ایک دن رو رہے تھے ان سے پوچھا گیا کہ آپ کیوں روتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا ہم عرصہ دراز تک گناہوں پر روتے رہے پس اب اسلام پر روتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جس کی کشتی سمندر کے گرداب میں چلی گئی اور اس پر مخالف ہواؤں کا ہجوم ہو گیا اور موجوں میں اضطراب پیدا ہو گیا تو اس کے حق میں نجات، ہلاکت سے بہت دور ہے اور مومن کا دل کشتی سے زیادہ مضطرب ہوتا ہے اور وسوسوں کی موجیں سمندر کی موجوں سے زیادہ ٹکراتی ہیں اور موت کے وقت صرف ان اندیشوں کا خوف ہوتا ہے جو دل میں پیدا ہوتے ہیں اسی سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

إِنَّ الرَّجُلَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ خَمْسِيْنَ سَنَةً حَتّٰى لَا يَبْقٰى بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ اِلَّا فَوَاقُ نَاقَةٍ فَيُخْتَمُ لَهُ بِمَا سَبَقَ بِهِ الْكِتَابُ۔ (۱)

ایک انسان ستر سال اہل جنت کے عمل کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف اونٹنی کی دو دھاروں کے درمیان وقفہ جتنا وقت باقی رہتا ہے تو اس کا خاتمہ پہلے سے لکھے ہوئے فیصلے کے مطابق ہوتا ہے۔

اور اونٹنی کی دو دھاروں کے درمیان اتنا وقت نہیں ہوتا جس میں کوئی بدبختی پر مبنی عمل کیا جا سکے۔ بلکہ یہ اندیشے ہیں جو اچکنے والی بجلی کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔

حضرت سہل رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے دیکھا کہ گویا میں جنت میں داخل ہو رہا ہوں میں نے اس میں تین سو انبیاء کرام

---

(۱) کنز العمال جلد اول ص ۱۲۳ حدیث ۵۸۲

کو دیکھا میں نے پوچھا آپ دنیا میں کس بات سے زیادہ ڈرتے تھے انہوں نے فرمایا برے خاتمے سے، اور اسی بڑے خطرے کے پیش نظر شہادت قابلِ رشک بن گئی اور اچانک موت ناپسند ہوتی ہے۔

اچانک موت (کی ناپسندیدگی) اس وجہ سے ہے کہ بعض اوقات اس وقت موت واقع ہوتی ہے جب برے اندیشے پیدا ہوتے اور دل پر غالب آجاتے ہیں اور دل ایسی باتوں سے خالی نہیں مگر یہ کہ کراہت کے ذریعے یا نورِ معرفت کی وجہ سے اسے دُور کردے۔

اور شہادت کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مطلب رُوح کا ایسی حالت میں نکلنا ہے جب دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہے اور دل سے دنیا، اہل و مال، اولاد اور تمام خواہشات کی محبت نکل جائے کیوں کہ وہ لڑائی کے میدان میں اسی لیے جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی رضا کی طلب اور اپنی دنیا کو آخرت کے بدلے بیچے نیز اس سودے پر راضی ہو جو سودا اس نے اللہ تعالیٰ سے کیا ہے۔

ارشادِ خداوندی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۱)	بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال خرید لیے کہ اس کے بدلے میں ان کے لیے جنت ہے۔

اور بیچنے والا لازماً مبیع (جس چیز کا سودا ہوا) سے اعراض کرتا اور دل سے اس کی محبت کو نکال باہر کرتا ہے اور جو چیز اس کے عوض لیتا ہے اس کی محبت کے لیے دل کو خالی کرلیتا ہے اور اس قسم کی حالت بعض حالات میں دل پر غالب آجاتی ہے لیکن اس حالت میں رُوح پرواز نہیں کرتی پس لڑائی کی صف اسی حالت میں روح کے نکلنے کا سبب ہے۔

یہ اس شخص کے بارے میں ہے غلبہ، غنیمت اور بہادری کی شہرت کا قصد نہ کرے جس کی یہ حالت ہو اگرچہ وہ میدان جنگ میں قتل ہوجائے وہ اس قسم کے مرتبہ سے بعید ہے جیسا کہ اس پر احادیث دلالت کرتی ہیں۔ (۲)

برے خاتمے سے حفاظت:

جب تمہارے سامنے برے خاتمے کا معنی واضح ہوگیا اور اس میں جس بات کا خوف ہے وہ بھی معلوم ہوگئی تو تمہیں اچھے خاتمے کی تیاری میں مشغول ہونا چاہیے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو اپنے دل سے دنیا کی محبت نکال دو گناہوں سے اپنے اعضاء کی حفاظت کرو اور دل کو بھی اس قسم کی سوچ سے محفوظ رکھو اور جس قدر ممکن ہو گناہوں کو دیکھنے اور گنہگاروں کے مشاہدے سے بچو یہ بات بھی دل پر اثر انداز ہوتی ہے اور تمہارا فکر اور خیال اس طرف پھر سکتا ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ توبہ آیت ۱۱۱

(۲) صحیح بخاری، جلد اول ص ۳۹۴ کتاب الجہاد

اس کام کو آئندہ پر نہ ٹال اور یوں نہ کہنا کہ عنقریب جب خاتمے کا وقت آئے گا تو میں اس کے لیے تیاری کر لوں گا کیوں کہ تمہارا ہر سانس تمہارا خاتمہ ہے کیوں کہ ہو سکتا ہے اسی سانس میں تمہاری رُوح نکال لی جائے۔

لہذا ہر لحظہ دل کی نگرانی کرو اور اسے بیکار نہ چھوڑو ہو سکتا ہے وہ لحظہ تمہارے خاتمے کا ہو کیوں کہ ممکن ہے اس میں تمہاری رُوح پرواز کر جائے یہ تو بیداری کی حالت میں ہے جہاں تک نیند کا تعلق ہے تو تمہیں ظاہری اور باطنی طہارت کے بغیر سونے سے پرہیز کرنا چاہیئے اور نیند کا غلبہ اس وقت ہو جب دل پر اللہ تعالیٰ کے ذکر کا غلبہ ہو اور اس سے ہماری مراد زبانی ذکر نہیں کیوں کہ محض زبان کی حرکت کمزور اثر رکھتی ہے اور یہ بات جان لو کہ نیند کے وقت تمہارے دل پر وہی بات غالب ہو گی جو پہلے غالب تھی اور نیند کے اندر بھی وہی بات غالب ہو گی جو نیند سے پہلے غالب تھی اور جاگتے وقت بھی وہی بات غالب ہو گی جو نیند کی حالت میں تھی۔

موت اور قیامت کے دن اٹھنا سونے اور بیداری کی طرح ہیں جس طرح بندہ انہی خیالات پر سوتا ہے جو بیداری کی حالت میں اس پر غالب تھے اور انہی خیالات پر بیدار ہوتا ہے جو نیند کی حالت میں تھے اسی طرح بندہ اسی حالت پر مرتا ہے جو زندگی کی حالت میں تھی اور جس پر وہ فوت ہوا اسی پر اٹھے گا۔

- اور تمہیں قطعی طور پر یہ بات جاننا چاہیئے کہ موت اور اس کے بعد اٹھنا تمہاری دو حالتیں ہیں جس طرح نیند اور بیداری تیرے احوال میں سے دو حالتیں ہیں دل کے اعتقاد کے ساتھ اس بات کا یقین کرو اگر عین الیقین اور نُورِ بصیرت کے ساتھ اس بات کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔

نیز اپنے سانسوں اور لحظوں کی حفاظت و نگرانی کرو اور پلک جھپکنے کے برابر بھی اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو کیوں کہ یہ راہ اختیار کرنے کے باوجود بھی بہت بڑا خطرہ ہے اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو کیا حالت ہو گی؟ اور تمام لوگ ہلاک ہونے والے ہیں سوائے علماء کے اور علماء بھی وہ محفوظ رہیں گے جو عمل کرنے والے ہیں اور عمل کرنے والوں میں سے بھی صرف مخلص لوگ ہی ہلاکت سے محفوظ رہیں گے اور مخلص لوگوں کو بھی بہت بڑا خطرہ ہے۔

اور جان لو کہ تمہیں یہ بات اسی وقت میسر آسکتی ہے جب تم ضرورت کے مطابق دنیا پر قناعت کرو اور تمہاری ضرورت کھانا، لباس اور رہائش ہے باقی سب زائد ہے اور کھانے میں سے بھی ضرورت صرف اتنی ہے کہ تمہاری پیٹھ سیدھی رہے اور جان بچی رہے لہذا تمہارا کھانا ایسا ہونا چاہیے جیسے وہ شخص کھاتا ہے جو اس کے لیے مجبور ہو اور کھانے کی خواہش قضائے حاجت کی خواہش سے زیادہ نہ ہو کیوں کہ پیٹ میں کھانا داخل کرنے اور اسے نکالنے میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں فطری ضرورتیں ہیں۔ اور جس طرح قضائے حاجت کی طرف اس طرح توجہ نہیں ہوتی جو دل کو اسی میں مشغول کر دے اسی طرح کھانا کھانے میں دل نہیں لگانا چاہیئے اور جان لو کہ اگر تمہاری توجہ اس چیز کی طرف ہو جسے تم اپنے پیٹ میں داخل کرتے ہو تو تمہاری قیمت وہی ہو گی جو تمہارے پیٹ سے نکلتا ہے۔

اور جب کھانا کھانے سے مقصود اللہ تعالیٰ کی عبادت پر قوت حاصل کرنا ہو جس طرح قضائے حاجت سے یہی مقصود ہے تو اس کی علامت تین چیزیں ہیں کھانے کا وقت کھانے کی مقدار اور کھانے کی جنس۔

کھانے کے وقت کے سلسلے کم از کم جس پر اکتفا کیا جا سکتا ہے وہ دن رات میں ایک مرتبہ کھانا ہے لہٰذا ہمیشہ روزے سے رہے۔ اور کھانے کی مقدار یہ ہے کہ پیٹ کے تہائی حصے سے زیادہ نہ ہو اور جنسِ غذا کے سلسلے میں اس بات کو پیش نظر رکھے کہ لذیذ کھانے تلاش نہ کرے بلکہ جیسا کھانا مل جائے اسی پر قناعت کرے اگر تم ان تین باتوں پر قادر ہو جاؤ اور تم سے لذیذ کھانوں کی خواہشات کی مشقت ساقط ہو جائے تو اس کے بعد تم شبہات کو چھوڑنے پر قادر ہو جاؤ گے اور تمہارے لیے ممکن ہوگا کہ حلال سے ہی کھاؤ کیوں کہ حلال کم ملتا ہے اور خواہشات کی تکمیل بھی نہیں کرتا۔

جہاں تک لباس کا تعلق ہے تو اس سے غرض یہ ہونی چاہیئے کہ گرمی سردی کو دُور کیا جائے اور ستر ڈھانپا جائے پس جو چیز تم سے سردی کو دور کرے چاہے ایک دمڑی (معمولی رقم) کی ٹوپی ہی کیوں نہ ہو تو اس کے علاوہ کی طلب فضول ہے اور وقت کا ضیاع ہے اس طرح تم ہمیشہ مشغول ہو جاؤ گے اور ایک مرتبہ اس کے حصول کے لیے کمانے کی مشقت برداشت کرو گے پھر طمع پیدا ہوگی حرام سے ملے یا شبہات سے اس کی کوئی پرواہ نہ ہوگی جس چیز سے تم گرمی اور سردی کو اپنے بدن سے دور کر سکتے ہو ان سب کو اسی ایک بات پر قیاس کر لو۔

اب وہ چیز جس سے لباس کا مقصود حاصل ہو جاتا ہے اگر تم اس کے کم قیمت یا معمولی جنس سے ہونے کی وجہ سے اس پر اکتفا نہ کرو تو تمہارے لیے ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا بلکہ تم ان لوگوں میں سے ہو گے جن کے پیٹ کو صرف مٹی ہی بھر سکتی ہے۔

رہائش کی صورت بھی یہی ہے اگر تم مقصود پر اکتفا کرو تو چھت کے طور پر آسمان اور بچھونے کے طور پر زمین تمہارے لیے کافی ہے اگر تم پر سردی یا گرمی کا غلبہ ہو جائے تو مساجد میں چلے جاؤ اور اگر تم خاص قسم کی رہائش کے طالب ہو تو بات لمبی ہو جائے گی اور تمہاری زندگی کا اکثر وقت اسی میں صرف ہوگا اور یہ زندگی ہی تمہارا سرمایہ ہے پھر اگر تمہیں یہ میسر آ جائے اور تم اس دیوار سے زیادہ بناؤ جو تمہارے اور لوگوں کے درمیان پردے کے لیے کافی ہے اور چھت جو بارش سے بچاتی ہے اس سے بھی تجاوز کرو اور دیواریں بلند کر کے چھتوں کو بھی مزین کرنے لگو تو ایسے گڑھے میں گرو گے جس سے نکلنا مشکل ہوگا۔

اپنی تمام ضروریات کو اسی طرح دیکھو اگر تم ضرورت پر اکتفا کرو گے تو اللہ تعالیٰ کے لیے فراغت حاصل ہو جائے گی اور آخرت کے لیے زادِ راہ لینے پر قادر ہو جاؤ گے اسی طرح اچھے خاتمے کی تیاری بھی ہو جائے گی اور اگر تم ضرورت کی حد سے تجاوز کر کے خواہشات کی وادیوں میں بھٹکتے پھرو گے تو تمہارے مقاصد پراگندہ ہو جائیں گے (بکھر جائیں گے) اور اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی پرواہ نہ ہوگی کہ وہ تمہیں کہاں ہلاک کرتا ہے پس تم اس شخص سے یہ نصیحت قبول کرو جو اس نصیحت کا تم سے زیادہ محتاج ہے۔

یاد رہے کہ تدبیر اور زادِ راہ کے حصول اور احتیاط کے لیے یہی چھوٹی سی زندگی ہے اگر تم اس کو غفلت میں روز بروز ٹال مٹول میں گزار دو گے تو تمہیں اچانک اُچک لیا جائے گا حالانکہ اس وقت تمہارا ارادہ نہیں ہوگا اور حسرت و ندامت تمہارا پیچھا

نہیں چھوڑے گی پس اگر تم خوف کی کمزوری کے باعث اس بات کو اختیار نہ کرو جس کی طرف ہم نے تمہاری راہنمائی کی ہے اور اچھے خاتمہ کے سلسلے میں ہم نے جو کچھ ذکر کیا تخویف کے سلسلے میں وہ تمہیں کافی نہ ہو تو خوف کھانے والے حضرات کا ذکر کرتے ہیں ہمیں امید ہے کہ اس سے تمہارے دل کی سختی زائل ہو گی کیوں کہ یہ بات تمہارے نزدیک بھی ثابت ہے کہ انبیاء کرام، اولیاء عظام اور علماء کرام کی عقل، عمل اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا مقام و مرتبہ تمہاری عقل، عمل اور مقام سے کم نہیں تھا تو ان کے احوال کو نہ دیکھ سکنے اور ان سے دل کے اندھا پن کے باوجود یہ تو سوچو کہ وہ لوگ بہت زیادہ خوف کیوں کھاتے تھے اور ان کا رونا اور غم کیوں کر زیادہ تھا حتیٰ کہ بعض چیخیں مارتے اور بعض بیہوش ہو جاتے اور بعض غش کھا کر گر پڑتے بلکہ بعض تو مر کر زمین پر گر جاتے اگر ان کے حالات بھی تمہارے دل پر اثر انداز نہ ہوں تو تعجب کی بات نہیں کیوں کہ غافل لوگوں کے دل پتھروں کی طرح ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت ہیں کیوں کہ بعض پتھروں سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور ان میں سے بعض پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکل جاتا ہے اور کچھ پتھر اللہ تعالیٰ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔

فصل ۸:

خوف کے سلسلے میں انبیاء کرام اور فرشتوں کے احوال

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب ہوا میں تبدیلی ہوتی اور سخت آندھی چلتی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کا رنگ متغیر ہو جاتا چنانچہ آپ کھڑے ہو جاتے اور حجرۂ مبارکہ میں چکر لگاتے کبھی اندر جاتے کبھی باہر تشریف لاتے (۱) یہ سب کچھ خوفِ خداوندی کی وجہ سے تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ واقعہ کی ایک آیت تلاوت فرمائی تو بیہوش ہو گئے (۲)

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا۔ (۳) اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو کر گر پڑے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابطح مقام پر حضرت جبریل علیہ السلام کی صورت دیکھی تو بیہوش ہو گئے۔ (۴)

ایک روایت میں ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع فرماتے تو آپ کا سینہ مبارکہ ہنڈیا کی طرح جوش

(۱) صحیح مسلم جلد اول ص ۲۹۴ کتاب صلوٰۃ الاستسقاء

(۲) شعب الایمان جلد اول ص ۵۲۲، حدیث ۹۱۷

(۳) قرآن مجید، سورۂ اعراف آیت ۱۴۳

(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۳۲۲ مرویات ابن عباس

مارنا تھا۔ (۱)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَاجَاءَنِیْ جِبْرِیْلُ قَطُّ اِلَّا وَھُوَ یَرْعَدُ فَرَقًا مِنَ الْجَبَّارِ۔ (۲)

حضرت جبریل علیہ السلام میرے پاس جب بھی آئے اللہ جبار کے خوف کی وجہ سے کانپ رہے ہوتے۔

کہا گیا کہ جب ابلیس پر ظاہر ہوا جو کچھ ظاہر ہوا (یعنی وہ مردود ہوا) تو حضرت جبریل اور حضرت میکائیل علیہما السلام رونے لگے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی طرف وحی بھیجی کہ تم دونوں کیوں روتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا اے رب! ہم تیری خفیہ تدبیر سے بے خوف نہیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تم اسی طرح رہنا میری خفیہ تدبیر سے بے خوف نہ ہونا۔

حضرت محمد بن منکدر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں جب آگ کو پیدا کیا گیا تو فرشتوں کے دل اپنی جگہ سے اڑنے لگے پھر جب انسانوں کو پیدا کیا گیا تو واپس آگئے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام سے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے میں حضرت میکائیل علیہ السلام کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھتا؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے جواب دیا جب سے جہنم کو پیدا کیا گیا حضرت میکائیل علیہ السلام نہیں ہنسے۔ (۳)

کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ ایسے فرشتے ہیں کہ جب سے جہنم کو پیدا کیا گیا ان میں سے کوئی بھی اس ڈر سے نہیں ہنسا کہ کہیں اللہ تعالیٰ کو ان پر غصہ نہ آئے پس وہ ان کو جہنم میں عذاب دے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ باہر نکلا حتیٰ کہ آپ انصار کے ایک باغ میں تشریف لے گئے اور کھجوریں اتار اتار کر کھانے لگے آپ نے فرمایا اے ابن عمر! کیا بات ہے تم نہیں کھاتے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے طلب نہیں آپ نے فرمایا مجھے تو خواہش ہے اور یہ چوتھی صبح ہے کہ میں نے کھانا نہیں چکھا اور نہ ہی میں نے کھانا پایا اور اگر میں اپنے رب سے سوال کرتا تو وہ مجھے قیصر و کسریٰ کی حکومت عطا فرماتا تو ابن عمر! کیسے ہوگا جب تم ایسی قوم میں رہو گے جو ایک سال کا رزق پسند کرتے ہیں اور ان کے دلوں میں یقین کمزور ہے حضرت ابن عمر فرماتے ہیں اللہ کی قسم نہ ہم وہاں سے ہٹے اور نہ ہی کھڑے ہوئے حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی۔

وَکَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّۃٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَھَا اور کتنے ہی چارپائے ہیں کہ ہم ان کو رزق نہیں دیتے

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۲۵ مرویات عبداللہ بن شخیر

(۲)

(۳) مجمع الزوائد جلد ۱۰ ص ۳۸۵ کتاب صفتہ النار

اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ (۱) اللہ تعالیٰ ان کو بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی اور وہی سننے والا جاننے والا ہے۔

فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال جمع کرنے اور خواہشات کے پیچھے چلنے کا حکم نہیں دیا جو شخص دینار جمع کرکے اس سے فانی دنیا کا ارادہ کرے تو (یاد رکھو) زندگی اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے سنو! میں دینار اور درھم جمع نہیں کرتا اور نہ ہی کل کے لیے کھانا روک رکھتا ہوں۔ (۲)

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اپنے رب سے اس قدر ڈرتے کہ ایک میل کے فاصلے سے ان کے دل سے جوش کی آواز آتی۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام چالیس دن حالتِ سجدہ میں روتے رہے آپ نے سر نہ اٹھایا حتیٰ کہ آپ کے آنسوؤں سے گھاس اُگ گیا اور یہاں تک کہ اس نے آپ کے سر کو ڈھانپا آواز دی گئی اے داؤد علیہ السلام! کیا آپ بھوکے ہیں تو آپ کو کھانا کھلایا جائے پیاسے ہیں تو پانی پلایا جائے برہنہ ہیں تو کپڑے پہنائے جائیں۔ آپ نے ایسی دھاڑ ماری کہ آپ کے خوف کی گرمی سے لکڑی جل گئی پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر توبہ اور مغفرت نازل فرمائی انہوں نے عرض کیا یا اللہ! میرے گناہ کو میری ہتھیلی میں رکھ دے تو آپ کا گناہ لکھا ہوا آپ کی ہتھیلی میں ہو گیا پس آپ جب بھی کھانے یا پینے یا کسی دوسرے کام کے لیے ہتھیلی کھولتے تو اسے دیکھ کر اس کی وجہ سے رو جاتے۔ راوی فرماتے ہیں آپ کو پانی کا پیالہ دیا جاتا تو اس کا تہائی حصہ خالی ہوتا پس جب آپ اسے پکڑتے تو اپنی لغزش کو دیکھتے تو آپ اسے ہونٹوں پر نہ رکھتے حتیٰ آنسوؤں سے پیالہ بھر جاتا۔

اور آپ کے احوال میں ہی مروی ہے کہ آپ نے وصال تک آسمان کی طرح سر نہیں اٹھایا اور آپ حیاء کی وجہ سے ایسا کرتے تھے آپ اپنی دعا میں یوں کہتے اے میرے معبود! جب مجھے اپنی لغزشیں یاد آتی ہیں تو زمین کشادگی کے باوجود مجھ پر تنگ ہو جاتی ہے اور جب میں تیری رحمت کو یاد کرتا ہوں تو روح میری طرف لوٹ آتی ہے یا اللہ! تو پاک ہے میں تیرے بندوں میں سے طبیبوں کے پاس گیا تاکہ وہ گناہ کا علاج کریں تو ان میں سے ہر ایک نے تیری طرف راہنمائی کی پس جو لوگ تیری رحمت سے مایوس ہیں ان کے لیے خرابی ہے۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ ایک دن حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنی خطا کو یاد کیا تو آپ چیختے ہوئے اور سر پر ہاتھ رکھے ہوئے کود پڑے حتیٰ کہ پہاڑوں میں تشریف لے گئے تو آپ کے گرد پرندے جمع ہوئے

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ عنکبوت آیت ۶۰

(۲) المطالب العالیۃ جلد ۳ ص ۱۵۹، ۱۶۰ حدیث ۳۱۴۰

آپ نے فرمایا جاؤ مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہیں تو اس کو چاہتا ہوں جو اپنی خطا پر روئے اور میرے سامنے روتا ہوا آئے اور جو خطا کار نہیں اس کو داؤد خطا وار سے کیا کام ہے جب آپ کو زیادہ رونے سے روکا جاتا تو آپ فرماتے مجھے رونے دو اس سے پہلے کہ رونے کا دن چلا جائے، ہڈیاں جل جائیں اور انتیں بھڑک اٹھیں اور اس سے پہلے کہ سخت قسم کے فرشتوں کو میرے بارے میں حکم دیا جائے وہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے اور جس بات کا ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں۔

حضرت عبدالعزیز بن عمر فرماتے ہیں جب حضرت داؤد علیہ السلام سے خطا واقع ہوئی تو ان کی آواز میں کمی آگئی آپ نے عرض کیا یا اللہ! صدیقین کی آواز صاف ہے اور میری آواز میں خرابی پیدا ہوگئی۔

اور مروی ہے کہ جب آپ کا رونا زیادہ ہوگیا اور اس سے آپ کو فائدہ نہ ہوا تو آپ نے دل میں تنگی محسوس کی اور غم زیادہ ہوگیا۔ آپ نے عرض کیا اے میرے رب کیا تجھے میرے رونے پہ رحم نہیں آتا؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی بھیجی فرمایا اے داؤد! آپ اپنی خطا کو بھول گئے اور آپ کو رونا یاد ہے آپ نے عرض کیا اے میرے مولا! اے میرے سردار! میں اپنی خطا کو کیسے بھول سکتا ہوں جب کہ میری حالت تو یہ تھی کہ جب میں تورات پڑھتا تو جاری پانی رُک جاتا اور ہوا کا چلنا ٹھہر جاتا، پرندے میرے سر پہ سایہ کرتے وحشی جانور میرے محراب میں مجھ سے مانوس ہوتے یا اللہ! یہ کیسی وحشت ہے جو میرے اور تیرے درمیان حائل ہے؟ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ اے داؤد علیہ السلام! وہ فرمانبرداری کا اُنس تھا اور یہ نافرمانی کی وحشت ہے۔

اے داؤد علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام میری مخلوق میں سے تھے میں نے ان کو اپنے دست قدرت سے پیدا کیا اور ان میں اپنی رُوح پھونکی اپنے فرشتوں سے ان کو سجدہ کروایا اور ان کو اپنی کرامت وعزت کا لباس پہنایا ان کو اپنے وقار کا تاج پہنایا انہوں نے تنہائی کی شکایت کی تو میں نے حضرت حوا کو ان کے نکاح میں دیا جو میری باندی ہیں ان کو اپنی جنت میں ٹھہرایا، لیکن انہوں نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی تو میں نے ان کو برہنہ کرکے اپنے قرب سے دُور کر دیا اے داؤد! مجھ سے سنو اور میں سچ ہی کہتا ہوں آپ نے میری بات مانی تو میں نے آپ کی بات مانی آپ نے مجھ سے سوال کیا تو میں نے آپ کو عطا کیا آپ سے لغزش ہوئی تو میں نے آپ کو مہلت دی اگر آپ ہماری طرف رجوع کریں گے تو ہم قبول کریں گے۔

حضرت یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت داؤد علیہ السلام جب نوحہ کرنا چاہتے تو اس سے پہلے سات دن ٹھہرتے نہ کھانا کھاتے نہ پانی پیتے اور نہ عورتوں کے قریب جاتے جب ایک دن رہتا تو ان کے لیے ایک منبر جنگل میں لایا جاتا پھر آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکم دیتے کہ وہ بلند آواز سے شہروں اور اردگرد والوں کو آواز دیں، تالابوں، ٹیلوں پہاڑوں، جنگلوں، یہود و نصاریٰ کی عبادت گاہوں میں اعلان کریں چنانچہ ندا دی جاتی کہ سنو! جو شخص حضرت داؤد علیہ السلام کا نوحہ سننا چاہے وہ آئے فرماتے ہیں صحراؤں اور ٹیلوں سے وحشی آتے جنگلوں سے درندے اور پہاڑوں سے کیڑے مکوڑے، گھونسلوں سے

پرندے آتے نیز کنواری عورتیں اپنے پردوں سے نکل آتیں اور اس دن تمام لوگ جمع ہوتے حضرت داؤد علیہ السلام تشریف لاکر منبر پر چڑھ جاتے اور بنی اسرائیل آپ کے ارد گرد ہوتے ہر قسم علیحدہ آپ کو گھیرے ہوئی حضرت سلیمان علیہ السلام آپ کے سر کے پاس کھڑے ہوتے چنانچہ آپ اپنے رب کی ثنا سے شروع کرتے اور لوگ چیخیں مارتے اور دھاڑیں مار مار کر روتے پھر آپ جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے تو کیڑے مکوڑے اور کچھ وحشی، درندے اور انسان مر جاتے پھر قیامت کے ہولناک منظر کا ذکر کرتے اور اپنے اوپر نوحہ کا بیان کرتے تو ہر قسم کے جانوروں میں سے ایک جماعت مر جاتی پس جب حضرت سلیمان علیہ السلام مرنے والوں کی کثرت دیکھتے تو عرض کرتے ابا جان! آپ نے سننے والوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بنی اسرائیل میں سے بہت سے لوگ مر گئے نیز وحشی جانور اور زمین کے اندر رہنے والے جانور (اور کیڑے مکوڑے) مر گئے پس آپ دعا شروع کرتے۔

آپ دعا ہی میں ہوتے کہ بنی اسرائیل کے بعض عبادت گزار پکارتے اے داؤد علیہ السلام! آپ نے اپنے رب سے جزا طلب کرنے میں جلدی کی یہ سن کر آپ بیہوش ہو کر گر پڑتے جب حضرت سلیمان یہ صورت حال دیکھتے تو ایک چارپائی لاکر آپ کو اس پر اٹھا لیتے پھر ایک ندا دینے والے کو حکم دیتے کہ وہ یوں پکارے سنو! حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ جس کا کوئی دوست اور قریبی تھا وہ چارپائی لاکر اس کو اٹھا لے کیوں کہ جو لوگ آپ کے ساتھ تھے ان کو جنت اور دوزخ کے ذکر نے ہلاک کر دیا ہے۔

تو ایک عورت چارپائی لاتی اور اپنے قریبی کو اٹھا کر لے جاتی اور کہتی اے وہ شخص جو جہنم کے ذکر سے مر گیا اے وہ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہلاک ہوا پھر جب حضرت داؤد علیہ السلام کو افاقہ ہوتا اور آپ اپنا دست مبارک اپنے سر پر رکھتے اور اپنی عبادت گاہ میں داخل ہو کر اسے بند کر دیتے اور عرض کرتے اے داؤد کے معبود! کیا تو داؤد پر غضبناک ہے اور اپنے رب سے مسلسل مناجات کرتے پھر حضرت سلیمان علیہ السلام تشریف لاکر دروازے پر بیٹھ جاتے اور اندر جانے کی اجازت طلب کرتے پھر اندر داخل ہوتے اور آپ کے ساتھ جَو کی ایک روٹی ہوتی آپ عرض کرتے ابا جان! اس روٹی کے ذریعے طاقت حاصل کیجئے چنانچہ آپ اس سے جس قدر اللہ تعالیٰ چاہتا، تناول فرماتے پھر باہر نکل کر بنی اسرائیل کے درمیان موجود رہتے۔

حضرت یزید رقاشی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک دن حضرت داؤد علیہ السلام لوگوں کو وعظ کرنے اور ان کو ڈرانے کے لیے باہر تشریف لائے تو آپ چالیس ہزار افراد کے ساتھ تھے پھر ان میں سے تیس ہزار مر گئے اور دس ہزار آپ کے ساتھ واپس آئے فرماتے ہیں آپ کی دو لونڈیاں تھیں یہاں تک کہ جب آپ پر خوف کی حالت طاری ہوتی اور آپ گر کر تڑپنے لگتے تو وہ دونوں آپ کے سینے اور پاؤں پر بیٹھ جاتیں تاکہ آپ کے اعضاء اور جوڑ بکھر کر آپ کا انتقال نہ ہو جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اس وقت

آپ کی عمر آٹھ سال تھی۔ آپ نے عابدین کو دیکھا تو انہوں نے بالوں اور اُون سے بنے ہوئے کپڑے پہن رکھے تھے اور مجتہدین کو دیکھا تو انہوں نے گلے کی ہڈیاں پھاڑ کر ان میں زنجیریں ڈال رکھی تھیں اور اپنے آپ کو بیت المقدس کے اطراف میں باندھ رکھا تھا ان کو دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے

آپ اپنے والد ماجد کی طرف لوٹ آئے پھر کچھ بچوں کے پاس سے گزرے جو کھیل رہے تھے انہوں نے کہا اے یحیٰی علیہ السلام! آئیے ہمارے ساتھ کھیلئے۔ آپ نے فرمایا مجھے کھیلنے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا۔ راوی کہتے ہیں پھر آپ اپنے والدین کے پاس تشریف لائے اور ان سے کہا کہ وہ ان کو جانوروں کے بالوں سے بنا ہوا لباس پہنائیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا پھر آپ بیت المقدس کی طرف لوٹے دن کو ان کی خدمت کرتے اور رات بھر وہاں ہی رہتے حتیٰ کہ پندرہ سال گزر گئے آپ وہاں سے نکلے اور پہاڑوں اور گھاٹیوں کے غاروں کو ٹھکانہ بنا لیا آپ کے والدین آپ کی تلاش میں نکلے تو آپ کو بحیرہ اردن کے کنارے پایا آپ نے اپنے پاؤں پانی میں تر کر رکھے تھے حتیٰ کہ قریب تھا آپ پیاس سے ہلاک ہو جاتے اور آپ فرما رہے تھے یا اللہ! تیری عزت و جلال کی قسم میں اس وقت تک ٹھنڈا پانی نہیں پیئوں گا جب تک مجھے معلوم نہ ہو جائے کہ تیرے ہاں میرا کیا مقام ہے؟ آپ کے والدین نے فرمایا کہ جَو کی اس روٹی سے روزہ افطار کیجئے جو ان دونوں کے پاس تھی اور یہ پانی بھی پی لیں قسم کا کفارہ ادا کر دینا انہوں نے بات مان لی چنانچہ آپ کے والدین آپ کو دوبارہ بیت المقدس لے آئے۔

آپ جب نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو روتے حتیٰ کہ آپ کے ساتھ درخت اور ڈھیلے بھی رونے لگتے اور آپ کے رونے پر حضرت زکریا علیہ السلام بھی روتے حتیٰ کہ آپ بیہوش ہو جاتے آپ مسلسل روتے رہتے حتیٰ کہ آنسوؤں نے آپ کے رخسار کے گوشت کو پھاڑ دیا اور دیکھنے والوں کو آپ کی داڑھیں نظر آنے لگیں آپ کی والدہ نے فرمایا اگر تم کہو تو میں کوئی ایسی چیز بناؤں جس کی وجہ سے آپ کی داڑھیں لوگوں کو نظر نہ آئیں؟ آپ نے اجازت دے دی حتیٰ کہ انہوں نے نمدے کے ایک ٹکڑے کو دوہرا کر کے آپ کی گالوں پر چپٹا دیا آپ نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو روتے اور جب وہ نمدے آنسوؤں سے بھیگ جاتے تو آپ کی والدہ آکر ان کو نچوڑتیں جب آپ اپنے آنسوؤں کو والدہ کے بازو پر جاری ہوتے ہوئے دیکھتے تو بارگاہ خداوندی میں عرض کرتے یا اللہ! یہ میرے آنسو ہیں اور یہ میری ماں ہیں اور میں تیرا بندہ ہوں اور تو سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔

ایک دن حضرت زکریا علیہ السلام نے ان سے فرمایا اے بیٹے! میں نے تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی تھی کہ وہ تجھے میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنائے حضرت یحیٰی علیہ السلام نے عرض کیا ابا جان! حضرت جبریل علیہ السلام نے مجھے بتایا ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک جنگل ہے اسے وہی طے کر سکتا ہے جو بہت رونے والا ہو۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا بیٹے! روؤ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے حواریوں کے گروہ! اللہ تعالیٰ کا خوف اور جنت الفردوس کی محبت مشقت پر صبر کو پیدا کرتے ہیں اور دنیا سے دور رکھتے ہیں میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو کی روٹی کھانا اور خس و خاشاک پر کتوں کے ساتھ سو جانا جنت الفردوس کی طلب میں بہت تھوڑی بات ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام اپنی خطاؤں کو یاد کرتے تو آپ پر غشی طاری ہو جاتی اور آپ کے دل کا اضطراب کئی میلوں تک سنا جاتا حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے پاس حاضر ہو کر عرض کرتے آپ کو آپ کا رب سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کیا آپ نے دیکھا ایک خلیل اپنے خلیل سے ڈرتا ہے انہوں نے فرمایا اے جبریل! جب میں اپنی خطا کو یاد کرتا ہوں تو اپنا خلیل ہونا بھول جاتا ہوں۔

تو یہ انبیاء کرام علیہم السلام کے احوال ہیں ان کو پیش نظر رکھیں اور خوب غور کریں یہ لوگ باقی مخلوق کی نسبت اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات کو زیادہ جاننے والے تھے ان سب پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو اور اللہ تعالیٰ کے تمام مقرب بندوں پر بھی، اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

فصل ۹

شدت خوف کے سلسلے میں صحابہ کرام، تابعین اور اولیاء کرام کے حالات

ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک پرندے سے فرمایا اے پرندے! کاش میں تمہاری طرح ہوتا اور مجھے انسان نہ بنایا جاتا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ میں ایک درخت ہوتا جسے کاٹا جاتا حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح فرمایا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ مجھے مرنے کے بعد اٹھایا نہ جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا میں چاہتی ہوں کہ میں بھولی بسری ہو جاؤں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب قرآن پاک کی کوئی آیت سنتے تو خوف کی وجہ سے بیہوش ہو کر گر پڑتے اور کئی دنوں تک ان کی عیادت ہوتی ایک دن آپ نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور فرمایا کاش میں یہ تنکا ہوتا کاش میرا ذکر نہ ہوتا کاش مجھے بھلا دیا گیا ہوتا کاش مجھے میری ماں جنم نہ دیتی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چہرے پر آنسو کی دو سیاہ لکیریں تھیں آپ فرماتے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہ اپنا غصہ نہیں نکالتا اور جو اللہ تعالیٰ کے ہاں تقویٰ اختیار کرتا ہے وہ من مرضی نہیں کرتا اور اگر قیامت نہ ہوتی تو ہم کچھ اور ہی دیکھتے۔

اور جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی۔

اِذَا الشَّمۡسُ كُوِّرَتۡ (۱) جب دھوپ لپیٹی جائے گی۔

یعنی سورۂ تکویر پڑھتے ہوئے اس کی آیت۔

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتۡ (۲) اور جب نامۂ اعمال کھولے جائیں گے۔

تک پہنچے تو بیہوش ہو کر گر پڑے۔

ایک دن آپ آدمی کے مکان سے گزرے وہ نماز میں سورۂ "الطور" پڑھ رہا تھا آپ کھڑے ہو کر سنتے رہے جب وہ اس آیت پر پہنچا۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ مَا لَهٗ مِنۡ دَافِعٍ۔ (۳) بے شک تمہارے رب کا عذاب واقع ہونے والا ہے اسے کوئی چیز دور نہیں کر سکتی۔

تو آپ اپنے دراز گوش سے اتر پڑے اور دیوار سے ٹیک لگا کر دیر تک کھڑے رہے پھر گھر واپس لوٹے تو ایک مہینہ بیمار رہے لوگ آپ کی عبادت کرتے لیکن پتہ نہ چلا کہ بیماری کیا ہے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے نماز فجر سے سلام پھیرا اس وقت آپ کو کوئی رنج تھا آپ اپنا ہاتھ الٹ پلٹ کر رہے تھے آپ نے فرمایا میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو دیکھا ہے لیکن آج ان جیسا کوئی نظر نہیں آتا وہ اس حال میں صبح کرتے کہ بال بکھرے ہوتے رنگ زرد ہوتا اور چہرے پر گرد و غبار ہوتا ان کی آنکھوں کے درمیان جگہ بکریوں کی رانوں کی طرح ہوتی ان کی رات اللہ تعالیٰ کے لیے سجدے اور قیام میں گزرتی اور وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے وہ اپنی پیشانی اور پاؤں پر باری باری زور ڈالتے صبح ہوتی تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح کانپتے جس طرح ہوا کے ساتھ درخت ہلتا ہے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہتے حتیٰ کہ ان کے کپڑے تر ہو جاتے اللہ کی قسم! میں گویا ایسی قوم کے ساتھ ہوں جو غفلت میں رات گزارتے ہیں پھر آپ کھڑے ہوئے اور اس کے بعد آپ کو ہنستے ہوئے دیکھا نہیں گیا حتیٰ کہ ابن ملجم نے آپ کو شہید کر دیا۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں چاہتا ہوں کہ راکھ بن جاؤں اور سخت آندھی کے دن ہوا میرے اجزا کو بکھیر دے۔

حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ میں مینڈھا ہوتا اور میرے گھر والے مجھے ذبح کر دیتے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ تکویر آیت ۱

(۲) قرآن مجید، سورۂ تکویر آیت ۱۰

(۳) قرآن مجید سورۂ طور آیت ۷

پھر وہ میرا گوشت کھا لیتے اور شوربا پی لیتے ـــــ حضرت علی بن حسین (حضرت امام زین العابدین) رضی اللہ عنہما جب وضو کرتے تو آپ کا رنگ زرد ہو جاتا آپ کے گھر والے پوچھتے یہ وضو کے وقت آپ کو کیا ہو جاتا ہے؟ آپ فرماتے کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں کس کے سامنے کھڑا ہونے کا ارادہ کرتا ہوں۔

حضرت موسیٰ بن مسعود رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب ہم حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کے پاس بیٹھتے تو ان کے خوف اور جزع فزع کو دیکھ کر یوں سمجھتے کہ ہمارے ارد گرد آگ ہے۔

ایک دن مضر قاری نے پڑھا۔

هَٰذَا كِتَابُنَا يَنطِقُ عَلَيْكُم بِالْحَقِّ ۔ (۱) یہ ہمارا لکھا ہوا نامۂ اعمال ہے جو تمہارے اعمال سچ بتاتا ہے

(یہ سن کر) حضرت عبدالواحد بن زید رحمہ اللہ رو پڑے حتیٰ کہ ان پر بیہوشی طاری ہو گئی جب ان کو افاقہ ہوا تو بارگاہ خداوندی میں عرض کیا اے اللہ! تیری عزت کی قسم! جس قدر ممکن ہوا تیری نافرمانی سے بچوں گا پس تو اپنی توفیق سے اپنی عبادت پر میری مدد فرما۔

حضرت مسور بن مخرمہ رحمہ اللہ شدتِ خوف کی وجہ سے قرآن پاک میں سے کچھ سننے پر قادر نہ ہوتے ان کے پاس کوئی ایک حرف یا آیت پڑھی جاتی تو وہ ایک چیخ مارتے تو کئی دن تک ان کو ہوش نہ آتا حتیٰ کہ قبیلہ خثعم کا ایک شخص ان کے پاس آیا اور اس نے پڑھا۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا ۝ وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا ۔ (۲)

جس دن ہم متقی لوگوں کو رحمٰن کی طرف مہمان بنا کر لے جائیں گے اور مجرموں کو جہنم کی طرف ہانک کر لے جائیں گے۔

آپ نے فرمایا میں مجرموں میں سے ہوں اور متقی لوگوں میں سے نہیں ہوں اے قاری! دوبارہ پڑھو اس نے دوبارہ پڑھا تو آپ نے ایک نعرہ مارا اور روح پرواز کر گئی۔ حضرت یحییٰ بکاء (بہت رونے والے) کے سامنے پڑھا گیا۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَىٰ رَبِّهِمْ ۔ (۳) اور اگر تم دیکھو جب ان کو ان کے رب کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔

تو انہوں نے ایک چیخ ماری کہ اس سے چار مہینے تک بیمار رہے بصرہ کے اطراف سے لوگ ان کی عیادت کرتے۔

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں بیت اللہ شریف کا طواف کر رہا تھا کہ میں نے ایک عبادت گزار لونڈی کو

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ جاثیہ آیت ۲۹
(۲) قرآن مجید، سورۃ مریم آیت ۸۵، ۸۶
(۳) قرآن مجید، سورۃ انعام آیت ۳۰

دیکھا جو کعبہ شریف کے پردوں سے لٹکی ہوئی تھی اور کہہ رہی تھی کتنی ہی خواہشات ہیں جن کی لذت چلی گئی لیکن عذاب باقی ہے اے میرے رب! کیا تیرے ہاں جہنم کے سوا کوئی اور سزا اور عذاب نہیں ہے، یہ کہہ کر وہ روتی رہی اور طلوع فجر تک وہیں کھڑی رہی حضرت مالک فرماتے ہیں جب میں نے اسے دیکھا تو میں نے اپنا ہاتھ سر پر رکھا اور چیخ ماری میں نے کہا مالک پر اس کی ماں روئے (یعنی ہمارا کیا حال ہوگا)

روایت کیا گیا کہ عرفہ کے دن لوگ دعا مانگ رہے تھے اور حضرت فضیل رحمہ اللہ گمشدہ بچے کی دل جلی ماں کی طرح رو رہے تھے جب سورج غروب ہونے لگا تو آپ نے اپنی داڑھی کو پکڑا پھر آسمان کی طرف سر اٹھایا اور فرمایا اگر تو مجھے بخش بھی دے تب بھی مجھے تجھ سے بڑی حیا آتی ہے پھر لوگوں کے ساتھ واپس تشریف لے گئے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ڈرنے والے لوگوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا ان کے دل خوف کی وجہ سے زخمی ہوتے ہیں اور آنکھیں روتی ہیں وہ کہتے ہیں ہم کیسے خوش ہوں جب کہ موت ہمارا پیچھا کر رہی ہے قبر ہمارے سامنے ہے اور قیامت کا ہم سے وعدہ کیا گیا ہے ہم نے جہنم کے اوپر سے گزرنا ہے اور اللہ جو ہمارا رب ہے اس کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ ایک جوان کے پاس سے گزرے اور وہ لوگوں کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا ہنسنے میں مشغول تھا حضرت حسن نے فرمایا اے نوجوان! کیا تو پل صراط پار کر چکا ہے؟ اس نے کہا نہیں فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ جنت میں جاؤ گے یا دوزخ میں؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا تو یہ ہنسی کیسی ہے؟ فرماتے ہیں اس کے بعد اس نوجوان کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

حضرت حماد بن عبد ربہ جب بیٹھتے تو قدموں کے بل بیٹھتے کہا گیا کہ آپ اطمینان سے کیوں نہیں بیٹھتے؟ وہ فرماتے وہ امن والوں کا بیٹھنا ہے اور میں پُر امن نہیں ہوں کیوں کہ میں گناہ گار ہوں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جو بندوں کے دلوں میں غفلت ڈالی ہے تو یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے مر نہ جائیں۔

حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ارادہ کیا کہ میں مرتے وقت لوگوں کو حکم دوں کہ وہ مجھے بیڑیاں اور طوق ڈال کر اللہ تعالیٰ کے پاس لے جائیں جس طرح بھاگے ہوئے غلام کو اس کے مالک کے پاس لے جایا جاتا ہے۔

حضرت حاتم اصم رحمہ اللہ نے فرمایا کسی اچھی جگہ کے دھوکے میں نہ آؤ کیوں کہ جنت سے بہتر کوئی جگہ نہیں لیکن حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ ہوا اسی جگہ ہوا اور نہ عبادت کی کثرت تمہیں دھوکہ دے کیوں کہ ابلیس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ایک طویل عرصہ عبادت کرنے کے بعد ہوا اور کثرت علم سے بھی دھوکہ نہ کھاؤ کیوں کہ بلعام (بلعم بن باعور) اسم اعظم اچھی طرح جانتا تھا تو دیکھو اس کا انجام کیا ہوا نیز نیک لوگوں کی زیارت بھی تمہیں دھوکہ نہ دے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا مقام کسی کا نہیں لیکن آپ کے اقارب اور دشمن آپ کی ملاقات سے فائدہ حاصل نہ کر سکے۔

حضرت سری سقطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں ایک دن میں کئی مرتبہ اپنی ناک کی طرف دیکھتا ہوں مجھے یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں میرا چہرہ سیاہ نہ ہو جائے حضرت ابو حفص رحمہ اللہ فرماتے ہیں چالیس سال سے میرے دل میں یہ اعتقاد ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے غضب کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے اور اس بات پر میرے اعمال دلالت کر رہے ہیں۔

ایک دن حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ اپنے احباب کی طرف نکلے تو فرمایا میں نے گذشتہ رات اللہ تعالیٰ پر جرات کی ہے یعنی میں نے اس سے جنت کا سوال کیا ہے۔

حضرت محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ کی والدہ نے ان سے فرمایا اے بیٹے! میں تجھے بچپن میں بھی پاک جانتی تھی اور بڑا ہونے کے بعد بھی پاکیزہ ہی جانتی ہوں گویا تو نے اپنے اوپر ہلاکت خیز مسلط کر دیا ہے کیوں کہ تو دن رات عبادت کرتا ہے انہوں نے فرمایا اے ماں! اللہ تعالیٰ میرے اعمال پر مطلع ہے اور اگر میرے اعمال میں کچھ گناہ ہوئے جن پر وہ ناراض ہو گیا تو میں کس بات سے نڈر ہو جاؤں اگر اللہ تعالیٰ فرمائے کہ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم میں تجھے نہیں بخشوں گا۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں کسی نبی مرسل، مقرب فرشتے اور صالح بندے پر رشک نہیں کرتا کیا قیامت کے دن ان لوگوں پر عتاب نہ ہوگا میرے لئے قابل رشک وہ ہے جو پیدا ہی نہیں ہوا۔

ایک روایت میں ہے کہ انصار میں سے ایک نوجوان کو دوزخ کا ڈر ہوا وہ روتے رہے حتیٰ کہ گھر میں مقید ہو کر رہ گئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ان کو گلے لگایا تو وہ فوت ہو کر گر پڑے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جَهِّزُوْا صَاحِبَكُمْ فَاِنَّ الْفَرَقَ مِنَ النَّارِ فَتَّتَ كَبِدَهٗ۔ (۱)

اپنے ساتھی کے کفن دفن کا انتظام کرو جہنم کے خوف نے اس کے جگر کو ٹکڑے کر دیا ہے۔

حضرت ابن میسرہ رحمہ اللہ سے مروی ہے جب آپ بستر پر تشریف لے جاتے تو فرماتے کاش میری ماں مجھے نہ جنتی ان کی ماں نے فرمایا اے میسرہ! اللہ تعالیٰ نے تجھ سے اچھا سلوک کیا تجھے اسلام کی ہدایت دی انہوں نے فرمایا ہاں ٹھیک ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم سے بیان کیا کہ ہم جہنم میں جائیں گے اور یہ نہیں فرمایا کہ اس سے نکل جائیں گے (یعنی وارد کا لفظ ہے صادر کا نہیں) حضرت فرقد سبخی سے کہا گیا کہ ہمیں سب سے زیادہ تعجب خیز بات بتائیں جو بنی اسرائیل سے آپ تک پہنچی ہو انہوں نے فرمایا مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ بیت المقدس میں پانچ سو کنواری لڑکیاں داخل ہوئیں جن کا لباس کمبل اور ٹاٹ تھا انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ثواب اور عذاب کے بارے میں گفتگو کی تو وہ سب کی سب ایک ہی دن میں مر گئیں۔

حضرت عطاء سلمی خوف کھانے والے لوگوں میں سے تھے وہ اللہ تعالیٰ سے کبھی بھی جنت کا سوال نہ کرتے بلکہ محض عفو و درگزر کا سوال کرتے ان سے بیماری کی حالت میں کہا گیا کیا آپ کو کسی چیز کی خواہش نہیں؟ انہوں نے فرمایا جہنم کے خوف

---

(۱) المستدرک للحاکم جلد ۲ ص ۴۹۴ کتاب التفسیر

نے میرے دل میں خواہش کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی ۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے چالیس سال تک نہ تو آسمان کی طرف سر اٹھایا اور نہ ہی ہنسے ۔ ایک دن انہوں نے سر اٹھایا تو گھبرا کر گر پڑے اور ان کی آنتیں پھٹ گئیں آپ کا طریقہ تھا کہ رات کو اپنا جسم ٹٹولتے کہ کہیں مسخ تو نہیں ہو گیا اور جب کبھی آندھی چلتی یا بجلی گرتی یا غلہ مہنگا ہوتا تو وہ فرماتے میری وجہ سے لوگوں کو یہ مصیبت پہنچی ہے اگر عطاء مر جائے تو لوگوں کو سکون ملے ۔

حضرت عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم عتبہ غلام کے ہمراہ باہر نکلے ہم میں بوڑھے بھی تھے اور نوجوان بھی وہ فجر کی نماز عشاء کے وضو سے پڑھتے تھے اور طویل قیام کی وجہ سے ان کے پاؤں سوج گئے تھے اور آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں چمڑے ہڈیوں سے مل گئے تھے اور رگیں باریک تاروں کی طرح معلوم ہوتی تھیں وہ ایسے ہو گئے تھے گویا ان کے چمڑے تربوز کے چھلکے ہوں اور گویا وہ قبروں سے نکالے گئے ہیں وہ بتاتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اطاعت گزار لوگوں کو عزت بخشی اور نافرمان لوگوں کو ذلیل کیا وہ چل ہی رہے تھے کہ ان میں سے ایک ایسی جگہ سے گزرا جہاں وہ بیہوش ہو کر گر پڑا اس کے دوست اس کے گرد بیٹھ کر رونے لگے وہ دن سخت سرد تھا لیکن اس کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینہ آیا ہوا تھا انہوں نے پانی لا کر اس کے چہرے پر مارا تو اسے افاقہ ہوا انہوں نے اس سے ماجرا پوچھا تو اس نے کہا مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں نے اس جگہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تھی ۔

حضرت صالح المری رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے عبادت گزار لوگوں میں سے ایک کے پاس یہ آیت پڑھی ۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَ ۔ (۱)

جس دن آگ میں لوگوں کے چہرے بدل جائیں گے (اور) وہ کہیں گے کاش ہم اللہ تعالیٰ کا حکم مانتے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ۔

(یہ سن کر) وہ زاہد بیہوش ہو گیا اور جب افاقہ ہوا تو اس نے کہا اے صالح ! مزید پڑھئے کیوں کہ غم ہو رہا ہے پس میں نے پڑھا ۔

كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا ۔ (۲)

وہ جب بھی اس (جہنم) سے نکلنے کا ارادہ کریں گے ان کو اس میں واپس بھیج دیا جائے گا ۔

یہ آیت سن کر اس کی روح پرواز کر گئی اور وہ گر پڑا ۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت زرارہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے یہ آیت پڑھی ۔

---

(۱) قرآن مجید ، سورۃ احزاب آیت ۶۶

(۲) قرآن مجید ، سورۃ حج آیت ۲۲

فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ۔ (۱) پھر جب صور پھونکا جائے گا۔

تو وہ بیہوش ہو کر گر پڑے اور انتقال کر گئے۔

حضرت یزید رقاشی رحمہ اللہ، حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کے پاس تشریف لے گئے تو انہوں نے کہا اے یزید! مجھے کچھ نصیحت فرمائیں انہوں نے فرمایا اے امیر المومنین جان لو تم پہلے خلیفہ نہیں ہو جو مر جاؤ گے (بلکہ تم سے پہلے بھی خلفاء دنیا سے رخصت ہوئے) یہ سن کر حضرت عمر بن عبد العزیز رونے لگے پھر فرمایا مزید کچھ بتائیے انہوں نے فرمایا۔ اے امیر المومنین! حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کے درمیان آپ کے جتنے اجداد گزرے ہیں وہ سب فوت ہو گئے یہ سن کر آپ روئے پھر فرمایا مزید کچھ بتائیے انہوں نے فرمایا آپ کے اور جنت و دوزخ کے درمیان کوئی منزل نہیں ہے یہ سن کر حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔

حضرت میمون بن مہران رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ (۲) اور بے شک ان سب سے جہنم کا وعدہ ہے۔

تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے چیخ ماری اور اپنا ہاتھ، سر پر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے تین دن تک ان کا پتہ نہ چلا۔

حضرت داؤد طائی رحمہ اللہ نے ایک خاتون کو دیکھا جو اپنے بچے کی قبر کے سرہانے رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی اے میرے بچے! معلوم نہیں تیرے کس رخسار کو کیڑوں نے پہلے کھایا ہے۔ یہ سن کر حضرت داؤد طائی رحمہ اللہ نے چیخ ماری اور اسی جگہ گر پڑے کہا گیا کہ ہے کہ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ بیمار ہو گئے تو ان کا پیشاب ایک ذمی (کافر) طبیب کو دکھایا گیا تو اس نے کہا خوف نے ان کا جگر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے پھر اس نے آکر آپ کی نبض دیکھی اور کہا میں نے اسلام میں ان جیسا آدمی نہیں دیکھا۔

حضرت احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ وہ مجھ پر خوف کا ایک دروازہ کھول دے تو اس نے کھول دیا پھر مجھے اپنی عقل پر ڈر محسوس ہوا تو میں نے عرض کیا اے میرے رب! میری طاقت کے مطابق رکھنا، تو اس سے میرا دل تھم گیا۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا روؤ اگر رونا نہ آتا ہو تو رونے کی کوشش کرو پس اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم میں سے کسی کو علم ہوتا تو وہ اس قدر چیختا کہ اس کی آواز ٹوٹ جاتی اور اس طرح نماز پڑھتا کہ اس کی پیٹھ ٹوٹ جاتی گویا انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی طرف اشارہ کیا آپ نے ارشاد فرمایا۔

---

(۱) قرآن مجید سورۃ مدثر آیت ۸

(۲) قرآن مجید، سورۃ حجر آیت ۴۳

لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِیْلًا وَّ لَبَکَیْتُمْ کَثِیْرًا۔ (۱) اگر تم وہ بات جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ۔

حضرت عنبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اصحاب حدیث حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کے دروازے پر جمع ہوئے تو آپ نے روشندان سے ان کو جھانکا (تو انہوں نے دیکھا کہ) آپ رو رہے تھے اور آپ کی داڑھی مبارک ہل رہی تھی آپ نے فرمایا، تم پر قرآن پاک پڑھنا لازم اور نماز کی پابندی ضروری ہے اور یہ وقت حدیث کا نہیں یہ رونے، گڑگڑانے، عاجزی اور ڈوبنے والے کی طرح پکارنے کا وقت ہے اس زمانے میں اپنی زبان کی حفاظت کرو اپنی جگہ چھپاؤ اور دل کا علاج کرو اچھی باتوں کو اختیار کرو اور بری باتوں کو چھوڑ دو۔

ایک دن حضرت فضیل رحمہ اللہ کو دیکھا گیا کہ آپ چل رہے تھے پوچھا گیا کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا مجھے معلوم نہیں گویا وہ خوف کی حالت میں چل رہے تھے۔

حضرت ذر بن عمر نے اپنے باپ حضرت عمر بن ذر (رحمہما اللہ) سے پوچھا کیا وجہ ہے کہ دوسرے لوگ گفتگو کرتے ہیں تو کوئی بھی نہیں روتا اور جب آپ کلام فرماتے ہیں تو ہر طرف سے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے انہوں نے فرمایا جس عورت کا بچہ گم ہو جائے اس کے رونے اور اجرت لے کر رونے والی کے رونے میں فرق ہے۔

منقول ہے کہ ایک جماعت ایک عابد کے پاس کھڑی ہوئی اور وہ رو رہا تھا انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے رونے کی کیا وجہ ہے؟ اس عابد نے جواب دیا ایک زخم ہے جس کو ڈرنے والے لوگ اپنے دلوں میں پاتے ہیں پوچھا وہ کیا ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کے لیے جو ندا ہوگی۔

حضرت خواص رحمہ اللہ رو رہے تھے اور اپنی مناجات میں کہتے تھے میں بوڑھا ہوا اور میرا جسم تیری خدمت سے کمزور ہو گیا پس تو مجھے آزاد کر دے۔

حضرت صالح مری رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ حضرت ابن سماک رحمہ اللہ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا اپنے عبادت گزار ساتھیوں کے کچھ عجائبات دکھاؤ میں اسے محلے کے ایک شخص کے پاس لے گیا جو جھونپڑے میں رہتا تھا ہم نے اس سے اندر آنے کی اجازت مانگی اور اندر چلے گئے دیکھا تو ایک شخص چٹائی بنا رہا تھا میں نے اس کے سامنے آیت پڑھی۔

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْۤ اَعْنَاقِهِمْ وَ السَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ فِی الْحَمِیْمِ ثُمَّ فِی النَّارِ یُسْجَرُوْنَ۔ (۲) جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی کھولتے ہوئے پانی میں گھسیٹے جائیں گے پھر آگ میں دہکائے جائیں گے۔

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۶۵، کتاب التفسیر

(۲) قرآن مجید، سورۂ غافر آیت ۷۱

(یہ سن کر) اس شخص نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑا چنانچہ ہم اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے دوسرے کے پاس پہنچے اور یہی آیت پڑھی تو اس نے بھی چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑا ہم وہاں سے بھی چلے پڑے اور تیسرے کے پاس جانے کی اجازت طلب کی اس نے کہا تم داخل ہو سکتے بشرطیکہ ہمیں، ہمارے رب سے نہ روکو میں نے اس کے پاس یہ آیت پڑھی۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ۔ (۱) یہ اس کے لیے جو میرے حضور کھڑا ہونے سے ڈرے اور میں نے جو عذاب کا حکم سنایا ہے اس سے خوف کھائے

اس نے بھی ایک چیخ ماری تو اس کے نتھنوں سے خون نکلنے لگا اور وہ اسی خون میں تڑپنے لگا حتیٰ کہ خون خشک ہو گیا ہم اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے میں نے حضرت ابن سماک کو چھ آدمیوں کے پاس پھرایا ہم ان میں سے ہر ایک کو بیہوش چھوڑ کر آگے چلے جاتے۔ پھر میں ان کو ساتویں کے پاس لے گیا اور اس سے اجازت مانگی تو دیکھا کہ جھونپڑے میں ایک عورت ہے اس نے کہا آجاؤ چنانچہ ہم داخل ہو گئے ہم نے دیکھا ایک بوڑھا شخص مصلے پر بیٹھا ہوا ہے ہم نے اسے سلام کیا لیکن اسے ہمارے سلام کا پتہ نہ چلا میں نے بلند آواز سے کہا سنو! کل لوگوں نے ایک جگہ کھڑا ہونا ہے شیخ نے کہا کمبخت! کس کے سامنے کھڑا ہونا ہے پھر وہ حیران ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس کا منہ کھلا تھا آنکھیں کھلی رہ گئیں وہ کمزور آواز کے ساتھ اوہ، اوہ کرنے لگا حتیٰ کہ یہ آواز بھی ختم ہو گئی اس کی بیوی نے کہا نکل جاؤ تمہیں اس وقت کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

پھر اس کے بعد جب میں نے لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ تین کو افاقہ ہو گیا تھا اور تین اپنے رب سے جا ملے تھے جب کہ شیخ تین دن سے اسی طرح حیران اور خاموش کھڑا تھا حتیٰ کہ اس نے کوئی فرض نماز بھی ادا نہ کی پھر تین دن بعد اسے ہوش آیا۔

حضرت یزید بن اسود کو ابدال میں سے جانا جاتا تھا اور انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ نہ تو کبھی ہنسیں گے نہ پہلو کے بل آرام کریں گے اور نہ کبھی مرغن چیز کھائیں گے حتیٰ کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

حجاج نے حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے کہا مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ بالکل نہیں ہنستے انھوں نے فرمایا میں کیسے ہنسوں جب کہ جہنم کی آگ بھڑکائی جا چکی ہے طوق تیار کر دیئے گئے اور جہنم کے فرشتے مستعد ہیں۔

ایک شخص نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے پوچھا اے ابو سعید! آپ نے صبح کیسے کی؟ انہوں نے فرمایا اچھی طرح۔ پوچھا کیا حال ہے؟ اس پر حضرت حسن مسکرائے اور فرمایا تم میری حالت پوچھتے ہو ان لوگوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جو کشتی میں سوار ہوئے جب دریا کے درمیان پہنچے تو کشتی ٹوٹ گئی اور ان میں سے ہر ایک، ایک لکڑی کے ساتھ لٹک گیا تو وہ کس حال میں ہوگا؟ اس نے کہا سخت حالت میں ہوگا حضرت حسن رحمہ اللہ نے فرمایا میری حالت ان کی حالت سے

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ ابراہیم آیت ۱۴

بھی زیادہ سخت ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی ایک لونڈی ان کے پاس گئی اور سلام پیش کیا پھر وہ گھر کی مسجد کے پاس کھڑی ہو گئی اور دو رکعت نماز ادا کی اس کے بعد اس پر نیند کا غلبہ ہو گیا اور وہ سو گئی وہ خواب کی حالت میں روئی جب بیدار ہوئی تو عرض تو عرض کیا امیر المومنین! اللہ کی قسم! میں نے عجیب معاملہ دیکھا ہے آپ نے پوچھا وہ کیا اس نے کہا میں نے دوزخ کو دیکھا وہ دوزخیوں پر بھڑک رہی تھی پھر پل صراط کو لا کر اس کے اوپر رکھا گیا آپ نے پوچھا پھر کیا ہوا اس نے کہا عبدالملک بن مروان کو لا کر اس پل پر چڑھایا گیا وہ تھوڑا سا چلا کہ پل الٹ گیا اور وہ جہنم میں گر گیا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا مزید کیا ہوا؟ اس نے کہا پھر ولید بن عبدالملک کو لایا گیا اسے بھی اس پر سوار کیا گیا تو تھوڑا سا چلنے کے بعد پل صراط الٹ گیا اور وہ جہنم میں گر گیا آپ نے فرمایا پھر کیا ہوا؟ اس نے کہا پھر سلیمان بن عبدالملک کو لایا گیا وہ بھی تھوڑا سا چلا تھا کہ پل الٹ گیا اور وہ اسی طرح جہنم میں چلا گیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے فرمایا پھر کیا ہوا؟ اس نے کہا اے امیر المومنین! اللہ تعالیٰ کی قسم پھر آپ کو لایا گیا یہ سن کر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑے وہ آپ کے پاس کھڑی ہو کر آپ کے کانوں میں کہنے لگی اے امیر المومنین! اللہ کی قسم! میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ نجات پا گئے قسم بخدا! میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ نجات پا گئے راوی فرماتے ہیں وہ اسی طرح آواز دیتی رہی اور آپ چلاتے اور پاؤں اٹھا اٹھا کر مارتے رہے۔

حکایت کیا گیا ہے کہ حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ واعظ کے پاس تشریف لاتے اور اس کے کلام سے روتے جب وہ جہنم کا ذکر کرتا تو حضرت اویس چیخ مارتے پھر اٹھ کر چل پڑتے تو لوگ آپ کو پاگل پاگل کہتے ہوئے آپ کے پیچھے لگ جاتے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا مومن کا خوف اس وقت تک نہیں ٹھہرتا جب تک وہ جہنم کے پل کو اپنے پیچھے نہ چھوڑ دے۔

حضرت طاؤس رحمہ اللہ کے لیے بچھونا بچھایا جاتا آپ اس پر لیٹتے اور اس طرح لوٹ پوٹ ہوتے جس طرح گرم کڑاہی میں دانے ادھر ادھر اچھلتے ہیں پھر اتر کر بستر کو لپیٹ دیتے اور صبح تک قبلہ رخ ہو جاتے (نماز پڑھتے) اور فرماتے جہنم کے ذکر نے ڈرنے والوں کی نیند اڑا دی۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ایک شخص جہنم سے ایک ہزار سال بعد نکالا جائے گا (پھر فرمایا) کاش وہ شخص میں ہوتا آپ نے یہ بات جہنم میں ہمیشہ رہنے اور برے خاتمے کے خوف سے فرمائی۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ چالیس سال تک نہیں ہنسے۔ راوی کہتے ہیں میں جب ان کو بیٹھا ہوا دیکھتا تو یوں معلوم ہوتا گویا وہ ایک قیدی ہیں جنہیں ان کی گردن مارنے کے لیے لایا گیا ہے اور جب وہ گفتگو کرتے تو گویا آخرت کو دیکھ رہے ہیں اور اس کو دیکھ کر بتا رہے ہیں اور جب وہ خاموش ہوتے تو گویا ان کی آنکھوں کے درمیان آگ بھڑک رہی ہے

اور جب ان پر اس شدتِ غم و حزن کا عتاب کیا گیا تو انہوں نے فرمایا میں اس بات سے بے خوف نہیں ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے میرے بعض ناپسندیدہ اعمال کو دیکھ کر مجھ پر غضب فرمایا اور کہا جاؤ میں تمہیں نہیں بخشتا تو میرا عمل کرنا بے فائدہ ہوگا۔

حضرت ابن سماک رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ایک دن کسی مجلس میں وعظ کیا تو لوگوں میں سے ایک نوجوان نے کھڑے ہو کر کہا اے ابوالعباس! آپ نے آج ایک ایسا کلمہ کہا ہے کہ اگر ہم اس کے علاوہ کوئی بات نہ سنیں تو بھی کوئی پرواہ نہیں میں نے پوچھا وہ کونسا کلمہ ہے اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے؟ اس نے کہا آپ کا یہ قول کہ دو جگہ (میں سے ایک میں) ہمیشہ رہنے یعنی جنت یا دوزخ میں ہمیشہ رہنے کے خیال نے خائفین کے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا پھر وہ نوجوان مجھ سے غائب ہو گیا میں نے اسے دوسری مجلس میں تلاش کیا تو نہ پایا میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ وہ بیمار ہے اور لوگ اس کی عیادت کے لئے جاتے ہیں۔

چنانچہ میں بھی اس کی بیمار پرسی کے لیے گیا اور میں نے کہا اے بھائی میں آپ کو کس حالت میں دیکھ رہا ہوں؟ اس نے کہا اے ابوالعباس! یہ آپ کے اسی قول کی وجہ سے ہوا ہے کہ جنت یا دوزخ میں سے کسی ایک مقام پر ہمیشہ رہنے کے خوف نے لوگوں کے دلوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ فرماتے ہیں پھر وہ نوجوان انتقال کر گیا اللہ تعالیٰ اس پر رحم فرمائے میں نے اسے خواب میں دیکھ کر کہا اے میرے بھائی اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے بخش دیا اور مجھ پر رحم فرمایا نیز مجھے جنت میں داخل کر دیا میں نے پوچھا کس عمل کی وجہ سے؟ اس نے کہا اسی کلمے کی وجہ سے۔

تو انبیاء کرام، اولیاء عظام اور علماء کرام نیز صالحین کے خوف کا یہ حال تھا اور ہمیں تو ان کی نسبت زیادہ ڈرنا چاہیئے لیکن یہ مطلب نہیں کہ جب گناہ زیادہ ہوں تو اس وقت خوف پیدا ہو بلکہ دل کی صفائی اور کمال معرفت کی صورت میں بھی خوف ہونا چاہیے ورنہ گناہوں کی قلت اور عبادات کی کثرت بے خوفی کا سبب نہیں ہو سکتی بلکہ شہوتِ نفس کی اطاعت، بدبختی کا غلبہ، اور غفلت نیز دل کی سختی کی وجہ سے اپنے اعمال کو نہ دیکھنے قربِ موت کے باوجود بیدار نہ ہونے، گناہوں کی کثرت کے باوجود حرکت میں نہ آنے، خوف کھانے والوں کے حالات دیکھنے کے باوجود خوف کے پیدا نہ ہونے بُرے خاتمے کے خوف کے اثر انداز ہونے کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کریں کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ہمارے احوال کی اصلاح فرمائے اور ان باتوں کا تدارک کرے اگر محض زبانی سوال بغیر استعداد کے نفع دیتا ہو۔

اور عجیب بات تو یہ ہے کہ دنیا میں جب ہم مال کی خواہش کرتے ہیں تو کھیتی باڑی کرتے ہیں، درخت لگاتے ہیں اور تجارت کرتے ہیں نیز دریاؤں اور خشکی کا سفر کرتے ہیں اور جب علمی مرتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو غور و فکر کرتے ہیں اور اس کے حفظ و تکرار کے سلسلے میں مشقت اٹھاتے اور شب بیداری کرتے ہیں ہم تلاشِ رزق کے سلسلے میں کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ضمان پر اعتماد کر کے گھر میں بیٹھ نہیں جاتے کہ ہم صرف اسی پر اکتفا کریں کہ یا اللہ ہمیں رزق عطا فرما۔

اور جب آخرت کی دائمی سلطنت پر نظر کرتے ہیں تو صرف اسی بات پر قناعت کرتے ہیں کہ زبان سے کہہ دیں یا اللہ!

ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور جس ذات سے ہماری امید وابستہ ہے اور جس کے نام سے ہم دھوکہ کھائے ہوئے ہیں وہی ہمیں پکار پکار کر کہتا ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ (۱)

اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ محنت کرتا ہے۔

اور وہ ارشاد فرماتا ہے۔

وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ (۲)

اور تمہیں کوئی دھوکہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں دھوکے میں نہ ڈالے۔

اور ارشاد فرمایا۔

يَا اَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ۔ (۳)

اے انسان! تجھے رب کریم کے بارے میں کس نے دھوکے میں ڈالا۔

پھر یہ سب باتیں ہمیں دھوکے اور آرزوؤں کی وادیوں سے تہیں نکالتیں اور نہ ہی ہمیں بیدار کرتی ہیں ——— تو یہ نہایت ہی گھائل کرنے والی بات، اور مشقت ہے اگر اللہ تعالیٰ توبۃ النصوح کے ذریعے ہم پر اپنا فضل نہ فرمائے اور یوں ہماری اس کمی کا تدارک نہ فرمائے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ ہماری توبہ کو قبول فرمائے۔ بلکہ ہم اس بات کا سوال کرتے ہیں کہ وہ ہماری توبہ کو قبول فرمائے۔ بلکہ ہم اس بات کا سوال کرتے ہیں کہ وہ ہمارے دلوں میں توبہ کا شوق ڈال دے اور توبہ کے سوال کے لیے محض زبانی حرکت کو غایت نہ بنائے اس طرح ہم ان لوگوں میں سے ہو جائیں گے جو کہتے ہیں عمل نہیں کرتے اور سنتے ہیں لیکن قبول نہیں کرتے۔ جب ہم وعظ سنتے ہیں تو روتے ہیں اور جب عمل کا وقت آتا ہے تو ہم نافرمانی کرتے ہیں ذلت و رسوائی کی اس سے بڑی علامت کیا ہو سکتی ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ اپنے فضل و کرم اور احسان سے ہمیں توفیق اور ہدایت عطا فرمائے۔

اب ہم خائفین کے احوال کا ذکر اسی پر ختم کرتے ہیں جو ہم نے ذکر کیا ہے کیوں کہ تھوڑا ہو لیکن قبول کرنے والے دل تک پہنچ جائے وہ کافی ہے جب کہ زیادہ ہو اور غافل دل تک پہنچے بے مقصد ہے۔

ایک راہب جو منتخب بندوں میں تھا اس سے حضرت عیسیٰ بن مالک خولانی رحمہ اللہ نے نقل کیا کہ انہوں نے اسے

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ النجم آیت ۳۹

(۲) قرآن مجید، سورۃ فاطر آیت ۵

(۳) قرآن مجید، سورۃ انفطار آیت ۶

بیت المقدس کے دروازے پر کھڑا دیکھا شدت غم اور زیادہ رونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو رکتے نہیں حضرت عیسیٰ بن مالک فرماتے ہیں جب میں نے اسے اس پریشان کن حالت میں دیکھا تو میں نے کہا اے راہب! مجھے کوئی نصیحت فرمائیں جسے میں یاد رکھوں اس نے کہا بھائی! میں آپ کو کس بات کی نصیحت کروں؟ اگر تم اس شخص کی طرح رہ سکتے ہو جو درندوں اور زہری جانوروں سے خوف زدہ ہے اور اسے اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں غفلت میں اس کو کوئی درندہ چیر پھاڑ نہ دے یا بھول ہو جائے تو کیڑے نہ کاٹ دیں وہ رات بھر خوف زدہ دل کے ساتھ رہتا ہے اگرچہ دھوکہ کھانے والے پُرامن ہوتے ہیں وہ دن بھر بھی غمگین رہتا ہے اگرچہ نکمے لوگ خوش رہتے ہیں تو تمہیں اسی طرح رہنا چاہیئے پھر وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا میں نے کہا اگر مزید کچھ بتائیں تو مجھے فائدہ ہوگا اس نے کہا پیاسے کو جتنا پانی مل جائے اُسے کفایت کرتا ہے اور واقعی اس نے صحیح کہا کیونکہ صاف دل کو ادنیٰ خوف بھی حرکت دے دیتا ہے اور سخت دل سے وعظ و نصیحت دور رہتی ہے۔

راہب نے جو درندوں کی مثال بیان کی ہے تو وہ محض فرضی بات نہیں ہے بلکہ حقیقت یہی ہے اگر تم نور بصیرت سے اپنے باطن کو دیکھو تو وہ طرح طرح کے درندوں کے گھیرے میں ہے جیسے غصہ، شہوت، کینہ، حسد، تکبر، خود پسندی اور ریاکاری وغیرہ اور یہ (رُوحانی درندے) تمہیں مسلسل کاٹتے اور نوچتے ہیں اگر تم ایک لحظہ بھی ان سے غافل رہو۔ ہاں یہ بات ہے کہ وہ تمہیں نظر نہیں آتے۔ لیکن جب پردہ اٹھ جائے گا اور تمہیں قبر میں رکھ دیا جائے گا تو تم ان کو دیکھ لوگے۔ اور وہ تمہارے سامنے ایسی شکلوں میں آئیں گے جن کو تم دیکھ لوگے پھر تم اپنی آنکھوں سے بچھوؤں اور سانپوں کو دیکھو گے کہ انہوں نے قبر میں تمہیں گھیر رکھا ہے یہ وہ خصلتیں ہیں جو اس وقت بھی موجود ہیں۔ لیکن ان کی شکلیں اس دن (قبر میں) نظر آئیں گی اگر تم موت سے پہلے ان کو مارنا چاہو اور مارنے پر قادر بھی ہو تو ان کو مار ڈالو ورنہ دل میں یہ بات پکی طرح بٹھا لو کہ وہ تمہارے دل کو کاٹتی اور نوچتی ہیں۔ ظاہری جسم تو ایک طرف رہا ——

۴۔۔۔فقر و زہد کا بیان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس کے لیے ریت کے تودے بھی تسبیح کرتے اور سائے سجدہ کرتے ہیں اس کی ہیبت سے پہاڑ بھی گر جاتے ہیں اس نے انسان کو چپکنے والے سوکھے ہوئے بجنے والے گارے سے پیدا کیا اور اس کی صورت کو احسن تقویم (اچھے سانچے) اور مکمل اعتدال کے ساتھ مزین کیا اور اس کے دل کو نورِ ہدایت کے ذریعے گمراہی کے گڑھے سے بچایا اور اسے صبح و شام خدمت (عبادت) کا دروازہ کھٹکھٹانے کا حکم دیا۔

پھر عبادت میں مخلص شخص کی بصیرت کو نورِ عبرت کا سرمہ لگایا حتیٰ کہ اس نے اس کی روشنی سے دربارِ خداوندی کو بھی ملاحظہ کیا پس اس کے لیے ایسی خوبصورتی حسن اور کمال ظاہر ہوا جس کی چمک کے مبادی کے سامنے ہر حسن و جمال ماند پڑ گیا اور جو اس کے مشاہدے اور لزوم سے پھر گیا اس نے اس کو نہایت بھاری اور مشکل خیال کیا اور ظاہری دنیا اس کے لیے ایک خوبصورت عورت کی شکل میں ظاہر ہوئی جو دھوکہ دیتی ہے اور اس کا باطن اس کے لیے اس بوڑھی عورت کی طرح منکشف ہوا جس کا خمیر ذلت و رسوائی سے تیار کیا گیا اور اس کو ذلت کے ڈھانچے میں رکھا گیا۔ اور وہ اپنی بڑی چادر کے ساتھ لپیٹی گئی تاکہ جادو اور حیلے بہانوں کی نرمی کے ساتھ اس کے اندر کی خرابیاں چھپی رہیں اور اس کے جال مردوں کے راستے میں نصب کئے گئے اور وہ ان کو طرح طرح کے مکر و فریب سے شکار کرتی ہے اور وہ صرف وصال کے وعدہ کی خلاف ورزی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ وہ اس وصال کے خاتمے کے ساتھ ان کو طوقوں اور زنجیروں میں قید کرتی اور ان کو طرح طرح کی آزمائشوں اور سامانِ عبرت میں مبتلا کرتی ہے۔

پس جب عارفین کے لیے اس کی پوشیدہ خرابیاں اور افعال منکشف ہو گئے تو انہوں نے اس سے اس طرح کنارہ کشی کی جیسے کوئی نفرت کرنے والا کرتا ہے پس انہوں نے اسے چھوڑ دیا نیز انہوں نے مال کی فراوانی پر فخر کرنا بھی چھوڑ دیا اور وہ اپنی مکمل توجہ اور ہمت کے ساتھ بارگاہ خداوندی کی حاضری کی طرف متوجہ ہو گئے انہیں اس کے وصال کا پورا یقین ہے جس میں انفصال نہیں اور ایسا مشاہدہ جس میں فنا اور زوال نہیں اور رحمتِ کاملہ ہمارے سردار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو تمام انبیاء کرام کے سردار ہیں اور آپ کی بہترین آل پر ہو۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد۔۔۔۔ واضح ہو کہ دنیا اللہ عزوجل کی دشمن ہے وہ دھوکے سے جسے چاہے گمراہ کرتی اور اپنے مکر سے جس کو چاہے لغزش کا شکار کرتی ہے اس کی محبت خطاؤں اور گناہوں کی اصل ہے اور اس سے نفرت عبادات اور قرب کی اصل ہے اس کا حال اور اس کی دوستی کی مذمت سے متعلق ہم نے مہلکات کے بیان میں دنیا کی مذمت کے

عنوان سے ذکر کیا ہے اب ہم دنیا سے نفرت اور کنارہ کشی کی فضیلت بیان کرتے ہیں کیوں کہ یہ بات نجات دینے والے امور کی اصل ہے پس نجات کی طمع اسی وقت ہو سکتی ہے جب دنیا سے قطع تعلق کیا جائے اور اس سے دوری اختیار کی جائے اور اس سے قطع تعلق کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ دنیا خود انسان سے الگ ہو اسے فقر کہتے ہیں اور دوسری صورت یہ ہے کہ بندہ اس سے الگ ہو اسے زہد کہا جاتا ہے اور سعادت کے حصول میں ان میں سے ہر ایک کے لئے ایک درجہ ہے اور فوز و نجات کے سلسلے میں ان کا اثر ہے اب ہم فقر اور زہد کی حقیقت، ان کے درجات، اقسام، شرائط، اور احکام کا ذکر کریں گے ایک حصے میں فقر کا ذکر ہو گا جب کہ دوسرے میں زہد کا، لیکن پہلے فقر کا ذکر کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں۔

پہلا حصہ :-

فقر کا بیان

اس حصے میں درج ذیل بیان ہوں گے۔

(۱) حقیقت فقر
(۲) فقر کی مطلق فضیلت
(۳) فقر کی خصوصی فضیلت
(۴) غنی پر فقیر کی فضیلت
(۵) فقر کی حالت میں فقیر کا ادب
(۶) عطیات قبول کرنے کی صورت میں ادب
(۷) ضرورت کے بغیر سوال کا حرام ہونا
(۸) کس قدر مالداری کی حالت میں مانگنا حرام ہے۔
(۹) مانگنے والوں کے حالات۔

اللہ تعالیٰ ہی اپنے لطف و کرم سے راہِ صواب کی توفیق عطا کرنے والا ہے۔

فصل ۱ :

حقیقتِ فقر اور فقیر کے احوال اور ناموں کا اختلاف

فقر کا مطلب اس چیز کا نہ ہونا ہے جس کی حاجت ہو لیکن جس کی حاجت نہ ہو اس کا نہ ہونا فقر نہیں کہلاتا اور اگر وہ چیز جس کی حاجت ہے موجود بھی ہو اور انسان کے بس میں بھی ہو تو وہ فقیر نہیں کہلاتا۔

پس جب تمہیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ تمہیں اس بات میں شک نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو بھی موجود ہے وہ فقیر ہے کیوں کہ اسے دوسرے وقت موجود ہونے کی حاجت ہے اور وجود کا ہمیشہ رہنا اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہے پس اگر کوئی ایسا وجود موجود ہو جو کسی دوسرے کا محتاج نہ ہو تو وہ مطلق غنی ہے اور ایسا وجود سوائے ایک ذات کے متصور نہیں ہو سکتا پس ایک ہی غنی موجود ہے اور باقی جو کچھ ہے وہ سب اس کے محتاج ہیں کہ وہ ان کو دائمی وجود میں مدد دے اسی حصر کی طرف اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اشارہ ہے۔

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ - (۱) اور اللہ تعالیٰ غنی ہے جب کہ تم فقیر ہو

فقرِ مطلق کا یہ معنیٰ ہے لیکن ہمارا مقصود فقرِ مطلق کا بیان نہیں ہے بلکہ ہم خصوصی فقر یعنی مال کے حوالے سے محتاجی کا ذکر کرتے ہیں ورنہ حاجات کے اعتبار سے بندے کے فقر کی انتہا نہیں ہے کیوں کہ اس کی حاجات بے شمار ہیں اور اس کی حاجات میں سے بعض وہ ہیں جن تک رسائی مال کے ذریعے ہوتی ہے اور اس وقت اسی کا بیان مطلوب ہے پس ہم کہتے ہیں۔

جس آدمی کے پاس مال نہ ہو ہم اسے اس مال کی نسبت سے فقیر کہتے ہیں جو اس کے پاس نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اس کا محتاج ہو پھر فقر کے وقت پانچ حالتوں کا تصور ہوتا ہے اور ہم ان تمام کے الگ نام رکھتے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے تمیز ہو سکے۔

فقر کی پانچ حالتیں

پہلی حالت: یہ سب سے بلند ہے یعنی جب اس کے پاس مال آئے تو وہ اسے ناپسند کرے اور اس سے اذیت محسوس کرے اور اسے قبول کرنے سے بھاگے نیز اس کے شر اور اس میں مشغولیت سے بچے یہ زہد ہے اور ایسے شخص کو زاہد کہتے ہیں۔

دوسری حالت: مال میں ایسی رغبت نہ ہو کہ اس کے ملنے پر خوش ہو اور نہ اس طرح ناپسند کرتا ہو کہ اس سے اذیت حاصل ہو یا اگر حاصل ہو تو چھوڑ دے ایسی حالت والے کو راضی کہتے ہیں۔

تیسری حالت: مال کے نہ ہونے کے مقابلے میں اس کا پایا جانا اسے پسند ہو کیوں کہ وہ اس میں رغبت رکھتا ہے لیکن اس کی محبت اس حد کو نہیں پہنچتی کہ اس کی طلب میں سرگرمی دکھائے بلکہ اگر آسانی سے بلا محنت مل جائے تو خوش ہوتا ہے اور اس کی تلاش میں محنت کرنا پڑے تو اس میں مشغول نہیں ہوتا ایسے شخص کو قانع صبر کرنے والا کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس نے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ محمد آیت ۳۸

موجود پر قناعت کی حتیٰ کہ اس کی طلب کو چھوڑ دیا باوجود یکہ کچھ کمزور سی رغبت بھی تھی۔

چوتھی حالت: عاجزی کی وجہ سے مال کی طلب چھوڑ دے ورنہ وہ اس میں ایسی رغبت رکھتا ہے کہ اگر اس کی طلب تک راستہ ملے اگرچہ تھکاوٹ کے ساتھ ہو تو وہ اسے طلب کرے یا اس کی طلب میں مشغول ہو تو ایسی حالت والے کو حریص کہتے ہیں۔

پانچویں حالت: اس کے پاس جو مال نہیں ہے وہ اس کی طرف مجبور ہو جیسے بھوکا شخص جس کے پاس روٹی نہ ہو اور برہنہ آدمی جس کے پاس کپڑا نہ ہو ایسے شخص کو مضطر (مجبور) کہتے ہیں چاہے مال کی رغبت ضعیف ہو یا قوی اور یہ حالت رغبت سے بہت کم الگ ہوتی ہے تو یہ پانچ حالتیں ہیں جن میں سے سب سے اعلیٰ زہد ہے اور اگر اضطرار کے ساتھ زہد بھی ہو اور اس کا تصور ہو سکے تو یہ زہد کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے جیسے اس کا بیان آئے گا۔

ان پانچ سے اوپر ایک حالت ہے جو زہد سے بھی اعلیٰ ہے یعنی انسان کے نزدیک مال کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہو اگر مال مل جائے تو وہ خوش نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے اسے اذیت پہنچتی ہے اور اگر مال نہ ملے تو بھی یہی صورت حال ہوتی ہے بلکہ اس کی حالت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حالت کی طرح ہوتی ہے جب آپ کے پاس ایک لاکھ درہم بطور عطیہ آئے تو آپ نے لے لیے لیکن اسی دن تقسیم کر دیئے آپ کی خادمہ نے عرض کیا اگر آج کے ان درھموں میں سے ایک درہم کا گوشت لے لیتیں تو اس سے روزہ افطار کر لیتے؟ آپ نے فرمایا اگر تم پہلے یاد دلا دیتیں تو میں ایسا ہی کرتی۔

پس جس شخص کی یہ حالت ہو اگر تمام دنیا اس کے قبضے اور خزانے میں ہو تو بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیوں کہ وہ تمام مال کو اللہ تعالیٰ کے خزانے میں جانتا ہے اپنے قبضے میں نہیں پس اس بات میں کوئی فرق نہیں ہوتا کہ مال اس کے اپنے قبضے میں ہو یا کسی دوسرے کے قبضے میں۔

ایسی حالت والے کو مستغنی کہنا زیادہ مناسب ہے کیوں کہ وہ مال کے ہونے نہ ہونے دونوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔

اس اسم (مستغنی) سے ایک ایسا معنیٰ سمجھنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ پر مطلق غنی کے اطلاق اور بندوں میں سے جس کے پاس زیادہ مال ہو اس کو غنی کہنے میں فرق کرتا ہے کیوں کہ جس بندے کے پاس زیادہ مال ہو اور وہ اس پر خوش بھی ہوتا ہو تو وہ اس بات کا محتاج ہے کہ جو مال اس کے قبضے میں ہے وہ باقی رہے لیکن مزید مال کے آنے سے بے نیاز ہے باقی رہنے سے نہیں۔ لہٰذا وہ ایک اعتبار سے فقیر ہے لیکن یہ شخص (مستغنی) مال کے قبضے میں آنے سے بھی بے نیاز ہے اور اس کے باقی رہنے سے بھی بے نیاز ہے بلکہ وہ مال کے ہاتھوں سے نکل جانے سے بھی بے نیاز ہوتا ہے کیوں کہ اسے مال کے ملنے سے کوئی اذیت نہیں ہوتی کہ وہ اسے اپنی ملک سے نکالنے کا محتاج ہو اور وہ اس کے آنے پر خوش بھی نہیں ہوتا کہ اس کے باقی رہنے کا محتاج ہو اور چوں کہ مال سے محروم بھی نہیں اس لیے وہ اسے

قبضے میں لانے کا محتاج بھی نہیں پس اس کا غنا عام ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی صفت غنی کے زیادہ قریب ہے اور بندے کو اللہ تعالیٰ کا قرب صفات کے قرب کے ذریعے حاصل ہوتا ہے قرب مکانی نہیں ہوتا۔

لیکن ہم ایسی حالت والے کو غنی نہیں کہتے بلکہ مستغنی کہتے ہیں تاکہ غنی کا اسم صرف اسی ذات کے لیے ہو جو مطلق غنی ہے اور کسی چیز کا محتاج نہیں ہے (یعنی اللہ تعالیٰ) لیکن یہ بندہ (مستغنی) وہ مال کے ہونے نہ ہونے سے غنی (بے نیاز) ہے لیکن اس کے علاوہ دیگر اشیاء سے بے نیاز نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق کی مدد سے بھی بے نیاز نہیں ہے تاکہ اس کا وہ استغناء باقی رہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس کے دل کو زینت بخشی ہے۔ کیوں کہ جو دل مال کی محبت میں قید ہے وہ غلام ہے اور جو اس محبت سے مستغنی ہے وہ آزاد ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہی اسے اس غلامی سے آزاد کیا ہے لہٰذا وہ اس آزادی کے دوام کا محتاج ہے۔ اور دل کی حالت تو یہ ہے کہ وہ غلامی اور آزادی کے درمیان بدلتا رہتا ہے اور اس تبدیلی میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگتا کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قبضہ میں ہے۔ اسی لیے اس کمال کے باوجود اس شخص کو مطلق غنی نہیں کہا جاسکتا ہم اسے مجازاً غنی کہتے ہیں۔

جان لو کہ زُہد ایک ایسا درجہ ہے جو نیک لوگوں کا کمال ہے اور ایسا آدمی مقربین میں سے ہوتا ہے پس یقیناً اس کے حق میں زُہد نقصان ہوتا ہے کیونکہ ابرار کی نیکیاں، مقربین کے گناہ ہیں (اور یہ برابر میں سے ہے) کیوں کہ جو شخص دنیا کو ناپسند کرتا ہے وہ دنیا میں مشغول ہے جس طرح اس میں رغبت رکھنے والا اس میں مشغول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے غیر میں مشغول ہونا اللہ تعالیٰ سے حجاب ہے کیوں کہ تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی دُوری نہیں ہے وہ شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اور وہ کسی مکان میں بھی نہیں کہ آسمان اور زمین تمہارے اور اس کے درمیان حجاب ہوں پس تمہارے اور اس کے درمیان حجاب یہی ہے کہ تم اس کے غیر میں مشغول ہو اور جب آدمی اپنے نفس اور خواہشات میں مشغول ہو تو وہ بھی غیر خدا میں مشغولیت ہے اور چوں کہ تم اپنے نفس اور خواہشات میں مسلسل مشغول رہتے ہو اس لیے تم اس سے مسلسل حجاب میں ہوتے ہو پس جو اپنے نفس کی محبت میں مشغول ہو وہ اللہ تعالیٰ سے اعراض کرتا ہے اور جو شخص اپنے نفس سے نفرت میں مشغول ہو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے منہ پھیرنے والا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے وہ اس رقیب کی طرح ہے جو اس مجلس میں حاضر ہے جس میں عاشق اور معشوق دونوں اکٹھے ہوتے ہیں پس اگر عاشق کا دل رقیب کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بُغض رکھنے اور اسے بوجھ سمجھنے کی طرف مشغول ہو نیز یہ کہ اس کی حاضری کو ناپسند کرے تو ایسی حالت میں جب اس کا دل رقیب کے بُغض میں مشغول ہو وہ معشوق کے مشاہدہ کی لذت سے اعراض کرنے والا ہوتا ہے اور اگر اس کو عشق نے گھیر رکھا ہو تو وہ معشوق کے غیر سے غافل ہوتا ہے اور اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

تو جس طرح معشوق کی موجودگی میں غیر معشوق کی طرف اس کی محبت کی وجہ سے دیکھنا عشق میں شرک اور نقصان ہے

اسی طرح اس کے بُغض کی وجہ سے اس کو دیکھنا بھی شرک اور نقصان ہے البتہ ان میں سے ایک، دوسرے کے مقابلے میں ہلکا ہے بلکہ کمال تو یہ ہے کہ دل محبوب کے غیر کی طرف متوجہ نہ ہو چاہے بُغض کی صورت میں ہو یا محبت کی صورت میں ــــ تو جس طرح دل میں دو محبتیں ایک ہی حال میں جمع نہیں ہو سکتیں اسی طرح ایک ہی حالت میں محبت اور بُغض بھی جمع نہیں ہوتے۔

پس جو شخص دنیا سے بُغض رکھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے اسی طرح غافل ہے جس طرح اس سے محبت کرنے والا غافل ہوتا ہے البتہ اس کی محبت میں مشغول غافل ہے اور وہ اس غفلت میں دُوری کے راستے پر چلتا ہے اور جو شخص اس سے بُغض میں مشغول ہوتا ہے وہ بھی غافل ہے لیکن وہ اس غفلت میں قرب کے راستے پر چلتا ہے کیوں کہ اس کے بارے میں امید ہے کہ وہ ایسی حالت تک پہنچے جہاں یہ غفلت زائل ہو کر شہود میں بدل جائے تو اس کے لیے کمال ترقی پذیر ہوتا ہے کیوں کہ دنیا سے بُغض ایک سواری ہے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچاتی ہے۔

پس دنیا سے محبت کرنے والا اور بُغض رکھنے والا ان دو آدمیوں کی طرح ہیں جو حج کے راستے پر چلتے ہیں وہ دونوں اونٹنی پر سواری اسے ہانکنے اور چارہ دینے میں مشغول رہتے ہیں لیکن ایک کا منہ قبلہ کی طرف ہے اور دوسرے نے اس طرف پیٹھ کر رکھی ہے تو اس حالت میں دونوں برابر ہیں کہ دونوں کعبۃ اللہ سے حجاب میں ہیں اور اس سے اعراض کرنے والے ہیں لیکن جس کا منہ کعبۃ اللہ کی طرف ہے وہ اس کی طرف پیٹھ کرنے والے کی نسبت محمود ہے کیوں کہ اس کے لیے کعبہ شریف تک پہنچنے کی امید ہے۔

لیکن جو شخص کعبۃ اللہ میں معتکف ہوتا ہے اس سے باہر نہیں نکلتا اس کے مقابلے میں یہ شخص قابلِ تعریف نہیں ہے کیونکہ اسے وہاں تک پہنچنے کے لیے جانور میں مشغولیت کی ضرورت ہے۔

پس یہ خیال کرنا مناسب نہیں کہ دنیا سے بُغض رکھنا ذاتی طور پر مقصود ہے بلکہ دنیا اللہ تعالیٰ سے روکنے والی چیز ہے اور اس تک رسائی اسی وقت ہو سکتی ہے جب رکاوٹ کو دُور کیا جائے۔

اسی لیے حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ نے فرمایا جو شخص دنیا میں زُہد اختیار کرتا ہے اور اسی پر اکتفا کرتا ہے تو وہ جلدی راحت چاہتا ہے بلکہ اسے چاہیے کہ آخرت میں مشغول ہو۔

تو انہوں نے بیان کیا کہ آخرت کے راستے پر چلنا زہد کے بعد ہے جس طرح حج کے راستے پر چلنا قرض کی ادائیگی کے بعد ہے جو حج کے راستے میں رکاوٹ ہے۔

• تو نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا سے بے رغبتی (زُہد) سے مراد مال کے وجود اور عدم وجود میں رغبت نہ رکھنا ہو تو وہ انتہائی درجہ کا کمال ہے اور اگر اس کے نہ ہونے میں رغبت مراد ہو تو وہ راضی، قانع اور حریص کے حوالے سے کمال ہے لیکن مستغنی کے درجہ کی نسبت سے نقصان ہے بلکہ مال کے سلسلے میں کمال یہ ہے کہ تمہارے نزدیک مال اور پانی برابر ہوں اور اس

کے پڑوس میں پانی کا زیادہ ہونا کوئی نقصان نہیں دیتا مثلاً وہ دریا کے کنارے پر ہو تو اسے پانی نقصان نہیں دیتا اسی طرح پانی کی قلت بھی ایذا نہیں پہنچاتی ہاں ضرورت سے کم نہ ہو حالانکہ مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس طرح پانی کی حاجت ہوتی ہے پس تمہارا دل زیادہ پانی کے پڑوس سے راہ فرار اختیار کرنے میں مشغول نہ ہو اور نہ ہی زیادہ پانی سے بغض رکھتا ہو بلکہ تم یوں کہو کہ میں ضرورت کے مطابق اس سے پیئوں گا اور اس سے لوگوں کو حاجت کے مطابق پلاؤں گا اور بخل کرتے ہوئے کسی سے نہیں روکوں گا۔

پس مال کی حالت بھی یہی ہونی چاہئے کیوں کہ حاجت کے سلسلے میں روٹی اور پانی دونوں ایک جیسے ہیں فرق صرف ایک کی قلت اور دوسرے کی کثرت کا ہوتا ہے پس جب تمہیں اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو گئی اور تمہیں اس کی اس تدبیر پر یقین ہو گیا جس کے ساتھ اس نے اس عالم کا انتظام کیا ہے تو تمہیں معلوم ہو گیا کہ جس قدر روٹی تمہاری ضرورت ہے جب تک تم زندہ ہو وہ لامحالہ تمہارے پاس آئے گی جس طرح حسب حاجت پانی تمہارے پاس آتا ہے عنقریب توکل کے بیان میں اس بات کا ذکر آئے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

حضرت احمد بن ابی الحواری رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ سے کہا کہ حضرت مالک بن دینار نے حضرت مغیرہ سے فرمایا کہ گھر جا کر وہ ڈولچی لے لیں جو آپ نے مجھے تحفہ دی تھی کیوں کہ شیطان نے مجھے وسوسہ ڈالا ہے کہ اسے شیطان لے گیا ہے حضرت ابو سلیمان نے فرمایا یہ صوفیا کے دلوں کی کمزوری ہے انہوں نے دنیا میں زیادہ لیا جس کا لے جانا ان کے دل پر غالب آ گیا ـــــ تو انہوں نے بیان کیا گھر میں ڈولچی کے ہونے کو ناپسند کرنا بھی اس کی طرف توجہ ہے جس کا سبب کمزوری اور نقصان ہے۔

سوال:۔

انبیاء کرام اور اولیاء عظام نے دنیا سے نفرت کی اور کلی طور پر بھاگے اس کی کیا وجہ ہے۔

جواب:

جس طرح وہ پانی سے بھاگے مطلب یہ کہ انہوں نے ضرورت سے زیادہ نوش نہیں فرمایا پس جو حاجت سے زیادہ تھا اس سے بھاگے انہوں نے اسے مشکیزوں اور مشکوں میں جمع نہیں کیا کہ اپنے ساتھ لیے پھرتے ہوں بلکہ انہوں نے اسے نہروں کنوؤں اور صحراؤں میں محتاجوں کے لیے چھوڑ رکھا یہ نہیں ہوا کہ ان کے دل اس کی محبت اور بغض میں مشغول رہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے پاس زمین کے خزانے آئے لیکن انہوں نے ان کو لے کر ان کے مناسب مقام پر خرچ کیا اور ان سے بھاگے نہیں کیوں کہ ان کے نزدیک مال، پانی، سونا اور پتھر ایک جیسے تھے (۱) یہ بات منقول نہیں ہوئی کہ انہوں نے ان چیزوں سے انکار کیا ہو۔

اگر مال لینے سے انکار منقول ہے تو ایسے لوگوں سے منقول ہے جن کو یہ خوف تھا کہ اگر وہ لیں گے تو یہ مال ان کو دھوکہ دے گا اور ان کے دل کو قیدی بنائے گا پس وہ ان کو خواہشات کی طرف بلائے گا یہ کمزور لوگوں کا حال ہے تو ایسے لوگوں کے حق میں مال سے بغض رکھنا اور اس سے بھاگنا کمال ہے اور یہ تمام لوگوں کا حکم ہے کیوں کہ انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے علاوہ سب لوگ کمزور ہیں۔

یا یہ نفرت ایسے شخص کے بارے میں منقول ہے جو درجۂ کمال کو پہنچا لیکن اس نے اس سے فرار کی راہ اس لیے اختیار کی اور کمزور لوگوں کے مقام پر اتر آئے کہ ترکِ مال کے سلسلے میں لوگ ان کی اقتدا کریں کیوں کہ اگر وہ مال لینے میں ان کی اقتدا کریں گے تو ہلاک ہو جائیں گے جیسے سپیرا اپنی اولاد کے سامنے سانپ سے بھاگتا ہے اس لیے نہیں کہ وہ اسے پکڑ نہیں سکتا بلکہ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ اسے پکڑے گا تو اس کی اولاد بھی اسے پکڑے گی جب وہ اسے دیکھیں گے اور اس طرح وہ ہلاک ہو جائیں گے اور کمزوروں کی طرح چلنا انبیاء کرام اولیاء عظام اور علماء کرام کی سیرت ہے۔

اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ کل چھ مراتب ہیں اور سب سے اعلیٰ رتبہ مستغنی کا ہے پھر زاہد، اس کے بعد راضی، بعد ازاں قانع اور پھر حریص ہے اور مضطر (مجبور) کے حق میں بھی زہد، رضا اور قناعت کا تصور ہو سکتا ہے اور ان احوال کے اختلاف سے اس کا درجہ بدلتا رہتا ہے اور فقیر کا لفظ ان پانچوں پر بولا جاتا ہے جہاں تک مستغنی کو فقیر کہنے کا تعلق ہے تو اس معنیٰ کے اعتبار سے اس کی کوئی وجہ نہیں بلکہ اگر اسے فقیر کہیں تو کسی دوسری وجہ سے کہیں گے اور وہ اس کی یہ معرفت ہے کہ وہ اپنے تمام امور میں عموماً اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے اور خاص طور پر مال سے استغناء کے بقا کے لیے اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے پس اس کو فقیر کہنا اسی طرح ہے جیسے وہ شخص اپنے بندہ ہونے کو پہچان لے اور اس کا اقرار کرے تو غافل لوگوں کی بنسبت ایسا شخص بندہ کہلانے کا زیادہ مستحق ہے اگرچہ بندہ کا لفظ تمام مخلوق کے لیے عام ہے اسی طرح لفظ فقیر بھی عام ہے اور جو شخص اس بات کو جان لیتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے وہ لفظ فقیر کا زیادہ مستحق ہے لہٰذا فقیر کا لفظ ان دونوں معنوں کے درمیان مشترک ہے۔

جب تمہیں اس اشتراک کی سمجھ آ گئی تو تم نے سمجھ لیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دو ارشاد

أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفَقْرِ۔ (۱) (یا اللہ) میں فقر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

اور ارشاد فرمایا۔

كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا۔ (۲) قریب ہے کہ فقر، کفر ہو جائے۔

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۵۰۳ مرویات ابی ہریرہ

(۲) کنز العمال جلد ۶ ص ۴۹۲ حدیث ۱۶۶۸۲

آپ کے اس ارشاد کے خلاف نہیں ہیں۔

اَحْيِنِىْ مِسْكِيْنًا وَّاَمِتْنِىْ مِسْكِيْنًا۔ (۱)

یا اللہ! مجھے مسکین ہونے کی حالت میں زندہ رکھنا اور مسکین ہونے کی صورت میں میرا وصال ہو۔

کیوں کہ مضطر کا فقر وہ ہے جس سے وہ پناہ مانگتا ہے (پہلی دو حدیثوں میں اسی طرف اشارہ ہے) اور وہ فقر جو مسکینی، عاجزی اور اللہ تعالیٰ کی طرف محتاج ہونا ہے اس کی آپ نے دعا مانگی ہے آپ پر اور زمین و آسمان کے ہر پسندیدہ و منتخب بندوں پر رحمت و سلام ہو۔

فصل ۲:

فقر کی مطلق فضیلت

آیات کریمہ:

ارشاد خداوندی ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ۔ (۲)

ان فقراء مہاجرین کے لیے جو اپنے گھروں اور مال سے نکالے گئے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا۔

اُن فقراء کے لیے جن کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں روکا گیا وہ زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

یہ کلام مدح اور تعریف کے لیے لایا گیا پھر ان کے وصف ہجرت اور رُکا وٹ سے پہلے فقر کے ساتھ موصوف ذکر کیا اور اس میں فقر کی تعریف پر واضح دلالت ہے۔

احادیث مبارکہ:

فقر کی تعریف میں بے شمار احادیث مروی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے پوچھا لوگوں میں سے کون بہتر ہے؟ انہوں نے عرض کیا وہ مال دار شخص جو اپنی جان اور مال میں سے اللہ تعالیٰ کا

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۳۱۴، ابواب الزھد

(۲) قرآن مجید، سورۂ حشر آیت ۸

(۳) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۲۷۳

حق ادا کرتا ہے آپ نے فرمایا یہ شخص اچھا ہے لیکن یہ میری مراد نہیں انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر کون شخص سب سے اچھا ہے؟ آپ نے فرمایا وہ فقیر جس کو اس کی جدوجہد عطا کی گئی۔ (۱)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔

اِلْقَ اللّٰہَ فَقِیْرًا وَلَا تَلْقَہٗ غَنِیًّا۔ (۲)

اللہ تعالیٰ سے فقر کی حالت میں ملاقات کرنا غنی ہونے کی صورت میں نہیں۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْفَقِیْرَ الْمُتَعَفِّفَ اَبَا الْعِیَالِ۔ (۳)

بے شک اللہ تعالیٰ اس فقیر کو پسند کرتا ہے جو عیالدار ہونے کے باوجود اپنا دامن بچاتا ہے۔

اور ایک مشہور حدیث میں ہے۔

یَدْخُلُ فُقَرَاءُ اُمَّتِیْ الْجَنَّۃَ قَبْلَ اَغْنِیَائِہَا بِخَمْسِمِائَۃِ عَامٍ۔ (۴)

میری امت کے فقرا، مالدار لوگوں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔

ایک دوسری حدیث میں بِاَرْبَعِیْنَ خَرِیْفًا (۵) کے الفاظ ہیں یعنی چالیس سال پہلے ——— تو اس سے مراد یہ ہے کہ فقیر حریص، غنی حریص سے پہلے جائے گا اور فقیر زاہد، غنی رغبت کرنے والے کی نسبت پانچ سو سال پہلے جائے گا۔

اور ہم نے جو فقر کے درجات کا اختلاف ذکر کیا ہے اس سے تمہیں فقراء کے درمیان درجات کے تفاوت کی پہچان ہو جائے گی۔ اور حریص فقیر، زاہد فقیر سے ساڑھے بارہ درجوں پر ہے کیوں کہ چالیس کی پانچ سو سے یہی نسبت ہے اور تمہیں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ یہ مقدار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر اتفاقاً جاری ہو گئی بلکہ آپ تو حقیقتِ حق کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں کیوں کہ ارشاد خداوندی ہے۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ (۵)

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مرضی سے گفتگو نہیں کرتے بلکہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ آپ کی طرف وحی کی جاتی ہے

---

(۱)

(۲) کنز العمال جلد ۶ ص ۴۸۷ حدیث ۱۶۷۸۳

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۶۲ مرویات عیاض بن حمار

(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۲۹۶ مرویات ابی ہریرہ

(۵) الترغیب والترہیب جلد ۴ ص ۱۲۶ کتاب التوبہ (۶) قرآن مجید سورہ النجم آیت ۳، ۴

اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلرُّؤیَا الصَّالِحَۃُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّۃٍ وَّاَرْبَعِیْنَ جُزْءً مِنَ النُّبُوَّۃِ۔ اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ (۱)

تو آپ کا یہ ارشاد گرامی تقدیر تحقیقی ہے لیکن کسی دوسرے شخص کو یہ طاقت نہیں کہ اس نسبت کی علت محض انداز سے جان سکے۔ اور تحقیق تو ہو نہیں سکتی کیوں کہ یہ بات معلوم ہے کہ نبوت ایسے وصف کا نام ہے جو نبی کے لیے مخصوص ہے اور اسی کی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں سے ممتاز ہیں۔ اور نبی میں بے شمار خواص ہوتے ہیں۔

نبی کے خواص

پہلی خاصیت :۔

اللہ تعالیٰ، اس کی صفات، ملائکہ اور آخرت سے متعلق امور کے حقائق کو جس طرح نبی جانتا ہے کوئی دوسرا نہیں جان سکتا بلکہ معلومات کی کثرت اور یقین، تحقیق اور کشف کی زیادتی کی وجہ سے نبی کا علم دوسروں کے علم سے مختلف ہوتا ہے۔

دوسری خاصیت :۔

نبی کی ذات میں ایسی صفت رکھی گئی ہے جس کے ذریعے وہ امور مکمل ہوتے ہیں جو عادت کے خلاف ہیں جیسے ہمارے پاس صفت ہے جس کے ذریعے وہ حرکات پوری ہوتی ہیں جو ہمارے ارادے اور اختیار سے ملی ہوئی ہیں اور وہ صفت، قدرت ہے اگرچہ قدرت اور مقدور دونوں اللہ تعالیٰ کے افعال سے ہیں۔

تیسری خاصیت :۔

نبی کو ایک ایسی صفت حاصل ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ فرشتوں کو دیکھتا اور ان کا مشاہدہ کرتا ہے جس طرح بینائی والے کے پاس ایک صفت ہے جس کے ذریعے وہ نابینا آدمی سے جدا ہوتا ہے اور اس صفت کے ذریعے دیکھی جانے والی چیزوں کو دیکھتا ہے۔

چوتھی خاصیت :

نبی کو ایک ایسی صفت عطا ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ غیب کی باتوں کو جان لیتا ہے بیداری کی حالت میں یا خواب میں، کیوں کہ اس صفت کے ذریعے انبیاء کرام لوح محفوظ کو دیکھتے ہیں اور اس میں جو غیب ہے اس کو دیکھ لیتے ہیں۔

تو یہ وہ کمالات و صفات ہیں جن کا ثبوت انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے ظاہر ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ ان میں سے

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۳۵، کتاب التعبیر

ہر ایک کئی قسموں میں تقسیم ہوتا ہے اور ہمارے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ان کو چالیس یا پچاس یا ساٹھ اقسام میں تقسیم کریں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چھیالیس اقسام میں تقسیم کردیں کہ سچا خواب ان تمام کے مجموعہ کا ایک جزو بن سکے۔ لیکن ان ممکنہ تقسیمات کے طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کا تعین محض اندازے سے ہی ہو سکتا ہے حقیقتاً ہم نہیں جان سکتے کہ کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کا ارادہ کیا ہے یا نہیں اور جو کچھ معلوم ہے وہ ان صفات کا مجموعہ ہے جن کے ساتھ نبوت کی تکمیل ہوتی ہے اور ان کی تقسیم کی اصل بھی معلوم ہے لیکن مقرر کرنے کی علت معلوم نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح ہم جانتے ہیں کہ فقراء کے بھی کئی درجات ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے لیکن یہ بات کہ یہ حریص فقیر مثلاً زاہد فقیر سے بارہویں درجہ پر ہو گا حتی کہ اسے جنت میں جانے کے لیے صرف چالیس سال کی تقدیم حاصل ہو گی اور دوسرا پانچ سو سال پہلے جانے کا مستحق ہو گا تو یہ بات انسانی طاقت سے باہر کہ اس کے بارے میں اپنے اندازے سے کچھ کہے ہاں انبیاء کرام مستثنیٰ ہیں اور وثوق سے تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔ مقصود تو یہ ہے کہ اس قسم کے امور میں مقدار مقرر کرنے کے طریقے پر تنبیہ ہو کیوں کہ کمزور ایمان والا آدمی بعض اوقات گمان کرتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ بات اتفاقی طور پر جاری ہوئی ہے جب کہ منصب نبوت اس سے پاک ہے۔

اب ہم احادیث مبارکہ کی طرف رجوع کرتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

خَيْرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ فُقَرَاءُهَا وَأَسْرَعُهَا تَضَجُّعًا فِي الْجَنَّةِ ضُعَفَاءُهَا۔ (۱)

اس امت کے بہترین لوگ، فقراء ہیں اور ان میں سے کمزور لوگ جنت میں سب سے جلدی بچھونا پائیں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّ لِي حِرْفَتَيْنِ اثْنَتَيْنِ فَمَنْ أَحَبَّهُمَا فَقَدْ أَحَبَّنِي وَمَنْ أَبْغَضَهُمَا فَقَدْ أَبْغَضَنِي الْفَقْرُ وَالْجِهَادُ (۲)

بے شک میرے دو پیشے ہیں پس جس نے ان کو پسند کیا اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان کو ناپسند کیا اس نے مجھ سے بُغض رکھا ایک فقر ہے اور دوسرا جہاد۔

ایک روایت میں ہے حضرت جبریل علیہ السلام، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! بے شک اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کیا آپ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ میں ان پہاڑوں کو سونا بنادوں اور یہ آپ کے ساتھ رہیں آپ جہاں بھی جائیں؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر سر جھکائے رہے پھر فرمایا۔

---

(۱)

(۲) الاحادیث الضعیفۃ الموضوعۃ جلد ۲ ص ۴۰ حدیث ۵۶۶

يَا جِبْرِيْلُ اِنَّ الدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَا دَارَ لَهُ وَمَالُ مَنْ لَا مَالَ لَهُ وَلَهَا يَجْمَعُ مَنْ لَا عَقْلَ لَهُ۔

اے جبریل! دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو اور اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہ ہو اور اسے وہی جمع کرتا ہے جو عقلمند نہ ہو۔

٭ ٭ ٭ ٭

حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ آپ کو قولِ ثابت پر قائم رکھے (۱) ایک روایت میں ہے حضرت جبریل علیہ السلام اپنی سیاحت کے دوران ایک ایسے آدمی کے پاس سے گزرے جو اپنے چادر لپیٹ کر سو رہا تھا آپ نے اسے جگایا اور فرمایا اے سونے والے! اٹھو اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرو اس نے کہا آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں میں نے دنیا، دنیا داروں کے لیے چھوڑ دی ہے آپ نے فرمایا اے میرے دوست! اگر یہ بات ہے تو سو جاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو مٹی پر سویا ہوا تھا اور اس کے سر کے نیچے اینٹ تھی اس کا چہرہ اور داڑھی گرد آلود ہو چکی تھی اور اس نے ایک چادر کا تہبند باندھ رکھا تھا آپ نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا اے میرے رب! تیرا یہ بندہ دنیا میں ضائع ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی بھیجی اے موسیٰ علیہ السلام! جب میں اپنے بندے کی طرف مکمل طور پر نظر کرتا ہوں تو اس سے تمام دنیا کو لپیٹ دیتا ہوں۔

حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک مہمان آیا تو آپ کے پاس اس وقت اس کی مہمان نوازی کے لیے کچھ نہ تھا آپ نے مجھے خیبر کے ایک یہودی کے پاس بھیجا اور فرمایا اس سے کہنا کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں رجب کے چاند تک مجھے آٹا قرض دو یا بیچو فرماتے ہیں میں اس کے پاس گیا تو اس نے کہا اللہ کی قسم! جب تک آپ کوئی چیز رہن نہیں رکھیں گے میں آٹا نہیں دوں گا حضرت ابورافع فرماتے ہیں میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی تو آپ نے فرمایا۔

اَمَا وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَمِیْنٌ فِیْ اَهْلِ السَّمَاءِ اَمِیْنٌ فِیْ اَهْلِ الْاَرْضِ وَلَوْ بَاعَنِیْ اَوْ اَسْلَفَنِیْ لَاَدَّیْتُ اِلَیْهِ اِذْهَبْ بِدِرْعِیْ هٰذَا اِلَیْهِ فَادْهَنْهُ۔ (۲)

سنو! اللہ کی قسم میں آسمان والوں میں امین ہوں اور زمین والوں میں امین ہوں اگر وہ مجھ پر بیچتا یا مجھے ادھار دیتا تو میں اسے ادا کر دیتا میری یہ زرہ لے جاؤ اور اس کے پاس رہن رکھو۔

حضرت ابورافع فرماتے ہیں جب میں باہر نکلا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۵۴ مرویات ابو امامہ

(۲) مصنف عبدالرزاق جلد ۸ ص ۱۱ حدیث ۱۴۰۹۲

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (۱)

اور اے سننے والے اپنی آنکھیں نہ پھیلا اس کی طرف جو ہم نے کافروں کے جوڑے کو برتنے کے لیے دی ہے (یعنی) دنیوی زندگی کی تازگی۔

یہ آیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے تسلی دیتا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَلْفَقْرُ اَزْيَنُ بِالْمُؤْمِنِ مِنَ الْعِذَارِ الْحَسَنِ عَلٰى خَدِّ الْفَرَسِ۔ (۲)

فقر مومن کے لیے گھوڑے کے منہ پر موجود عمدہ بالوں سے زیادہ زینت والا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ اَصْبَحَ مِنْكُمْ مُعَافًى فِيْ جِسْمِهٖ آمِنًا فِيْ سِرْبِهٖ عِنْدَهٗ قُوْتُ يَوْمِهٖ فَكَاَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا۔ (۳)

جو شخص اس حالت میں صبح کرے کہ اسے جسمانی صحت حاصل ہو اس کا نفس مامون ہو محفوظ ہو اس کے پاس ایک دن کا رزق ہو گویا اس کے لیے تمام دنیا جمع کردی گئی۔

حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا اے موسیٰ! جب فقر کو آتے ہوئے دیکھیں تو کہیں مسلمانوں کی نشانی کا آنا مبارک ہو۔

حضرت عطاء خراسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ایک نبی ایک ساحل سے گزرے تو دیکھا کہ وہاں ایک شخص مچھلیوں کا شکار کر رہا ہے اس نے بسم اللہ پڑھ کر جال پھینکا تو کوئی چیز نہ نکلی پھر ایک دوسرے شخص کے پاس سے گزر ہوا اس نے کہا شیطان کے نام سے اور جال ڈالا تو اتنی زیادہ مچھلیاں نکلیں کہ وہ ان کو پکڑنے سے پہلو تہی کرنے لگا۔ نبی علیہ السلام نے عرض کیا اے میرے رب یہ کیا ہے؟ میں تو یہ جانتا ہوں کہ سب کچھ تیرے قبضے میں ہے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا میرے اس بندے کے سامنے ان دونوں کا مرتبہ واضح کرو جب انہوں نے دیکھا کہ اس شخص کے لیے اللہ تعالیٰ نے کیا عزت تیار کی ہے اور اس کے لیے جو ذلت رکھی ہے تو عرض کیا اے میرے رب! میں راضی ہوں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں میں نے جنت میں جھانکا تو وہاں کے زیادہ لوگ فقراء تھے اور جہنم میں جھانک کر دیکھا تو وہاں کے اکثریت مال دار لوگوں اور عورتوں کی نظر آئی۔ (۴)

---

(۱) قرآن مجید، سورہ طٰہٰ آیت ۱۳۱

(۲) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۷ ص ۲۹۵ حدیث ۱۸۱)

(۳) سنن ابن ماجہ ص ۳۱۵، ابواب الزھد

(۴) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۵۵ کتاب الرقاق / الترغیب والترہیب جلد ۴ ص ۱۸۳ کتاب التوبۃ

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں ـ میں نے پوچھا مالدار کہاں ہیں ؟ تو کہا گیا ان کو مالداری نے روک رکھا ہے (۱)
ایک دوسری روایت میں کہ میں نے جہنم کی اکثریت عورتوں کو دیکھا میں نے پوچھا ان کو کیا ہوا ؟ کہا گیا ان کو دو سرخ چیزوں یعنی سونے اور زعفران نے روک رکھا ہے ۔ (۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ فِي الدُّنْيَا اَلْفَقْرُ ۔ (۳) دنیا میں مومن کا تحفہ فقر ہے ۔

ایک حدیث شریف میں ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام میں سے سب سے آخر میں جنت میں جانے والے حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام ہوں گے کیوں کہ آپ بادشاہ تھے اور صحابہ کرام میں سے سب سے آخر میں جنت میں جانے والے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہوں گے کیوں کہ آپ غنی تھے ۔ (۴)

ایک دوسری روایت میں ہے آپ نے فرمایا میں نے ان کو دیکھا جنت میں آہستہ آہستہ چل کر جا رہے ہیں ۔ (۵)
حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں مالدار آدمی جنت میں بڑی شدت کے ساتھ داخل ہوگا۔
اہل بیت سے مروی ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا ابْتَلَاهُ فَاِذَا اَحَبَّهُ الْحُبَّ الْبَالِغَ اقْتَنَاهُ، قِيْلَ وَمَا اقْتَنَاهُ قَالَ لَمْ يَتْرُكْ لَهُ اَهْلًا وَلَا مَالًا ۔ (۶)

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائش میں ڈال دیتا ہے اور جب اسے زیادہ پسند کرتا ہے تو اسے چھانٹ لیتا ہے پوچھا گیا اقتناء (چھانٹنا) کیا ہے فرمایا اس کے لیے اہل اور مال نہیں چھوڑتا (۶)

ایک دوسری حدیث میں ہے ۔

اِذَا رَاَيْتَ الْفَقْرَ مُقْبِلًا فَقُلْ مَرْحَبًا بِشِعَارِ الصَّالِحِيْنَ وَاِذَا رَاَيْتَ الْغِنٰى مُقْبِلًا فَقُلْ ذَنْبٌ عُجِّلَتْ عُقُوْبَتُهُ ۔ (۷)

جب تم فقر کو اپنی طرف متوجہ دیکھو تو کہو نیک لوگوں کی نشانی ! مبارک ہو اور جب مالداری کو آتے ہوتے دیکھو تو کہو یہ کسی گناہ کی جلدی ملنے والی سزا ہے ۔

---

(۱) (۲)

(۳) الفردوس بماثور الخطاب جلد ۲ ص ۷۰ حدیث ۲۳۹۹

(۴) الفردوس بماثور الخطاب جلد ۵ ص ۵۰۷ حدیث ۸۹۰۹

(۵) المستدرک للحاکم جلد ۳ ص ۳۱۱ کتاب معرفۃ الصحابۃ

(۶) کنزالعمال جلد ۱۰ ص ۱۰۱۰۰ حدیث ۳۰۷۹۳ (۷)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا اے میرے رب! تجھے مخلوق میں سے کون زیادہ پسند ہے تاکہ تیری وجہ سے میں بھی اس سے محبت کروں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہر فقیر فقیر۔ ممکن ہے دوسری مرتبہ لفظ فقیر کا استعمال تاکید کے لیے ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ سخت مصیبت والا مراد ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں مسکینی کو پسند کرتا ہوں اور دولت کو برا جانتا ہوں اور آپ کو تمام ناموں میں سے لفظ مسکین زیادہ پسند تھا کہ اس سے آپ کو پکارا جائے (اے مسکین)

جب عرب کے سرداروں اور مالدار لوگوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ ایک دن ہمارے لیے مقرر فرمائیں اور ایک دن ان (اصحاب صفہ) کے لیے مقرر فرمائیں جب وہ آپ کے پاس آئیں تو ہم نہ آئیں اور جب ہم آئیں تو وہ نہ آئیں انہوں نے حضرت بلال، حضرت سلمان فارسی، حضرت صہیب رومی، حضرت، ابوذر غفاری، خباب بن ارت، حضرت عمار بن یاسر، حضرت ابوہریرہ اور دیگر اصحاب صفہ (رضی اللہ عنہم) جو فقیر تھے ان کے بارے میں کہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بات مان لی ان (کفار مکہ) نے آپ سے یہ مطالبہ اس لیے کیا تھا کہ ان کو ان (فقراء صحابہ کرام) کے کپڑوں سے بو آتی تھی اور ان کا لباس اونی تھا اور سخت گرمی تھی جب ان کو پسینہ آتا تو اس کی بو پھیلتی جو مالدار لوگوں پر گراں گزرتی ان (سرداروں اور مالدار لوگوں) میں اقرع بن حابس تمیمی، عینیہ بن حص فزاری عباس بن مرداس سلمی اور کچھ دوسرے لوگ شامل تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ٹھیک ہے میں ان کو تمہارے ساتھ اکٹھا نہیں کروں گا۔ تو اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا۔ (۱)

اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھیں جو صبح شام اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں اور صرف اسی کی رضا کے طالب ہیں اور ان (فقراء) سے اپنی نگاہیں نہ پھیریں یہ مالدار لوگ تو دنیوی زندگی کی زینت چاہتے ہیں اور آپ اس کی بات نہ مانیں جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا۔ (۲)

اور ارشاد فرمایا۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (۳)

اور آپ فرما دیجئے حق میرے رب کی طرف سے ہے پس جس کا دل چاہے ایمان لائے اور جس کا دل چاہے کفر کرے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ کہف آیت ۲۸

(۲) حلیۃ الاولیاء جلد اوّل ص ۳۴۵ ترجمہ ۶۴

(۳) قرآن مجید، سورۂ کہف آیت ۲۹

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے بارگاہ نبوی میں حاضری کی اجازت طلب کی اس وقت آپ کے پاس عرب کے کچھ معزز افراد بیٹھے ہوئے تھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا آنا ناگوار گزرا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓی اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰٓی اَوْیَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی۔ (۱)

تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ ان کے پاس نابینا آیا اور آپ کو کیا معلوم ہو کہ شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا یا نصیحت حاصل کرے تو اسے نصیحت فائدہ دے لیکن جس نے بے نیازی اختیار کی آپ اس کی فکر میں ہیں۔ (۲)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

قیامت کے دن ایک بندے کو لایا جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس طرح معذرت کرے گا جس طرح دنیا میں لوگ ایک دوسرے سے معذرت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم میں نے تجھ سے دنیا اس لیے روک کر نہیں رکھی کہ تو میرے نزدیک ذلیل تھا بلکہ میں نے تمہارے لیے عزت اور فضیلت تیار کر رکھی ہے اے میرے بندے تو ان صفوں میں جا کر پہچان جس نے تجھے میری رضا کے لیے کھانا دیا یا جس نے میری رضا جوئی کے لیے تجھے لباس پہنایا تو اس کا ہاتھ پکڑ میں نے تجھے اس کا اختیار دیا اور اس دن لوگوں کو پسینے نے لگام ڈال رکھی ہوگی وہ صفوں میں جا کر ان لوگوں کو تلاش کرے گا جنہوں نے اس کے ساتھ یہ اچھا سلوک کیا پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے جنت میں لے جائے گا۔ (۳)

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

فقراء کی پہچان زیادہ رکھو اور ان کے ہاں سے نعمت حاصل کرو کیوں کہ ان کے پاس دولت ہے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان کی دولت کیا ہے؟ فرمایا جب قیامت کا دن ہوگا تو ان سے کہا جائے گا تلاش کرو کس نے تمہیں کھانا کھلایا یا پانی پلایا یا تمہیں لباس پہنایا ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں جنت میں لے جاؤ۔ (۴)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

میں جنت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے آگے حرکت سنی میں نے دیکھا تو وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے میں نے جنت کے بالائی حصے کی طرف دیکھا تو وہاں میری امت کے فقراء اور ان کی اولاد تھی پھر میں نے اس کی نچلی جانب دیکھا تو اس میں مالدار

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ عبس آیت ۱ تا ۵

(۲) جامع ترمذی ص ۴۸۱، ابواب التفسیر

(۳) کنز العمال جلد ۶ ص ۴۷۸ حدیث ۱۶۶۳۰

(۴) کنز العمال جلد ۶ ص ۴۶۸ // ۱۶۵۸۲ / لعل المتناہیہ جلد ۲ ص ۲۵ حدیث ۸۵۴

لوگ اور عورتیں تھیں اور وہ بھی کم تعداد میں تھے میں نے عرض کیا اے میرے رب! ان کو کیا ہوا ؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے تو ان کو دو سرخ چیزوں نے نقصان پہنچایا ایک سونا اور دوسرا ریشمی کپڑا اور مال دار لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے حساب وکتاب میں مشغول ہوگئے ہیں نے اپنے صحابہ کرام کو تلاش کیا تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو نہ پایا پھر وہ میرے پاس تشریف لائے اور وہ رو رہے تھے میں نے پوچھا آپ مجھ سے پیچھے کیسے رہ گئے ؟ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! اللہ کی قسم میں آپ تک اس وقت تک نہ پہنچ سکا جب تک بوڑھا کر دینے والے راستے طے نہ کر لیے اور میں نے سوچا کہ شاید آپ کو نہ دیکھ سکوں آپ نے پوچھا کیوں ؟ عرض کیا میرے مال کا حساب ہو رہا تھا۔ (۱)

تو دیکھئے یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہیں جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت بڑی سبقت حاصل ہے اور آپ ان دس صحابہ کرام میں سے ہیں جن کو دنیا میں ہی جنت کی خوشخبری دی گئی اور وہ ان مالدار لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (۲)

اِلَّا مَنْ قَالَ بِالْمَالِ هٰكَذَا وَهٰكَذَا۔ (۳) مگر جو اس طرح اس طرح مال دے۔

لیکن اس شان کے باوجود ان کو اس حد تک مال داری کا نقصان ہوا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک فقیر آدمی کے پاس تشریف لے گئے تو اس کے لیے کچھ نہ دیکھا تو فرمایا۔

لَوْ قُسِمَ نُوْرُ هٰذَا عَلٰى اَهْلِ الْاَرْضِ لَوَسِعَهُمْ۔ (۴) اگر اس کا نور زمین والوں میں تقسیم کیا جائے تو سب کو کافی ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا میں تمہیں جنتیوں کے بادشاہوں کی خبر نہ دوں صحابہ کرام نے عرض کیا ہاں کیوں نہیں یارسول اللہ! آپ نے فرمایا۔

كُلُّ ضَعِيْفٍ مُسْتَضْعَفٍ اَغْبَرَ اَشْعَثَ ذِىْ طِمْرَيْنِ لَا يُؤْبَهُ لَهٗ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ۔ (۴) ہر وہ کمزور جسے دبا دیا گیا جس کے چہرے پر گرد وغبار ہو اور بال بکھرے ہوئے ہوں اور اس کی پرواہ نہ کی جاتی ہو اگر وہ اللہ تعالیٰ پر قسم کھائے تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دے۔

---

(۱) مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۵۹ کتاب المناقب

(۲) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۲۸۲ کتاب السنۃ

(۳) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۸۲ کتاب الایمان والنذور (۴)

(۵) الترغیب والترہیب جلد ۴ ص ۱۴۶ کتاب النذر

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے بارگاہ نبوی میں ایک مقام حاصل تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے عمران! تمہیں ہمارے ہاں ایک مقام و مرتبہ حاصل ہے کیا تم حضرت خاتون جنت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی عیادت کے لیے جاؤ گے؟ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں پھر حضور کھڑے ہوئے اور میں بھی آپ کے ساتھ کھڑا ہوا حتی کہ آپ حضرت خاتون جنت کے دروازے پر کھڑے ہوئے اور دروازہ کھٹکھٹایا اور فرمایا "السلام علیکم أأدخل" (کیا میں اندر آسکتا ہوں) انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ تشریف لائیے آپ نے فرمایا اور جو کوئی میرے ساتھ وہ بھی؟ خاتون جنت نے پوچھا آپ کے ساتھ کون ہے یا رسول اللہ! فرمایا حضرت عمران ہیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو سچا نبی بنا کر بھیجا میرے اوپر تو صرف ایک کمبل ہے آپ نے اشارے سے بتایا کہ اس طرح کرو انہوں نے عرض کیا اس طرح میں اپنا جسم تو چھپالوں گی سر کو کس طرح ڈھانپوں گی؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر ایک پرانی چادر تھی آپ نے ان کی طرف ڈال دی اور فرمایا اس کو سر پر لپیٹ لو پھر حضرت خاتون جنت نے اجازت دی تو آپ داخل ہوئے سلام کرنے کے بعد فرمایا بیٹی! تم کیسی ہو؟ انہوں نے عرض کیا قسم بخدا! درد میں مبتلا رہی اور اس کے ساتھ درد میں اضافہ ہوا کہ میرے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں مجھے بھوک نے تکلیف پہنچائی ہے۔

(یہ سن کر) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رو پڑے اور فرمایا بیٹی! مت گھبراؤ اللہ کی قسم میں نے تین دن سے کھانا نہیں چکھا حالانکہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تم سے زیادہ معزز ہوں اگر میں اللہ تعالیٰ سے مانگتا تو وہ مجھے ضرور عطا کرتا لیکن میں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی ہے۔

پھر آپ نے ان کے کاندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا تمہیں خوشخبری ہو اللہ کی قسم تم جنتی عورتوں کی سردار ہو انہوں نے پوچھا فرعون کی زوجہ حضرت آسیہ کا کیا ہوگا حضرت مریم بنت عمران کا کیا حال ہوگا؟ آپ نے فرمایا حضرت آسیہ اپنے زمانے کی عورتوں کی اور حضرت مریم اپنے دور کی عورتوں کی سردار ہوں گی اور تم تمام جہان کی عورتوں کی سردار ہو گی تم سب ایسے گھروں میں ہوں گی جہاں کوئی شور اور تھکاوٹ نہ ہوگی پھر فرمایا اپنے چچا زاد پر قناعت کرو اللہ کی قسم میں نے تمہارا نکاح ایسے شخص سے کیا جو دنیا اور آخرت کا سردار ہے (۱)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

إِذَا أَبْغَضَ النَّاسُ فُقَرَاءَهُمْ وَأَظْهَرُوا عِمَارَةَ الدُّنْيَا وَتَكَالَبُوا عَلَى جَمْعِ الدَّرَاهِمِ رَمَاهُمُ اللّٰهُ بِأَرْبَعِ خِصَالٍ بِالْقَحْطِ مِنَ الزَّمَانِ وَالْجَوْرِ مِنَ السُّلْطَانِ وَالْخِيَانَةِ مِنْ وُلَاةِ الْأَحْكَامِ وَالشَّوْكَةِ مِنَ الْأَعْدَاءِ۔ (۱)	جب لوگ اپنے فقراء کو برا جانیں گے اور دنیا کی تعمیر کو ظاہر کریں گے نیز درھم جمع کرنے کی حرص کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو چار باتوں میں مبتلا کردے گا ایک زمانے کا قحط دوسرا بادشاہ کا ظلم، تیسرا والیانِ حکام کی خیانت اور چوتھا دشمن کا غلبہ اور قوت۔

---

(۱) المستدرک للحاکم جلد ۳ ص ۳۲۵

آثار :

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا دو درہموں والے کی قید سخت ہوگی یا فرمایا اس کا حساب ایک درہم والے سے زیادہ سخت ہوگا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کی طرف ایک ہزار دینار بھیجے تو وہ غمگین اور شکستہ دل گھر میں آئے ان کی بیوی نے پوچھا کوئی نئی بات پیدا ہوگئی؟ انہوں نے فرمایا اس سے بھی بڑھ کر ہے پھر فرمایا اپنا پرانا دوپٹہ مجھے دو چنانچہ انہوں نے اسے لے کر پھاڑا اور تھیلیاں بنائیں اور درہم تقسیم کر دیئے پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے اور صبح تک روتے رہے اس کے بعد فرمایا میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا۔

يَدْخُلُ فُقَرَاءُ اُمَّتِي الْجَنَّةَ قَبْلَ الْاَغْنِيَاءِ بِخَمْسِمِائَةِ عَامٍ حَتّٰى اَنَّ الرَّجُلَ مِنَ الْاَغْنِيَاءِ يَدْخُلُ فِي غِمَارِهِمْ فَيُؤْخَذُ بِيَدِهٖ فَيُسْتَخْرَجُ۔ (۱)	میری امت کے فقراء مال دار لوگوں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں جائیں گے یہاں تک کہ مال دار لوگوں میں سے ایک شخص ان کی جماعت میں گھس آئے گا تو اسے پکڑ کر نکال دیا جائے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تین (قسم کے) آدمی جنت میں کسی حساب کے بغیر جائیں گے ایک وہ شخص جو اپنا کپڑا دھونا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس کوئی پرانا کپڑا نہیں جسے پہنے دوسرا وہ شخص جس نے اپنے چولہے پر دو ہنڈیاں نہ چڑھائی ہوں اور تیسرا وہ شخص جو پانی مانگے تو یہ نہ کہا جائے کہ کونسا پانی مانگ رہا ہے (مطلب یہ ہے کہ زندگی میں تکلف نہ ہو۔)

ایک فقیر حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کی مجلس میں آیا تو آپ نے فرمایا قریب آؤ اگر تم مال دار آدمی ہوتے تو میں تمہیں قریب نہ کرتا اور ان کے مال دار دوست پسند کرتے تھے کہ وہ فقیر ہوتے کیوں کہ آپ، فقیروں کو زیادہ قریب کرتے اور مالداروں کی طرف (زیادہ) توجہ نہ دیتے۔

حضرت مؤمل فرماتے ہیں میں نے حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ کی مجلس میں مال دار لوگوں سے زیادہ ذلیل اور فقراء سے زیادہ کسی کو معزز نہیں دیکھا۔ کسی دانا نے فرمایا اگر آدمی بیچارہ جہنم سے اس قدر ڈرتا جس قدر وہ فقر سے ڈرتا ہے تو ان دونوں سے نجات پاتا اور اگر جنت میں اس طرح رغبت رکھتا جس طرح مالداری میں رغبت رکھتا ہے تو دونوں کے ساتھ کامیابی حاصل کرتا اور اگر باطنی طور پر اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرتا جس قدر ظاہر میں اس کی مخلوق سے ڈرتا ہے تو دونوں جہانوں میں سعادت مند ہوتا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا وہ شخص لعنت کا مستحق ہے جو مال دار کی عزت کرتا اور فقیر کی توہین کرتا ہے (یعنی مالداری اور غربت کی وجہ سے ایسا کرتا ہے ورنہ مالدار کی نیکی کی وجہ سے اس کی عزت کرنا اور فقیر کی برائی کی وجہ سے

---

(۱) کنز العمال جلد ۶ ص ۴۷۷ حدیث ۱۶۶۲۵

اس سے نفرت کرنا جائز ہے ۱۲ ہزاروی)

حضرت لقمان حکیم نے اپنے بیٹے سے فرمایا کسی شخص کو اس کے پرانے کپڑوں کی وجہ سے ہرگز حقیر نہ جاننا کیوں کہ تمہارا اور اسی کا رب ایک ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ نے فرمایا اگر تم فقراء سے محبت کرو تو انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت ہے اور اپنی مجلس میں ان کو ترجیح دو تو یہ صالحین کا طریقہ ہے اور ان کی صحبت سے بھاگنا منافقین کا طریقہ ہے۔

اور پہلی کتب سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ آپ اس بات سے ڈریں کہ میں آپ پر ناراض ہو جاؤں اور آپ میری نگاہوں سے گر جائیں پھر میں آپ پر دنیا مکمل طور پر انڈیل دوں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ایک دن میں ایک لاکھ درہم تقسیم کر دیتی تھیں اور یہ درہم آپ کے پاس حضرت معاویہ، حضرت ابن عامر اور دوسرے حضرات رضی اللہ عنہم بھیجا کرتے تھے اور آپ کے دوپٹے پر پیوند لگے ہوتے تھے آپ کی لونڈی عرض کرتیں کہ اگر آپ افطاری کے لیے ایک درہم کا گوشت خریدتیں تو اچھا ہوتا اور آپ نے روزہ رکھا ہوتا تو آپ فرماتیں اگر تم مجھے (پہلے) یاد دلاتیں تو میں ایسا کرتی۔

ام المومنین رضی اللہ عنہا کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تھی کہ ــــــــ

اِنْ اَرَدْتِ اللُّحُوْقَ بِیْ فَعَلَیْكِ بِعَیْشِ الْفُقَرَاءِ وَاِیَّاكِ وَمُجَالَسَةَ الْاَغْنِیَاءِ وَلَا تَسْتَرْعِیْ دِرْعَكِ حَتّٰی تُرَقِّعِیْهِ۔ (۱)	اگر تم میرے ساتھ ملنا چاہتی ہو تو فقراء جیسی زندگی گزارنا ہوگی، مالدار لوگوں کی مجالس سے بچنا ہوگا اور اس وقت چادر نہ اتارنا جب تک اس پر پیوند نہ لگاؤ۔

(فضول خرچی سے منع فرمایا آج ہماری صورت حال یہ ہے کہ گھر میں کپڑوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں لیکن پھر بھی نیا کپڑا خریدنا فرض سمجھا جاتا ہے کیوں کہ بازار میں نئی ورائٹی آئی ہے ۱۲ ہزاروی)

ایک شخص حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کے پاس دس ہزار درھم لے کر حاضر ہوا تو آپ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اس شخص نے بہت منت سماجت کی تو آپ نے فرمایا کہ تم چاہتے ہو کہ میں دس ہزار درہم کے بدلے میں اپنا نام فقراء کے رجسٹر سے نکال دوں میں ایسا کبھی بھی نہیں کروں گا۔

<u>فصل ۳:</u>

خاص فقراء، راضی، قانع اور صادق کی فضیلت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

---

(۱) المستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۳۱۲ کتاب الرقاق

طُوبیٰ لِمَنْ هُدِیَ اِلَی الْاِسْلَامِ وَ کَانَ عَیْشُہٗ کَفَافًا وَّ قَنَعَ بِہٖ۔ (۱)

اس شخص کے لیے خوشخبری ہے جس کی اسلام کی طرف راہنمائی کی گئی اور اسے پورا پورا رزق دیا گیا اور وہ اس پر قناعت کرتا ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

یَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ اَعْطُوا اللّٰہَ الرِّضَا مِنْ قُلُوْبِکُمْ تَظْفَرُوْا بِثَوَابِ فَقْرِکُمْ وَاِلَّا لَا۔ (۲)

اے فقراء کی جماعت! اپنے دلوں سے اللہ تعالیٰ سے راضی رہو گے تو اپنے فقر کا ثواب پاؤ گے ورنہ نہیں۔

تو پہلی حدیث میں قانع (فقیر) کا ذکر تھا اور اس میں راضی کا ذکر ہے اور اس حدیث کے معانی سے معلوم ہوتا ہے کہ حریص فقیر کو اس کے فقر کا ثواب نہیں ملے گا لیکن فقر کی فضیلت میں وارد عام احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اس کے لیے بھی ثواب ہے جیسے اس کی تحقیق آگے آئے گی اور شاید یہاں عدم رضا سے مراد اللہ تعالیٰ کا فعل ہو کہ اس نے اس سے دنیا کو روک رکھا ہے اس کی ناپسندیدگی مراد ہو۔ اور کئی لوگ جو مال میں رغبت رکھتے ہیں کہ ان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے فعل پر کسی قسم کا اعتراض یا نفرت کا خیال نہیں آتا۔ پس یہ ناپسندیدگی فقر کے ثواب کو ضائع کرتی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا آپ نے فرمایا۔

اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ مِفْتَاحًا وَمِفْتَاحُ الْجَنَّۃِ حُبُّ الْمَسَاکِیْنِ وَالْفُقَرَاءِ لِصَبْرِہِمْ ھُمْ جُلَسَاءُ اللّٰہِ تَعَالٰی یَوْمَ الْقِیَامَۃِ۔ (۳)

بے شک ہر چیز کی ایک چابی ہوتی ہے اور جنت کی چابی مساکین اور فقراء سے محبت کرنا ہے کیوں کہ وہ صبر کرتے ہیں اور وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ہم نشین ہوں گے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا۔

اَحَبُّ الْعِبَادِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی اَلْفَقِیْرُ الْقَانِعُ بِرِزْقِہٖ الرَّاضِیْ عَنِ اللّٰہِ تَعَالٰی۔ (۴)

اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں میں سے سب سے زیادہ محبوب وہ فقیر ہے جو اپنے رزق پر قناعت کرتا ہے (اور) اللہ تعالیٰ سے راضی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دعا مانگی۔

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۱۹ مرویات فضالہ بن عبید انصاری

(۲) کنز العمال جلد ۶ ص ۴۸۵ حدیث ۱۶۶۵۵

(۳) کنز العمال جلد ۶ ص ۴۶۹ حدیث ۱۶۵۸۱

(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۶۲ مرویات عیاض بن حمار

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ قُوْتَ آلِ مُحَمَّدٍ كَفَافًا۔ (۱)
اے اللہ! آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا پورا رزق عطا فرما۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

مَا مِنْ اَحَدٍ غَنِيٍّ وَلَا فَقِيْرٍ اِلَّا وَدَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِنَّهٗ كَانَ اُوْتِيَ قُوْتًا فِي الدُّنْيَا۔ (۲)
کوئی مالدار اور فقیر ایسا نہیں جو قیامت کے دن اس بات کو پسند نہ کرے کہ کاش اسے دنیا میں گزارے کے مطابق رزق دیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ مجھے شکستہ دل لوگوں میں تلاش کریں انہوں نے عرض کیا وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا سچے فقراء۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا اَحَدَ اَفْضَلَ مِنَ الْفَقِيْرِ اِذَا كَانَ رَاضِيًا۔ (۳)
فقیر سے افضل کوئی نہیں جب کہ وہ (فقر پر) راضی ہو

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا۔

میری مخلوق کے پسندیدہ لوگ کہاں ہیں؟ فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے رب! وہ کون لوگ ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا مسلمان فقراء جو میری عطا پر قناعت کرنے اور میری تقدیر پر راضی ہوتے ہیں ان کو جنت میں داخل کرو پس وہ جنت میں داخل ہو کر کھائیں اور پئیں گے جب کہ دوسرے لوگ حساب میں پھنسے ہوں گے (۴)

تو یہ قانع اور راضی کے بارے میں ہے زاہد کی فضیلت اس بیان کے دوسرے حصے میں ذکر کریں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

رضا اور قناعت کے بارے میں آثار بے شمار ہیں اور یہ بات مخفی نہیں کہ قناعت، طمع کی ضد ہے۔ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا طمع فقر ہے اور ناامید ہو جانا مالداری ہے اور جو شخص اس چیز سے ناامید ہو کر قناعت کرے جو لوگوں کے پاس ہے تو وہ ان سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہر دن ایک فرشتہ عرش کے نیچے سے اعلان کرتا ہے اے انسان! تھوڑا جو

---

(۱) صحیح مسلم جلد اول ص ۳۳۷ کتاب الزکوٰۃ

(۲) سنن ابن ماجہ ص ۳۱۵، ابواب الزہد

(۳)

(۴) کنز العمال جلد ۶ ص ۴۷۸ حدیث ۱۶۶۳۰

تمہیں کافی ہے اس زیادہ سے بہتر ہے جو تمہیں سرکش بنا دے اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے فرمایا۔ ہر شخص کی عقل میں نقص ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس کے پاس دنیا زیادہ آتی ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے جب کہ رات اور دن اس کی عمر کو ختم کرنے میں لگے ہوئے ہیں پھر اس سے اس کو غم بھی نہیں ہوتا۔ اے انسان! افسوس وہ مال نفع نہیں دیتا جو بڑھتا ہے اور عمر کم ہو جاتی ہے۔

کسی دانا سے پوچھا گیا کہ مالداری کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا تمنا کم کرنا اور جو جتنا مال کافی ہو اس پر راضی ہونا۔

کہا گیا کہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ خراسان کے مالدار لوگوں میں سے تھے ایک دن آپ اپنے محل سے دیکھ رہے تھے کہ محل کے صحن میں ایک شخص نظر آیا اس کے ہاتھ میں روٹی تھی جسے کھا رہا تھا جب کھا چکا تو سو گیا آپ نے اپنے ایک غلام سے فرمایا جب یہ شخص بیدار ہو تو اسے میرے پاس لے کر آنا جب وہ بیدار ہوا تو غلام اسے آپ کے پاس لے گیا حضرت ابراہیم ادھم رحمہ اللہ نے پوچھا اے شخص! تم نے بھوک کی حالت میں روٹی کھائی؟ اس نے عرض کیا جی ہاں آپ نے پوچھا تم سیر ہو گئے؟ اس نے جواب دیا جی ہاں فرمایا پھر تم اچھی طرح سو گئے؟ اس نے عرض کیا جی ہاں۔ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ نے اپنے آپ سے کہا میں اس دنیا کو کیا کروں گا جب کہ نفس اتنی مقدار پر قناعت کر لیتا ہے۔

ایک شخص حضرت عامر بن عبدالقیس رحمہ اللہ کے پاس سے گزرا وہ نمک اور سبزی کھا رہے تھے آپ نے فرمایا اللہ کے بندے! کیا تو دنیا سے اتنی سی چیز پر راضی ہو گیا؟ اس نے کہا کیا میں آپ کو بتاؤں جو شخص اس سے زیادہ بری چیز پر راضی ہوا۔ فرمایا ہاں بتاؤ فرمایا جو آخرت کے بدلے دنیا پر راضی ہو جائے۔

حضرت محمد بن واسع رحمہ اللہ خشک روٹی نکال کر اسے پانی سے تر کرتے اور نمک کے ساتھ کھاتے اور فرماتے جو شخص دنیا میں سے اتنی مقدار پر راضی ہو وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے فرمایا ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی لیکن انہوں نے اس کی تصدیق نہ کی ارشاد خداوندی ہے۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ۔ (۱)

اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے پس آسمانوں اور زمین کے رب کی قسم بیشک یہ حق ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ایک دن لوگوں کے درمیان تشریف فرما تھے ایک عورت حاضر ہوئی اور اس نے عرض کیا آپ ان لوگوں کے درمیان بیٹھے ہیں اللہ کی قسم گھر میں نہ کھانے کو کچھ ہے اور نہ پینے کو آپ نے فرمایا اے فلاں خاتون!

---

(۱) قرآن مجید، سورہ الذاریات آیت ۲۲،۲۳

ہمارے سامنے ایک دشوار گزار گھاٹی ہے اس سے وہی نجات حاصل کرے گا جو ہلکا پھلکا ہو گا چنانچہ وہ راضی ہو کر واپس ہو گئی۔

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ نے فرمایا کفر کے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو فاقہ زدہ ہو اور صبر نہ کرے۔

کسی دانا شخص سے پوچھا گیا تمہارا مال کیا ہے؟ اس نے کہا ظاہر میں زیب و زینت، باطن میں میانہ روی اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے مایوسی۔

ایک روایت میں ہے کہ پہلی آسمانی کتب میں سے کسی کتاب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے انسان! اگر تمام دنیا تمہارے لیے ہوتی پھر بھی تیرے لیے کھانا ہی ہوتا تو میں نے تجھے اس سے کھانا دے دیا اور اس کا حساب دوسروں کے ذمہ کر دیا تو میں نے تم پر احسان کیا۔ قناعت کے بارے میں کہا گیا۔

اِضْرَعْ اِلَی اللّٰهِ لَا تَضْرَعْ اِلَی النَّاسِ
وَاقْنَعْ بِیَاسٍ فَاِنَّ الْعِزَّ فِی الْیَاسِ
وَاسْتَغْنِ عَنْ کُلِّ ذِیْ قُرْبٰی وَذِیْ رَحِمٍ
اِنَّ الْغَنِیَّ مَنِ اسْتَغْنٰی عَنِ النَّاسِ

اللہ تعالیٰ کے ہاں فریاد کرو لوگوں کے سامنے فریاد نہ کرو اور (لوگوں سے) مایوسی پر قناعت کرو کیوں کہ عزت (لوگوں سے) مایوسی میں ہے ہر قرابت دار اور ذی رحم رشتہ دار سے مستغنی ہو جاؤ کیوں کہ مالدار وہی ہے جو لوگوں سے بے نیازی اختیار کرے۔

⁂ ⁂ ⁂

اسی معنیٰ میں یہ بھی کہا گیا ہے۔

یَا جَامِعًا مَانِعًا وَالدَّهْرُ یَرْمُقُهُ
مُقَدِّرًا اَیَّ بَابٍ مِنْهُ یُغْلِقُهُ

اے جمع کرنے والے اور روکنے والے زمانہ تیری تاک میں ہے وہ اس بات کا اندازہ کرتا ہے کہ اس سے کس دروازے کو بند کرے

مُفَکِّرًا کَیْفَ تَاْتِیْهِ مَنِیَّتُهٗ
اَغَادِیًا اَمْ بِهَا یَسْرِیْ فَتَطْرُقُهٗ

وہ اس فکر میں ہے کہ اس کے پاس موت صبح کے وقت آئے یا رات کو نازل ہو۔

جَمَعْتَ مَالًا فَقُلْ لِیْ هَلْ جَمَعْتَ لَهٗ
یَا جَامِعَ الْمَالِ اَیَّامًا تُفَرِّقُهٗ

تو نے مال جمع کیا تو مجھے بتا کہ اے مال کو جمع کرنے والے اسے کب تقسیم کرے گا۔

اَلْمَالُ عِنْدَکَ مَخْزُوْنٌ بِوَارِثِهٖ
مَا الْمَالُ مَالُکَ اِلَّا یَوْمَ تُنْفِقُهٗ

تیرے پاس جو مال ہے وہ وارثوں کے لیے جمع ہے تیرا مال صرف وہی ہے جسے تو خرچ کرتا ہے۔

اَرْفِهْ بِبَالِ فَتًی یَغْدُوْ عَلٰی ثِقَةٍ
اَنَّ الَّذِیْ قَسَمَ الْاَرْزَاقَ یَرْزُقُهٗ

خوش دل وہی نوجوان ہے جسے اس بات کا یقین ہو کہ قاسم رزق اسے رزق دے گا۔

فَالْعِرْضُ مِنْهُ مَصُوْنٌ مَا یُدَنِّسُهٗ وَالْوَجْهُ مِنْهُ جَدِیْدٌ لَیْسَ یُخْلِقُهٗ

اس کی عزت محفوظ ہے اسے کوئی چیز میلا نہیں کر سکتی اور اس کا چہرہ جدید (تازہ) ہے اس کو کوئی چیز پرانا نہیں کر سکتی۔

اِنَّ الْقَنَاعَةَ مَنْ یَحْلُلْ بِسَاحَتِهَا لَمْ یَبْقَ فِیْ ظِلِّهَا هَمٌّ یُؤَرِّقُهٗ

جو شخص قناعت کے صحن میں اترتا ہے اسے فکر معیشت بے خوابی کا شکار نہیں بناتی۔

فصل : ۴

مال داری پر فقر کی فضیلت

اس سلسلے میں اختلاف ہے حضرت جنید، حضرت خواص اور اکثر لوگ فقر کی فضیلت کے قائل ہیں حضرت ابن عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں شکر گزار مال دار جو حقوق کی ادائیگی کرے وہ صابر فقیر سے افضل ہے کہا جاتا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ نے حضرت عطاء کے خلاف بد دعا کی کیوں کہ انہوں نے اس سلسلے میں ان کی مخالفت کی تھی تو ان کو رنج پہنچا۔ یہ بات ہم نے صبر کے بیان میں ذکر کی اور صبر و شکر کے درمیان فرق کی وجہ بھی بیان کی ہے اور ہم نے یہ بھی بتایا کہ اعمال و احوال میں طلبِ فضیلت، تفصیل کے بغیر ممکن نہیں۔

اگر فقر اور غنا کا مطلقاً مقابلہ ہو تو احادیث و آثار کا مطالعہ کرنے والے کو فقر کی فضیلت میں شک نہیں ہوگا اور اس سلسلے میں تفصیل ضروری ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں۔

شک کا تصور دو جگہ پر ہوتا ہے ایک یہ کہ فقیر صابر ہو اور طلب کی حرص نہ رکھتا ہو بلکہ وہ قانع اور راضی ہے اس کی نسبت اس غنی کی طرف کی جائے جو اپنا مال اچھی جگہوں پر خرچ کرتا ہے اور مال کو روکنے کی حرص نہیں کرتا۔

دوسرا مقام وہ ہے جہاں فقیر حریص ہو اور مالدار بھی حریص ہو کیوں کہ یہ بات مخفی نہیں کہ صبر کرنے والا فقیر اس مالدار سے افضل ہے جو روکنے والا اور حریص ہے لیکن جو مالدار اپنا مال نیک کاموں پر خرچ کرتا ہے وہ حریص فقیر سے افضل ہے۔

پہلی صورت میں یہ گمان بھی ہو سکتا ہے کہ مالدار، فقیر سے افضل ہو کیوں کہ مال کی حرص کمزور ہونے میں دونوں برابر ہیں اور مال دار صدقات و خیرات کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے جب کہ فقیر اس بات سے عاجز ہے ہمارے خیال میں حضرت ابن عطاء رحمہ اللہ نے بھی یہی خیال فرمایا۔

لیکن وہ غنی جو مال سے فائدہ اٹھاتا ہے اگرچہ جائز مال ہی ہو اس کے بارے میں یہ تصور نہیں ہو سکتا کہ قناعت کرنے والے فقیر سے افضل ہو اور اس بات پر حدیث شریف گواہ ہے کہ فقراء نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی کہ مالدار لوگ نیکیوں میں ان سے آگے نکل گئے وہ صدقہ دیتے ہیں نیز حج اور جہاد کرتے ہیں تو آپ نے ان کو کلماتِ تسبیح (سبحان اللہ، الحمد للہ اور اللہ اکبر) سکھائے اور آپ نے بتایا کہ ان کلمات کے ذریعے ان کو مال دار لوگوں کی نسبت زیادہ

ثواب ملے گا مالدار لوگوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بھی تسبیح کے کلمات پڑھنے لگے فقراء دوبارہ بارگاہ نبوی میں حاضر ہوئے اور یہ بات گذارش کی تو آپ نے فرمایا یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے (۱)

حضرت عطاء رحمہ اللہ سے جب سوال کیا گیا تو انہوں نے بھی اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا مال دار افضل ہے کیوں کہ غنی ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے لیکن جہاں تک ان کی پہلی دلیل کا تعلق ہے تو وہ محل غور ہے کیوں کہ حدیث تو تفصیل سے بیان ہوتی ہے اور اس میں اس بات کے خلاف پر دلالت ہے وہ یہ کہ تسبیح میں فقیر کے لیے مالدار سے زیادہ ثواب ہے اور اس ثواب کا حصول ان کے لیے اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہے عطا فرمائے۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ فقراء نے اپنا ایک نمائندہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا اس نے عرض کیا کہ میں آپ کی بارگاہ میں فقراء کا نمائندہ ہوں آپ نے فرمایا۔

مَرْحَبًا بِكَ وَبِمَنْ جِئْتَ مِنْ عِنْدِهِمْ قَوْمٌ اُحِبُّهُمْ۔

تجھے بھی اور جن کے پاس سے تو آیا ہے سب کو خوش آمدید کہتا ہوں میں اس قوم سے محبت کرتا ہوں۔

اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! فقراء کہتے ہیں کہ مال دار لوگ بھلائی لے گئے وہ حج کرتے ہیں لیکن ہمیں اس کی طاقت نہیں وہ عمرہ کرتے ہیں لیکن ہم نہیں کر سکتے اور جب وہ بیمار ہوتے ہیں تو اپنا زائد مال ذخیرہ بنانے کے لیے بھیج دیتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

میری طرف سے فقراء تک یہ بات پہنچا دو کہ تم میں سے جو صبر کرے گا اور ثواب کا طالب ہوگا اس کے لیے تین باتیں ہیں جو مال دار لوگوں کے لیے نہیں ہیں ایک بات یہ کہ جنت میں کچھ بالاخانے ہیں اہل جنت ان کی طرف اس طرح دیکھیں گے جس طرح زمین والے ستاروں کو دیکھتے ہیں مگر ان میں فقیر نبی یا فقیر شہید یا مومن فقیر ہی داخل ہوگا اور دوسری خصلت یہ ہے کہ فقراء جنت میں مالدار لوگوں سے نصف دن پہلے داخل ہوں گے اور دن پانچ سو سال کا ہوگا اور تیسری بات یہ کہ جب مالدار "سبحان اللہ"، "الحمد للہ" اور "لا الہ الا اللہ واللہ اکبر" پڑھتا ہے اور فقیر بھی یہی کلمات کہتا ہے تو مالدار، فقیر کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا اگرچہ وہ اس مقصد کے لیے دس ہزار درھم خرچ کرے باقی تمام نیک اعمال کا بھی یہی حال ہے (۲)

وہ شخص واپس آیا اور جو کچھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا ان (فقراء) کو بتا دیا تو انہوں نے کہا ہم راضی ہوئے ہم راضی ہوئے۔

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۱ ص ۲۱۹، کتاب المساجد

(۲) سنن ابن ماجہ ص ۳۱۳، ابواب الزھد، (مختصر ہے مکمل نہیں ملتی)

پس یہ اس بات پر دلالت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کہ "یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے" سے مراد یہ کہ فقراء کے ذکر کو اغنیاء کے ذکر سے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔

جہاں تک ان کی اس بات کا تعلق ہے کہ "غنی" اللہ تعالیٰ کی صفت ہے تو بعض اکابر نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ کیا تم اللہ تعالیٰ کو اسباب اور سامان کے ساتھ غنی جانتے ہو؟ (یعنی ایسا تو نہیں ہے) تو حضرت عطاء نے کچھ جواب نہ دیا۔

بعض دوسرے حضرات نے یوں جواب دیا کہ تکبر اللہ تعالیٰ کی صفت ہے تو وہ بھی تواضع سے افضل ہونا چاہیے پھر انہوں نے فرمایا بلکہ یہ تو اس بات پر دلالت ہے کہ فقر افضل ہے کیوں کہ وہ بندے کی صفت ہے اور بندے کے لیے افضل ہے جیسے خوف اور امید۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں اس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا اسی لیے ایک حدیث قدسی میں ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِیْ وَالْعَظَمَةُ إِزَارِیْ فَمَنْ نَازَعَنِیْ وَاحِدًا مِنْهُمَا قَصَمْتُهٗ۔ (۱)

کبریائی میری چادر اور عظمت میں میرا ازار ہے (یعنی میری صفات ہیں) پس جو شخص مجھ سے ان میں سے ایک میں بھی جھگڑے گا میں اسے توڑ دوں گا۔

حضرت سہل رحمہ اللہ نے فرمایا۔ عزت اور باقی رہنے کی چاہت ربوبیت میں شرک اور جھگڑا ہے کیوں کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہیں۔

تو مال داری اور فقر میں سے کس کو فضیلت حاصل ہے اس سلسلے میں اس قسم کی گفتگو ہے اور اس کا تعلق عام روایات سے ہے جو تاویلات کو قبول کرتی ہیں اور ایسے فاسد کلمات ہیں جن کو توڑنا بعید نہیں ہے کیوں کہ جس طرح اس شخص کے قول کو توڑا جا سکتا ہے جو مالداری کو فضیلت دیتا ہے اور اس کا توڑ صفت تکبر کے ذریعے کیا جاتا ہے اسی طرح جو شخص مالداری کی مذمت کرتا ہے اس کا قول یوں توڑا جا سکتا ہے کہ یہ علم و معرفت کے ذریعے بندے کا وصف بنتا ہے جب کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا وصف ہے بندے کا وصف تو جہالت اور غفلت ہے اور کوئی بھی شخص غفلت کو علم پر فضیلت نہیں دیتا پس اس پردے کو اسی طرح دور کیا جا سکتا ہے جو ہم نے صبر کے بیان میں ذکر کیا ہے۔ یعنی جو چیز ذاتی طور پر مراد نہ ہو بلکہ کسی دوسری چیز کے لیے مراد ہو تو اس کی نسبت اسی دوسری چیز کی طرف ہونی چاہیے (اور اسی کے حوالے سے فضیلت کا تعین ہوگا) کیوں کہ اسی سے اس کی فضیلت ظاہر ہوگی اور دنیا ذاتی طور پر منع نہیں ہے۔

بلکہ اس لیے منع ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے اسی طرح فقر بھی ذاتی طور پر مطلوب نہیں بلکہ اس لیے مطلوب ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ تک پہنچنے سے رکاوٹ نہیں ہے اور آدمی اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر کسی دوسری طرف مشغول نہیں

---

(۱) مسند امام بن حنبل جلد ۲ ص ۴۱۴ مرویات ابی ہریرہ

ہوتا اور کتنے ہی مال دار ہیں جن کو ان کی مالداری اللہ تعالیٰ سے مشغول نہیں رکھتی جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت عثمان غنی اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما اور کتنے ہی فقراء ایسے ہیں جن کو فقر نے مشغول رکھا اور مقصد سے پھیر دیا اور دنیا میں غایت مقصد تو اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس سے مانوس ہونا ہے اور یہ بات معرفت کے بعد حاصل ہوتی ہے اور مشاغل کے ساتھ معرفت کے راستے پر چلنا ممکن نہیں اور فقر بعض اوقات مشغول کر دیتا ہے جس طرح مالداری بعض اوقات مشغول رکھتی ہے اور مشغول کرنے والی بات حقیقت میں محبت دینا ہے کیوں کہ دل میں اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت جمع نہیں ہو سکتی اور جو شخص کسی سے محبت کرتا ہے اس کے ساتھ مشغول ہوتا ہے چاہے فراق کی صورت میں مشغولیت ہو یا وصال کی صورت میں ـــــ

بعض اوقات فراق کے ساتھ مشغولیت زیادہ ہوتی ہے اور بعض اوقات وصال کی صورت میں زیادہ مشغول ہوتا ہے اور دنیا غافل لوگوں کی معشوق ہے جو اس سے محروم ہیں اور اس کی طلب میں مشغول ہیں۔ اور جو آدمی دنیا پر قادر ہے وہ اس کی حفاظت اور اس سے نفع اندوزی میں مشغول ہے۔

تو نتیجہ یہ ہوا کہ اگر تم دو آدمیوں کو دنیا کی محبت سے فارغ تصور کرو اس طرح کہ ان کے حق میں مال پانی کی طرح ہو کہ جس کے پاس موجود ہے اور جس کے پاس نہیں ہے دونوں برابر ہیں کیوں کہ دونوں میں سے ہر ایک حسبِ ضرورت خرچ کرتا ہے اور حاجت کے مطابق پایا جانا اس کے نہ ہونے سے افضل ہے کیوں کہ بھوکا آدمی موت کے راستے پر چلتا ہے معرفت کے راستے پر نہیں اور بڑے معاملے کو دیکھو تو فقیر خطرے سے زیادہ دور ہے کیوں کہ مالداری کا فتنہ تنگدستی کے فتنے سے زیادہ سخت ہے اور حفاظت یہی ہے کہ قادر نہ ہو۔ اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہم مفلسی کے فتنہ میں مبتلا ہوئے تو ہم نے صبر کیا اور ہم مالداری کے فتنے میں مبتلا ہوئے تو ہم نے صبر نہ کیا۔

اور یہ بات انسان کی فطرت میں ہے شاذ و نادر ہی کوئی اس سے خالی ہوگا جس کا وجود بہت زمانوں میں کم ہوا کرتا ہے۔

اور چوں کہ شریعت کا خطاب سب سے متعلق ہے اس نادر کے ساتھ نہیں اور مفلسی سب کے لیے مناسب ہے صرف اس نادر کے لیے نہیں تو شریعت نے مالداری کی مذمت کی اور اس سے روکا نیز فقر کی فضیلت اور مدح بیان فرمائی حتیٰ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا "اہل دنیا کے مالوں کو نہ دیکھو کیوں کہ ان کے مالوں کی چمک تمہارے نورِ ایمان کو لے جائے گی"۔ اور بعض علماء نے فرمایا، مالوں کا پھیر پھیر اکر آنا ایمان کی حلاوت کو چوس لیتا ہے اور ایک حدیث شریف میں ہے۔

اِنَّ لِكُلِّ اُمَّةٍ عِجْلًا وَعِجْلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الدِّيْنَارُ وَالدِّرْهَمُ (۱)

ہر امت کے لیے ایک بچھڑا (معبود) ہے اور اس امت کا بچھڑا دینار اور درہم ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے بچھڑے کی اصل بھی سونے اور چاندی سے تھی مال اور پانی نیز سونے اور پتھر کا ایک جیسا

---

(۱) الفردوس بماثور الخطاب جلد ۳ ص ۳۲۸ حدیث ۵۰۱۹

ہونا انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے لیے تصور کیا جاسکتا ہے پھر ان کے لیے بھی یہ بات طویل مجاہدے کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل سے پوری ہوتی ہے کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے فرماتے تھے۔

اِلَيْكَ عَنِّيْ (۱) مجھ سے دُور ہو جاؤ۔

آپ یہ بات اس وقت فرماتے جب وہ مزین ہو کر آپ کے سامنے آتی حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے اسے زرد رنگ والے (دینار) میرے سوا کسی اور کو دھوکہ دے اور سفید رنگ والے (درہم) میرے علاوہ کسی کو دھوکہ دے ——— آپ نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ آپ اس کے دھوکے کو اپنے اندر محسوس فرماتے اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھتے اور یہ مطلق غنا ہے کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ اِنَّمَا الْغِنٰى عَنِ النَّفْسِ۔ (۲) مالداری مال کی کثرت سے نہیں بلکہ مالداری (غنائے) نفس کی ہے۔

اور جب یہ بات بہت دشوار ہے تو عام مخلوق کے حق میں مال کا نہ ہونا بہتر ہے اگرچہ وہ اسے صدقہ کریں اور نیک کاموں پر خرچ کریں کیوں کہ وہ مال پر قادر ہونے کی صورت میں دنیوی انس اور اس سے نفع اندوزی سے بچ نہیں سکتے۔ نیز اس کے خرچ کرنے سے راحت پاتے ہیں اور یہ تمام باتیں اس دنیا سے محبت پیدا کرتی ہیں اور آدمی جس قدر دنیا سے مانوس ہوتا ہے اسی قدر اسے آخرت سے وحشت ہوتی ہے اور جس قدر وہ معرفت کے علاوہ اپنی کسی صفت سے مانوس ہوتا ہے اسی قدر اسے اللہ تعالیٰ اور اس کی محبت سے وحشت ہوتی ہے اور جب دنیا سے اُنس کے اسباب منقطع ہو جائیں تو دل دنیا اور اس کی تروتازگی سے دُور رہتا ہے اور جب دل اللہ تعالیٰ کے ماسوا سے دُور ہو تو وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والا شمار ہوتا ہے اور وہ لازماً اللہ تعالیٰ کی طرف پھرتا ہے کیوں کہ فارغ دل کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اور موجود تو اللہ تعالیٰ ہے یا اس کا غیر، پس جو اللہ تعالیٰ کے غیر کی طرف متوجہ ہو وہ اللہ تعالیٰ سے دُور رہتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو وہ اس کے غیر سے دور رہتا ہے اور ان میں سے ایک کی طرف توجہ اسی حساب سے ہوتی ہے جس قدر دوسرے سے دُوری ہوتی ہے بلکہ کسی ایک کا قرب بعینہٖ دوسرے سے بُعد ہے پس دنیا کی محبت ہی اللہ تعالیٰ سے بُغض ہے لہٰذا مناسب یہ ہے کہ عارف کی نگاہ دل پر ہی ہونی چاہیے کہ وہ دنیا اور اس کے ساتھ مانوس ہونے سے علیحدگی اختیار کرے۔

تو فقر اور غنی کی فضیلت کو صرف اس حوالے سے دیکھا جائے گا کہ ان کے دل کا مال سے کس قدر تعلق ہے اگر اس تعلق میں دونوں برابر ہوں تو ان کا درجہ بھی برابر برابر ہو گا لیکن یہ پھسلنے کا مقام اور دھوکہ کی جگہ ہے کیوں کہ بعض اوقات مالدار یہ

---

(۱) حلیۃ الاولیاء جلد اول ص ۳۰، نزجمہ ۱

(۲) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۵۴ کتاب الرقاق

سمجھتا ہے کہ اس کا دل مال سے قطع تعلق ہے حالانکہ مال کی محبت اس کے سینے میں چھپی ہوتی ہے اور اسے خبر نہیں ہوتی اسے اس وقت پتہ چلتا ہے جب مال اس کے پاس نہیں رہتا تو اپنے نفس کا تجربہ اس وقت کرے جب مال تقسیم کرے یا اس سے چوری ہو جائے اب اگر اس کے دل کی توجہ اس طرف ہو تو جان لے کہ وہ دھوکے میں تھا کتنے ہی لوگ اپنی لونڈی کو یہ خیال کر کے بیچ دیتے ہیں کہ ان کے دل کا اس سے کوئی تعلق نہیں جب بیع پکی ہو جاتی ہے اور لونڈی خریدار کے حوالے کر دیتے ہیں تو ان کے دل میں چھپی ہوئی آگ شعلہ زن ہوتی ہے اس وقت ثابت ہوتا ہے کہ وہ دھوکے میں تھا اور اس کے دل میں عشق اسی طرح چھپا ہوا تھا جس طرح راکھ کے نیچے آگ موجود ہوتی ہے انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے علاوہ تمام مالدار لوگوں کا یہی حال ہے۔

اور جب بات محال یا کم از کم مشکل ہے تو ہم مطلق طور پر کہتے ہیں کہ عام مخلوق کے لیے فقر زیادہ مناسب اور افضل ہے کیوں کہ فقیر کا دنیا سے تعلق اور اُنس زیادہ کمزور ہوتا ہے اور جس قدر تعلق کمزور ہوتا ہے اسی قدر اس کی تسبیحات اور عبادات کا ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے کیوں کہ زبان کی حرکات ذاتی طور پر مقصود نہیں ہوتیں بلکہ ان کا مقصد اس مذکورہ اُنس کو پکا کرنا ہوتا ہے اور فارغ دل میں اُنس پیدا کرنے کے سلسلے میں اس کی تاثیر اس تاثیر کی طرح نہیں جو مشغول دل پر ہوتی ہے اسی لیے بعض بزرگوں نے فرمایا جو شخص طلب دنیا میں ہو اور عبادت کرے وہ اس شخص کی طرح ہے جو گھاس سے آگ کو بجھاتا ہے اور جو اپنے ہاتھ سے گوشت کی چکناہٹ کو مچھلی کے ساتھ دھوتا ہے حضرت ابوسلیمان دارانی رحمہ اللہ نے فرمایا فقیر کا کسی ایسی خواہش کے بغیر سانس لینا جس پر وہ قادر نہیں مالدار کی ایک ہزار سال کی عبادت سے بہتر ہے اور حضرت ضحاک رحمہ اللہ سے مروی ہے فرماتے ہیں جو شخص بازار جائے اور ایک مشتبہ چیز دیکھ کر صبر کرے اور ثواب کی طلب میں ہو تو یہ ایک ہزار دینار سے بہتر ہے جو وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرے ایک شخص نے حضرت بشر بن حارث رحمہ اللہ سے عرض کیا کہ میرے لیے دعا کیجئے مجھے اہل وعیال کی وجہ سے پریشانی ہے تو انہوں نے فرمایا جب تمہارے گھر والے کہیں کہ ہمارے پاس آٹا یا روٹی نہیں ہے تو تم اس وقت میرے لیے دعا مانگو کیوں کہ میری دعا کے مقابلے میں تمہاری دعا افضل ہے۔

اور وہ فرماتے تھے عبادت گزار مال دار کی مثال گندگی کے ڈھیر پر پائے جانے والے باغ کی طرح ہے اور عبادت گزار فقیر کی مثال موتیوں کے اس ہار کی طرح جو کسی خوبصورت عورت کے گلے میں پڑا ہوا ہو۔

اسلاف مال دار لوگوں سے معرفت کا علم سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یوں دعا مانگی۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ الذُّلَّ عِنْدَ النَّصَفِ مِنْ نَفْسِیْ وَالزُّهْدَ فِيْمَا جَاوَزَ الْكَفَافَ۔

یا اللہ! میں تجھ سے رحمت کا سوال کرتا ہوں جب میرا نصف۔

تو جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسے لوگ باوجود کمال حال کے دنیا سے بچتے ہیں تو کس طرح اس بات میں شک کیا جا سکتا ہے کہ مال کے پائے جانے کے مقابلے میں اس کا نہ ہونا زیادہ بہتر ہے —— اور یہ اس کے باوجود ہے جب کہ مال دار کا حال

نہایت اچھا ہو کہ وہ حلال مال حاصل کرے اور پاکیزہ خرچ کرے لیکن قیامت کے دن اس کا لمبا چوڑا حساب ہوگا اور طویل انتظار ہوگی اور جس سے حساب کی پوچھ گچھ ہوئی وہ عذاب میں مبتلا ہوا۔

اسی لیے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو جنت میں جانے سے تاخیر ہوئی کیوں کہ حساب میں مشغول تھے جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا اسی لیے حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ مسجد کے دروازے پر میری دوکان ہو مجھ سے نماز اور ذکر بھی نہ چھوٹے مجھے روزانہ پچاس دینار کا نفع ہو اور میں وہ سارا مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں صدقہ کروں پوچھا گیا ناپسندیدگی کی وجہ؟ فرمایا حساب کی خرابی۔

اسی لیے حضرت سفیان رحمہ اللہ نے فرمایا فقراء نے تین چیزیں اختیار کیں اور مالدار لوگوں نے بھی تین چیزیں اختیار کیں اور فقراء نے نفس کا آرام، دل کی فراغت اور حساب کی آسانی اختیار کی جب کہ مالدار لوگوں نے نفس کی تھکاوٹ، دل کی مشغولیت اور حساب کی شدت اختیار کی۔ اور جو کچھ ابن عطاء نے ذکر کیا کہ غنا اللہ تعالیٰ کا وصف ہے پس اس وجہ سے یہ افضل ہے تو یہ صحیح بات ہے لیکن اس وقت جب بندہ مال کے ہونے نہ ہونے سے بے نیاز ہو یعنی اس کے نزدیک دونوں باتیں برابر ہوں ——— اور جب مال کے ہونے سے مال دار ہو (غنی ہوا) اور باقی رہنے کا محتاج ہو تو اس کا غنا اللہ تعالیٰ کے غنا کے مشابہ نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ ذاتی طور پر غنی ہے اور اس کے غنا کے لیے زوال کا تصور نہیں ہو سکتا جب کہ مال کا زوال تصور کیا جا سکتا ہے مثلاً چوری ہو سکتا ہے۔

اور جو کچھ حضرت عطاء کے رد میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مال و اسباب کے ساتھ غنی نہیں ہے تو یہ بات بھی اس غنی کی مذمت میں صحیح ہے جو مال کی بقا چاہتا ہے اور یہ جو کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات بندوں کے لائق نہیں ہیں تو یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ علم اس کی صفات میں سے ہے اور وہ بندے کے لیے افضل ہے بلکہ بندے کی انتہا یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متصف ہو اور میں نے بعض مشائخ سے سنا وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلتا ہے تو راستہ طے کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام اس کے اوصاف بن جاتے ہیں یعنی ہر وصف میں سے اسے حصہ ملتا ہے۔

لیکن تکبر بندے کے لائق نہیں ہے کیوں کہ جس پر تکبر نہ کیا جا سکے اس پر تکبر کرنا اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے نہیں ہے ہاں جس پر تکبر ہو سکتا ہے جیسے مومن کا کافر پر، عالم کا جاہل پر، نیکو کار کا گناہ گار پر تکبر (بڑائی) تو یہ اللہ تعالیٰ کے لائق ہے ہاں بعض اوقات تکبر سے دوسروں کو حقیر جاننا بلند بانگ دعویٰ کرنا اور ایذا رسانی مقصود ہوتی ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے وصف میں سے نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بیان فرمایا کہ وہ ہر چیز سے بڑا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اسی طرح ہے اور بندے کو اس بات کا حکم ہے کہ اعلیٰ مرتبہ طلب کرے اگر اس پر قادر ہو لیکن استحقاق کے ساتھ (طلب کرے) باطل طریقے اور دھوکہ دہی سے نہیں۔

بندے کو اس بات کا علم ضرور ہونا چاہیئے کہ مومن، کافر سے بڑا ہے، فرمانبردار، نافرمان سے بڑا ہے۔ عالم جاہل سے

بڑا اور انسان، جانوروں، جمادات اور سبزیوں سے بڑا ہے اور ان کی نسبت یہ اللہ تعالیٰ کے زیادہ قریب ہے۔

اور اگر وہ اپنے آپ کو اس صفت کے ساتھ موصوف دیکھے لیکن یہ دیکھنا تحقیقی ہو شک پر مبنی نہ ہو تو اسے صفتِ تکبر حاصل ہوگی اور یہ اس کے لائق بھی ہے اور اس کے حق میں فضیلت بھی۔ لیکن اس بات کی معرفت تک راستہ نہیں اس لیے کہ یہ خاتمے پر موقوف ہے اور اسے معلوم نہیں کہ اس کا خاتمہ کیسے ہوگا۔ تو اس بات سے جہالت کی وجہ سے اس پر واجب ہے کہ اپنے لیے کافر کے رتبہ سے بڑے رتبے کا عقیدہ نہ رکھے کیوں کہ بعض اوقات کافر کا خاتمہ ایمان پر اور مومن کا خاتمہ کفر پر ہوتا ہے پس یہ بات (تکبر) اس کے لائق نہیں کیوں کہ انجام کی معرفت سے اس کا علم کوتاہ ہے۔

اور جب اس بات کا تصور ہو سکتا ہے کہ اشیاء کی حقیقت کو جان سکے تو اس کے حق میں علم میں کمال ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے اور جب بعض اشیاء کی معرفت اسے نقصان دیتی ہے تو یہ علم اس کے حق میں نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف میں ایسا علم نہیں جو اس کو نقصان دے تو جن امور کی معرفت سے نقصان نہیں ہوتا ان کی معرفت بندے کے حق میں اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے متصور ہوتی ہے پس یقیناً وہ فضیلت کی انتہا ہے اور اسی سے انبیاء کرام، اولیا اور علماء کی فضیلت ہے۔

تو بات یہ ہوئی کہ اگر اس کے نزدیک مال کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہوں تو یہ وہ قسم ہے جو کسی وجہ سے اس غنا کے مشابہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے پس یہ فضیلت ہے لیکن محض مال کے پائے جانے سے جو غنا حاصل ہوتا ہے اس میں بالکل کوئی فضیلت نہیں ——— تو یہ قناعت کرنے والے فقیر کے حال کی شکر گزار غنی کی حالت کی طرف نسبت کا بیان ہے۔

دوسرا مقام حریص فقیر کی حالت، حریص غنی کی حالت کی طرف نسبت میں ہے تو ہم اس بات کو ایک شخص میں فرض کرتے ہیں اور وہ مال کا طالب ہے اور اس کے لیے کوشش کرتا ہے اس وقت اس کے پاس مال نہیں ہے پھر وہ اسے پالیتا ہے تو اس کے لیے مال کے نہ ہونے کی حالت بھی ہے اور ہونے کی حالت بھی، تو کون سی حالت افضل ہوگی؟

تو ہم کہتے ہیں ہم دیکھیں گے اگر اس کا مطلوب وہ مال ہے جو اس کی معیشت کے لیے ضروری ہے اور اس کا قصد دین کے راستے پر چلنا ہے اور وہ مال کے ذریعے اس مقصد پر مدد حاصل کرتا ہے تو مال کا پایا جانا افضل ہے کیوں کہ فقر اسے طلب میں مشغول کر دے گا اور روزی کی تلاش کرنے والا فکر و ذکر پر قادر نہیں ہوتا اور اگر قادر ہو بھی تو اس میں دوسرا شغل شامل ہوگا اور ذکر و فکر پر قادر وہی ہے جسے بقدر کفایت رزق حاصل ہو۔

اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ قُوْتَ اٰلِ مُحَمَّدٍ کَفَافًا۔ (۱) اے اللہ! آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم رضی اللہ عنہم) کو بقدر کفایت رزق عطا فرما۔

---

(۱) صحیح مسلم جلد اول ص ۳۳۷ کتاب الزکوٰۃ

اور آپ نے فرمایا۔

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا۔ (۱) قریب ہے کہ فقر، کفر تک پہنچا دے۔

اس سے وہی فقر مراد ہے جس میں آدمی ضروری چیز کے لیے پریشان ہو۔

اور اگر اس کا مطلوب حاجت سے زیادہ ہو یا مطلوب تو حاجت کے مطابق ہو لیکن اس سے دین کے راستے پر چلنے میں مدد حاصل کرنا مقصود نہ ہو تو اس صورت حالِ فقر افضل اور زیادہ بہتر ہے کیوں کہ حرص اور محبتِ مال میں غنی اور فقیر دونوں برابر ہیں اور اس بات میں بھی دونوں برابر ہیں کہ وہ دین کے راستے میں مدد حاصل کرنا نہیں چاہتے اور اس بات میں بھی مساوی ہیں کہ ان میں سے ایک بھی فقر یا غنا کو گناہ کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتا لیکن اس سلسلے میں دونوں میں فرق ہے کہ ایک اس مال سے محبت کرتا ہے جو اسے حاصل ہے پس اس کے دل میں مال کی محبت پکی ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ اس کا دل مطمئن ہو جاتا ہے اور جس کے پاس مال نہیں ہے اس کا دل دنیا سے دور ہے اور اس کے نزدیک دنیا قید خانے کی طرح ہے جس سے وہ چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے اور جب دو آدمی تمام باتوں میں برابر ہوئے اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت ایک کا دل دنیا کی طرف بہت جھکا ہوا ہے تو لامحالہ اس کی حالت دوسرے کی نسبت زیادہ سخت ہو گی کیوں کہ اس کا دل دنیا کی طرف متوجہ ہے اور آخرت سے اس قدر نفرت کرتا ہے جس قدر دنیا سے اُنس مضبوط ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رُوْعِيْ اَحْبِبْ مَنْ اَحْبَبْتَ فَاِنَّكَ مُفَارِقُهٗ (۲) بے شک رُوح القدس نے میرے دل میں یہ بات پھونکی ہے کہ جس سے چاہو دوستی کرو بے شک تم نے اس سے جدا ہونا ہے۔

یہ اس بات سے آگاہی ہے کہ محبوب کا فراق بہت سخت ہوتا ہے۔ پس تمہیں چاہیئے کہ اس سے محبت کرو جو تم سے جدا نہ ہو اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اور جس نے تم سے جدا ہونا ہے اس سے محبت نہ کرو اور وہ دنیا ہے کیوں کہ جب تم دنیا سے محبت کرو گے تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات تمہیں پسند نہ ہو گی تو موت اس حال پر ہو گی جسے ناپسند کرتا ہے اور محبوب سے جدائی ہو گی اور جو شخص اپنے محبوب سے جدا ہوتا ہے اسے اس کے فراق کی اسی قدر تکلیف ہوتی ہے جس قدر اس کو اس سے محبت اور اُنس ہوتا ہے اور جو شخص دنیا پر قادر بھی ہو اور اسے دنیا حاصل بھی ہو اس کا اُنس اس شخص کے اُنس سے زیادہ ہو گا جس کے پاس دنیا نہیں ہے اگرچہ وہ اس کی حرص رکھتا ہو۔

---

(۱) کنز العمال جلد ۶ ص ۴۹۲ حدیث ۱۶۶۸۲

(۲) شرح السنۃ للبغوی جلد ۱۴ ص ۳۰۴ حدیث ۴۱۱۲

تو اس تحقیق سے واضح ہوا کہ تمام لوگوں کے لیے دونوں جگہ فقر ہی اشرف، افضل اور اصلح ہے ایک وہ مالداری جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے غنا کی طرح ہو جس میں وجود و عدم دونوں برابر ہیں کیوں کہ یہ غنا اضافہ کا باعث ہے کیوں کہ اس سے فقراء و مساکین کی دعائیں اور باطنی توجہ حاصل ہوتی ہے اور دوسرا مقدار ضرورت سے فقر ہے اور یہ قریب ہے کہ کفر تک چلا جائے اور اس میں کسی اعتبار سے بھی بھلائی نہیں ہے مگر جب یہ (مال) اس کی حیات کو باقی رکھے پھر وہ اپنی زندگی اور قوت کو گناہوں اور کفر پر مدد کے طور پر استعمال کرے اور اگر وہ بھوکا مر جائے تو اس کے گناہ کم ہوں گے تو اس صورت میں زیادہ بہتر یہی ہے کہ بھوکا مر جائے اور جس مال کی طرف مجبور ہے اسے بھی حاصل نہ کرے۔

تو غنا اور فقر کے سلسلے میں یہ تفصیلی بات تھی اب اس فقیر کو دیکھنا ہے جو حریص ہے اور مال کی طلب میں مکمل طور پر مصروف ہے اور اس کا کوئی دوسرا مقصد اور فکر ہی نہیں ہے اور دوسرا وہ غنی جو مال کی حفاظت میں اس سے کم حریص ہے اور اگر اس کے پاس مال نہ رہے تو اسے اس قدر دکھ نہیں ہوتا جس قدر فقیر کو فقر پر پریشانی ہوتی ہے تو یہ بھی قابل غور ہے اور زیادہ ظاہر بات یہی ہے کہ ان دونوں کی اللہ تعالیٰ سے دُوری اسی قدر ہے جس قدر مال کے نہ ہونے پر ان کی پریشانی اور دُکھ ہے اور جس قدر یہ دُکھ کمزور ہوگا اسی قدر ان کو قرب بھی حاصل ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔

فصل ۵:

فقر میں آداب فقیر

جان لو! کہ فقیر کے لیے باطنی اور ظاہری طور پر کچھ آداب ہیں وہ لوگوں سے میل جول کے اعتبار سے بھی ہیں اور اس کے افعال کے حوالے سے بھی پس ان کا لحاظ کرنا چاہیے۔

جہاں تک اس کے باطنی آداب کا تعلق ہے تو وہ اس طرح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس فقر میں اسے مبتلا کیا ہے اسے ناپسند نہ کرے یعنی اس اعتبار سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اسے ناپسند کرنے والا نہ ہو اگرچہ فقر اسے پسند نہ ہو جس طرح پچھنے لگوانے والا اس عمل کو ناپسند کرتا ہے کیوں کہ اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے لیکن پچھنے لگانے والے کے عمل کو ناپسند نہیں کرتا بلکہ بعض اوقات اس کا احسان مند ہوتا ہے اور یہ کم از کم درجہ ہے جو واجب ہے اور اس کے خلاف کرنا حرام ہے جس سے اعمال بھی ضائع ہو جاتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث شریف کا یہی مطلب ہے آپ نے فرمایا۔

یَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ اَعْطُوا اللّٰہَ الرِّضَا مِنْ قُلُوْبِکُمْ تَظْفَرُوْا بِثَوَابِ فَقْرِکُمْ وَاِلَّا فَلَا۔

اے فقراء کی جماعت! قلبی طور پر اللہ تعالیٰ سے راضی رہو اپنے فقر کا ثواب پاؤ گے ورنہ تمہیں یہ ثواب نہیں ملے گا۔

اور اس سے بلند ادب یہ ہے کہ فقر کو ناپسند نہ کرے بلکہ اس پر راضی ہو۔ اس سے بھی بلند مرتبہ یہ ہے کہ فقر کا طالب ہو اور اس پر خوش ہو کیوں کہ اسے غنا کی خرابیوں کا علم ہے اور وہ باطنی طور پر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والا ہے اور اس بات

پر پختہ یقین ہو کر جو کچھ اس کے مقدر میں ہے وہ اس تک ضرور پہنچے گا۔ اور ضرورت سے زائد کو ناپسند کرنے والا ہو۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ فقر پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ سزائیں ہیں اور کچھ انعامات بھی فقر پر ثواب کی علامت یہ ہے کہ اس پر آدمی کی عادت کو اچھا کر دے اور وہ اپنے رب کی اطاعت کرے نیز اس کا شکر بھی ادا کرے اور جب فقر سزا کا باعث بنے تو اس کی علامت یہ ہے کہ آدمی بداخلاق ہو جاتا ہے اور وہ عبادت کو ترک کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے بارگاہِ خداوندی میں شکایات کرتا ہے اور اس کے فیصلے پر ناراض ہوتا ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر فقیر قابلِ تعریف نہیں ہوتا بلکہ وہ فقیر محمود ہے جو ناراض نہیں ہوتا بلکہ راضی ہوتا ہے یا وہ فقر پر خوش ہوتا ہے اس لیے کہ وہ اس کے فوائد سے واقف ہے کیوں کہ کہا گیا ہے کہ بندے کو جب دنیا کی کوئی چیز دی جاتی ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ اسے تین حصوں پر لو کیونکہ یہ تین باتیں پیش آئیں گی، مشغولیت، فکر اور طویل حساب۔

فقر کے ظاہری آداب یہ ہیں کہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچے اور اچھی حالت ظاہر کرے شکوہ اور فقر کا اظہار نہ کرے بلکہ اپنے فقر کو چھپائے اور یہ بات بھی سامنے نہ آنے دے کہ وہ فقر کو چھپا رہا ہے۔

حدیث شریف میں ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْفَقِيْرَ الْمُتَعَفِّفَ اَبَا الْعِيَالِ۔ (۱)	بے شک اللہ تعالیٰ ایسے فقیر کو پسند کرتا جو بچنے والا عیال دار ہو۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ۔	جاہل لوگ ان کو نہ مانگنے کی وجہ سے مال دار تصور کرتے ہیں۔

حضرت سفیان رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مشقت کے وقت اپنے آپ کو اچھی حالت میں ظاہر کرنا سب سے بہتر عمل ہے۔ اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ فقر کو چھپانا نیکی کے خزانوں میں سے ہے۔

اعمال میں فقر کے آداب سے یہ ہے کہ کسی مال دار کی مالداری کی وجہ سے اس کے سامنے تواضع نہ کرے بلکہ اپنے آپ کو اس سے بڑا سمجھے حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں مالدار کا فقیر کے لیے تواضع کرنا اچھا ہے تاکہ اسے ثواب حاصل ہو اور اس سے بھی اچھا یہ ہے کہ فقیر اپنے آپ کو غنی سے بڑا سمجھے اور یہ اللہ تعالیٰ پر بھروسے اور توکل کے باعث ہے۔ یہ ایک اعلیٰ مرتبہ ہے اور اس سلسلے میں کم از کم بات یہ ہے کہ مالداروں سے میل جول نہ رکھے اور نہ ہی ان کی مجالس میں رغبت رکھے کیوں کہ یہ طمع کی بنیاد ہے۔

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۶۲ مرویات عیاض بن حمار

(۲) قرآن مجید، سورۃ بقرہ آیت ۲۷۳

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب فقیر شخص مال داروں سے میل جول رکھتا ہے تو جان لو کہ یہ ریا کار ہے اور جب وہ بادشاہ سے تعلق رکھے تو سمجھ لو کہ یہ چور ہے بعض عارفین نے فرمایا جب فقیر مالدار لوگوں سے ملتا ہے تو اس کا اعتماد ڈھیلا ہو جاتا ہے اور جب ان سے طمع رکھتا ہے تو اس کی عصمت ختم ہو جاتی ہے اور جب ان میں سکونت اختیار کرتا ہے تو گمراہ ہو جاتا ہے۔

فقیر کو چاہیے کہ مالدار لوگوں کی خاطر اور ان کے عطیات کی طمع کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خاموشی اختیار نہ کرے۔

افعال میں فقیر کے آداب یہ ہیں کہ فقر کی وجہ سے عبادت میں سستی نہ کرے اور جو کچھ اس کے اخراجات سے بچے چاہے وہ تھوڑا ہی ہو اس کو خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے کیوں کہ یہ کم مایہ کی کوشش ہے اور اس کا ثواب ان زیادہ مالوں کے خرچ سے زیادہ ہے جو مالداری کی حالت میں دیئے جائیں۔

حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

دِرْهَمٌ مِنَ الصَّدَقَةِ اَفْضَلُ عِنْدَ اللّٰهِ مِنْ مِائَةِ اَلْفِ دِرْهَمٍ، قیل وکیف ذلك یارسول الله؟ قَالَ "اَخْرَجَ رَجُلٌ مِنْ عَرَضِ مَالِهِ مِائَةَ اَلْفِ دِرْهَمٍ فَتَصَدَّقَ بِهَا وَاَخْرَجَ رَجُلٌ دِرْهَمًا مِنْ دِرْهَمَيْنِ لَا يَمْلِكُ غَيْرَهُمَا طَيِّبَةً بِهِ نَفْسُهُ فَصَارَ صَاحِبُ الدِّرْهَمِ اَفْضَلَ مِنْ صَاحِبِ الْمِائَةِ اَلْفِ"۔ (۱)

صدقے کا ایک درہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک لاکھ درہم سے افضل ہے عرض کیا گیا یارسول اللہ! یہ کیسے؟ آپ نے فرمایا ایک شخص اپنے بہت سے مال میں سے ایک لاکھ درہم نکال کر صدقہ کرتا ہے اور دوسرا شخص دو درھموں میں سے ایک درہم خرچ کرتا ہے اور اس کے پاس صرف وہی دو درہم ہیں اور وہ دل کی خوشی سے خرچ کرتا ہے تو یوں ایک درہم خرچ کرنے والا ایک لاکھ درہم خرچ کرنے والے سے افضل ہے۔

اور مناسب یہ ہے کہ مال جمع نہ کرے بلکہ ضرورت کے مطابق رکھے اور باقی اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کر دے اور مال جمع کرنے میں تین درجات ہیں ایک درجہ یہ ہے کہ صرف ایک دن رات کے لیے جمع کرے اور یہ صدیقین کا درجہ ہے دوسرا یہ کہ چالیس دن کے لیے جمع کرے کیوں کہ جو کچھ اس سے زائد ہے وہ طول امید میں داخل ہے اور علماء کرام نے یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی میعاد سے معلوم کی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مقرر فرمائی تو اس سے زندگی کے لیے چالیس دن کی مہلت سمجھی گئی اور یہ متقی لوگوں کا درجہ ہے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ ایک سال کے لیے جمع کرے یہ سب سے آخری درجہ ہے اور یہ صالحین کا مقام ہے۔ اور جو شخص اس

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی جلد ۴ ص ۱۸۱، ۱۸۲ کتاب الزکوٰۃ

سے زائد جمع کرے وہ عوام الناس میں داخل ہے اور خصوصی مقام سے مکمل طور پر خارج ہے پس نیک کمزور شخص کا ایک سال کے رزق میں اطمینانِ قلب اس کا غنا ہے اور خاص لوگوں کا چالیس دن میں غنا ہے جب کہ خاص الخاص لوگوں کا غنا ایک دن رات رزق جمع کرنے میں ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواج مطہرات کو اسی قسم کی اقسام پر تقسیم کیا بعض امہات المومنین کو آپ ایک سال کا خرچہ عنایت فرماتے جب آپ کے پاس آتا بعض کو چالیس دن کا اور کچھ کو ایک دن رات کا اور یہ آخری تقسیم حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کے لیے تھی۔

فصل ۶:

بغیر سوال کے ملنے والے عطیہ کو فقیر قبول کرے تو اس کے آداب

فقیر کے پاس جو کچھ آئے میں اس میں تین باتوں کا خیال رکھے ایک نفسِ مال دوسری بات دینے والے کی غرض اور تیسری بات اس کی اپنی غرض جس کے لیے لے رہا ہے۔

مال حلال ہو اور تمام شبہات سے خالی ہو اگر اس میں شبہ ہو تو اس کے لینے سے بچے ہم نے حلال و حرام کے بیان میں شبہات کے درجات لکھے ہیں نیز اس سے اجتناب اور استحباب کا ذکر بھی کیا ہے۔

دینے والے کی غرض صرف یہ ہونی چاہیے کہ اس سے وہ فقیر کا دل خوش کرے اور اس کی محبت کا حصول مقصد ہو اس صورت میں یہ ہدیہ ہوگا اگر ثواب مقصود ہو تو صدقہ یا زکوٰۃ ہوگی یا اس کا مقصد محض شہرت اور ریاکاری ہوگی یا تو محض ریاکاری ہوگی یا اس میں دوسری (مذکورہ بالا) اغراض بھی شامل ہوں گی۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے اور وہ ہدیہ ہے تو اسے قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ ہدیہ قبول کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے (۱)

لیکن اس میں احسان نہ جتایا جائے اگر احسان ہو تو چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہے اور اگر معلوم ہو کہ اس میں سے بعض مال پر احسان جتایا جا رہا ہے بعض پر نہیں تو بعض کو رد کر دے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گھی، پنیر اور مینڈھا ہدیہ کے طور پر پیش کیا گیا تو آپ نے گھی اور پنیر قبول فرمالی اور مینڈھا واپس کر دیا (۲)

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ مبارکہ تھا کہ بعض لوگوں سے تحفہ قبول کرتے اور بعض کا تحفہ واپس کر دیتے۔ (۳)

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۹۰ مرویات عائشہ

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۱۷۱ مرویات یعلی بن مرہ

(۳) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۱۴۲ کتاب البیوع

اور آپ نے فرمایا۔

لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ لَا اَتَّهِبَ اِلَّا مِنْ قُرَشِيٍّ اَوْ ثَقَفِيٍّ اَوْ اَنْصَارِيٍّ اَوْ دَوْسِيٍّ۔ (۱)

میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں کسی سے ہبہ قبول نہ کروں سوائے قرشی، ثقفی، انصاری یا دوسی کے (قبیلہ قریش، بنو ثقیف، انصار اور قبیلہ دوس کے لوگ مراد ہیں)

تابعین کی ایک جماعت نے بھی اسی طرح کیا ہے۔

حضرت فتح موصلی کے پاس ایک تھیلی آئی جس میں پچاس درھم تھے تو انہوں نے فرمایا ہم سے حضرت عطاء نے بیان کیا وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا۔

مَنْ اَتَاهُ رِزْقٌ مِنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ فَرَدَّهُ فَاِنَّمَا يَرُدُّهُ عَلَى اللّٰهِ۔ (۲)

جس شخص کے پاس مانگنے کے بغیر رزق آئے اور وہ اسے لوٹا دے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹا رہا ہے (یعنی قبول کرنا چاہیے)

پھر انہوں نے تھیلی کھولی اور اس سے ایک درھم لیا اور باقی لوٹا دیئے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ بھی یہ حدیث روایت کیا کرتے تھے لیکن ان کے پاس ایک شخص ایک تھیلی اور خراسان کے باریک کپڑوں کی ایک گٹھڑی لایا تو آپ نے واپس کر دیا اور فرمایا جو شخص میرے اس منصب پر فائز ہو اور لوگوں سے اس قسم کے تحفے قبول کرے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس طرح ملاقات کرے گا کہ اس کے لیے کوئی حصہ نہ ہوگا۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عطیات قبول کرنے میں عالم اور واعظ کا معاملہ بہت سخت ہے اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ دوستوں سے ہدیہ قبول فرماتے تھے۔

حضرت ابراہیم تیمی رحمہ اللہ اپنے دوستوں سے ایک دو درھم بھی مانگ لیتے لیکن دوسرے ان کی خدمت میں سینکڑوں درھم بھی پیش کرتے تو قبول نہ کرتے۔

بعض بزرگوں کا یہ طریقہ تھا اگر ان کا کوئی دوست ان کو کچھ دیتا تو فرماتے میں اس کو تیرے پاس چھوڑتا ہوں اب تم دیکھو اگر اس کے قبول کرنے کے بعد تمہارے دل میں میرا مقام پہلے سے زیادہ ہو تو مجھے بتا دینا میں لے لوں گا ورنہ نہیں۔

اور اس کی علامت یہ ہے کہ اگر وہ واپس کرنا چاہے تو واپس کرنا مشکل ہو اور قبول کرنے پر خوش ہو اور اپنے اوپر دوست کا احسان سمجھے کہ اس نے قبول کیا اور اگر معلوم ہو کہ اس میں احسان بھی ملا ہوا ہے تو لینا جائز ہوگا لیکن صادق فقراء کے

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۲۹۵ مرویات ابن عباس

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۲۲۱ مرویات خالد بن عدی جھنی

نزدیک مکروہ ہے۔

حضرت بشر رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے حضرت سری سقطی رحمہ اللہ کے علاوہ کسی سے کوئی ہدیہ قبول نہیں کیا کیوں کہ میرے نزدیک ان کا دنیا سے زہد صحیح ثابت ہے اور جب ان کے ہاتھ سے کوئی چیز جاتی ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں اور جب ان کے پاس باقی رہے تو پریشان ہوتے لہذا میں ان کی پسندیدہ بات پر ان کی مدد کرتا ہوں۔

ایک خراسانی، حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے پاس مال لے کر آیا اور کہا کہ آپ اسے کھائیں انہوں نے فرمایا فقراء پر تقسیم کر دو انہوں نے کہا میرا یہ مقصد نہیں ہے حضرت جنید نے فرمایا میں کب تک زندہ رہوں گا کہ اسے کھاؤں گا اس نے کہا اسے سرکے اور سبزیوں پر خرچ کریں بلکہ مٹھائی اور پھلوں وغیرہ کے لیے خرچ کریں آپ نے قبول کر لیا خراسانی نے کہا بغداد میں آپ سے زیادہ مجھ پر احسان کرنے والا کوئی نہیں۔ حضرت جنید رحمہ اللہ نے فرمایا تمہارے علاوہ کسی سے ہدیہ قبول کرنا مناسب بھی نہیں۔

دوسرا یہ کہ محض ثواب کے لیے دے تو یہ صدقہ ہوگا یا زکوٰۃ اب اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو دیکھے کہ کیا وہ زکوٰۃ کا مستحق ہے؟ اگر اس پر مشتبہ ہو جائے تو وہ محل مشتبہ ہے ہم نے اسرار زکوٰۃ کے بیان میں اس کی تفصیل ذکر کی ہے۔

اور اگر صدقہ ہو اور اس (فقیر) کے دیندار ہونے کی وجہ سے دیا ہو تو اپنے باطن پر نظر کرے اگر کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہے اور اسے معلوم ہے کہ اگر دینے والے کو اس بات کا علم ہو جائے تو وہ اس سے طبعی طور پر نفرت کرے اور صدقہ کے ذریعے تقرب خداوندی حاصل نہ کرے تو اس صورت میں لینا حرام ہے جیسے وہ اس خیال سے دے کہ یہ عالم ہے یا علوی، حالاں کہ وہ اس صفت سے موصوف نہیں ہے تو بلاشبہ لینا حرام ہے۔

• تیسرا یہ کہ اس کی غرض ریاکاری اور شہرت ہو تو اسے چاہیے کہ اس کے فاسد ارادے کو رد کر دے اور قبول نہ کرے کیوں کہ یہ اس کی فاسد غرض پر مدد کرنا ہے۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ کو جو کچھ دیا جاتا واپس کر دیتے اور فرماتے اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہ لوگ اس کا ذکر فخر کے طور پر نہیں کریں گے تو میں لے لیتا۔

کسی بزرگ پر لوگوں نے عتاب کیا کہ جو کچھ لوگ آپ کو دیتے ہیں آپ اسے کیوں واپس کر دیتے ہیں تو انہوں نے فرمایا میں ان پر شفقت اور نصیحت کے طور پر واپس کرتا ہوں کیوں کہ وہ اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کی شہرت ہو اس طرح ان کا مال بھی جاتا ہے اور ثواب بھی ضائع ہوتا ہے۔

جہاں تک اس کے لینے کی غرض ہے تو اسے چاہیے کہ دیکھے کیا وہ ضروری اخراجات کے لیے اس کا محتاج ہے یا نہیں اگر محتاج ہے تو وہ شبہ اور ان آفات سے محفوظ ہوگیا جو ہم نے دینے والے کے بارے میں ذکر کی ہیں لہذا لینا افضل ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَا الْمُعْطِيْ مِنْ سَعَةٍ بِأَعْظَمَ اَجْرًا مِنْ — وسعت کی حالت میں دینے والے کو اس لینے والے سے

الآخِذِ إِذَا كَانَ مُحْتَاجاً۔ (۱) — زیادہ ثواب نہیں ملتا جو محتاج ہو۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

مَنْ أَتَاهُ شَيْءٌ مِنْ هٰذَا الْمَالِ مِنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ وَلَا اسْتِشْرَافٍ فَإِنَّمَا هُوَ رِزْقٌ سَاقَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ۔ (۲)

جس شخص کے پاس اس مال میں سے کچھ سوال کرنے اور مانگنے کے بغیر آئے تو وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف بھیجا ہے۔

اور ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں "فَلَا يَرُدَّهُ"(۳) پس وہ اسے واپس نہ کرے بعض علماء فرماتے ہیں جس شخص کو دیا جائے اور وہ نہ لے تو وہ سوال کرے گا لیکن اسے نہیں دیا جائے گا۔

حضرت سری سقطی رحمہ اللہ حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے پاس کچھ بھیجا کرتے تھے آپ نے ایک مرتبہ واپس کر دیا تو حضرت سری رحمہ اللہ نے فرمایا اے احمد! لوٹانے کی آفت سے بچو کیوں کہ یہ لینے کی آفت سے زیادہ ہے حضرت امام احمد نے ان سے فرمایا دوبارہ فرمائیے انہوں نے دوبارہ وہی کلمات کہے تو حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا میں نے اس لیے واپس کیا ہے کہ میرے پاس ایک مہینے کی غذا موجود ہے لہذا آپ اسے میرے کھاتے میں اپنے پاس جمع کریں اور ایک مہینے کے بعد مجھے بھیج دیں۔

بعض علماء نے فرمایا کہ حاجت کے باوجود واپس لوٹانے کی صورت میں اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں اسے طمع میں مبتلا کرنے یا شبہ وغیرہ میں ڈالنے کی سزا نہ دے اور اگر وہ حاجت سے زیادہ ہو تو دو حال سے خالی نہ ہوگا یا تو اپنی ذات میں مشغول ہوگا یا فقراء کے امور کا کفیل اور ان پر خرچ کرنے والا ہو کہ اپنی طبعی نرمی اور سخاوت کی وجہ سے ان کو دیا کرتا ہے تو اب دیکھیں گے اگر اپنی ذات میں مشغول ہے تو اسے لینے اور اپنے پاس روکنے کا کوئی جواز نہیں اگر وہ آخرت کے طریقے کا طالب ہے کیوں کہ یہ محض نفسانی خواہش ہے اور جو عمل اللہ تعالیٰ کے لیے نہ ہو وہ شیطان کے راستے میں ہوتا ہے یا اس کی طرف بلانے والا ہوتا ہے اور جو شخص سرکاری چراہ گاہ کے قریب چراتا ہے قریب ہے کہ وہ اس کے اندر چلا جائے۔

پھر اس لینے کی بھی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ علانیہ لیتا ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ پوشیدہ طور پر لیتا ہے یا لیتا تو علانیہ ہے لیکن تقسیم پوشیدہ طور پر کرتا ہے اور یہ صدیقین کا مقام ہے اور نفس پر گراں گزرتا ہے اس کی طاقت صرف ان لوگوں کو ہوتی ہے جن کے ساتھ اطمینان ہو دوسری صورت یہ ہے کہ نہ لے تاکہ مالک اسے کسی زیادہ محتاج شخص کو دے

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۱۲ ص ۳۲۲ حدیث ۱۳۵۶۰

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۲۲۱ حدیث خالد بن عدی الجہنی

(۳) ″ ″ ″ ″

یا خود دے کر ایسے شخص تک پہنچائے جو اس سے زیادہ محتاج ہو لیں یہ دونوں کام پوشیدہ طور پر کرے یا ظاہراً، اور کیا لیتے وقت ظاہر کرنا افضل ہے یا پوشیدہ رکھنا، یہ بات ہم نے زکوٰۃ کے اسرار کے بیان میں ذکر کی ہے اور اس کے ساتھ ہی فقر کے احکام بھی نقل کئے ہیں لہٰذا وہاں سے معلوم کریں۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے حضرت سری سقطی رحمہ اللہ سے قبول نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ مستغنی تھے کیوں کہ ان کے پاس ایک مہینے کی روزی تھی اور وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ اسے لے کر دوسروں پر صرف کریں کیوں کہ اس میں بہت سی آفات اور خطرات ہیں۔ اور ورع (تقویٰ) آفات کے مقامات سے بچنے کا نام ہے کیوں کہ شیطان کے مکر سے بے خوفی نہیں ہو سکتی۔

مکہ مکرمہ کے ایک مجاور بتاتے ہیں کہ میرے پاس کچھ درہم تھے جو میں نے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے رکھے ہوئے تھے میں نے ایک فقیر کو سنا جو طواف سے فارغ ہو چکا تھا اور آہستہ آواز سے کہہ رہا تھا میں بھوکا ہوں جیسا کہ تو جانتا ہے میں ننگا ہوں جیسا کہ تو دیکھتا ہے جو کچھ تو دیکھتا ہے وہ دیکھا نہیں جاتا اسے وہ جو دیکھتا ہے لیکن دکھائی نہیں دیتا۔ وہ کہتے ہیں میں نے دیکھا تو اس پر دو پرانے کپڑے تھے جو اس کے جسم کو نہیں ڈھانپ رہے تھے میں نے دل میں کہا کہ میرے درہموں کا اس سے بہتر مصرف نہیں ہے چنانچہ میں نے وہ دراہم اسے دے دیئے اس نے ان کو دیکھ کر ان میں سے پانچ درہم لے لیے اور کہنے لگا چار درہموں کی دو چادریں آجائیں گی اور ایک درہم کو میں تین دن خرچ کروں گا اس کے علاوہ کی مجھے حاجت نہیں ہے چنانچہ اس نے وہ درہم واپس کر دیئے۔

راوی بیان کرتے ہیں دوسری رات میں نے اسے دیکھا کہ اس کے اوپر دو نئی چادریں ہیں تو میرے دل میں کچھ وسوسہ پیدا ہوا اس نے میری طرف دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے طواف کے سات چکر لگوائے ہر چکر میں ایک نئے قسم کے جوہر کی زمین کی کانوں میں سے ہمارے پاؤں کے نیچے سے ٹخنوں تک جھنکار سنائی دیتی، ان میں سونا بھی تھا، چاندی بھی، یاقوت موتی اور جواہر وغیرہ سب کچھ تھا لیکن لوگوں کو نظر نہیں آتا تھا اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ مجھے دیا ہے لیکن میں نے ان سے بے رغبتی اختیار کی ہے اور میں لوگوں کے ہاتھوں سے لیتا ہوں کیوں کہ یہ سب کچھ بوجھ اور فتنہ ہے اور اس لینے میں لوگوں کے لیے رحمت اور نعمت ہے۔

اس بات کا مقصد یہ ہے کہ حاجت سے زیادہ جو کچھ تمہارے پاس آتا ہے وہ آزمائش اور فتنے کے طور پر آتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ دیکھے کہ تم اس میں کیسا عمل کرتے ہو اور حاجت کے مطابق تمہارے پاس نرمی اور آسانی کے طور پر آتا ہے پس تجھے آسانی اور آزمائش میں فرق سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا جو کچھ زمین پر ہے ہم نے اسے اس کے لیے زینت بنایا

لِيَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ۔ (۱) تاکہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون اچھے اعمال کرتا ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لاَحَقَّ لِابْنِ آدَمَ اِلَّا فِی ثَلَاثٍ طَعَامٍ يُقِيمُ صُلْبَهُ وَثَوْبٍ يُوَارِى عَوْرَتَهُ وَبَيْتٍ يُكِنُّهُ فَمَا زَادَ فَهُوَ حِسَابٌ ۔ (۲)

انسان کا حق صرف تین چیزوں میں ہے کھانا جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھے لباس جو اس کی شرمگاہ کو چھپائے اور گھر جو اسے پناہ دے جو کچھ اس سے زائد ہے اس کا حساب ہوگا۔

پس جو کچھ تم ان تین چیزوں میں سے حاجت کے مطابق لوگے اس پر تمہیں ثواب ہوگا اور جو اس سے زائد لوگے اس کی دو صورتیں ہیں اگر تم نے اس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی تو وہ حساب کے لیے پیش ہوگا اور اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے مال حاصل کیا ہے تو تمہیں عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

آزمائش کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے اور اپنے نفس کی صفت کو توڑنے کے لیے کسی لذت کو چھوڑ دے پھر وہ لذت صاف ستھری ہو کر آئے تا کہ اس کی قوت عقل کا امتحان ہو تو اس لذت کو چھوڑنا زیادہ بہتر ہے کیوں کہ جب نفس کو کسی ارادے کے توڑنے کی اجازت دی جائے تو اسے وعدہ توڑنے کی عادت پڑ جاتی ہے اور نفس کو دبانا ممکن نہیں رہتا لہٰذا اس عادت کو رد کر دینا ضروری ہے اور یہی زہد ہے اگر تم مال لے کر کسی محتاج پر خرچ کرو تو یہ انتہائی درجے کا زہد ہے اور اس پر صرف صدیقین ہی قادر ہوتے ہیں۔

اور جب تمہاری حالت، سخاوت کرنے، خرچ کرنے، فقراء کے حقوق کی کفالت کرنے اور صلحاء کی ایک جماعت کا خیال رکھنے کی ہو تو تم حاجت سے زائد لے لو کیوں کہ یہ فقراء کی حاجت سے زیادہ نہیں ہے اور اسے خرچ کرنے میں جلدی کرو اسے جمع کر کے نہ رکھو کیوں کہ اس کو روک رکھنے میں فتنہ اور آزمائش ہے چاہے ایک رات ہی کیوں نہ ہو بعض اوقات تمہارا دل اسے اچھا سمجھے گا اور تم اسے روک لوگے تو یہ تمہارے لیے فتنے کا باعث ہوگا۔

ایک جماعت نے فقراء کی خدمت کا قصد کیا تو اسے مال کی کثرت اور عیش و عشرت کے کھانے پینے کا ذریعہ بنا لیا اور یہی ہلاکت ہے اور جو شخص اس کام سے فقراء پہ آسانی اور ثواب حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے چاہیے کہ اللہ تعالیٰ پر صحیح عقیدہ رکھتے ہوئے قرض لے ظالم بادشاہوں پر اعتماد نہ کرے اگر اللہ تعالیٰ اسے حلال مال عطا فرمائے تو قرض ادا کر دے اور اگر ادائیگی سے پہلے مر گیا تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا کر دے گا اور اس کے قرض خواہوں کو راضی کر دے گا اور اس کیلئے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ کہف آیت ۷

(۲) جامع ترمذی ص ۳۴۹، ابواب الزہد

شرط یہ ہے کہ قرض دینے والے کے لیے اس کی حالت واضح ہو پس قرض خواہ کو دھوکہ نہ دے اور وعدوں پر ٹالنے کے لیے اسے دھوکے میں نہ رکھے بلکہ اپنا حال اس کے سامنے کھول کر رکھ دے تاکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اسے قرض دے اور اس قسم کے لوگوں کا قرض بیت المال سے ادا کرنا ضروری ہے یا زکوٰۃ کے مال سے دیا جائے ارشاد ربانی ہے۔

وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللّٰهُ۔ (۱)

اور جس شخص پر اس کا رزق تنگ ہو گیا تو اسے چاہیے کہ اس میں سے خرچ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اسے دیا۔

کہا گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنا ایک کپڑا بیچ دے اور کہا گیا کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اپنی شخصیت کی بنیاد پر قرض لے تو یہ وہ ہے جو اسے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا۔

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو اپنے سرمایہ کے مطابق خرچ کرتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو اس اندازے پر خرچ کرتے ہیں جس قدر ان کو اللہ تعالیٰ کے بارے میں حُسنِ ظن ہوتا ہے۔

ایک بزرگ فوت ہوئے تو انہوں نے اپنے مال کے تہائی حصے کی اقویاء (مضبوط لوگوں) سخیوں اور مالدار لوگوں کے لیے وصیت کی پوچھا گیا یہ کون لوگ ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا اقویاء وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں اور سخی وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں حُسنِ ظن رکھتے ہیں اور غنی وہ لوگ ہیں جو سب کچھ چھوڑ کر اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق قائم کر لیتے ہیں۔

پس جب فقیر میں، مال میں اور دینے والے میں مذکورہ بالا شرائط پائی جائیں تو وہ ہدیہ قبول کرے اور اسے یہ عقیدہ رکھنا چاہیے کہ جو کچھ ملا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہے بندے کی طرف سے نہیں ملا۔ کیوں کہ دینے والا تو ایک واسطہ ہے جو عطاء کے لیے مسخر کیا گیا ہے اور اس پر جو کام مسلط کیا گیا ہے اس کے لیے وہ مجبور ہے مثلاً اس کے دل میں جو ارادہ یا اعتقاد یا داعیہ پیدا ہوا۔

منقول ہے کہ کسی شخص نے حضرت شفیق بلخی رحمہ اللہ کو ان کے پچاس ساتھیوں سمیت دعوت دی اس نے اچھا دسترخوان بچھایا جب وہ بیٹھ گئے تو اپنے ساتھیوں سے فرمایا یہ ایک ایسے شخص کی طرف سے ہے جو کہتا ہے کہ جو شخص اس کو میری طرف سے نہیں سمجھے گا کہ میں نے اسے بنایا اور پیش کیا ہے تو اس پر میرا یہ کھانا حرام ہے یہ سن کر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر نکل گئے البتہ ایک نوجوان بیٹھا رہا جو ان سے کم درجہ کا تھا۔ صاحب خانہ نے حضرت شفیق رحمہ اللہ سے کہا میں نے تو یہ ارادہ نہیں کیا تھا! انہوں نے فرمایا میں نے اپنے ساتھیوں کے عقیدۂ توحید کو آزمانا چاہا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا یا اللہ! تو نے میرا رزق بنی اسرائیل کے ہاتھ میں رکھا ہے یہ صبح و شام مجھے کھانا دیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ اسی طرح کرتا ہوں میں ان کا رزق

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ طلاق آیت ۷

اپنے بندوں میں سے اہل باطل کے پاس رکھنا ہوتا تاکہ ان کو اس کا اجر ملے۔ لہٰذا دینے والے کو یہی خیال کرنا چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہے اور اسے اجر ملے گا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے پسندیدہ اعمال کی اچھی توفیق کا سوال کرتے ہیں۔

فصل ملک :

ضرورت کے بغیر سوال حرام ہے اور مجبور فقیر کے آداب

سوال کرنے کے بارے میں بہت زیادہ ممانعت آئی ہے اور اس سلسلے میں اجازت بھی دی گئی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لِلسَّائِلِ حَقٌّ وَلَوْ جَاءَ عَلٰى فَرَسٍ۔ (۱) مانگنے والے کا حق ہے اگرچہ گھوڑے پر آئے۔

ایک دوسری حدیث شریف میں ہے۔

رُدُّوا السَّائِلَ وَلَوْ بِظِلْفٍ مُحْرَقٍ۔ (۲) سائل کا سوال پورا کرو اگرچہ جلے ہوئے کھر کے ساتھ ہو۔

اگر مانگنا مطلقاً حرام ہوتا تو جو شخص اپنے دشمنوں پر زیادتی کرتا ہے اس کی مدد جائز نہ ہوتی اور عطا کرنا مدد ہے۔ تو اس سلسلے میں وضاحت یہ ہے کہ اصل کے اعتبار سے سوال حرام ہے اور ضرورت کے تحت یا کسی اہم حاجت کی صورت میں جو ضرورت کے قریب ہے، مانگنا جائز ہے اگر اس سے بچ سکتا ہو تو سوال حرام ہوگا ہم نے یہ کہا کہ اصل میں سوال حرام ہے کیوں کہ مانگنے کی صورت میں تین حرام کام کرنا پڑتے ہیں۔

مانگنے کی تین خرابیاں

پہلا کام - اللہ تعالیٰ پر شکوہ کا اظہار، کیوں کہ سوال فقر کا اظہار ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی کمی کا ذکر عین شکوہ ہے اور جس طرح کسی مملوک غلام کا مانگنا اپنے مالک پر طعن و تشنیع ہے اسی طرح بندوں کا سوال کرنا اللہ تعالیٰ کی ذات پر طعن ہے اور یہ کام حرام ہے اور ضرورت کے بغیر ایسا کرنا جائز نہیں جیساکہ مردار ضرورت کے وقت ہی حلال ہوتا ہے۔

دوسرا کام : مانگنے میں غیر خدا کے سامنے ذلت اختیار کرنا ہے اور مومن کے لیے جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے سامنے ذلیل و رسوا ہوتا پھرے بلکہ اسے چاہیے کہ اپنے آقا کے سامنے ہی عاجزی اختیار کرے کیوں کہ اس میں اس کی عزت ہے باقی تمام لوگ اس کی طرح بندے ہیں لہٰذا ضرورت کے بغیر ان کے سامنے ذلت و رسوائی اختیار نہ کرے۔

اور سوال کرنے میں مسئول عنہ (جس سے سوال کیا گیا) کی نسبت سائل کی ذلت ہے۔

---

(۱) سنن ابی داؤد جلد اول ص ۲۳۵ کتاب الزکوٰۃ

(۲) سنن ابی داؤد جلد اول ص ۲۳۵ کتاب الزکوٰۃ

تیسرا کام: عام طور پر مانگنے والے کو مسئول عنہ کی طرف سے اذیت پہنچتی ہے کیوں کہ بعض اوقات وہ دل کی خوشی سے خرچ کرنا نہیں چاہتا پس اگر وہ سائل سے حیا کرتے ہوئے یا ریاکاری کے طور پر خرچ کرے تو یہ لینے والے پر حرام ہے اور اگر وہ منع کرے تو بعض اوقات وہ حیا کرتے ہوئے منع کرتے وقت اپنے نفس میں اذیت محسوس کرتا ہے کیوں کہ اپنے آپ کو بخیل کی شکل میں دیکھتا ہے کہ خرچ کرنے میں مال کا نقصان ہے اور منع کرنے میں عزت کا نقصان ہے اور یہ دونوں کام اذیت ناک ہیں اور مسائل ہی ایذا کا سبب بنا ہے اور ایذا رسانی ضرورت کے بغیر حرام ہے۔

اب جب تم ان تینوں ممنوع باتوں کو سمجھ گئے تو تمہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کی سمجھ بھی آ گئی ہو گی کہ آپ نے فرمایا۔

مَسْأَلَةُ النَّاسِ مِنَ الْفَوَاحِشِ مَا أُحِلَّ مِنَ الْفَوَاحِشِ غَيْرُهَا۔ (۱)

لوگوں سے مانگنا فاحش کاموں سے ہے اور فواحش میں سے صرف یہی جائز ہے۔

تو دیکھئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگنے کو فاحشہ (بے حیائی کا کام) قرار دیا اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ فاحش کام ضرورت کے وقت ہی جائز ہوتا ہے جیسے کسی آدمی کا لقمہ پھنس جائے اور اس کے پاس شراب کے سوا کچھ نہ ہو (تو اسے استعمال کر سکتا ہے)

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ سَأَلَ عَنْ غِنًى فَإِنَّمَا يَسْتَكْثِرُ مِنْ جَمْرِ جَهَنَّمَ۔ (۲)

جو شخص مال دار ہونے کے باوجود مانگتا ہے وہ جہنم کے انگارے زیادہ کرتا ہے۔

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

مَنْ سَأَلَ وَلَهُ مَا يُغْنِيهِ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَوَجْهُهُ عَظْمٌ يَتَقَعْقَعُ وَلَيْسَ عَلَيْهِ لَحْمٌ۔ (۳)

جو شخص بے نیازی کے باوجود مانگتا ہے وہ قیامت کے دن یوں آئے گا کہ اس کا چہرہ ایک ہڈی ہو گی جو حرکت کرے گی اور اس پر گوشت نہیں ہو گا۔

دوسری روایت میں اسطرح ہے۔

وَكَانَتْ مَسْأَلَتُهُ خُدُوشًا وَكُدُوحًا

اور اس کا سوال اس کے چہرے پر خراشیں بن

---

(۱)

(۲) صحیح مسلم جلد اول ص ۳۳۳ کتاب الزکوٰۃ

(۳) المستدرک للحاکم جلد اول ص ۴۰۷ کتاب الزکوٰۃ

فِی وَجْهِهٖ (۱) جائے گا۔

تو یہ الفاظ مانگنے کی حرمت اور سختی میں واضح ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جماعت کو اسلام پر بیعت فرمایا تو ان پر سننے اور ماننے کی شرط رکھی پھر ان سے ایک ہلکا سا کلمہ فرمایا۔

وَلَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا۔ (۲) اور لوگوں سے کچھ نہ مانگنا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر سوال سے بچنے کا حکم دیتے اور فرماتے۔

مَنْ سَأَلَنَا أَعْطَيْنَاهُ وَمَنِ اسْتَغْنَى أَغْنَاهُ اللّٰهُ وَمَنْ لَمْ يَسْأَلْنَا فَهُوَ أَحَبُّ إِلَيْنَا۔ (۳)

جو شخص ہم سے مانگے گا ہم اسے دیں گے اور جو بے نیازی اختیار کرے اللہ تعالیٰ اسے بے نیاز کر دے گا اور جو آدمی ہم سے سوال نہ کرے وہ ہمیں زیادہ پسند ہے

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

اِسْتَغْنُوا عَنِ النَّاسِ وَمَا قَلَّ مِنَ السُّؤَالِ فَهُوَ خَيْرٌ۔

لوگوں سے بے نیاز رہو (سوال نہ کرو) اور جس قدر سوال کم ہو (اسی قدر) بہتر ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ سے بھی؟ آپ نے فرمایا ہاں مجھ سے بھی۔ (۴) (تواضع کے طور پر یا تعلیم کے لیے فرمایا)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو (نماز) مغرب کے بعد سوال کرتے ہوئے سنا تو اپنی قوم کے ایک شخص سے فرمایا اسے کھانا کھلاؤ اس نے کھانا کھلایا آپ نے دوبارہ سوال کرتے ہوئے سنا تو فرمایا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ اسے کھانا کھلاؤ اس نے عرض کیا میں نے اسے کھانا کھلا دیا ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو اس شخص کی بغل میں روٹیوں سے بھرا ہوا توبرا تھا آپ نے فرمایا تم سائل نہیں بلکہ تاجر ہو پھر آپ نے اس سے لے کر صدقہ کے اونٹوں کے سامنے ڈال دیا اور اسے درے سے مارا اور فرمایا آئندہ ایسا نہ کرنا ــــ اگر مانگنا حرام نہ ہوتا تو آپ اسے نہ مارتے اور نہ ہی اس کا توبرا لیتے۔

شاید کوئی کم عقل تنگ حوصلے والا شخص اعتراض کرے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف اس عمل کی نسبت عقل سے

---

(۱) سنن ابی داؤد جلد اول ص ۲۳۱ کتاب الزکوٰۃ

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۲۷ مرویات عوف بن مالک

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۴۴ مرویات ابو سعید خدری

(۴) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۱۱ ص ۴۴۴ حدیث ۱۲۲۵۷

بعید ہے آپ کا مارنا تادیب ہے اور شریعت میں تعزیر کا حکم آیا اور اس کا مال لینا بطور جرمانہ تھا اور شریعت میں مال کے ساتھ سزا جائز نہیں ہے تو آپ نے اس بات کو کیسے جائز سمجھ لیا ایسا اعتراض کرنے والے فقہ کم جانتے ہیں فقہاء کی فقہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے کیا ہے آپ جس قدر اللہ تعالیٰ کے دین کی سمجھ رکھتے تھے اور بندوں کے مصالح سے آگاہ تھے ان لوگوں کو کہاں حاصل ہے تمہارا کیا خیال ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ مالی سزا جائز نہیں یا ان کو معلوم تو تھا لیکن انہوں نے غصے میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی یا آپ نے مصلحت کے تحت جھڑکنے کے لیے وہ راستہ اختیار کیا جو نبی کی شریعت کے خلاف ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ بھی تو گناہ ہے بلکہ آپ کے لیے جو فقہ واضح ہوئی وہ یہ تھی کہ آپ نے اس کو سوال سے مستغنی خیال کیا اور جان لیا کہ اسے جو کوئی کچھ دیتا تھا وہ اس کو محتاج سمجھ کر دیتا تھا حالانکہ وہ جھوٹا تھا اس لیے جو کچھ وہ دھوکہ دہی کے ذریعے حاصل کرتا تھا وہ اس کی ملک میں داخل نہیں ہوا۔ اور ان چیزوں کے مالکوں کو تلاش کرنا ممکن نہ تھا کہ ان تک لوٹایا جاتا کیوں کہ بعینہٖ ان کی پہچان نہ ہو سکی۔ تو اس مال کا کوئی مالک نہ رہا لہٰذا مسلمانوں کے مصالح پر خرچ کرنا واجب تھا اور اونٹ اور ان کا چارہ مسلمانوں کے مصالح میں سے ہے۔

سائل نے جھوٹ کے ذریعے اپنی حاجت کو ظاہر کیا تو اس کی مثال اس طرح ہے جیسے کوئی شخص علوی بن کر حاصل کرے حالانکہ وہ علوی نہیں ہے تو وہ جو کچھ لے گا اس کا مالک نہیں ہو گا اسی طرح ایک صوفی جو بظاہر صالح ہے اور اس کی صالحیت کی وجہ سے اسے دیا جاتا ہے لیکن وہ باطنی طور پر گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے اور اگر دینے والے کو اس بات کا علم ہو جاتے تو وہ اسے ہرگز نہ دے۔ اور ہم نے کئی جگہ لکھا ہے کہ جو کچھ وہ اس طریقے پر لیتے ہیں وہ اس کے مالک نہیں ہوتے اور یہ مال ان پر حرام ہے اور ان پر لازم ہے کہ اسے مالک کی طرف لوٹا دیں۔

پس تم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فعل سے اس معنیٰ کی صحت پر استدلال کرو جس سے بہت سے فقہاء غافل ہیں اور ہم نے متعدد مقامات پر اس کا ذکر کیا اور فقہ سے اپنی غفلت کے باعث حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فعل کو باطل قرار نہ دو (حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بطور تنبیہ اس کو سزا دی اور روٹیاں واپس لیں)

پس جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ ضرورت کے تحت سوال جائز ہے تو جان لو کہ کسی چیز کے لیے آدمی مجبور ہوتا ہے یا اس کی سخت حاجت ہوتی ہے یا معمولی حاجت ہوتی ہے یا اس سے بے نیاز ہوتا ہے تو یہ چار حالتیں ہیں پہلی حالت یعنی جب مجبور ہو (جسے حالت اضطرار کہتے ہیں) جیسے کسی شخص کو اپنے نفس پر موت یا بیماری کا ڈر ہو یا وہ ننگا ہے اور اس کے پاس بدن ڈھانپنے کے لیے کچھ نہیں تو اس صورت میں سوال جائز ہے جب مسئول میں باقی شرائط پائی جائیں اور وہ اس کے سوال پر دل سے راضی بھی ہو نیز سائل کمانے سے عاجز بھی ہو کیوں کہ جو شخص کما سکتا ہے لیکن نکما پھرتا ہے اسے سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے البتہ اس کا تمام وقت حصول علم میں خرچ ہو جاتا ہو تو جائز ہے اور جو شخص لکھنا جانتا ہو وہ کتابت کے ذریعے کمانے پر قادر ہے اور جو شخص (سوال سے) بے نیاز ہو کر کچھ مانگے اور اس کے پاس اس مال کی مثل یا کوئی مثل چیز موجود ہے تو اس کے لیے مانگنا قطعی طور

پر حرام ہے اور یہ دونوں قسمیں واضح ہیں۔

دوسری حالت یعنی جب سخت حاجت ہو جیسے مریض کو دوائی کی ضرورت ہے لیکن اسے دوائی استعمال نہ کرنے سے ہلاکت وغیرہ کا خوف ہوتا ہے لیکن زیادہ خطرہ نہیں ہوتا یا ایک آدمی کے جسم پر کوٹ ہے لیکن اس کے نیچے قمیص نہیں ہے اور سردیوں کا موسم ہے اسے سردی سے اذیت پہنچتی ہے لیکن ضرورت کی حد پیدا نہیں ہوتی اسی طرح ایک آدمی کرائے کے لیے پیسے مانگتا ہے حالانکہ وہ کچھ مشقت برداشت کر کے پیدل بھی چل سکتا ہے تو ایسے شخص کے لیے بھی مانگنا جائز ہوگا کیوں کہ یہاں حاجت ثابت ہے البتہ صبر کرنا زیادہ بہتر ہے اور وہ سوال کر کے اولیٰ (بہتر) کام کو چھوڑ رہا ہے اور جب وہ سوال کرنے میں سچا ہو تو اس کے سوال کو مکروہ نہیں کہا جائے گا مثلاً وہ کہتا ہے کہ میرے کوٹ کے نیچے قمیص نہیں ہے اور سردی مجھے اذیت دیتی ہے میں اسے برداشت کرتا ہوں لیکن مشقت اٹھانا پڑتی ہے پس جب وہ سچ بولے گا تو اس کا سچ اس کے سوال کا کفارہ بن جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ۔

تیسری حالت حاجت خفیفہ کی ہے اس کی مثال اس طرح ہے کہ ایک شخص قمیص مانگتا ہے تاکہ باہر جاتے وقت اسے کپڑوں کے اوپر پہن لے تاکہ اس کے کپڑوں کی پھٹن لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہے یا کوئی شخص سالن کے لیے مانگتا ہے جب کہ روٹی اس کے پاس موجود ہے یونہی ایک شخص کے پاس گدھے کا کرایہ ہے لیکن وہ گھوڑے کے کرائے کے لیے سوال کرتا ہے یا سواری کے کرائے پر قادر ہے لیکن کجاوے کے کرائے کے لیے مانگتا ہے تو اس صورت میں اگر وہ دھوکہ دیتا ہے کہ اس حاجت کے علاوہ حاجت کا اظہار کرتا ہے تو یہ حرام ہے اور اگر ایسی صورت نہیں لیکن یہ تین خرابیاں یعنی اللہ تعالیٰ پر شکوہ، ذلت برداشت کرنا اور مسئول کو ایذا پہنچانا پایا جاتا ہے تو بھی حرام ہے کیوں کہ اس قسم کی حاجت کے لیے اس قسم کے ممنوعات کو جائز قرار دینا صحیح نہیں ہے اور اگر تین باتوں میں سے کوئی بات نہ ہو تو سوال کرنا جائز ہوگا لیکن مکروہ بھی ہوگا۔

سوال :۔

ان تین ممنوع امور سے سوال کا خالی ہونا کیسے ممکن ہے۔

جواب :۔

شکوہ تو یوں دور ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور مخلوق سے بے نیاز رہے اور محتاج کی طرح سوال نہ کرے بلکہ یوں کہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے میں اس کی وجہ سے سوال سے بے نیاز ہوں لیکن میرے نفس کی طمع مجھ سے ایک اور کپڑے کا سوال کرتی ہے جو میں کپڑوں کے اوپر پہنوں اور یہ حاجت سے زائد ہے اور نفس کے فضول امور میں سے ہے اس طرح وہ شکوہ کی حد سے نکل جائے گا۔

ذلت سے نکلنے کی صورت یہ ہے کہ اپنے باپ سے یا کسی قریبی رشتہ دار یا کسی ایسے دوست سے مانگے جس کے بارے میں وہ جانتا ہو کہ اس کی نگاہوں میں وہ حقیر نہیں ہوگا اور سوال کی وجہ سے ذلت اٹھانا نہیں پڑے گی یا کسی ایسے سخی سے

مانگے جس نے اپنے مال کو اس مقصد کے لیے تیار کر رکھا ہے اور وہ اس قسم کا کام کر کے خوش ہوتا ہے بلکہ اس کے قبول کرنے کو اپنے اوپر احسان سمجھتا ہے یوں سوال کرنے سے ذلت اٹھانا نہیں پڑے گی کیوں کہ ذلت، احسان کے ساتھ لازم ہے ایذا اور سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ سوال کے لیے کسی شخص کو معین نہ کرے بلکہ سب کے سامنے سوال رکھ دے تاکہ جسے دینے کی سچی رغبت ہو وہ دے دے اور اگر مجلس میں کوئی ایسا شخص ہو جس کی طرف لوگوں کی نظریں اٹھتی ہیں اور اگر وہ نہ دے تو ملامت کیا جاتا ہے تو یہ اسے ایذا پہنچانا ہے کیوں کہ بعض اوقات وہ ملامت کے خوف سے مجبوراً خرچ کرتا ہے اور دل میں سوچتا ہے کہ اگر ملامت کا خوف نہ ہوتا تو میں دینے سے اجتناب کرتا۔

اور اگر کسی معین شخص سے سوال کرے تو مناسب یہ ہے کہ صراحتاً نہ کہے بلکہ کنایتاً کہے تاکہ وہ غفلت برتنا چاہے تو اس کے لیے راستہ کھلا ہو اور اگر وہ طاقت کے باوجود غفلت اختیار نہیں کرتا تو گویا وہ خوشی سے دے رہا ہے اور اس دینے سے اسے کوئی اذیت نہیں پہنچتی اور مناسب یہی ہے کہ ایسے آدمی سے سوال کرے جو اس کے سوال کو رد کرنا چاہے یا غفلت برتے تو اسے حیا دامن گیر نہ ہو کیونکہ سائل سے حیا اذیت کا باعث ہے جس طرح مانگنے والا نہ ہو تو وہاں دکھاوا ایذا رسانی کا باعث ہے۔

سوال:۔

اگر سائل کو معلوم ہو کہ دینے والا اس سے یا حاضرین سے حیا کرتے ہوئے دیتا ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ نہ دیتا ہے تو کیا اس صورت میں لینا حلال ہے یا مشتبہ؟

جواب:

میں کہتا ہوں یہ محض حرام ہے اور اس سلسلے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں اور اس کا حکم وہی ہے جو دوسروں کا مال مارپیٹ یا بدمعاشی کے ذریعے لینے کا حکم ہے کیوں کہ اس بات میں کوئی فرق نہیں کہ اس کے ظاہری چمڑے کو لکڑی کے ڈنڈے سے مارے یا دل کے باطن کو حیا اور ملامت کے خوف کے ڈنڈے سے مارے بلکہ عقلمند لوگوں کی نگاہ میں باطنی ضرب کا زیادہ دکھ ہوتا ہے۔ اور یہ نہ کہا جائے کہ ظاہری طور پر تو وہ راضی ہو گیا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّمَا اَحْکُمُ بِالظَّاهِرِ وَاللّٰہُ یَتَوَلَّی السَّرَائِرَ۔ میں ظاہر کے مطابق حکم دیتا ہوں باطن کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

تو یہ مقدمات کے فیصلوں کے سلسلے میں قاضیوں کی ضرورت ہے کیوں کہ وہ باطن کا حال نہیں جانتے اور نہ ہی ان کو قرائن احوال کا علم ہوتا ہے لہٰذا وہ ظاہری زبانی قول پر حکم دینے میں مجبور ہیں حالانکہ زبان سے اکثر جھوٹ نکلتا ہے لیکن ضرورت کا تقاضا ہے۔

اور یہ سوال بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہے کیوں کہ اس میں حاکم تمام حاکموں سے بڑا ہے اور اس کے نزدیک دلوں کا وہ مقام ہے جو دیگر حاکموں کے نزدیک زبان کا ہے لہٰذا اس قسم کی صورت میں اپنے دل کو دیکھو اگرچہ لوگ تمہیں فتویٰ

دیں کیوں کہ مفتی، قاضی اور سلطان کو سکھاتے ہیں تاکہ وہ ظاہری طور پر فیصلہ کر سکیں اور دلوں کے مفتی آخرت کا علم رکھنے والے لوگ ہیں اور ان کے فتویٰ سے آخرت کے بادشاہ کی پکڑ سے نجات ہو گی جس طرح فقیہ کے فتویٰ سے دنیا کے حاکم سے نجات ملتی ہے تو سائل جو مال دوسرے کی مرضی کے بغیر لیتا ہے دیانتاً اس کا مالک نہیں ہوتا اور (اخلاقی طور پر) اس پر واجب ہے کہ اس کے مالک کو واپس کر دے اور اگر وہ حیا کرتے ہوئے واپس نہ لے تو اس پر لازم ہے کہ اس مال کی قیمت کے برابر اسے ہدیہ اور تحفہ دے تاکہ اس کی ذمہ داری پوری ہو جائے۔ اور اگر وہ اس کا ہدیہ بھی قبول نہ کرے تو چاہیئے کہ اس کے وارثوں کو واپس دے دے اور اگر اس کے پاس ضائع ہو جائے تو عنداللہ اس پر تاوان ہو گا (اگرچہ فقہی حکم کے مطابق تاوان نہیں ہوتا نہ ہی واپسی لازمی ہے) اور اس میں تصرف کرنے سے وہ گناہ گار ہو گا نیز سوال کر کے جو اسے اذیت پہنچائی ہے اس کا گناہ بھی ہو گا۔

سوال:

یہ تو ایک باطنی معاملہ ہے جس پر مطلع ہونا مشکل ہے پس اس سے نجات کا کیا راستہ ہے؟ بعض اوقات سائل یہ سمجھتا ہے کہ دینے والا راضی ہے حالانکہ وہ دل سے راضی نہیں ہوتا۔

جواب:

یہی وجہ ہے کہ متقی لوگوں نے سرے سے سوال کرنا ہی چھوڑ دیا وہ کسی سے کچھ بھی نہیں لیتے تھے حضرت بشر رحمہ اللہ، حضرت سری سقطی رحمہ اللہ کے علاوہ کسی سے کچھ نہ لیتے اور فرماتے ہیں ان سے اس لیے لیتا ہوں کہ وہ مال دینے پر خوش ہوتے ہیں لہٰذا میں ان کے پسندیدہ عمل پر ان کی مدد کرتا ہوں۔

مانگنے پر اعتراض اور اس سے بچنے کی تاکید اسی لیے ہے کہ ضرورت کے بغیر کسی کو ایذا پہنچانا جائز نہیں ہے یعنی سائل کو ہلاکت کا خطرہ ہو اور نجات کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور اسے کوئی ایسا شخص نہ ملے جو کراہت اور اذیت کے بغیر (خوشی خوشی) دیتا ہو تو اب اس کے لیے جائز ہو گا۔ جیسے (ایسی حالت میں) خنزیر کا گوشت اور مردار کا گوشت کھانا حلال ہو جاتا ہے تو پرہیز گار لوگوں کا طریقہ بچنا ہے۔ بعض ارباب قلوب اپنی بصیرت کی وجہ سے احوال کے قرائن پر مطلع ہو جاتے تھے اس لیے کسی سے لیتے تھے اور کسی سے نہیں لیتے تھے اور بعض اکابر صرف اپنے دوستوں سے لیتے تھے اور بعض ان لوگوں سے لیتے جو بعض مال دیتے اور کچھ واپس لے لیتے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مینڈھے، گھی اور پنیر کے سلسلے میں عمل اختیار فرمایا اور یہ اس صورت میں ہوتا تھا جب سوال کے بغیر کچھ ملے کیوں کہ اس میں دینے والے کی رغبت ہوتی ہے لیکن بعض اوقات رغبت کی وجہ جاہ و مرتبہ کی طمع یا ریاکاری اور شہرت کی طلب ہوتی ہے چنانچہ اس سے وہ لوگ بچتے تھے۔ لیکن جہاں تک سوال کا تعلق ہے تو اس سے وہ دو جگہ بالکل پرہیز کرتے تھے البتہ دو موقعوں پر سوال کرتے تھے۔ ایک تو ضرورت کے وقت سوال کرتے تین انبیاء کرام حضرت سلیمان، حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہم السلام نے ضرورت کے وقت سوال کیا اور اس میں شک نہیں کہ

انہوں نے ایسے لوگوں سے سوال کیا جن کے بارے میں وہ جانتے تھے کہ وہ رغبت سے دینے والے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ انہوں نے دوستوں اور بھائیوں سے سوال کیا وہ ان کا مال سوال اور اجازت کے بغیر بھی لے لیتے تھے کیوں کہ اہل دل اس بات کو جانتے ہیں کہ مطلوب دل کی رضا مندی ہے زبان سے بولنا نہیں اور انہیں اپنے ان بھائیوں پر یقین تھا کہ وہ ان کی بے تکلفی پر خوش ہوں گے اور جب ان کے بارے میں شک ہوتا کہ آیا وہ ہمارے اس لینے پر راضی ہوں گے یا نہیں تو سوال کرتے تھے ورنہ ان کو سوال کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

اور سوال کرنے کی اجازت کی حد یہ ہے کہ سائل کو معلوم ہو کہ مسئول ایسی صفت پر ہے کہ اگر اسے میری حاجت کا علم ہو جائے تو سوال کے بغیر خود بخود ہی مجھے دے دے گا اب سوال کا مقصد صرف حاجت سے آگاہی ہوتا ہے اور حیاء کے ذریعے اسے آگاہ کرنا یا کسی حیلے بہانے سے دینے کے لیے اسے تیار کرنا مقصود نہیں ہوتا اس کے بعد بھی سائل کی تین حالتیں ہوتی ہیں ایک حالت یہ کہ اسے مسئول کی قلبی رضا مندی میں کوئی شک نہیں ہوتا دوسری حالت میں اس کی عدم رضا یقینی ہوتی ہے اور یہ بات احوال کے قرینے سے معلوم ہوتی ہے پہلی حالت میں لینا مطلقاً حلال ہے دوسری حالت میں قطعی حرام ہے اور ان دونوں حالتوں کے درمیان کچھ مشکوک احوال ہیں ان کے بارے میں دل سے پوچھنا چاہیئے اور جو کچھ دل میں کھٹکے اسے چھوڑ دے کیوں کہ یہ گناہ ہے جس میں شک ہو اس کو چھوڑ کر اسے اختیار کرے جس میں شک نہیں ہے اور ذہین آدمی کے لیے قرائن احوال کے ذریعے اس کا ادراک آسان ہوتا ہے بشرطیکہ اس کی حرص اور خواہش کمزور ہو اور اگر حرص مضبوط اور سمجھ کمزور ہو تو اسے وہی کچھ دکھائی دیتا ہے جو اس کی غرض کے موافق ہو اور کراہت پر دلالت کرنے والے قرائن کی سمجھ نہیں آتی ان باریک باتوں کے ذریعے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا راز سمجھ آتا ہے۔

آپ نے فرمایا۔

اِنَّ اَطْیَبَ مَا اَکَلَ الرَّجُلُ مِنْ کَسْبِہٖ۔ انسان جو سب سے اچھا کھانا کھاتا ہے وہ اس کا اپنا کمایا ہوا ہوتا ہے۔ (۱)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جامع کلمات کے ساتھ گفتگو کی صلاحیت عطا کی گئی ہے کیوں کہ جو شخص کماتا نہ ہو اور اسے باپ یا کسی قریبی رشتہ دار کی کمائی سے مالِ وراثت بھی نہ ملا ہو وہ لوگوں سے لے کر کھاتا ہے اگر سوال کے بغیر دیا جائے تو دین کی وجہ سے دیا جائے گا اور اگر اس کا اندرونی معاملہ ایسا ہے کہ اگر لوگوں کے سامنے آجائے تو وہ اسے دین کی وجہ سے نہ دیں تو اس صورت میں یہ کھانا حرام ہوگا اور اگر مانگنے پر دیا گیا تو مانگنے پر دینے والے نے کب دل کی خوشی سے دیا اور سوال میں ضرورت کی مقدار کا کب خیال رکھا جاتا ہے۔

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۱۳ مرویات عائشہ

اور جب تم لوگوں کے مال سے کھانے والے کے حال کی تفتیش کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ جو کچھ وہ کھاتا ہے سب کا سب یا اس کا اکثر حرام سے اور حلال و پاکیزہ وہ ہے جو خود اس نے حلال کمائی سے حاصل کیا یا جس کا وہ وارث ہے اس نے حلال کمائی کے ذریعے حاصل کیا لہٰذا لوگوں سے لے کر کھانے کے ساتھ تقویٰ جمع نہیں ہو سکتا۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ غیر سے ہماری طمع کو ختم کر دے اور اپنے حلال مال کے ساتھ حرام سے بے نیاز کر دے اور اپنے فضل و کرم، احسان اور وسیع جُود کے ذریعے غیر سے ہماری طمع کو منقطع کر دے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔

فصل ۸:

کس قدر مالداری سے سوال حرام ہوتا ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ سَأَلَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرًا فَلْيَسْتَقِلَّ مِنْهُ أَوْ يَسْتَكْثِرْ۔ (۱)

جو شخص مالداری کے باوجود سوال کرتا ہے وہ انگارے کا سوال کرتا ہے بس اس کی مرضی ان انگاروں کو کم لے یا زیادہ۔

یہ حدیث سوال کے حرام ہونے میں صریح ہے لیکن مال داری کی حد بندی مشکل ہے اور ہم مقدار مقرر نہیں کر سکتے بلکہ یہ توفیقی ہے (جیسے شریعت بتائے)

اور حدیث شریف میں ہے۔

اِسْتَغْنُوْا بِغِنَى اللهِ تَعَالَى عَنْ غَيْرِهِ۔

اللہ تعالیٰ سے حاصل مالداری کے ذریعے اس کے غیر سے بچو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا وہ (مال داری) کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔

غَدَاءُ يَوْمٍ وَعَشَاءُ لَيْلَةٍ۔ (۲)

صبح و شام کا کھانا۔

ایک دوسری حدیث شریف میں ہے۔

مَنْ سَأَلَ وَلَهُ خَمْسُوْنَ دِرْهَمًا أَوْ عِدْلُهُمَا مِنَ الذَّهَبِ فَقَدْ سَأَلَ إِلْحَافًا۔ (۳)

جس شخص نے سوال کیا اور اس کے پاس پچاس درہم یا ان کے برابر سونا ہو تو اس نے الحاف کے طور پر سوال کیا (چمٹ جانا الحاف ہے)

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۱۴۷ مرویات علی

(۲) الکامل لابن عدی جلد ۳ ص ۱۰۹۸ من اسمہ سلیمان بن عمرو

(۳) السنن الکبریٰ للبیہقی جلد ۷ ص ۲۴ کتاب الصدقات

(اور قرآن پاک میں بتایا گیا کہ صدقہ وغیرہ کے مستحق وہ لوگ ہیں جو لوگوں سے بطور الحاف سوال نہیں کرتے گویا حدیث شریف میں بتایا گیا کہ ایسے لوگ سوال کرنے کا حق نہیں رکھتے ۱۲ ہزاروی)

ایک دوسری حدیث میں چالیس درہم کا ذکر ہے (۱)

اور جب مقدار میں اختلاف ہو اور روایات صحیح ہوں تو ان کو مختلف احوال سے متعلق ماننا پڑتا ہے کیوں کہ فی نفسہٖ حق تو ایک ہی ہے اور ہم اندازہ مقرر نہیں کر سکتے اور زیادہ سے زیادہ ممکن بات یہی ہے کہ اسے قریب قریب قرار دیا جائے اور وہ اسی صورت میں ہے جب ایسی تقسیم ہو جو محتاج لوگوں کے احوال کا احاطہ کرتی ہو تو ہم کہتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا حَقَّ لِابْنِ آدَمَ اِلَّا فِي ثَلَاثٍ طَعَامٍ يُقِيمُ صُلْبَهُ وَثَوْبٍ يُوَارِي عَوْرَتَهُ وَبَيْتٍ يُكِنُّهُ فَمَا زَادَ فَهُوَ حِسَابٌ۔ (۲)

انسان کا حق صرف تین چیزوں میں ہے طعام جو اس کی پیٹھ کو سیدھا رکھے کپڑا جو اس کے ستر کو ڈھانپے اور گھر جو اسے ٹھکانہ دے پس جو زیادہ ہے اس کا حساب ہوگا۔

تو ہم ان تین چیزوں کو حاجات میں اصل قرار دیتے ہیں تاکہ ان کی اجناس کا بیان ہو سکے اور جنس، مقدار اور وقت میں نظر کی جاسکے۔

تو اجناس یہی تین ہیں (یعنی کھانا، لباس اور رہائش) اور ان کے ساتھ جو ان کے ہم معنی ہیں وہ بھی ملحق ہیں حتیٰ کہ ان کے ساتھ مسافر کا کرایہ بھی شامل ہے اگر پیدل چل نہ سکتا ہو اور اسی طرح جو اہم امور ان کے قائم مقام ہیں۔ اور انسان کی ذاتی ضروریات میں اس کے اہل و عیال اور جو اس کے زیر کفالت ہیں وہ بھی شامل ہیں جیسے جانور وغیرہ۔

مقدار کا جہاں تک تعلق ہے تو اس میں یہ خیال رکھا جائے کہ وہ دیندار لوگوں کے شایانِ شان ہو اور وہ ایک جوڑا ہو یعنی قمیص، رومال، سلوار اور جوتا اور ہر جنس سے دوسرے کی حاجت نہیں گھر کے تمام سامان کو اسی پر قیاس کرے اور یہ بھی مناسب نہیں کہ باریک کپڑے تلاش کرے برتن مٹی کے ہوں تو وہی کافی ہیں پیتل اور تانبے کے برتن تلاش کرنے کی حاجت نہیں گویا تعداد کے اعتبار سے ایک اور نوع کے اعتبار سے سب سے ہلکی قسم ہونی چاہیے بشرطیکہ عادت (عرف) سے زیادہ دور نہ ہو جائے۔

کھانے کی مقدار ایک دن میں ایک مُد (ایک کلو) ہے اور یہ شریعت نے مقرر کی ہے اور کس قسم کا کھانا ہونا چاہیے تو جو کھانا کھایا جاتا ہے چاہے جو ہی کیوں نہ ہوں اور ہمیشہ سالن کھانا ضرورت سے زائد ہے اور اسے بالکل چھوڑ دینا نقصان دیتا ہے بعض حالات میں اس کی طلب کی اجازت ہے۔

---

(۱) السنن الکبریٰ للبیہقی جلد ۷، ص ۲۴ کتاب الصدقات

(۲) المستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۳۱۲ کتاب الرقاق

رہائش بھی وہی چاہیئے جو مقدار کے اعتبار سے کفایت کرے اور بہ کسی زینت کے بغیر ہو زینت اور توسیع کے لیے مانگنا مال داری کے ساتھ مانگنا ہے۔

اوقات کی طرف اضافت کی صورت یہ ہے کہ جس کی فی الحال ضرورت ہو یعنی ایک دن رات کا کھانا، پہننے کے لیے لباس، اور ٹھکانہ جو اسے پناہ دے اور اس میں شک نہیں لیکن مستقبل کے لیے سوال کے تین درجے ہیں۔

پہلا درجہ : جس کی دوسرے دن کے لیے حاجت ہو۔

دوسرا درجہ : جس کی چالیس یا پچاس دنوں میں ضرورت ہو۔

تیسرا درجہ : جس کی سال بھر کے لیے ضرورت ہو۔

تو قطعی حکم یہ ہے کہ جس کے پاس اس قدر ہو جو اسے اور اس کے اہل و عیال کو (اگر ہوں) ایک سال کے لیے کافی ہو تو مانگنا حرام ہے کیوں کہ یہ مال داری کی انتہا ہے اور حدیث شریف میں جو پچاس درہم مقرر کئے گئے ہیں وہ اسی اعتبار سے ہیں کیوں کہ اعتدال کے ساتھ خرچ کرتے ہوئے ایک شخص کے لیے سال میں پانچ دینار کافی ہیں لیکن عیالدار کے لیے بعض اوقات کافی نہیں ہوتے اور اگر سال گزرنے سے پہلے حاجت مند ہو جائے پس اگر وہ سوال پر قادر ہے اور آئندہ سوال کا موقع بھی مل سکتا ہے تو اس کے لیے سوال جائز نہیں ہوگا کیوں کہ فی الحال وہ بے نیاز ہے اور ممکن ہے کل تک زندہ نہ رہے تو اس طرح گویا وہ اس چیز کا سوال کر رہا ہے جس کی اسے حاجت نہیں ہے تو اسے صبح شام کا کھانا کافی ہوگا اور جس حدیث میں اس مقدار کا بیان ہے وہ اسی بات پر محمول ہے۔

اور اگر وہ آئندہ سوال کرنے کا موقع نہیں پاتا اور اگر اب سوال نہ کرے تو آئندہ اسے دینے والا کوئی نہیں ہوگا تو اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے کیونکہ ایک سال تک زندہ رہنے کی امید بعید از عقل نہیں ہے اور سوال کی تاخیر سے اسے اس بات کا خوف ہے کہ وہ مجبور ہو جائے اور ضرورت کی اشیاء سے عاجز ہو۔

اور اگر مستقبل میں سوال کرنے سے عجز کا خوف کمزور ہو اور جس کے لیے سوال کر رہا ہے وہ ضرورت سے خارج ہے تو سوال کرنا کراہیت سے خالی نہ ہوگا اور جس قدر مجبوری کمزور ہوگی اسی حساب سے سوال کی کراہت ہوگی اسی طرح سوال کے موقع کے چلے جانے اور جس مدت میں سوال کا محتاج ہوگا اس کی تاثیر بھی پیش نظر رکھی جائے گی۔

یہ تمام باتیں کسی ضابطے میں نہیں آسکتیں بلکہ بندہ خود سوچے اور اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان جو معاملہ ہے اس پر غور کرے پھر اپنے دل سے فتویٰ پوچھے اور اس پر عمل کرے اگر آخرت کے راستے پر چلتا ہے پس جس آدمی کا یقین مضبوط ہو مستقبل میں رزق کے ملنے پر کامل اعتماد ہو وقتی کھانے پر قناعت زیادہ ظاہر ہو تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا درجہ اعلیٰ ہے اب مستقبل کا خوف نہیں ہونا چاہیئے جب کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک دن کا کھانا تمہارے لیے اور تمہارے بال بچوں کے لیے عطا فرمایا ہے اب اگر یہ خوف ہوگا تو اس کی وجہ یقین کی کمی ہوگی نیز شیطان کی بات سننا اور اس کے ڈراتے

پر کان دھرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۱)

پس ان (کفار) سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا (۲)

شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ دیتا ہے۔

اور بری چیز کا سوال ضرورت کے وقت جائز ہوتا ہے اور جو شخص اس چیز کے لیے مانگے جس کی آج حاجت نہیں ہے اگرچہ سال کے دوران اسے ضرورت پڑے تو اس شخص کا حال اس آدمی کے حال سے زیادہ سخت ہے جس کو وراثت سے مال حاصل ہوا اور وہ اسے سال کے بعد کی ضرورت کے لیے رکھ دے ظاہری فتویٰ میں دونوں صورتیں جائز ہیں لیکن دونوں کی بنیاد دنیا کی محبت، لمبی امید اور اللہ تعالیٰ کے فضل پر یقین کا نہ ہونا ہے اور یہ امور ہلاکت خیز امور کی اصل ہیں ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ وہ اپنے لطف و کرم سے ہمیں حُسنِ توفیق عطا فرمائے۔

فصل ۹:

مانگنے والوں کے حالات

حضرت بشر رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ فقراء تین قسم کے ہیں ایک وہ فقیر ہے جو سوال نہیں کرتا اور اگر اسے کچھ دیا جائے تو نہیں لیتا یہ رُوحانی لوگوں کے ساتھ اعلیٰ علیین میں رہے گا دوسرا وہ فقیر ہے جو مانگتا تو نہیں لیکن دیا جائے تو لے لیتا ہے یہ مقرب لوگوں کے ساتھ جنت الفردوس میں ہوگا۔ اور تیسرا فقیر وہ ہے جو حاجت کے وقت مانگتا ہے وہ اصحابِ یمین میں سے صدیقین لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ تو گویا یہ سب سوال کی مذمت پر متفق ہیں۔ البتہ فاقہ مرتبے اور درجے کو کم کر دیتا ہے۔

حضرت شقیق بلخی رحمہ اللہ نے حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ سے پوچھا جب آپ خراسان تشریف لائے تو آپ نے اپنے فقراء ساتھیوں کو کس حال میں چھوڑا؟ انہوں نے فرمایا اس طرح چھوڑا ہے کہ اگر ان کو دیا جائے تو شکر کرتے ہیں اور اگر نہ دیا جائے

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ آل عمران آیت ۱۷۵

(۲) قرآن مجید، سورۃ بقرہ آیت ۲۶۸

توصبر کرتے ہیں جب انہوں نے ان کا وصف یوں بیان کیا کہ وہ سوال نہیں کرتے اور ان کی بہت زیادہ تعریف کی تو حضرت شفیق بلخی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ بلخ کے کتوں کو آپ نے ہمارے پاس اسی طرح چھوڑا ہے حضرت ابراہیم بن ادھم نے پوچھا اے ابواسحق! آپ کے ہاں فقراء کا کیا حال ہے؟ انہوں نے فرمایا ہمارے فقراء کا حال یہ ہے کہ اگر ان کو نہ دیا جائے تو شکر کرتے ہیں اور اگر دیا جائے تو دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں حضرت ابراہیم بن ادھم نے ان کی پیشانی چوم کر فرمایا اے استاذ آپ نے سچ فرمایا۔

تو ارباب احوال کے درجات رضا، صبر، شکر اور سوال کے اعتبار سے بہت زیادہ ہیں لہٰذا جو شخص آخرت کے راستے پر چلتا ہے اسے ان درجات کی معرفت حاصل کرنی چاہیے نیز ان کی اقسام اور درجات کے درمیان اختلاف کی معرفت بھی حاصل ہو۔ اگر اسے معلوم نہ ہوگا تو پست درجات سے اعلیٰ درجات تک ترقی ممکن نہ ہوگی اور نہ ہی اسفل السافلین سے اعلیٰ علیین تک جا سکے گا۔ اور جو آدمی پست اور بلند کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا وہ ترقی پر قطعاً قدرت نہیں رکھتا شک تو اس آدمی کے بارے میں ہے پہچان رکھتا ہے کیوں کہ بعض اوقات وہ اس ترقی پر قادر نہیں ہوتا۔

اور ارباب احوال پر بعض اوقات ایسی حالت غالب ہوتی ہے جو اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ سوال کرنے سے ان کے درجات میں اضافہ ہو لیکن اس کا تعلق ان کی حالت سے ہے کیوں کہ اس قسم کے اعمال کا تعلق نیتوں کے ساتھ ہوتا ہے جیسے کسی نے حضرت ابواسحق نوری رحمہ اللہ کو دیکھا کہ وہ کسی جگہ ہاتھ پھیلائے لوگوں سے مانگ رہے ہیں وہ فرماتے ہیں میں نے اس بات کو گراں سمجھا اور ناپسند کیا میں حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کے پاس آیا اور واقعہ بتایا تو انہوں نے فرمایا اس بات سے پریشان نہ ہو حضرت نوری لوگوں سے اس لیے سوال نہیں کرتے کہ وہ ان کو کچھ دیں بلکہ اس لیے سوال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو آخرت میں ثواب ملے اور انہیں کسی ضرر کے بغیر اجر عطا ہو گویا انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی طرف اشارہ کیا آپ نے فرمایا

يَدُ الْمُعْطِي هِيَ الْعُلْيَا۔ (۱) دینے والے کا ہاتھ ہی بلند ہوتا ہے۔

بعض نے فرمایا کہ دینے والے کے ہاتھ سے مراد مال لینے والے کا ہاتھ ہے کیوں کہ اس کے واسطے سے ثواب ملتا ہے اور قدر اسی کی ہے اور جو کچھ وہ لیتا ہے اس کی قدر نہیں۔ پھر حضرت جنید رحمہ اللہ نے فرمایا ترازو لاؤ چنانچہ انہوں نے ایک سو درھم تولے پھر ایک مٹھی درھم لے کر ان سو میں ملا دیئے پھر فرمایا یہ ان (حضرت نوری رحمہ اللہ) کے پاس لے جاؤ میں نے دل میں سوچا کہ کسی چیز کو اس لیے تولا جاتا ہے کہ اس کی مقدار معلوم ہو تو انہوں نے کس طرح اس میں مجہول چیز کو ملایا حالانکہ یہ تو ایک عقل مند آدمی ہیں لیکن مجھے سوال کرتے ہوئے حیا محسوس ہوا چنانچہ میں وہ تھیلی لے کر حضرت نوری رحمہ اللہ کے پاس چلا گیا انہوں نے بھی

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۴۴۶ مرویات ابورمثہ

ترازو منگوایا اور ایک سو درھم تولے اور فرمایا یہ ان کے پاس واپس لے جاؤ اور کہو کہ میں تم سے کچھ بھی قبول نہیں کرتا اور جس قدر ایک سو سے زائد ہیں وہ لے رہا ہوں وہ بزرگ کہتے ہیں ان کی بات سے مجھے مزید تعجب ہوا چنانچہ میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا حضرت جنید رحمہ اللہ ایک دانا آدمی ہیں وہ رسی کے دونوں سرے خود ہی پکڑنا چاہتے ہیں انہوں نے ایک سو اپنے فائدے کے لیے تولے تاکہ آخرت کا ثواب حاصل کریں اور اس پر ایک مٹھی درھم بلا وزن اللہ تعالیٰ کے لیے ڈال دیئے تو جو کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے تھا میں نے وہ لے لیا اور جو کچھ انہوں نے اپنے لیے رکھا تھا میں نے واپس کر دیا وہ بزرگ فرماتے ہیں میں نے وہ درھم حضرت جنید رحمہ اللہ کو واپس کئے تو وہ رونے لگے اور فرمایا جو کچھ ان کے لیے تھا وہ انہوں نے لے لیا ہمارا مال ہمیں واپس کر دیا اور اللہ تعالیٰ سے ہی مدد مانگی جاتی ہے۔

تو دیکھو ان لوگوں کے دل کیسے صاف تھے اور ان کے اعمال بھی خالص اللہ تعالیٰ کے لیے تھے حتیٰ کہ ان میں سے ہر ایک، دوسرے کے دل کو دیکھ لیتا تھا اور زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی وہ دلوں کے ساتھ مشاہدہ کرتے اور اسرار پر گفتگو کرتے تھے اور یہ حلال رزق کھانے کا نتیجہ تھا نیز انہوں نے دل کو دنیا کی محبت سے خالی کیا اور پوری ہمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔

تو جو شخص تجربہ کرنے سے پہلے اس بات کا انکار کرے وہ جاہل ہے جیسے وہ شخص جو دوائی پینے سے پہلے اس کے مُسہل ہونے کا انکار کرے اور جو آدمی طویل اجتہاد کرے حتیٰ کہ اس میں پوری محنت صرف کر دے اور یہ بات اور وہ دوسروں کے لیے اس کا انکار کر دے تو ایسا شخص اس آدمی کی طرح ہے تو دست آور دوائی پیئے لیکن یہ دوائی اس کی کسی باطنی بیماری کی وجہ سے اس کے لیے موثر نہ ہو تو وہ اس دوائی کے دست آور ہونے کا ہی انکار کر دے تو ایسا شخص اگرچہ جہالت میں دوسرے سے کم درجے میں ہے لیکن جہالت کے ایک بہت بڑے حصے سے خالی نہیں ہے بلکہ بصیرت والے دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ شخص جو اس راستے پر چلے جو اہل اللہ کو معلوم ہے تو یہ ذوق اور معرفت والا آدمی ہے اور یہ عین الیقین کے مقام تک پہنچا وہ شخص جو ان بزرگوں کے راستے پر نہیں چلایا چلا تو سہی لیکن پہنچا نہیں البتہ اس نے اسے تسلیم کیا اور تصدیق کی تو یہ علم الیقین والا ہے اور جو آدمی علم الیقین اور عین الیقین دونوں سے خالی ہو وہ مومنوں کی جماعت سے خارج ہے اور قیامت کے دن منکرین متکبرین کے زمرے میں اٹھایا جائے گا جن کے دل مردہ اور شیطان کے تابع ہیں ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان لوگوں میں کر دے جو علم میں راسخ ہیں اور کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت تو صرف عقل مند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔

دوسرا حصہ:

زہد کا بیان

اس میں درج ذیل باتوں کا بیان ہوگا۔

حقیقت زہد، زہد کی فضیلت، زہد کے درجات اور اقسام، کھانے، لباس، رہائش اور گھر کے سامان کے سلسلے میں زہد، معیشت کی اقسام اور زہد کی علامت۔

فصل ۱:

زہد کی حقیقت

جان لو! دنیا سے بے رغبتی (یعنی زہد) سالکین کے مقامات میں سے ایک شریف مقام ہے اور دوسرے مقامات کی طرح یہ مقام بھی علم، حال اور عمل سے مرکب ہوتا ہے کیوں کہ اسلاف کے قول کے مطابق ایمان کے تمام باب، عقد، قول اور عمل کی طرف لوٹتے ہیں اور گویا قول کے ظہور کی وجہ سے اسے حال کی جگہ پر رکھا گیا کیوں کہ اس کے ذریعے باطن کا حال ظاہر ہوتا ہے ورنہ قول ذاتی طور پر مراد نہیں ہوتا اور اگر قول باطن کے مطابق صادر نہ ہو تو اسے اسلام کہا جاتا ہے لیکن ایمان نہیں کہتے۔ اور علم حال کا سبب ہے گویا حال علم کا ثمرہ ہے اور عمل حال کا ثمرہ ہوتا ہے اب ہم حال کی دونوں طرفوں یعنی علم اور عمل کے ساتھ حال کا ذکر کرتے ہیں۔

حال: اس سے ہماری مراد وہی ہے جسے زہد کہا جاتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ رغبت کو ایک چیز سے پھیر کر اس سے بہتر کی طرف متوجہ کیا جائے تو جو شخص ایک چیز سے رغبت کو پھیرتا ہے چاہے اس کا کوئی بدل لے، اسے بیچ دے یا کسی دوسرے طریقے سے ہو تو گویا وہ اس سے اس لیے منہ پھیرتا ہے کہ اس میں رغبت نہیں رکھتا اور اس کے غیر میں راغب ہے تو جس سے اس نے منہ پھیرا ہے اس کی نسبت سے اس کے حال کو زہد کہا جاتا ہے اور جس کی طرف متوجہ ہوا ہے اس کی نسبت سے یہ حالت رغبت اور محبت کہلاتی ہے۔

تو گویا زہد دو چیزوں کو چاہتا ہے ایک وہ جس سے رغبت کو پھیرا جائے اور دوسری وہ جس میں رغبت کی جائے اور یہ اس پہلی سے بہتر ہوتی ہے اور جس سے رغبت کو پھیرا ہے اس میں بھی کسی نہ کسی وجہ سے رغبت ہوتی ہے اس لیے جو شخص اس چیز سے رغبت کو پھیرتا ہے جو اسے ذاتی طور پر مطلوب نہیں ہے تو ایسے شخص کو زاہد نہیں کہا جاتا کیوں کہ پتھر اور مٹی وغیرہ کو چھوڑنے والا زاہد نہیں کہلا سکتا زاہد وہ ہوتا ہے جو درھم اور دینار کو چھوڑتا ہے کیوں کہ مٹی اور پتھر میں رغبت نہیں ہوتی۔

اور جس چیز میں رغبت رکھی جارہی ہے اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ مرغوب عنہ (جس سے رغبت کو پھیرا ہے) سے بہتر ہو تاکہ یہ رغبت غالب آجائے بیچنے والا اسی لیے بیچتا ہے کہ جو کچھ وہ خرید رہا ہے اس کے نزدیک وہ اس چیز سے بہتر ہے جس کو وہ بیچ رہا ہے تو مبیع (جو کچھ بیچ رہا ہے) کی نسبت سے اس کا حال زہد کہلاتا ہے اور جو کچھ وہ عوض میں لیتا ہے اس کی حالت رغبت اور محبت کہلاتی ہے۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ۔ (۱)

اور انہوں نے ان کو (حضرت یوسف علیہ السلام کو) ناقص قیمت کے ساتھ چند درھموں میں بیچ دیا اور وہ ان میں رغبت نہیں رکھتے تھے۔

"شروہ" کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے بیچ دیا کیوں کہ لفظ شراء بیچنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے وصف کو زہد سے تعبیر کیا کیوں کہ وہ اپنے والد کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرانے کی طمع رکھتے تھے اور یہ بات ان کے نزدیک حضرت یوسف علیہ السلام سے زیادہ محبوب تھی چنانچہ انہوں نے عوض کی طمع میں ان کو بیچ دیا۔

لہٰذا جو شخص دنیا کو آخرت کے بدلے بیچتا ہے وہ دنیا میں زاہد ہے اور جو آدمی دنیا کے بدلے آخرت کو بیچتا ہے وہ بھی زاہد ہے لیکن آخرت کا زاہد ہے (یعنی آخرت سے بے رغبت ہے)

لیکن عرف میں زاہد اسے ہی کہا جاتا ہے جو دنیا سے بے رغبت ہو جیسے الحاد کا نام باطل کی طرف میلان کے ساتھ خاص ہے اگرچہ لغوی طور پر الحاد محض میلان کا نام ہے۔

اور جب زہد، محبوب چیز سے رغبت کو پھیرنے کا نام ہے تو اس کا تصور اسی صورت میں ہوگا جب اس سے زیادہ محبوب چیز کی طرف توجہ کو پھیرا جائے ورنہ محض محبوب کو چھوڑنا محال ہے اور جو آدمی اللہ تعالیٰ کے سوا سب چیزوں سے محبت کو پھیر دیتا ہے حتیٰ کہ اسے جنت کی رغبت بھی نہ رہے اور صرف اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہو وہ زاہد مطلق ہے اور جو آدمی دنیا کی تمام چیزوں سے رغبت اٹھالے اور آخرت میں حاصل ہونے والی نعمتوں کے حوالے سے زہد اختیار نہ کرے بلکہ حوروں، محلات نہروں اور پھلوں وغیرہ کی طمع کرے وہ بھی زاہد ہے لیکن پہلے کے مقابلے میں اس کا درجہ کم ہے اور جو شخص دنیا کے بعض مفادات کو چھوڑ دیتا ہے بعض کو نہیں چھوڑتا جیسے ایک شخص مال میں رغبت نہیں رکھتا لیکن اقتدار میں رغبت رکھتا ہے حتیٰ کہ وہ کھانے پینے میں کشادگی کو ترک کر دیتا ہے لیکن زیب و زینت کو نہیں چھوڑتا تو اسے مطلقاً زاہد نہیں کہا جاتا اور زاہدین میں اس کا درجہ اس طرح ہے جیسے توبہ کرنے والوں میں وہ شخص جو بعض گناہوں سے توبہ کرتا ہے یہ بھی زہد صحیح ہے جیسے بعض گناہوں سے توبہ صحیح ہوتی ہے کیوں کہ توبہ ممنوع کاموں کو چھوڑنے کا نام ہے اور زہد مباح اور جائز چیزوں کے ترک کا نام ہے جن کو نفس چاہتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے اور یہ بات عقل سے بعید نہیں کہ آدمی بعض مباح چیزوں کو چھوڑنے پر قادر ہو اور بعض پر قادر نہ ہو جیسے ممنوعات میں یہ بات خلاف عقل نہیں ہے اور جو شخص صرف ممنوعات کو چھوڑتا ہے اسے زاہد نہیں کہا جا سکتا اگرچہ اس نے ممنوع چیزوں میں زہد اختیار کیا اور ان سے رخ پھیر لیا لیکن عرف و عادت میں زہد مباح چیزوں کو چھوڑنے کا نام ہے تو زہد دنیا سے رغبت ختم کر کے اس کو آخرت کی طرف پھیرنے کا نام ہے یا غیر خدا سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور یہ بلند درجہ ہے تو جس طرح مرغوب فیہ (جس میں رغبت ہے) میں شرط ہے کہ وہ اس آدمی کے نزدیک اچھی ہو اسی طرح مرغوب عنہ (جس سے رغبت ترک کی ہے) کا اس کے بس میں ہونا ضروری ہے کیوں کہ جو کام انسان کے بس میں نہ ہو اس کو

چھوڑنا محال ہے اور جب چھوڑتا ہے تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس کی رغبت زائل ہو گئی۔
یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن مبارک رحمہ اللہ سے کہا گیا اے زاہد! تو انہوں نے فرمایا زاہد تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ ہیں کیوں کہ ان کے پاس دنیا ذلیل ہو کر آئی تو انہوں نے اسے چھوڑ دیا میں نے کس بات میں زہد کیا؟

وہ علم جو اس حال کا نتیجہ ہے وہ اس بات کو جاننا ہے کہ جس چیز کو ترک کیا ہے وہ حاصل کی جانے والی چیز کی نسبت حقیر ہے جیسے تاجر اس بات کو جانتا ہے کہ عوض، مبیع (جو چیز بیچی گئی) اسے بہتر ہے اس لیے وہ اس میں رغبت رکھتا ہے۔ اور جب تک یہ علم متحقق نہ ہو مبیع سے رغبت کا زوال متصور نہیں ہو سکتا اسی طرح جس شخص کو اس بات کا عرفان حاصل ہو جائے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی ہے اور آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے یعنی اس کی لذتیں ذاتی طور پر بہتر اور باقی رہنے والی ہیں جس طرح برف کے مقابلے میں جواہر بہتر اور باقی رہنے والے ہیں اور برف کے مالک پر برف کو جواہر اور موتیوں کے بدلے میں بیچنا مشکل نہیں ہوتا۔ دنیا اور آخرت کی یہی مثال ہے دنیا اس برف کی طرح ہے جو دھوپ میں رکھی ہوئی ہو وہ ختم ہونے تک پگھلتی رہتی ہے اور آخرت جوہر کی طرح ہے جو فنا نہیں ہوتا پس دنیا اور آخرت کے درمیان تفاوت کے بارے میں جس قدر یقین اور معرفت مضبوط ہوگی اس کا سودا کرنے اور معاملہ کرنے میں اسی قدر رغبت مضبوط ہوگی حتیٰ کہ جس شخص کا یقین مضبوط ہوتا ہے وہ اپنے نفس اور مال کو بیچ دیتا ہے جیسے ارشاد خداوندی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ - (۱)

بے شک اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور مال خرید لئے کہ ان کا بدلہ جنت ہوگی۔

پھر بتایا کہ ان کو اس سودے میں نفع ہوا ارشاد خداوندی ہے۔

فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِىْ بَايَعْتُمْ بِهٖ - (۲)

پس تم اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ جو سودا تم نے کیا

زہد کے سلسلے میں صرف اتنا علم کافی ہے یعنی آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے اور بعض اوقات وہ شخص بھی اس بات کو جانتا ہے جو علم اور یقین کی کمزوری کی وجہ سے ترکِ دنیا پر قادر نہیں ہوتا یا اس وقت اس پر خواہش کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ شیطان کے ہاتھوں مغلوب ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شیطان کے وعدوں سے دھوکے میں ہوتا ہے یہاں تک کہ اسے مدت اٹھا لیتی ہے اور اب سوائے کفِ افسوس ملنے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔
اس آیت میں دنیا کے خسیس ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ربانی ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ توبہ آیت ۱۱۱

(۲) قرآن مجید، سورۂ توبہ آیت ۱۱۱

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ۔ (۱) آپ فرما دیجئے دنیا کا سامان قلیل ہے۔

اور آخرت کے نفیس ہونے کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ۔ (۲) اور ان لوگوں نے کہا جن کو علم دیا گیا تمہارے لیے ہلاکت ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا ثواب بہتر ہے۔

تو اس بات سے آگاہ کیا کہ جوہر کی نفاست کا علم ہی اس کے عوض کی رغبت سے پھیرتا ہے۔

اور جب زہد کا تصور اس بات کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ محبوب چیز کی رغبت چھوڑ کر زیادہ محبوب چیز کی طرف متوجہ ہو۔ تو ایک شخص نے اپنی دعا میں کہا یا اللہ مجھے دنیا اسی طرح دکھا جس طرح تو اسے دیکھتا ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا تَقُلْ ھٰکَذَا وَلٰکِنْ قُلْ اَرِنِیْ کَمَا اَرَیْتَھَا الصَّالِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکَ۔ (۳) تم یوں نہ کہو بلکہ یوں کہو (اے اللہ) مجھے (دنیا) اس طرح دکھا جیسے تو نے اپنے نیک بندوں کو دکھائی ہے

کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو اسے حقیر جانتا ہے جیسے وہ حقیر ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے جلال کی نسبت سے ہر مخلوق حقیر ہے اور بندہ اسے اس چیز کی نسبت سے حقیر جانتا ہے جو اس کے لیے بہتر ہے اور جو شخص گھوڑا بیچتا ہے اگرچہ وہ اس وقت اس میں رغبت نہیں رکھتا لیکن وہ اسے زمین کے کیڑے مکوڑوں کی طرح نہیں دیکھتا کیوں کہ کیڑوں سے تو وہ مکمل طور پر بے نیاز ہے لیکن گھوڑے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور اللہ تعالیٰ ذاتی طور پر ہر چیز سے بے نیاز ہے اس لیے وہ اپنی ذات کے اعتبار سے تمام اشیاء کو ایک درجہ میں دیکھتا ہے کہ اس کے جلال کے سامنے سب ایک جیسے ہیں لیکن ایک دوسرے کے حوالے سے ان میں فرق ہے اور زاہد وہی ہے جو اپنی ذات کے حوالے سے فرق دیکھتا ہے دوسروں کی نسبت سے نہیں۔

زاہد کا عمل یہی ترک ہے کیوں کہ یہ بیع، معاملہ اور ادنیٰ کے بدلے میں بہتر لیتا ہے تو جس طرح بیع کی صورت میں عمل یہی ہوتا ہے کہ مبیع کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اسے اپنے قبضے سے نکال کر اس کا عوض لیا جاتا ہے اسی طرح زہد کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز میں زہد اختیار کیا ہے اسے مکمل طور پر چھوڑ دے اور وہ دنیا ہے جس کے ساتھ اس کے اسباب، مقدمات اور تمام لوازم و متعلقات ہیں پس دل سے اس کی محبت نکل جاتی ہے اور عبادات کی محبت داخل ہو جاتی ہے اور جس چیز کو وہ دل سے نکالتا ہے وہ آنکھوں اور ہاتھوں سے بھی نکل جاتی ہے اور اب ہاتھ، آنکھیں اور تمام اعضاء ایک ہی

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ النساء آیت ۷۷

(۲) قرآن مجید، سورۃ قصص آیت ۸۰

(۳) الفردوس بماثور الخطاب جلد اول ص ۴۶۹ حدیث ۱۹۱۰

وظیفے یعنی عبادات میں مشغول ہوجاتے ہیں ورنہ صرف دنیا کو چھوڑنا اسی طرح ہوگا۔ جیسے کوئی شخص مبیع دے دے لیکن اس کی قیمت وصول نہ کرے جب وہ لینے اور دینے کے سلسلے میں دونوں طرف کی شرط پوری کر لیتا ہے تو اب اس کو اپنے سودے پر راضی ہونا چاہیے کیوں کہ جو شخص اس طرح سودا کرتا ہے وہ عہد کو پورا کرتا ہے۔

پس جو شخص موجود چیز کا غائب کے عوض سودا کرتا ہے اور وہ چیز دوسرے شخص کے حوالے بھی کر دیتا ہے (اسے بیع سلم کہتے ہیں) تو وہ غائب کی طلب شروع کر دیتا ہے پس اگر سودا کرنے والا ایسا شخص ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ وہ سچا بھی ہے، قادر بھی اور وعدہ پورا کرنے والا بھی تو جوں ہی اس شخص کی کوشش پوری ہوگی غائب چیز اس کے حوالے کر دے گا اور جب تک دنیا کو اپنے پاس روکے رکھے اس کا زہد بالکل درست نہ ہوگا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت بنیامین علیہ السلام کے حق میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو زاہدین نہیں فرمایا اگرچہ وہ کہتے تھے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی (حضرت بنیامین) ہمارے والد کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں اور انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح ان کو بھی دور کرنے کی کوشش کی لیکن ان میں سے ایک کی سفارش پر ان کو چھوڑ دیا اسی طرح جب انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو نکالنے کا ارادہ کیا تو اس وقت بھی ان کو زاہدین نہیں فرمایا بلکہ اس وقت فرمایا جب انہوں نے آپ کو فروخت کیا اور ان لوگوں کے حوالے کر دیا۔

تو رغبت کی علامت روکنا اور زہد کی علامت نکال باہر کرنا ہے اگر تم دنیا کی بعض چیزیں اپنے قبضے سے نکالو اور بعض نہ نکالو تو جو کچھ تم نے نکالا ہے صرف اسی میں زاہد ہو گے مطلق زاہد نہیں ہو گے اور اگر تمہارے پاس مال نہ ہو اور دنیا تمہاری مددگار نہ ہو تو تم سے زہد کا تصور نہیں ہوگا کیوں کہ جو شخص کسی چیز پر قادر نہ ہو وہ اس کے ترک پر بھی قادر نہیں ہوتا بعض اوقات شیطان تمہیں دھوکے میں مبتلا کر دیتا ہے اور تمہارے دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ اگرچہ دنیا تمہارے پاس نہیں آئی لیکن تم زاہد ہو تو شیطان کے دھوکے میں نہ آؤ جب تک تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیے گئے وعدے پر قوی اعتماد اور یقین نہ ہو جب تک تم طاقت کے حال کو نہیں آزماؤ گے اس وقت تک دنیا کو چھوڑنے پر قدرت کا یقین کیسے رکھو گے کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو گناہ پر قادر نہ ہونے کی صورت میں خیال کرتے ہیں کہ ان کو گناہ ناپسند ہیں اور جب کسی رکاوٹ اور مخلوق کے خوف کے بغیر گناہ ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے تو اس کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

تو جب یہ بات گناہوں کے سلسلے میں شیطانی دھوکہ ہے تو مباح امور میں کیا حال ہوگا اور نفس کا پکا وعدہ اس طرح ہے کہ تم طاقت کی حالت میں بار بار اس کا تجربہ کرتے رہو جب وہ اس وعدے کو ہمیشہ پورا کرے حالانکہ کوئی ظاہری اور باطنی عذر بھی نہ ہو تو اب اس پر یقین اور اعتماد کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن اس کے بدلنے کا خوف اب بھی باقی رہنا چاہیے کیوں کہ وہ بہت جلد وعدے کو توڑ دیتا اور طبعی تقاضوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ نفس سے امن اسی وقت ہے جب وہ کسی چیز کو ترک کر دے اور اس سلسلے میں بھی متروکہ چیز کے

حوالے سے ہی امن ہوگا اور یہ اس وقت ہے جب وہ اس کام کو کرنے کی طاقت رکھتا ہو۔

حضرت ابی لیلیٰ نے حضرت ابن شبرمہ (رحمہما اللہ) سے فرمایا کیا تم کپڑا بننے والے کے اس بیٹے (حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ) کو دیکھتے ہو کہ ہم جس مسئلہ میں فتویٰ دیتے ہیں یہ اسے رد کر دیتا ہے حضرت ابن شبرمہ نے فرمایا میں نہیں جانتا کہ وہ کپڑا بننے والے کا بیٹا ہے یا کیا ہیں لیکن اتنی بات جانتا ہوں کہ دنیا اس کے پاس آئی لیکن وہ اس سے بھاگ گیا اور دنیا ہم سے بھاگی اور ہم نے اس کو طلب کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مقدسہ میں سب لوگ اسی طرح کہتے تھے کہ ہم اپنے رب سے محبت کرتے ہیں اور اگر ہمیں معلوم ہو کہ کس عمل سے اس کی محبت حاصل ہوتی ہے تو ہم وہ عمل کریں گے حتیٰ کہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ (۱)

اور اگر ہم ان پر لکھ دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے تھوڑے لوگ ایسا کرتے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا "تم بھی ان میں سے ہو"۔ (۲) یعنی تھوڑے لوگوں میں سے ہو۔

وہ فرماتے ہیں مجھے معلوم نہ تھا کہ ہم میں سے کچھ لوگ دنیا سے محبت بھی کرتے ہیں حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی (۳)

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (۴)

تم میں سے بعض دنیا چاہتے ہیں اور تم میں سے کچھ آخرت کا ارادہ کرتے ہیں۔

یہ بات بھی جان لو کہ زہد کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی سخاوت اور جوانمردی کے طور پر مال خرچ کرنا بھی چھوڑ دے یا لوگوں کے دلوں کو مائل کرنے یا کسی (اچھی بات کی) طمع کی بنیاد پر دینے سے بھی باز رہے کیوں کہ یہ سب اچھی عادات ہیں زہد تو یہ ہے کہ تم دنیا کو اس لیے ترک کرو کہ تم جانتے ہو کہ آخرت کی نفاست کے مقابلے میں یہ حقیر ہے اور دنیا کو ہر اعتبار سے وہی ترک کرتا ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا لیکن اس وجہ سے یہ مروت، جوانمردی، سخاوت اور حسن خلق تو کہلاتا ہے لیکن اسے زہد نہیں کہہ سکتے کیوں کہ اچھا نام اور دلوں کا میلان تو فوری ملنے والے دنیوی فوائد ہیں اور یہ مال کے مقابلے میں زیادہ لذیذ اور زیادہ خوشگوار ہوتے ہیں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ نساء آیت ۶۶

(۲) الدر المنثور جلد ۲ ص ۱۸۲ تحت آیت "ولو ان کتبنا علیہم"

(۳) الدر المنثور جلد ۲ ص ۸۶ تحت آیت منکم من یرید الدنیا۔

(۴) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۱۵۲

اور جس طرح مال بیع سلم کے طور پر عوض کی طمع میں دینا زہد نہیں کہلاتا اسی طرح مال اس لیے خرچ کرنا کہ میرا ذکر ہو میری تعریف ہو، جوانمردی اور سخاوت کے ساتھ مشہوری ہو نیز اس لیے خرچ کرنا کہ مال کی حفاظت بہت مشکل ہے اور اس میں مشقت اور تھکاوٹ برداشت کرنا پڑتی ہے اور بادشاہوں اور مالداروں کے سامنے ذلت و رسوائی اٹھانا پڑتی ہے اس لیے مال جمع نہ کیا جائے بلکہ اس سے قطع تعلق کیا جائے یہ بالکل زہد نہیں ہے بلکہ اپنے نفس کے لیے ایک دوسرا فائدہ حاصل کرنا ہے اور زاہد وہ ہوتا ہے جس کے پاس دنیا ذلیل و رسوا ہو کر آئے اس میں کسی قسم کی مشقت وغیرہ نہ ہو وہ اس سے لطف اندوز بھی ہو سکتا ہو نہ تو اس کی عزت و جاہ میں کوئی نقصان ہوتا ہے اور نہ نفسانی لذات فوت ہوتی ہوں تو اب اس خوف سے مال کو چھوڑ دے کہ کہیں اس سے اُنس پیدا نہ ہو جائے اس طرح اللہ تعالیٰ کے غیر سے اُنس ہو جائے گا اور ماسوی اللہ کی محبت پیدا ہو گی اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں اس کا غیر شریک ہو جائے گا یا وہ آخرت کے ثواب کی طمع کرتے ہوئے مال سے قطع تعلق کرتا ہے۔ تو یہ دنیوی مشروبات سے نفع اندوزی کو جنت کے مشروبات سے نفع اندوزی کی طمع میں چھوڑتا ہے جنتی حوروں کی طمع میں لونڈیوں اور عورتوں سے نفع حاصل کرنے کو ترک کرتا ہے جنت کے باغات اور درختوں کی طمع میں دنیوی باغوں سے لطف اندوزی کو چھوڑتا ہے جنت کی زینت کی لالچ میں دنیوی زینت سے بننے سنورنے کو ترک کرتا ہے اور جنتی میووں کی طمع میں لذیذ کھانوں کو چھوڑتا ہے نیز اس بات کا خوف ہے کہ کہیں یہ نہ کہا جائے۔

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا(۱) تم اپنے مزے اپنی دنیوی زندگی میں لے گئے۔

تو ان تمام باتوں میں دنیا میں کسی فکر و پریشانی کے بغیر حاصل ہونے والی دولت پر ان نعمتوں کو ترجیح دیتا ہے جن کا اس سے جنت میں ملنے کا وعدہ کیا گیا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ آخرت میں ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والا ہے اس کے علاوہ جو صورتیں ہیں وہ سب دنیوی معاملات ہیں آخرت میں ان کا کوئی فائدہ نہیں۔

فصل ۲:

زہد کی فضیلت

آیات کریمہ:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ

(ایک دن قارون) اپنی قوم کے سامنے زیب و زینت کے ساتھ آیا تو جو لوگ دنیوی زندگی چاہتے تھے کہنے

(۱) قرآن مجید، سورۂ احقاف آیت ۲۰

مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ٥ وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ۔ (۱)

لگے کاش ہمیں بھی اس کی مثل دیا جاتا جو قارون کو دیا گیا وہ تو بہت بڑے حصے والا ہے اور جن لوگوں کو علم دیا گیا انہوں نے کہا تمہارے لیے ہلاکت ہو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا ثواب اس شخص کے لیے بہتر ہے جو ایمان لایا اور اس نے اچھے کام کئے اور یہ تو صرف صبر کرنے والوں کو ملتا ہے۔

تو زہد کو علماء کی طرف منسوب کیا اور زاہدین کو علم سے موصوف قرار دیا اور یہ انتہائی درجہ کی تعریف ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا۔ (۲)

ان لوگوں کو ان کا اجر دو مرتبہ دیا جائے گا کیوں کہ انہوں نے صبر کیا۔

اور یہ آیت دنیا میں زہد کی تفسیر کے بارے میں آئی ہے۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَی الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (۳)

بے شک ہم نے ان تمام چیزوں کو جو زمین پر ہیں زمین کی زینت بنایا تاکہ ہم ان کو آزمائیں کہ ان میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے۔

کہا گیا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ان میں سے کون زیادہ زہد اختیار کرتا ہے تو زہد کو اچھے اعمال میں سے قرار دیا۔

نیز ارشاد خداوندی ہے:

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ وَمَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ۔ (۴)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا ارادہ کرے ہم اس کی کھیتی میں اضافہ کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے ہم اسے اس میں سے دیں گے اور اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ قصص، آیت ۷۹، ۸۰

(۲) قرآن مجید، سورۂ قصص، آیت ۵۴

(۳) قرآن مجید، سورۂ کہف آیت ۷

(۴) قرآن مجید، سورۂ شوریٰ آیت ۲۰

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ۔ (۱)

اور آپ اُن چیزوں کی طرف نظر نہ دوڑائیں جو ہم نے مختلف لوگوں کو دنیوی زندگی کی رونق کے سامان کے طور پر دی ہیں تاکہ ہم ان کو اس میں آزمائیں اور آپ کے رب کا رزق بہتر اور خوب باقی رہنے والا ہے۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

اَلَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ۔ (۲)

وہ لوگ جو دنیوی زندگی کو آخرت کے مقابلے میں پسند کرتے ہیں۔

تو یہ کافروں کا وصف بیان کیا پس اس کا مفہوم یہ ہے کہ مومن اس کی نقیض کے ساتھ موصوف ہوتا ہے اور وہ دنیوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کو پسند کرتا ہے

احادیث مبارکہ:

دنیا کی مذمت میں بے شمار احادیث آئی ہیں جن میں سے کچھ ہم نے مہلکات کے ضمن میں دنیا کی مذمت کے بیان میں ذکر کی ہیں۔ کیوں کہ دنیا کی محبت مہلکات میں سے ہے۔

اب ہم صرف دنیا سے بُغض کی فضیلت ذکر کریں گے کیوں کہ اس کا تعلق نجات دینے والے امور سے ہے۔ اور یہی زہد ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مَنْ أَصْبَحَ وَهَمُّهُ الدُّنْيَا شَتَّتَ اللّٰهُ عَلَيْهِ أَمْرَهُ وَفَرَّقَ عَلَيْهِ ضَيْعَتَهُ وَجَعَلَ فَقْرَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَلَمْ يَأْتِهِ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا مَا كُتِبَ لَهُ وَمَنْ أَصْبَحَ وَهَمُّهُ الْآخِرَةُ جَمَعَ اللّٰهُ لَهُ هَمَّهُ وَحَفِظَ عَلَيْهِ ضَيْعَتَهُ وَجَعَلَ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ وَأَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ۔ (۳)

جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ اسے دنیا کی فکر ہو اللہ تعالیٰ اس کے کاموں کو بکھیر دیتا ہے اور اس کا سامان متفرق ہو جاتا ہے اس کا فقر اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے اور دنیا تو اسی قدر آئے گی جو اس کے لیے لکھ دی گئی ہے اور جو اس حال میں صبح کرے کہ اس کو آخرت کی فکر ہو اللہ تعالیٰ اس کی ہمت و فکر کو جمع کر دیتا ہے اس کے سامان کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے دل میں مالداری پیدا کر دیتا ہے نیز اس کے پاس دنیا ذلیل ہو کر آتی ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ طٰہٰ آیت ۱۳۱ (۲) قرآن مجید سورۂ ابراہیم آیت ۳

(۳) سنن ابن ماجہ ص ۳۱۲، ابواب الزھد

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

إِذَا رَأَيْتُمُ الْعَبْدَ وَقَدْ أُعْطِيَ صَمْتًا وَزُهْدًا فِي الدُّنْيَا فَاقْتَرِبُوا مِنْهُ فَإِنَّهُ يُلَقَّى الْحِكْمَةَ۔ (۱)

جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ اسے خاموشی اور دنیا سے بے رغبتی دی گئی ہے تو اس کے قریب ہو جاؤ کیوں کہ اس کے دل میں حکمت ڈالی جاتی ہے۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا۔ (۲)

اور جس شخص کو حکمت دی گئی اسے بہت زیادہ بھلائی دی گئی۔

اسی لیے کہا گیا ہے کہ جو شخص چالیس دن دنیا سے بے رغبتی (زُہد) اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت کے چشمے جاری کر دیتا ہے اور اس کی زبان پر بھی حکمت بھری گفتگو جاری فرماتا ہے۔

ایک صحابی کے بارے میں مروی ہے انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! لوگوں میں سے کون شخص بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا۔

كُلُّ مُؤْمِنٍ مَخْمُومِ الْقَلْبِ صَدُوْقِ اللِّسَانِ۔ ہر وہ مومن جس کا دل صاف اور زبان سچی ہو۔

ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! "مخموم القلب" (صاف دل) کون ہوتا ہے؟

آپ نے فرمایا۔

اَلتَّقِيُّ النَّقِيُّ الَّذِي لَا غِلَّ فِيهِ وَلَا غِشَّ وَلَا بَغْيَ وَلَا حَسَدَ۔

وہ متقی پرہیزگار جس کے دل میں خیانت کھوٹ، بغض اور حسد نہ ہو۔

ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کے بعد کون بہتر ہے آپ نے فرمایا۔

اَلَّذِي يَشْنَأُ الدُّنْيَا وَيُحِبُّ الْآخِرَةَ۔ (۳) وہ شخص جو دنیا کو برا جانے اور آخرت سے محبت کرے

اس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں میں سے بُرے لوگ وہ ہیں جو دنیا سے محبت رکھتے ہیں۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

إِنْ أَرَدْتَ أَنْ يُحِبَّكَ اللّٰهُ فَازْهَدْ فِي الدُّنْيَا۔ (۴)

اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے تو دنیا میں زُہد اختیار کرو۔ (یعنی دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ)

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۳۱۱، ابواب الزھد

(۲) قرآن مجید، سورۂ بقرہ آیت ۲۶۹

(۳) سنن ابن ماجہ ص ۳۲۱، ابواب الزھد

(۴) سنن ابن ماجہ ص ۳۱۱ ابواب الزھد

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے بے رغبتی کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا سبب قرار دیا پس جس شخص سے اللہ تعالیٰ محبت کرے وہ اعلیٰ درجات والا ہے لہذا دنیا سے بے رغبتی سب سے افضل مقام ہونا چاہیے اور اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھ آتی ہے کہ دنیا سے محبت کرنے والا اللہ تعالیٰ سے بغض و عداوت کی طرف جاتا ہے۔

ایک حدیث میں جو اہل بیت سے مروی ہے یوں ارشاد فرمایا گیا۔

"اَلزُّهْدُ وَالْوَرَعُ يَجُوْلَانِ فِي الْقُلُوْبِ كُلَّ لَيْلَةٍ فَإِنْ صَادَفَا قَلْبًا فِيْهِ الْإِيْمَانُ وَالْحَيَاءُ أَقَامَا فِيْهِ وَإِلَّا ارْتَحَلَا۔" (۱)

زہد اور ورع (تقویٰ) ہر رات دلوں میں چکر لگاتے ہیں اگر وہ ایسے دل سے متفق ہو جائیں جس میں ایمان اور حیاء ہو تو وہاں ٹھہر جاتے ہیں ورنہ کوچ کر جاتے ہیں۔

حضرت حارثہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں سچا مومن ہوں تو آپ نے پوچھا "تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے" انہوں نے عرض کیا میں نے اپنے دل کو دنیا سے الگ کر دیا ہے پس میرے نزدیک دنیا کے پتھر اور سونا برابر ہیں گویا میں جنت اور دوزخ میں ہوں اور گویا میں اپنے رب کے عرش کے پاس ہوں آپ نے فرمایا تم نے پہچان لیا پس اسے اختیار کئے رکھنا (پھر فرمایا) یہ ایک بندہ ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے نور ایمان سے منور کر دیا۔

تو دیکھو کس طرح انہوں نے حقیقتِ ایمان کے اظہار کا آغاز دنیا سے علیحدگی کے ساتھ کیا اور اسے یقین کے ساتھ ملایا اور کس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی پاکیزگی بیان کرتے ہوئے فرمایا ایک بندہ ہے جس کے دل کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ منور کیا۔ (۲)

اور جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کی تفسیر پوچھی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔ (۳)

اللہ تعالیٰ جس شخص کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔

تو آپ نے فرمایا۔

اِنَّ النُّوْرَ اِذَا دَخَلَ فِي الْقَلْبِ اِنْشَرَحَ لَهُ الصَّدْرُ وَانْفَسَحَ۔

بے شک نور جب دل میں داخل ہوتا ہے تو اس کے لیے سینہ کھل جاتا ہے اور کشادہ ہو جاتا ہے۔

---

(۱)

(۲) مصنف ابن ابی شیبہ جلد ۱۱ ص ۴۳ حدیث ۱۰۴۷۴

(۳) قرآن مجید، سورۂ انعام آیت ۱۲۵

عرض کیا گیا یا رسول اللہ! کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ آپ نے فرمایا۔

نَعَمْ اَلتَّجَافِیْ عَنْ دَارِ الْغُرُوْرِ وَالْاِنَابَۃُ اِلٰی دَارِ الْخُلُوْدِ وَالْاِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُوْلِہٖ۔ (۱)

ہاں، دھوکے والے گھر (دنیا) سے دور رہنا اور ہمیشہ کے گھر کی طرف رجوع کرنا نیز موت کے آنے سے پہلے اس کے لیے تیاری کرنا۔

تو دیکھئے کس طرح زہد کو اسلام کی شرط قرار دیا اور زہد دھوکے والے گھر سے علیحدگی کا نام ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِسْتَحْیُوْا مِنَ اللّٰہِ حَقَّ الْحَیَاءِ۔

اللہ تعالیٰ سے حیا کرو جیسے اس کا حق ہے۔

انہوں نے عرض کیا بے شک ہم اللہ تعالیٰ سے حیا کرتے ہیں آپ نے فرمایا۔

لَیْسَ کَذٰلِکَ تَبْنُوْنَ مَا لَا تَسْکُنُوْنَ وَتَجْمَعُوْنَ مَا لَا تَاْکُلُوْنَ۔ (۲)

بات یہ نہیں بلکہ تم مکانات بناتے ہو جن میں رہائش اختیار نہیں کرتے اور جمع کرتے ہو لیکن کھاتے نہیں۔

تو آپ نے بتایا کہ یہ کام (یعنی دنیا سے محبت اور اسے جمع کرنا) اللہ تعالیٰ سے حیا کے خلاف ہے۔

ایک وفد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ کہنے لگے بے شک ہم مومن ہیں آپ نے پوچھا تمہارے ایمان کی علامت کیا ہے؟

انہوں نے آزمائش کے وقت صبر، خوشی کے وقت شکر اور قضا کے مقامات پر رضا کا ذکر کیا نیز جب دشمن پر مصیبت آئے تو خوش نہ ہونا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اگر تم واقعی اسی طرح ہو تو جو کچھ نہیں کھاتے اسے جمع نہ کرو جن مکانات میں رہائش نہیں رکھتے ان کی تعمیر نہ کرو اور جس چیز کو چھوڑنا ہے اس میں رغبت نہ کرو۔ (۳)

تو آپ نے زہد کو ایمان کی تکمیل قرار دیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

مَنْ جَاءَ بِلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ لَا یَخْلِطُ بِھَا غَیْرَھَا وَجَبَتْ لَہُ الْجَنَّۃُ۔

جو شخص کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ پڑھے اور اس میں کچھ اور نہ ملائے اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔

---

(۱) المستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۳۱۱ کتاب الرقاق

(۲) الترغیب والترہیب جلد ۴ ص ۳۴۱ کتاب التوبۃ

(۳)

حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں (کلمہ میں) دوسری چیز ملانے کا کیا مطلب ہے ہمارے لیے اس کی وضاحت فرمائیں آپ نے فرمایا۔

(کلمہ میں ملاوٹ) دنیا کو طلب کرنا اور اس کی اتباع کے لیے اسے دوست رکھنا ہے اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو رسولوں کی باتوں جیسی باتیں کرتے ہیں لیکن عمل میں ظالموں کی طرح ہوتے ہیں پس جو شخص اس طرح کلمہ پڑھے کہ اس میں اس (ظالموں کے عمل) میں سے کچھ نہ ہو تو اس کے لیے جنت واجب ہو گئی۔ (۱)

ایک حدیث شریف میں ہے۔

اَلسَّخَاءُ مِنَ الْیَقِیْنِ وَلَا یَدْخُلُ النَّارَ مُوْقِنٌ وَالْبُخْلُ مِنَ الشَّكِّ وَلَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ شَكَّ۔ (۲)

سخاوت یقین میں سے ہے اور کوئی یقین والا دوزخ میں نہیں جائے گا اور بخل شک میں سے ہے اور شک کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

اور آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔

سخی، اللہ تعالیٰ کے بھی قریب ہوتا ہے، انسانوں کے بھی اور جنت کے بھی قریب ہوتا ہے (۳) اور بخیل (کنجوس) اللہ تعالیٰ اور بندوں سے دُور ہوتا ہے جب کہ جہنم کے قریب ہوتا ہے۔

بخل دنیا سے رغبت کا نتیجہ ہے جب کہ سخاوت زُہد کا ثمرہ ہے اور کسی چیز کے نتیجے پر تعریف یقیناً اس عمل پر تعریف ہوتی ہے جس کا یہ ثمرہ اور نتیجہ ہے۔

حضرت ابن مسیب، حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہما) سے اور وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا۔

مَنْ زَهِدَ فِی الدُّنْیَا اَدْخَلَ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ قَلْبَهٗ فَاَنْطَقَ بِهَا لِسَانَهٗ وَعَرَّفَهٗ دَاءَ الدُّنْیَا وَدَوَاءَهَا وَاَخْرَجَهٗ مِنْهَا سَالِمًا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ۔ (۴)

جو شخص دنیا میں زُہد اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت داخل کرتا اور زبان پر اسے جاری کرتا ہے نیز اسے دنیا کی بیماری اور علاج کی پہچان کرا دیتا ہے اور اسے دنیا سے صحیح سالم، سلامتی کے گھر کی طرف نکالتا ہے۔

ایک روایت میں ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ ایسی اونٹنیوں کے پاس سے

---

(۱) نوادر الاصول ص ۲۴۶، الاصل الثانی عشر والمائتان

(۲) الفردوس بماثور الخطاب جلد ۲ ص ۳۴۱ حدیث ۳۵۴۵

(۳) جامع ترمذی ص ۲۹۰، ابواب الصلۃ

(۴) الکامل لابن عدی جلد ۵ ص ۱۹۴۵ من اسمہ عبدالملک بن مہران

گزرے جو دس ماہ سے حاملہ تھیں اور ان کے تھنوں میں بہت دودھ تھا اور وہ ان کے پسندیدہ ترین اور نہایت نفیس مالوں میں سے تھیں کیوں کہ وہ (ان کے لیے بار برداری (زیر سواری) گوشت، دودھ اور اُون کے لیے مفید تھیں۔ اور ان کے دلوں میں ان کی عظمت تھی۔ ارشاد خداوندی ہے۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ (۱) — جب دس ماہ کی حاملہ اونٹنیاں چھوٹی پھریں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اونٹنیوں سے منہ پھیرا اور آنکھیں بند کر دیں عرض کیا گیا یا رسول اللہ! یہ تو ہمارے عمدہ مالوں میں سے ہیں آپ ان کی طرف کیوں نہیں دیکھتے آپ نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے منع کیا ہے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی (۲)

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ۔ (۳)

آپ ان چیزوں کی طرف نظر نہ دوڑائیں جو ہم نے مختلف لوگوں کو دنیوی زندگی کی رونق کے سامان کے طور پر دی ہیں تاکہ ہم ان کو آزمائیں۔

حضرت مسروق، حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت کرتے ہیں ام المومنین فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ اللہ تعالیٰ سے کھانا نہیں مانگتے کہ وہ آپ کو عطا کرے؟ آپ فرماتی ہیں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھوک کو دیکھ کر رو پڑی تھی۔ آپ نے فرمایا۔

يَا عَائِشَةُ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ سَأَلْتُ رَبِّيْ اَنْ يُّجْرِيَ مَعِيَ جِبَالَ الدُّنْيَا ذَهَبًا لَاَجْرَاهَا حَيْثُ شِئْتُ مِنَ الْاَرْضِ وَلٰكِنِّيْ اخْتَرْتُ جُوْعَ الدُّنْيَا عَلٰى شِبَعِهَا وَفَقْرَ الدُّنْيَا عَلٰى غِنَاهَا وَحُزْنَ الدُّنْيَا عَلٰى فَرَحِهَا يَا عَائِشَةُ اِنَّ الدُّنْيَا لَا تَنْبَغِيْ لِمُحَمَّدٍ وَلَا لِاٰلِ مُحَمَّدٍ يَا عَائِشَةُ اِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَرْضَ لِاُولِي الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ اِلَّا الصَّبْرَ عَلٰى مَكْرُوْهِ الدُّنْيَا وَالصَّبْرَ

اے عائشہ! اس ذات کی قسم! جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اگر میں اللہ تعالیٰ سے سوال کروں کہ وہ پہاڑوں کو سونے کا بنا کر میرے ساتھ چلائے تو میں زمین میں جہاں جاؤں میرے ساتھ چلا دے لیکن میں نے دنیا کی بھوک کو اس کے سیر ہونے پر دنیا کے فقر کو اس کی مالداری پر اور اس کے غم کو اس کی خوشی پر ترجیح دی ہے اے عائشہ! دنیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل کے لیے مناسب نہیں اے عائشہ! اللہ تعالیٰ اولوا العزم

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ التکویر آیت ۴

(۲) الدر المنثور جلد ۶ ص ۳۱۸ تحت آیت واذا العشار عطلت / الدر المنثور جلد ۴ ص ۳۱۳ تحت آیت ولا تمدن عینیک

(۳) قرآن مجید، سورۃ طٰہٰ آیت ۱۳۱

عَنْ مَجْبُوبِهَا ثُمَّ لَمْ يَرْضَ لِي إِلَّا أَنْ يُكَلِّفَنِي مَا كَلَّفَهُمْ فَقَالَ (فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ) وَاللّٰهِ مَالِي بُدٌّ مِنْ طَاعَتِهِ وَإِنِّي وَاللّٰهِ لَأَصْبِرَنَّ كَمَا صَبَرُوا بِجُهْدِي وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ»۔ (۱)

پیغمبروں سے صرف دنیا کی تکلیفوں پر صبر کو پسند کرتا ہے نیز دنیا کی پسندیدہ چیزوں سے بھی صبر کریں پھر میرے لیے یہی پسند کیا کہ جن باتوں کا ان (رسل عظام) کو مکلف بنایا اسی کا مجھے بھی مکلف بنایا۔

پس ارشاد فرمایا۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (۲)

پس آپ صبر کیجیے جیسے اولوالعزم رسولوں نے صبر کیا۔

اللہ کی قسم میرے لیے اس کی فرمانبرداری کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں اور اللہ کی قسم! بے شک میں حتی المقدور ضرور صبر کروں گا جیسے انہوں نے صبر کیا اور قوت تو اللہ تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے۔

ایک روایت میں ہے جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پر فتوحات کا دروازہ کھلا تو آپ کی صاحبزادی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا جب دور دراز سے آپ کے پاس وفود آتے ہیں اس وقت آپ باریک (عمدہ) لباس پہنا کریں اور کچھ کھانے کا حکم دیا کریں جس سے آپ بھی تناول فرمائیں اور وہ لوگ بھی کھائیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے حفصہ! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ مرد کا حال اس کی بیوی سب سے زیادہ جانتی ہے انہوں نے عرض کیا جی ہاں! فرمایا میں تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تمہیں معلوم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اتنے سال نبوت کے منصب پر فائز رہے اور آپ نے اور آپ کے گھر والوں نے اگر صبح کو سیر ہو کر کھایا تو رات کو بھوکے رہے اور رات کو سیر ہوئے تو دن بھوک سے گزارا۔ اور میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتی ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنے سال منصب نبوت پر گزارتے ہوئے آپ اور آپ کے گھر والے صرف کھجور پر گزارہ کرتے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے خیبر فتح فرمایا اور میں تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتی ہو کہ ایک روز تم لوگوں نے آپ کے سامنے اونچے دستر خوان پر کھانا رکھا تو آپ کو یہ بات ناگوار گزری حتی کہ چہرۂ انور کا رنگ بدل گیا پھر اس دستر خوان کو اٹھانے کا حکم دیا اور کھانا اس سے کچھ نیچے دستر خوان پر رکھا یا زمین پر رکھ دیا اور میں تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتی ہو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک کمبل کو دو تہہ کر کے اس پر آرام فرماتے تھے ایک دفعہ اس کو چار تہہ کیا گیا تو آپ اس پر آرام فرما ہوئے جب بیدار ہوئے تو فرمایا تم نے اس کمبل کے ذریعے مجھے قیام لیل سے روک دیا اس کو دوہرا کر دو جیسے پہلے تم اسے دوہرا کیا کرتے تھے اور میں تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتی ہو کہ رسول اکرم

---

(۱) الفردوس بماثور الخطاب جلد ۵ ص ۲۴۶ حدیث ۸۱۲۸

(۲) قرآن مجید، سورۂ احقاف آیت ۳۵

دھونے کے لیے کپڑا اتارتے پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ آکر نماز کی اطلاع کرتے تو آپ کے پاس (دوسرا) کپڑا نہ ہوتا جو پہن کر نماز کے لیے جاتے جب تک وہ خشک نہ ہو جاتے تو آپ اسے ہی پہن کر تشریف لے جاتے اور میں تمہیں قسم دے کر پوچھتا ہوں کر تم جانتی ہو کہ بنو ظفر کی ایک خاتون نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دو چادریں بنائیں ایک بطور تہبند باندھنے والی اور دوسری اوپر لینے کے لیے، اس نے ایک چادر آپ کے پاس بھیج دی اور دوسری ابھی تک نہیں پہنچی تھی تو آپ اسی کو لپیٹ کر نماز کے لیے تشریف لے گئے آپ پر کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا آپ نے اس کے دونوں کناروں سے اپنی گردن مبارک کے ساتھ گرہ باندھی اور اسی طرح نماز پڑھی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مسلسل بیان کرتے رہے حتی کہ انہوں نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو رُلا دیا اور آپ خود بھی روئے اور ایسی چیخ ماری کہ ہم نے گمان کیا کہ عنقریب آپ کی رُوح پرواز کر جائے گی۔ (۱)

بعض روایات میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول میں اضافہ ہے آپ نے فرمایا میرے دو ساتھی مجھ سے جو ایک راستہ پر چلے (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مراد ہیں) اگر میں ان کے راستے کے علاوہ راستے پر چلوں گا تو میرے ساتھ ایسا سلوک ہوگا جو ان کے ساتھ نہیں ہوگا اور اللہ کی قسم! میں ان کی سخت زندگی پر صبر کروں گا شاید میں بھی ان کے ساتھ اسی طرح عیش پاؤں۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا۔

مجھ سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کسی کو فقر میں مبتلا کیا جاتا اور وہ صرف ایک کوٹ پہنتے بعض کو جوؤں کے ذریعے آزمایا گیا حتی کہ جوؤں نے ان کو شہید کر دیا اور ان کو یہ بات اس سے زیادہ پسند تھی جس قدر تمہیں عطیات پسند ہیں (۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا جب حضرت موسیٰ علیہ علیہ السلام مدین کے چشمے پر پہنچے تو کمزوری کی وجہ ساگ کی سبزی آپ کے پیٹ مبارک میں نظر آتی تھی۔

تو اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں نے اس بات کو اختیار کیا اور وہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے۔ اور آخرت میں کامیابی کا راستہ بھی ان کو زیادہ معلوم تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے جب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ (۲)

اور وہ لوگ جو سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے انہیں درد ناک عذاب کی خبر دیجئے۔ (۳)

---

(۱) سنن ابن ماجہ، ص ۳۰۴، ابواب الاطعمہ / جامع ترمذی ص ۳۴۰، ابواب الزھد / ابواب الشمائل ص ۵۹۳ (نامکمل)

(۲) سنن ابن ماجہ ص ۳۰۰، ابواب الفتن (۳) قرآن مجید سورۃ توبہ آیت ۳۴

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تَبًّا لِلدُّنْيَا تَبًّا لِلدِّينَارِ وَالدِّرْهَمِ۔ — دنیا کے لیے ہلاکت ہو، دینار اور درہم کے ہلاکت ہو۔

ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے ہمیں سونے اور چاندی کو خزانہ بنانے سے روکا ہے تو ہم کیا چیز جمع کریں آپ نے ارشاد فرمایا۔

لِيَتَّخِذْ أَحَدُكُمْ لِسَانًا ذَاكِرًا وَقَلْبًا شَاكِرًا وَزَوْجَةً صَالِحَةً تُعِينُهُ عَلَى أَمْرِ آخِرَتِهِ۔ (۱)

تم سے ایک کو (یعنی سب کو) چاہیے کہ وہ ذکر کرنے والی زبان، شکر کرنے والا دل اور نیک بیوی اختیار کرے جو اس کے اخروی کاموں میں اس کی مدد کرے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

مَنْ آثَرَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ ابْتَلَاهُ اللّٰهُ بِثَلَاثٍ هَمًّا لَا يُفَارِقُ قَلْبَهُ أَبَدًا وَفَقْرًا لَا يَسْتَغْنِي أَبَدًا وَحِرْصًا لَا يَشْبَعُ أَبَدًا۔ (۲)

جو شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دے اللہ تعالیٰ اسے تین باتوں میں مبتلا کر دیتا ہے ایسی پریشانی جو اس کے دل سے کبھی جدا نہیں ہوتی نفر جو اسے کبھی بے نیاز نہیں ہونے دیتا اور حرص جو اسے کبھی سیر نہیں ہونے دیتی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا يَسْتَكْمِلُ الْعَبْدُ الْإِيمَانَ حَتَّى يَكُونَ أَنْ لَا يُعْرَفَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ أَنْ يُعْرَفَ وَحَتَّى يَكُونَ قِلَّةُ الشَّيْءِ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ كَثْرَتِهِ۔ (۳)

بندے کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اسے مشہور ہونے کی بجائے معروف نہ ہونا زیادہ پسند نہ ہو نیز اس کے نزدیک کسی چیز کی قلت اس چیز کی کثرت سے زیادہ پسندیدہ ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

"دنیا ایک پل ہے اس کو عبور کرو اس کو آباد نہ کرو" آپ سے عرض کیا گیا اے اللہ کے نبی! اگر ہمیں اجازت دیں تو ہم ایک گھر بنائیں جس میں ہم اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں آپ نے فرمایا جاؤ پانی پر عمارت بناؤ انہوں نے عرض کیا پانی پر عمارت کیسے قائم ہو سکتی ہے؟ فرمایا تو دنیا کی محبت کی موجودگی میں عبادت کس طرح درست ہو سکتی ہے۔

---

(۱) جامع ترمذی ص ۴۱۴ ،ابواب التفسیر

(۲) کنز العمال جلد ۳ ص ۲۲۶، ۲۲۷ حدیث ۶۲۶۶

(۳)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے پیشکش فرمائی کہ وہ میرے لیے وادی مکہ کو سونے کا بنا دے میں نے عرض کیا اے میرے رب نہیں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ایک دن بھوکا رہوں اور ایک دن سیر ہو کر کھاؤں جس دن بھوکا رہوں گا اس دن تیری بارگاہ میں عاجزی کروں گا اور تجھے پکاروں گا اور جس دن سیر ہو کر کھاؤں گا اس دن تیرا شکر ادا کروں گا اور تیری تعریف کروں گا۔ (۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے فرماتے ہیں ایک دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے آپ چل رہے تھے اور حضرت جبریل علیہ السلام بھی آپ کے ساتھ تھے آپ کوہ صفا پر تشریف لے گئے آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا۔

يَا جِبْرِيْلُ وَالَّذِىْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ مَا اَمْسٰى لِاٰلِ مُحَمَّدٍ كَفٌّ سَوِيْقٍ وَلَا سَفَّةُ دَقِيْقٍ۔ (۲)

اے جبریل! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا آج شام آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ایک مٹھی ستو یا آٹا نہیں تھی۔

آپ کی گفتگو مکمل نہ ہوئی تھی کہ اس سے پہلے آسمان سے ایک کڑک سنی گئی جس نے آپ کو پریشان کر دیا آپ نے فرمایا کیا اللہ تعالیٰ نے قیامت کو قائم ہونے کا حکم دے دیا ہے؟ حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا نہیں بلکہ یہ حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں جو آپ کا کلام سن کر حاضر ہوئے ہیں حضرت اسرافیل علیہ السلام نے حاضر ہو کر عرض کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کا کلام سن لیا ہے اور اس نے مجھے زمین کی چابیاں دے کر بھیجا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں پیش کروں اگر آپ چاہیں کہ میں تہامہ کے پہاڑوں کو زمرد، یاقوت سونا اور چاندی بنا کر آپ کے ساتھ چلا دوں تو میں ایسا کرتا ہوں اور اگر نبی بادشاہ بننا چاہتے ہیں تو وہ بن جائیں اور اگر نبی بندہ ہونا چاہیں تو وہ بن جائیں حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ کی طرف اشارہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کریں تو آپ نے فرمایا میں محض بندہ ہونے کی حیثیت سے نبی رہنا چاہتا ہوں (تین مرتبہ فرمایا)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا زَهَّدَهُ فِى الدُّنْيَا وَرَغَّبَهُ فِى الْاٰخِرَةِ وَبَصَّرَهُ بِعُيُوْبِ نَفْسِهٖ۔ (۳)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے دنیا سے بے رغبت کر دیتا ہے اور آخرت کی رغبت پیدا کر دیتا ہے اور اسے اس کے ذاتی عیب دکھا دیتا ہے

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۵۴ مرویات ابو امامہ

(۲) الترغیب والترہیب جلد ۴ ص ۱۹۶ کتاب التوبہ

(۳) الفردوس بماثور الخطاب جلد اول ص ۲۴۲ حدیث ۹۳۵

اور آپ نے ارشاد فرمایا۔

اِزْهَدْ فِی الدُّنْیَا یُحِبُّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِیْمَا فِیْ اَیْدِی النَّاسِ یُحِبُّكَ النَّاسُ۔ (۱)

دنیا سے بے رغبتی اختیار کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور جو کچھ لوگوں کے پاس سے بے رغبت ہو جاؤ لوگ تم سے محبت کریں گے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ اَرَادَ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ عِلْمًا بِغَیْرِ تَعَلُّمٍ وَهُدًی بِغَیْرِ هِدَایَةٍ فَلْیَزْهَدْ فِی الدُّنْیَا۔ (۲)

جو شخص چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے سیکھنے کے بغیر علم اور حصول ہدایت کے بغیر ہدایت دے اسے چاہیئے کہ دنیا سے بے رغبت ہو جائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنِ اشْتَاقَ اِلَی الْجَنَّةِ سَارَعَ اِلَی الْخَیْرَاتِ وَمَنْ خَافَ مِنَ النَّارِ لَهَا عَنِ الشَّهَوَاتِ وَمَنْ تَرَقَّبَ الْمَوْتَ تَرَكَ اللَّذَّاتِ وَمَنْ زَهِدَ فِی الدُّنْیَا هَانَتْ عَلَیْهِ الْمُصِیْبَاتُ۔ (۳)

جو شخص جنت کا شوق رکھتا ہے وہ نیکیوں کی طرف جلدی کرتا ہے اور جو شخص جہنم سے ڈرتا ہے وہ خواہشات کو چھوڑ دیتا ہے اور جو آدمی موت کا منتظر رہتا ہے وہ لذتوں کو چھوڑ دیتا ہے اور جو دنیا سے بے رغبتی اختیار کرتا ہے اس پر مصیبتیں آسان ہو جاتی ہیں۔

ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام (دونوں) سے مروی ہے فرماتے ہیں۔

اَرْبَعٌ لَا یُدْرَكْنَ اِلَّا بِتَعَبٍ اَلصَّمْتُ وَهُوَ اَوَّلُ الْعِبَادَةِ وَالتَّوَاضُعُ وَكَثْرَةُ الذِّكْرِ۔ (۴)

چار چیزیں مشقت اور تھکاوٹ کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں (۱) خاموشی اور یہ اول عبادت ہے (۲) تواضع (۳) کثرتِ ذکر اور (۴) قلت اشیاء۔

وہ تمام روایات جو دنیا سے بغض کی تعریف اور محبتِ دنیا کی مذمت میں وارد ہوئی ہیں ان کا ذکر ممکن نہیں انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد لوگوں کو دنیا سے آخرت کی طرف پھیرنا تھا اور مخلوق کے ساتھ ان کا اکثر کلام اسی بات کو متضمن تھا اور جو کچھ ہم نے ذکر

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۳۱۱، ابواب الزہد

(۲) الاسرار المرفوعۃ ص ۲۱۶ حدیث ۸۵۶ / الفوائد المجموعۃ ص ۲۸۶ حدیث ۸۵

(۳) کنز العمال جلد ۱۵ ص ۸۶۴ حدیث ۴۳۴۴۴

(۴) المعجم الکبیر للطبرانی جلد اول ص ۲۵۶ حدیث ۷۴۱

کیا ہے، کافی ہے اور اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کی جاتی ہے۔

آثار:

ایک روایت میں ہے "لا الہ الا اللہ"، بندوں سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کو دُور کرتا ہے جب تک وہ چیز نہ مانگیں جو ان کی دنیا سے کم ہوگئی ——— ایک دوسری روایت میں ہے جب تک وہ دینوی معاملے کو دینی معاملے پر ترجیح نہ دیں جب وہ ایسا کریں اور "لا الہ الا اللہ" بھی پڑھیں تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے تم نے جھوٹ بولا تم سچے نہیں ہو۔

کسی صحابی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا ہم نے سب اعمال کئے لیکن آخرت کے معاملے میں دنیا سے زُہد سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں پایا۔

اور ایک صحابی نے ایک تابعی سے فرمایا تمہارے اعمال اور اجتہاد صحابہ کرام کی نسبت زیادہ ہے لیکن وہ تم سے بہتر تھے انہوں نے پوچھا وہ کیوں؟ فرمایا وہ تم سے بڑھ کر زاہد تھے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا دنیا سے قطع تعلق دل اور جسم کا آرام ہے اور حضرت بلال بن سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ ہمارا یہی گناہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا سے بے رغبتی کا حکم دیتا ہے اور ہم اس میں رغبت رکھتے ہیں۔

ایک شخص نے حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ سے کہا کہ میں کسی زاہد عالم کو دیکھنا چاہتا ہوں انہوں نے فرمایا کمبخت، یہ تو گمشدہ دولت ہے جو نہیں ملتی۔

حضرت وہب بن منبہ رحمہ اللہ نے فرمایا جنت کے آٹھ دروازے ہیں جب اہل جنت ان کی طرف جائیں گے تو دربان کہیں گے ہمیں اپنے رب کی عزت کی قسم! ان لوگوں سے پہلے کوئی بھی داخل نہیں ہوگا جو دنیا سے بے رغبت اور جنت کے عاشق تھے۔

حضرت یوسف بن اسباط رحمہ اللہ نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ سے تین باتوں کی خواہش رکھتا ہوں یہ کہ جب میں مروں تو میری ملک میں ایک درھم بھی نہ ہو، مجھ پر کوئی قرض نہ ہو اور میری ہڈیوں پر گوشت نہ ہو چنانچہ ان کو یہ سب کچھ دیا گیا۔

منقول ہے کہ کسی بادشاہ نے فقہاء کی طرف کچھ عطیات بھیجے تو انہوں نے قبول کر لیے اور حضرت فضیل رحمہ اللہ کی طرف بھیجے تو انہوں نے قبول نہ کیئے ان کے بیٹوں نے کہا فقہاء نے عطیات قبول کر لیے اور آپ باوجود اپنی اس حالت (یعنی افلاس) کے واپس کر رہے ہیں؟ حضرت فضیل رحمہ اللہ رو پڑے اور فرمایا تمہاری اور میری مثال اس قوم کی طرح ہے جن کے پاس ایک گائے تھی جس سے کھیتی باڑی کرتے تھے جب وہ بوڑھی ہوگئی تو انہوں نے اسے ذبح کر دیا تاکہ اس کے چمڑے سے نفع حاصل کریں اسی طرح تم بھی مجھے بڑھاپے میں ذبح کرنا چاہتے ہو اے میرے گھر والو! فضیل کو ذبح کرنے کی بجائے تمہارا مرجانا بہتر ہے۔

حضرت عبید بن عمیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام علیہ السلام اُونی لباس پہنتے، درختوں کے پتے کھاتے اور ان کی اولاد نہ تھی جو مر جاتی نہ گھر تھا جو برباد ہوتا اور نہ وہ آئندہ دن کے لیے جمع کرتے جہاں شام ہو جاتی سو جاتے۔

حضرت ابوحازم رحمہ اللہ کی بیوی نے ان سے کہا کہ سردیوں کا موسم آگیا ہے اور ہمیں کھانے، کپڑوں اور لکڑیوں کی حاجت ہے حضرت ابوحازم نے اس سے فرمایا ان سب چیزوں کے بغیر گزارہ ہو سکتا ہے لیکن موت، اس کے بعد اٹھنے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے اور پھر جنت یا جہنم میں جانے کے بغیر چارہ نہیں۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ آپ کپڑے کیوں نہیں دھوتے؟ فرمایا معاملہ اس سے بھی جلدی ہے (یعنی موت جلد آنے والی ہے)

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ نے فرمایا ہمارے دلوں پر تین پردے ہیں اور جب تک یہ پردے نہ ہٹیں بندے کے لیے یقین ظاہر نہیں ہوتا ایک پردہ موجود چیز پر خوش ہونا، دوسرا پردہ اس چیز کا غم جو موجود نہیں اور تیسرا پردہ تعریف پر خوش ہونا، پس جب تم موجود چیز پر خوش ہو گے تو تم حریص ہو گے، غیر موجود پر غم کرو گے تو غصہ آئے گا اور غصے والا عذاب میں مبتلا ہوتا ہے اور جب تم تعریف کرنے پر خوش ہو گے تو خود پسند (متکبر) بن جاؤ گے اور خود پسندی عمل کو ضائع کر دیتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس شخص کا دل زاہد ہو اس کی دو رکعتیں اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑی کوشش سے عبادت کرنے والے (غیر زاہد) کی عمر بھر کی عبادت سے بہتر ہیں۔

کسی بزرگ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ہم سے پھیر دیا اس میں اس کی نعمت اس سے زیادہ ہے جو اس نے ہماری طرف متوجہ کیا۔ گویا انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کے مفہوم کی طرف اشارہ کیا۔

آپ نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّ اللّٰهَ يَحْمِي عَبْدَهُ الْمُؤْمِنَ الدُّنْيَا وَهُوَ يُحِبُّهُ كَمَا تَحْمُونَ مَرِيضَكُمُ الطَّعَامَ وَالشَّرَابَ تَخَافُونَ عَلَيْهِ۔ (۱)	اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندے کو دنیا سے بچاتا ہے حالانکہ وہ اسے چاہتا ہے جیسے تم اپنے مریض کو ایسے کھانے پینے سے روکتے ہو جس کا تمہیں اس پر خوف ہوتا ہے

جب یہ بات معلوم ہو گئی تو اس سے معلوم ہوا کہ ایسی ممانعت جو صحت کا باعث بنے اس عطیے سے زیادہ عظیم ہے جو بیماری تک پہنچاتا ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے تھے دنیا دار فانی ہے باقی رہنے والی نہیں دکھوں کی جگہ ہے خوشی کی جگہ نہیں جو اس کو پہچان لیتا ہے وہ اس کی وسعت پر خوش اور تنگی پر غمگین نہیں ہوتا۔

حضرت سہل رحمہ اللہ نے فرمایا بندے کا عمل اس وقت تک خالص نہیں ہوتا جب تک وہ چار چیزوں سے فارغ نہ ہو جائے، بھوک، برہنگی (ننگا ہونا) فقر اور ذلت۔

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۴۲۸ مرویات محمود بن لبید

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے کئی ایسی جماعتوں کو دیکھا اور ان کے ساتھ رہا جو دنیا کی کسی چیز کے آنے پر خوش نہیں ہوتے تھے اور اس کے جانے پر افسوس نہ کرتے اور ان کے نزدیک مٹی سے بھی زیادہ حقیر ہوتی تھی۔ ان میں سے ایک پچاس یا ساٹھ سال زندہ رہتا لیکن نہ اس کے لیے کپڑا تہہ کیا جاتا، نہ اس کے لیے ہنڈیا چڑھتی، نہ زمین پر کوئی بچھونا بچھایا جاتا اور نہ اس کے گھر کوئی کھانا پکانے کا حکم دیا جاتا جب رات ہوتی تو وہ کھڑے ہو جاتے (اور عبادت کرتے) اپنے چہروں کو بچھاتے ان کے رخساروں پر آنسو جاری ہوتے وہ اپنی آزادی کے لیے اپنے رب سے مناجات کرتے جب وہ کوئی اچھا کام کرتے تو شکر کی راہ اختیار کرتے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی قبولیت کی دعا کرتے اور جب کسی برائی کا ارتکاب ہوتا تو غمگین ہو جاتے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے کہ وہ ان کو بخش دے وہ ہمیشہ یہی طریقہ اختیار کرتے مگر اللہ کی قسم! وہ گناہوں سے محفوظ نہ رہے اور ان کی نجات مغفرت کے ذریعے ہی ہوئی اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رضا ان کو حاصل ہو۔ آمین۔

فصل ۳:

زہد کے درجات

زہد کے درجات اور اقسام زہد کی نسبت سے، جس چیز سے اعراض کیا اس کی نسبت سے اور جس میں رغبت ہے اس کی نسبت سے تقسیم۔

جان لو! کہ زہد اپنی قوت کے تفاوت کے اعتبار سے تین درجوں پر ہے

زہد کا پہلا درجہ: یہ سب سے کم درجہ ہے یعنی دنیا سے بے رغبت رہے حالانکہ وہ اس کا خواہش رکھتا ہے اس کا دل دنیا کی طرف مائل اور نفس اس کی طرف متوجہ ہے لیکن وہ مجاہدہ کرتا اور اسے اپنے آپ سے دور کرتا ہے اس شخص کو متزھد کہا جاتا ہے اور یہ اس شخص کے حق میں زہد کا آغاز ہے جو کسب و اجتہاد کے ذریعے زہد کے درجے تک پہنچتا ہے متزہد شخص پہلے اپنے نفس کو پگھلاتا ہے پھر تھیلی کو اور زاہد پہلے اپنی تھیلی کو اور پھر اپنے نفس کو عبادات میں پگھلاتا ہے یہ نہیں کہ جو چیز جدا ہوگئی اس پر صبر میں نفس کو گھلا دے متزہد خطرے میں ہوتا ہے کیوں کہ بعض اوقات اس پر نفس غالب آجاتا ہے اور خواہش اسے کھینچتی ہے پس وہ دنیا اور راحت و آرام کی طرف لوٹ جاتا ہے کم ہو یا زیادہ۔

دوسرا درجہ: اپنی خوشی سے دنیا کو چھوڑے یعنی وہ جس چیز کی طمع کر رہا ہے اس کی نسبت سے دنیا کو حقیر جانتا ہے۔ جیسے کوئی شخص دو درہموں کے لیے ایک درہم کو چھوڑ دیتا ہے اور یہ بات اسے گراں نہیں گزرتی اگرچہ اسے کچھ انتظار کرنا پڑے لیکن یہ زاہد اپنے زہد کو سمجھتا ہے اور اس کی طرف توجہ کرتا ہے تو قریب ہے کہ وہ خود پسندی کا شکار ہو اور اپنے زہد پر تکبر کرنے لگے اور یہ خیال کرے کہ جو کچھ اس نے چھوڑا ہے اس کے نزدیک اس چیز کی قدر ہے لیکن اس

نے اسے زیادہ قدر والی چیز کے لیے ترک کیا ہے یہ بھی نقصان ہے۔

تیسرا درجہ:

یہ سب سے اعلیٰ درجہ ہے یعنی خوشی سے زہد اختیار کرے اور اپنے زہد میں بھی زہد اختیار کرے اور اپنے زہد کی طرف متوجہ نہ ہو کیوں کہ اس نے اپنے خیال میں کوئی چیز نہیں چھوڑی اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ دنیا کوئی چیز نہیں اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو ایک جوہر لینے کے لیے ٹھیکری کو چھوڑ دیتا ہے پس وہ اس جوہر کو اس کا معاوضہ نہیں جانتا اور اپنے آپ کو کسی چیز کا چھوڑنے والا نہیں سمجھتا۔ اور اللہ تعالیٰ اور آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا اس سے بھی زیادہ حقیر ہے جس قدر ٹھیکری، موتی کے مقابلے میں حقیر ہے اور یہ زہد کامل ہے اور اس کا سبب معرفت کا کامل ہونا ہے۔ اس قسم کا زاہد دنیا کی طرف توجہ کے خطرے سے محفوظ رہتا ہے جیسے جوہر لے کر ٹھیکری دینے والے سودے کی واپسی سے بے خوف ہوتا ہے۔

حضرت ابویزید رحمہ اللہ نے حضرت ابوموسیٰ عبدالرحیم رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آپ کس چیز میں گفتگو کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا زہد کے بارے میں، انہوں نے پوچھا کس چیز میں زہد؟ فرمایا دنیا میں" یہ سن کر انہوں نے ہاتھ جھاڑے اور فرمایا میں جانتا تھا کہ آپ کس چیز میں گفتگو کریں گے دنیا تو "لاشی" ہے (کچھ بھی نہیں) آپ کس میں زہد کرتے ہیں۔

جو شخص دنیا کو آخرت کے لیے چھوڑتا ہے اہل معرفت اور ارباب قلوب جن کے دل مشاہدات اور مکاشفات سے معمور ہیں، کے نزدیک وہ اس شخص کی طرح ہے جو بادشاہ کے دربار میں جانا چاہتا ہے تو دروازے پر موجود کتا اسے روک دیتا ہے وہ اس کے سامنے روٹی کا ایک لقمہ ڈالتا ہے اور اسے اپنے کام میں مشغول کر کے خود دروازے سے اندر داخل ہو جاتا ہے اور بادشاہ کا قرب حاصل کرتا ہے حتیٰ کہ اس کا حکم تمام مملکت میں نافذ ہونے لگتا ہے تو تمہارا کیا خیال ہے کہ اس نے جو کچھ حاصل کیا ہے اس کے مقابلے میں وہ بادشاہ کے ہاں اپنے لیے اس لقمے کی کوئی حیثیت جانتا ہے جو اس نے اس کے کتے کے سامنے ڈالا ہے۔

تو شیطان اللہ تعالیٰ کے دروازے پر ایک کتا ہے جو لوگوں کو داخل ہونے سے روکتا ہے حالانکہ دروازہ کھلا ہے اور پردہ بھی اٹھا ہوا ہے اور دنیا روٹی کے ایک لقمے کی طرح ہے اگر تم اسے کھاؤ تو اس کی لذت صرف چبانے کی حد تک ہے پھر نگلتے ہی لذت ختم ہو جاتی ہے پھر اس کا بوجھ معدے میں باقی رہتا ہے پھر وہ بدبو اور گندگی کی شکل اختیار کرتا ہے پھر اس کے بعد اسے بوجھ کو نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے تو جو شخص اسے اس لیے ترک کرتا ہے کہ بادشاہ کے ہاں عزت حاصل کرے وہ اس کی طرف کیسے توجہ کرے گا۔

اور دنیا جو کسی شخص کو صحیح سالم حاصل ہوتی ہے اگرچہ اس کی عمر سو سال ہو آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں اس کی وہ نسبت بھی نہیں جو ایک لقمے کو دنیوی ملک کے مقابلے میں حاصل ہے۔ کیوں کہ جس کی کوئی انتہا ہو اسے غیر متناہی چیز سے کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ اور دنیا عنقریب ختم ہونے والی ہے اگرچہ وہ ایک لاکھ سال تک چلی جائے اور بالکل صاف ہو اس میں کوئی میل اور

گندگی نہ ہو اس کی ابدی نعمتوں سے کوئی مناسبت نہیں اور جب عمر ہی کم ہو اور دنیوی لذات بھی گدلی اور میلی کچیلی ہوں تو اس صورت میں کیا حکم ہوگا۔ اسے آخرت کی ابدی نعمتوں سے کیا نسبت ہوگی۔

تو معلوم ہوا کہ زاہد اپنے زہد کی طرف اسی وقت توجہ کرتا ہے جب وہ اس چیز کی طرف متوجہ ہو جس میں زہد اختیار کیا ہے اور اس چیز کی طرف توجہ اس وقت کرے گا جب اسے قابل اعتبار چیز سمجھے گا اور اسے اسی صورت میں معتبر مانے گا جب معرفت میں کوتاہی ہوگی پس معلوم ہوا کہ زہد کا نقصان درحقیقت معرفت کی کمی اور کوتاہی ہے۔

تو یہ زہد کے درجات میں تفاوت ہے اور ان میں سے ہر درجے کے لیے کئی درجات ہیں کیونکہ متزہد کا صبر کرنا صبر میں مشقت کے تفاوت کے حساب سے مختلف اور متفاوت ہوتا ہے اسی طرح جو شخص اپنے زہد پر تکبر کرتا ہے اور خود پسندی کا شکار ہوتا ہے وہ جس قدر زہد کی طرف متوجہ ہوگا اسی حساب سے اس کا درجہ ہوگا۔

مرغوب فیہ کے اعتبار سے زہد کے درجات

جس چیز میں رغبت ہو اس کی طرف اضافت و نسبت کے حوالے سے بھی زہد کی تقسیم تین درجات میں ہوتی ہے۔

سب سے نچلا درجہ:

جس چیز میں رغبت ہے اس میں جہنم کی آگ اور دیگر تمام تکالیف سے نجات ہو جیسے عذاب قبر، حساب کا پیش کرنا پُل صراط کا خطرہ اور اس کے علاوہ جتنے خطرناک مراحل بندے کے سامنے ہیں جیسا کہ روایات میں آیا ہے۔

کیونکہ روایات میں آیا ہے کہ ایک شخص کو حساب کے لیے کھڑا کیا جائے گا حتیٰ کہ اگر ایک سو پیاسے اونٹ اس کے پسینے پر آئیں تو وہ سیراب ہو جائیں (۱)

یہ ڈرنے والوں کا زُہد ہے گویا وہ (دنیا کے) نہ ہونے پر راضی ہوئے اگر ان کے پاس نہ ہو کیونکہ تکلیف سے نجات تو نہ ہونے سے ہی حاصل ہو جاتی ہے۔

دوسرا درجہ:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے ثواب اور اس کی نعمتوں میں رغبت کے تحت زُہد اختیار کرے اور ان لذات کی رغبت ہو جن کا وعدہ کیا گیا ہے کہ جنت میں ملیں گی جیسے، حُور، اور محلات وغیرہ پر امید رکھنے والوں کا زہد ہے ان لوگوں نے دنیا سے بے رغبتی صرف اس لیے اختیار نہیں کی اور اس کے نہ ہونے پر قناعت اس لیے نہیں کی کہ وہ تکلیف سے نجات پائیں بلکہ انہوں نے دائمی وجود اور ہمیشہ کی نعمتوں کی امید کی ہے جن کی کوئی انتہا نہیں۔

تیسرا درجہ:

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۱۳۰ ہر روایت ابن عباس

یہ سب سے بلند درجہ ہے وہ یہ کہ اس کی رغبت اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی ملاقات میں ہو اس کا دل نہ تو تکالیف کی طرف متوجہ ہو کہ ان سے چھٹکارا پائے اور نہ لذتوں کی طرف کہ ان کو حاصل کرے اور ان کے ذریعے کامیاب ہو بلکہ اس کی تمام تر توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے اور یہی وہ شخص ہے جس کا ایک ہی غم اور ایک ہی لگن ہوتی ہے اور یہی موحّد حقیقی ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی طلب نہیں رکھتا کیوں کہ جو شخص غیر خدا کی طلب کرتا ہے وہ اس کی پوجا کرتا ہے کیوں کہ ہر مطلوب معبود اور ہر طالب اپنے مطلوب کے حوالے سے اس کی پوجا کرنے والا ہے اور غیر خدا کی طلب شرک خفی سے ہے اور یہ محبت کرنے والوں کا زہد ہے اور یہ عارفین ہیں کیوں کہ خاص اللہ تعالیٰ سے وہی محبت کرتا ہے جو اس کی معرفت رکھتا ہے اور جس طرح ایک شخص دینار اور درہم دونوں کی پہچان رکھتا ہو اور اسے معلوم ہو کہ وہ دونوں کو جمع کرنے پر قادر نہیں ہے تو وہ صرف دینار کو چاہتا ہے اسی طرح جو آدمی اللہ تعالیٰ کی پہچان رکھتا ہو اور اس کی ذات پاک کے دیدار کی لذت کا عرفان اسے حاصل ہو اور یہ بھی جانتا ہو کہ یہ لذت اور حوروں سے لطف اندوز ہونا جمع نہیں ہو سکتیں اور محلات کے نقش و نگار اور درختوں کی سبزی دونوں کو (بیک وقت) دیکھنا ممکن نہیں ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی لذت کو چاہتا ہے اس کے غیر کو ترجیح نہیں دیتا۔

اور یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ جنتی جب اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے تو ان کے دلوں میں حور و قصور کی لذت بھی باقی رہے گی بلکہ یہ لذت اہل جنت کی نعمتوں کی لذت کے حوالے سے اسی طرح ہوگی جس طرح چڑیا پر غلبہ پانے اور اس سے کھیلنے کی نسبت سے دنیا کی بادشاہی اور اطراف عالم پر حکومت اور لوگوں کی گردنوں کا مالک ہونے کی لذت ہے۔ کیوں کہ جو شخص کسی پرندے سے کھیلتا ہے تو اس کی یہ وجہ ہیں کہ اس کی لذت مخلوق پر حکومت کرنے کی لذت سے زیادہ ہے بلکہ اس لیے کھیلتا ہے کہ اسے حکومت کرنے اور اس راستے سے لوگوں پر غالب آنے کی لذت کا ادراک نہیں ہے۔

اور جس چیز سے رغبت کو پھیرا جاتا ہے اس کی نسبت سے تقسیم کے سلسلے میں بہت سے اقوال ہیں اور شاید اس سلسلے میں مذکورہ اقوال ایک سو سے زیادہ ہیں لہٰذا ہم ان اقوال کو نقل کرنے میں مشغول نہیں ہوتے بلکہ ہم ایک ایسے کلام کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو تمام تفاصیل کو محیط ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ جو کچھ ذکر کیا گیا ہے اس کا اکثر حصہ کل کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے پس ہم کہتے ہیں کہ زہد کے اعتبار سے جس چیز کو چھوڑا جاتا ہے اور اس سے رغبت کو پھیرا جاتا ہے اس کا اجمال بھی ہے اور تفصیل بھی، اور اس کی تفصیل کے کئی مراتب ہیں ان میں سے بعض ایک ایک قسم کی خوب تشریح کرتے ہیں اور ان میں سے بعض تمام درجات کا نہایت اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں۔

پہلے درجہ میں اجمال یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے سوا ہے اس سے بے رغبتی اختیار کی جائے حتیٰ کہ خود اپنے آپ سے بھی بے رغبت ہو جائے دوسرے درجہ میں اجمال یہ ہے کہ اپنی ان تمام صفات سے توجہ ہٹا دے جن میں نفع ہو اور یہ طبیعت کے تمام تقاضے ہیں جیسے شہوت، غصہ، تکبر، اقتدار، مال اور جاہ و مرتبہ وغیرہ۔

اور تیسرے درجے میں مال و جاہ اور ان کے اسباب سے زُہد اختیار کرے کیوں کہ تمام نفسانی فوائد ان دونوں کی طرف

لوٹتے ہیں۔

چوتھے درجے میں علم، طاقت، دینار، درہم اور جاہ و مرتبہ کے حوالے سے زہد اختیار کرے کیوں کہ مال کی اقسام اگرچہ زیادہ ہیں لیکن وہ درہم اور دینار میں جمع ہو جاتی ہیں اور جاہ و مرتبہ کے اسباب اگرچہ زیادہ ہیں لیکن ان کا رجوع علم و قدرت کی طرف ہوتا ہے اور اس سے مراد وہ علم و قدرت ہے جس سے دلوں کا مالک بننا مقصود ہو کیوں کہ جاہ و مرتبہ کا معنیٰ دلوں کا مالک بننا اور ان پر قادر ہونا ہے جس طرح مال کا مفہوم اشیاء کا مالک بننا اور ان پر قادر ہونا ہے۔

اگر یہ تفصیل اس سے زیادہ بلیغ شرح و تفصیل کی طرف تجاوز کر جائے تو قریب ہے کہ جس میں نسخہ ہے وہ حد سے نکل جائے اور اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں سات چیزوں کا ذکر کیا ہے ارشاد خداوندی ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ (۱)

لوگوں کے لیے خواہشات کی محبت مزین کی گئی ہے یعنی عورتوں، بیٹیوں اور سونے چاندی کے ڈھیر لگے ہوئے خزانوں اور نشان لگے ہوئے گھوڑوں اور جانوروں اور کھیتی کی محبت، یہ دنیوی زندگی کا سامان ہے۔

پھر دوسری آیت میں پانچ کا ذکر فرمایا۔

اِعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ (۲)

جان لو دنیا کی زندگی کھیل کود، زینت اور باہم فخر کرنا نیز مالوں اور اولاد کی کثرت طلب کرنا ہے۔

پھر ان سب کو دو باتوں کی طرف لوٹایا۔ ارشاد خداوندی ہے۔

إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ۔ (۳)

بے شک دنیوی زندگی کھیل کود ہے۔

پھر ان سب کو ایک بات میں جمع کر دیا۔ فرمایا۔

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ۔ (۴)

اور اس نے نفس کو خواہش سے روکا تو بے شک جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

تو لفظ ھویٰ (خواہش) ایک ایسا لفظ ہے جو نفس کی تمام دنیوی لذات کو جمع کرتا ہے لہٰذا اس سے زہد ہونا چاہیے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۴

(۲) قرآن مجید، سورۃ الحدید آیت ۲۰

(۳) قرآن مجید، سورۃ الحدید آیت ۲۰

(۴) قرآن مجید، سورۃ النازعات آیت ۴۰

جب تم نے اجمال اور تفصیل کا طریقہ معلوم کر لیا تو تمہیں معلوم ہو گیا کہ ان میں سے بعض، دوسرے بعض کے مخالف نہیں ان کے درمیان تفریق کبھی تشریح کے اعتبار سے ہوتی ہے اور کبھی اجمال کے حوالے سے۔

حاصل یہ ہوا کہ زہد کا مطلب تمام دنیوی لذتوں سے بے رغبت ہو جانا ہے اور جب آدمی نفس کی خواہشات سے بے رغبت ہو جائے تو اسے دنیا میں باقی رہنے کی رغبت بھی نہیں رہتی تو لا محالہ اس کی امید کم ہو جاتی ہے کیوں کہ بقا تو اس لیے چاہتا ہے کہ نفع حاصل کرے اور بقاء کے ذریعے دائمی نفع کا ارادہ کرتا ہے کیوں کہ جو شخص کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے وہ اس کے دوام کا ارادہ کرتا ہے اور دنیوی زندگی سے محبت کا مطلب یہی ہے کہ جو کچھ اس میں موجود ہے یا جس کا امکان ہے وہ ہمیشہ رہے اور جب اس سے بے رغبت ہو جائے گا تو دوام کا ارادہ نہیں کرے گا۔

یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں پر جہاد فرض کیا گیا تو انہوں نے کہا۔

رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ۔ (۱)

اے ہمارے رب تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا تو نے ہمیں ایک قریب کی مدت تک مہلت کیوں نہیں دی۔

ارشاد خداوندی ہے۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ۔ (۲)

فرما دیجئے دنیا کا سامان تھوڑا ہے۔

یعنی تم دنیا کے ساز و سامان کے لیے باقی رہنا چاہتے ہو اس کے بعد زاہدوں اور منافقوں دونوں کا حال واضح ہو گیا۔

زاہد جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ایسے لڑے کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں اور انہوں نے دو میں سے ایک بھلائی کا انتظار کیا انہیں جب جہاد کے لیے بلایا جاتا تھا تو وہ جنت کی خوشبو سونگھتے تھے اور اس کی طرف وہ اس طرح دوڑتے جس طرح پیاسے ٹھنڈے پانی کی طرف دوڑتے ہیں کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کرنے یا مرتبہ شہادت حاصل کرنے کی حرص رکھتے تھے اور ان میں سے جو اپنے بستر پر انتقال کر جاتا اسے شہادت کا مقام حاصل نہ ہونے پر افسوس ہوتا حتیٰ کہ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بستر مرگ پر تھے تو فرماتے تھے میں نے کس قدر اپنی جان لڑائی اور شہادت کی طمع میں صفوں میں گھستا رہا لیکن اب میں بوڑھی عورتوں کی طرح جان دے رہا ہوں اور جب آپ کا وصال ہوا تو آپ کے جسم پر زخموں کے آٹھ سو داغ تھے ایمان میں سچے لوگوں کا یہی حال تھا۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

لیکن منافق لوگ موت کے خوف سے جماعت سے بھاگتے تھے ان سے کہا گیا۔

إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ

بے شک جس موت سے تم بھاگتے ہو تم نے اس سے

---

(۱) قرآن مجید سورۃ النساء آیت ۵

(۲) قرآن مجید سورۃ النساء آیت ۲۲

مُلٰقِيْكُمْ - (۱) ملاقات کرنا ہے۔

ان لوگوں نے جو دنیا میں باقی رہنے کو شہادت پر ترجیح دی تو یہ اعلیٰ کے بدلے میں ادنیٰ چیز لینا ہے یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی پس ان کو تجارت میں نفع نہ ہوا کیوں کہ انہوں نے اس کی راہ نہ پائی لیکن مخلص لوگوں سے اللہ تعالیٰ نے ان کی جانوں اور مالوں کا سودا کیا اور ان کو جنت عطا فرمائی پس جب انہوں نے دیکھا کہ انہوں نے مثلاً بیس یا تیس سال کا نفع ابدی نفع کے بدلے میں چھوڑ دیا تو وہ اپنے سودے پر جو انہوں نے کیا، خوش ہوئے تو جس چیز میں زہد کیا جاتا ہے یہ اس کا بیان ہے۔

جب تم اس بات کو سمجھ گئے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ متکلمین نے زہد کی تعریف میں جو کچھ ذکر کیا ہے تو وہ صرف اقسام کی طرف اشارہ کیا ہے پس ہر ایک نے وہ بات لکھی جو اس کے نفس پر غالب تھی یا اس مخاطب پر۔

حضرت بشر رحمہ اللہ نے فرمایا دنیا میں زُہد لوگوں سے بے رغبتی اختیار کرنا ہے اور بہ خاص طور پہ جاہ مرتبہ کے اعتبار سے زہد ہے اور حضرت قاسم الجوعی رحمہ اللہ نے فرمایا دنیا سے زُہد پیٹ کے اعتبار سے زُہد ہے جس قدر آدمی کو اپنے پیٹ پر کنٹرول ہوگا اسی قدر وہ زاہد ہوگا، تو یہ ایک خواہش میں زُہد کی طرف اشارہ ہے اور حقیقتاً یہی ایک خواہش اکثر خواہشات پر غالب ہے اور ان کو ابھارتی ہے۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں دنیا میں زُہد قناعت کے اعتبار سے زہد ہے اور بہ خاص مال کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے فرمایا امید میں کم رکھنا زہد ہے اور یہ تمام خواہشات کو جامع ہے کیوں کہ جو شخص خواہشات کی طرف میلان رکھے گا اس کا دل بقا چاہے گا اور یوں اس کی امید طویل ہوگی اور جس کی امید کم ہو گویا اس نے تمام خواہشات سے رغبت کو ختم کر دیا۔

حضرت اُویس رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب زاہد طلبِ معاش کے لیے نکلتا ہے تو اس سے زُہد چلا جاتا ہے اس سے انہوں نے زُہد کی تعریف کرنے کا قصد نہیں کیا بلکہ زُہد میں توکل کو شرط قرار دیا انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ زہد اس رزق کی طلب کو ترک کرنا ہے جس کی ضمان دی گئی ہے۔ اور یہ رزق کی طرف اشارہ ہے۔

اربابِ حدیث فرماتے ہیں رائے اور عقل کے مطابق عمل دنیا ہے اور زُہد علم کی اتباع اور سنت کو لازم پکڑنے کا نام ہے۔ اگر اس رائے اور عقل سے فاسد رائے مراد ہے جس کے ذریعے دنیا میں جاہ و مرتبہ طلب کیا جاتا ہے تو یہ بات صحیح ہے لیکن یہ جاہ سے بعض اسباب کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا یا بعض اسباب کی طرف اشارہ ہے جو فضول خواہشات ہیں۔ کیوں کہ بعض علوم کا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور لوگوں نے ان کو اتنا طول دیا ہے کہ انسان کی عمر ایک ہی علم میں

---

(۱) قرآن مجید سورۂ جمعہ آیت ۸

صرف ہو جائے۔

پس زاہد کے لیے شرط یہ ہے کہ سب سے پہلے فضول کاموں سے بے رغبت ہو۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں زاہد وہ ہے جو کسی کو دیکھ کر کہے کہ یہ مجھ سے افضل ہے تو وہ اس طرف گئے ہیں کہ زُہد، تواضع کا نام ہے اور یہ جاہ اور خود پسندی کی نفی کی طرف اشارہ ہے اور یہ زُہد کی ایک قسم ہے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا زُہد، طلبِ حلال کا نام ہے تو اس صورت اس بات کا کیا مطلب رہ جاتا جو حضرت اویس نے فرمائی کہ زُہد طلبِ معاش کو چھوڑنے کا نام ہے اور اس میں شک نہیں کہ انہوں نے طلب حلال کے ترک کا ہی ارادہ کیا ہے۔

حضرت یوسف بن اسباط رحمہ اللہ فرماتے تھے جو شخص اذیت پر صبر کرے اور خواہشات کو چھوڑ دے نیز حلال کھانا کھائے اس نے زُہد کے اصل کو اختیار کرلیا۔

زہد کے بارے میں ان مذکورہ بالا اقوال کے علاوہ بھی کہا گیا ہے لیکن ان کو نقل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیوں کہ جو شخص حقائقِ امور کو لوگوں کے اقوال سے کھولنا چاہتا ہے وہ ان کو مختلف پاتا ہے اب سوائے حیرت کے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا اور جس کے لئے حق واضح ہو جاتے اور وہ قلبی مشاہدے سے ادراک کرے تو اسے سنی ہوئی بات سے فائدہ نہ ہوگا کیوں کہ وہ حق بات پر اعتماد کر چکا ہے اور جس شخص کی بصیرت میں کمی ہے اس کی کمی پر بھی مطلع ہو چکا ہے اور جنہوں نے کمالِ معرفت کے باوجود اختصار کی راہ اختیار کی کیونکہ حاجت کم تھی تو وہ اس اختصار پر بھی مطلع ہو جائے گا ان تمام بزرگوں نے اختصار سے کام لیا تو اس کی وجہ ان کی بصیرت میں کمی نہ تھی بلکہ انہوں نے ضرورت کے مطابق ذکر کیا ہے اور چونکہ حاجات مختلف ہیں اس لیے کلمات بھی مختلف ہیں۔

اور بعض اوقات اختصار سے کام لینے کی وجہ بندے کی مستقل حالت کی خبر دینا ہوتی ہے جو بندے کا ایک مقام ہے اور احوال مختلف ہوتے ہیں پس جو اقوال ان احوال کی خبر دیتے ہیں وہ بھی مختلف ہوں گے۔

لیکن فی نفسہٖ حق ایک ہی ہوتا ہے اس میں اختلاف کا تصور نہیں ہو سکتا تو ان اقوال میں سے جامع قول وہ ہوگا جو اپنی ذات میں کامل ہو اگرچہ اس میں تفصیل نہ ہو حضرت سلیمان دارانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

ہم نے زہد کے بارے میں بہت زیادہ کلام سنا اور ہمارے نزدیک زہد ہر اس چیز کو چھوڑنے کا نام ہے جو تمہیں اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے ایک مرتبہ انہوں نے تفصیل سے بیان کرتے ہوئے فرمایا جس نے نکاح کیا یا طلبِ معیشت کے لیے سفر کیا یا حدیث لکھی وہ دنیا کی طرف جھک گیا تو انہوں نے ان تمام باتوں کو زہد کے خلاف قرار دیا۔ انہوں نے یہ آیت پڑھی۔

اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۔ (۱) مگر جو شخص اللہ تعالیٰ کے پاس صحیح سالم دل کے ساتھ آئے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ الشعراء آیت ۸۹

پھر فرمایا قلبِ سلیم وہ دل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا غیر نہ ہو اور فرمایا کہ اسلاف نے زہد اس لیے اختیار کیا کہ ان کے دل دنیا کے غموں سے چھوٹ کر آخرت کے لیے فارغ ہو جائیں تو جس چیز میں زہد اختیار کیا جاتا ہے اس کے حوالے سے زہد کی اقسام کا بیان مکمل ہوا۔

زھد کے احکام:

زہد کے احکام فرض، نفل اور سلامتی میں تقسیم ہوئے ہیں جس طرح حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ نے فرمایا۔ پس فرض زہد حرام سے بچنے میں ہوتا ہے اور نفلی زہد، حلال چیز میں ہوتا ہے اور سلامتی شبہات کی صورت میں ہوتی ہے اور ورع و تقویٰ کے درجات کی تفصیل ہم نے حلال و حرام کے ذکر میں بیان کی ہے اور یہ زُہد ہے کیوں کہ حضرت مالک بن انس رحمہ اللہ سے پوچھا گیا زُہد کیا ہے؟ فرمایا تقویٰ" اور خفیہ امور کو چھوڑنے کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کی کوئی انتہا نہیں لہٰذا ان میں زہد کی بھی کوئی حد نہیں کیوں کہ نفس جن خطرات اور تمام حالات سے نفع اندوز ہوتا ہے ان کی کوئی انتہا نہیں بالخصوص ریاکاری کے خفیہ امور تو بے شمار ہیں اور ان پر سوائے بڑے بڑے علماء کے کوئی مطلع نہیں ہو سکتا۔

بلکہ ظاہری اموال میں بھی زُہد کے درجات غیر متناہی ہیں اور ان میں سے نہایت اعلیٰ درجہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زہد ہے جب آپ نے آرام فرما ہونے کے لیے پتھر کو تکیہ بنایا تو شیطان نے کہا کیا آپ نے دنیا کو چھوڑ نہیں دیا تھا اب کیا ہوا؟ آپ نے پوچھا کیا نئی چیز پیدا ہو گئی؟ اس نے کہا آپ نے پتھر کو تکیہ بنایا ہوا ہے یعنی آپ نے آرام کرتے ہوئے اپنے سر کو زمین سے بلند کر کے آسائش اختیار کی ہے یہ سن کر آپ نے پتھر نکال کر پھینک دیا اور فرمایا اسے اور دنیا دونوں کو لے جاؤ۔

حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے بارے میں مروی ہے کہ آپ نے ٹاٹ کا لباس پہنا حتیٰ کہ آپ کے جسم میں سوراخ پڑ گئے اور آپ نے نرم لباس اس لیے نہ پہنا کہ یہ عیاشی ہے۔ اور چھونے کی حس کو آرام پہنچاتا ہے۔ آپ کی والدہ نے فرمایا کہ اس ٹاٹ کی بجائے آپ اُونی لباس پہن لیں تو انہوں نے وہ پہن لیا اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا اے یحییٰ آپ نے دنیا کو ترجیح دے دی اس پر آپ روئے اور اُونی لباس اتار کر دوبارہ پہلے والا لباس پہن لیا۔

حضرت امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں زُہد تو حضرت اویس رحمہ اللہ کا تھا کہ برہنگی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ بانس سے بنے ہوئے ایک برتن میں بیٹھے رہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک آدمی کی دیوار کے سائے میں تشریف فرما ہوئے تو دیوار کے مالک نے آپ کو اٹھا دیا آپ نے فرمایا مجھے تم نے نہیں اٹھایا بلکہ اس نے اٹھایا جو میرے لیے دیوار کے سائے کی آسائش پسند نہیں کرتا (یعنی اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے)

تو ظاہری اور باطنی طور پر زہد کے درجات بے شمار ہیں اور سب سے کم درجہ ہر مشتبہ اور ممنوع چیز میں زہد اختیار کرنا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ زہد تو صرف حلال چیز سے بے رغبتی کا نام ہے شبہ والی اور ممنوع چیز سے بے رغبتی زہد نہیں اور یہ زہد کے درجات میں بالکل نہیں آتی پھر انہوں نے دیکھا کہ دنیوی اموال میں حلال نہیں رہا لہٰذا اب زہد کا تصور ختم ہو گیا۔

سوال :

جب صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا سب کچھ ترک کرنے کا نام زہد ہے تو کھانے پینے لباس پہننے، لوگوں سے میل جول اور گفتگو وغیرہ کی صورت میں زہد کس طرح متصور ہو سکتا ہے کیوں کہ یہ سب کچھ ماسوی اللہ ہی ہیں۔

جواب :

دنیا سے اللہ تعالیٰ کی طرف پھرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا دل مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر کی طرف متوجہ ہو اور یہ بات اسی وقت ہو سکتی ہے جب آدمی دنیا میں باقی رہے اور بقا کے لیے ضروریاتِ نفس کا ہونا ضروری ہے اور جب تم دنیا سے صرف اسی قدر حاصل کرو کہ بدن سے ہلاکت خیز امور کو دور کرو اور تمہاری غرض بدن سے عبادت پر مدد لینا ہو تو تم غیر خدا میں مشغول قرار نہیں دیئے جاؤ گے کیوں کہ جو چیز کسی چیز تک پہنچنے کا وسیلہ ہو وہ اسی سے ہوتی ہے جو شخص حج کی طرف جاتے ہوئے راستے میں اونٹنی کو چارہ دیتا اور پانی پلاتا ہے وہ حج سے منہ پھیرنے والا نہیں ہوتا لیکن تمہارا بدن اللہ تعالیٰ کے راستے میں اسی طرح ہونا چاہیے جس طرح اونٹنی حج کے راستے میں ہوتی ہے کیونکہ تمہارا مقصد اونٹنی کو عیش کرانا نہیں ہوتا بلکہ صرف اتنی غرض ہوتی ہے کہ اسے ہلاکت میں ڈالنے والی باتوں سے بچایا جائے تاکہ وہ تمہیں تمہارے مقصد تک پہنچائے اسی طرح تم اپنے بدن کو کھانا پینا اس لیے دو تاکہ بھوک اور پیاس سے وہ ہلاک نہ ہو جائے لباس اور رہائش اس لیے مہیا کرو ہو کہ ہلاکت خیز گرمی اور سردی سے بچا رہے پس تم ضرورت کی مقدار پر کفایت کرو اور اسے لذت پہنچانے کا قصد نہ کرو بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت پر قوت پہنچاؤ — تو یہ انداز زہد کے منافی نہیں بلکہ یہ تو زہد کی شرط ہے۔

سوال :

جب آدمی بھوک کی حالت میں کھانا کھاتا ہے تو لازماً اسے لذیذ معلوم ہوتا ہے۔

جواب

جان لو کہ اس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا جب کہ تمہارا مقصد لذت حاصل کرنا نہ ہو کیوں کہ ٹھنڈا پانی پینے والے کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے لیکن اس کا مقصد تو پیاس کی تکلیف کو زائل کرنا ہوتا ہے اور جو شخص اپنی حاجت کو پورا کرتا ہے اسے اس سے راحت پہنچتی ہے لیکن اس کے نزدیک یہ اس کا مقصود اور قصداً مطلوب نہیں ہوتی لہٰذا دل اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا انسان بعض اوقات رات کو عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اسے سحری کی خوشگوار ہوا اور پرندوں کی آواز سے راحت پہنچتی ہے لیکن جب اس قسم کی راحت کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش نہ کرے تو کسی قصد کے بغیر جو کچھ اس تک پہنچے گا وہ اسے (شرعی طور پر) نقصان نہیں پہنچاتا اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے لوگوں میں سے ایسے لوگ بھی تھے جو ایسی جگہ تلاش کرتے جہاں بادِ نسیم نہ پہنچے کیوں کہ وہ اس کے ذریعے پہنچنے والی راحت سے ڈرتے تھے اور اس کے ساتھ دل کے مانوس ہونے کا خطرہ ہوتا تھا وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح دنیا سے اُنس پیدا ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُنس میں کمی آ جائے گی جس قدر

اس کے عنبر سے اُنس ہو گا یہی وجہ ہے کہ حضرت داؤد طائی رحمہ اللہ کا ایک کنواں تھا جس کا پانی ننگا رہتا تھا وہ اسے دھوپ سے نہ بچاتے اور گرم پانی پیتے تھے اور فرماتے جو شخص ٹھنڈے پانی کی لذت حاصل کرتا ہے اس کے لیے دنیا کو چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔

تو احتیاط کرنے والے لوگ اس طرح ڈرتے تھے اور ان سب صورتوں میں احتیاط ہی مناسب ہے کیوں کہ اگرچہ یہ مشکل کام ہے لیکن ابدی نعمتوں کے حصول کے لیے تھوڑی مدت تک پرہیز کرنا اہل معرفت پر بھاری نہیں ہوتا ہے وہ شرعی سیاست کے ساتھ اپنے نفسوں کو مغلوب کرتے ہیں اور دین و دنیا کے درمیان اختلاف کی پہچان حاصل کرنے کے لیے یقین کی رسی کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں رضی اللہ عنہم اجمعین۔

فصل ۴:

ضروریات زندگی میں زہد کی تفصیل

جاننا چاہیئے کہ لوگ جن چیزوں کے حصول میں مصروف ہیں ان میں بعض ضرورت سے زائد ہیں اور کچھ اہم ہیں زائد کی مثال نشان زدہ (عمدہ) گھوڑے ہیں کیوں کہ عام لوگ ایسے گھوڑے اس لیے رکھتے ہیں کہ ان پر سواری کے ذریعے آرام پاتے ہیں حالانکہ وہ پیدل چلنے پر قادر ہوتے ہیں اور ضروری چیزیں جیسے کھانا اور پینا ہے ہم زائد چیزوں کی اقسام کی تفصیل بیان نہیں کر سکتے کیوں کہ وہ بے شمار ہیں ہاں ضروری اور اہم چیزیں شمار میں آتی ہیں۔

لیکن ضروری اشیاء میں مقدار، جنس اور اوقات کے اعتبار سے فضول داخل ہے پس ان میں زہد کی وجہ بیان کرنا ضروری ہے اہم (اور ضروری) چیزیں چھ ہیں کھانا، لباس، رہائش، گھریلو سامان، نکاح، مال اور جاہ جو (اچھی) اغراض کے لیے ہو اور یہ چیزیں ان اچھی اغراض میں سے ہیں۔

ہم نے جاہ و مرتبہ کا معنیٰ اور مخلوق اسے کیوں چاہتی دونوں باتیں بیان کی ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس سے بچنے کا طریقہ کیا ہے یہ سب باتیں مہلکات کے بیان میں ریاکاری کے عنوان کے تحت ذکر کی ہیں اب ہم صرف ان چھ اہم امور سے متعلق بیان کرتے ہیں۔

(۱) کھانا:- انسان کے لیے حلال روزی کا ہونا ضروری ہے جس سے قوت حاصل کر سکے لیکن اس کا معاملہ بھی لمبا چوڑا ہے اس لیے اس کے طول و عرض کو کنٹرول کرنا ہو گا یہاں تک کہ زہد کی تکمیل ہو طول تو پوری زندگی کی طرف نسبت کے حوالے سے ہے کیوں کہ جس شخص کو ایک دن کا رزق حاصل ہو وہ اس پر قناعت نہیں کرتا اور اس کا عرض (چوڑائی) کھانے کی مقدار، جنس اور جس وقت کھاتا ہے اس کے حوالے سے ہے۔

اس کی طوالت کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ امید کو کم کر دے اور اس سلسلے میں زہد کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ صرف اتنی

مقدار پر اکتفا کرے جو بھوک کو ختم کر دے یعنی جب بھوک لگی ہوئی ہو اور بیماری کا ڈر ہو اور جس شخص کی یہ حالت ہو گی وہ جب وہ کوئی چیز پائے گا تو وہ صبح کے کھانے سے شام کے لیے جمع نہیں کرے گا اور یہ سب سے بلند درجہ ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ ایک مہینے یا چالیس دن کے لیے جمع کرے۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ صرف ایک سال کے لیے جمع کرے اور یہ کمزور زاہدوں کا رتبہ ہے اور جو شخص اس سے زیادہ مدت کے لیے جمع کرے اسے زاہد کہنا محال ہے کیوں کہ جو شخص ایک سال سے زیادہ زندہ رہنے کی امید رکھتا ہے تو وہ بہت زیادہ امید رکھ رہا ہے تو اس کا زہد مکمل نہ ہو گا ہاں اس کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو اور اپنے لیے لوگوں سے کچھ لینے پر بھی راضی نہ ہو تو الگ بات ہے جیسے حضرت داؤد طائی رحمہ اللہ کو وراثت میں بیس دینار ملے تو انہوں نے ان کو روک رکھا اور بیس سالوں میں خرچ کیا تو یہ اصل زہد کے خلاف نہیں البتہ ان لوگوں کے نزدیک زہد کے خلاف ہے جو زہد میں توکل کو شرط قرار دیتے ہیں۔

اسے جب مقدار کی طرف نسبت کریں تو چوتھائی کی صورت میں سب سے کم درجہ یہ ہو گا کہ ایک دن رات میں ایک پاؤ خوراک ہو درمیانہ درجہ یہ ہے کہ آدھ سیر ہو اور اعلیٰ درجہ ایک کلو ہے اور یہ وہ مقدار ہے جو اللہ تعالیٰ نے کفارے کے سلسلے میں ایک مسکین کا کھانا مقرر کیا ہے اس سے زائد پیٹ کو وسعت دینا اور اسی میں مشغول ہونا ہے اور جو شخص ایک کلو پر اکتفا نہ کر سکے اسے پیٹ کے حوالے سے زہد میں سے حصہ نہیں ملے گا۔

جنس کی طرف اضافت کریں تو کم از کم یہ ہے کہ وہ غذا بن سکے اگرچہ چھان بورے کی روٹی ہو۔ اور درمیانہ درجہ یہ ہے کہ جَو اور جوار کی روٹی ہو اور اعلیٰ درجہ گندم کی روٹی ہے اور وہ بھی آٹا چھنا ہوا نہ ہو۔ اگر اسے چھان کر بورا الگ کر دیا جائے اور میدہ بن جائے تو یہ عیاشی میں داخل ہے اور اس طرح زہد کے آخری دروازے سے بھی نکل جائے گا ابتدائی درجات کی تو بات ہی الگ ہے۔

جہاں تک سالن کا تعلق ہے تو وہ نمک یا ساگ یا سرکہ ہو یہ کم از کم درجہ ہے درمیانے درجے میں زیتون کا تیل یا کوئی دوسری چکنائی شامل ہے اور اعلیٰ درجہ گوشت ہے وہ کسی بھی (حلال) جانور کا ہو اور یہ ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ ہو اگر ہمیشہ گوشت کھائے یا ہفتے میں دو مرتبہ سے زائد ہو تو زہد کے آخری دروازے سے بھی نکل جائے گا اور ایسا شخص پیٹ کے حوالے سے بالکل زاہد نہیں کہلاتا وقت کی طرف اضافت کے حوالے سے کم از کم یہ ہے کہ دن رات میں ایک مرتبہ کھائے یعنی دن کو روزہ رکھے درمیانہ درجہ یہ ہے کہ دن کو روزہ رکھے اور رات کو پانی پیئے اور کھانا نہ کھائے یا کھانا کھائے اور پانی نہ پیئے۔ اور اعلیٰ مقام یہ ہے کہ تین دن یا ایک ہفتے یا اس سے زائد کا روزہ رکھنے کے قابل ہو۔ کھانے کو کم کرنے اور خواہش کو توڑنے کا طریقہ ہم نے مہلکات کے بیان میں ذکر کیا ہے۔

چاہیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو دیکھے کہ کھانے کے سلسلے میں ان کے زہد کی کیا کیفیت تھی۔

اور انہوں نے سالن کو چھوڑ دیا تھا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ہمیں چالیس دن اس طرح گزر جاتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر مبارک میں نہ چراغ جلتا اور نہ ہی آگ جلتی پوچھا گیا تو پھر آپ لوگ کس طرح گزارہ کرتے؟ ام المومنین نے فرمایا دو سیاہ چیزوں یعنی کھجور اور پانی پر گزارہ کرتے (۱)

یہ گوشت، شوربے اور سالن کو چھوڑنا ہے۔

حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دراز گوش پر سوار ہوتے اونی لباس پہنتے اور پیوندلگی ہوئی نعلین شریف پہنتے۔ انگلیاں چاٹتے اور زمین پر (بیٹھ کر) کھانا کھاتے (۲)

اور آپ فرماتے۔

اِنَّمَا اَنَا عَبْدٌ اٰکُلُ کَمَا تَاْکُلُ الْعَبِیْدُ وَ اَجْلِسُ کَمَا یَجْلِسُ الْعَبِیْدُ۔	میں ایک بندہ ہوں اس طرح کھاتا ہوں جس طرح بندے کھاتے ہیں اور اس طرح بیٹھتا ہوں جس طرح بندے بیٹھتے ہیں۔ (۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو شخص جنت الفردوس طلب کرتا ہے اس کے لیے جو کی روٹی اور کوڑے کرکٹ پر کتوں کے ساتھ پڑے رہنا بھی زیادہ ہے۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سے مدینہ طیبہ تشریف لائے آپ نے تین دن بھی گندم سے پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔ (۴)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے تھے اے بنی اسرائیل! تمہیں خالص پانی، جنگلی سبزی اور جو کی روٹی کافی ہے اور گندم کی روٹی سے بچو تم اس کا شکر ادا نہیں کر سکو گے۔

ہم نے مہلکات کے بیان میں کھانے پینے سے متعلق انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت ذکر کی ہے اب دوبارہ بیان نہیں کرتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب قباء والوں کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے دودھ میں شہد ملا کر آپ کی خدمت میں پیش کیا آپ نے پیالہ اپنے ہاتھ سے رکھ دیا اور فرمایا میں اس کو حرام تو نہیں کہتا لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع کرتے

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۱۸۲ مرویات عائشہ

(۲) مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۲۰ کتاب علامات النبوۃ

(۳) مجمع الزوائد جلد ۹ ص ۲۰ کتاب علامات النبوۃ

(۴) جامع ترمذی ص ۳۴۰ ابواب الزھد

ہوئے چھوڑتا ہوں۔

گرمیوں کے موسم میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس ٹھنڈا پانی لایا گیا جس میں شہد ملا یا گیا تھا تو آپ نے فرمایا اس کے حساب کو مجھ سے دُور رکھو۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رازی رحمہ اللہ نے فرمایا سچے زاہد کا رزق وہ ہے جو مل جائے لباس وہ ہے جو ستر کا کام دے اور رہائش گاہ وہی ہے جہاں جگہ مل جائے دنیا قید خانہ ہے قبر خوابگاہ ہے خلوت اس کی مجلس ہے اور عبرت پکڑنا اس کا غور و فکر ہے قرآن اس کی گفتگو ہے اللہ تعالیٰ اس کا انیس (ہم مجلس ساتھی) ہے ذکر اس کا رفیق اور زہد اس کا ساتھی ہے غم اس کا حال اور حیا اس کا شعار (نشانی) ہے بھوک اس کا سالن ہے حکمت اس کا کلام، مٹی اس کا بچھونا، تقویٰ اس کا سامانِ سفر، خاموشی اس کی غنیمت، صبر اس کا تکیہ توکل اس کی کفایت، عقل اس کی راہنما، عبادت اس کا پیشہ اور جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔

دوسری اہم ضرورت لباس ہے اور اس کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ جو گرمی اور سردی کو دُور کرے اور سترِ عورت کے کام آئے اور وہ ایک چادر ہے جس کے ساتھ اپنے آپ کو ڈھانپ لے اس کا اوسط ایک قمیص، ٹوپی اور جوتوں کا ایک جوڑا ہے اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ رومال اور شلوار بھی ہو۔ اس سے زائد کپڑے زہد کی حد سے تجاوز ہے اور زاہد کے لیے شرط یہ ہے کہ جب وہ اپنے کپڑے دھوئے تو پہننے کے لیے مزید کپڑے نہ ہوں بلکہ اسے گھر میں بیٹھنا پڑے اور جب اس کے پاس دو قمیصیں، دو شلواریں اور دو رومال ہوں تو وہ مقدار کے اعتبار سے زہد سے خارج ہو گیا۔

جہاں تک کپڑوں کی جنس کا تعلق ہے تو کم درجہ یہ ہے کہ وہ موٹا ٹاٹ ہو درمیانہ یہ ہے کہ اُون کا کھردرا کپڑا ہو اور اعلیٰ درجے کا زہد یہ ہے کہ کپاس کا سخت موٹا کپڑا ہو۔

وقت کے اعتبار سے آخری درجہ یہ ہے کہ ایک سال کے لیے ستر کا کام دے اور کم از کم یہ کہ ایک دن باقی رہے حتیٰ کہ بعض بزرگوں نے اپنے کپڑوں میں پتوں کے پیوند لگائے اگرچہ وہ بہت جلد خشک ہو جاتے ہیں اور اس اعتبار سے درمیانے درجے کا زہد یہ ہے کہ ایک مہینہ یا اس کے لگ بھگ وہ لباس ٹھہرا رہے۔

پس ایک سال سے زیادہ رہنے والا طلب کرنا لمبی امید کی طرف نکلنا ہے اور یہ زہد کے خلاف ہے البتہ جب موٹے کپڑے کی تلاش ہو تو کوئی حرج نہیں (کیوں کہ وہ دیرپا ہوتا ہے) اور جو اس سے زیادہ پائے تو اسے صدقہ کر دینا چاہیے اگر اسے روک کر رکھتا ہے تو زاہد نہیں بلکہ دنیا سے محبت کرنے والا ہے۔

اس سلسلے میں انبیاء کرام اور صحابہ کرام کے حالات کو دیکھنا چاہیے کہ کس طرح انہوں نے لباس کو چھوڑ دیا تھا حضرت ابو بردہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہمیں ایک نمدے کی چادر اور ایک موٹی ازار دکھائی اور فرمایا نبی اکرم

---

(۱) الترغیب والترہیب ج جلد ۴ ص ۱۹۷ کتاب التوبہ

صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ان کپڑوں میں ہوا (۱)

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُحِبُّ الْمُتَبَذِّلَ الَّذِیْ لَا یُبَالِیْ مَا لَبِسَ۔ (۲)

بے شک اللہ تعالیٰ کام کاج کے کپڑے پہننے والے کو پسند کرتا ہے جو اس بات کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس نے کیا پہنا ہے

حضرت عمرو بن اسود عنسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں کبھی شہرت کا کپڑا نہیں پہنوں گا اور کبھی بھی رات کے وقت بچھونے پر نہ سوؤں گا نہ کبھی عمدہ سواری پر سوار ہوں گا اور نہ ہی کبھی کھانے سے پیٹ بھروں گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جس شخص کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت دیکھنا اچھا لگتا ہو وہ حضرت عمرو بن اسود رضی اللہ عنہ کو دیکھے۔ (۳)

حدیث شریف میں ہے۔

مَا مِنْ عَبْدٍ لَبِسَ ثَوْبَ شُھْرَۃٍ اِلَّا اَعْرَضَ اللّٰہُ عَنْہُ حَتّٰی یَنْزِعَہٗ وَاِنْ کَانَ عِنْدَہٗ حَبِیْبًا۔ (۴)

جو شخص شہرت کا لباس پہنتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے رُخ پھیر لیتا ہے حتیٰ کہ اسے اتار دے اگرچہ وہ اس کا محبوب ہو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کپڑا چار درہم کے بدلے خریدا (۵) اور آپ کے دونوں کپڑوں کی قیمت دس درہم تھی۔ (۶)

آپ کی ازار مبارک ساڑھے چار گز تھی (۷) اور آپ نے تین درہم میں سلوار خریدی۔ (۸)

آپ دو سفید اُونی شملے پہنتے تھے اور ان کو حُلّہ کہا جاتا تھا کیوں کہ یہ ایک ہی جنس کے دو کپڑے تھے بعض اوقات آپ دو یمنی چادریں پہنتے تھے دو معمولی موٹی سحولی (معمولی) چادریں ہوتیں۔ (۹)

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۹۳ کتاب اللباس

(۲) الترغیب والترہیب جلد ۳ ص ۱۰۸ کتاب اللباس (۳)

(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۹۲ مرویات ابن عمر

(۵) مجمع الزوائد جلد ۵ ص ۱۲۱ کتاب اللباس (۶)

(۷) طبقات ابن سعد جلد اول ص ۵۸ ۴ ذکر اصناف لباسہ

(۸) مجمع الزوائد جلد ۵ ص ۱۲۱ کتاب اللباس

(۹) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۹۳ کتاب اللباس

حدیث شریف میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص یوں معلوم ہوتی تھی کہ اس کے ساتھ تیل لگا ہوا ہے۔ (۱)
اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن سندس کا دھاری دار کپڑا پہنا جس کی قیمت دو سو درھم تھی صحابہ کرام تعجب کرتے ہوئے اسے ہاتھوں سے چھوتے اور عرض کرتے یا رسول اللہ! کیا یہ کپڑا آپ کے پاس جنت سے آیا ہے (۲)
اور یہ کپڑا آپ کی خدمت میں اسکندریہ کے بادشاہ مقوقس نے بطور ہدیہ بھیجا تھا آپ نے اسے پہن کر اس کے اعزاز کا ارادہ فرمایا اور پھر اتار کر ایک مشرک کے پاس بھیج دیا جس سے صلہ رحمی کرنا مقصود تھا پھر آپ نے حریر اور دیباج (ریشمی لباس مردوں پر) حرام قرار دیا گویا آپ نے پہلے اس لیے پہنا کہ اس کی حرمت کی تاکید ہو جیسا کہ آپ نے ایک دن سونے کی انگوٹھی پہنی پھر اتار دی اور اس کا پہننا مردوں پر حرام قرار دیا۔ (۳)
اور جیسا کہ آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں فرمایا اس کے گھر والوں پر ولا کی شرط رکھو (۴) جب انہوں نے شرط رکھی تو آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور اس (ولا) کو حرام قرار دیا۔
اور جس طرح آپ نے تین دن کے لیے متعہ جائز قرار دیا پھر امر نکاح کی تاکید کے طور پر اس کو حرام قرار دیا۔ (۵)
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دھاری دار چادر میں نماز پڑھی جب سلام پھیرا تو فرمایا اس کی طرف دیکھنے نے نماز سے میری توجہ ہٹا دی اسے حضرت جہم رضی اللہ عنہ کے پاس لے جاؤ اور ان کی چادر مجھے لا دو۔ (۶)
تو آپ نے عمدہ کپڑے کی نسبت ادنیٰ چادر پسند فرمائی۔
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین مبارک کا تسمہ پرانا ہوا تو آپ نے نیا تسمہ لگا کر اس میں نماز پڑھی جب سلام پھیرا تو فرمایا پرانا تسمہ واپس لے آؤ، اور اس نئے تسمے کو اتار دو نماز میں میری نظر اس پر پڑی ہے (۷)
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی پہنی اور آپ نے منبر شریف پر بیٹھے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی پھر اسے پھینک دیا اور فرمایا اس نے تمہاری طرف سے میری توجہ کو ہٹا دیا میں ایک نظر تمہاری طرف کرتا اور ایک نظر اس کی طرف ہوتی۔ (۸)

---

(۱) شرح السنۃ للبغوی جلد ۱۲ ص ۸۲ حدیث ۳۱۶۴
(۲) صحیح بخاری جلد اول ص ۳۵۶ کتاب الھبۃ
(۳) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۸۷۱ کتاب اللباس
(۴) صحیح بخاری جلد اول ص ۳۵۰ کتاب الھبۃ
(۵) صحیح مسلم جلد اول ص ۴۵۱ کتاب النکاح
(۶) صحیح بخاری جلد اول ص ۵۳ کتاب الصلوٰۃ (۷)
(۸) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۳۲۲ مرویات ابن عباس

ایک دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دو نئے جوتوں کو آپس میں برابر کر رہے تھے تو آپ کو ان کی خوبصورتی اچھی معلوم ہوئی آپ فوراً سجدے میں گر پڑے اور فرمایا مجھے ان جوتوں کی خوبصورتی اچھی معلوم ہوئی تو میں اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع کر رہا ہوں اس خوف سے کہ کہیں وہ مجھ پر ناراض نہ ہو جائے پھر ان جوتوں کو باہر لائے اور جس مسکین کو پہلے دیکھا اسے عنایت فرما دیئے (۱)

حضرت سنان بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اون کا دھاری دار ایک جبہ بُنا گیا اور اس کے کنارے سیاہ رکھے گئے جب آپ نے اسے پہنا تو فرمایا دیکھو یہ کس طرح عمدہ اور کس طرح نرم ہے راوی فرماتے ہیں ایک اعرابی کھڑا ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! یہ مجھے عنایت کر دیجئے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب آپ سے کسی چیز کا سوال کیا جاتا تو آپ بخل سے کام نہ لیتے (فرماتے ہیں) چنانچہ آپ نے اسے دے دیا۔ اور حکم دیا کہ آپ کے لیے ایک اور جبہ بُنا جائے اور جب حضور علیہ السلام کا انتقال ہوا تو وہ جبہ ابھی بُنا جا رہا تھا (۲)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خاتون جنت فاطمۃ الزاہرا رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور آپ چکی پیس رہی تھیں اور آپ پر اونٹ کے بالوں کی ایک چادر تھی آپ نے ان کو دیکھا تو رو پڑے آپ نے فرمایا۔

تَجَرَّعِیْ مَرَارَۃَ الدُّنْیَا لِنَعِیْمِ الْاَبَدِ (۳)

ابدی نعمتوں کے لیے دنیا کی کڑواہٹ کا گھونٹ بھرو۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی۔ (۴)

عنقریب آپ کا رب آپ کو اس قدر دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ مِنْ خِیَارِ اُمَّتِیْ فِیْمَا اَنْبَانِی الْمَلَاءُ الْاَعْلٰی قَوْمًا یَضْحَکُوْنَ جَھْرًا مِنْ سِعَۃِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَیَبْکُوْنَ سِرًّا مِنْ خَوْفِ عَذَابِہٖ مُؤْنَتُھُمْ

مجھے اوپر والوں (فرشتوں) نے جو خبر دی ہے اس کے مطابق میری امت کے بہترین لوگ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کی وجہ سے اونچی آواز سے ہنستے ہیں۔

---

(۱)

(۲) مجمع الزوائد جلد ۵ ص ۱۲۰ کتاب اللباس

(۳) الدر المنثور جلد ۶ ص ۳۶۱ تحت آیت ولسوف یعطیک ربک فترضی

(۴) قرآن مجید، سورۃ والضحی آیت ۵

عَلَى النَّاسِ خَفِيفَةٌ وَعَلَى اَنْفُسِهِمْ ثَقِيلَةٌ يَلْبَسُونَ الْخُلْقَانَ وَيَتَّبِعُونَ الرُّهْبَانَ اَجْسَامُهُمْ فِي الْاَرْضِ وَاَفْئِدَتُهُمْ عِنْدَ الْعَرْشِ۔ (۱)

اور اس کے عذاب کے خوف سے چھپ چھپ کر روتے ہیں ان کی مشقت اور بوجھ لوگوں پر ہلکا اور خود ان پر بھاری ہے وہ پرانے کپڑے پہنتے اور راہبوں (تارک دنیا) کی اتباع کرتے ہیں ان کے جسم زمین پر اور ان کے دل عرش کے پاس ہیں۔

تو لباس کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ اس طرح تھی اور آپ نے تمام امت کو اپنی اتباع کا حکم دیا آپ نے فرمایا۔

مَنْ اَحَبَّنِي فَلْيَسْتَنَّ بِسُنَّتِي۔ (۲)

جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے وہ میری سنت پر چلے۔

اور ارشاد فرمایا۔

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ مِنْ بَعْدِي عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔ (۳)

تم پر میری اور میرے بعد خلفائے راشدین کی سنت اختیار کرنا لازم ہے اسے مضبوطی سے پکڑو۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۴)

آپ فرما دیجئے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو خاص طور پر یہ وصیت فرمائی آپ نے فرمایا۔

اِنْ اَرَدْتِ اللُّحُوْقَ بِي فَاِيَّاكِ وَمُجَالَسَةَ الْاَغْنِيَاءِ وَلَا تَنْزِعِي ثَوْبًا حَتّٰى تُرَقِّعِيْهِ۔ (۵)

اگر تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو تو مالدار لوگوں کی مجلس سے بچو اور جب تک کپڑوں پر پیوند نہ لگا لو ان نہ اتارو (یعنی جب تک پرانے نہ ہو جائیں ان کو نہ بدلو)

---

(۱) حلیۃ الاولیا، جلد اول ص ۱۶ مقدمۃ الکتاب

(۲) السنن الکبریٰ للبیہقی جلد ۷، ص ۷، کتاب النکاح

(۳) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۲۷۹ کتاب السنۃ

(۴) قرآن مجید، سورۃ آل عمران آیت ۳۱

(۵) جامع ترمذی ص ۲۶۹، ابواب اللباس

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی قمیص پر بارہ پیوند شمار کئے گئے جن میں سے بعض چمڑے کے تھے۔

حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے تین درہم میں ایک کپڑا خریدا اور اسے پہنا اور یہ آپ کے دورِ خلافت کا واقعہ ہے آپ نے آستینیں کلائیوں سے کاٹیں اور فرمایا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَسَانِیْ هٰذَا مِنْ رِیَاشِہٖ۔ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے مجھے یہ لباس اپنے عمدہ لباس میں سے پہنایا۔

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ اور دوسرے حضرات فرماتے ہیں وہ لباس پہنو جو تمہیں علماء کے نزدیک مشہور نہ کرے اور جاہلوں کے ہاں ذلیل نہ کرے۔

وہ فرماتے تھے اگر کوئی فقیر میرے پاس سے گزرے اور میں نماز پڑھتے ہوئے اسے جانے دوں تو یہ جائز ہے اور کوئی دنیادار میرے پاس سے گزرے اور اس پر یہ عمدہ لباس ہو تو میں اس سے ناراض ہوتا ہوں اور میں ایسے نہ نکلنے دوں تو یہ جائز ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ حضرت سفیان رحمہ اللہ کے دو کپڑوں اور جوتے کی قیمت ایک درہم اور چار دانق (ایک دانق درہم کا چھٹا حصہ ہوتا ہے) لگائی گئی اور حضرت ابن شبرمہ رحمہ اللہ نے فرمایا میرے بہترین کپڑے وہ ہیں جو میری خدمت کریں اور بدترین لباس وہ ہے جن کی خدمت میں کروں۔

بعض بزرگوں نے فرمایا ایسا لباس پہنو جس سے تم بازار والوں کے ساتھ گھل مل جاؤ اور ایسا لباس نہ پہنو جو تمہیں مشہور کر دے اور تمہاری طرف نظریں اٹھیں۔

حضرت ابوسلیمان دارانی رحمہ اللہ نے فرمایا لباس تین قسم کا ہوتا ہے ایک وہ لباس ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتا ہے اور یہ وہ لباس ہے جو ستر کو ڈھانپ دے دوسرا لباس نفس کے لئے ہے اور یہ نرم و گداز لباس ہے اور تیسرا لباس لوگوں (کو دکھانے) کے لیے ہوتا ہے اور یہ وہ لباس ہے جس کے جوہر اور حُسن کو تلاش کیا جائے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا جس کا لباس پتلا ہوگا اس کا دین بھی پتلا ہوگا اور تابعین میں سے جمہور علماء کے لباس کی قیمت بیس سے تیس درہم تک ہوتی تھی حضرت خواص رحمہ اللہ کا لباس دو حصوں پر مشتمل ہوتا تھا ایک قمیص دوسرا تہبند اور بعض اوقات وہ قمیص کے دامن کو سر پر الٹ دیتے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا پہلا زہد لباس میں ہوتا ہے اور حدیث شریف میں ہے شکستہ حال رہنا ایمان کی علامت ہے اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے طاقت کے باوجود محض اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع اختیار کرتے ہوئے خوبصورت لباس کو ترک کیا اور اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا تلاش کرنا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر واجب ہے کہ وہ اس کے لیے جنت کا لباس یاقوت کے جامہ دانوں میں رکھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی کی طرف وحی فرمائی کہ میرے دوستوں سے فرما دیں کہ وہ میرے دشمنوں کا لباس پہنیں اور نہ ان راستوں سے گزریں جہاں سے میرے دشمن گزرتے ہیں اس طرح وہ بھی میرے دشمن ہو جائیں گے جس طرح وہ لوگ میرے دشمن ہیں۔

حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے بشر بن مروان کو کوفہ میں منبر پر (بیٹھے) وعظ کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا اپنے امیر کو دیکھو وہ لوگوں کو وعظ کر رہا ہے اور خود فاسقوں والا لباس پہنے ہوا ہے اور اس نے باریک لباس پہنا ہوا تھا۔

عبداللہ بن عامر عمدہ لباس پہن کر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور زُہد کے بارے میں گفتگو کرنے لگا حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اس کے منہ پر ہتھیلی رکھی اور اس کی ہوا خارج کروں ابن عامر کو غصہ آیا اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی انہوں نے فرمایا تم نے خود غلطی کی ہے تم اس لباس میں ان کے سامنے زُہد کے بارے میں گفتگو کرتے ہو!

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہدایت دینے والے ائمہ سے عہد لیا کہ وہ لوگوں کے ادنیٰ حال کو اختیار کریں تاکہ مالداران کی اقتدا کریں اور فقیر کے فقر کی وجہ سے اس کو حقیر نہ سمجھا جائے اور جب حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ آپ موٹا کھردرا لباس کیوں پہنتے ہیں تو انہوں نے فرمایا یہ تواضع کے زیادہ قریب ہے اور اس بات کے لائق ہے کہ مسلمان اس کی اقتدا کریں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیش پسندی اور آرام طلبی سے منع فرمایا آپ نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا لَيْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِيْنَ۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو عیش پسند نہیں ہیں۔ (۱)

حضرت فضالہ بن عبید رحمہ اللہ مصر کے والی تھے انہیں دیکھا گیا کہ بال بکھرے ہوئے ہیں اور پاؤں سے ننگے ہیں کہا گیا آپ حکمران ہیں اور اس طرح کرتے ہیں انہوں نے فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیاشی سے منع فرمایا اور ہمیں حکم دیا کہ کبھی ننگے پاؤں بھی پھرا کریں۔ (۲)

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا اگر آپ اپنے دونوں ساتھیوں (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) سے ملنا چاہتے ہیں تو قمیص پر پیوند لگائیں، ازار کو جھکا کر رکھیں جوتی پیوند لگی ہوئی پہنیں اور سیر ہو کر نہ کھائیں۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا موٹا کھردرا لباس پہنو اور عجمیوں یعنی کسریٰ اور قیصر کے لباس سے بچو۔

---

(۱) الترغیب والترہیب جلد ۳ ص ۲۴ کتاب الطعام

(۲) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۲۱۱ کتاب الرجل

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو شخص کسی قوم کا لباس پہنتا ہے وہ ان ہی میں سے ہوتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ مِنْ شِرَارِ اُمَّتِیْ الَّذِیْنَ غُذُّوْا بِالنَّعِیْمِ یَطْلُبُوْنَ اَلْوَانَ الطَّعَامِ وَاَلْوَانَ الثِّیَابِ وَیَتَشَدَّقُوْنَ فِی الْکَلَامِ۔ (۱)

میری امت کے برے لوگ وہ ہیں جو دولت میں پلتے ہیں طرح طرح کے کھانے اور لباس تلاش کرتے ہیں اور گفتگو میں تکلف کرتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

وقال صلی اللہ علیہ وسلم "اِزْرَۃُ الْمُؤْمِنِ اِلَی اَنْصَافِ سَاقَیْهِ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ فِیْمَا بَیْنَهٗ وَبَیْنَ الْکَعْبَیْنِ وَمَا اَسْفَلُ مِنْ ذٰلِكَ فَفِی النَّارِ وَلَا یَنْظُرُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِلٰی مَنْ جَرَّ اِزَارَهٗ بَطَرًا۔ (۲)

مومن کے ازار (تہبند) پنڈلی کے نصف تک ہوتی ہے اور اس کے اور ٹخنوں کے درمیان ہونے میں بھی کوئی حرج نہیں جو اس سے نیچے کرے گا وہ جہنم میں جائے گا اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس شخص کی طرف نظر رحمت نہیں فرمائے گا جو تکبر کے طور پر اپنی چادر (یا شلوار) کھینچتا ہے۔

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَا یَلْبَسُ الشَّعْرَ مِنْ اُمَّتِیْ اِلَّا مُرَاءٍ اَوْ اَحْمَقُ۔ (۳)

میری امت میں سے وہی شخص بالوں (والے لباس) کو پہنے گا جو ریاکار ہوگا۔ یا بیوقوف۔

حضرت امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اُونی لباس سفر میں سنت میں ہے اور غیر سفر میں بدعت ہے۔

حضرت محمد بن واسع رحمہ اللہ، حضرت قتیبہ بن مسلم رحمہ اللہ کے پاس تشریف لے گئے تو ان پر اُونی لباس تھا حضرت قتیبہ نے کہا آپ کو اُونی قمیص کی کیا ضرورت پڑی؟ وہ خاموش ہو گئے انہوں نے کہا میں آپ سے گفتگو کرتا ہوں اور آپ مجھے جواب نہیں دیتے حضرت محمد بن واسع نے فرمایا مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ میں کہوں میں نے زہد کے طور پر یہ لباس پہنا ہے اس طرح اپنی پاکیزگی بیان کرنے والا ہوں گا اور اگر کہوں کہ فقر کے طور پر ایسا کیا ہے تو اپنے رب سے شکایت ہوگی۔

حضرت ابو سلیمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا تو ان کی طرف وحی بھیجی کہ

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۸ ص ۱۲۶ حدیث ۷۵۱۲

(۲) سنن ابن ماجہ ص ۲۶۴، ابواب اللباس

(۳) تذکرۃ الموضوعات للفتنی ص ۱۵۷ باب اللباس وتنظیفہ

اپنی شرمگاہ کو زمین سے چھپانا اور آپ کی عادت تھی کہ تمام چیزیں ایک ایک رکھتے جب کہ آپ کے سلواریں دو تھیں جب ایک سلوار کو دھوتے تو دوسری کو پہن لیتے حتیٰ کہ آپ پر ایسی حالت نہ آتی کہ آپ کی شرمگاہ کھلی ہوئی ہو۔

حضرت سلیمان فارسی رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ کیا وجہ ہے آپ اچھا لباس نہیں پہنتے فرمایا غلام کو عمدہ کپڑے سے کیا تعلق اور جب وہ آزاد ہو جائے گا تو قسم بخدا! اسے ایسا لباس ملے گا جو کبھی پرانا نہیں ہوگا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ آپ کے پاس ایک اُونی جبہ اور ایک اُونی چادر تھی ان دونوں کو آپ رات کے وقت پہنتے جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔

حضرت حسن فرقد سبخی رحمہ اللہ فرماتے ہیں تمہارا خیال یہ ہے کہ تمہیں گدڑی کی وجہ سے لوگوں پر فضیلت حاصل ہے! مجھے تو یہ بات پہنچی ہے کہ اکثر اصحابِ جہنم وہ ہوں گے جو منافقت کی وجہ سے گدڑی پہنیں گے۔

حضرت یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابو معاویہ اسود رحمہ اللہ کو دیکھا وہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں سے چیتھڑے چن کر ان کو دھوتے اور سی کر پہن لیتے میں نے پوچھا آپ اس سے اچھا لباس بھی تو پہن سکتے ہیں انہوں نے فرمایا جو مصیبت دنیا میں ان (فقراء) کو پہنچتی ہے اس میں کیا نقصان ہے جب کہ اللہ تعالیٰ جنت میں اس کا تدارک فرمائے گا۔ حضرت یحییٰ بن معین یہ بات ذکر کرتے ہوئے روتے تھے۔

تیسری ضرورت، رہائش ہے اور اس میں بھی زُہد کے تین درجات ہیں۔

سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنے لیے کوئی خاص جگہ طلب نہ کرے اور اصحاب صُفہ کی طرح مسجد کے کونوں پر قناعت کرے۔ درمیانہ درجہ یہ ہے کہ اپنے لیے خاص جگہ طلب کرے جیسے ایک چھپر جو گھاس پھونس سے بنا ہو یا اس قسم کا کوئی ٹھکانہ۔

اور سب سے کم درجے کا زُہد یہ ہے کہ کوئی کمرہ حاصل کرے چاہے خریدے یا کرائے پر لے اگر یہ رہائش ضرورت کے مطابق ہو اس سے زائد بھی نہ ہو اور اس میں زینت بھی نہ ہو تو یہ مقدار اسے زہد کے آخری درجہ سے نہیں نکالے گی اور اگر وہ پختہ مکان ہو اسے چونا بھی کیا گیا ہو کشادہ ہو اور چھت چھ (شرعی) گز سے بلند ہو تو وہ رہائش کے حوالے سے زُہد کی حد سے تجاوز کر گیا۔

تو مکان کی جنس کا اختلاف اس طرح ہوتا ہے کہ وہ چُونے کا (یعنی سیمنٹ) کا ہو یا گھاس وغیرہ گارا استعمال ہو یا اینٹیں، اور مقدار کا اختلاف اس کی وسعت اور تنگی کے اعتبار سے ہوتا ہے اور اس کی طوالت کا اختلاف اوقات کے اعتبار سے ہوتا ہے مثلاً اس کی ذاتی ملکیت ہے یا کرایہ پر ہے یا ادھار لیا ہے ان تمام صورتوں میں زُہد کا دخل ہوتا ہے۔

تو خلاصہ یہ ہوا کہ ہر وہ چیز جو ضرورت کے تحت حاصل کی جائے وہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کرے اور دنیا کا حسب ضرورت حاصل کرنا دین کا آلہ اور وسیلہ ہے اور جو اس سے تجاوز کر جائے وہ دین کے خلاف ہے رہائش کا مقصد بارش اور سردی نیز لوگوں کی نظروں اور اذیت سے بچنا ہے اس کا کم از کم درجہ تو معلوم ہے اور جو اس سے زائد ہے وہ فضول

سب کا سبب دنیا ہے اور جو شخص فضول کا طالب ہو اور اس کے لیے کوشش کرے وہ زہد سے بہت دور رہے۔

کہا گیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لمبی امید کے سلسلے میں سب سے پہلے جو بات ظاہر ہوئی وہ تذریر اور تشیید تھی تذریر کپڑوں کی عمدہ اور باریک سلائی کرنا ہے (۱) کپڑوں کی ہلکی سلائی ہونے لگی اور تشیید سے مراد چونے اور اینٹوں کی عمارت بنانا ہے (۲) پہلے لوگ کھجور کی شاخوں سے عمارت بناتے تھے حدیث شریف میں ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب لوگ اپنے کپڑوں کو یمنی چادروں کی طرح منقش کریں گے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ کو حکم دیا کہ انہوں نے جو عمارت بلند کی ہے اسے گرا دیں۔ (۳)

اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بلند قبے کے پاس سے گزرے تو پوچھا یہ کس کا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا فلاں کا ہے جب وہ شخص حاضر ہوا تو آپ نے منہ پھیر لیا اور پہلے کی طرح اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے اس شخص نے صحابہ کرام سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کی تبدیلی کے بارے میں پوچھا تو اسے بتایا گیا اس نے اسی وقت اس کو گرا دیا پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ اس جگہ سے گزرے تو وہ عمارت نظر نہ آئی آپ کو بتایا گیا کہ اس نے اس کو گرا دیا ہے تو آپ نے اس کے لیے دعائے خیر فرمائی۔ (۴)

حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال تک (یعنی زندگی میں) اینٹ پر اینٹ اور بانس پر بانس نہ رکھا۔ (۵)

آپ نے ارشاد فرمایا۔

إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ شَرًّا أَهْلَكَ مَالَهُ فِي الْمَاءِ وَالطِّيْنِ۔ (۶)

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کی برائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے مال کو پانی اور گارے میں (تعمیرات میں) ہلاک کر دیتا ہے

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس سے گزرے تو ہم ایک چھپر کی مرمت کر رہے تھے آپ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ ہم نے عرض کیا یہ چھپر ٹوٹ گیا ہے آپ نے فرمایا میں اس سے بھی جلدی کا معاملہ دیکھتا ہوں (۷)

---

(۱) المستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۱۹۵ کتاب اللباس

(۲) صحیح بخاری جلد اول ص ۳۷۲ کتاب الصوم / کتاب الصلوٰۃ ص ۶۱

(۳) مجمع الزوائد جلد ۴ ص ۷۰ کتاب البیوع

(۴) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۳۵۵ کتاب الادب

(۵) الترغیب والترہیب جلد ۴ ص ۱۸۶ کتاب التوبہ

(۶) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۲ ص ۸۵ حدیث ۱۷۵۵

(۷) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۳۵۴ کتاب الادب

(موت کی طرف اشارہ ہے)

حضرت نوح علیہ السلام نے بانسوں (کانوں کا) گھر بنایا تو آپ سے کہا گیا کہ آپ پختہ مکان بنا لیتے؟ آپ نے فرمایا جس نے مرنا ہے اس کے لیے اتنا بھی زیادہ ہے۔

حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم صفوان بن محیریز کے پاس گئے تو وہ نرکل (بانس وغیرہ) سے بنے ہوئے مکان میں تھے جو جھکا ہوا تھا۔ عرض کیا گیا اگر آپ اسے ٹھیک کرلیں تو اچھا ہے، فرمایا کتنے ہی لوگ مر گئے اور یہ اپنی حالت پر قائم ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ بَنَى فَوْقَ مَا يَكْفِيْهِ كُلِّفَ اَنْ يَحْمِلَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (۱)

جو شخص ضرورت سے زیادہ تعمیر کرے قیامت کے دن اسے اس کو اٹھانے کی تکلیف دی جائے گی۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔

كُلُّ نَفَقَةٍ لِلْعَبْدِ يُؤْجَرُ عَلَيْهَا اِلَّا مَا اَنْفَقَهٗ فِي الْمَاءِ وَالطِّيْنِ۔ (۲)

بندے کو تمام خرچ کئے گئے مال پر اجر ملے گا سوائے (غیر ضروری) تعمیر کے۔

اور ارشاد خداوندی ہے:۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا وَّلَا فَسَادًا۔ (۳)

یہ آخرت کا گھر ہے جسے ہم ان لوگوں کے لیے بناتے ہیں جو نہ تکبر کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ ہی فساد کا۔

اس سے مراد ریاست اور اونچے مکانوں میں ایک دوسرے پر فخر کرنا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

كُلُّ بِنَاءٍ وَبَالٌ عَلٰى صَاحِبِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اِلَّا مَا اَكَنَّ مِنْ حَرٍّ وَبَرْدٍ۔ (۴)

ہر عمارت اپنے مالک کے لیے قیامت کے دن وبال ہوگی سوائے اس (عمارت) کے جو گرمی اور سردی سے محفوظ رکھے۔

ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مکان کی تنگی کی شکایت کی تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

اِتَّسِعْ فِي السَّمَاءِ۔ (۵)

آسمان میں وسیع مکان تلاش کرو۔

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۱۰ ص ۱۸۷، حدیث ۱۰۲۸۷

(۲) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۴ ص ۵۷، حدیث ۳۶۲۰

(۳) قرآن مجید، سورۂ قصص آیت ۸۳

(۴) مشکل الآثار جلد اول ص ۱۶ ۴ مشکل ماروی عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۵) کتاب المراسیل لابی داؤد ص ۱۹۵ ماجاء فی البناء

مقصد یہ ہے کہ جنت کے وسیع مکان کے لیے کوشش کرو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شام کے راستے میں ایک محل دیکھا جو چونے اور اینٹوں سے بنا ہوا تھا آپ نے اللہ اکبر کہہ کر فرمایا میرا خیال نہیں تھا کہ اس امت میں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو ہامان کی طرح فرعون کے لیے عمارت بنائیں گے۔

آپ نے اس آیت کی طرف اشارہ فرمایا۔

فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ۔ (۱) (فرعون نے کہا) اے ہامان میرے لیے گارے کو پکاؤ (یعنی اینٹیں بناؤ)

کہا گیا ہے کہ فرعون پہلا شخص ہے جس کے لیے چونے اور اینٹوں سے عمارت بنائی گئی اور سب سے پہلے ایسی عمارت بنانے والا ہامان تھا پھر بڑے بڑے سرکش لوگوں نے ان دونوں کی پیروی کی اور یہ زینت ہے۔

کسی بزرگ نے ایک شہر میں جامع مسجد دیکھی تو فرمایا میں نے اس مسجد کو کھجور کی شاخوں سے بنا ہوا دیکھا پھر کچے ردے لگے ہوئے اب میں نے اس کو اینٹوں سے بنا ہوا دیکھا ہے کھجور کی شاخوں سے بنانے والے، کچے ردوں کے ساتھ بنانے والوں سے اچھے تھے اور کچے ردوں والے اینٹوں والوں سے اچھے تھے۔

بعض بزرگ ایسے تھے کہ وہ زندگی میں اپنا مکان کئی بار بناتے کیوں کہ وہ اسے کمزور بناتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ زندہ رہنے کی امید رکھتے تھے اور مکان کے سلسلے میں وہ زاہد تھے۔

اور ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو حج یا جہاد کے لیے جائے تو اپنا گرا دیتے یا پڑوسی کو دے جاتے جب واپس لوٹتے تو دوبارہ بناتے اور ان کے مکانات گھاس اور چمڑے کے ہوا کرتے تھے یمن کے علاقے میں عربوں کی آج بھی یہی عادت ہے۔ اور ان کے مکان کی بلندی انسان کے قد سے تقریباً ایک بالشت زیادہ ہوتی تھی۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکانات میں داخل ہوتا تو اپنا ہاتھ چھت سے لگا لیتا۔

حضرت عمرو بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب کوئی شخص اپنے مکان کی دیواریں چھ ہاتھ سے بلند بناتا ہے تو فرشتہ آواز دیتا ہے اے بہت بڑے فاسق کہاں جا رہے ہو؟

حضرت سفیان رحمہ اللہ نے مضبوط عمارت کو دیکھنے سے منع فرمایا اور فرمایا اگر لوگ ان عمارتوں کو نہ دیکھتے تو یہ (اس طرح کی مضبوط و مزین) نہ بنائی جاتیں لہٰذا ان کو دیکھنا اس عمل پر مدد کرنا ہے۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ نے فرمایا مجھے اس شخص پر تعجب نہیں ہے جو عمارت بنا کر چھوڑ جاتا ہے بلکہ اس پر تعجب ہے جو

---

(۱) قرآن مجید، سورہ قصص آیت ۳۸

اس عمارت کو دیکھ کر عبرت حاصل نہیں کرتا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا ایک ایسی قوم آئے گی جو گارے کو بلند کرے گی اور دین کو پست کر دے گی اور وہ عمدہ گھوڑوں کو کام میں لائیں گے وہ تمہارے قبلہ تک پہنچیں گے اور تمہارے دین کے علاوہ پر مریں گے۔

چوتھی ضرورت گھریلو سامان ہے اور اس میں بھی زُہد کے کئی درجات ہیں۔

سب سے اعلیٰ درجہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے آپ کے پاس صرف ایک کنگھی اور لوٹا ہوتا تھا آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنی داڑھی کو ہاتھ سے ٹھیک کر رہا ہے تو کنگھی پھینک دی اور دوسرے کو نہر سے ہاتھ کے ساتھ پانی پیتے ہوئے دیکھا تو لوٹا پھینک دیا اور یہ تمام سامان کا حکم ہے کیوں کہ یہ مقصود کے لیے حاصل کیا جاتا ہے اور جب آدمی اس سے بے نیاز ہو تو یہ سامان دنیا اور آخرت میں وبال ہے اور جس سامان کی ضرورت ہو اس میں کم از کم درجے پر اکتفا کرے اور وہ مٹی کا برتن ہے جہاں وہ کام دے سکتا ہو اور اس بات کی پرواہ نہ کرے کہ اس کا کوئی کنارہ ٹوٹا ہوا ہے کیوں کہ اس سے مقصود حاصل ہو رہا ہے۔

اس سلسلے میں زُہد کا درمیانہ درجہ یہ ہے کہ اس کے پاس حاجت کے مطابق سامان ہو اور وہ ٹوٹا ہوا بھی نہ ہو لیکن ایک برتن کو کئی مقاصد کے لیے استعمال کر سکتا ہے جیسے پیالہ ہے اس میں کھانا کھائے، پانی پیئے اور اپنی چیزیں بھی رکھے پہلے بزرگ تخفیف کی غرض سے ایک برتن کو کئی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اچھا سمجھتے تھے۔

اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ہر مقصد کے لیے ایک ادنیٰ چیز رکھتا ہو اگر تعداد میں زیادہ ہو یا جنس کے اعتبار سے اچھا ہو تو زہد کے تمام دروازوں سے نکل جائے گا اور فضول کی طلب کی طرف جھک جائے گا۔

چاہیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت کو دیکھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس بچھونے پر آرام فرماتے تھے وہ چمڑے کا ایک گدا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ (۱)

حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بچھونا ایک کمبل تھا جسے دوہرا کیا جاتا تھا اور چمڑے کا ایک گدا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ (۲)

ایک روایت میں ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ایک چارپائی پر آرام فرما تھے جس کو کھجور کے پٹھوں سے بُنا گیا تھا انہوں نے آپ کے پہلو میں پٹھوں کے نشانات دیکھے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے ابن خطاب! آپ کیوں روتے ہیں؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ

---

(۱) جامع ترمذی ص ۲۶۷ کتاب اللباس

(۲) جامع ترمذی ص ۲۶۷ کتاب اللباس

میں کسریٰ اور قیصر ایران کے حکومت کا خیال کرتا ہوں اور ادھر آپ کو دیکھتا ہوں حالانکہ آپ اللہ تعالیٰ کے محبوب پسندیدہ اور رسول لیکن کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چارپائی پر آرام فرمائیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمر! کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ ان لوگوں کے لیے دنیا ہو اور ہمارے لیے آخرت، ہو؟ انہوں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ آپ نے فرمایا تو بات یہی ہے (۱)

جب حمص کے امیر حضرت عمیر بن سعید، رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا تمہارے پاس دنیا میں سے کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا ایک عصا ہے جس کا سہارا لیتا ہوں اور اگر سانپ سامنے آ جائے تو اسے مارتا ہوں اور ایک تھیلی ہے جس میں کھانا اٹھائے رکھتا ہوں ایک پیالہ ہے جس میں کھاتا ہوں اور سر دھوتا ہوں اور میرے پاس ایک لوٹا ہے جس میں پینے اور نماز کے وضو کے لیے پانی رکھتا ہوں اس لیے کہ جو کچھ دنیا سے ہے وہ میرے اس سامان کے تابع ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم نے سچ کہا اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر سے واپس تشریف لائے تو حضرت خاتون جنت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے آپ نے ان کے دروازے پر پردہ اور ہاتھوں میں چاندی کے دو کنگن دیکھے تو آپ واپس تشریف لے گئے حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ حضرت خاتون جنت کے پاس آئے تو وہ رو رہی تھیں انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واپس لوٹنے کے بارے میں بتایا حضرت ابو رافع نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے واپسی کے بارے میں پوچھا تو آپ نے پردے اور کنگن کا ذکر فرمایا (یہ سن کر) حضرت خاتون جنت نے دونوں کنگن حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ہاتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجے اور عرض کیا کہ میں نے ان کو صدقہ کر دیا آپ جہاں چاہیں خرچ کریں آپ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا جاؤ ان کو بیچ کر رقم اہل صفہ کو دے دو انہوں نے دونوں کنگن اڑھائی درہم میں بیچے اور وہ رقم اہل صفہ پر صدقہ کر دی پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خاتون جنت کے پاس تشریف لائے اور فرمایا میرے باپ آپ پر قربان ہوں تم نے اچھا کیا۔ (۲)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دروازے پر پردہ دیکھا تو اسے اتار دیا اور فرمایا میں جب بھی اسے دیکھتا ہوں مجھے دنیا یاد آ جاتی ہے اور فرمایا اسے فلاں کے گھر بھیج دو۔ (۳)

ایک رات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک نیا بستر بچھایا اور آپ ایک کمبل پر آرام فرمایا کرتے تھے جس کو دوہرا کیا جاتا تھا آپ تمام رات کروٹیں بدلتے رہے صبح ہوئی تو ام المومنین سے فرمایا وہ پرانا

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۱۴۰ مرویات انس

(۲) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۱۷۱ کتاب الاطعمۃ

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۸۶ مرویات عائشہ

کی وا پس لاؤ اور اس بستر کو مجھ سے دُور کر دو اس نے رات بھر مجھے سونے نہیں دیا۔ (۱)

اسی طرح ایک رات آپ کے پاس پانچ یا چھ دینار آئے وہ رات کو گھر میں ہی رہے تو آپ کو رات بھر نیند نہ آئی حتی کہ رات کے آخری حصے میں ان کو نکال دیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اس وقت آپ کو نیند آئی حتی کہ میں نے آپ کے خراٹوں کی آواز سنی پھر فرمایا اگر اسی حالت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو جاتا کہ یہ درہم آپ کے پاس ہوتے تو آپ کا اپنے رب کے بارے میں کیا گمان ہوتا۔ (۲)

حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ستر نیک بندے ایسے دیکھے ہیں جن کے پاس صرف ایک کپڑا تھا اور انہوں نے اپنے اور زمین کے درمیان کبھی کپڑا نہیں رکھا (یعنی بچھونا نہیں بچھایا) اور جب وہ سونا چاہتے تو زمین پر لیٹ کر اوپر کپڑا لیتے۔

پانچویں ضرورت نکاح ہے بعض حضرات نے فرمایا اصل نکاح اور اس کی کثرت میں زہد نہیں ہے حضرت سہل بن عبداللہ رحمہ اللہ بھی اسی نظریے کے قائل ہیں اور زاہدوں کے سردار کے نزدیک عورتیں پسندیدہ قرار دی گئیں (حضور علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے) تو ہم ان سے زہد کیسے اختیار کریں حضرت ابن عیینہ نے بھی اس قول کی موافقت کی ہے اور انہوں نے فرمایا صحابہ کرام میں سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ زیادہ زہد رکھتے تھے اور آپ کی چار بیویاں اور دس سے زائد لونڈیاں تھیں لیکن صحیح بات وہ ہے جو حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ نے فرمائی ہے وہ فرماتے ہیں ہر وہ چیز جو تمہیں اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے وہ اولاد ہو یا مال یا گھر والے وہ تمہارے لیے باعث نحوست ہے اور عورت بھی بعض اوقات اللہ تعالیٰ سے غافل کر دیتی ہے۔

اس میں حق بات کی وضاحت اس طرح ہے کہ بعض حالات میں مجرد رہنا افضل ہے جیسا کہ کتاب النکاح میں گزر چکا ہے پس نکاح کو چھوڑنا زہد ہوگا اور جہاں غالب شہوت کو دور کرنے کے لیے نکاح افضل ہو وہاں نکاح واجب ہوگا پس نکاح کو چھوڑنا کیسے زہد ہو سکتا ہے اور اگر اس کے چھوڑنے اور اختیار کرنے دونوں صورتوں میں آفت نہ ہو لیکن اس لیے نکاح کو چھوڑ دے کہ عورتوں کی طرف میلان اور ان سے اُنس پیدا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل کر دے تو اس صورت میں نکاح کو چھوڑنا زہد ہے۔ اگر وہ جانتا ہے کہ عورت اسے اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہیں کرے گی لیکن وہ لذت نظر ہم بستری اور مباشرت سے بچنے کے لیے نکاح کو چھوڑتا ہے تو یہ بالکل زہد نہیں ہے کیوں کہ نسل کو باقی رکھنا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بڑھانا ثواب کا موجب اور عبادت ہے اور وہ لذت جو ضروری امور کے پائے جانے سے حاصل ہو، نقصان دہ نہیں ہے کیوں کہ اصل مقصد یہ نہیں ہے یہ اسی طرح ہے کہ ایک شخص کھانے پینے کی لذت سے بچنے کے لیے روٹی کھانا یا

---

(۱) جامع ترمذی ص ۲۶۷، ابواب اللباس

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۱۴۴ مرویات عائشہ

پانی پینا چھوڑ دیتا ہے اس کا بھی زُہد سے کوئی تعلق نہیں کیوں کہ اس کو چھوڑنے سے بدن ہی ختم ہو جاتا ہے اسی طرح نکاح کو چھوڑنا نسل کا انقطاع ہے۔

لہٰذا نکاح کی لذت کے خوف سے اسے چھوڑنا جائز نہیں جب تک کسی دوسری آفت کا خوف نہ ہو حضرت سہل رحمہ اللہ کا مقصد بھی لامحالہ یہی ہوگا اور اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح فرمایا۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی تو جس شخص کی حالت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت جیسی ہو کہ عورتوں کی کثرت نے آپ کو ذکر خداوندی سے نہ روکا اور نہ ہی آپ کا دل ان کی اصلاح اور ان پر خرچ کرنے کی طرف مائل ہوا، تو ایسے شخص کے لیے محض جماع کرنے اور عورت کو دیکھنے کی لذت سے بچنے خاطر زہد اختیار کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لیکن یہ بات انبیاء کرام اور اولیاء عظام سے کیسے متصور ہو سکتی ہے اکثر لوگوں کو عورتوں کی کثرت اللہ تعالیٰ سے غافل کر دیتی ہے پس مناسب یہی ہے کہ اگر نکاح اس کو غافل کرتا ہے تو اسے چھوڑ دے اور اگر غافل نہیں کرتا لیکن اسے ڈر ہے کہ عورت کی کثرت یا عورت کا حسن اسے اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے گا تو صرف ایک عورت سے نکاح کرے اور وہ بھی خوبصورت نہ ہو۔ اور اس سلسلے میں اپنے دل کا خیال رکھے۔

حضرت ابوسلیمان رحمہ اللہ فرماتے ہیں عورتوں کے سلسلے میں زُہد یہ ہے کہ ادنیٰ اور یتیم عورت کو خوبصورت خاندانی عورت پر ترجیح دے۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں اپنے مبتدی مرید کے لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ تین کاموں میں دل نہ لگائے ورنہ اس کا حال بدل جائے گا ایک کمانا دوسرا طلب حدیث اور تیسرا کام نکاح۔

اور فرماتے ہیں میں صوفی کے لیے پسند کرتا ہوں کہ نہ لکھے نہ پڑھے اس لیے کہ اس کی توجہ ایک طرف مبذول رہے گی۔

پس جب ظاہر ہوا کہ لذتِ نکاح، کھانے کی لذت جیسی ہے تو جو عمل اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے وہ ان دونوں کاموں میں ممنوع ہے۔

چھٹی ضرورت وہ ہے جو ان پانچوں کی طرف وسیلہ ہو اور وہ مال و جاہ ہے جاہ کا مطلب دلوں کا مالک ہونا ہے یعنی لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی جائے تاکہ اس طرح اپنے مقاصد اور کام نکلوائے جائیں اور ہر وہ شخص جو اپنے تمام کام خود نہیں کر سکتا اور خادم کا محتاج ہوتا ہے وہ لازماً اس بات کا محتاج ہوتا ہے کہ خادم کے دل میں جگہ بنائے کیوں کہ اگر اس کے دل میں جگہ نہ ہوگی تو وہ کام نہیں کرے گا اور اسی قدر دل میں جگہ بنانا جاہ کہلاتا ہے اس کا آغاز تو قریب ہے لیکن بالآخر یہ ایسے گڑھے کی طرف لے جاتا ہے جس کی کوئی گہرائی نہیں اور جو شخص ممنوعہ چراگاہ کے قریب چراتا ہے قریب ہے کہ وہ اس کے اندر چلا جائے۔ دلوں میں جگہ بنانے کا مطلب یا تو نفع حاصل کرنا ہے یا نقصان کو دور کرنا یا ظلم سے بچناء جہاں تک نفع کا تعلق ہے تو مال کی موجودگی میں اس کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ جو شخص اجرت پر کام کرتا ہے وہ کام

کرے گا اگرچہ اس کے دل میں کام لینے والے کی قدر و منزلت نہ ہو خدمت کرنے والے کے دل میں مقام بنانے کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب اجرت کے بغیر کام لینا ہو۔

جہاں تک تکلیف کو دور کرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں جاہ کی ضرورت ایسے شہر میں پڑتی ہے جس میں عدل کی تکمیل نہ ہوتی ہو۔ یا وہ ایسے پڑوسیوں کے درمیان ہو جو اس پر ظلم کرتے ہیں اور جب تک وہ ان کے دلوں میں اپنی جگہ نہ بنائے ان کی زیادتی و ظلم کو دور نہیں کر سکتا۔ یا بادشاہ کے ہاں کوئی مقام حاصل کرے اس سلسلے میں حاجت کی مقدار کو تحریر میں نہیں لایا جا سکتا خاص طور پر جب اس کے ساتھ انجام کا خوف اور بدگمانی بھی ملی ہوئی ہو اور جو شخص طلب جاہ میں رہتا ہے وہ ہلاکت کے راستے پر چلتا ہے بلکہ زاہد کو چاہیے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے کے لیے بالکل کوشش نہ کرے کیوں کہ دین اور عبادت میں اس کی مشغولیت خود بخود دلوں میں اس کے لیے جگہ بنا دے گی جس کی وجہ سے لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی اذیت دور کر سکے گا اگر کافروں کے درمیان ہو تو بھی ایسا ہوتا ہے مسلمانوں کے درمیان ہو تو کیسے بچاؤ نہیں ہو گا۔

اور اگر کسی کسب کے بغیر جاہ حاصل ہو تو اس کے اضافے کے لیے توہمات اور مفروضے محض جھوٹ ہیں کیوں کہ جو شخص مزید جاہ و مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ بعض حالات میں اذیت سے خالی نہیں ہوتا پس بردباری اور صبر کے ذریعے اس کا علاج طلب جاہ کے ذریعے علاج کرنے کی نسبت بہتر ہے پس دلوں میں جگہ بنانے کی بالکل اجازت نہیں ہے اور اس سلسلے میں تھوڑی مقدار کثیر کی طرف لے جاتی اور اس کا شوق شراب کے شوق سے زیادہ سخت ہے لہٰذا اس کے قلیل و کثیر سے بچنا چاہیے۔

جہاں تک مال کا تعلق ہے تو وہ معیشت کے لیے ضروری ہے لیکن اس سے قلیل مال مراد ہے اگر وہ کمائی کرنے والا ہے تو جب ایک دن کی ضرورت کے لیے کما لے تو اب کمانا چھوڑ دیا جائے بعض بزرگوں کا طریقہ تھا کہ جب وہ دو دانے (دینار کا آٹھواں حصہ) کما لیتے تو اپنی ٹوکری اٹھاتے اور کھڑے ہو جاتے۔

زہد کی شرط ہے اگر اس سے تجاوز کر کے ایک سال کی کفایت تک جائے تو وہ ضعیف اور قوی دونوں قسم کے زاہدین کی تعریف سے نکل جائے گا اگر اس کے پاس زمین ہو لیکن اسے توکل میں قوت یقین حاصل نہ ہو تو اسے اس زمینی آمدنی سے اس قدر رکھ چھوڑنا چاہیے جو سال بھر کے لیے کافی ہو اس مقدار سے وہ زہد سے نہیں نکلے گا بشرطیکہ سال بھر کی کفایت سے زائد کو صدقہ کر دے لیکن یہ کمزور زاہدین میں سے ہو گا۔

اور اگر زہد میں توکل شرط ہو جیسے حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ نے یہ شرط رکھی ہے تو ایسا شخص زاہدین میں سے نہیں ہو گا ہمارا یہ قول کہ وہ زاہدین کی تعریف سے نکل جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ زاہدین سے جو وعدہ کیا گیا ہے کہ ان کو آخرت کے گھر میں مقامات محمودہ حاصل ہوں گے، یہ شخص ان سے محروم رہے گا ورنہ اسے زاہد کہا جا سکتا کیوں کہ

فضول اور کثرت کے اعتبار سے تو وہ زُہد اختیار کر رہا ہے۔

اس تمام تفصیل میں اکیلے آدمی کا معاملہ عیال دار شخص کے مقابلے میں آسان ہے حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اپنے گھر والوں کو زُہد پر مجبور نہ کرے بلکہ ان کو اس بات کی دعوت دے اگر مان جائیں تو ٹھیک ہے ورنہ ان کو چھوڑ دے اور خود جو چاہے کرے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ زاہد کے لیے تنگی اختیار کرنے کی شرط خود اس کے ساتھ خاص ہے اور اس کے عیال پر لازم نہیں ہے ہاں ان کی ایسی باتیں ماننا اس پر لازم نہیں جو اسے حد اعتدال سے نکال دیں اور اسے یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھنی چاہیئے کہ آپ حضرت خاتون جنت رضی اللہ عنہا کے مکان سے پردے اور کنگن کی وجہ سے واپس تشریف لے گئے کیوں کہ اس کا تعلق زینت سے ہے حاجت سے نہیں۔

تو انسان جس جاہ ومال کی حاجت محسوس کرتا ہو وہ ممنوع نہیں بلکہ حاجت سے زائد زہر قاتل ہے اور ضرورت پر اکتفا نفع بخش دوا ہے ان دونوں کے درمیان مشتبہ درجات ہیں پس جو زائد کے قریب ہو اگرچہ وہ نافع دوا نہیں لیکن اس کا نقصان تھوڑا ہے اور زہر کا پینا ممنوع ہے جب کہ دوائی کا استعمال فرض ہے اور دونوں کے درمیان مشتبہ بات ہے لیکن جو احتیاط کرتا ہے اسی کا بھلا ہے اور جو سستی کرتا ہے سستی کا نقصان اسے ہی پہنچتا ہے اور جو شخص اپنے دین کو بچائے اور شک والی چیز کو چھوڑ کر غیر مشکوک کو اختیار کرے اور اپنے آپ کو ضرورت کی تنگی کی طرف پھیر دے وہ احتیاط کا دامن پکڑنے والا ہے اور لازماً یہ نجات پانے والے گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔

جو شخص ضرورت پر اکتفا کرتا ہو اس کو دنیا دار کہنا جائز نہیں بلکہ دنیا میں سے اس قدر حاصل کرنا تو عین دین ہے کیونکہ یہ دین کی شرط ہے اور شرط کو مشروط میں سے ہی سمجھا جاتا ہے اس بات پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ دلالت کرتا ہے آپ کو ایک ضرورت پڑی تو آپ ایک دوست کے پاس قرض لینے تشریف لے گئے اس نے قرض نہ دیا تو پریشان ہو کر واپس تشریف لے آئے اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی کہ اگر آپ اپنے دوست (اللہ تعالیٰ) سے سوال کرتے تو وہ آپ کو دے دیتا آپ نے عرض کیا اے میرے رب! مجھے معلوم تھا کہ تجھے دنیا ناپسند ہے اس لیے مجھے ڈر لگا کہ دنیا کی کوئی چیز تجھ سے مانگوں اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی اے ابراہیم! حاجت دنیا سے نہیں (بلکہ دین سے ہے)

لہٰذا حاجت کے مطابق جو کچھ ہے وہ دین سے ہے اور جو اس کے علاوہ ہے وہ آخرت میں وبال ہوگا اور وہ بھی دنیا میں سے ہے جو شخص مالدار لوگوں کے حالات، کسبِ مال میں ان کی محنت، اسے جمع کر کے محفوظ کرنے اور اس سلسلے میں ذلت اٹھانے سے واقف ہے وہ اس بات کو سمجھتا ہے کہ مالِ دنیا وبال ہے اس کی زیادہ سے زیادہ سعادت یہ ہے کہ یہ مال اس کے وارثوں تک پہنچے اور وہ اسے کھائیں لیکن بعض اوقات وہ اس کے دشمن بن جاتے ہیں اور بعض اوقات وہ اس مال کو گناہ کے کام پر خرچ کرتے ہیں تو گویا یہ شخص گناہ پر ان کا مددگار ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کو جمع کرنے والے اور خواہشات کے پیچھے چلنے والے کو ریشم کے کیڑے سے تشبیہ دی جاتی ہے وہ اسے اپنے اوپر لپیٹتا ہے اور وہ زندہ ہوتا ہے پھر وہ نکلنا چاہتا ہے لیکن راستہ نہیں پاتا اور مر جاتا ہے تو وہ خود اپنے عمل کے باعث ہلاک ہوتا ہے اسی طرح جو شخص دنیوی خواہشات کی اتباع کرتا ہے وہ اپنے دل کو خواہشات کی زنجیروں سے جکڑ لیتا ہے یہاں تک کہ جب اس پر یہ زنجیریں غالب آجاتی ہیں تو مال جاہ واقتدار، اہل واولاد، دشمنوں کی برائی دوستوں سے ریاکاری کرنا اور تمام دنیوی فوائد کی قید میں آجاتا ہے اب اگر اسے محسوس ہو کہ اس نے اس سلسلے میں غلطی کی ہے تو وہ دنیا سے نکلنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس بات پر قادر نہیں ہوتا اور اپنے دل کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہے لیکن ان کو کاٹنے پر قادر نہیں ہوتا اور اگر وہ اپنی کسی پسندیدہ چیز کو اپنے اختیار سے چھوڑتا ہے تو قریب ہے کہ اپنے آپ کو ہلاک کرنے والا اور اس ضمن میں کوشش کرنے والا ہو جائے۔ یہاں تک کہ موت یکدم اس کے اور ان تمام چیزوں کے درمیان جدائی ڈال دے اب وہ بیڑیاں اس کے دل میں باقی رہتی ہیں جو دنیا سے متعلق ہوتی ہیں جو دنیا اس سے رہ گئی اور وہ اس کو پیچھے چھوڑ گیا۔ وہ اسے دنیا کی طرف کھینچتی ہیں اور ملک الموت کے پنجے اس کے دل کی رگوں تک پہنچ چکے ہوتے ہیں جو اس کو آخرت کی طرف کھینچتے ہیں پس موت کے وقت اس کی سب سے ہلکی حالت اس شخص کی طرح ہوگی جس کو آرے سے پھاڑا جائے اور دونوں طرف سے اس کو پکڑ کر اس طرح کھینچا جائے کہ ایک پہلو دوسرے سے الگ ہو جائے اور جس شخص کو آرے سے چیرا جاتا ہے اس کی تکلیف محض اس کے بدن تک پہنچتی ہے اور دل کو تکلیف اس کے اثر کے سرایت کرنے کی وجہ سے ہوتی ہے تو اس تکلیف کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جو پہلے ہی دل کے اندر جاگزیں ہوتی ہے اور اس کے ساتھ خاص ہے دوسری طرف سے سرایت کر کے وہاں نہیں جاتی۔

یہ پہلا عذاب ہے جو اس کو پہنچتا ہے اس سے پہلے کہ وہ اعلیٰ علیین اور رب العالمین کے قرب سے اترنے کے افسوس میں مبتلا ہو کیوں کہ دنیا کی طرف میلان اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے راستے میں رکاوٹ ہے اور رکاوٹ کے وقت اس پر جہنم کی آگ مسلط ہوتی ہے کیوں کہ آگ اسی پر مسلط ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے حجاب میں ہو۔

ارشاد خداوندی ہے۔

كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ۔ (۱)

ہاں ہاں وہ بے شک اس دن اپنے رب کے دیدار سے محروم ہوں گے پھر بے شک انہیں جہنم میں داخل ہونا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے عذاب کو حجاب کی اذیت پر مرتب فرمایا اور حجاب کی تکلیف ہی کافی ہے دوسرے عذاب کو ایک طرف

(۱) قرآن مجید، سورۂ مطففین آیت ۱۵

رکھ دیں اور جب اس کے علاوہ بھی عذاب ہو تو کیا صورت ہوئی۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں جو بات ڈالی گئی کہ آپ جس چیز سے چاہیں محبت کریں بالآخر آپ کو اس سے الگ ہونا ہوگا (۱) اللہ تعالیٰ ہمارے کانوں میں بھی اس بات کو پکا کر دے اور جو مثال ہم نے بیان کی تھی اسی کا مفہوم شاعر کے اس قول میں ہے۔

كَدُودِ الْقَزِّ يَنْسِجُ دَائِمًا وَيَهْلِكُ غَمًّا وَسْطَ مَا هُوَ نَاسِجُهٗ۔

ریشمی کیڑے کی طرح کہ وہ بنتا رہتا ہے اور جو کچھ بنتا ہے اس کے درمیان میں غم سے ہلاک ہو جاتا ہے۔

اور جب اولیاء کرام پر یہ بات منکشف ہوگئی کہ بندہ اپنے اعمال اور نفسانی خواہشات کی وجہ سے اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے جس طرح ریشم کا کیڑا اپنے آپ کو ہلاک کرتا ہے، تو اولیاء کرام نے دنیا کو چھوڑ دیا۔ حتیٰ کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ستر بدری صحابہ کرام کو دیکھا وہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ اشیاء سے اس قدر اجتناب کرتے تھے جس قدر تم حرام اشیاء سے پرہیز نہیں کرتے ــــــ دوسری روایت میں اس طرح ہے کہ جس قدر تم فراخی کی حالت پر خوش ہوتے ہو اس سے زیادہ وہ آزمائشوں پر خوش ہوتے تھے۔ اگر تم ان کو دیکھ لیتے تو تم کہتے یہ مجنون ہیں اور اگر وہ تمہارے بہترین لوگوں کو دیکھتے تو کہتے کہ ان لوگوں کا کوئی اخلاق نہیں اور اگر وہ تم میں سے بُرے لوگوں کو دیکھتے تو کہتے ان لوگوں کا قیامت کے دن پر ایمان نہیں۔ ان میں سے ایک کے سامنے حلال مال پیش کیا جاتا تو وہ نہ لیتا اور کہتا کہ مجھے اپنے دل کے خراب ہونے کا ڈر ہے۔ پس جس شخص کا دل ہو اسے اس کے خراب ہونے کا ڈر ضرور ہوتا ہے اور جن لوگوں کے دلوں کو دنیا کی محبت نے مردہ کر دیا ہو ان کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا۔

وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ۔ (۲)

اور وہ لوگ دنیا کی زندگی پر راضی ہوئے اور اس پر مطمئن بھی اور وہ لوگ ہماری آیات سے غافل ہیں۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

فَأَعْرِضْ عَمَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ۔ (۳)

اور اس کی بات نہ مانو جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے چلا اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا۔

---

(۱) مجمع الزوائد جلد ۴ ص ۲، کتاب البیوع

(۲) قرآن مجید، سورۂ یونس آیت ۷

(۳) قرآن مجید، سورۂ کہف آیت ۲۸

اور ارشاد خداوندی ہے۔

فَاَعْرِضْ عَمَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ۔ (۱)

اور اس شخص سے منہ پھیر لیں جس نے ہمارے ذکر سے اعراض کیا اور صرف دنیا کا ارادہ کیا ان کے علم کی پہنچ اسی مقام تک ہے۔

تو اللہ تعالیٰ نے اس تمام عمل کو غفلت اور عدم علم کا نتیجہ قرار دیا اسی لیے ایک شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ سیاحت کے لیے جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے جائیں آپ نے فرمایا اپنا مال کسی کو دے دو اور میرے ساتھ چل پڑو اس نے کہا یہ نہیں ہو سکتا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا غنی جنت میں داخل ہو یہ تعجب کی بات ہے یا فرمایا مشکل ہے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا نہیں کوئی دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے مگر چار فرشتے آفاق میں چار آوازوں سے ندا کرتے ہیں دو فرشتے مشرق میں اور دو مغرب میں ان میں سے ایک مشرق میں کہتا ہے اے خیر کے متلاشی! آگے بڑھ، اور اے شر کے متلاشی رُک جا، اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ! خرچ کرنے والے کو نعم البدل عطا کر اور روکنے والے کے مال کو تلف کر دے اور مغرب والوں میں سے ایک کہتا ہے موت کے لیے بچے جنو اور برباد ہونے کے لیے عمارت بناؤ اور دوسرا کہتا ہے طویل حساب کے لیے کھاؤ اور نفع اٹھاؤ۔

فصل ۴:

زہد کی علامات

بعض اوقات گمان کیا جاتا ہے کہ مال کا تارک زاہد ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے کیوں کہ مال کو چھوڑنا اور شدت و تکلیف کا اظہار اس آدمی کے لیے آسان ہے جو زہد کے ساتھ اپنی تعریف چاہتا ہے کتنے ہی راہب (تارک دنیا) ہیں جنہوں نے اپنے نفسوں کو معمولی کھانے کی طرف لوٹایا اور ایسے عبادت خانے کو اختیار کیا جس کا دروازہ نہیں لیکن وہ اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ لوگوں کو ان کی حالت کا علم ہو وہ ان کو دیکھیں اور ان کی تعریف کریں۔

تو ترک دنیا زاہد ہونے پر قطعی دلیل نہیں ہے بلکہ مال اور جاہ دونوں سے بے رغبتی زہد ہے۔ تاکہ دنیا کی تمام لذات سے زہد مکمل ہو جائے بلکہ بعض اوقات کچھ لوگ اُونی عمدہ لباس اور اس کے علاوہ قیمتی لباس پہننے کے باوجود زہد کا دعویٰ کرتے ہیں جیسے حضرت خواص رحمہ اللہ نے ان دعویدار لوگوں کے بارے میں فرمایا۔ کہ ایک قوم نے زہد کا دعویٰ کیا لیکن

---

(۱) قرآن مجید سورۃ النجم آیت ۲۹، ۳۰

انہوں نے عمدہ لباس پہنا وہ اس طرح لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ وہ ان کو اس طرح کا لباس تحفہ میں پیش کریں تاکہ ان کی طرف اس نظر سے نہ دیکھا جائے جس نظر سے فقراء کو دیکھا جاتا ہے کیوں کہ اس طرح ان کو فقیر سمجھا جائے گا اور اس انداز میں دیا جائے گا جس طرح مساکین کو دیا جاتا ہے اور وہ اپنے نفسوں کے لیے یوں استدلال کرتے ہیں کہ وہ علم کی اتباع کرتے ہیں اور سنت کے مطابق چلتے ہیں۔

نیز دنیا کی اشیاء ان کی طرف آرہی ہیں حالانکہ وہ ان سے دور بھاگتے ہیں اور یہ دوسروں کی بیماری اپنے سر لیتے ہیں یہ اس وقت ہے جب ان سے حقائق کا مطالبہ کیا جائے اور ان کو تنگ راستوں کی طرف مجبور کیا جائے یہ سب دین کے بدلے دنیا کھاتے ہیں اپنے باطن کی صفائی اور نفسوں کی عادات کی تہذیب ان کا مقصد ہی نہیں پس ان پر ان کی صفات ظاہر ہو کر غالب ہوگئیں تو ان کو اپنا حال بتا دیا یہ لوگ دنیا کی طرف مائل ہیں اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں — یہ حضرت خواص رحمہ اللہ کا کلام تھا۔

تو زہد کی معرفت مشکل بات ہے بلکہ زاہد پر بھی زہد کا حال مشتبہ رہتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے باطن میں تین باتوں پر اعتماد کرے۔

پہلی علامت:

موجود چیز پر خوش نہ ہو اور نہ ہی غیر موجود پر غمگین ہو جیسے۔ ارشاد خداوندی ہے:۔

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ۔ (۱)

تاکہ تم اس چیز پر افسوس نہ کرو جو تمہیں نہیں ملی اور نہ اس پر خوش ہو جو اس نے تمہیں عطا کی۔

بلکہ اس کے برعکس ہو یعنی موجود مال پر دکھ ہو اور جو نہیں ملا اس پر خوش ہو۔

دوسری علامت:

اس کے نزدیک برا کہنے والا اور تعریف کرنے والا دونوں برابر ہوں پہلی علامت مال میں زہد کی علامت ہے اور دوسری جاہ میں علامتِ زہد ہے۔

تیسری علامت:

اللہ تعالیٰ سے مانوس ہو اور اس کے دل پر اطاعتِ خداوندی کی مٹھاس غالب ہو کیوں کہ دل محبت کی حلاوت سے خالی نہیں ہوتا یا تو وہ دنیوی محبت ہوتی ہے یا اللہ تعالیٰ کی محبت، اور یہ دونوں دل میں اس طرح ہوتی ہیں جس طرح پیالے میں پانی اور ہوا ہوتی ہے جب پانی داخل ہوتا ہے تو ہوا خارج ہو جاتی ہے اور دونوں جمع نہیں ہوتیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ الحدید آیت ۲۳

اُنس رکھتا ہے وہ اسی کے ساتھ مشغول ہوتا ہے اس کے غیر سے مشغول نہیں ہوتا۔

اسی لیے کسی بزرگ سے پوچھا گیا کہ زُہد نے زاہدوں کو کہاں تک پہنچا دیا انہوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ سے اُنس تک کیوں کہ اللہ تعالیٰ سے اُنس اور دنیا سے اُنس دونوں کا اجتماع نہیں ہوسکتا اور اہلِ معرفت نے کہا ہے کہ جب ایمان ظاہر دل سے متعلق رہتا ہے تو دنیا اور آخرت دونوں سے محبت کرتا ہے اور دونوں کے لیے عمل بھی کرتا ہے اور جب ایمان دل کے سیاہ نقطے پر چلا جاتا ہے اور اس میں جاگزیں ہوتا ہے تو وہ دنیا سے نفرت کرتا ہے اور اس کی طرف نہیں دیکھتا اور نہ ہی اس کے لیے عمل کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی دعا میں یوں آیا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا یُّبَاشِرُ قَلْبِیْ۔ یا اللہ! میں تجھ سے ایسے ایمان کا سوال کرتا ہوں جو دل کے ساتھ رہے۔

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ نے فرمایا جو شخص اپنے دل کے ساتھ مشغول ہوتا ہے وہ جو آدمی اپنے رب کے ساتھ مشغول ہوتا ہے وہ اپنے نفس سے بے خبر ہوتا ہے اور یہ عارفین کا مقام ہے اور زاہد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک مقام میں ہو۔ پہلا مقام یہ ہے کہ اپنے نفس میں ہی مشغول ہو اور اس وقت اس کے نزدیک تعریف اور مذمت نیز وجود و عدم برابر ہوتے ہیں اور تھوڑا سا مال رکھنے سے اس کے زُہد کے چلے جانے پر استدلال نہیں کیا جائے گا۔

حضرت ابن ابوالحواری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں نے حضرت ابو سلیمان رحمہ اللہ سے پوچھا کیا حضرت داؤد طائی رحمہ اللہ زاہد تھے؟ انہوں نے فرمایا ہاں تھے میں نے کہا مجھے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے بطور وراثت دینار حاصل کئے اور ان کو بیس سالوں میں خرچ کیا تو زاہد کیسے ہوئے جب کہ انہوں نے اپنے پاس دینار روک رکھے تھے حضرت ابو سلیمان نے فرمایا تمہاری مراد یہ ہے کہ وہ حقیقتِ زُہد کو پہنچ جاتے اور حقیقت سے ان کی مراد غایتِ زُہد تھی کیوں کہ صفاتِ نفس کی کثرت کی وجہ سے زُہد کی کوئی انتہا نہیں ہے اور زُہد کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب ان تمام صفات میں زُہد ہو اور جو شخص دنیا پر قادر ہونے کے باوجود دنیا میں سے کچھ چھوڑتا ہے کیوں کہ اسے اپنے نفس اور دین پر خوف ہوتا ہے تو جس قدر اس نے ترک کیا اسی مقدار میں وہ زُہد میں داخل ہوا اور اس کی انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے سب کو چھوڑ دے حتیٰ کہ پتھر کو تکیہ بھی نہ بنائے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے ہیں کہ ہمیں زُہد کے اول سے ہی کچھ حصہ عنایت فرمادے اگرچہ تھوڑا ہی ہو کیوں کہ ہمارے جیسے لوگوں کو اس کی انتہا کی طمع کرنے کی جرأت نہیں ہوسکتی اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ناامید ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اگر ہم اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے عجائب کو دیکھیں جو اس نے ہمیں عطا فرمائی ہیں تو ہمیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی چیز بڑی نہیں ہے پس اگر اس کے جود و سخا جو ہر کمال سے آگے بڑھنے والا ہے پر اعتماد کرتے ہوئے بہت بڑا سوال بھی کیا جائے تو کوئی بعید بات نہیں۔

تو زُہد کی علامت، فقر اور مالداری، عزت و ذلت اور مدح و ذم کا ایک جیسا ہونا ہے اور اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُنس کا غلبہ ہے اور ان علامات سے لامحالہ کچھ دوسری علامات بھی نکلتی ہیں مثلاً دنیا کو ترک کیا اور یہ پرواہ نہ ہو کہ کس کے پاس گئی ہے۔

اور کہا گیا کہ زُہد کی علامت یہ ہے کہ دنیا جیسی ہے اسی طرح چھوڑ دی جائے یہ نہ کہے کہ میں سرائے بناؤں گا یا مسجد تعمیر کروں گا۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ فرماتے ہیں زُہد کی علامت یہ ہے کہ جو کچھ موجود ہے اس کے ساتھ سخاوت کی جائے۔

حضرت ابن خفیف رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اس کی علامت مِلک سے نکلنے پر خوش ہونا اور آرام پانا ہے انہوں نے ہی فرمایا زُہد یہ ہے کہ دنیا سے بلا تکلف الگ ہو جائے حضرت ابو سلیمان دارانی رحمہ اللہ نے فرمایا۔

اُونی لباس زُہد کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے پس تین درہم کا اُونی لباس بھی مناسب نہیں جب کہ اس کے دل میں پانچ درہم کی رغبت ہو۔

حضرت امام احمد بن حنبل اور سفیان ثوری رحمہما اللہ نے فرمایا زُہد کی علامت امید کا کم ہونا ہے۔

حضرت سری سقطی رحمہ اللہ نے فرمایا جب زاہد اپنے نفس سے بے خبر ہو تو اس کی عیاشی اچھی نہیں اور عارف جب اپنے نفس میں مشغول ہو تو اس کا عیش و عشرت اختیار کرنا بھی اچھا نہیں۔

حضرت نصر آبادی رحمہ اللہ نے فرمایا زاہد دنیا میں مسافر ہے اور عارف آخرت میں۔ حضرت یحییٰ بن معاذ رحمہ اللہ نے فرمایا زہد کی تین علامات ہیں کسی تعلق کے بغیر عمل کرنا، طمع کے بغیر بات کرنا اور ریاست و اقتدار کے بغیر عزت کا حصول۔ انہوں نے ہی فرمایا اے زاہد اللہ تعالیٰ (کی رضا) کے لیے تمہیں سرکہ اور رائی سونگھنا ہے (معمولی خوراک کی طرف اشارہ ہے) اور اے عارف! تم نے کستوری اور عنبر کو سونگھنا ہے۔

ان سے ایک شخص نے عرض کیا کہ میں توکل کی دوکان میں کب جا کر زہد کی چادر اوڑھوں گا اور زاہدین کے ساتھ بیٹھوں گا؟ آپ نے فرمایا جب باطن میں تمہارے نفس کی ریاضت اس حد تک پہنچ جائے کہ اگر اللہ تعالیٰ تم سے تین دن تک رزق روک رکھے تو تیرا اعتماد کمزور نہ ہو لیکن جب تک اس درجہ پر نہیں پہنچو گے تو تمہارا زاہدوں کی نشست پر بیٹھنا جہالت ہے پھر مجھے تم پر اس بات کا ڈر بھی ہے کہ کہیں تم رسوا نہ ہو جاؤ۔

انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ دنیا، دلہن کی طرح ہے جو اس کو طلب کرتا ہے وہ اس کی کنگھی کرتا ہے اور زاہد اس کا منہ کالا کرتا اور اس کے بال اکھیڑتا ہے نیز اس کے کپڑے جلاتا ہے اور عارف اللہ تعالیٰ کی ذات میں مشغول ہوتا ہے اور اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

حضرت سری رحمہ اللہ نے فرمایا میں نے زُہد میں سے جو بات چاہی وہ حاصل کر لی لیکن میں انسانوں میں زہد تک نہ پہنچا اور نہ

ہی مجھے اس کی طاقت ہے۔

حضرت فضیل رحمہ اللہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمام برائی ایک گھر میں رکھی ہے اور اس کی چابی دنیا کی محبت کو بنایا اور تمام بھلائی ایک گھر میں رکھ کر دینا سے بے رغبتی کو اس کی چابی بنایا۔

ہم زہد اور اس کے احکام سے متعلق یہ باتیں بیان کرنا چاہتے تھے اور جب زہد کی تکمیل کے لیے توکل ضروری ہے تو ہم اس کا بیان شروع کریں گے ان شاء اللہ۔





۵۔ توحید اور توکل کا بیان

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جو ملک و ملکوت کا مدبر ہے عزت و جبروت کے ساتھ منفرد و یکتا ہے آسمان کو ستون کے بغیر اٹھانے والا اور اس میں بندوں کے رزق کو مقرر کرنے والا ہے وہ اللہ جس نے اربابِ قلوب و عقول کی آنکھوں کو وسائل و اسباب کو دیکھنے سے مسبب الاسباب کی طرف پھیر دیا اور ان کی ہمتوں اور ارادوں کو اپنے غیر کی طرف متوجہ ہونے اور کسی دوسرے پر اعتماد سے ہٹا دیا۔ پس وہ اس کے سوا کسی کی پوجا نہیں کرتے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ وہی ایک ہے جو بے نیاز ہے اور معبود ہے اور ان کے نزدیک یہ بات ثابت ہے کہ ہر قسم کی مخلوق اس کے بندے ہیں ان کے پاس رزق تلاش کرنا مناسب نہیں اور ہر ذرے کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور جو بھی چیز زمین پر چلتی ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کا رازق ہے اور جب ان کے نزدیک یہ بات ثابت شدہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کے رزق کا ضامن ہے اور کفیل بھی، تو انہوں نے اسی پر توکل کیا اور کہا ہمیں اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

اور رحمت کاملہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو جو باطل کا قلع قمع کرنے والے اور سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرنے والے ہیں اور آپ کی آل پر بھی رحمت ہو اور بہت زیادہ سلام ہو۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد:۔ توکل دین کی منازل میں سے ایک منزل اور یقین رکھنے والوں کے مقامات میں سے ایک مقام ہے بلکہ یہ مقربین کے بلند درجات میں سے ایک درجہ ہے اور توکل ذاتی طور پر علم کی رُو سے نہایت دقیق اور عمل کے اعتبار سے مشکل ہے سمجھنے کے اعتبار سے اس کی باریکی کی وجہ یہ ہے کہ اسباب پر نگاہ رکھنا اور اعتماد کرنا توحید میں شراکت ہے اور اسباب کو بالکل ہی چھوڑ دینا سنت پر طعن اور شریعت پر اعتراض ہے اور اسباب پر اس طرح اعتماد کرنا کہ ان کو اسباب خیال نہ کرنا قیاس کو بدلنا اور جہالت کی گہرائی میں غوطہ زن ہونا ہے۔

توکل کا معنیٰ اس انداز پر ثابت کرنا کہ وہ توحید کے تقاضوں کے موافق اور شریعت کے مطابق ہے نہایت مشکل بات ہے اور چونکہ یہ بات نہایت مخفی ہے لہٰذا اس سے پردہ اٹھانے پر ایسے جید علماء قادر ہو سکتے ہیں جن کی آنکھوں میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے حقائق کا نور موجود ہے انہوں نے دیکھا اور تحقیق کی پھر جو کچھ دیکھا اسے اس طرح بیان کیا جس طرح ان سے بیان کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

اب ہم مقدمہ کے طور پر توکل کی فضیلت بیان کرتے ہیں پھر پہلا حصہ توحید پر اور دوسرا حصہ توکل اور اس پر عمل کے بیان

مقدمہ :

توکل کی فضیلت

آیات کریمہ :

ارشاد خداوندی ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ (۱) اور اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرو اگر تم مومن ہو۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۔ (۲) اور توکل کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پر ہی توکل کرنا چاہیے۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۔ (۳) اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے تو وہ اسے کافی ہے

اور ارشاد ربانی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ۔ (۴) بے شک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تو وہ مقام کتنا عظیم ہے جس پر فائز شخص کو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہو اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کفایت کی ضمان بھی حاصل ہو پس جس کے لیے اللہ تعالیٰ کفایت فرمائے، اس سے محبت کرے اور اس کی رعایت فرمائے اس نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی کیوں کہ جو محبوب ہوتا ہے اسے نہ تو عذاب ہوتا ہے، نہ دوری ہوتی ہے اور نہ ہی وہ پردے میں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ۔ (۵) کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کافی نہیں ہے

تو جو شخص اللہ تعالیٰ کے غیر سے کفایت طلب کرے وہ توکل کو چھوڑنے والا ہے اور وہ اس آیت کی تکذیب کرتا ہے کیوں کہ یہ سوال حق بات کے اقرار کے طور پر ہے۔ جیسے ارشاد خداوندی ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ مائدہ آیت ۲۳

(۲) قرآن مجید، سورۃ ابراہیم آیت ۱۲

(۳) قرآن مجید، سورۃ طلاق آیت ۳

(۴) قرآن مجید، سورۃ آل عمران آیت ۱۵۹

(۵) قرآن مجید، سورۃ الزمر آیت ۱

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ (۱)

بے شک انسان پر ایک وقت گزرا کہ کہیں اس کا نام بھی نہ تھا۔

(یعنی ایسا وقت آیا ہے) اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (۲)

اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے تو بے شک اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے۔

یعنی ایسا غالب اور عزت والا ہے کہ جو کوئی اس کی پناہ میں آجائے وہ ذلیل ورسوا نہیں ہوتا جو اس کی بارگاہ بے کس پناہ میں پناہ لیتا اور اس کی حمایت بن آجاتا ہے وہ پستی کا شکار نہیں ہوتا وہ ایسا حکیم ہے کہ جو کوئی اس کی تدبیر پہ بھروسہ کرتا ہے اس کی تدبیر میں کوئی کوتاہی نہیں ہوتی۔

ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ۔ (۳)

بے شک وہ کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کی تم پوجا کرتے ہو وہ تمہاری طرح بندے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے وہ اس کے مسخر بندے ہیں وہ بھی تمہاری طرح حاجتمند ہیں پس ان پر کس طرح توکل کیا جا سکتا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ۔ (۴)

تم اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو پوجتے ہو وہ تمہارے لیے رزق کے مالک نہیں ہیں پس اللہ تعالیٰ کے پاس رزق تلاش کرو اور اسی کی عبادت کرو۔

اور ارشاد فرمایا۔

وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ۔ (۵)

اور اللہ تعالیٰ کے پاس ہی آسمانوں اور زمین کے خزانے ہیں لیکن منافق سمجھتے نہیں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ الدھر آیت ۱

(۲) قرآن مجید، سورۃ انفال آیت ۴۹

(۳) قرآن مجید، سورۃ اعراف آیت ۱۹۴

(۴) قرآن مجید، سورۃ عنکبوت آیت ۱۷

(۵) قرآن مجید، سورۃ منافقون آیت ۷

اورارشاد ربانی ہے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ۔ (۱)

وہ (اللہ تعالیٰ) امور کی تدبیر فرماتا ہے (اور) کوئی بھی سفارش کرنے والا اس کے حکم کے بغیر سفارش نہیں کر سکتا۔

توحید کے بارے میں قرآن مجید میں جو کچھ مذکور ہے وہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ غیر خدا سے توقعات ختم کر کے ایک قہار ذات پر بھروسہ کیا جائے۔

احادیث:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مجھے موسم حج میں تمام امتیں دکھائی گئیں میں نے ان میں اپنی امت کو دیکھا تو انہوں نے میدان اور پہاڑ سب جگہ کو گھیر رکھا تھا مجھے ان کی کثرت اور انداز نے تعجب میں ڈالا اور خوش کیا مجھ سے پوچھا گیا کیا آپ اس بات پر راضی ہیں؟ میں نے کہا ہاں میں راضی ہوں کہا گیا ان کے ساتھ ستر ہزار مزید ہیں جو کسی حساب کے بغیر جنت میں داخل ہوں گے ——— نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا وہ لوگ جو بلا ضرورت) جسم نہیں داغتے نہ فال لیتے ہیں اور نہ ہی (شرکیہ کلمات کے ساتھ) دم جھاڑا کرتے ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔

حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ مجھے بھی ان میں سے کر دے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی "یا اللہ! ان (حضرت عکاشہ) کو بھی ان میں سے کر دے" ایک دوسرے صحابی کھڑے ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے لیے بھی دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان لوگوں میں کر دے آپ نے فرمایا حضرت عکاشہ تم سے سبقت کر گئے ہیں (۲)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

وَاَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْا خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا۔ (۳)

اگر تم اللہ تعالیٰ پر صحیح معنیٰ میں توکل کرو تو وہ تمہیں اس طرح رزق عطا فرمائے جیسے پرندے کو رزق عطا فرماتا ہے وہ صبح کے وقت خالی پیٹ نکلتا ہے اور شام کے وقت سیر ہو کر لوٹتا ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورہ یونس آیت ۳

(۲) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۸۵۶ کتاب الطب

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۳۰ مرویات عمر بن خطاب

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنِ انْقَطَعَ اِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ كَفَاهُ اللّٰهُ تَعَالٰى كُلَّ مُؤْنَةٍ وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنِ انْقَطَعَ اِلَى الدُّنْيَا وَكَلَهُ اللّٰهُ اِلَيْهَا۔ (۱)

جو شخص سب سے تعلق توڑ کر اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑتا ہے اللہ تعالیٰ اسے ہر مشقت میں کفایت کرتا ہے (اور ضرورتوں کو پورا کرتا ہے) اور اسے وہاں سے رزق عطا فرماتا ہے جس جگہ کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا اور جو شخص دنیا سے تعلق جوڑتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دنیا کے سپرد کر دیتا ہے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ سَرَّهُ اَنْ يَكُوْنَ اَغْنَى النَّاسِ فَلْيَكُنْ بِمَا عِنْدَ اللّٰهِ اَوْثَقَ مِنْهُ بِمَا فِي يَدَيْهِ۔ (۲)

جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ مالدار ہو جائے تو اسے اپنے پاس موجود مال کے مقابلے میں اس چیز پر زیادہ اعتماد ہونا چاہیے جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

ایک روایت میں ہے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو بھوک کی شدت پہنچتی تو آپ فرماتے نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور ارشاد فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی بات کا حکم دیا ہے (۳)

ارشاد خداوندی ہے :۔

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔ (۴)

آپ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیں اور اس پر صبر اختیار کریں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَمْ يَتَوَكَّلْ مَنِ اسْتَرْقٰى وَاكْتَوٰى۔ (۵)

اس شخص نے توکل نہیں کیا جس نے دم جھاڑا طلب کیا اور داغ لگوایا۔

---

(۱) شعب الایمان جلد ۲ ص ۲۸ حدیث ۱۰۷۶

(۲) کنز العمال جلد ۳ ص ۱۰۳ حدیث ۵۶۸۶

(۳) مجمع الزوائد جلد ۷ ص ۶۷ کتاب التفسیر

(۴) قرآن مجید، سورہ طٰہٰ آیت ۱۳۲

(۵) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۲۵۱ مرویات مغیرہ

(یعنی ضرورت کے بغیر یہ کام کیا یا یہ ان چیزوں پر ہی اعتماد کیا ان کو سبب ماننے کی بجائے مسبب مانا ورنہ دم کرانا تعویذ باندھنا یا علاج کے لیے داغ وغیرہ حصولِ صحت کے اسباب ہیں ۱۲ ہزاروی)

ایک روایت میں ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق کے ذریعے آگ میں ڈالا گیا تو حضرت جبریل علیہ السلام نے (حاضر ہو کر) عرض کیا کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا (ہے تو سہی لیکن) آپ تک نہیں۔ آپ نے "حسبی اللہ نعم الوکیل" (مجھے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے) پر عمل کرتے ہوئے یہ بات ارشاد فرمائی آپ نے یہ کلمات اس وقت کہے تھے جب آپ کو پھینکنے کے لیے پکڑا گیا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَاِبْرَاهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰىٓ۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام وہ ہیں جنہوں نے اپنی بات کو پورا کیا۔ (۱)

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی ارشاد فرمایا اے داؤد علیہ السلام میرا جو بندہ میرے دامن سے وابستہ ہو جاتا ہے اور مخلوق پر بھروسہ نہیں کرتا پھر اگر آسمان و زمین اس سے کوئی مکر کریں تو میں اس کے لیے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہوں

آثار :

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے بچھو نے ڈس لیا میری ماں نے مجھے قسم دی کہ تم ضرور دم کراؤ گے تو میں نے دم کرنے والے کو دوسرا ہاتھ پکڑا دیا۔

حضرت خواص رحمہ اللہ نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِىْ لَا يَمُوْتُ۔ (۲) اور اس زندہ (ذات) پر بھروسہ کرو جس کے لیے موت نہیں

(یہ آیت پڑھنے کے بعد) فرمایا اس آیت کے بعد کسی بندے کے لیے مناسب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی پناہ لے۔

بعض علماء کو خواب میں کہا گیا کہ جس نے اللہ تعالیٰ پر یقین رکھا اس نے اپنی روزی جمع کر لی۔

بعض علماء نے فرمایا جو رزق تمہارے لیے مقدر ہے اس کے لیے فرض عمل سے منہ نہ پھیرو اس طرح آخرت کے امر کو ضائع کرو گے اور دنیا سے وہی ملے گا جو تمہارے لیے لکھ دیا گیا ہے حضرت یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا جب بندے کو طلب کے بغیر ملتا ہے تو یہ اس بات پر دلالت ہے کہ رزق کو حکم دیا گیا کہ وہ بندے کو تلاش کرے۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ایک تارکِ دنیا سے پوچھا کہ آپ کہاں سے کھاتے ہیں؟ اس نے کہا اس بات کا مجھے علم نہیں البتہ میرے رب سے پوچھو کہ وہ مجھے کہاں سے کھلاتا ہے۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ النجم آیت ۳۷

(۲) قرآن مجید، سورہ فرقان آیت ۵۸

حضرت ہرم بن حیان رحمہ اللہ نے حضرت اویس قرنی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ آپ مجھے کہاں رہنے کا مشورہ دیتے ہیں؟ انہوں نے شام کی طرف اشارہ کیا حضرت ہرم نے پوچھا معیشت کی کیا کیفیت ہو گی؟ حضرت اویس رحمہ اللہ نے فرمایا ان دلوں پر افسوس ہے ان میں تو شک ملا ہوا ہے ان کو وعظ کیا نفع دے گا۔

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ جب آدمی اللہ تعالیٰ کے کارساز ہونے پر راضی ہو جائے تو وہ ہر بھلائی کی طرف راستہ پالیتا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے حسن ادب کا سوال کرتے ہیں۔

فصل ۱:

حقیقت توحید جو توکل کی اصل ہے

جان لو! توکل ایمان کا ایک باب ہے اور ایمان کے تمام ابواب علم، حال اور عمل سے بنتے ہیں اسی طرح توکل بھی ان تینوں چیزوں سے منظم ہوتا ہے علم اصل ہے عمل نتیجہ ہے اور حال سے مراد توکل ہی ہے۔

تو ہم اصل یعنی علم کے بیان سے آغاز کرتے ہیں جس کو بنیادی طور پر ایمان کہا جاتا ہے کیوں کہ ایمان، تصدیق ہے اور ہر قلبی تصدیق علم ہے اور جب یہ مضبوط ہو جائے تو اسے یقین کہتے ہیں لیکن یقین کے دروازے بہت زیادہ ہیں اور ہم ان میں سے اس یقین کے محتاج ہیں جس کو توکل کی بنیاد بنا سکیں اور وہ توحید ہے جس کی ترجمانی " لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ " سے ہوتی ہے اور قدرت پر ایمان کی ترجمانی " لہ الملک " کے الفاظ سے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے جود و حکمت پر ایمان کی ترجمانی " ولہ الحمد " کہنے سے ہوتی ہے پس جو شخص پڑھے۔

" لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ، لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شیء قدیر۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کی بادشاہی ہے وہ تعریف کے لائق ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس کا ایمان مکمل ہو جاتا ہے جو توکل کی اصل ہے یعنی اس قول کا معنیٰ ایک وصف بن جاتا ہے جو اس کے دل کے لیے لازم اور اس پر غالب ہو جاتا ہے۔

توحید اصل ہے اور اس میں گفتگو طویل ہے اور یہ علم مکاشفہ سے ہے لیکن علوم مکاشفہ احوال کے واسطے سے اعمال سے متعلق ہوتے ہیں اور علم کی تکمیل کے لیے ضروری ہوتے ہیں اس لیے ہم صرف اسی قدر بیان کریں گے جس کا تعلق علم معاملہ سے ہے ورنہ توحید تو ایک وسیع سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں پس ہم کہتے ہیں۔

توحید کے مراتب:

توحید کے چار مراتب ہیں یعنی مغز، مغز کا مغز، چھلکا اور چھلکے کا چھلکا — ہم اس کو مثال سے بیان کریں گے تاکہ

کمزور ذہن سمجھ سکیں مثلاً اخروٹ کے اوپر دو چھلکے ہوتے ہیں اور اس کے اندر ایک مغز ہوتا ہے اور اس میں تیل ہوتا ہے جو مغز کا مغز ہے۔

پس پہلا مرتبۂ توحید یہ ہے کہ انسان اپنی زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہے اور اس کا دل اس سے غافل ہو اور منکر بھی جیسے منافقوں کی توحید۔

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس کا دل ان الفاظ کی تصدیق کرے جیسے عام مسلمان تصدیق کرتے ہیں یہ عوام کا اعتقاد ہے تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ کشف کے ذریعے نورِ حق کے واسطے سے مشاہدہ کرے اور یہ مقربین کا مقام ہے یعنی وہ اشیاء کو کثرت کے ساتھ (زیادہ) دیکھتا ہے لیکن ان سب کو ایک قہار ذات کی طرف سے سمجھتا ہے۔

چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ وہ صرف ایک وجود کو دیکھتا ہے اور یہ صدیقین کا مشاہدہ ہے اور صوفیاء کرام کی اصطلاح میں اس کو فنا فی التوحید کہتے ہیں کیوں وہ صرف ایک کو دیکھتا ہے وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھتا اور جب وہ توحید میں ڈوب جانے کی وجہ سے اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھتا تو توحید میں اپنے نفس سے فانی ہوگا یعنی وہ اپنے نفس اور مخلوق کو دیکھنے کے حوالے سے فانی ہے۔ تو پہلا شخص محض زبانی موحد ہے وہ دنیا میں (توحید کی وجہ سے) تلوار اور تیروں کی بوچھاڑ (قتل) سے بچ جاتا ہے دوسرا وہ موحد ہے جو دل سے الفاظ کے مفہوم کا اعتقاد رکھتا ہے اور دل سے اعتقاد کو جھٹلاتا نہیں اور یہ دل پر ایک گرہ ہے جو کھلتی نہیں لیکن اگر ایسا شخص اسی عقیدے پر مر جائے اور گناہوں کی وجہ سے اس کا عقیدہ کمزور نہ ہوا ہو تو وہ آخرت کے عذاب سے بچ جاتا ہے پھر اس گرہ کے کچھ حیلے ایسے ہیں جن کا مقصد اس کو ڈھیلا کرنا اور کھولنا ہوتا ہے اسے بدعت کہتے ہیں اور کچھ حیلے ایسے ہیں جن کا مقصد اس کو کھولنے اور کمزور کرنے والے حیلے کو دور کرنا ہے نیز ان کا مقصد اس گرہ کو دل پر مضبوط کرنا اور باندھنا ہے اس کو کلام کہتے ہیں اور اس بات کو جاننے والا متکلم کہلاتا ہے گویا متکلم، بدعتی کے مقابلے میں ہوتا ہے اور اس کا مقصد بدعتی کو عوام کے دلوں سے اس گرہ کو کھولنے سے روکنا ہے اور بعض اوقات متکلم کو موحد ہی کہتے ہیں کیوں کہ وہ اپنے کلام کے ذریعے لفظ توحید کے مفہوم کو عوام کے دلوں میں محفوظ کرتا ہے حتیٰ کہ یہ گرہ نہیں کھلتی۔

تیسرا وہ موحد ہے جو صرف ایک فاعل کو دیکھتا ہے جب اس کے لیے حق بعینہٖ منکشف ہوتا ہے اور حقیقت میں وہ ایک ہی فاعل کو دیکھتا ہے اور حقیقت بھی اس کے سامنے منکشف ہو چکی ہے وہ اپنے دل کو لفظ حقیقت کے مفہوم پر گرہ باندھنے کا مکلف نہیں بناتا کیوں کہ یہ تو عوام اور متکلمین کا درجہ ہے اس لیے کہ اعتقاد کے اعتبار سے عامی اور متکلم میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ فرق تو صرف اس بات میں ہے کہ متکلم ایسا کلام بنانے پر قادر ہے جس کے ذریعے بدعتی کے ان حیلوں کو دور کر سکے جو اس گرہ کو کھولتے ہیں۔

چوتھا وہ موحد ہے جس کے سامنے ایک ہی ذات ہے وہ سب چیزوں کو کثیر ہونے کے حوالے سے نہیں دیکھتا بلکہ وحدت کے اعتبار سے دیکھتا ہے اور توحید کی غرض و غایت بھی یہی ہے تو پہلا شخص اخروٹ کے اوپر والے چھلکے کی طرح ہے دوسرا

نچلے چھلکے کی مثل ہے تیسرا شخص اخروٹ کے مغز کی طرح ہے اور چوتھا اس تیل کی طرح ہے جو اس مغز سے نکالا جاتا ہے۔

اور جس طرح اخروٹ کے اوپر والے چھلکے میں کوئی بھلائی نہیں بلکہ اگر اسے کھایا جائے تو اس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے اور اگر اس کے اندر دیکھا جائے تو اچھا دکھائی نہیں دکھاتا اگر اس سے لکڑی کا کام لیا جائے تو آگ کو بجھا دیتا ہے اور دھواں زیادہ کرتا ہے اگر گھر میں رکھیں تو جگہ تنگ ہو جاتی ہے پس اس کا کام یہی ہے کہ کچھ عرصہ تک اسے اخروٹ کی حفاظت کے لیے اس کے اوپر ہی چھوڑا جائے پھر اس سے الگ کر کے پھینک دیا جائے اسی طرح محض زبانی توحید جس میں قلبی تصدیق شامل نہ ہو، کا کوئی فائدہ نہیں البتہ نقصان زیادہ ہوتا ہے اس کا ظاہر و باطن مذموم ہے لیکن اندر والے چھلکے کی حفاظت کے لیے مرتے دم تک اس سے نفع اٹھایا جاتا ہے اور اندر والا چھلکا دل اور بدن ہے اور منافق کی توحید اس کے بدن کو مجاہدین کی تلوار سے بچاتی ہے کیوں کہ ان کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ دلوں کو پھاڑ کر دیکھیں۔ اور تلوار بدن کے جسم تک پہنچتی ہے اور وہ چھلکا ہے اور موت کی وجہ سے یہ توحید ان کے بدن سے الگ ہو جاتی ہے اس لیے اس کے بعد توحید کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اور جس طرح اوپر والے چھلکے کی نسبت اندر والے چھلکے کا نفع ظاہر ہے کیوں کہ وہ مغز کی حفاظت کرتا ہے اور جب اخروٹ جمع کر کے رکھے جائیں تو یہ ان کو خراب ہونے سے بچاتا ہے اور جب الگ کیا جائے تو لکڑی کا فائدہ دیتا ہے لیکن مغز کے مقابلے میں اس کی قدر کم ہوتی ہے اسی طرح محض دل کا اعتقاد جس میں کشف شامل نہ ہو محض زبانی توحید کے مقابلے میں زیادہ نفع دیتی ہے لیکن کشف و مشاہدہ جو شرح صدر اور اس میں نورِ حق کے چمکنے سے حاصل ہوتا ہے کے مقابلے میں اس توحید کی قدر کم ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی سے یہی شرح صدر مراد ہے ارشاد خداوندی ہے۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔ (۱)

پس جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہے اس کے سینے کو اسلام کے لیے کشادہ کر دیتا ہے۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔ (۲)

تو کیا وہ شخص جس کے سینے کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے کھول دیا پس وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہے۔

تو جس طرح چھلکے کے مقابلے میں مغز نفیس ہوتا ہے اور وہی مقصود بالذات ہوتا ہے لیکن پھر بھی تیل نکالنے کی صورت میں گدلے پن سے محفوظ نہیں ہوتا اسی طرح توحید فعل (فاعل کو ایک جاننا) سالکین کے لیے ایک بلند مقصد ہے لیکن یہ غیر کے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ انعام آیت ۱۲۵

(۲) قرآن مجید سورۂ الزمر آیت ۲۲

ملاحظہ کی ملاوٹ سے خالی نہیں ہے اور جو شخص صرف ایک ذات حق کو ہی دیکھتا ہے اس کے مقابلے میں اس کی توجہ کثرت کی طرف ہے۔

سوال :-

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ہی کو دیکھے حالانکہ وہ آسمان ، زمین اور تمام محسوس جسموں کو دیکھتا ہے اور وہ بہت زیادہ ہیں تو کثیر کس طرح ایک ہو جائیں گے۔

جواب :

علوم مکاشفہ کی غایت یہی تو ہے اور اس علم کے اسرار کتاب میں نہیں لکھے جا سکتے عارفین نے فرمایا کہ ربوبیت کے رازوں کو فاش کرنا کفر ہے پھر یہ کہ یہ بات علم معاملہ سے متعلق بھی نہیں ہے ہاں یہ بات بتانا ممکن ہے کہ کثرت کو ایک دیکھنا عقل سے بعید ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہی چیز بعض اوقات مشاہدات اور اعتبار کی انواع کے اختلاف سے زیادہ ہو جاتی ہے اور کسی دوسری وجہ سے وہ ایک نظر آتی ہے جیسے انسان کی روح ، جسم ، اعضاء رگوں ، ہڈیوں اور آنتوں کا اعتبار کیا جائے تو اس میں کثرت ہے لیکن ایک دوسرے اعتبار اور مشاہدہ کے مطابق وہ ایک ہے۔ کیونکہ ہم کہتے ہیں یہ ایک انسان ہے تو انسان ہونے کے اعتبار سے وہ ایک ہے اور کئی لوگ ایسے ہیں جو ایک آدمی کو دیکھتے ہیں لیکن ان کے دل میں اس کی آنتوں ، رگوں ، اعضاء روح ، جسم اور اعضاء کی تفصیل نہیں آتی ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ یہ شخص حالت استغراق میں ہے اور استغراق ایک میں ہوتا ہے جس میں تفریق نہیں ہوتی گویا وہ جمع کو دیکھتا ہے اور جو کثرت کو دیکھتا ہے اس کے سامنے تفریق ہوتی ہے۔

اسی طرح خالق اور مخلوق جو بھی موجود ہے اس کے کئی اعتبارات اور مشاہدات ہیں جو مختلف ہیں وہ ایک اعتبار سے ایک ہے اور دوسرے کثیر ہے اور ان میں سے بعض دوسرے بعض کی نسبت زیادہ سخت ہیں اس کی مثال انسان ہے اگرچہ یہ غرض کے مطابق تو نہیں لیکن اس سے اس بات سے آگاہی ہو جاتی ہے کہ کثیر ، مشاہدے میں ایک کیسے ہوتا ہے۔

اس کلام سے واضح ہوتا ہے کہ انسان کی سمجھ جس مقام تک نہ پہنچ سکے اس کا انکار نہ کرے بلکہ اس پر تصدیق کے ساتھ ایمان لائے اس طرح توحید پر ایمان لانے کے اعتبار سے حصہ ملے گا اگرچہ جس بات پر ایمان لایا ہے وہ اس کی صفت نہیں ہے جیسے آدمی نبوت پر ایمان لاتا ہے حالانکہ وہ نبی نہیں ہے لیکن جس قدر ایمان ہوگا اس قدر حصہ ملے گا۔

اور یہ مشاہدہ جس میں صرف واحد حق ظاہر ہوتا ہے کبھی دائمی ہوتا ہے اور کبھی بجلی کی چمک کی طرح اچانک آتا ہے اور عام طور پر اسی طرح ہوتا ہے اور بہت نادر ہے حسین بن منصور حلاج نے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے جب انہوں نے حضرت خواص رحمہ اللہ کو دیکھا کہ وہ عام طور پر سفر میں رہتے ہیں تو پوچھا آپ کیا کرتے پھرتے ہیں انہوں نے فرمایا سفروں میں رہتا ہوں تاکہ توکل میں اپنی حالت کو صحیح کرسکوں اور وہ متوکل لوگوں میں سے تھے تو حسین بن منصور نے فرمایا تم نے اپنے باطن کی

تعمیر میں زندگی خرچ کر دی تو فنا فی التوحید کہاں ہے؟ تو گویا حضرت خواص رحمہ اللہ توحید میں تیسرے مقام کو صحیح کرنے میں لگے ہوئے تھے تو انہوں نے ان سے چوتھے مقام کا مطالبہ کیا ——— تو اجمالی طور پر توحید والوں کے مقامات اس طرح ہیں۔

سوال :-

اس بات کی اس قدر شرح ضروری ہے جس سے اس پر توکل کی بنیاد رکھنے کی کیفیت سمجھ آجائے۔

جواب :-

جہاں تک چوتھے مقام کا تعلق ہے تو اس کے بیان میں غور و خوض کرنا جائز نہیں اور نہ ہی وہ کل کی بنیاد ہے بلکہ توکل، توحید کے تیسرے مرتبے سے حاصل ہوتا ہے پہلا مقام تو واضح منافقت ہے۔

جہاں تک دوسرے مقام کا تعلق ہے اور وہی عقیدہ ہے جو عام مسلمانوں میں موجود ہے اور اس کو کلام کے ذریعے موکد کرتے اور بدعتی لوگوں کے حیلوں کو دُور کرنے کا طریقہ علم کلام میں مذکور ہے ہم نے اسے حسب ضرورت اعتقاد کے بیان میں ذکر کیا ہے۔

اور تیسرا مرتبہ وہ ہے جس پر توکل کی بنیاد رکھی جاتی ہے کیوں کہ محض اعتقادی توحید توکل کی حالت پیدا نہیں کرتی پس ہم اس سے اس قدر ذکر کرتے ہیں جس کے ساتھ توکل مربوط ہو تفصیلی ذکر جو اس قسم کی کتابیں برداشت نہیں کرسکتیں، نہیں کریں گے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ تمہارے لیے یہ بات منکشف ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی فاعل (حقیقی) نہیں ہے اور جو کچھ موجود ہے وہ مخلوق ہے، رزق، عطاء، منع، زندگی، موت، مالداری، فقر وغیرہ جس کا کوئی بھی نام ہو سکتا ہے تو اس کو پیدا کرنے والی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں جب تمہارے سامنے یہ بات منکشف ہو جائے گی تو تم اس کے غیر کی طرف نہیں دیکھو گے۔ بلکہ اسی سے ڈرو گے اسی سے امید رکھو گے اسی پر تمہارا اعتماد ہوگا اور اسی پر بھروسہ کرو گے کیوں کہ صرف وہی فاعل ہے دوسرا کوئی نہیں، دوسرے تمام مسخر ہیں وہ آسمانوں اور زمین کی حکومت میں سے ایک ذریعے کو بھی ذاتی طور پر اور بالاستقلال حرکت نہیں دے سکتے۔

پس جب تمہارے لیے مکاشفہ کے دروازے کھل جائیں تو یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی جو ظاہری مشاہدہ سے زیادہ مکمل ہوگی۔

شیطان تمہیں اس توحید سے دور کرکے ایسے مقام کی طرف لے جانا چاہتا ہے جہاں تمہارے دل میں شرک کا شائبہ پیدا ہو جائے اور اس کے دو سبب ہیں ایک حیوانات کے اختیار کی طرف توجہ اور دوسرا جمادات کی طرف توجہ۔

جمادات کی طرف توجہ کی مثال یہ ہے کہ مثلاً تم کھیتی کے پیدا ہونے اور بڑھنے کے سلسلے میں بارش پر اعتماد کرتے ہو بارش کے لیے بادلوں پر، بادلوں کے جمع ہونے کے سلسلے میں ٹھنڈک پر اعتماد کرتے ہو کشتی کے چلنے اور ٹھہرنے کے سلسلے میں ہوا پر اعتماد کرتے ہو اور یہ سب باتیں توحید میں شرک اور حقائق امور سے جہالت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

فَاِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ۔ (۱)

اور جب وہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اس کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے پس جب اللہ تعالیٰ ان کو بچا کر خشکی پر لے جاتا ہے تو اسی وقت شرک کرنے لگتے ہیں

مطلب یہ ہے کہ کہتے ہیں اگر ہوا برابر نہ ہوتی تو ہم نجات نہ پاتے اور جس شخص پر اس جہاں کا معاملہ حقیقتاً منکشف ہو جائے وہ جان لیتا ہے کہ ریح تو ہوا ہے اور ہوا خود بخود حرکت نہیں کرتی جب تک کوئی محرک اسے حرکت نہ دے اسی طرح اس کا محرک کسی دوسرے محرک کا محتاج ہے یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس پہلے محرک تک پہنچتا ہے جس کو کوئی حرکت دینے والا نہیں ۔اور نہ ہی خود ذاتی طور پر حرکت کرتا ہے (وہ اللہ تعالیٰ ہے)

تو بندے کا ہوا کی طرف متوجہ ہونا اسی طرح ہے کہ ایک شخص کو اس لیے پکڑا جائے کہ اس کی گردن کاٹ دی جائے لیکن بادشاہ اس کی معافی کا پروانہ لکھ دے اب وہ شخص روشنائی کاغذ اور قلم جس کے ساتھ تحریر لکھی گئی کی طرف متوجہ ہو جائے اور یوں کہے کہ اگر قلم نہ ہوتا تو مجھے نجات نہ ملتی

وہ قلم کو نجات دہندہ خیال کرے اور قلم کو حرکت دینے والے کو نظر انداز کر دے اور یہ انتہائی جہالت ہے اور جو شخص اس بات کو جانتا ہے کہ قلم ذاتی طور پر کچھ نہیں کر سکتا وہ تو لکھنے والے کے ہاتھ میں قابو ہے تو وہ شخص قلم کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، وہ صرف لکھنے والے کا شکریہ ادا کرتا ہے ۔بلکہ بعض اوقات نجات کی خوشی سے اس قدر مدہوش ہو جاتا ہے کہ وہ بادشاہ اور لکھنے والے کا شکر ادا کرتا ہے اور اس کے دل میں قلم روشنائی اور دوات، کا خیال تک نہیں آتا ہے ۔

سورج ،چاند، ستارے، بارش، بادل، زمین اور تمام حیوانات و جمادات قبضۂ قدرت میں ہیں جس طرح قلم کاتب کے کنٹرول میں ہے بلکہ یہ تو انسانوں کے لیے مثال ہے جن کا خیال ہے کہ بادشاہ ہی کاتب پروانہ ہے اور حق تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کاتب ہے وہ ارشاد فرماتا ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (۱)

اور جب آپ نے کنکریاں پھینکیں تو وہ آپ نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکیں ۔

جب تمہارے لیے یہ بات منکشف ہو جائے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس طریقے پر مسخر ہے تو شیطان تم سے امداد ہونا امید ہو کر واپس ہو جائے گا کہ اب وہ تمہارے عقیدۂ توحید میں شرک کی آمیزش نہیں کر سکتا تو اب وہ تمہیں دوسری طرح ہلاک کرنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اختیاری کاموں میں حیوانات کے اختیار کی طرف متوجہ کرتا ہے وہ کہتا ہے تم

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ عنکبوت آیت ۶۵

(۲) قرآن مجید، سورۂ انفال آیت ۱۷

ان سب کاموں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسے دیکھتے ہو حالانکہ یہ شخص تمہیں اپنے اختیار سے رزق دیتا ہے اگر وہ چاہے تو تمہیں دے اور چاہے تو روک دے اور یہی آدمی اپنی تلوار سے تمہاری گردن کاٹتا ہے اور وہ اس پر قادر بھی ہے اور اگر چاہے تو تمہیں معاف کر دے تو کس طرح اس سے نہیں ڈرتا اور کس طرح تو اس سے امید نہیں رکھتا حالانکہ تیرا معاملہ اس کے کنٹرول میں ہے اور تو اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے تجھے اس میں شک نہیں وہ یہ بھی کہتا ہے ہاں اگر تمہاری نظر میں قلم نے یہ کام نہیں کیا تو کاتب کو کیوں مانتا ہے وہ بھی تو اس کام کے لیے مسخر ہے۔

اس وقت اکثر لوگوں کے قدم پھسلتے ہیں البتہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندے محفوظ رہتے ہیں شیطان لعین کو ان پر کوئی قدرت اور تسلط حاصل نہیں ہوتا وہ بصیرت کے نور سے دیکھتے ہیں کہ کاتب مسخر اور مجبور ہے جس طرح تمام کمزور لوگ دیکھتے ہیں کہ قلم مسخر ہے اور ان کو معلوم ہے کہ اس سلسلے میں کمزور لوگوں کو اسی طرح مغالطہ لگتا ہے جیسے کوئی چیونٹی کاغذ پر چلے اور اسے قلم کا سرا نظر آئے جو کاغذ کو سیاہ کر رہا ہے اور اس کی نگاہ ہاتھوں اور انگلیوں تک نہ جائے لکھنے والے تک جانا تو دور کی بات ہے تو اس چیونٹی کو بھی مغالطہ ہوتا ہے وہ خیال کرتی ہے کہ قلم ہی سفید جگہ کو سیاہ کر رہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس چیونٹی کی بینائی میں کوتاہی ہے اور اس کی آنکھ کی پتلی تنگ ہونے کی وجہ سے اس کی نظر قلم کے سرے سے تجاوز نہیں کرتی۔

پس اسی طرح جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ کے نور سے اسلام کے لیے نہ کھلا ہو اس کی بصیرت بھی آسمانوں اور زمین کے جبار کو دیکھنے سے کوتاہ ہوتی ہے اور اس بات کا مشاہدہ بھی نہیں کر سکتی کہ وہ سب پر قاہر و غالب ہے پس اس کی نگاہ راستے میں ہی کاتب پر رک جاتی ہے اور یہ محض جہالت ہے۔

بلکہ ارباب قلوب و مشاہدات کے حق میں اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کے ہر ذرے کی زبان کو جاری کر دیتا ہے اور اس میں وہی قدرت کارگر ہوتی ہے جس کے ساتھ ہر چیز بولتی ہے حتیٰ کہ یہ لوگ ان تمام ذرات سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس سنتے ہیں نیز وہ تمام اشیاء اپنی عاجزی کی شہادت ایسی زبان کے ساتھ دیتی ہیں جو تیز ہے وہ حروف اور آواز کے بغیر گفتگو کرتے ہیں اور اس گفتگو کو وہ لوگ نہیں سن سکتے جو سننے سے کنارہ کش ہیں اور اس سے ہماری مراد ظاہری سماعت نہیں جو آوازوں سے آگے نہیں بڑھ سکتی کیوں کہ اس میں تو گدھا بھی شریک ہے اور جس کام میں جانور بھی شریک ہوں وہ قابل قدر نہیں ہوتا ہماری مراد وہ سماعت ہے جس کے ذریعے اس کلام کا ادراک ہو جاتا ہے جو حرف اور آواز کے بغیر ہے۔ اور وہ عربی اور عجمی نہیں ہے۔

سوال:

یہ تو ایک عجیب بات ہے جسے عقل قبول نہیں کرتی ہمیں ان کے بولنے کا طریقہ بتائیں وہ کس طرح بولتی ہیں اور کیا کہتی ہیں تسبیح و تقدیس کس طرح کرتی ہیں۔ اور اپنے نفس کی عاجزی پر گواہی کس طرح دیتی ہیں۔

جواب:

جان لو کہ آسمانوں اور زمین کے ہر ذرے کے لیے ارباب قلوب کے ساتھ پوشیدہ گفتگو ہوتی ہے اور اس کی کوئی حد اور

انتہا نہیں کیوں کہ یہ کلمات کلام الٰہی کے بحر بے کنار سے مدد حاصل کرتا ہیں ارشاد خداوندی ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا۔ (۱)

آپ فرما دیجئے اگر سمندر میرے رب کے کلمات (کو لکھنے) کے لیے سیاہی ہوں تو سمندر کی سیاہی ختم ہو جائے گی لیکن میرے رب کے کلمات ختم نہیں ہوں گے اگرچہ ہم اس کی مدد کے لیے اس کی مثل (سیاہی) لائیں۔

پھر یہ سب ذرات مُلک و ملکوت کے اسرار بیان کرتے ہیں اور رازوں کا افشا بری بات ہے بلکہ آزاد لوگوں کے سینے اسرار کی قبریں ہیں اور تم نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا کہ کوئی شخص بادشاہ کے رازوں کا امین ہو اور اس سے خفیہ باتیں کہی جائیں تو وہ لوگوں کے سامنے بیان کر دے اگر ہمارے لیے رازوں کو ظاہر کرنا جائز ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات نہ فرماتے۔

لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا۔ (۲)

اگر تم ان باتوں کو جانتے جن کا مجھے علم ہے تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ۔

بلکہ حضور علیہ السلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بیان کرتے تاکہ وہ روئیں اور ہنسنے سے باز رہیں اور آپ تقدیر کا راز فاش کرنے سے منع نہ کرتے (۳)

اور آپ یہ بات بھی نہ فرماتے۔

إِذَا ذُكِرَ النُّجُوْمُ فَأَمْسِكُوْا وَإِذَا ذُكِرَ الْقَدَرُ فَأَمْسِكُوْا وَإِذَا ذُكِرَ أَصْحَابِيْ فَأَمْسِكُوْا۔ (۴)

جب ستاروں کا ذکر ہو تو خاموش رہو اور جب تقدیر کا ذکر ہو تو خاموش رہو اور جب میرے صحابہ کرام کا ذکر ہو تو خاموش رہو۔

اور آپ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بعض اسرار کے ساتھ خاص نہ فرماتے (۵)

تو ملک و ملکوت کے ذرات جو کچھ اربابِ مشاہدات کے دلوں سے مناجات کرتے ہیں ان کو بیان کرنے سے دو باتیں مانع ہیں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ کہف آیت ۱۰۹

(۲) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۶۶۵، کتاب التفسیر

(۳) حلیۃ الاولیاء جلد ۶ ص ۱۸۲ ترجمہ ۳۵۸

(۴) التمہید لابن عبدالبر جلد ۶ ص ۶۸

(۵)

ایک یہ کہ راز فاش کرنا محال ہے اور دوسری بات یہ کہ ان ذرات کے کلمات گنتی اور شمار سے باہر ہیں لیکن جو مثال ہم نے پہلے ذکر کی ہے اور وہ قلم کی حرکت ہے اس کی گفتگو کا کچھ تذکرہ کر دیتے ہیں تاکہ اس سے اجمالی طور پر معلوم ہو جائے کہ کس طرح یہ تو کل کی بنیاد بنتی ہے اور یہ کلمات اگرچہ حروف و آواز سے متعلق نہیں لیکن ہم سمجھانے کی ضرورت کے تحت ان کو حروف اور آواز کی طرف لوٹا دیتے ہیں پس ہم کہتے ہیں۔

ایک شخص جو نورِ الٰہی کی مشعل سے کاغذ کو دیکھتا تھا اس نے دیکھا کہ سیاہی سے اس کا چہرہ سیاہ ہو گیا تو پوچھا تیرے چہرے کو کیا ہوا یہ تو سفید چمک دار تھا اور اب اس پر سیاہی ظاہر ہو گئی ہے تو نے اپنے چہرے کو سیاہ کیوں کر دیا۔ اس کا کیا سبب ہے؟ کاغذ نے کہا تو نے اس گفتگو میں مجھ سے انصاف نہیں کیا میں نے خود اپنے چہرے کو سیاہ نہیں کیا سیاہی سے پوچھو وہ دوات میں جمع تھی جو اس کا ٹھکانہ اور وطن ہے پس اس نے وطن سے سفر اختیار کیا اور ظلم کرتے ہوئے میرے صحن میں اتر آئی اس نے کہا تو نے سچ کہا۔

پھر اس نے سیاہی سے پوچھا تو اس نے بھی یہی جواب دیا کہ تو نے مجھ سے انصاف نہیں کیا میں تو دوات میں چپ چاپ بیٹھی تھی اور میں نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ اس سے نہیں نکلوں گی تو قلم نے اپنے فاسد طمع کے ساتھ مجھ پر زیادتی کر کے مجھے بے وطن کر دیا مجھے تتر بتر کر کے سفید کاغذ پر پھیلا دیا تو سوال قلم سے کرنا چاہیے مجھ سے کیوں کر سوال کرتے ہو اس نے کہا تم نے ٹھیک کہا ہے۔

پھر قلم سے اس کے ظلم اور زیادتی کے بارے میں پوچھا اور یہ کہ تم نے سیاہی کو کیوں بے وطن کر دیا اس نے کہا ہاتھ اور انگلیوں سے پوچھو میں تو دریا کے کنارے ایک کانے (نرسل) کی صورت میں کھڑی تھی اور سرسبز درختوں کے درمیان خوش و خرم تھی پھر ہاتھ چھری لے کر آیا اور میرا چھلکا اتارنے لگا اس نے میرا لباس پھاڑ دیا اور مجھے جڑ سے کاٹ کر میرے پورے جدا کیے پھر تراشا اور کاٹ لگا کر روشنائی کی سیاہی اور کڑواہٹ میں غوطہ دیا وہی (ہاتھ) مجھ سے خدمت لیتا اور سر کے بل چلاتا ہے تم نے سوال کر کے میرے زخموں پر نمک چھڑکا اور مجھ پر عتاب کیا تم مجھے چھوڑو اور اس سے پوچھو جس نے مجھ پر ظلم کیا اس نے کہا تم نے سچ کہا۔

پھر ہاتھ سے پوچھا کہ تم نے قلم پر ظلم و زیادتی کیوں کی اور اس سے خدمت کیوں لی؟ اس نے کہا میں گوشت، ہڈی اور خون کا مجموعہ ہوں کیا تم نے گوشت کو ظلم کرتے ہوئے دیکھا ہے یا کوئی جسم اپنے آپ حرکت کرتے دیکھا ہے میں تو ایک سواری ہوں جسے مسخر کیا گیا مجھ پر ایک سوار ہے جسے قدرت اور غلبہ کہا جاتا ہے وہی مجھے تمام روئے زمین میں دوڑاتا پھرتا ہے لیکن تم نے دیکھا ہے کہ ڈھیلے، پتھر اور درخت اپنی جگہ سے خود بخود حرکت نہیں کرتے کیوں کہ ان پر اس قسم کا مضبوط اور غالب سوار، سواری نہیں کر رہا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میرے ہاتھ گوشت، ہڈی اور خون کی صورت میں مردوں کے ہاتھوں کے برابر ہیں لیکن ان کے ہاتھوں اور قلم کے درمیان کوئی معاملہ نہیں تو میرے اور قلم کے درمیان بھی کوئی معاملہ نہیں پس تم اس معاملے میں قدرت سے سوال کرو

میں تو سواری ہوں میرا سوار مجھے حرکت دیتا ہے۔ اس نے کہا تو نے ٹھیک کہا ہے۔

پھر اس نے قدرت سے پوچھا کہ وہ ہاتھ کو کیوں استعمال کرتی ہے اور اس سے کیوں زیادہ خدمت لیتی ہے اس نے کہا مجھے ملامت نہ کرو بہت سے ملامت کرنے والوں پر خود ملامت ہوتی ہے اور کئی ایسے ہیں جن کو ملامت کیا جاتا ہے لیکن وہ بے گناہ ہوتے ہیں اور تم پر میرا معاملہ کس طرح پوشیدہ رہ گیا اور تم نے کیسے گمان کر لیا کہ میں نے ہاتھ پر سوار ہو کر اس پر ظلم کیا ہے میں تو اس کو حرکت دینے سے پہلے بھی اس پر سوار تھی۔ میں تو اس کو حرکت نہیں دیتی تھی اور نہ ہی اسے مسخر کرتی تھی بلکہ میں سوئی ہوئی اور خاموش تھی حتیٰ کہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ میں مردہ ہوں یا بالکل معدوم ہوں کیونکہ میں نہ تو حرکت کرتی تھی اور نہ کسی کو حرکت دیتی تھی حتیٰ کہ ایک موکل آیا اور اس نے مجھے حرکت دی اور جھنجھوڑا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اب میں اس کی موافقت تو کر سکتی تھی لیکن اس کی مخالفت میرے بس میں نہ تھی۔ اس موکل کو ارادہ کہتے ہیں میں تو اس کا نام ہی جانتی ہوں یا مجھے اس قدر معلوم ہے کہ اس نے یکبارگی چڑھائی کر کے مجھے گہری نیند سے جگا دیا اور مجھ سے بزور وہ کام لیا کہ اگر میری رائے کوئی پوچھتا تو مجھے گنجائش تھی کہ میں اسے نہ کرتی۔ اس نے کہا تو نے ٹھیک کہا ہے۔

پھر اس نے ارادے سے پوچھا کہ یہ قدرت جو خاموش مطمئن بیٹھی تھی اس پر تجھے کیسے جرأت ہوئی کہ تو نے اس کو حرکت دینے میں لگا دیا اور اس قدر زبردستی کی کہ وہ مخالفت نہ کر سکی تو ارادے نے جواب دیا مجھ پر جلدی نہ کرو شاید میں بھی معذور تھا اور تم مجھے ملامت کر رہے ہو میں خود نہیں اٹھا مجھے اٹھایا گیا اور سخت حکم کے تحت مجھے بھیجا گیا اس سے پہلے تو میں خاموش تھا لیکن حضرتِ دل کی بارگاہ سے علم کا قاصد عقل کی زبانی میرے پاس آیا اور یہ پیغام لایا کہ قدرت کو اٹھا دو تو میں نے مجبوراً اسے اٹھایا میں تو مسکین ہوں اور علم و عقل کی قدرت کے تحت مسخر ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ مجھ سے کونسا جرم کروایا جائے گا اور کس کے لیے مجھے مسخر کیا گیا۔ اور اس کا حکم ماننا مجھ پر لازم ہوا۔ اتنی بات ضرور جانتا ہوں کہ میں بالکل پرسکون تھا جب تک یہ زبردستی کرنے والا نہیں آیا تھا یہی میرا حاکم ہے وہ عادل ہے یا ظالم میں اس کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوں اور اس کی اطاعت کو لازم سمجھتا ہوں بلکہ جب یہ قطعی حکم دے دیتا ہے تو مجھے مخالفت کی تاب نہیں رہتی مجھے اپنی جان کی قسم جب تک وہ خود اپنے دل میں تردد اور حکم میں حیران رہتا ہے تو میں خاموش رہتا ہوں لیکن اس کے حکم کا منتظر رہتا ہوں اور چوکنا بھی، پھر جب اس کا حکم قطعی اور یقینی ہوتا ہے تو میں اپنی طبیعت کے مطابق اور اس کی اطاعت کے غلبہ کے تحت مجبور ہو جاتا ہوں اور قدرت کو اٹھاتا ہوں کہ وہ اس کے حکم کے مطابق عمل کرے تو میرے معاملے میں علم سے پوچھو مجھے نہ جھڑکو، میں تو کسی شاعر کے اس قول کا مصداق ہوں۔

مَتیٰ تَرَحَّلْتُ عَنْ قَوْمٍ وَقَدْ قَدَرُوْا اَنْ — جب میں ایک قوم سے کوچ کر جاتا ہوں اور انہوں نے فرض

لَا نُفَارِقَهُمْ فَالرَّاحِلُوْنَ هُمْ۔ — کیا تھا کہ ہم ان سے جدا نہیں ہوں گے تو جدا ہونے والے وہ ہیں۔

اس نے کہا تم نے سچ کہا ہے۔

پھر وہ علم، عقل اور دل کی طرف متوجہ ہوا اور ان کو اس بات پر جھڑکا کہ انہوں نے ارادے کو کیوں برانگیختہ کیا اور قدرت کو حرکت دینے پر کیوں مجبور کیا۔ تو عقل نے جواب دیا میں تو ایک چراغ ہوں میں خود بخود نہیں جلتی مجھے روشن کیا جاتا ہے۔ دل نے کہا میں تو ایک تختی ہوں میں خود بخود نہیں پھیلتا بلکہ مجھے پھیلایا جاتا ہے، علم نے جواب دیا میں تو ایک نقش ہوں جو دل کی سفید تختی پر اس وقت نقش کیا جاتا ہے جب عقل کا چراغ روشن ہوتا ہے میں خود بخود منتقل نہیں ہوتا دل کی یہ تختی کتنا عرصہ مجھ سے خالی رہی پس جس قلم نے مجھے نقش کیا اس سے پوچھو کیوں کہ لکھائی تو قلم سے ہی ہوتی ہے۔

اس وقت سائل عاجز ہو جاتا ہے اور جواب پر قناعت نہ کرتے ہوئے کہتا ہے اس راستے میں میری تھکاوٹ بہت زیادہ ہو گئی ہے اور میں نے بہت منزلیں طے کی ہیں اور مجھے جس سے توقع ہوتی کہ وہ بتائے گا اس نے مجھے دوسروں کے حوالے کر دیا لیکن کثرت سے پھرنے کی صورت میں بھی میں خوش ہوا کیونکہ ہر ایک سے ایسا کلام سنا جسے میرے دل نے قبول کیا اور سوال کو دور کرنے میں اس نے واضح عذر پیش کیا اب اے علم! تمہارا یہ کہنا کہ میں ایک نقش اور خط ہوں اور مجھے قلم نے لکھا ہے یہ بات مجھے سمجھ نہیں آتی مجھے تو ایک ہی قلم کا علم ہے جو کانے (نڑ) سے بنتی ہے اور تختی جو لوہے یا لکڑی کی ہوتی ہے اور خط روشنائی سے ہوتا ہے اور چراغ آگ سے روشن کیا جاتا ہے اور میں نے اس منزل میں تختی، چراغ، خط اور قلم کی بات سنی لیکن میں نے ان میں سے کسی کو دیکھا نہیں تعجب کی بات ہے کہ میں چکی کی آواز سنتا ہوں لیکن چکی نظر نہیں آتی تو علم نے اسے جواب دیا اگر تم اپنی بات میں سچے ہو تو تمہارے پاس سرمایہ کم ہے اور تمہاری سواری کمزور ہے اور جان لو کہ تم جس راستے پر جا رہے ہو اس میں ہلاکتیں زیادہ ہیں پس تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم یہ خیال چھوڑ دو اور واپس جاؤ تم اس میدان کے مرد نہیں ہو لہٰذا یہاں سے ہٹ جاؤ جس کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا وہ کام اس کے لیے آسان کر دیا گیا۔

اگر تم مقصد کی طرف راستے کی تکمیل میں رغبت رکھتے ہو تو کان دھرو اس حال میں کہ تم گواہ ہو اور جان لو کہ تمہارے راستے میں تین عالم ہیں۔

پہلا عالم، عالم الملک والشہادۃ ہے اور کاغذ، سیاہی، قلم اور ہاتھ کا اسی عالم سے تعلق ہے اور ان منازل کو سہولت سے طے کیا جا سکتا ہے دوسرا عالم ملکوت ہے اور وہ میرے بعد ہے جب تم مجھ سے تجاوز کر جاؤ گے تو اس کی منزل تک پہنچ جاؤ گے اس کے راستے میں لمبے چوڑے جنگل، وسیع میدان، بلند پہاڑ اور غرق کرنے والے سمندر ہیں اور مجھے معلوم نہیں تم کس طرح اس میں سلامت رہو گے۔

اور تیسرا عالم، عالم جبروت ہے اور وہ عالم ملک اور عالم ملکوت کے درمیان ہے تم نے اس کی تین منزلیں پہلے طے کر لی ہیں یعنی قدرت، ارادے اور علم کی منازل۔ اور یہ ملک وشہادت اور ملکوت کے درمیان واسطہ ہے کیوں کہ عالم ملک کا راستہ آسان ہے اور عالم ملکوت کا راستہ دشوار گذار ہے۔

جب کہ عالم جبروت جو عالم ملک اور عالم ملکوت کے درمیان ہے وہ اس کشتی کی طرح ہے جو پانی اور زمین کے درمیان

مرکت کرتی ہے اب نہ تو وہ پانی کے اضطراب کی حدیں ہے اور نہ ہی زمین کے سکون اور ٹھہراؤ کی حد میں، اور جو شخص زمین پر چلتا ہے وہ ملک و شہادت کے عالم میں چلتا ہے اگر اس کی قوت تجاوز کرے اور کشتی پر سوار ہو سکے تو وہ اس طرح ہے کہ جیسے عالم جبروت میں چلتا ہے اگر کشتی کے بغیر پانی پر چلنے کی طاقت نہیں رکھتے تو واپس ہو جاؤ تم زمین سے آگے بڑھ گئے لیکن کشتی سے پیچھے رہ گئے اور اب تمہارے سامنے صاف پانی باقی رہ گیا اور عالم ملکوت کا پہلا مشاہدہ وہ قلم ہے جس کے ساتھ دل کی تختی پر علم نقش کیا جاتا ہے اور اس یقین کا حاصل ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ پانی پر چلتا ہے۔ کیا تم نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نہیں سنا۔

آپ نے فرمایا۔

لَوِ ازْدَادَ يَقِيناً لَمَشٰى عَلَى الْهَوَاءِ۔ (۱) اگر وہ یقین میں بڑھ جاتے تو ہوا پر چلتے۔

آپ نے یہ بات اس وقت فرمائی جب آپ سے عرض کیا گیا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام پانی پر چلتے تھے۔

سوال کرنے والے سالک نے کہا میں اپنے معاملے میں حیران ہوں اور میرے دل میں اس بات سے خوف پیدا ہوا جو تم نے راستے کا خطرہ بیان کیا ہے اور مجھے معلوم نہیں جو کچھ تم نے خوفناک راستے کا ذکر کیا ہے میں اس کو طے کرنے کی طاقت رکھتا ہوں یا نہیں تو کیا اس کی کوئی علامت ہے؟

علم نے کہا ہاں اپنی آنکھیں کھولو دونوں آنکھوں کی روشنی کو جمع کر کے میری طرف دیکھو اگر تمہارے سامنے وہ قلم آجائے جس کے ساتھ مجھے دل کی تختی پر لکھا جاتا ہے تو تم اس راستے کے اہل ہونے کے لائق ہے کیوں کہ جو آدمی عالم جبروت سے آگے بڑھ جائے اور ملکوت کے دروازوں کو کھٹکھٹائے اس پر قلم منکشف ہو جاتا ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی مرتبہ ہی قلم واضح کر دیا گیا جب آپ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ۔ (۲) پڑھیے اور آپ کا رب زیادہ عزت والا ہے وہ جس نے قلم کے ذریعے سکھایا انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

سالک نے کہا تم نے تو میری آنکھ کھول دی اللہ تعالیٰ کی قسم میں بانس اور لکڑی کو نہیں دیکھتا اور نہ قلم کو جانتا ہوں مگر اس طرح (جس طرح تم نے بیان کیا)

علم نے کہا تم اپنے مقصود سے دور ہو گئے کیا تم نے نہیں سنا کہ گھر کا سامان صاحب خانہ جیسا ہوتا ہے کیوں کہ تم نہیں

---

(۱) الفردوس بماثور الخطاب جلد ۳ ص ۳۷۰ حدیث ۵۱۲۲

(۲) قرآن مجید، سورۃ العلق آیت ۳، ۴، ۵

جاننے کہ کوئی بھی ذات اللہ تعالیٰ کی ذات کے مشابہ نہیں ہے اسی طرح اس کا ہاتھ (دست قدرت) دوسرے ہاتھوں، اس کا قلم دوسرے قلموں، اس کا کلام دوسرے کلاموں، اس کا خط دوسری تحریروں کی طرح نہیں ہے یہ امور الٰہیہ ہیں جن کا تعلق عالم ملکوت سے ہے اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں جسم نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی مکان میں ہے جب کہ دوسروں (مخلوقات) کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ اس کا ہاتھ گوشت، ہڈی اور خون کا نہیں ہے جب کہ دوسرے ہاتھ ان چیزوں سے بنے ہوئے ہیں اس کا قلم بانس (کا نے) کا نہیں نہ اس کی تختی لکڑی کی ہے اس کا کلام آواز اور حروف سے مرکب نہیں اس کی تحریر نقوش نہیں نہ اس کی روشنائی پھٹکری اور مازو ہے (مازو ایک رنگ ہے جو روشنائی میں ڈالا جاتا ہے) اگر تم ان تمام چیزوں کو اس طرح نہیں دیکھتے تو میں تمہیں ہیجڑا سمجھتا ہوں جو پاکیزگی کی مردانگی اور تشبیہ کی تانیث کے درمیان ہے دونوں کے درمیان ڈانواں ڈول ہے نہ ادھر کا نہ اُدھر کا۔ پس تو کس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو جسموں اور ان کی صفات سے پاک قرار دے اور اس کے کلام کو حروف اور آوازوں سے پاک ہو گئے۔ تم نے اس کے ہاتھ، قلم، تختی اور خط میں غور و فکر کرنا شروع کر دیا اگر تم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی۔

اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی (یا ان کی) صورت پر پیدا فرمایا۔ (۱)

(اس حدیث) سے ظاہر صورت سمجھے ہو جس کا ادراک آنکھ سے ہوتا ہے تو تم مطلقاً تشبیہ والوں میں ہو گئے جیسے کہا جاتا "محض یہودی بن جا ورنہ تورات کے ساتھ نہ کھیل" اور اگر اس سے باطنی صورت سمجھے ہو بصیرتوں کے ساتھ جس کا ادراک ہوتا ہے آنکھوں کے ساتھ نہیں تو محض اس کی پاکیزگی بیان کرنے والے بن جاؤ اور راستے کو لپیٹ دو کیوں کہ تم مقدس وادی تک پہنچ چکے ہو اور اپنے دل کی گہرائی کے ساتھ اس بات کو سنو جو وحی کی جاتی ہے شاید تمہیں آگ کی طرف راہنمائی مل جائے اور شاید تمہیں عرش کے پردوں کے پیچھے سے آواز دی جائے۔ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آواز دی گئی۔

اِنِّیْ اَنَا رَبُّکَ ۔ (۲) بے شک میں تمہارا رب ہوں۔

جب سالک نے علم سے یہ بات سنی تو اسے اپنے نفس کی کوتاہی کا شعور حاصل ہوا اور یہ کہ وہ تشبیہ اور تنزیہ کے درمیان ہیجڑے کی صورت میں ہے تو اسے اپنے نفس پر اس قدر غصہ آیا کہ اس کی گرمی سے اس کے دل میں آگ شعلہ زن ہوئی جب اس نے اپنے نفس کو نقصان کی آنکھ سے دیکھا اور اس کے دل کے چراغ میں جو تیل تھا قریب تھا کہ وہ آگ کے پہنچے بغیر روشن ہو جائے اور جب اس کی گرمی کی وجہ سے اس میں علم پھونکا گیا تو اس تیل نے شعلہ پکڑا اور اس کی روشنی بڑھ گئی اب علم نے اس سے کہا کہ اس فرصت کو غنیمت جانو اور اپنی آنکھ کھولو شاید تم آگ پر راہنمائی حاصل کرو چنانچہ اس نے

---

(۲) قرآن مجید سورۂ طٰہٰ آیت ۱۲

آنکھ کھولی تو اس کے لیے قلم الٰہی منکشف ہو گئی اس نے دیکھا کہ تنزیہہ کے سلسلے میں وہ اسی طرح ہے جیسے علم نے بیان کیا تھا نہ وہ لکڑی سے بنی ہے اور نہ کانے (نڑ) سے نہ اس کا سر ہے اور نہ دُم، وہ ہمیشہ انسانوں کے دلوں پر مختلف علوم لکھتی ہے اور ہر دل میں اس کا ایک سر ہے حالانکہ اس کا اپنا کوئی سر نہیں ہے تو اس سے میرا تعجب مکمل ہوا اور اس نے کہا بہترین ساتھی علم ہے اللہ تعالیٰ اسے میری طرف سے اچھی جزاء عطا فرمائے کیوں کہ اب میرے لیے واضح ہوا کہ اس نے قلم کے بارے میں جو کچھ بیان کیا تھا وہ صحیح ہے اب میں اس قلم کو دوسری قلموں کی طرح نہیں دیکھتا۔

اس وقت اس سالک نے علم کو رخصت کیا اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا میں نے تمہارا بہت وقت لیا اور بہت بحث کی اب میں ارادہ کرتا ہوں کہ قلم کے پاس حاضری کے لیے سفر کروں اور اس کا معاملہ پوچھوں چنانچہ اس نے اس کی طرف سفر کیا اور اس سے پوچھا اے قلم! تجھے کیا ہوا کہ تو ہمیشہ دلوں پر وہ علوم لکھتی رہتی ہے جن کے ذریعے ارادے تقدیر کی طرف اٹھتے ہیں اور پھر مقدورات کی طرف جاتے ہیں۔ اس نے کہا کیا تو وہ سب کچھ بھول گیا جو تو نے مُلک و شہادت میں دیکھا اور قلم سے تم نے سوال کیا تو اس نے جواب دیتے ہوئے تمہیں ہاتھ کی طرف پھیر دیا، اس نے کہا میں نہیں بھولا، اس نے کہا میرا بھی وہی جواب ہے اس نے کہا یہ کس طرح ہو سکتا ہے تو اس کی طرح تو نہیں ہے قلم نے کہا کیا تو نے سنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی صورت پر پیدا کیا؟ اس نے کہا ہاں سنا ہے اس نے کہا میرے بارے میں اس سے پوچھ جس کو یمین الملک کہا جاتا ہے میں اس کے قبضہ میں ہوں اور وہی مجھے پھیرتا ہے میں تو اس کے حکم کے تابع اور اس کے لیے مسخر ہوں۔ پس تسخیر اور قابو میں ہونے کے اعتبار سے قلم الٰہی اور انسانی قلم میں کوئی فرق نہیں فرق تو صرف ظاہری صورت کا ہے اس نے پوچھا یمین الملک کون ہے؟ قلم نے جواب دیا کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا۔

وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ۔ (۱) اور تمام آسمان اس کے دائیں ہاتھ (اس کی قدرت) کے ساتھ لپیٹے گئے ہیں۔

اس نے کہا یہ آیت سنی ہے قلم نے کہا قلمیں بھی تو اس کے قبضۂ یمین میں ہیں اور وہی ان کو ادھر اُدھر پھیرتا ہے۔ اب اس سالک نے یمین کی طرف سفر شروع کر دیا حتیٰ کہ اسے دیکھا اور اس کے عجائب بھی دیکھے جو قلم کے عجائب سے زیادہ تھے اور ان میں سے کسی کا وصف بیان نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اس کی وضاحت کی جا سکتی ہے بلکہ کئی جلدوں میں اس کا سواں حصہ بھی نہیں آسکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ یمین (دایاں ہاتھ) ہے لیکن دوسرے دائیں ہاتھوں کی طرح نہیں، انگلی ہے لیکن دوسری انگلیوں جیسی نہیں۔

اس نے دیکھا کہ قلم اس یمین کے قبضہ میں حرکت کر رہی ہے تو اس کے سامنے قلم کا عذر ظاہر ہو گیا اس نے یمین سے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ زمر آیت ۶۷

اس کے معاملے اور قلم کو حرکت دینے کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب دیا اس نے کہا میرا وہی جواب ہے جو تو نے عالم شہادت کے دائیں ہاتھ سے سنا یعنی اس نے کہا تھا قدرت و طاقت سے پوچھو کیوں کہ ہاتھ ذاتی طور کچھ نہیں کر سکتا اسے قدرت حرکت دیتی ہے۔

پھر اس نے عالم قدرت کی طرف سفر کیا اور اس میں ایسے عجائب دیکھے جن کے سامنے پہلے کے عجائب معمولی معلوم ہوئے اور اس سے یمین کو حرکت دینے کے بارے میں پوچھا اس نے جواب دیا کہ میں ایک صفت ہوں تو قادر سے پوچھ کیوں کہ اعتماد موصوف پر ہوتا ہے صفت پر نہیں۔

اس وقت قریب تھا کہ سالک لغزش کھا جاتا اور زبان سوال جرأت کر جاتی لیکن اسے قولِ ثابت کے ساتھ استقلال نصیب ہوا اور اسے دربار خداوندی کے پردوں کے پیچھے سے آواز دی گئی - ارشاد ہوا۔

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ۔ (۱) اس سے اس کے فعل کے بارے میں نہیں پوچھا جاتا البتہ ان سے (مخلوق سے) پوچھا جائے گا۔

یہ سن کر اس پر ہیبت طاری ہو گئی اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑا اور اپنی بیہوشی میں تڑپتا رہا جب افاقہ ہوا تو کہا یا اللہ! تو پاک ہے تیری شان کس قدر عظیم ہے میں نے تیری بارگاہ میں توبہ کی، تجھ پر بھروسہ کیا اور اس بات پر ایمان لایا کہ تو ہی بادشاہ جبار ہے واحد و قہار ہے میں تیرے غیر سے نہیں ڈرتا اور نہ ہی تیرے سوا کسی سے امید رکھتا ہوں تیرے عذاب سے تیرے ہی عفو و درگزر میں پناہ لیتا ہوں تیری ناراضگی سے تیری رضا میں پناہ تلاش کرتا ہوں مجھے اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ میں تیری بارگاہ میں گڑگڑاؤں اور تیرے سامنے التجا کروں کہ تو میرا سینہ کھول دے تاکہ میں تجھے پہچان سکوں اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ میں تیری حمد و ثنا کر سکوں۔

تو حجاب کے پیچھے سے آواز دی خبردار ثنا کی طمع نہ کرنا اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا بلکہ ان ہی کی طرف رجوع کرو وہ جس بات کا حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس کام سے روکیں اس سے رک جاؤ انہوں نے جو کلمات کہے وہی کہو انہوں نے اس دربار میں صرف اتنا کہا۔

سُبْحَانَکَ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ۔ (۲) یا اللہ! تو پاک ہے میں تیری ثنا بیان نہیں کر سکتا تو اسی طرح ہے جیسے تو نے خود اپنی ثنا بیان فرمائی۔

اس نے عرض کیا الٰہی! اگر زبان تیری ثنا نہیں کر سکتی تو کیا دل کو بھی تیری معرفت کی طمع ہو سکتی ہے یا نہیں تو آواز دی گئی

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ انبیاء آیت ۲۳

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۶ ص ۵۸ مرویات عائشہ

صدیقین کی گردنیں پھاندنے سے بچو اور صدیق اکبر کی طرف لوٹ جاؤ اور ان کی اقتدا کرو کیوں کہ سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام ستاروں کی مثل ہیں جس کی اقتدا کرو گے، ہدایت پاؤ گے کیا تم نے نہیں سنا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

لَا مَعْجُزٌ عَنْ دَرْكِ الْاِدْرَاكِ اِدْرَاكٌ ۔ (۱) اس کو پانے سے عاجز ہونا ہی اسے پانا ہے۔

تو اے سالک! ہماری بارگاہ سے تیرا حصہ اسی قدر ہے کہ تو اس بات کو جان لے کہ تو ہماری بارگاہ سے محروم ہے اور ہمارے جلال و جمال کے ملاحظہ سے عاجز ہے۔

تو اس وقت سالک نے رجوع کیا اور اپنے سوال اور عتاب سے معذرت کی اور یمین، قلم، علم، ارادے، قدرت اور بعد کی چیزوں سے کہا میرا عذر قبول کر و میں اجنبی تھا اور اس شہر میں نیا نیا آیا تھا اور ہر آنے والے کے لیے دہشت ہوتی ہے میرا تمہارے اوپر اعتراض کوتاہی اور جہالت کی وجہ سے تھا اب تمہارا عذر میرے نزدیک صحیح ہو گیا اور میرے سامنے یہ بات واضح ہو گئی کہ ملک و ملکوت کا واحد بادشاہ اور عزت و جبروت والا واحد قہار ہے اور تم سب اس کے قبضہ قدرت میں مسخر ہو وہی اول و آخر ہے اور وہی ظاہر و باطن ہے۔

پس جب سالک نے یہ بات عالم ظاہر میں بیان کی تو اس پر اعتراض کیا گیا اور کہا گیا کہ وہ (اللہ تعالیٰ) کس طرح اول اور آخر ہو سکتا ہے جب کہ یہ دونوں صفتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور کس طرح وہ ظاہر بھی ہے اور باطن بھی؛ کیوں کہ جو اول ہے وہ آخر نہیں اور جو ظاہر ہے وہ باطن نہیں تو اس نے کہا وہ تمام موجودات کے اعتبار سے اول ہے کیوں کہ تمام موجودات ترتیب کے ساتھ ایک ایک کر کے اسی سے صادر ہوئے ہیں اور جو اس کی طرف چلنے والے ہیں ان کی نسبت سے وہی آخر ہے کیوں کہ وہ ہمیشہ ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کی بارگاہ بے کس پناہ پر انتہا ہوتی ہے تو سفر کا اختتام وہیں ہوتا ہے پس وہ مشاہدہ میں سب سے آخر اور وجود میں سب سے پہلے ہے۔

اور جو لوگ حواس خمسہ کے ذریعے اس کا ادراک کرنا چاہتے ہیں اور عالم شہادت میں بیٹھے ہوئے ہیں ان کی نسبت سے وہ باطن ہے اور جو لوگ باطنی بصیرت جو عالم ملکوت میں ہے کی وجہ سے دل میں روشن چراغ میں اس کو تلاش کرتے ہیں ان کی نسبت سے وہ ظاہر ہے تو جو لوگ فعلی توحید کے راستے پر چلتے ہیں ان کی توحید اس طرح ہے یعنی ان پر منکشف ہو جاتا ہے کہ فاعل ایک ہے۔

سوال:

اس عقیدۂ توحید کی انتہا یہ ہے کہ یہ عالم ملکوت پر ایمان لانے پر مبنی ہے تو جو شخص اس بات کو نہ سمجھے یا اس کا انکار کرے اس کا کیا طریقہ ہے؟

جواب:

منکر کا کوئی علاج نہیں ہاں اس سے یہ کہا جائے کہ تمہارا عالم ملکوت سے انکار اسی طرح ہے جس طرح فرقہ سمینہ

عالم جبروت کا انکار کرتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک علم حواس خمسہ ہی میں منحصر ہے انہوں نے قدرت، ارادے اور علم کا انکار کیا کیوں کہ ان چیزوں کا تعلق حواس خمسہ سے نہیں ہے پس انہوں نے عالم شہادت کی پستی ہی کو اختیار کر لیا۔

اگر وہ (منکر) کہے کہ میں بھی ان ہی لوگوں میں سے ہوں میں تو صرف حواس خمسہ کے ذریعے عالم شہادت تک ہی ہدایت پا سکتا ہوں اور اس کے سوا میں کسی بات کو نہیں جانتا تو کہا جائے گا کہ تمہارا ان چیزوں کا انکار کرنا جن کا ہم نے مشاہدہ کیا اور ان کا حواس خمسہ سے تعلق نہیں ہے اسی طرح ہے جیسے سوفسطائیہ فرقہ حواس خمسہ کا انکار کرتا ہے وہ کہتے ہیں ہم جو کچھ دیکھتے ہیں اس پر یقین نہیں کر سکتے کیوں کہ ہو سکتا ہے ہم نے اسے خواب میں دیکھا ہو۔

اور اگر وہ کہے کہ میں ان سب میں سے ہوں کیوں کہ میں تو محسوسات میں بھی شک کرتا ہوں تو کہا جائے گا کہ اس شخص کا دماغ خراب ہو گیا ہے اور اس کا علاج نہیں ہو سکتا اسے کچھ دن چھوڑ دیا جائے کیوں کہ طبیب ہر مریض کا علاج نہیں کر سکتا — تو یہ منکر کا حکم ہے۔

اور جو شخص انکار نہیں کرتا لیکن اس کو سمجھ نہیں آتی تو سالکین کو چاہیے کہ اس کے ساتھ یہ طریقہ اختیار کریں کہ اس کی اس آنکھ کو دیکھیں جس کے ساتھ عالم ملکوت کو دیکھا جاتا ہے اگر وہ اصل کے اعتبار سے صحیح ہے لیکن اس میں سیاہ پانی اتر آیا ہے جسے دور کر کے آنکھ کو صاف کیا جا سکتا ہے تو اسے صاف کرنے میں مشغول ہوں جس طرح سرمے کے ذریعے ظاہری آنکھ کو صحیح کیا جاتا ہے پھر جب بینائی صحیح ہو جائے تو اس کو راستہ بتایا جائے جیسے حضور علیہ السلام نے خاص خاص صحابہ کرام کے ساتھ یہ طریقہ اختیار فرمایا۔

اور اگر وہ علاج کے قابل ہی نہ ہو تو جو طریقہ ہم نے توحید کے بارے میں لکھا ہے اس کے لیے وہ ممکن نہیں اور اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ ملک و ملکوت کے ذرات کی شہادت توحید کو سن سکے ایسے شخص کے ساتھ حروف و آواز کے ذریعے ہی کلام کیا جائے اور توحید کے سلسلے میں بلند گفتگو اس کے کمزور ذہن کے مطابق کی جائے کیوں کہ عالم شہادت میں بھی توحید ہے کیوں کہ ہر آدمی جانتا ہے کہ ایک گھر دو آدمیوں کی وجہ سے اور ایک شہر دو حاکموں کی وجہ سے خراب ہو جاتا ہے لہذا اس شخص کی عقل کے مطابق کہا جائے کہ تمام جہان کا معبود اور مدبر ایک ہے کیوں کہ دو معبود ہوتے تو زمین و آسمان کا نظام خراب ہو جاتا تو یہ تقریر اس کے اس ذوق کے مطابق ہو گی جو وہ ظاہری عالم میں دیکھتا ہے تو اس طرح اس کی عقل کے مطابق اس کے دل میں توحید کا پودا لگ جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو مکلف بنایا کہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق کلام کریں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک عربی زبان میں اہل عرب کی باہمی گفتگو کے طریقے پر نازل فرمایا (یعنی جس انداز کی عربی وہ عام روز مرہ زندگی میں بولتے ہیں اسی انداز کی عربی میں قرآن پاک نازل کیا گیا)

سوال :

اس قسم کی اعتقادی توحید اس بات کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ وہ توکل کی بنیاد قرار پائے۔

جواب:

جب اعتقاد مضبوط ہو تو وہ احوال کے پیدا کرنے میں کشف کا عمل کرتا ہے لیکن عام طور پر وہ کمزور ہوتا ہے اور اضطراب اور تزلزل اس میں جلدی سرایت کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایسے عقیدہ والا کسی علم کلام والے کا محتاج ہوتا ہے جو اپنے کلام کے ذریعے اس کی حفاظت کرے یا وہ خود علم کلام سیکھے جس کے ذریعے اس عقیدے کی حفاظت کرے جو اس نے اپنے استاذ یا اپنے والدین یا شہر والوں سے حاصل کیا لیکن جو شخص راستے کا مشاہدہ کرتا اور خود اس پر چلتا ہے اس پر کسی بات کا خوف نہیں ہوتا بلکہ پردہ اُٹھ جانے سے یقین نہیں بڑھتا لیکن خلقت کی تفصیل زیادہ واضح ہو جاتی ہے جیسے ایک شخص کسی انسان کو صبح کی سفیدی میں دیکھتا ہے تو طلوع شمس کے وقت اس بات کا یقین نہیں بڑھتا کہ وہ انسان ہے البتہ اس کی جسمانی ساخت کی تفصیل زیادہ واضح ہوتی ہے۔

ارباب کشف اور اصحاب عقیدہ کی مثال فرعون کے جادوگروں اور سامری کے ساتھیوں جیسی ہے فرعون کے جادوگر جب اپنے طویل مشاہدے اور تجربے کی وجہ سے جادو کی تاثیر کی انتہا پر مطلع تھے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وہ عمل دیکھا جو جادو کی حدود سے تجاوز کر گیا اور ان کے لیے حقیقت امر منکشف ہو گئی پس انہوں نے فرعون کی اس بات کی پرواہ نہ کی اس نے کہا تھا۔

لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ۔ (۱)

میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں ضرور کاٹوں گا۔

تو انہوں نے اس بات کی پرواہ نہ کی اور یہ جواب دیا۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔ (۲)

جو واضح دلائل ہمارے پاس آچکے ہیں ہم ان پر تجھے ترجیح نہیں دیں گے اور اس ذات پر بھی جس نے ہمیں پیدا کیا پس تو جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر لے یہ دنیوی زندگی تو ختم ہو جائے گی۔

لیکن جب سامری کے ساتھیوں کی نظر سانپ کے ظاہر پر تھی تو جب انہوں نے سامری کے بچھڑے کو دیکھا اور اس کی آواز کو سنا تو ان میں تبدیلی آگئی انہوں نے سامری یہ بات سنی۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ طٰہٰ آیت ۱،

(۲) قرآن مجید، سورۂ طٰہٰ آیت ۲،

هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰـهُ مُوْسٰى ۔ (۱) یہ تمہارا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معبود ہے ۔
اور وہ اس بات کو بھول گئے کہ یہ بچھڑا ان کی بات کا جواب نہیں دے سکتا اور نہ ہی ان کے لیے نفع اور نقصان کا مالک ہے پس جو شخص سانپ کے ظاہر کو دیکھ کر ایمان لایا وہ لازماً انکار کر گیا جب اس نے بچھڑے کو دیکھا کیوں کہ دونوں کا تعلق ظاہر سے تھا اور ظاہری عالم میں اختلاف اور تضاد بہت زیادہ ہے ۔

لیکن عالم ملکوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس لیے تم اس میں اختلاف اور تضاد بالکل نہیں پاتے ۔

سوال :

آپ نے توحید کے بارے میں جو کچھ ذکر کیا ہے وہ ظاہر بات ہے جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ وسائل اور واسطے مسخر ہیں یہ سب باتیں ظاہر میں لیکن انسان کا معاملہ الگ ہے وہ چاہے تو حرکت کرتا ہے اور چاہے تو ٹھہرا رہتا ہے پس وہ کس طرح مسخر ہو گا ۔

جواب :

جان لو ! کہ اگر اس کے ساتھ یہ بات بھی ہو کہ انسان جب کسی بات کو چاہنا چاہتا ہے تو چاہتا ہے اور جب اس کی مشیت نہیں ہوتی تو نہیں چاہتا تو یہاں قدم پھسلتا ہے اور غلطی لگتی ہے ۔ لیکن جان لو کہ جب وہ چاہتا ہے تو جو کچھ چاہتا ہے وہ کرتا ہے وہ کرنا چاہے یا نہ ، تو چاہنا اس کے اختیار میں نہیں ہے کیوں کہ اگر مشیت اس کے اختیار میں ہوتی تو وہ دوسری مشیت کا محتاج ہوتا تو لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ۔ پس جب مشیت پائی جائے جو قدرت کو مقدور کی طرف پھیرتی ہے تو قدرت لازماً پھر جاتی ہے اور اس کے مخالف کا کوئی راستہ نہیں ہوتا ۔ کیوں کہ قدرت کے لیے حرکت لازمی اور ضروری ہے ۔

اور جب مشیت پکی ہو جائے تو قدرت ضرور حرکت کرتی ہے اور مشیت دل میں ایک ضرورت پیدا کرتی ہے اور یہ ضرورتیں ایک دوسری پر مرتب ہوتی ہیں ۔ اور بندے کے اختیار میں نہیں کہ وہ مشیت کے وجود کو دور کر سکے اور نہ ہی مشیت کے بعد قدرت کو مقدور تک جانے سے روک سکتا ہے اور جب مشیت قدرت کو اٹھاتی ہے تو اب حرکت کے وجود کو بھی نہیں روک سکتا وہ ان تمام باتوں میں مجبور ہے ۔

جبر و اختیار :

سوال :

یہ تو محض جبر ہے اور جبر ، اختیار کے خلاف ہے اور آپ اختیار کا انکار بھی نہیں کرتے تو مجبور آدمی ، مختار کیسے ہو گا ۔

---

(۱) قرآن مجید ، سورہ طٰہٰ آیت ۸۸

جواب :

اگر پردہ اٹھ جائے تو معلوم ہو جائے کہ وہ عین اختیار میں مجبور ہے پس وہ اختیار پر مجبور ہے تو جس کو اختیار کی سمجھ نہ ہو وہ اس بات کو کیسے سمجھ سکتا ہے اس لیے ہم اہل کلام کی زبان میں اختیار کی مختصر تشریح کرتے ہیں جو ہمارے جیسے تابع شخص کے لائق ہے کیوں کہ اس کتاب میں ہم نے صرف علم معاملہ کا قصد کیا ہے لیکن ہم کہتے ہیں۔

انسان میں فعل کا اطلاق تین طریقوں پر ہوتا ہے جب کہا جاتا ہے کہ انسان انگلیوں سے لکھتا ہے اور پھیپھڑے اور سانس کی نالی سے سانس لیتا ہے اور جب پانی پر کھڑا ہوا تو اپنے جسم سے اس کو پھاڑتا ہے تو پانی کو پھاڑنا، سانس لینا اور کتابت اس کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ یہ تین امور اضطرار اور جبر کی حقیقت میں ایک ہی ہیں اس کے بعد کچھ امور میں مختلف ہیں پس ہم اس سلسلے میں تمہارے لیے تین عبارتیں واضح کرتے ہیں جب آدمی پانی کے اوپر کھڑا ہوتا ہے اور پانی کو پھاڑ دیتا ہے تو اس کو طبعی فعل کہتے ہیں سانس لینے کو ارادی فعل کہا جاتا ہے اور کتابت کو ہم اختیاری فعل کہتے ہیں طبعی فعل میں جبر (مجبور ہونا) ظاہر ہے کیوں کہ جب وہ پانی کے اوپر کھڑا ہوتا ہے چھت سے فضا میں گرتا ہے تو ہوا لا محالہ پھٹ جاتی ہے اور اس کے بعد اس پھٹن کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے۔

سانس لینا بھی اسی معنیٰ میں ہے کیوں کہ گلے کی حرکت کی سانس لینے کی طرف نسبت اسی طرح ہے جیسے پانی کے پھٹنے کی نسبت بدن کے بوجھ کی طرف ہوتی ہے تو جب بوجھ موجود ہوگا تو اس کے بعد پھٹنا ضروری ہوگا اور بوجھ اس کے اختیار میں نہیں اسی طرح ارادہ بھی اس کے اختیار میں نہیں اسی لیے اگر کسی انسان کی آنکھ کی طرف سوئی کے ساتھ اشارہ کیا جائے تو مجبوراً آنکھیں بند ہو جاتی ہیں اور وہ ان کو کھلا رکھنے کا ارادہ کرے تو اس بات پر قادر نہیں ہوتا حالانکہ مجبوراً پلکوں کو بند کر دینا ہے اور ملانا ارادی فعل ہے لیکن جب سوئی کی صورت اس کے مشاہدہ میں ادراک کے ساتھ آتی ہے تو آنکھیں بند کرنے کا ارادہ لازماً پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ حرکت بھی پیدا ہوتی ہے اور اگر وہ اس کو اسی حالت میں چھوڑنا چاہے تو ایسا نہیں کر سکتا۔ حالاں کہ یہ فعل قدرت اور ارادے کے ساتھ ہے اور ضروری ہونے کی وجہ سے فعل طبعی کے ساتھ مل چکا ہے۔

اور فعل کی تیسری صورت یعنی اختیاری فعل میں التباس ہوتا ہے جیسے کتابت اور گفتگو، اور اسی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ چاہے تو کرے اور چاہے تو نہ کرے اور کبھی چاہتا ہے اور کبھی نہیں چاہتا تو اس وجہ سے گمان ہوتا ہے کہ یہ اس کے اختیار میں ہے اور یہ قول اختیار کے معنیٰ سے عدم واقفیت کی وجہ سے کیا جاتا ہے لہٰذا ہم اختیار کا مفہوم واضح کرتے ہیں۔

اختیار کا مفہوم:

اس کا بیان یہ ہے کہ ارادہ اس علم کے تابع ہے جو اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی چیز تمہارے موافق ہے اور اشیاء کی دو قسمیں ہیں ایک قسم میں وہ اشیاء شامل ہیں کہ انسان کا ظاہری یا باطنی مشاہدہ کسی حیرانگی اور تردد کے بغیر اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ وہ چیز تمہارے موافق ہے اور دوسری قسم ان اشیاء پر مشتمل ہے جن میں عقل ڈانواں ڈول ہوتی ہے تو

جس میں قطعی فیصلہ ہوتا ہے کوئی تردد نہیں ہوتا اس کی مثال جیسے کوئی سوئی تمہاری آنکھ کا یا تلوار تمہارے بدن کا ارادہ کرتی ہے تو تمہارے علم میں تردد نہیں ہوتا کہ اس کو دور کرنا تمہارے لیے بہتر اور موافق ہے تو علم کے ساتھ ارادہ اور ارادے کے ساتھ قدرت حرکت میں آتی ہے اور پلکوں کی حرکت سوئی کو دور کرنے اور ہاتھ کی حرکت تلوار کو دور کرنے کے لیے سامنے آتی ہے لیکن اس میں کسی قسم کی سوچ اور فکر کا تعلق نہیں ہوتا۔ اور یہ کام صرف ارادے کے تحت ہوتا ہے۔

اور بعض کام وہ ہیں جن میں تمیز اور عقل کا دخل ہوتا ہے اور آدمی کو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کام اس کے موافق ہے یا نہیں؟ لہذا وہ دیکھنے اور غور و فکر کا محتاج ہوتا ہے تاکہ اس بات میں امتیاز کر سکے کہ اس کام کے کرنے میں بھلائی ہے یا چھوڑنے میں — اور جب دیکھنے اور سوچنے کے ذریعے اس بات کا علم ہو جائے کہ ان میں سے ایک میں بھلائی ہے (کرنے یا چھوڑنے میں) تو جس کے بارے میں قطعی علم حاصل ہوا کسی غور و فکر کے بغیر اس پر عمل پیرا ہو جاتا ہے تو یہاں ارادہ اسی طرح پیدا ہوتا ہے جس طرح وہ تلوار اور تیر کو دور کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا پس جب اس فعل کے لیے ارادہ پیدا ہو جس کے بارے میں عقل کے لیے واضح ہوا ہو کہ یہ فعل بہتر ہے تو اس ارادے کا نام اختیار ہے جو خیر (بھلائی) سے مشتق ہے یعنی اس کام کی طرف اٹھا جس کے بارے میں عقل کہتی ہے کہ یہ بہتر ہے اور یہ بعینہ ارادہ ہے اس کے حرکت میں آنے کے لیے اس چیز کا انتظار نہیں کیا جاتا ہے جس کے لیے پہلے ارادے نے انتظار کیا اور وہ اس آدمی کے حق میں فعل کا اچھا ہونا ہے لیکن تلوار کو دور کرنے کا بہتر ہونا کسی سوچ و بچار کے بغیر معلوم ہوا بلکہ بدیہی طور پر معلوم ہے اور یہ دوسرا ارادہ غور و فکر اور سوچ و بچار کا محتاج ہے۔

تو اختیار ایک خاص ارادے کا نام ہے اور یہ ارادہ عقل کے اشارے سے اٹھتا ہے اور ایسے فعل میں ہوتا ہے جس کے ادراک میں توقف ہوتا ہے اسی لیے کہا گیا کہ عقل کی ضرورت دو اچھی باتوں کے درمیان اور دو بری باتوں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے پڑتی ہے۔ اور اس بات کا تصور نہیں ہو سکتا کہ ارادہ محسوس کرنے اور خیال کرنے کے بغیر یا عقل کے قطعی فیصلے کے بغیر وجود میں آئے یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی گردن کاٹنا چاہے تو اس بات پر قادر نہیں ہوتا اس لیے نہیں کہ اسے اپنے ہاتھ یا چھری پر قدرت حاصل نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ ارادہ جو قدرت کو دعوت دیتا ہے مفقود ہے اور ارادہ اس لیے مفقود ہوتا ہے کہ وہ عقل یا حس کے ذریعے حرکت میں آتا ہے جب فعل موافق ہو۔ جب کہ اپنے آپ کو قتل کرنا اس کے موافق نہیں ہے اس لیے اپنے آپ کو قتل کرنے پر اعضاء کی قوت حاصل ہونے کے باوجود وہ ایسا نہیں کر سکتا البتہ یہ کہ اسے اتنی سخت تکلیف ہو جس کی طاقت نہ رکھتا ہو اس صورت میں عقل فیصلہ کرنے میں تردد کرتی ہے اور فوراً فیصلہ نہیں کرتی کیونکہ یہ دو خرابیوں کے درمیان تردد ہے پس اگر غور و فکر کے بعد اس بات کو ترجیح حاصل ہو جائے کہ قتل کو چھوڑنے میں شر کم ہے تو اس صورت میں اپنے آپ کو قتل نہیں کر سکے گا اور عقل یہ فیصلہ کرے کہ قتل کی صورت میں شر کم ہے اور اس کا فیصلہ پکا ہو اس میں کوئی میلان یا پھرنے والی بات نہ ہو تو اب ارادہ اور قدرت دونوں جوش میں آتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے جیسے کوئی شخص کسی کے پیچھے تلوار لے کر دوڑے کہ اسے قتل کر دے تو وہ اپنے آپ کو چھت سے گرا

دیتا ہے اگرچہ یہ باعث ہلاکت ہے لیکن وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتا اور اپنے آپ کو گرانے سے بچانا اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا اور اگر اس کا پیچھا صرف اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اسے ہلکی مار ماری جائے پس جب وہ چھت کے کنارے پر پہنچتا ہے تو عقل فیصلہ کرتی ہے کہ گرانے کی نسبت مار کھا لینا آسان ہے تو اس کے اعضاء ٹھہر جاتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو نیچے پھینک نہیں سکتا۔ اور اس کام کا ارادہ بھی نہیں کرتا کیوں کہ جو چیز ارادے کو دعوت دیتی ہے وہ عقل اور حس کے حکم کے تابع ہے اور قدرت اس داعیہ (ارادے کو دعوت دینے والی بات) کے تابع ہے، حرکت قدرت کے سامنے مسخر ہے اور یہ سب باتیں انسان میں لازماً پیدا ہوتی ہیں لیکن اس کو علم نہیں ہوتا وہ ان امور کا محل اور جاری ہونے کی جگہ ہے یہ مطلب نہیں کہ یہ اس سے صادر ہوتے ہیں۔

تو اس وقت مجبور ہونے کا معنیٰ یہ ہوا کہ یہ سب باتیں اس میں غیر کی طرف سے حاصل ہوتی ہے اس سے نہیں اور مختار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس ارادے کا محل ہے جو اس میں مجبوراً پیدا ہوا جب عقل نے فیصلہ کیا کہ فعل محض بھلائی پر مبنی اور موافق ہے اور حکم بھی جبراً ہوا تو وہ اختیار پر مجبور ہے مثلاً آگ کا جلانے والا عمل محض جبر ہے اور اللہ تعالیٰ کا فعل اختیارِ محض ہے اور انسان کا عمل دونوں منزلوں کے درمیان ہے کیوں کہ یہ اختیار پر جبر ہے پس اہل حق نے اس کے لیے ایک تیسری عبارت تلاش کی کیوں کہ یہ تیسرا فن ہے تو انہوں نے قرآن پاک کی اقتداء میں اسے کسب کہا اور یہ جبر یا اختیار نہیں ہے بلکہ سمجھنے والوں کے نزدیک یہ دونوں کا جامع ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے فعل کو اختیار کہتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ اختیار سے وہ ارادہ مراد نہ لیا جائے جو حیرانگی اور تردد کے بعد ہوتا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ بات محال ہے اور لغات میں جتنے الفاظ مذکور ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ کے حق میں استعمال کرنا محال ہے البتہ مجازی استعمال ہو سکتا ہے اور اس بات کا ذکر اس علم کے لائق بھی نہیں اور طوالت کا باعث بھی ہے۔

سوال:

کیا آپ یہ بات کہتے ہیں کہ علم نے ارادہ پیدا کیا اور ارادے سے قدرت ظہور میں آئی اور قدرت نے حرکت کو جنم دیا اور ہر دوسری بات پہلی سے پیدا ہوئی اگر تم اس بات کو مانتے ہو تو گویا تم یوں کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بغیر یہ چیزیں ایک دوسرے سے پیدا ہوئیں اور اگر تم اس بات کو نہیں مانتے تو ان میں سے بعض کے بعض پر مرتب ہونے کا کیا مطلب ہے؟

جواب:

یہ بات کہنا کہ یہ باتیں ایک دوسرے سے پیدا ہوئی ہیں محض جہالت ہے اسے پیدا ہونا کہیں یا کوئی دوسرا لفظ استعمال کریں بلکہ ان سب کا حوالہ اس معنیٰ پر ہے جس قدرت ازلیہ کہتے ہیں اور یہ وہی اصل ہے جس سے عام لوگ واقف نہیں سوائے ان لوگوں کے جو علم میں راسخ ہیں وہ اس کی ماہیت کو جانتے ہیں اور عوام تو محض اس لفظ کو جانتے ہیں اور اس

ہیں انسانی قدرت کے ساتھ ایک قسم کی مشابہت سمجھتے ہیں اور یہ بات حق سے دور ہے اور اس کا بیان بھی طویل ہے۔

البتہ بعض مقدورات دوسرے بعض پر پیدا ہونے کے حوالے سے مرتب ہوئے ہیں جس طرح مشروط، شرط پر مرتب ہے پس قدرت ازلیہ سے ارادہ علم کے بعد ہی صادر ہوتا ہے اور علم حیات کے بعد ہوتا ہے اور حیات کے لیے محلِ حیات کا ہونا ضروری ہے اور جس طرح یہ کہنا صحیح نہیں کہ حیات اس جسم سے حاصل ہوتی ہے جو حیات کے لیے شرط ہے اسی طرح ترتیب کے دوسرے درجات کا معاملہ ہے لیکن بعض شرطیں عام لوگوں کے لئے ظاہر ہوتی ہیں اور بعض صرف خاص لوگوں کے سامنے واضح ہوتی ہیں جن کو نورِ حق کے ذریعے کشف ہوتا ہے ورنہ آگے بڑھنے والا اور پیچھے رہنے والا دونوں لزوم اور حق کے ساتھ ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کے تمام افعال کا یہی معاملہ ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو تقدم و تاخیر فضول اور بیکار ہوتی اور پاگلوں کے فعل کے مشابہ ہوتی اللہ تعالیٰ جاہلوں کی باتوں سے بہت بلند و بالا ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (۱)

اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت (اور معرفت) کے لیے پیدا کیا ہے۔

اور ارشاد خداوندی ہے،

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ مَا خَلَقْنٰهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (۲)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل نہیں بنایا اور ہم نے ان کو ٹھیک ٹھیک بنایا۔

اور جو کچھ زمین و آسمان کے درمیان ہے وہ واجب ترتیب اور حق لازم کے ساتھ ہیں وہ جس طرح پیدا ہوئی ہیں اس کے سوا کسی بات کا تصور نہیں ہو سکتا وہ اسی ترتیب پر ہیں جو چیز بعد میں ہوتی ہے وہ اپنی شرط کی منتظر ہوتی ہے اور مشروط کا شرط سے پہلے ہونا محال ہے اور محال چیز، مقدور نہیں ہو سکتی پس علم کا نطفہ کے بعد ہونا اسی لیے ہے کہ اس میں حیات نہیں جو علم کے لیے شرط ہے اور علم کے بعد ارادے کا حیات سے پیچھے ہونا بھی شرطِ علم کے نہ ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ سب کچھ واجب کا منہاج اور حق کی ترتیب ہے ان میں سے کوئی بھی بات کھیل یا اتفاقی نہیں ہے بلکہ ہر ایک میں حکمت اور تدبیر کارفرما ہے۔

اس بات کو سمجھنا مشکل ہے لیکن ہم ایسی مثال بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ مقدور، قدرت کے جاننے کے باوجود شرط پر موقوف ہوتا ہے یہ ایسی مثال ہے جس سے ضعیف سمجھ والوں کو بھی حق کی ابتدائی باتیں سمجھ آجاتی ہیں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ ذاریات آیت ۵۶

(۲) قرآن مجید، سورۂ دخان آیت ۳۹

مثلاً ہم فرض کرتے ہیں کہ ایک بے وضو شخص ہے وہ پانی میں گردن تک غوطہ لگا لیتا ہے تو اس کے اعضاء سے حدیث دور نہیں ہوتا اگرچہ حدث کو پانی سے ہی دور کیا جاتا ہے اور وہ اس وقت پانی کے اندر ہے اسی طرح قدرت ازلیہ بھی تمام مقدورات سے ملی ہوئی ہے اور اس کا ان مقدورات کے ساتھ اسی طرح تعلق ہے جس طرح پانی کا اعضاء کے ساتھ، لیکن اس کے باوجود مقدور حاصل نہیں ہوتا جس طرح پانی کے ذریعے حدث دور نہیں ہو رہا ہے کیوں کہ شرط نہیں پائی گئی اور وہ چہرے کا دھونا ہے۔ اور جب پانی میں کھڑا شخص اپنا چہرہ پانی پر رکھ دے تو پانی اس کے تمام اعضاء میں عمل کرے گا اور حدث دور ہو جائے گا اور بعض اوقات جاہل آدمی سمجھتا ہے کہ منہ سے حدث دور ہونے کی وجہ سے ہاتھوں سے بھی دور ہو گیا یعنی منہ سے حدث کا دور ہونا ہاتھوں سے اس کی دوری کی علت ہے کیوں کہ وہ پانی کو حدث کے دور ہونے کا سبب نہیں جانتے وہ کہتے ہیں ہاتھ پانی سے ملے لیکن حدث دور نہیں ہوا اور پانی نے کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تو جو چیز (چہرے کے دھونے سے) پہلے پانی سے حاصل نہیں ہوئی اب کیسے حاصل ہوگی لہٰذا چہرے کا دھونا ہی ہاتھوں سے حدث کو ختم کرتا ہے اور یہ جہالت ہے جو اس شخص کے گمان کے مشابہ ہے جو یہ خیال کرتا ہے کہ حرکت، قدرت سے حاصل ہوتی ہے قدرت ارادے سے اور ارادہ علم سے حاصل ہوتا ہے اور یہ سب باتیں غلط ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چہرے سے حدث دور ہوتے ہی ہاتھوں سے بھی دور ہوتا ہے لیکن حدث کی دوری اس پانی کی وجہ سے ہے جو ہاتھوں سے ملا چہرے کے دھونے سے نہیں نہ تو پانی میں کوئی تبدیلی آئی اور نہ ہاتھوں میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی اور ان دونوں میں کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوئی البتہ شرط پائی گئی تو علت کا اثر ظاہر ہوا۔

تو مقدورات کے قدرتِ ازلیہ سے صدور کو اسی طرح سمجھنا چاہیے حالانکہ قدرت قدیم ہے اور مقدورات حادث ہیں اور یہ مکاشفات کے جہانوں میں سے ایک اور جہاں کے دروازے کو کھٹکھٹانا ہے پس ہم ان سب باتوں کو چھوڑتے ہیں کیوں کہ ہمارا مقصود توحید فعلی کے طریقے سے آگاہ کرنا ہے کیوں کہ حقیقت میں فاعل ایک ہے وہی خوف اور امید کا مرکز ہے اور اسی پر توکل اور اعتماد ہے اور ہم تو توحید کے سمندروں میں سے ایک قطرہ مقاماتِ توحید میں سے تیسرے مقام کے حوالے سے بیان کر سکتے ہیں اور اس کو پورا کرنے کے لیے اگر عمر نوح بھی مل جائے تو بھی اس کی تکمیل محال ہے جس طرح سمندر کے تمام پانی کو لینے کے لیے کوئی شخص قطرہ قطرہ لینا شروع کر دے اور یہ سب باتیں "لا الٰہ الا اللہ" کے تحت داخل ہیں تو یہ کلمہ زبان پر کتنا آسان ہے اور اس کے مفہوم کا اعتقاد دل میں کس قدر سہل ہے اور جو علماء، علم میں راسخ ہیں ان کے نزدیک اس کی حقیقت اور مغز کتنی بڑی بات ہے دوسروں کے نزدیک کیا کیفیت ہوگی۔

سوال:

توحید اور شریعت کو کیسے جمع کیا جا سکتا ہے توحید کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی فاعل نہیں اور شریعت کا مفہوم بندوں کے لیے افعال کو ثابت کرنا ہے اگر بندہ فاعل ہے تو اللہ تعالیٰ کس طرح فاعل ہو سکتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ فاعل ہے

تو بندہ کیسے فاعل ہو سکتا ہے اور دونوں فاعلوں کے درمیان ایک مفعول کی سمجھ بھی نہیں آتی۔

جواب :

ہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب فاعل کا ایک ہی معنیٰ ہو اگر اس کے دو معنیٰ ہوں اور یہ لفظ مجمل ہونے کی صورت میں دونوں میں پایا جاتا ہو تو کوئی تناقض و اختلاف نہیں جیسے کہا جاتا ہے امیر نے فلاں کو قتل کیا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے جلاد نے قتل کیا تو امیر اور معنیٰ کے اعتبار سے قاتل ہے جب کہ جلاد دوسرے مفہوم کے اعتبار سے قاتل ہے پس اللہ تعالیٰ کے فاعل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ موجد اور اختراع کرنے والا ہے اور بندے کے فاعل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک محل ہے جس میں قدرت پیدا کی گئی اور اس سے پہلے اس میں ارادہ اور ارادے سے پہلے علم پیدا کیا گیا تو قدرت، ارادے سے مربوط ہوتی ہے حرکت کا قدرت کے ساتھ رابطہ ہے جس طرح شرط اور مشروط ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ اس کا رابطہ اس طرح ہے جیسے معلول کا علت سے اور موجد کا ایجاد سے ربط ہوتا ہے اور جس چیز کو قدرت کے ساتھ رابطہ حاصل ہو تو محل قدرت اس کے لیے فاعل کہلاتا ہے ارتباط کسی انداز کا بھی ہو جس طرح جلاد کو بھی قاتل کہا جاتا ہے اور امیر کو بھی، کیوں کہ قتل ان دونوں کی طاقت سے ملا ہوا ہے لیکن دو مختلف طریقوں پر، اسی لیے اسے دونوں کا فعل کہا جاتا ہے مقدورات کا دو طاقتوں کے ساتھ رابطہ بھی اسی طریقے پر ہے۔

اسی موافقت اور ارتباط کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں افعال کو کہیں فرشتوں سے منسوب کیا کبھی بندوں کی طرف کی اور کسی جگہ اپنی ذات سے منسوب فرمایا موت کے بارے میں ارشاد خداوندی ہے۔

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ۔ (۱) آپ فرما دیجئے ملک الموت تمہیں موت دیتا ہے۔

پھر ارشاد فرمایا۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا۔ (۲) اللہ تعالیٰ نفسوں کو موت سے ہمکنار کرتا ہے جب ان کی موت کا وقت ہوتا ہے۔

اور ارشاد فرمایا۔

اَفَرَاَيْتُمْ مَا تَحْرُثُوْنَ۔ (۳) کیا تم دیکھتے ہو جو تم کھیتی باڑی کرتے ہو۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ سجدہ آیت ۱۱

(۲) قرآن مجید، سورۃ زمر آیت ۴۲

(۳) قرآن مجید، سورۃ واقعہ آیت ۶۳

یہی کھیتی باڑی کو ہماری طرف منسوب فرمایا پھر ارشاد فرمایا۔

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا۔ (۱)

بے شک ہم نے اچھی طرح پانی بہایا پھر زمین کو اچھی طرح پھاڑ کر اس میں غلہ اور انگور اگائے ہے۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔ (۲)

پس بھیجا ہم نے اس (حضرت مریم) کے پاس اپنا فرشتے تو اس نے اس کے لیے پورا آدمی بنایا۔

اور ارشاد خداوندی ہے:

نَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا۔ (۳)

پس ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

اور وہ پھونک مارنے والے حضرت جبریل علیہ السلام تھے۔

اور جیسے ارشاد خداوندی ہے۔

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ۔ (۴)

پس جب ہم اس کو پڑھ چکیں تو آپ اس پڑھے ہوئے کی اتباع کریں

اس کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ جب اسے حضرت جبریل علیہ السلام آپ کے سامنے پڑھیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ۔ (۵)

ان سے لڑو اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھوں ان کو عذاب دے گا

تو اس میں قتل کی نسبت صحابہ کرام کی طرف کی اور عذاب دینے کی نسبت اپنی طرف فرمائی اور عذاب دینا ہی قتل ہے بلکہ صراحتاً بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ۔ (۶)

پس تم نے ان کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل کیا۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ عبس آیت ۲۵ تا ۲۸

(۲) قرآن مجید، سورۂ مریم آیت ۱۷

(۳) قرآن مجید، سورۂ تحریم آیت ۱۲

(۴) قرآن مجید، سورۂ قیامۃ آیت ۱۹

(۵) قرآن مجید، سورۂ توبہ آیت ۱۴

(۶) قرآن مجید سورۂ انفال آیت ۱۷

اور ارشاد خداوندی ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (۱)

اور آپ نے کنکریاں نہیں پھینکیں جب آپ نے پھینکیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی ہیں۔

تو ظاہر میں یہ نفی اور اثبات کو جمع کرتا ہے لیکن اس کا معنیٰ یہ ہے کہ جس معنیٰ میں اللہ تعالیٰ کنکریاں پھینکنے والا ہے اس معنیٰ میں آپ پھینکنے والے نہیں ہیں کیوں کہ آپ نے اس معنیٰ کے اعتبار سے پھینکی ہیں جس کے اعتبار سے بندہ پھینکتا ہے۔ اور یہ دونوں معنیٰ مختلف ہیں۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

اَلَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ۔ (۲)

وہ (اللہ) جس نے قلم کے ذریعے سکھایا اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو کچھ وہ نہیں جانتا تھا۔

پھر ارشاد فرمایا۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ (۳)

رحمٰن نے قرآن سکھایا۔

اور فرمایا۔

وَعَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ (۴)

اور اس نے اس (انسان) کو بیان سکھایا۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔ (۵)

بے شک ہم پر ہی اس کا بیان ہے۔

اور ارشاد فرمایا۔

اَفَرَاَيْتُمْ مَا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الْخَالِقُوْنَ۔ (۶)

تمہارا کیا خیال ہے جو مادہ منویہ تم ڈالتے ہو کیا تم اسے پیدا کرتے ہو یا ہم اس کے خالق ہیں۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ انفال آیت ۱۷

(۲) قرآن مجید، سورۂ علق آیت ۴، ۵

(۳) قرآن مجید، سورۂ رحمٰن آیت ۱

(۴) قرآن مجید، سورۂ رحمٰن آیت ۲

(۵) قرآن مجید، سورۂ قیامہ آیت ۱۹

(۶) قرآن مجید، سورۂ واقعہ آیت ۵۸، ۵۹

پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارحام سے متعلق فرشتے کا وصف یوں بیان فرمایا کہ وہ رحم میں داخل ہوتا ہے اور مادہ منویہ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے جسم کی صورت میں بدل دیتا ہے اور عرض کرتا ہے اے میرے رب! مذکر بناؤں یا مونث سیدھے اور ٹھیک ٹھاک اعضاء رکھوں یا ٹیڑھا بناؤں ؟ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور فرشتہ اس کی شکل بناتا ہے۔ (۱)

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں ۔

فرشتہ شکل بنا کر اس میں نیک بختی یا بدبختی کے ساتھ روح پھونکتا ہے (۲)

بعض بزرگوں نے فرمایا کہ جس فرشتے کو روح کہا جاتا ہے وہی فرشتہ روحوں کو جسموں میں ڈالتا ہے وہ اپنے خاص طریقے پر سانس لیتا ہے تو اس کا ہر سانس روح بن کر جسم میں چلا جاتا ہے اسی لیے اسے روح کہتے ہیں۔

انہوں نے اس فرشتے اور اس کے وصف کے بارے میں جو کچھ بیان کیا وہ حق ہے اور عقل والے لوگ اپنی بصیرت سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن اس کو روح کہنے کے لیے نقلی دلیل کی ضرورت ہے اس کے بغیر صحیح نہیں اور یہ محض اندازہ ہے ۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایسے دلائل ذکر کئے جو زمین اور آسمانوں میں پائے جاتے ہیں پھر فرمایا۔

اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ (۳) کیا تمہارے رب کا ہر چیز پر گواہ ہونا کافی نہیں۔

اور ارشاد خداوندی ہے ۔

شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ (۴) اللہ تعالیٰ اس بات پر گواہ ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ وہ خود ہی اپنے اوپر دلیل ہے اور اس سلسلے میں کوئی تناقض نہیں بلکہ استدلال کا طریقہ مختلف ہے کتنے ہی طالب ہیں جنہوں نے موجودات کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو پہچانا اور کتنے ہی طالب ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ذریعے تمام موجودات کی معرفت حاصل کی جس طرح بعض حضرات نے فرمایا میں نے اپنے رب کو اپنے رب کے ذریعے پہچانا اور اگر میرا رب نہ ہوتا تو میں اپنے رب کو نہ پہچان سکتا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کا یہی مطلب ہے ۔

ارشاد خداوندی ہے ۔

اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ (۵) کیا تمہارا رب اس بات کے لیے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر گواہ ہے ۔

---

(۱) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۳۳۲ کتاب القدر

(۲) قرآن مجید سورہ حم السجدہ آیت ۵۳

(۳) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۱۲

(۴) قرآن مجید، سورۂ فصلت آیت ۵۳

اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف بیان فرمایا کہ وہ زندہ رکھنے والا اور موت دینے والا ہے پھر موت اور زندگی کو دو فرشتوں کے سپرد کیا حدیث شریف میں ہے کہ موت اور زندگی کے دونوں فرشتوں کے درمیان مناظرہ ہوا تو موت کے فرشتے نے کہا میں زندوں کو مارتا ہوں اور زندگی کے فرشتے نے کہا میں مردے کو زندہ کرتا ہوں اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی طرف وحی بھیجی کہ تم دونوں اپنا اپنا کام کرو میں نے تمہارے ذمے جو کام لگایا ہے اس کو بجالاؤ میں موت دینے والا اور زندہ کرنے والا ہوں میرے سوا نہ کوئی موت دیتا ہے اور نہ زندہ کرتا ہے (۱)

تو نتیجہ یہ ہوا کہ فعل مختلف طریقوں پر استعمال ہوتا ہے

اگر تم سمجھو تو ان معانی میں کوئی تناقض نہیں ہے اسی لیے جب ایک شخص کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور عنایت فرمائی تو ارشاد فرمایا۔

خُذْهَا لَوْ لَمْ تَاْتِهَا لَاَتَتْكَ ۔ اسے لے لو اگر تم اس کے پاس نہ آتے تو یہ خود تمہارے پاس آتی۔ (۱)

تو آپ نے کی نسبت اس شخص اور کھجور دونوں کی طرف فرمائی اور یہ بات معلوم ہے کہ جس طریقے سے انسان کھجور کے پاس جاتا ہے، اس طریقے پر کھجور اس کے پاس نہیں آتی اور اسی طرح جب ایک شخص نے کہا میں اللہ تعالیٰ کے ہاں توبہ کرتا ہوں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف توبہ نہیں کرتا تو آپ نے ارشاد فرمایا اس نے حقدار کے لیے حق کو جان لیا۔ (۲)

پس جو شخص تمام امور کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتا ہے وہ محقق ہے جس نے حق اور حقیقت کو پہچان لیا اور جو اس کے غیر کی طرف اضافت کرتا ہے اور اپنے کلام میں مجاز استعمال کرتا ہے اور مجاز کے لیے بھی ایک وجہ ہے جس طرح حقیقت کے لیے کوئی وجہ ہوتی ہے اور فاعل کا لفظ واضع نے موجد کے لیے وضع کیا ہے لیکن چونکہ اس نے خیال کیا کہ انسان بھی اپنی طاقت سے اختراع اور ایجاد کرتا ہے تو اس کی حرکت کی وجہ سے اس کو فاعل کہا اور اسے حقیقت خیال کیا اور اسے وہم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف فعل کی نسبت مجازی ہے جیسے قتل کی نسبت امیر کی طرف کرنا مجاز ہے اور جلاد کی طرف نسبت حقیقی ہے۔

لیکن جب اہل حق کے لیے حق منکشف ہو گیا تو انہیں معلوم ہوا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے اور انہوں نے کہا کہ اے لغت والے! تو نے فاعل کا لفظ اختراع کرنے والے کے لیے وضع کیا ہے اور فاعل تو صرف اللہ تعالیٰ ہے لہٰذا اس

---

(۱) تذکرۃ الموضوعات ص ۲۱۳ باب الموت وفضل ذکرہ

(۲) مجمع الزوائد جلد ۴ ص ۱۷ کتاب البیوع

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۴۳۵ مرویات اسود بن سریع

کے لیے اس لفظ کا استعمال حقیقت ہے اور دوسروں کے لیے یہ لفظ مجازی طور پر استعمال ہوتا ہے یعنی واقع لغت نے اسے جس کے لیے وضع کیا وہ اس کے غیر میں استعمال کیا جا رہا ہے اور جب معنیٰ کی حقیقت بعض عرب کی زبان پر قصداً یا اتفاقیہ جاری ہوئی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی آپ نے فرمایا سب سے سچا شعر جو کسی شاعر نے کہا وہ لبید کا یہ قول ہے

اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهِ بَاطِلُ (۱) سنو! اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز باطل ہے

یعنی ہر وہ چیز جو خود بخود قائم نہیں ہو سکتی بلکہ وہ کسی دوسرے کے سہارے قائم ہے وہ ذات کے اعتبار سے باطل ہے اس کی حقیقت اور حقیقت غیر کے ساتھ ہے اپنے طور پر نہیں۔

تو حقیقت میں حق تو صرف وہی ذات ہے جو حی و قیوم ہے جس کی مثل کوئی چیز نہیں وہ ذاتی طور پر قائم ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اس کی قدرت سے قائم ہے پس وہی حق ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ باطل ہے اسی لیے حضرت سہل رحمہ اللہ نے فرمایا اے مسکین! وہ (اللہ تعالیٰ) موجود تھا اور تم نہیں تھے اور وہ ہو گا لیکن تم نہیں ہو گے آج جو تو ہو گیا تو تو کہتا ہے میں، میں، تو اسی طرح ہو جا جیسے تو تھا ہی نہیں کیوں کہ آج کا دن بھی اسی طرح ہے۔

سوال:

اب ظاہر ہوا کہ یہ سب کچھ جبر ہے (مجبوری ہے) تو پھر ثواب، عذاب، ناراضگی اور رضا کا کیا مطلب ہوا اور اس کا اپنے ہی فعل پر ناراض ہونا کیسا ہے۔

جواب:

ہم نے اس بات کے مفہوم کی طرف شکر کے بیان میں اشارہ کیا ہے اس کو دوبارہ ذکر کر کے ہم بات کو طول دینا نہیں چاہتے توحید جو توکل کی حالت پیدا کرتی ہے، کی طرف اسی قدر اشارہ کرنا ہم نے مناسب سمجھا۔ اور یہ بات اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب رحمت و حکمت پر ایمان ہو کیوں کہ توحید کی وجہ سے مسبب الاسباب کی طرف نظر جاتی ہے اور رحمت نیز اس کی وسعت پر ایمان ہی مسبب الاسباب پر اعتماد کو پیدا کرتا ہے اور جیسا کہ آگے آئے گا جب تک وکیل پر یقین نہ ہو اس وقت تک حالتِ توکل کی تکمیل نہیں ہوتی نیز کفیل کی شفقت پر دل مطمئن ہونا چاہیے۔

اور یہ ایمان بھی ایمان کے بابوں میں سے ایک عظیم باب ہے۔ اور اس سلسلے میں اہل کشف کے طریقے کا ذکر طویل ہے پس ہم اس کا ماحصل بیان کرتے ہیں تاکہ مقام توکل کے سلسلے میں طالب اس پر قطعی اعتقاد رکھے جس میں کوئی شک نہ ہو۔ یعنی اس کی یقینی تصدیق کرے جو نہ تو کمزور ہو اور نہ ہی اس میں شک ہو۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۹۶۰ کتاب الرقاق

اگر اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو سب سے زیادہ عقل والے شخص جیسی عقل اور سب سے زیادہ علم والے کی طرح علم عطا کرتا اور ان کو اتنا علم دیتا جس قدر وہ برداشت کر سکتے۔ اور ان کو ایسی حکمت عطا کرتا جس کے وصف کی کوئی انتہا نہیں پھر ان کی تعداد کے مطابق مزید علم، حکمت اور عقل عطا کرتا اس کے بعد ان کے لیے تمام امور کا انجام منکشف کر دیتا اور اسرار ملکوت پر ان کو مطلع کرتا ان کو اپنے کرم کی باریکیاں اور سزاؤں کی خفیہ باتیں سمجھا دیتا حتیٰ کہ وہ اس کے ذریعے خیر و شر اور نفع و نقصان پر مطلع ہو جاتے پھر ان کو حکم دیتا کہ تمہیں جو علوم اور حکمتیں عطا کی گئی ہیں ان کے ذریعے ملک و ملکوت کی تدبیر کرو تو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے ساتھ دنیا اور آخرت میں جو تدبیر فرمائی ہے وہ باہمی تعاون کے باوجود اس میں مچھر کے پر کے برابر بھی اضافہ نہ کر سکتے اور نہ ہی اس قدر کمی کر سکتے۔ نہ اس سے ایک ذرہ اوپر نیچے کر سکتے اور کسی آزمائش میں مبتلا شخص سے بیماری، عیب، نقص، فقر اور ضرر کو بھی دور نہ کر سکتے اور نہ ہی کسی سے صحت، کمال، مالداری اور نفع کو دور کر سکتے جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں پیدا فرمایا اگر اس کی طرف نظر دوڑائیں اور غور سے دیکھیں تو بھی انہیں اس میں کوئی فرق اور قصور نظر نہیں آئے گا اور اللہ تعالیٰ نے بندوں کے درمیان جو رزق، موت، خوشی اور غم، عاجزی اور طاقت، ایمان اور کفر، عبادت اور گناہ کی تقسیم فرمائی ہے وہ محض عدل ہے اس میں کوئی ظلم نہیں ہے اور یہ محض حق ہے جس میں زیادتی نہیں بلکہ یہ واجب حق کی ترتیب پر ہے جیسے چاہیے اور جس قدر چاہیے اور اس سے زیادہ اچھا اور زیادہ کامل ممکن ہی نہیں اور بالفرض اس سے زیادہ بہتر ترتیب ممکن تھی اور قدرت کے باوجود اس نے اسے روک کے رکھا اور اسے عمل میں لا کر بندوں کو عنایت نہیں کی تو یہ بخل ہے جو جُود و سخاوت کے خلاف ہے اور ظلم ہے جو عدل کے خلاف ہے اور اگر وہ اس سے بہتر پر قادر نہیں تھا تو یہ عجز ہوگا جو اس کے معبود ہونے کے خلاف ہے بلکہ جو فقر اور ضرر ہے وہ دنیوی اعتبار سے نقصان اور آخرت کے اعتبار سے زیادتی ہے۔ اور جو بات کسی شخص کے حوالے سے آخرت میں نقصان ہے وہ دوسرے کی نسبت سے نعمت ہے کیوں کہ رات نہ ہوتی تو دن کی قدر معلوم نہ ہوتی اور اگر بیماری نہ ہوتی تو تندرست لوگ صحت سے کیسے لطف اندوز ہوتے اور اگر جہنم نہ ہوتا تو اہل جنت کو نعمت کی قدر کیسے معلوم ہوتی۔

اور جس طرح انسانوں کی رُوحوں کے لیے جانوروں کی ارواح کو قربان کرنا اور انسانوں کو ان کے ذبح کرنے پر کنٹرول دینا ظلم نہیں بلکہ کامل کو ناقص پر ترجیح دینا اور مقدم کرنا عین عدل ہے اسی طرح جنتی لوگوں کو زیادہ نعمت دینے کی خاطر جہنمیوں کو زیادہ سزا دینا اور اہل ایمان پر کفار کو قربان کر دینا بھی عین عدل ہے اور جب تک ناقص کو پیدا نہ کیا جائے کامل کی پہچان نہیں ہوتی اور اگر جانور پیدا نہ کیے جاتے تو انسان کا شرف ظاہر نہ ہوتا۔ کیوں کہ کمال اور نقص اضافت سے ظاہر ہوتا ہے پس جُود و حکمت کا تقاضا تھا کہ کامل اور ناقص دونوں کو پیدا کیا جائے۔

اور جس طرح رُوح کی بقا کے لیے گل سڑ جانے والے ہاتھ کو کاٹنا عدل ہے کیونکہ یہ ناقص کو کامل پر قربان کرنا ہے

اسی طرح دنیا اور آخرت کے سلسلے میں انسانوں کی تقسیم میں رزق کا معاملہ بھی ہے یہ سب کچھ انصاف ہے ظلم و زیادتی نہیں اور حق ہے کھیل کود نہیں۔

اور یہ بیان بھی ایک بہت گہرا سمندر ہے جس کے کنارے بہت دبیع ہیں اس کی موجیں اضطراب میں ہیں اور وسعت میں یہ توحید کے سمندر کے قریب ہے اس میں کئی کم عقل ڈوب گئے اور ان کو معلوم نہ ہو سکا کہ یہ ایک گہرا معاملہ ہے اور اسے صرف علماء ہی جان سکتے ہیں۔ اور اس بحر کے کنارے کے بعد تقدیر کا راز ہے جس میں اکثر لوگ حیران ہیں اور اہل کشف کو اس راز کے افشاء سے منع کیا گیا ہے۔

حاصل یہ ہوا کہ خیر اور شر کا فیصلہ کیا گیا ہے اور جس چیز کا فیصلہ ہو گیا وہ مشیت کے بعد واجب ہو جاتی ہے پس اس کے حکم کو کوئی رد نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی اس کی قضاء اور امر کو ٹال سکتا ہے بلکہ ہر چھوٹی اور بڑی چیز لکھی ہوئی ہے اور معلوم مقدار کے ساتھ اس کے حصول کا انتظار ہے اور جس چیز نے تم تک پہنچنا ہے وہ تم سے خطا نہیں کر سکتی اور جس نے تم تک نہیں پہنچنا وہ پہنچ نہیں سکتی علوم مکاشفہ جو مقام توکل کے اصول میں ان کے بارے میں اسی قدر بیان پر اکتفا کرتے ہیں اور اب ان شاء اللہ علم معاملہ کی طرف لوٹیں گے اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور وہی کارساز ہے۔

دوسرا حصہ:

توکل اور اس کے اعمال

اس حصے میں درج ذیل امور بیان ہوں گے۔

(۱) حالِ توکل۔
(۲) توکل کی تعریف میں بزرگوں کے اقوال
(۳) مجرد اور عیالدار کے لیے کسب میں توکل
(۴) جمع نہ کر کے توکل کرنا۔
(۵) ضرر رساں امور کو دور کرنے میں توکل
(۶) دوا وغیرہ کے ذریعے ضرر کو دور کرنے میں توکل
(۷) اور اللہ تعالیٰ ہی اپنی رحمت کے ساتھ توفیق دینے والا ہے۔

فصل ۱:

توکل کا حال

ہم نے پہلے ذکر کیا ہے کہ توکل علم، حال اور عمل سے بنتا ہے اور علم کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔

جہاں تک حال کا تعلق ہے تو حقیقت میں توکل حال ہی کا نام ہے جب کہ علم اس کی بنیاد ہے اور عمل اس کا نتیجہ ہے غور و خوض کرنے والوں نے توکل کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے اور ان کی عبارات میں اختلاف ہے اور ہر ایک نے اپنے ذاتی مقام کے حوالے سے بات کرتے ہوئے توکل کی تعریف بیان کی ہے جس طرح اہل تصوف کی عادت ہے لیکن زیادہ باتیں نقل کرنے کا کیا فائدہ۔ ہم اصل حقیقت واضح کرتے اور اس سے پردہ اٹھاتے ہیں تو بات یہ ہے کہ توکل وکالت سے مشتق ہے کہا جاتا ہے فلاں نے اپنا معاملہ فلاں کے سپرد کر دیا اس کے لیے "وَکَّلَ" کا لفظ ہوتا ہے گویا اس نے اس معاملے میں اس پر اعتماد کر لیا اور معاملہ جس کے سپرد کیا جائے وہ "وکیل" ہوتا ہے اور جو کام اس کے سپرد ہوتا ہے اس "متکل علیہ" یا "متوکل علیہ" کہا جاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وکیل پر نفس مطمئن ہو اور اس پر یقین کرے نہ تو اس پر کوتاہی کی تہمت لگائے اور نہ ہی اس کے بارے میں عجز و قصور کا اعتقاد رکھے۔

تو گویا توکل صرف وکیل پر قلبی اعتماد کا نام ہے اب ہم مقدمات کے وکیل کو فرض کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں جب کسی نے کسی شخص پر فریب سے جھوٹا دعویٰ کیا اور اس نے مقدمے کے لیے وکیل مقرر کیا جو اس فریب کا پردہ چاک کرے تو اس وقت یہ اس پر بھروسہ کرنے والا اور یقین کرنے والا نہیں ہو سکتا اور نہ اس کو وکیل بنانے سے مطمئن ہو سکتا ہے جب تک اس کے بارے میں چار امور کا خیال نہ کرے نہایت درجے کی ہدایت، انتہائی درجہ کی قوت بہت زیادہ فصیح اور نہایت ہی شفیق ہونا۔

ہدایت کی شرط اس لیے ہے کہ وہ (وکیل) فریب کی جگہ کو پہچان سکے تاکہ اس پر باریک قسم کے حیلے بہانے بھی مخفی نہ رہیں۔ اور قدرت و قوت کی ضرورت اس لیے ہے کہ وہ حق بات کو کسی منافقت کے بغیر واضح طور پر بیان کرنے کی جرأت کر سکے نہ ڈرے نہ شرمائے اور نہ بزدل بن جائے کیوں کہ بعض اوقات وہ دشمن کے فریب کی وجہ جان لیتا ہے لیکن خوف اور بزدلی اس کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے یا حیا آڑے آتا ہے یا کوئی دوسری رکاوٹ جو دل کو کمزور کر دیتی ہے وضاحت نہیں کرنے دیتی۔

فصاحت بھی ایک قسم کی طاقت ہی ہے لیکن اس قدرت کا تعلق زبان سے ہے کہ جس بات کی دل جرأت کرتا ہے اسے زبان بڑی آسانی سے بیان کر سکے فریب کے مقامات سے آگاہ ہر شخص اپنی زبان کے پھسلنے کی وجہ سے فریب کا عقدہ نہیں کھول سکتا۔

وکیل میں حد درجہ شفقت کا ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اس طرح وہ ہر قسم کی ممکنہ کوشش کر سکتا ہے کیوں کہ جب تک وہ مہربان نہ ہو تو اس کی طاقت کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جب وہ اس (موکل) کے معاملے کو اہم نہ سمجھتا ہو تو کیا فائدہ؟ وہ اس بات کی پرواہ نہ کرتا ہو کہ دشمن اس پر غالب آتا ہے یا نہیں اس کا حق مارا جاتا ہے یا نہیں؟

اگر وکیل میں ان چار صفات کے بارے میں شک ہو یا ایک میں شک ہو یا یہ خیال ہو کہ مخالف ان چار صفات میں زیادہ کامل ہے،

تو اس صورت میں وکیل پر نفس مطمئن نہیں ہوتا بلکہ دل میں کھٹکا رہتا ہے اور وہ ایسے حیلے اور تدبیر کی تلاش میں رہتا ہے جس کے ذریعے اس بات کا دفاع کرے جس کے بارے میں وکیل کی کوتاہی کی وجہ سے اسے ڈر ہوتا ہے اور دشمن کے غلبے کا بھی خوف رہتا ہے اور جس قدر وکیل میں ان صفات کے بارے میں عقیدے میں تفاوت ہوگا اسی اعتبار سے یقین و اطمینان کی شدت میں بھی اس کے احوال کا درجہ مختلف ہوگا اور عقیدے اور خیالات کی قوت میں اختلاف اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ شمار میں نہیں آسکتا۔ اسی لیے اطمینان اور اعتماد کے سلسلے میں توکل کرنے والوں کے احوال کا تفاوت بہت زیادہ ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ یقین تک پہنچ جائے جس میں کوئی کمزوری نہیں ہوتی جیسے وکیل، موکل کا والد ہو اور وہ اس کے لیے حلال و حرام جمع کرنے کی کوشش کرتا ہو تو اس (بیٹے) کو اس وکیل (باپ) کی انتہائی شفقت و عنایت کا یقین ہوگا اور چار خصلتوں میں سے ایک خصلت تو قطعی ہوگی اسی طرح دیگر خصلتوں کے بارے میں بھی یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ ان میں قطعیت حاصل ہو۔ اور اس کی بنیاد طویل تو یہ ہے نیز ایسی خبروں کا تواتر سے آنا ہے کہ یہ سب لوگوں سے زیادہ فصیح اللسان ہے اور بیان پر زیادہ قادر ہے نیز حق کی مدد پر سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہے بلکہ حق کو باطل اور باطل کو حق بنانے پر قادر ہے۔

جب تمہیں اس مثال سے توکل کی پہچان ہوگئی تو اللہ تعالیٰ پر توکل کو بھی اس پر قیاس کرلو اگر کشف یا پختہ عقیدے کے ذریعے تمہارے دل میں یہ بات ثابت ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی فاعل نہیں جیسا کہ پہلے بیان ہوچکا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تمہارا یہ اعتقاد بھی ہو کہ وہ بندوں کی کفایت کے لیے مکمل علم اور قدرت رکھتا ہے پھر اس کا لطف و عنایت اور رحمت تمام بندوں کو اجتماعی اور انفرادی طور پر شامل ہے اور اس کی قدرت سے بڑھ کر کوئی قدرت نہیں اور نہ ہی اس کے علم سے اوپر کوئی علم ہے اسی طرح اس کی عنایت اور رحمت سے بڑھ کر کوئی رحمت و عنایت بھی نہیں تو لامحالہ تمہارا دل صرف اسی ذات پر توکل کرے گا اور کسی دوسرے کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوگا بلکہ اپنی ذات اور قوت کی طرف بھی توجہ نہیں کرے گا کیوں کہ نیکی کرنے اور برائی سے بچنے کی قوت تو صرف اللہ تعالیٰ سے ہی حاصل ہوتی ہے جیسے توحید کے ذکر میں حرکت اور قدرت کے بیان میں گزر گیا ہے کیوں کہ حول حرکت کو کہتے ہیں اور قوت، قدرت کا نام ہے۔

پس اگر تمہیں اپنے نفس سے یہ حالت حاصل نہ ہو تو اس کا سبب دو باتیں ہوں گی یا تو ان چار خصلتوں کے بارے میں تمہارا یقین کمزور ہے اور اس کی وجہ دل کی کمزوری اور اس پر بزدلی کے غلبہ کی وجہ سے اس کا بیمار ہونا ہے اور جو وہم اس پر غالب ہیں ان کی وجہ سے وہ بے قرار ہوتا ہے کیوں کہ بعض اوقات دل وہم کے تابع ہوتا ہے اور اس کی اطاعت کرتے ہوئے وہ بے چین ہوتا ہے حالانکہ یقین میں کوئی کمی نہیں ہوتی کیوں کہ جو شخص شہد استعمال کر رہا ہے اگر اس کے سامنے اسے گندگی کے ساتھ تشبیہ دی جائے تو بعض اوقات اس کی طبیعت نفرت کرتی ہے اور اس کے لیے شہد کا استعمال مشکل ہوجاتا ہے اور اگر کسی عقل مند کو کہا جائے کہ میت کے ساتھ قبر میں یا اس کے بستر پر لیٹ جاؤ یا گھر میں اس کے ساتھ رہو تو اس سے اس کی طبیعت متنفر ہوتی ہے اگرچہ اسے یقین ہوتا ہے کہ یہ مرچکا ہے یا یہ کہ

اس وقت وہ جماد (غیر متحرک) ہے اور اللہ تعالیٰ کا جاری طریقہ یہی ہے کہ وہ اسے اس وقت نہیں اٹھائے گا اور نہ ہی اسے زندہ کرے گا اگرچہ وہ اس پر قادر ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی عادت کریمہ یہی ہے کہ جو قلم آدمی کے ہاتھ میں اسے وہ سانپ میں نہیں بدلتا اور نہ بلی کو شیر میں بدلتا ہے حالانکہ وہ اس بات پر قادر ہے لیکن اس یقین کے باوجود اس کی طبیعت میت کے ساتھ بستر پر لیٹنے یا اس کے ساتھ گھر میں ہونے سے نفرت کرتی ہے۔

حالانکہ دیگر جمادات سے وہ نفرت نہیں کرتا یہ دل کی بزدلی ہے اور یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے کوئی بھی انسان اس سے خالی نہیں ہوتا اگرچہ کم ہی ہو اور بعض اوقات تو یہ بزدلی مضبوط ہو کر مرض بن جاتی ہے حتیٰ کہ آدمی گھر میں اکیلا رہنے سے ڈرتا ہے حالانکہ دروازے کو مضبوط تالہ لگا ہوتا ہے۔

لہٰذا توکل اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک دل کی قوت اور یقین کی قوت دونوں حاصل نہ ہوں کیوں کہ ان دونوں کے ذریعے دل کا سکون اور طمانینت حاصل ہوتی ہے پس دل کا سکون الگ چیز ہے اور یقین الگ بات ہے کتنی ہی مرتبہ یقین ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ اطمینان قلبی نہیں ہوتا، جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا۔

اَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ۔ (۱) کیا تمہارا ایمان نہیں عرض کیا ہاں کیوں نہیں لیکن اس لیے سوال کیا ہے) کہ اطمینان قلبی حاصل ہو جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہ خداوندی میں عرض کیا تھا کہ میں اپنی آنکھوں سے مردے کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ یہ بات میرے خیال میں بیٹھ جائے کیوں کہ نفس خیال کے تابع ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ اطمینان حاصل ہوتا ہے اور ابتدائی مرحلے میں یقین کے ساتھ اطمینان حاصل نہیں ہوتا حتیٰ کہ آخر میں نفس مطمئنہ کے درجے تک پہنچ جائے۔ اور شروع میں یہ بات بالکل نہیں ہوتی کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو مطمئن ہوتے ہیں لیکن ان کو یقین حاصل نہیں ہوتا جس طرح دیگر مذاہب کے لوگ ہیں یہودی کو اپنی یہودیت پر اطمینان قلبی حاصل ہے اسی طرح نصرانی کا معاملہ ہے لیکن ان لوگوں کو یقین بالکل نہیں ہوتا وہ گمان اور نفس کی خواہش کے تابع ہوتے ہیں ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آئی اور وہ یقین کا سبب ہے لیکن انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا۔

غرضیکہ بزدلی اور جرأت (دونوں) فطری باتیں ہیں اور ان کی موجودگی میں یقین مفید نہیں ہوتا اور یہ بھی ان اسباب میں سے ایک سبب ہے جو توکل کی ضد ہیں جس طرح (مذکورہ بالا) چار خصلتوں پر یقین کی کمزوری ایک سبب ہے۔

اور جب یہ اسباب جمع ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ پر اعتماد حاصل ہو جاتا ہے کہا گیا ہے کہ تورات میں لکھا ہے۔

مَلْعُوْنٌ مَّنْ ثِقَتُهٗ اِنْسَانٌ مِّثْلُهٗ ۔ جس شخص کا اپنے جیسے انسان پر توکل ہو وہ ملعون ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنِ اسْتَعَزَّ بِالْعَبِيْدِ اَذَلَّهٗ جو شخص بندوں سے عزت طلب کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے

اللہ (۱) ذلیل کرتا ہے۔

اور جب تمہارے لیے توکل کا معنیٰ واضح ہو گیا اور تمہیں وہ حالت معلوم ہو گئی جسے توکل کا نام دیا گیا ہے تو جان لو کہ قوت و ضعف کے اعتبار سے اس حالت کے تین درجے ہیں۔

توکل کے درجات:

پہلا درجہ وہ ہے جس کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کی کفالت و عنایت پر اعتماد کے سلسلے میں اس کا حال اسی طرح ہو جس طرح وکیل پر اعتماد کی حالت ہوتی ہے۔

دوسرا درجہ زیادہ مضبوط ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی حالت اس طرح ہو جس طرح بچے کا حال اس کی ماں کے ساتھ ہوتا ہے وہ اس کے سوا نہ تو کسی کو جانتا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے سے فریاد کرتا ہے اور اعتماد بھی صرف اسی پر کرتا ہے جب وہ اسے دیکھتا ہے تو ہر حال میں اس کے دامن سے لپٹ جاتا ہے اور اسے نہیں چھوڑتا اور اگر ماں کی عدم موجودگی میں اسے کوئی بات پیش آتی ہے تو اس کی زبان پر سب سے پہلے یہی الفاظ آتے ہیں "اے ماں!" اور اس کے دل میں سب سے پہلے ماں ہی کا خیال آتا ہے کیوں کہ وہی اس کا ٹھکانہ ہے اس نے اس کی کفالت، کفایت اور شفقت پر ایسا اعتماد کیا ہے جو ایک قسم کے ادراک سے خالی نہیں اور اس کی تمیز اور سمجھ کے مطابق ہے اور یوں گمان کیا جا سکتا ہے کہ یہ طبعی بات ہے کیوں کہ اگر بچے سے ان باتوں کی تفصیل معلوم کی جائے تو وہ الفاظ کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا اور نہ ہی ذہن میں تفصیلاً حاضر کر سکتا ہے لیکن یہ سب باتیں ادراک کے سوا ہیں پس جس شخص کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو وہ اسی کی طرف دیکھے اور اسی پر اعتماد کرے تو وہ اس کا اسی طرح شوق رکھے گا جس طرح بچہ اپنی ماں کا اشتیاق رکھتا ہے تو وہی شخص حقیقت میں متوکل ہے کیوں کہ بچہ اپنی ماں پر ہی توکل کرتا ہے ان دونوں درجوں پر فائز لوگوں میں فرق یہ ہے کہ یہ شخص ایسا متوکل ہے کہ اپنے توکل ہی خود توکل سے بے خبر ہے کیوں کہ اس کا دل توکل اور اس کی حقیقت کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ جس پر توکل ہے اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اس متوکل علیہ (جس پر توکل ہے) کے غیر کے لیے اس کے دل میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی جب کہ پہلی قسم کا آدمی تکلف اور کسب کے ساتھ توکل کرتا ہے اور وہ اپنے توکل سے فانی نہیں ہوتا کیوں کہ وہ اپنے توکل کی طرف توجہ بھی کرتا ہے اور اسے اس کا شعور بھی ہوتا ہے اور یہ ایسی مشغولیت ہے جو صرف متوکل علیہ کے ملاحظہ سے دور رکھتی ہے جب حضرت سہیل رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ توکل کا ادنیٰ مرتبہ کیا ہے؛ تو انہوں نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا آرزوؤں کا ترک کرنا سائل نے پوچھا درمیانہ درجہ کیا ہے؟

فرمایا اختیار کو چھوڑ دینا اور یہ دوسرے درجہ کی طرف اشارہ ہے اور اعلیٰ درجہ کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اس

---

(۱) کنز العمال جلد ۹ ص ۷۷، حدیث ۲۵۰۴۲

کا ذکر نہ کیا اور فرمایا اس کی پہچان اسی شخص کو ہو سکتی ہے جو اس کے اوسط درجے تک پہنچ جائے۔

تیسرا درجہ سب سے اعلیٰ ہے وہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح ہو جائے جس طرح غسل دینے والے کے سامنے میت ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو مردہ سمجھے کہ قدرت ازلیہ حرکت دے رہی ہے جیسے غسل دینے والے کا ہاتھ میت کو حرکت دے رہا ہے یہی وہ شخص ہے جس کا یقین اس بات پر مضبوط ہے کہ حرکت دینے والا، قدرت، ارادے علم اور دیگر تمام صفات کا مالک وہی اللہ تعالیٰ ہے اور یہ سب باتیں جبراً ہوتی ہیں پس وہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ اس پر کیا حکم جاری ہوتا ہے اور بچے سے اس کا معاملہ جدا ہوتا ہے کیوں کہ بچہ اپنی ماں کی طرف فریاد کرتا ہے، چیختا ہے اس کے دامن سے لپٹتا ہے اور اس کے پیچھے دوڑتا ہے (اور یہ ایسا نہیں کرتا) بلکہ یہ اس بچے کی طرح ہے جسے یہ معلوم ہے کہ اگر وہ اپنی ماں کے لیے نہ بھی تڑپے تو بھی ماں اسے تلاش کرے گی اگر وہ اس کے دامن سے نہ بھی لپٹے پھر بھی وہ اسے اٹھائے گی اگر وہ ماں سے دودھ نہ بھی مانگے تو بھی وہ اسے خود اپنے آپ دودھ پلائے گی توکل میں یہ وہ مقام ہے کہ آدمی دعا کرنا اور سوال کرنا چھوڑ دیتا ہے کیوں کہ اسے اللہ تعالیٰ کے کرم اور عنایت پر اعتماد ہوتا ہے اور سوال کی بجائے جو کچھ وہ خود اپنی طرف سے (ابتداءً) دیتا ہے وہ افضل ہے کتنی ہی نعمتیں سوال و دعا سے پہلے اور استحقاق کے بغیر ملتی ہیں ——— دوسرا مقام دعا اور سوال کو چھوڑنے کا تقاضا نہیں کرتا وہ صرف غیر سے سوال کو چھوڑنے کا تقاضا کرتا ہے۔

سوال:

کیا ان احوال کے پائے جانے کا تصور کیا جاسکتا ہے؟

جواب:

جان لو کہ یہ بات محال نہیں ہے البتہ بہت ہی نادر ہے جب کہ دوسرا اور تیسرا مقام تو بالکل ہی نادر ہے البتہ پہلے مقام کا امکان ہے پھر جب دوسرا اور تیسرا مقام پایا جائے تو اس کا دوام بہت مشکل ہے بلکہ قریب ہے کہ تیسرا مقام دوام کے اعتبار سے خوف کی زردی کی طرح ہو کیوں کہ دل کا قوت اور دیگر اسباب کو دیکھ کر خوش ہونا ایک طبعی بات ہے جب کہ اس کا رکنا اور پریشانی عارضی ہے اور خوف کا مطلب یہ ہے کہ خون ظاہری چہرے سے باطن کی طرف سمٹ جاتا ہے حتیٰ کہ ظاہری چمڑے کی سرخی جو جلد کے باریک پردے میں سے جھلکتی تھی چلی جاتی ہے کیوں کہ جلد ایک باریک پردہ ہے اس کے پیچھے سے خون کی سُرخی نظر آتی ہے اور جب خون سمٹ جاتا ہے تو زردی ظاہر ہوتی ہے لیکن یہ دائمی نہیں ہوتی اسی طرح دل کا قوت و قدرت اور دیگر ظاہری اسباب سے پھر جانا اور سکڑ جانا بھی عارضی ہوتا ہے۔

جہاں تک دوسرے مقام کا تعلق ہے تو وہ بخار والے کی زردی کی طرح ہے کیوں یہ ایک دو دن باقی رہتی ہے اور پہلی زردی اس بیمار کی زردی کی طرح ہے جس کا مرض پکا ہو گیا ہو اس کا ہمیشہ رہنا بھی دشوار نہیں ہوتا اور زائل ہونا بھی۔

سوال: کیا ان احوال میں بندے کے ساتھ تدبیر اور اسباب کا تعلق باقی رہتا ہے۔

جواب :

تیسرا مقام تو تدبیر کی بالکل نفی کرتا ہے جب تک یہ حالت باقی ہو بلکہ ایسا آدمی، حیران و پریشان شخص کی طرح ہوتا ہے دوسرے مقام میں ہر تدبیر کی نفی ہو جاتی ہے البتہ اللہ تعالیٰ سے فریاد کرنا اور سوال کرنا باقی رہتا ہے جیسے بچہ صرف اپنی ماں سے تعلق رکھتا ہے اور پہلے مقام میں تدبیر اور اختیار کی بالکل نفی نہیں ہوتی البتہ بعض تدبیروں کی نفی ہوتی ہے جیسے کوئی شخص اپنے مقدمات میں وکیل پر توکل کرتا ہے وہ وکیل کے غیر کے حوالے سے تدبیر کو چھوڑ دیتا ہے لیکن جس تدبیر کی طرف وکیل اشارہ کرتا ہے اسے ترک نہیں کرتا یا اسے اپنے آپ تجربے سے معلوم کر لیتا ہے کہ یہ وکیل کی عادت اور طریقے سے ہے وکیل واضح اشارہ نہیں دیتا۔

جس بات کو وہ اس کے اشارے سے معلوم کرتا ہے اس کی مثال اس طرح ہے کہ وہ کہتا ہے کہ جب تم موجود ہو گے اسی وقت میں گفتگو کروں گا تو وہ لازماً حاضری کی تدبیر میں مشغول ہوتا ہے اور یہ بات اس پر توکل کے خلاف نہیں ہے کیوں کہ یہ بات حجت کے اظہار کے سلسلے میں اپنی قوت یا کسی دوسرے کی قوت کی طرف فریاد رسی نہیں ہے بلکہ یہ بات توکل کی تکمیل سے ہے کہ جو کچھ وکیل اس سے کہے وہ کام کرے کیوں کہ اگر وہ اس پر بھروسہ نہ کرتا اور نہ اس کی بات پر اعتماد ہوتا تو اس کے کہنے پر حاضر نہ ہوتا اور دوسری بات جو وکیل کی عادت سے معلوم ہے اس کے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی وہ اس طرح ہے کہ موکل جانتا ہے کہ اس کا وکیل مخالف سے دستاویز کے بغیر نہیں لڑتا تو اگر وہ اس پر توکل کرتا ہے تو اس توکل کی تکمیل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس وکیل کے طریقے پر کاربند ہو اور اس کے تقاضوں کو پورا کرے اور اس کی صورت یہ ہے کہ جب مقدمہ لڑا جائے تو دستاویزات ساتھ لے کر جائے۔

تو دستاویزات پیش کرنے اور خود حاضر ہونے کے سلسلے میں تدبیر کو چھوڑ نہیں سکتا۔ اگر ان میں سے کسی بات کو چھوڑے گا تو یہ توکل میں نقص ہوگا پس ان دونوں باتوں کی بجا آوری توکل میں نقصان کا باعث کیسے ہو سکتی ہے ہاں جب وکیل کے کہنے پر خود بھی حاضر ہو جائے اور دستاویزات بھی لے آئے اور بیٹھ کر اس کی دلیل بھی دیکھے سنے تو بعض اوقات یہ بات دوسرے اور تیسرے مقام تک پہنچا دیتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ پریشان آدمی کی طرح ہو جاتا ہے جو منتظر ہے اور وہ اپنی قوت و طاقت کی طرف رجوع نہیں کرتا کیوں کہ اس کی اپنی طاقت اور حرکت باقی نہیں رہی کیوں کہ اپنی قوت پر اعتماد اس وقت تک تھا جب تک حاضر نہ ہوا تھا اور نہ دستاویز لایا تھا کیوں کہ اس بات کی طرف وکیل کا اشارہ یا اس کا طریقہ تھا اور اب یہ بات اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اب تو اطمینان قلبی اور وکیل پر اعتماد نیز کیا فیصلہ ہوتا ہے؟ اس بات کا انتظار باقی ہے۔

جب تم اس بات کو سمجھ جاؤ گے تو توکل کے بارے میں تمام خدشات دور ہو جائیں گے اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہر تدبیر اور عمل کو چھوڑنا توکل کے لیے شرط نہیں ہے اور نہ یہ بات کہ توکل کی صورت میں کسی قسم کی تدبیر اور عمل جائز نہیں بلکہ اس میں تقسیم ہے جس کی تفصیل اعمال کے ذکر میں آئے گی۔

لہٰذا موکل (یا متوکل) کا اپنی حاضری اور دستاویز حاضر کرنے میں اپنی قوت و حرکت پر اعتماد توکل کے خلاف نہیں ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر وکیل نہ ہوتا تو اس کا حاضر ہونا یا دستاویز کو لانا باطل اور بلا فائدہ تھا کاوٹ کے بغیر کچھ نہ تھا۔ تو اس وقت فائدہ اس لحاظ سے نہیں کہ یہ اس کی اپنی قوت و طاقت ہے بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ وکیل نے مقدمہ لڑنے کے لیے اسے اس بات کا پابند کیا ہے اور اشارے سے اس کو یہ بات سمجھائی ہے لہٰذا اب تو وکیل کے بغیر کوئی طاقت و قوت نہیں ہے لیکن وکیل کے حق میں ان کلمات کا معنیٰ تکمیل کو نہیں پہنچتا کیوں کہ وکیل اس کی قوت کا خالق نہیں ہے بلکہ وکیل نے اس کی ان قوتوں کو مفید بنا دیا کیوں کہ اگر وکیل کا فعل نہ ہوتا تو یہ فائدہ نہ دیتیں۔ اور یہ بات سچے وکیل یعنی اللہ تعالیٰ کے حق میں صادق آتی ہے کیوں کہ حرکت و قوت کا خالق تو وہی ہے جیسا کہ اس سے پہلے توحید کے بیان میں گزر چکا ہے اسی نے ان دونوں کو مفید بنایا کیوں کہ ان کو ان فوائد و مقاصد کی شرط بنایا جن کو ان کے بعد پیدا کرتا ہے۔

تو "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" بالکل درست اور ٹھیک ہے اور جو شخص ان سب امور کا مشاہدہ کرتا ہے اس کے لیے بہت بڑا ثواب ہے جیسا کہ احادیث مبارکہ میں "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" پڑھنے والے کے بارے میں آیا ہے (۱)

بعض اوقات اس بات کو عقل کے بعید سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس قدر اجر ان کلمات پر کیسے ملے گا حالاں کہ ان کلمات کو زبان سے بسہولت ادا کیا جاتا ہے اور ان الفاظ کے مفہوم کا قلبی اعتقاد بھی آسان ہے لیکن یہ بات نہیں بلکہ یہ اس مشاہدے کی جزا ہے جس کا ذکر ہم نے توحید کے بیان میں کیا ہے اور اس کلمہ اور اس کے ثواب کی نسبت "لا الہ الا اللہ" اور اس کے ثواب کی طرف اسی طرح ہے جیسے ایک کلمے کے معنیٰ کو دوسرے کلمہ کے معنیٰ کی طرف نسبت ہے کیوں کہ اس کلمہ میں صرف دو باتوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ایک حول اور دوسری قوت، اور لا الہ الا اللہ میں تمام باتوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے تو غور کیجئے کل اشیا اور دو چیزوں کے درمیان کتنا فرق ہے تاکہ تم "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" کے مقابلے میں "لا الہ الا اللہ" کے ثواب کی پہچان حاصل کر سکو۔

جس طرح ہم نے اس سے پہلے ذکر کیا کہ توحید کے دو چھلکے اور دو مغز ہیں اسی طرح اس کلمے اور دیگر کلمات کا معاملہ بھی ہے۔ اور اکثر لوگ چھلکوں میں پھنس گئے اور مغزوں کی طرف ان کا جھکاؤ نہیں ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں اسی طرف اشارہ ہے آپ نے فرمایا:

مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ صَادِقًا مِنْ قَلْبِهٖ مُخْلِصًا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ۔ (۱)

جو شخص سچے دل سے اخلاص کے ساتھ لا الہ الا اللہ پڑھے اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے۔

---

(۱) المستدرک للحاکم جلد اول ص ۲۴۰ کتاب الدعاء

(۲) المعجم الکبیر للطبرانی جلد ۵ ص ۱۹۷ حدیث ۵۰۴

اور جہاں آپ نے مطلق ذکر فرمایا صدق اور اخلاص کا ذکر نہیں کیا تو اس مطلق سے یہی مقید مراد ہے جس طرح بعض مقامات پر مغفرت کی اضافت ایمان اور اعمال صالحہ کی طرف فرمائی اور جس جگہ صرف ایمان کا ذکر کیا تو اس سے مراد بھی وہی ایمان ہے جو اعمال صالحہ کے ساتھ مقید ہے اس لیے کہ آخری سلطنت محض زبانی بات سے نہیں ملتی اور زبان کی حرکت بات ہے اور دل کا عقد بھی بات ہی ہے البتہ اسے حدیثِ نفس کہتے ہیں صدق اور اخلاص ان دونوں باتوں کے علاوہ ہیں اور شاہی تخت صرف مقربین کے لیے بچھتا ہے اور وہ مخلص لوگ ہیں ہاں ان میں سے جو لوگ اصحاب یمین میں ان لوگوں کے رتبے کے قریب ہوں ان کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں درجات ہیں اگرچہ وہ اس سلطنت تک نہیں پہنچ سکتے کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب اللہ تعالیٰ نے سورۂ واقعہ میں مقربین سابقین کا ذکر کیا تو ان کے لیے تخت کا ذکر بھی فرمایا۔

ارشاد خداوندی ہے :-

عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَةٍ مُّتَّكِـِٕيۡنَ عَلَيۡهَا مُتَقٰبِلِيۡنَ ۔ (۱)	جڑے ہوئے تختوں پر ہوں گے ان پر تکیہ لگائے ہوئے آمنے سامنے۔

اور جب اصحاب یمین تک معاملہ پہنچا تو پانی، سائے، پھلوں، درختوں اور حور عین کے ذکر سے زائد کوئی بات نہیں فرمائی اور یہ سب چیزیں جس کی طرف نظر کی جائے، جس چیز کو پیا جائے جس کو کھایا جائے اور جس سے نکاح کیا جائے اس کے حوالے سے لذتیں ہیں اور یہ باتیں ہمیشہ جانوروں کے لیے متصور ہوتی ہیں اور جانوروں کی لذت کا اُخروی سلطنت، اعلیٰ علیین میں اترنے اور بارگاہ خداوندی کی حاضری کی لذت سے کیا مقابلہ ہے اگر ان لذتوں کی کوئی قدر ہوتی تو جانوروں کے لیے ان کی فراوانی نہ ہوتی اور ان پر فرشتوں کا درجہ بلند نہ ہوتا۔

کیا تم دیکھتے ہو کہ جانور جو باغوں میں کھلے پھرتے ہیں پانی، درختوں اور طرح طرح کے کھانوں سے نفع اندوز ہوتے ہیں جفتی کرتے کے ذریعے نفع حاصل کرتے ہیں زیادہ بلند، زیادہ لذیذ اور شرف والے ہیں اور اس بات کے لائق ہیں کہ اصحاب کمال کے نزدیک فرشتوں کے ان احوال کے مقابلے میں قابلِ رشک ہیں جو فرشتوں کو رب العالمین کی بارگاہ کا قرب اعلیٰ علیین میں حاصل ہے؛

ہرگز نہیں کسی شخص کو اختیار دیا جائے کہ وہ گدھا بن جائے یا حضرت جبریل علیہ السلام کے درجہ پر فائز ہو تو وہ حضرت جبریل علیہ السلام کے درجہ پر گدھے کے درجے کو کیسے پسند کرے گا۔

اور یہ بات مخفی نہیں کہ کسی چیز کی مشابہت اس کی طرف کشش کا سبب ہوتی ہے اور جس نفس کا جوتے بنانے کی طرف جھکاؤ ہو فن کتابت کی طرف جھکاؤ سے زیادہ ہو تو وہ اپنے جوہر میں کاتبوں کی نسبت جوتے بنانے والوں کے

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ واقعہ آیت ۱۵، ۱۶

زیادہ مشابہ ہے اسی طرح جانوروں کی لذات کے حصول کی طرف نفس کا جھکاؤ ملائکہ کی لذات پانے کی طرف جھکاؤ کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے کیوں کہ وہ فرشتوں کے مقابلے میں جانوروں کے زیادہ مشابہ ہے انہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۔ وہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے۔ (۱)

اور وہ زیادہ بھٹکے ہوئے اس لیے ہیں کہ جانوروں میں فرشتوں کا درجہ طلب کرنے کی قوت نہیں ہے لہٰذا ان کا اس مطلب کو چھوڑنا عاجزی کی وجہ سے ہے لیکن انسان کے بس میں یہ بات ہے اور جو شخص کمال حاصل کرنے پر قادر ہو جب وہ طلبِ کمال سے دستبردار ہو کر بیٹھ جائے تو اسے گمراہی کی طرف منسوب کر کے اس کی مذمت کرنا زیادہ مناسب ہے۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا ہم اصل مقصود کی طرف لوٹتے ہیں ہم نے "لا الہ الا اللہ" کا معنیٰ بیان کر دیا ہے اور "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کا معنیٰ بھی ذکر کر دیا ہے اور جو شخص مشاہدہ کے ساتھ یہ دونوں کلمات نہیں کہتا اس سے توکل کے حال کا تصور نہیں ہو سکتا۔

سوال :۔

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ" میں اللہ تعالیٰ کی طرف دو باتوں کی نسبت ہے اگر کوئی شخص یوں کہے،
"السماء والارض خلق اللہ" (آسمان اور زمین اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے) تو کیا اسے بھی لاحول ولا قوۃ الا باللہ" پڑھنے کی طرح ثواب ملے گا؟

جواب :

نہیں، کیوں کہ ثواب اس چیز کے درجہ کے مطابق ہوتا ہے جس پر ثواب ملتا ہے اور دونوں درجوں کے درمیان مساوات نہیں آسمان اور زمین کے بڑا ہونے اور حول وقوت کے چھوٹا ہونے کو نہ دیکھا جائے اگرچہ ان کو مجازاً چھوٹا جا سکتا ہے لیکن احکام اشخاص کے بڑا ہونے سے متعلق نہیں ہوتے بلکہ ہر عام آدمی بھی جانتا ہے کہ زمین و آسمان انسانوں کی طرف سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں لیکن حول وقوۃ کا معاملہ معتزلہ اور فلاسفہ اور ان بہت سی جماعتوں پر مشتبہ ہو گیا جو رائے اور عقل میں باریک بینی کا دعویٰ کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ بال کی کھال نکالنے کے مدعی ہیں تو یہ مہلک خطرہ اور بہت بڑی لغزش کا مقام ہے اس میں غافل لوگ ہلاک ہو گئے کیوں کہ وہ اپنے لیے ایک امر ثابت کرتے ہیں (یعنی خود فیصلہ دیتے ہیں) اور یہ توحید میں شرک اور اللہ تعالیٰ کے سوا خالق ثابت کرنا ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ اس گھاٹی کو عبور کرے اس کا

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ اعراف آیت ۱۷۹

رتبہ بلند ہوتا ہے اور اسے عظیم درجہ ملتا ہے وہی شخص "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" کہنے میں سچا ہے۔
ہم نے ذکر کیا ہے کہ توحید میں دو گھاٹیاں ہیں ان میں سے ایک آسمان، زمین، سورج، چاند، ستاروں، بادلوں، بارش اور تمام جمادات کی طرف دیکھنا ہے اور دوسرا حیوانات (جن میں انسان بھی شامل ہیں) کے اختیارات کو دیکھنا ہے اور یہ (دوسری بات) دونوں گھاٹیوں میں سے بڑی اور زیادہ خطرناک گھاٹی ہے اور ان دونوں کو طے کرلینا ہی سر توحید کا کمال ہے اسی لیے اس کلمے کا ثواب زیادہ ہے یعنی اس چیز کا مشاہدہ کرنا جس کی ترجمانی یہ کلمہ کرتا ہے۔
تو توکل کا حال اس بات کی طرف لوٹ گیا کہ انسان اپنے حول وقوت سے دستبردار ہو اور واحد حق پر توکل کرے عنقریب جب ہم توکل کے اعمال ذکر کریں گے تو اس بات کی وضاحت ہو جائے گی ان شاء اللہ۔

فصل:

احوال توکل سے متعلق بزرگوں کے اقوال

ان اقوال سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے کوئی بات خارج نہیں لیکن ہر ایک نے بعض احوال کی طرف اشارہ کیا ہے حضرت ابوموسیٰ دیلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابویزید رحمہ اللہ سے پوچھا کہ توکل کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا ہمارے اصحاب فرماتے ہیں اگر درندے اور سانپ تمہارے دائیں بائیں ہوں تو بھی تمہارے باطن میں کوئی حرکت نہ ہو، حضرت ابویزید رحمہ اللہ نے فرمایا ہاں یہ بات قریب ہے لیکن اگر اہل جنت، جنت میں نعمتوں سے متمتع ہوں اور جہنمیوں کو جہنم میں عذاب دیا جائے اور توکل والا ان کے درمیان تمیز کرے تو توکل سے نکل جائے گا۔
تو جو کچھ حضرت ابوموسیٰ علیہ الرحمۃ نے ذکر کیا وہ توکل کے بزرگ ترین احوال کی خبر ہے اور یہ مقام ثالث ہے اور جو کچھ حضرت ابویزید رحمہ اللہ نے بیان فرمایا وہ علم کی سب سے معزز نوع ہے جو توکل کی بنیادوں میں سے ہے اور وہ حکمت کا علم ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے کیا وہی ہونا چاہیے اصل عدل اور حکمت کی طرف نسبت کے حوالے سے اہل جنت اور اہل جہنم میں کوئی فرق نہیں اور یہ نہایت ہی گہرا علم ہے اور اس کے بعد تقدیر کا راز ہے اور حضرت ابویزید عام طور پر اعلیٰ مقام اور بلند ترین درجہ کے حوالے سے ہی بات کرتے تھے۔
اور سانپوں سے بچنا توکل کے پہلے مقام میں شرط نہیں ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سے بچاؤ اختیار کیا کہ (ہجرت کے موقعہ پر غار ثور میں) سانپوں کے سوراخوں کو بند کیا۔ (۱)
ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے پاؤں سے یہ کام کیا اور آپ کے دل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی یا یہ کہا جائے کہ آپ نے

---

(۱) الوفا جلد اول ص ۲۴۳، ابواب ہجرتہ الی المدینۃ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ڈرتے ہوئے ایسا کیا اپنی ذات کا خوف نہ تھا اور توکل تب زائل ہوتا ہے جب باطن میں تبدیلی اور حرکت ایسے امر کی وجہ سے ہو جو اس کی ذات کی طرف لوٹتا ہے لیکن اس میں تاویل کی گنجائش ہے اور عنقریب یہ بات بیان ہو گی کہ اس قسم کی مثالیں اور ان میں سے اکثر باتیں توکل کے خلاف نہیں ہیں کیوں کہ سانپوں کی وجہ سے باطنی حرکت خوف ہے اور توکل کرنے والے کو حق حاصل ہے کہ وہ اس سے ڈرے جس نے سانپوں کو مسلط کیا کیوں کہ سانپوں کو جو طاقت حاصل ہوئی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ملی ہے پس اگر وہ بچتا ہے تو یہ اس کی اپنی تدبیر، حرکت اور قوت پر اعتماد نہیں بلکہ حرکت، قوت اور تدبیر کے خالق پر اعتماد ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ سے توکل کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا ارباب سے علیحدگی اختیار کرنا اور اسباب سے انقطاع توکل ہے تو ارباب سے علیحدگی میں علمِ توحید کی طرف اشارہ ہے اور اسباب سے قطع تعلق اعمال کی طرف اشارہ ہے اور اس میں حال سے متعلق کوئی صریح بات نہیں کہی گئی اگرچہ ضمناً اشارہ ہے ان سے عرض کیا گیا کہ اضافہ کیجئے فرمایا اپنے نفس کو بندگی میں ڈالنا اور ربوبیت سے نکالنا (بھی توکل ہے) تو یہ صرف حرکت اور قوت سے بیزاری کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت حمدون القصار رحمہ اللہ سے توکل کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا اگر تمہارے لیے ایک ہزار درہم ہوں اور ایک دانق (درہم کا چھٹا حصہ) قرض ہو تو تم اس بات سے بے خوف نہیں ہوتے کہ تم اس طرح مر جاؤ گے کہ تمہارا قرض تمہاری گردن میں ہوگا اور اگر تمہارے ذمہ دس ہزار درہم ہوں اور تم ان کی ادائیگی کے لیے کچھ بھی چھوڑ کر فوت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ سے ناامید نہ ہو اللہ تعالیٰ تمہاری طرف سے ادا فرمائے گا اور یہ تقدیر کی وسعت پر مجرد ایمان کی طرف اشارہ ہے اور مقدورات میں ان ظاہری اسباب کے علاوہ خفیہ اسباب بھی ہیں۔

حضرت ابو عبداللہ قرشی رحمہ اللہ سے توکل کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم رکھنا سائل نے کہا مزید کچھ بتائیے فرمایا ہر اس سبب کو چھوڑ دینا جو کسی دوسرے سبب تک پہنچاتا ہے حتیٰ کہ حق ہی متولی قرار پائے تو پہلی بات تینوں مقاماتِ توکل کو شامل ہے اور دوسری میں خاص تیسرے مقام کی طرف اشارہ ہے اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توکل کی طرح ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے ان سے کہا کہ کیا آپ کو کوئی حاجت ہے؟ آپ نے فرمایا (حاجت تو ہے لیکن) آپ سے نہیں کیوں کہ ان کا سوال ایک سبب تھا جو دوسرے سبب یعنی حضرت جبریل علیہ السلام کی طرف لے جاتا تھا تو آپ نے اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو وہ حضرت جبریل علیہ السلام کو اس کام کے لیے مسخر کر دے گا کیوں کہ وہی اس کام کا متولی ہے یہ اس حیران شخص کا حال ہے جو اللہ تعالیٰ کی وجہ سے اپنے نفس سے غائب ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو نہیں دیکھتا اور اس حال کا وجود بہت کم ہوتا ہے اور اگر پایا جائے تو اس کا دوام اور زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

حضرت ابو سعید خراز رحمہ اللہ نے فرمایا سکون کے بغیر اضطراب اور اضطراب کے بغیر سکون توکل ہے شاید انہوں نے دوسرے مقام کی طرف اشارہ کیا ہے پس اضطراب کے بغیر سکون اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دل کو دکیل کے ساتھ سکون حاصل ہے اور اس پر اس کا اعتماد ہے اور سکون کے بغیر اضطراب میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اس کے سامنے فریاد کر رہا ہے جیسے بچہ اپنے ہاتھوں سے ماں کی طرف التجا کرتا ہے اور اس کے دل کا سکون ماں کی مکمل شفقت سے متعلق ہوتا ہے۔

حضرت ابو علی دقاق رحمہ اللہ نے فرمایا توکل کے تین درجات ہیں (۱) توکل (۲) تسلیم اور (۳) تفویض۔ متوکل وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے وعدے پر سکون حاصل کر لیتا ہے اور مسلّم (تسلیم والا) اس کے جاننے پر ہی کفایت کرتا ہے اور تفویض والا اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہوتا ہے اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ متوکل کا دیکھنا اس شخص کے اعتبار سے جسے دیکھتا ہے، مختلف درجات رکھتا ہے علم ہی اصل ہے وعدہ اس کے تابع ہے اور حکم وعدے کے تابع ہے اور بعید نہیں کہ متوکل کے دل پر ان میں سے کوئی چیز غالب ہو مشائخ نے توکل کے بارے میں مزید بھی کچھ فرمایا لیکن ہم بات کو طویل کرنا نہیں چاہتے کیوں کہ روایت اور نقل کی نسبت کشف زیادہ قوی ہوتا ہے یہ بیان حالِ متوکل سے متعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور لطف سے توفیق دینے والا ہے۔

فصل ۴:

متوکلین کے اعمال

جان لو کہ علم سے حال پیدا ہوتا ہے اور حال کا نتیجہ اعمال ہیں اور بعض اوقات گمان کیا جاتا ہے کہ بدن سے کوئی کام نہ کرنا اور دل کی تدبیر کو ترک کر دینا توکل ہے اور زمین پر یوں پڑا رہے جس طرح کپڑے کا کوئی ٹکڑا یا گوشت کا لوتھڑا قصاب کے پھٹے پر ہو اور یہ جاہل لوگوں کا خیال ہے کیوں کہ شریعت میں ایسا کرنا حرام ہے اور شریعت نے توکل کرنے والوں کی تعریف کی ہے تو دین کے ممنوع امور کے ذریعے کوئی دینی مقام کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ہم بات واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

توکل کی تاثیر اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب بندہ اپنے مقاصد کا علم رکھتے ہوئے اس کی طرف حرکت اور کوشش کرے اور بندے کی کوشش اس کے اختیار میں ہے اور یہ کوشش یا تو ان منافع کو حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہے جو ابھی اس کے پاس نہیں ہیں جیسے محنت اور کسب وغیرہ یا اس نفع بخش چیز کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے جو اس کے پاس موجود ہے جیسے ذخیرہ کرنا یا کسی ایسے ضرر رساں امر کے لیے ہوتی ہے جو ابھی تک نہیں آیا جیسے حملہ آور، چور اور درندے سے دفاع کرنا یا ایسے نقصان دہ کام کو زائل کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے جو واقع ہو چکا ہے

جیسے بیماری کا علاج کرنا تو بندے کی حرکات کا مقصود ان چار باتوں سے باہر نہیں ہے یعنی حصول نفع، حفاظتِ نفع، نقصان سے اپنے آپ کو بچانا اور ضرر کو دور کرنا۔

پس ہم ان چاروں امور میں توکل کی شرائط اور درجات ذکر کرتے ہیں جو شرعی دلائل کے ساتھ مزین ہیں۔

فنِ اوّل: یعنی نفع حاصل کرنا تو اس سلسلے میں ہم کہتے ہیں نفع بخش چیز کے اسباب تین درجات پر ہیں یا تو وہ قطعی اور یقینی ہوں گے یا ظنِ غالب ہوگا جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا موہوم ہوں گے یعنی ان کا صرف وہم ہوگا جس پر نفس مکمل اعتماد نہیں کرتا اور نہ ہی مطمئن ہوتا ہے۔

پہلا درجہ جو قطعی ہے ان اسباب کی مثل ہے جن کے ساتھ مسببات اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیت کے ساتھ اس طرح مربوط ہوتے ہیں کہ وہ ربط ہمیشہ قائم رہتا ہے اور بدلتا نہیں جیسے تمہارے سامنے کھانا رکھا ہوا ہو اور تم بھوکے ہو تمہیں کھانے کی حاجت ہو لیکن تم اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاتے بلکہ کہتے ہو کہ میں متوکل ہوں اور توکل کی شرط کوشش کو چھوڑنا ہے جب کہ ہاتھ کو بڑھانا کوشش اور حرکت ہے اسی طرح دانتوں کے ساتھ اسے چبانا اور دونوں جبڑوں کو ملا کر اسے نگلنا بھی ایک کام ہے (اور یہ توکل کے خلاف ہے) تو یہ محض پاگل پن ہے توکل کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

اگر تم اس بات کے منتظر ہو کہ اللہ تعالیٰ روٹی کے بغیر تمہیں سیر کر دے گا یا روٹی میں حرکت پیدا کرے گا کہ وہ تمہارے پاس پہنچے یا کسی فرشتے کو مامور کرے گا کہ وہ اس روٹی کو تمہارے لیے چبا کر تمہارے معدے تک پہنچا دے تو تم اللہ تعالیٰ کے طریقے سے ناواقف ہو۔

اسی طرح اگر تم زمین میں کھیتی باڑی نہ کرو اور اس بات کا طمع رکھو کہ اللہ تعالیٰ بیج کے بغیر سبزی اگائے گا یا جماع کے بغیر تمہاری بیوی بچہ جنے گی جیسے حضرت مریم علیہا السلام کے ہاں بچے کی پیدائش ہوئی تو یہ سب باتیں پاگل پن ہے اور اس قسم کی باتیں بے شمار ہیں جن کو شمار میں نہیں لایا جا سکتا اس مقام پر توکل عمل کے ساتھ نہیں بلکہ حال اور علم کے ذریعے ہوتا ہے۔

جہاں تک علم کا تعلق ہے تو وہ اس طرح کہ آدمی اس بات کو جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے کھانا، ہاتھ، دانت اور قوت حرکت پیدا فرمائی ہے اور وہی تمہیں کھلاتا اور پلاتا ہے۔

اور حال کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے دل کا سکون اور اس کا اعتماد اللہ تعالیٰ کے فعل پر ہو ہاتھ اور کھانے پر نہ ہو اور تم اپنے ہاتھ کی صحت پر کیسے اعتماد کر سکتے ہو جب کہ بعض اوقات وہ خشک ہو جاتا ہے اور فالج کا شکار ہو جاتا ہے اور تم اپنی طاقت پر کیسے بھروسہ کر سکتے ہو جب کہ بعض اوقات تم پر ایسی حالت طاری ہوتی ہے جو تمہاری عقل کو زائل کر دیتی ہے اور تمہاری حرکت کی قوت بھی باطل ہو جاتی ہے یا تمہیں کھانے کی موجودگی پر کس طرح اعتماد ہو سکتا ہے

جب کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی کو تم پر غالب کر دیتا ہے یا کوئی سانپ آجاتا ہے اور آدمی کھانا چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔

پس جب اس قسم کی باتیں ہو سکتی ہیں اور اس کا علاج صرف اللہ تعالیٰ کا فضل ہے تو اسی پر خوش ہونا چاہیے اور اسی پر اعتماد کرنا چاہیے جب آدمی کا حال اور علم اس طریقے پر ہو تو اسے (کھانے کی طرف) ہاتھ بڑھانا چاہیے کیونکہ وہ متوکل ہے۔

دوسرا درجہ:

وہ اسباب جو یقینی نہیں ہیں لیکن غالب گمان یہی ہے کہ مسبّبات ان کے بغیر حاصل نہیں ہوتے اور اسباب کے بغیر ان کا حصول بہت بعید ہے جیسے وہ شخص جو شہروں اور قافلوں سے دور ہو جائے اور ایسے جنگلوں میں سفر کر رہا ہو جہاں لوگوں کی آمد و رفت بہت کم ہو اور وہ ایسے سفر میں زادِ راہ ساتھ نہ لے تو یہ توکل نہیں ہے بلکہ پہلے لوگوں کا طریقہ یہی تھا کہ وہ اپنے ساتھ زادِ راہ لے جاتے تھے اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ ہو سامانِ سفر پر نہیں تو اب اس سامان کے ساتھ لے جانے کی وجہ سے توکل زائل نہیں ہوگا۔

لیکن اگر کوئی شخص زادِ راہ ساتھ نہ لے جائے تو یہ بھی جائز ہے اور یہ توکل کا اعلیٰ مقام ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت خواص رحمہ اللہ اسی طرح کرتے تھے۔

سوال:

یہ تو ہلاکت کی کوشش ہے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

جواب:

یہ صورت حرام ہونے سے دو وجہ سے خارج ہے ایک یہ کہ آدمی ایک ہفتہ یا اس کے قریب مدت اپنے نفس کو ریاضت، مجاہدہ اور کھانے کے بغیر صبر کی عادت ڈال دے اور یوں وہ صبر کرے کہ اس کے دل میں کوئی تنگی اور تشویش نہ ہو اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کوئی مشکل پیش آئے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ گھاس یا اس سے بھی معمولی چیز مل جائے اسے بطور خوراک استعمال کر سکے ان دو شرطوں کے پائے جانے کے بعد غالب بات یہی ہے کہ ہر ہفتے اسے جنگل میں کوئی نہ کوئی آدمی مل جائے گا یا کسی گاؤں یا بستی میں گزر ہوگا، یا کوئی ساگ وغیرہ مل جائے گا جس سے وقتی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ اور وہ نفس سے مجاہدہ کرتے ہوئے اس چیز کے ساتھ زندہ رہے گا اور مجاہدہ، توکل کا ستون ہے اور حضرت خواص رحمہ اللہ اور ان جیسے دوسرے حضرات کا اسی پر اعتماد تھا۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت خواص رحمہ اللہ سوئی، قینچی، رسی اور ڈولچی اپنے ساتھ ضرور رکھتے تھے وہ فرماتے تھے اس سے توکل میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جنگلوں میں پانی زمین کے اوپر نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی عادتِ کریمہ یہ نہیں ہے کہ پانی کو کنویں سے ڈول اور رسی کے بغیر اوپر لے آئے اور جنگلوں میں گھاس

تو عام مل جاتا ہے لیکن رسی اور ڈول عام نہیں ملتا اور دن میں کئی مرتبہ وضو کے لیے پانی کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح پینے کے لیے بھی ایک دو مرتبہ پانی کی حاجت ہوتی ہے کیوں کہ مسافر حرکت کی گرمی کی وجہ سے پانی سے صبر نہیں کر سکتا اگرچہ کھانے سے صبر کر لیتا ہے اسی طرح اس کے پاس جو کپڑا ہوتا ہے بعض اوقات وہ پھٹ جاتا ہے اور ستر ننگا ہو جاتا ہے اور عام طور پر جنگلوں میں قینچی اور سوئی نہیں ملتی اور سینے اور کاٹنے کے لیے ان دونوں کے متبادل بھی کوئی چیز نہیں ملتی اور ہر وہ چیز جو ان چاروں کے معنیٰ میں ہو وہ بھی دوسرے درجہ کے ساتھ ملحق ہے کیوں کہ یہ ظنی بات ہے یقینی نہیں یہ اس لیے کہ یہ بھی احتمال ہے کہ کپڑا نہ پھٹے یا کوئی شخص اسے دوسرا کپڑا دے دے یا کنویں کے پاس کوئی آدمی موجود ہو جو اس کو پانی نکال کر دے دے لیکن اس بات کا احتمال نہیں کہ چبایا ہوا کھانا اس کے منہ میں چلا جائے پس دونوں درجوں کے درمیان فرق ہے لیکن دوسرا درجہ پہلے درجہ کے معنیٰ میں ہے۔

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی گھاٹی میں جائے جہاں پانی اور کوئی سبزہ نہ ہو نہ وہاں کوئی اترنے والا ہو اور یہ توکل کر کے بیٹھ جائے تو گناہ گار اور اپنے آپ کو ہلاک کرنے والا ہوگا۔ جیسا کہ مروی ہے کہ ایک زاہد بستی سے الگ ہو کر ایک پہاڑ کے دامن میں سات دن ٹھہرا رہا اس نے کہا میں کسی سے کچھ نہیں مانگوں گا یہاں تک کہ میرا رب مجھے رزق عطا فرمائے وہ سات دن تک بیٹھا رہا حتیٰ کہ مرنے کے قریب ہو گیا لیکن اس کے پاس رزق نہ آیا اس نے کہا اے میرے رب! اگر تو مجھ سے محبت کرتا ہے تو تو نے جو رزق میرے مقدر میں لکھا ہے مجھے عطا فرما ورنہ میری روح قبض کر لے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے الہام ہوا کہ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! میں تجھے اس وقت تک رزق نہیں دوں گا جب تک تو شہر میں داخل ہو کر لوگوں کے درمیان نہیں بیٹھے گا۔ چنانچہ وہ شہر میں داخل ہو کر لوگوں کے ساتھ بیٹھا تو کوئی کھانا لا رہا ہے اور کوئی مشروب، اس نے کھانا کھایا اور پانی پیا تو اس کے دل میں کچھ خیال پیدا ہوا اللہ تعالیٰ نے الہام فرمایا تو چاہتا ہے کہ اپنے دنیوی زہد کی وجہ سے میری حکمت کو لے جائے کیا تجھے معلوم نہیں میں اپنے بندے کو اپنے دست قدرت سے رزق دینے کی بجائے لوگوں کے ہاتھوں سے دینا زیادہ پسند کرتا ہوں۔

تو تمام اسباب کو ترک کر دینا حکمت خداوندی کے خلاف اور سنت الٰہیہ سے جہالت ہے اور جب آدمی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھے اسباب پر نہیں اور یوں وہ سنت خداوندی کے مطابق عمل کرے تو یہ بات توکل کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے مقدمات کے وکیل کے حوالے سے ذکر کیا ہے لیکن اسباب ظاہری بھی ہوتے ہیں اور پوشیدہ بھی، اور توکل کا معنی یہ ہے کہ اسباب ظاہری سے اعراض کر کے خفیہ اسباب پر اکتفاء کرے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے نفس کو اسباب سے نہیں بلکہ مسبب الاسباب سے سکون حاصل ہو۔

سوال:

کسی کسب کے بغیر شہر میں بیٹھ جانے کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا حرام ہے؟ یا مباح یا مستحب؟

جواب:

جان لو! ایسا کرنا حرام نہیں ہے جب جنگلوں کی سیاحت کرنے والا اپنے آپ کو ہلاک کرنے والا نہیں کہلاتا تو یہ شخص کس طرح نفس کو ہلاک کرنے والا شمار ہوگا کہ اس کے فعل کو حرام قرار دیا جائے بلکہ یہ بات عقل سے بعید نہیں ہے کہ اس کے پاس وہاں سے رزق آئے جس جگہ کے بارے میں اسے گمان بھی نہ ہو۔ ہاں بعض اوقات دیر ہو جاتی ہے اور اس کے ملنے تک صبر بھی کیا جا سکتا ہے لیکن جب دروازے کو کنڈی لگا دے اور کوئی شخص اس تک پہنچ نہ سکے تو ایسا کرنا حرام ہے اور اگر وہ گھر کا دروازہ تو کھلا رکھے لیکن بیکار بیٹھا ہو عبادت میں مشغول نہ ہو تو مال کمانا اور اس کے لیے باہر نکلنا زیادہ بہتر ہے لیکن پھر اس کا نہ نکلنا حرام نہ ہوگا ہاں موت کا خطرہ ہو جائے تو (حرام ہوگا) اور اس وقت نکلنا اور کمانا ضروری ہو جائے گا۔

اور اگر اس کا دل اللہ تعالیٰ کی ذات میں مشغول ہو لوگوں کی طرف جھانکنے والا نہ ہو اور اس بات کی تاک میں نہ رہے کہ کون دروازے سے داخل ہوتا ہے اور رزق لے کر کرتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کا منتظر رہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہی اس کا شغف ہو تو یہ بات افضل ہے اور یہ توکل کے مقامات میں سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہونا اور رزق کا اہتمام نہ کرنا، تو ایسے شخص کے پاس لامحالہ رزق آتا ہے اس وقت بعض علماء کی یہ بات صحیح قرار پائی ہے کہ اگر بندہ اپنے رزق سے بھاگے تو رزق خود اسے تلاش کرتا ہے جس طرح موت سے بھاگتا ہے تو موت اسے ڈھونڈ نکالتی ہے اور اگر وہ اللہ تعالیٰ سے سوال کرے کہ وہ اسے رزق نہ دے تو اس کی دعا قبول نہ ہوگی اور وہ گناہ گار ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس سے فرماتا ہے یہ کیسے ہو سکتا کہ میں تجھے پیدا کروں اور رزق نہ دوں۔

اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگوں نے ہر چیز میں اختلاف کیا مگر رزق اور موت میں اختلاف نہیں کیا اس بات پر سب متفق ہیں کہ رزق اور موت صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

لَوْ تَوَكَّلْتُمْ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْ خِمَاصًا (۱) وَتَرُوْحُ بِطَانًا وَلَزَالَتْ بِدُعَائِكُمُ الْجِبَالُ۔ (۲)

اگر تم صحیح معنی میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو تو وہ تمہیں اسی طرح رزق دے جس طرح پرندے کو دیتا ہے وہ صبح کے وقت بھوکا ہوتا ہے لیکن شام کے وقت شکم سیر ہوتا ہے اور تمہاری دعا سے پہاڑ بھی ہل جائیں۔

---

(۱) کنز العمال جلد ۲ ص ۱۰۵ حدیث ۵۶۹۴

(۲) کنز العمال جلد ۲ ص ۱۴۶ حدیث ۵۸۹۳

حضرت عیسٰی علیہ السلام نے فرمایا پرندے کی طرف دیکھو نہ وہ کھیتی باڑی کرتا ہے نہ غلہ کاٹتا ہے اور نہ جمع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے ہر دن رزق عطا فرماتا ہے۔ اور اگر تم کہو کہ ہمارے پیٹ بڑے ہیں تو جانوروں کو دیکھو اللہ تعالیٰ نے ان کے رزق کے لیے اس مخلوق کو کس طرح مقرر فرمایا۔

حضرت ابو یعقوب سُوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں توکل کرنے والوں کا رزق بندوں کے ہاتھوں سے ان کو ملتا ہے اور ان (توکل کرنے والوں) کو کوئی تھکاوٹ بھی نہیں ہوتی جب کہ دوسرے لوگ مشغول رہتے اور رنج اٹھاتے ہیں۔

کسی بزرگ نے فرمایا رزق سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے لیکن بعض لوگ ذلت و رسوائی سے کھاتے ہیں مثلاً وہ مانگتے ہیں، بعض تھکاوٹ اور انتظار سے کھاتے ہیں جیسے تاجر لوگ، بعض محنت سے کھاتے ہیں جیسے کاریگر اور بعض کسی محنت کے بغیر کھاتے ہیں جیسے صوفیا کرام بادشاہوں کے پاس جاتے ہیں اور ان سے رزق حاصل کرتے ہیں اور واسطے کا خیال نہیں کرتے۔

تیسرا درجہ:

ایسے اسباب اختیار کرنا جن کے بارے میں وہم ہو کہ یہ مسببات کی طرف لے جاتے ہیں ظاہر پر اعتماد نہیں ہوتا۔ جیسے مال حاصل کرنے کے لیے باریک تدابیر اختیار کرنا یہ بات توکل کے تمام درجات سے نکال دیتی ہے۔ اور عام لوگ اسی میں مبتلا ہیں یعنی وہ لوگ جو جائز مال جائز طریقے سے باریک حیلوں کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔

جہاں تک شبہ کے ساتھ لینے یا ایسے طریقے پر حاصل کرنے کا تعلق ہے جس میں شبہ ہو تو یہ دنیا کی انتہائی حرص اور اسباب پر توکل ہے اور اس بات میں کوئی پوشیدگی نہیں کہ اس سے توکل باطل ہو جاتا ہے اور یہ ان اسباب کی طرح ہے جن کی نسبت نفع بخش چیز کی طرف اس طرح ہے جیسے دم جھاڑے، فال لینے اور داغنے کی نسبت نقصان دہ چیز کی طرف ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تو فرمایا کہ توکل کرنے والے یہ کام نہیں کرتے لیکن یہ نہیں فرمایا کہ وہ شہروں میں نہیں رہتے اور نہ کسی سے کوئی چیز لیتے ہیں بلکہ فرمایا کہ وہ ان اسباب کو اختیار کرتے ہیں اور اس قسم کے اسباب کو مسببات کے سلسلے میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے بہت زیادہ ہیں ان کا شمار نہیں کیا جاتا۔

حضرت سہل رحمہ اللہ نے توکل کے سلسلے میں فرمایا کہ یہ تدبیر کو چھوڑنے کا نام ہے اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرما کر ان کو اپنی ذات سے پردے میں نہیں رکھا ان کا حجاب ان کی تدبیر ہی ہوتی ہے۔

شاید ان کی مراد فکر کے ذریعے اسباب بعید نکالنا ہے کیوں کہ ان ہی اسباب میں فکر کی ضرورت ہوتی ہے واضح اسباب میں نہیں۔ گویا اسباب دو قسم کے ہیں ایک وہ اسباب ہیں کہ ان سے تعلق توکل سے نکال دیتا ہے اور دوسری قسم ان اسباب پر مشتمل ہے جو توکل سے خارج نہیں کرتے پھر وہ اسباب جو توکل سے نکالتے ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو یقینی ہیں اور دوسرے ظنی ہیں اور جو یقینی ہیں ان کو اپنانے سے آدمی توکل سے خارج نہیں ہوتا

جب توکل کا حال اور علم پایا جائے یعنی مسبب الاسباب پر بھروسہ ہو اس وقت توکل حال اور علم کے ساتھ ہوتا ہے عمل کے ساتھ نہیں۔

جہاں تک ظنی اسباب کا تعلق ہے تو ان میں توکل حال، علم اور عمل تینوں کے ساتھ ہوتا ہے اور جو لوگ ان اسباب سے تعلق رکھتے ہیں ان کے تین مقامات ہیں۔

متوکلین اور اسباب

پہلا مقام:

یہ حضرت خواص اور ان جیسے بزرگوں (رحمہم اللہ) کا مقام ہے یعنی وہ لوگ جو زادراہ کے بغیر جنگلوں میں پھرتے ہیں اور وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ کرتے ہیں کہ وہ ایک ہفتہ یا اس سے بھی زیادہ صبر کی طاقت عطا فرمائے گا یا انہیں کوئی سبزی وغیرہ کھانے کو مل جائے گی یا کوئی چیز نہ ملی تو موت پر راضی ہو جائے گا کیوں کہ جو آدمی زادراہ لے کر جاتا ہے اس کا یہ توشہ گم بھی ہو سکتا ہے یا وہ راستہ بھٹک کر بھوک کی حالت میں مر جاتا ہے تو یہ صورت زادراہ ہونے کی صورت میں بھی ممکن ہے جس طرح نہ ہونے کی صورت میں اس کا امکان ہے۔

دوسرا مقام:

آدمی اپنے گھر یا مسجد میں بیٹھ جائے لیکن کسی گاؤں یا شہر میں ہو، یہ مقام، پہلے مقام سے کمزور ہے لیکن ایسا شخص بھی متوکل ہے کیوں کہ وہ کمائی اور ظاہری اسباب کو چھوڑ دیتا ہے اور پوشیدہ اسباب کے اعتبار سے اپنے معاملے کی تدبیر میں اللہ تعالیٰ کے فضل پر بھروسہ کرتا ہے لیکن شہر میں بیٹھنے کی وجہ سے وہ اسباب رزق سے۔ تعلق رکھتا ہے کیوں کہ شہر میں رہنا بھی رزق حاصل کرنے کے اسباب میں سے ہے لیکن جب اس کی نظر اس ذات کی طرف ہو جس نے شہر والوں کو اس تک رزق پہنچانے کے لیے مسخر کیا ہے، شہریوں کی طرف نہ ہو تو اس سے توکل باطل نہیں ہوتا لیکن اس بات کا احتمال رہتا ہے کہ وہ سب اس سے غافل ہو جائیں اور اس کو ضائع کر دیں اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو اس کے حال سے آگاہ نہ کرے اور ان کی خبر گیری کو حرکت میں نہ لائے۔

تیسرا مقام:

جس طرح ہم نے آداب کسب کے تیسرے اور چوتھے باب میں ذکر کیا ہے اس طریقے پر وہ باہر جا کر کمائے اس کوشش کی وجہ سے بھی وہ توکل سے نہیں نکلے گا جب کہ اس کا اطمینان قلبی اپنی کفایت و قوت اور جاہ و پونجی پر نہ ہو کیوں کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو ایک لحظہ میں ہلاک کر دے بلکہ اس کی نظر اس سچے کفیل پر ہونی چاہیے جو ان تمام چیزوں کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے لیے اسباب کو آسان فرماتا ہے۔ بلکہ اپنے کسب، پونجی اور کفایت کو اللہ تعالیٰ

کی قدرت کے مقابلے میں اس طرح جانے جیسے حکم صادر کرنے والے بادشاہ کے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے پس اس کی نظر قلم پر نہیں ہوتی بلکہ بادشاہ کے دل پر ہوتی ہے کہ وہ کس بات کے ساتھ قلم کو حرکت دیتا ہے اور کس بات کی طرف مائل ہوتا ہے اور کیا حکم دیتا ہے۔

پھر اگر یہ روزی کمانے والا اپنے اہل و عیال کے لیے کماتا ہے یا اس لیے کہ مساکین میں تقسیم کرے گا تو بدن کے ساتھ یہ کمانے والا شمار ہوتا ہے لیکن دل سے وہ الگ ہے اس شخص کی حالت اس کی حالت سے بہتر ہے جو گھر میں بیٹھ جاتا ہے۔

جب توکل میں اس کی شرائط کی رعایت کی جائے اور اس میں حال و معرفت کا لحاظ کیا جائے جیسا کہ پہلے گزر گیا تو یہ کسب توکل کے خلاف نہیں ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے اور آپ کی بیعت کی گئی تو آئندہ صبح آپ نے کپڑوں کی گٹھڑی بغل کے نیچے رکھی اور ہاتھ میں گز لے کر بازار میں داخل ہوئے آپ آوازیں دیتے تھے حتیٰ کہ مسلمانوں نے اس بات کو ناپسند کیا اور فرمایا آپ خلافتِ نبوت کے قیام کے ساتھ ساتھ یہ کام کیسے کریں گے آپ نے فرمایا مجھے اپنے اہل و عیال سے دُور نہ کرو اگر میں نے ان کو ضائع کر دیا تو دوسروں کو بدرجہ اولیٰ ضائع کروں گا حتیٰ کہ صحابہ کرام نے بیت المال میں سے آپ کا وظیفہ مقرر کیا جو کسی بھی مسلمان کے اہل خانہ کے خرچ کے مطابق تھا جب وہ اس بات پر راضی ہوئے اور آپ نے دیکھا کہ وہ تعاون کر رہے ہیں تو ان کے دل کی خوشی اور پورا وقت مسلمانوں کی بھلائی کے لیے خرچ کرنا زیادہ مناسب سمجھا اور یہ کہنا محال ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ مقام توکل پر فائز نہ تھے ان سے بڑھ کر کون اس مقام کے لائق ہو سکتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ متوکل تھے لیکن کسب و سعی کو چھوڑ کر نہیں بلکہ اس اعتبار سے کہ آپ کی توجہ اپنی کفایت و قوت کی طرف نہ تھی۔ اور آپ اس بات کو جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہی کسب معاش آسان کرنے والا اور اسباب کی تدبیر فرمانے والا ہے نیز آپ کسب کے راستے میں شرائط کا بھی خیال رکھتے تھے یعنی حاجت کی مقدار پر اکتفا کرتے زیادہ مال جمع کرنے فخر کرنے اور ذخیرہ کرنے کی طرف مائل نہ تھے اور دوسروں کے روپے پیسے سے اپنے روپے پیسے کو زیادہ اچھا نہیں سمجھتے تھے جو شخص بازار میں جائے اور اسے دوسروں کی دولت کے مقابلے میں اپنی دولت زیادہ پسند ہو تو وہ دنیا کی حرص رکھتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے اور توکل اسی وقت صحیح ہوتا ہے جب دنیا سے بے رغبتی اختیار کی جائے ہاں زُہد، توکل کے بغیر بھی صحیح ہوتا ہے کیوں کہ توکل کا مقام زہد کے بعد آتا ہے۔

حضرت ابو جعفر حداد جو حضرت جنید (رحمہما اللہ) کے شیخ تھے اور متوکلین میں سے تھے، فرماتے ہیں میں نے بیس سال تک توکل کو چھپائے رکھا اور میں بازار سے جدا نہیں ہوا میں روزانہ ایک دینار کماتا لیکن رات کے لیے ایک دمڑی بھی نہ رکھتا اور نہ ہی اپنی راحت کے لیے کچھ خرچ کرتا کہ کچھ دمڑیاں دے کر حمام میں داخل ہو جاؤں بلکہ رات آنے سے پہلے پہلے سارا مال دے دیتا حضرت جنید رحمہ اللہ ان کی موجودگی میں توکل کے بارے میں گفتگو نہیں

کرتے تھے بلکہ فرماتے کہ مجھے حیا آتی ہے کہ ان کی موجودگی میں مقامِ توکل کے بارے میں کچھ کہوں۔

جان لو! اکر صوفیا کی خانقاہوں مقرر مال کے ساتھ بیٹھنا توکل سے دور ہے اگر مقرر مال یا وقف نہ ہو اور وہ خادم کو باہر جا کر لانے کے لیے کہیں تو اس صورت میں کمزور سا توکل ہو گا لیکن حال اور علم کے ذریعے یہ مضبوط ہو جاتا ہے جس طرح کمانے والے کا توکل ہے اور اگر وہ سوال نہ کریں بلکہ جو کچھ ان تک پہنچے اس پر قناعت کریں تو ان کے توکل میں یہ زیادہ مضبوط بات ہے لیکن وہ لوگوں میں مشہور ہو جاتے ہیں اور بازاری بن جاتے ہیں گویا وہ بازار میں داخل ہوئے اور جو آدمی بازار میں جاتا ہے وہ متوکل نہیں ہوتا جب تک بہت سی شرائط نہ پائی جائیں جیسا کہ پہلے گزر گیا ہے۔

سوال:

آدمی کا گھر میں بیٹھ جانا افضل ہے یا باہر نکل کر کمانا؟

جواب:

اگر وہ کسبِ معاش کو فکر و ذکر، اخلاص اور عبادت میں مصروفیت کے لیے چھوڑتا ہے اور کسبِ معاش ان امور میں مخل ہوتا ہے اور اس کے باوجود وہ شخص لوگوں کے انتظار میں نہیں رہتا کہ وہ اس کے پاس کچھ لائیں گے بلکہ صبر اور اللہ تعالیٰ پر توکل کے سلسلے میں اس کا دل مضبوط ہوتا ہے تو ایسے شخص کے لیے گھر میں بیٹھنا بہتر ہے اور اگر گھر میں رہتے ہوئے اس کا دل پریشان ہوتا ہے اور لوگوں کے انتظار میں رہتا ہے تو کسبِ معاش افضل ہے کیوں کہ لوگوں کی تاک میں رہنا دل کے ساتھ سوال کرنا ہے اور اس (سوال) کو چھوڑنا کسب کو چھوڑنے کے مقابلے میں اہم ہے اور پہلے متوکلین کا طریقہ تھا کہ جس چیز کی طرف ان کے نفس منتظر رہیں وہ نہیں لیتے تھے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے حضرت ابوبکر مروزی رحمہ اللہ کو حکم دیا کہ فلاں فقیر کو اجرت سے کچھ زیادہ دنیا لیکن فقیر نے واپس کر دیا جب وہ واپس آئے تو حضرت امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا جاؤ اور اسے دے دو اب وہ قبول کرے گا وہ دوبارہ گئے اور دیا تو اس نے لے لیا حضرت امام احمد سے پوچھا اس کی کیا وجہ ہے تو انہوں نے فرمایا اس کا نفس اس زائد مال کی تاک میں تھا تو اس نے نہ لیا جب وہ یہاں سے گیا تو طمع ختم ہو گئی اور ناامید ہو گیا تو اب لے لیا۔

حضرت خواص رحمہ اللہ جب کسی شخص کے دینے کے طرف دیکھتے یا نفس کے عادی ہونے کا خوف ہوتا تو کوئی چیز قبول نہ کرتے۔

حضرت خواص رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے سفر میں کیا عجیب بات دیکھی ہے؟ انہوں نے فرمایا میں نے حضرت خضر علیہ السلام کو دیکھا اور وہ میری صحبت پر راضی ہوئے لیکن میں ان سے جدا ہو گیا کہ کہیں میرا نفس ان کے ذریعے سکون حاصل نہ کرے اور اس طرح میرے توکل میں نقصان پیدا ہو گا۔

پس جب کسبِ معاش کرنے والا کسب کے آداب اور اس کی نیت کی شرطوں کی رعایت کرے جیسا کہ کسب کے

بیان میں ذکر کیا گیا یعنی زیادہ مال جمع کرنے کا ارادہ نہ کرے اور اس کا اعتماد اپنے سرمایہ اور کفایت پر نہ ہو تو وہ متوکل ہوگا

سوال :

اپنے سرمایہ اور کفایت پر بھروسہ نہ ہونے کی علامت کیا ہے ؟

جواب :

اس کی علامت یہ ہے کہ اگر اس کا مال چوری ہو جائے یا تجارت میں نقصان ہو جائے یا کوئی کام بند ہو جائے تو وہ اس پر راضی رہے اور اس کا اطمینان ختم نہ ہو اور نہ ہی دل پریشان ہو بلکہ اس کے دل کا سکون اس چوری سے پہلے اور بعد میں ایک جیسا رہے کیوں کہ جو شخص جس چیز کے ذریعے سکون حاصل نہیں کرتا وہ اس کے چلے جانے پر پریشان نہیں ہوتا ۔ اور جو آدمی کسی چیز کے چلے جانے پر پریشان ہو وہ اسی کے ذریعے سکون حاصل کرتا ہے ۔

حضرت بشر رحمہ اللہ چرخے بنایا کرتے تھے پھر آپ نے یہ کام چھوڑ دیا کیوں کہ بعادی (کوئی بزرگ) نے ان کو لکھا مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ اپنے رزق کے لیے چرخوں سے مدد لیتے ہیں بتائیے اگر اللہ تعالیٰ آپ کی سماعت و بصارت کو لے جائے تو آپ کے رزق کا کون کفیل ہوگا ؟ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تو انہوں نے چرخہ بنانے کے تمام اوزار دے دیئے اور یہ کام چھوڑ دیا ۔

یہ بھی کہا گیا کہ جب وہ چرخہ بنانے میں مشہور ہو گئے اور لوگوں نے ان کا قصد شروع کر دیا تو انہوں نے یہ کام چھوڑ دیا یہ بھی کہا گیا کہ جب ان کے اہل و عیال فوت ہو گئے تو انہوں نے یہ کام ترک کر دیا جس طرح حضرت سفیان رحمہ اللہ کے پاس پچاس درھم تھے جن کے ساتھ وہ تجارت کرتے تھے جب ان کے گھر والوں کا انتقال ہوا تو انہوں نے یہ رقم تقسیم کر دی ۔

سوال :

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے پاس سرمایہ ہو اور وہ اس کے لیے باعثِ سکون نہ ہو حالانکہ وہ جانتا ہے کہ سرمائے کے بغیر کسب ممکن نہیں ۔

جواب :

اسے یہ بات جان لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو سرمائے کے بغیر رزق دیتا ہے وہ زیادہ ہیں اور جن لوگوں کے پاس سرمایہ ہے اور وہ چوری ہو جاتا ہے اور یوں ہلاک ہو جاتا ہے تو وہ بھی بہت زیادہ ہیں اور اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جانی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے جو اس کے حق میں بہتر ہے اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے سرمائے کو ہلاک کر دیا تو یہی اس کے لیے بہتر تھا ہو سکتا ہے اس مال کے باقی رہنے سے اس کا کوئی دینی نقصان ہو جاتا ۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس پر کرم فرمایا ہے زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ بھوکا مر جائے گا پس اسے یہ عقیدہ رکھنا

چاہیے کہ بھوک کی حالت میں مرجانا آخرت کے حوالے سے میرے حق میں بہتر ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے میری کسی تقصیر کے بغیر میرے حق میں یہ فیصلہ فرمایا ہے جب وہ ان سب باتوں کا معتقد ہوگا تو اس کے نزدیک سرمائے کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے۔

إِنَّ الْعَبْدَ لَيَهُمُّ مِنَ اللَّيْلِ بِأَمْرٍ مِنْ أُمُورِ التِّجَارَةِ مِمَّا لَوْ فَعَلَهُ لَكَانَ فِيهِ هَلَاكُهُ فَيَنْظُرُ اللّٰهُ تَعَالَىٰ إِلَيْهِ مِنْ فَوْقِ عَرْشِهِ فَيَصْرِفُهُ عَنْهُ فَيُصْبِحُ كَئِيبًا حَزِينًا يَتَطَيَّرُ بِجَارِهِ وَابْنِ عَمِّهِ مَنْ سَبَقَنِي مَنْ دَهَانِي وَمَا هِيَ إِلَّا رَحْمَةٌ رَحِمَهُ اللّٰهُ بِهَا۔ (۱)

ایک شخص رات کو کسی تجارتی معاملے کا قصد کرتا ہے اور وہ ایسا کام ہے کہ اگر اسے کرے تو اس میں اس کی ہلاکت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر سے دیکھتا ہے (اللہ تعالیٰ جگہ سے پاک ہے اس کی بلندی کی طرف اشارہ ہے) اور اسے اس کام سے پھیر دیتا ہے صبح کے وقت وہ پریشان غمگین ہوتا ہے اور اپنے ہمسائے اور چچازاد بھائی کی بدشگونی لیتا ہے کہ کون میرے آگے آیا کس نے مجھ پر مصیبت ڈالی حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے جو اس پر فرمائی ہے۔

اسی لیے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ میں مالداری کی حالت میں صبح کرتا ہوں یا فقر کی حالت میں، کیوں کہ مجھے معلوم نہیں کہ میرے لیے ان میں سے کیا چیز بہتر ہے

اور جس شخص کو ان امور کا کامل یقین نہ ہو اس سے توکل کا تصور نہیں ہو سکتا اسی لیے حضرت سلیمان دارانی رحمہ اللہ نے حضرت احمد بن ابی الحواری رحمہ اللہ سے فرمایا مجھے ہر مقام سے حصہ ملا ہے لیکن اس مبارک توکل سے نہیں ملا مجھے اس کی خوشبو سونگھنے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا —— تو آپ نے بلند مقام حاصل ہونے کے باوجود یہ گفتگو فرمائی۔ انہوں نے اس بات کا انکار نہیں کیا کہ وہ مقامات ممکنہ حاصل نہیں کر سکتے بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے یہ مقام نہیں پایا۔ شاید ان کی مراد یہ ہو کہ انہوں نے بلند اور انتہائی مقام توکل نہیں پایا۔

جب تک اس بات پر ایمان مکمل نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی فاعل اور کوئی رزاق نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے بندے کے لیے جو فقر، غنا، موت اور حیات مقدر فرمائی ہے وہ اس کے لیے اس چیز سے بہتر ہے جس کی وہ تمنا کرتا ہے اس وقت تک اس کا حال توکل مکمل نہیں ہوتا پس توکل کی بنیاد ان امور پر ایمان کی قوت ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اسی طرح تمام دینی مقامات وہ اقوال ہوں یا اعمال ان کی بنیاد بھی ایمان ہے جو ان سب کی اصل ہے۔

---

(۱) حلیۃ الاولیاء جلد ۳ ص ۵ ،۳ ترجمہ ۲۴۳

خلاصہ یہ ہوا کہ توکل ایک مفہوم مقام ہے لیکن یہ دل کی قوت اور قوتِ یقین کو چاہتا ہے اسی لیے حضرت سہل رحمہ اللہ نے فرمایا جس نے مال کمانے پر طعن کیا اس نے سنت پر طعن کیا اور جس نے ترک کسب پر طعن کیا اس نے توحید پر طعن کیا۔

سوال :

کیا کوئی ایسی دوا ہے جس سے دل کو اسباب ظاہرہ سے پھیرنے اور خفیہ اسباب کو آسان کرنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں حسن ظن کا فائدہ حاصل ہو۔

جواب :

ہاں جب تم اس بات کو پہچان لو کہ برا گمان شیطان کی طرف سے بنایا جاتا ہے اور حسن ظن اللہ تعالیٰ کی طرف سے القا ہوتا ہے ارشاد خداوندی ہے۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا۔ (۱)

شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ دیتا ہے۔

انسان فطری طور پر شیطان کے ڈرانے پر کان دھرتا ہے اسی لیے کہا گیا ہے بدگمانی کی وجہ سے ڈرنے والا جوش دلانے والا ہے اور جب اس کے ساتھ بزدلی، ضعفِ قلب اور تسکین کا ظاہری اسباب اور ان کو برانگیختہ کرنے والے امور کو دیکھنا مل جائے تو برا گمان غالب آجاتا ہے اور توحید کلی طور پر باطل ہو جاتی ہے بلکہ رزق کا حصول پوشیدہ اسباب کی طرف سے دیکھنا بھی توکل کو باطل کر دیتا ہے ایک عابد کے بارے میں منقول ہے کہ اس نے مسجد میں اعتکاف کیا اور اس کے پاس مال نہ تھا امام مسجد نے کہا اگر تم مال کماتے تو تمہارے لیے یہ بات افضل تھی۔ اس نے جواب نہ دیا حتیٰ کہ اس نے تین بار یہ بات کہی اس نے چوتھی مرتبہ جواب دیا کہ مسجد کے پڑوس میں ایک یہودی ہے جس نے میرے لیے یومیہ دو روٹیوں کی ضمانت دی ہے اس نے کہا اگر وہ اپنی ضمانت میں سچا ہے تو تمہارا مسجد میں اعتکاف بیٹھنا صحیح ہے اس عابد نے کہا اے امام مسجد! تم عقیدۂ توحید میں کمی کے باعث اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان کھڑے ہوتے ہو اگر تم امام نہ ہوتے تو اچھا تھا۔ تم نے یہودی کے وعدے کو اللہ تعالیٰ کی رزق کے ساتھ ضمان پر ترجیح دی۔

ایک امام مسجد نے کسی نمازی سے پوچھا تم کہاں سے کھاتے ہو؟ اس نے کہا اے شیخ! صبر کرو میں وہ نماز دوبارہ پڑھ لوں جو میں نے تمہارے پیچھے پڑھی ہیں پھر جواب دوں گا۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ بقرہ آیت ۲۶۸

اگر تمہارا یہ حسن ظن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے پوشیدہ اسباب کے واسطے سے رزق دیتا ہے تو تم وہ حکایات سنو جن میں اللہ تعالیٰ کے بندوں تک رزق پہنچنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی عجیب صنعت کا ذکر ہے اور نیز تاجروں اور مالدار لوگوں کے مالوں کو ہلاک کرکے ان کو بھوکے مارنے کا تذکرہ ہے جیسے حضرت حذیفہ مرعشی رحمہ اللہ سے مروی ہے وہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کی خدمت کیا کرتے تھے ان سے کہا گیا آپ نے ان سے کیا عجیب بات دیکھی ہے انہوں نے فرمایا ہم مکہ مکرمہ کے راستے میں کئی دن اس طرح رہے کہ ہمارے پاس کھانا نہ تھا پھر ہم کوفہ میں داخل ہوتے تو ایک ویران مسجد میں پناہ لی حضرت ابراہیم بن ادھم نے میری طرف دیکھ کر فرمایا اے حذیفہ! میرا خیال ہے تم بھوکے ہو؟ میں نے کہا آپ صحیح فرماتے ہیں فرمایا دوات اور کاغذ لاؤ میں لے آیا۔ تو انہوں نے یوں لکھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ تو ہی ہر حالت میں مقصود ہے اور ہر معنی میں تیری ہی طرف اشارہ ہوتا ہے اور ایک شعر لکھا۔

اَنَا حَامِدٌ اَنَا شَاكِرٌ اَنَا ذَاكِرٌ	میں تعریف کرنے والا شکر کرنے والا اور ذکر کرنے والا
اَنَا جَائِعٌ اَنَا ضَائِعٌ اَنَا عَارِیٌ	ہوں میں بھوکا ہوں پیاسا اور ننگا ہوں یہ چھ باتیں ہیں
هِیَ سِتَّةٌ وَّاَنَا الضَّمِیْنُ لِنِصْفِهَا	ان میں سے نصف (تین) کا میں ضامن ہوں باقی نصف
فَكُنِ الضَّمِیْنَ لِنِصْفِهَا یَا بَارِیْ	کا تو ضامن بن جا تیرے غیر کی تعریف جہنم کی آگ
مَدْحِیْ لِغَیْرِكَ لَهَبُ نَارٍ خُضْتُهَا	ہے مجھے اس میں داخل ہونے سے بچا۔
فَاَجِرْ عُبَیْدَكَ مِنْ دُخُوْلِ النَّارِ	

(فرماتے ہیں) پھر وہ رقعہ مجھے دیا اور فرمایا جاؤ اور اپنے دل کو غیر خدا سے معلق نہ کرنا اور جس شخص سے سب سے پہلے ملاقات ہو یہ رقعہ اسے دینا۔ (فرماتے ہیں) میں نکلا تو سب سے پہلے جس شخص سے ملاقات ہوئی وہ خچر پر سوار تھا میں نے وہ رقعہ اسے دیا اس نے لیا جب وہ اس کے مضمون سے آگاہ ہوا تو رو پڑا اور کہنے لگا یہ رقعہ لکھنے والا کہاں ہے میں نے کہا فلاں مسجد میں ہے اس نے مجھے ایک تھیلی دی جس میں چھ سو دینار تھے پھر میں نے ایک اور شخص سے ملاقات کی اور اس سے خچر والے آدمی کے بارے میں پوچھا اس نے کہا یہ عیسائی ہے میں حضرت ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کے پاس آیا اور واقعہ عرض کیا انہوں نے فرمایا ان دیناروں کو ہاتھ نہ لگانا وہ شخص ابھی آئے گا چنانچہ کچھ دیر کے بعد وہ نصرانی اندر آیا اور جھک کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سر کو بوسہ دیا اور اسلام قبول کر لیا۔

حضرت ابو یعقوب اقطع بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں ایک دفعہ حرم شریف میں دس دن بھوکا رہا اور مجھے کمزوری محسوس ہوئی میرے دل میں خیال آیا کہ باہر نکلوں چنانچہ میں وادی کی طرف چلا گیا کہ شاید کوئی چیز مل جائے جس سے میری کمزوری ختم ہو جائے میں نے زمین پر پڑا ہوا شلغم دیکھا میں نے اسے اٹھا لیا لیکن اس سے میرے دل میں وحشت محسوس ہوئی اور گویا کوئی شخص مجھے کہہ رہا ہے تم دس دن بھوکے رہے اور بالآخر تمہارے حصے میں ایک شلغم آیا جو بدل چکا ہے میں نے

اسے پھینکا اور مسجد میں داخل ہو کر بیٹھ گیا میں نے کیا دیکھا کہ ایک عجمی شخص آیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا اس نے ایک تھیلا میرے سامنے رکھا اور کہا یہ تمہارے لیے ہے میں نے کہا تم نے کیسے اس کو میرے لیے خاص کر دیا؟ اس نے کہا ہم پندرہ دن سے سمندر میں تھے کشتی ڈوبنے لگی تو میں نے نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے بچا لیا تو مجاورین میں سے جو شخص مجھے سب سے پہلے نظر آیا یہ (تھیلا) میں اس پر صدقہ کروں گا۔ اور سب سے پہلے میری ملاقات تم سے ہوئی ہے میں نے کہا اس کو کھولو اس نے کھولا تو اس میں مصر کا میوہ، چھلے ہوئے بادام اور برفیاں تھیں میں نے کچھ ایک میں سے لیا اور کچھ دوسری میں سے اور باقی واپس کرتے ہوئے کہا اسے میری طرف سے اپنے دوستوں کو بطور ہدیہ دے دو میں نے اسے قبول کر لیا پھر میں نے اپنے آپ سے کہا کہ تمہارا رزق تو تمہاری طرف سفر کر رہا تھا اور تم اسے وادی میں ڈھونڈ رہے تھے۔

حضرت ممشاد دینوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں مجھ پر قرض تھا جس کی وجہ سے میرا دل اس طرف متوجہ ہو گیا میں نے خواب میں دیکھا گویا کوئی کہنے والا کہتا ہے اے بخیل! تم نے ہمارے حساب میں اتنا سا قرض مزید لو لینا تمہارا کام ہے اور ادائیگی ہمارا کام ہے اس کے بعد میں نے کبھی بھی سبزی فروش، قصاب یا کسی دوسرے سے حساب نہیں کیا۔

حضرت بنان حمال رحمہ اللہ سے منقول ہے فرماتے ہیں میں مکہ مکرمہ کے راستے میں تھا میں مصر سے آ رہا تھا اور میرے پاس زاد راہ تھا میرے پاس ایک عورت آئی اور اس نے کہا اے بنان! تم حمال ہو جو اپنی پیٹھ پر بوجھ اٹھاتے ہو اور تمہارا وہم ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں رزق نہیں دے گا فرماتے ہیں میں نے اپنا توشہ پھینک دیا پھر تین دن ایسے آئے کہ میں نے کچھ نہ کھایا اس کے بعد میں نے راستے میں ایک پازیب پائی تو دل میں کہا کہ اسے اٹھا لینا چاہیے یہاں تک کہ اس کا مالک آ جائے ہو سکتا ہے وہ مجھے کچھ دے اور میں اسے یہ واپس کر دوں اچانک دیکھا تو وہی عورت کھڑی تھی کہنے لگی تم تاجر ہو کہنے ہو ہو سکتا ہے اس کا مالک آ جائے اور میں اس سے کچھ لے لوں پھر اس نے میری طرف کچھ درہم پھینکے اور کہا کہ اسے خرچ کرو تو وہ مجھے مکہ مکرمہ کے قریب تک کافی رہے۔

منقول ہے کہ حضرت بنان رحمہ اللہ کو ایک لونڈی کی ضرورت پڑی کہ وہ آپ کی خدمت کرے انہوں نے اپنے بھائیوں سے بلا تکلف (واضح طور پر) کہہ دیا تو انہوں نے ان کے لیے لونڈی کی قیمت جمع کر دی انہوں نے کہا، تم یہ ہے قافلہ آئے گا تو ہم مناسب لونڈی خرید لیں گے جب قافلہ آیا تو ان سب نے ایک لونڈی کے بارے میں اتفاق کیا اور کہا کہ یہ لونڈی حضرت بنان کے لائق ہے انہوں نے اس کے مالک سے پوچھا کہ اس کی قیمت کتنی ہے؟ اس نے کہا یہ بیچنے کے لیے نہیں ہے جب انہوں نے اصرار کیا تو اس نے کہا یہ حضرت بنان حمال کے لئے ہے سمرقند کی ایک خاتون نے آپ کے لیے بطور تحفہ بھیجی ہے چنانچہ اسے حضرت بنان رحمہ اللہ کے پاس لے جایا گیا اور واقعہ بھی بتایا گیا۔

کہتے ہیں پہلے زمانے میں ایک شخص سفر میں تھا اور اس کے پاس ایک روٹی تھی اس نے کہا اگر میں اسے کھا گیا تو مر جاؤں گا چنانچہ اس پر اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر کر دیا اور فرمایا اگر وہ کھائے تو اسے اور دو اور اگر نہ کھائے

تو دوسری روٹی نہ دینا چنانچہ وہ روٹی مرتے دم تک اس نے نہ کھائی اور وہ اس کے پاس ہی رہی۔

حضرت ابو سعید خراز رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں ایک جنگل میں داخل ہوا اور میرے پاس زادِ راہ نہ تھا چنانچہ میں فاقے کا شکار ہو گیا میں نے دور سے ایک منزل کو دیکھا تو میں خوش ہوا کہ پہنچ گیا پھر میں نے اپنے دل میں سوچا کہ میں نے تو غیرِ خدا پر بھروسہ کر لیا اور سکون حاصل کیا چنانچہ میں نے قسم کھائی کہ میں اس منزل میں نہیں داخل ہوں گا ہاں مجھے اٹھا کر لے جایا جائے تو الگ بات ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے لیے ریت میں ایک گڑھا کھودا اور اپنے جسم کو سینے تک اس میں چھپا دیا جب آدھی رات ہوئی تو میں نے بلند آواز سے سنا اے منزل والو! اللہ تعالیٰ کے ایک ولی نے اپنے آپ کو ریت میں قید کر لیا ہے اس کے پاس جاؤ چنانچہ ایک جماعت نے آکر مجھے نکالا اور مجھے اٹھا کر بستی میں لے گئے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دروازے پر بیٹھا ہوا تھا تو اس نے کسی کہنے والے سے سنا اے فلاں! تم نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف ہجرت کی ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف؟ جاؤ قرآن سیکھو وہ تمہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دروازے سے بے نیاز کر دے گا چنانچہ وہ شخص چلا گیا اور غائب ہو گیا حتیٰ کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے تلاش کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ گوشہ نشین ہو کر عبادت میں مشغول ہو گیا ہے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس کے پاس تشریف لائے اور فرمایا میرا دل تمہیں دیکھنے کا خواہشمند تھا تم ہم سے کیوں غائب ہو گئے اس نے کہا میں نے قرآن پڑھا تو اس نے مجھے عمر اور آلِ عمر (رضی اللہ عنہم) سے بے نیاز کر دیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے تم نے اس میں کیا پایا؟ اس نے عرض کیا میں نے اس میں یہ لکھا ہوا پایا۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ۔ (۱) آسمان میں تمہارا رزق بھی ہے اور جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے

تو میں نے کہا میرا رزق آسمان میں ہے اور میں زمین میں تلاش کر رہا ہوں (یہ سن کر) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا تو نے سچ کہا چنانچہ اس کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس شخص کے پاس آکر بیٹھتے تھے۔

حضرت ابو حمزہ خراسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں میں نے ایک سال حج کیا اس دوران کہ میں راستے میں چل رہا تھا میں کنویں میں گر گیا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ میں کسی سے مدد طلب کروں لیکن میں نے کہا نہیں اللہ کی قسم میں مدد نہیں مانگوں گا۔ ابھی اسی خیال میں تھا کہ کنویں کے پاس سے دو آدمی گزرنے لگے ایک نے دوسرے سے کہا آؤ ہم اس کنویں کا منہ بند کر دیں تاکہ کوئی اس میں گر نہ جائے چنانچہ وہ بانس اور چٹائی لائے اور اس کا منہ بند کر دیا میں نے چیخنا چاہا لیکن دل میں سوچا کس

---

(۱) قرآن مجید، سورۃ ذاریات آیت ۲۲

کے سامنے چلاؤں اللہ تعالیٰ توان دونوں سے زیادہ قریب ہے چنانچہ میں پرسکون ہوگیا تھوڑی دیر بعد کوئی چیز آتی اور اس نے کنویں کا منہ کھول کر پاؤں اس میں لٹکایا اور گویا وہ چیز کہہ رہی ہے میرے پاؤں کے ساتھ لٹک جاؤ اس کی آواز میں گنگناہٹ تھی میں نے کہا میں اس کو پہچانتا ہوں چنانچہ میں اس کے ساتھ لٹک گیا اور اس نے مجھے باہر نکالا دیکھا تو وہ ایک درندہ تھا وہ چلا گیا اور یہ آواز دی اے ابوحمزہ! کیا یہ اچھی بات نہیں ہم نے تمہیں موت سے موت کے ذریعے بچایا چنانچہ میں وہاں سے چلا گیا اور میں یہ کہہ رہا تھا۔

نَہَانِیْ حَیَائِیْ مِنْکَ اَنْ اَکْشِفَ الْھَوٰی
وَاَغْنَیْتَنِیْ بِالْفَھْمِ مِنْکَ عَنِ الْکَشْفِ
تَلَطَّفْتَ فِیْ اَمْرِیْ فَاَبْدَیْتَ شَاھِدِیْ
اِلٰی غَائِبِیْ وَالتَّلَطُّفُ یُدْرَکُ بِالتَّلَطُّفِ
تَرَائَیْتَ لِیْ بِالْغَیْبِ حَتّٰی کَاَنَّمَا
تُبَشِّرُنِیْ بِالْغَیْبِ اَنَّکَ فِی الْکَفِّ
اَرَاکَ وَبِیْ مِنْ ھَیْبَتِیْ لَکَ وَحْشَۃً
فَتُؤْنِسُنِیْ بِالتَّلَطُّفِ مِنْکَ وَبِالْعَطْفِ
وَتُحْیِیْ مُحِبًّا اَنْتَ فِی الْحُبِّ حَتْفُہٗ
وَذَا عَجَبٌ کَوْنُ الْحَیَاۃِ مَعَ الْحَتْفِ

مجھے حیا نے اس بات سے منع کیا کہ میں عشق کو واضح کروں اور جب تو نے مجھے سمجھا دیا تو میں اس وضاحت سے بے نیاز ہوگیا تو نے اپنی مہربانی سے میرے غائب گواہ کو ظاہر کر دیا اور مہربانی، دوسری مہربانی سے حاصل ہوتی ہے تو نے غیب میں مجھے دیدار کرایا گویا تو مجھے غیب میں خوشخبری دے رہا ہے کہ تو ہتھیلی میں ہے (یعنی سامنے ہے) میں تجھے دیکھتا ہوں تو تیری ہیبت سے وحشت ہوتے لگتی ہے پس تو مجھے اپنی مہربانی سے مانوس کر لیتا ہے تو مجھے محبت میں زندہ رکھتا ہے اور خواہشات مر جاتی ہیں تو تعجب ہے کہ موت و حیات ساتھ ساتھ ہیں۔

اس قسم کے واقعات کی بے شمار مثالیں ہیں اور جب آدمی کا ایمان مضبوط ہو اور وہ تنگ دل کے بغیر ایک ہفتہ تک بھوک برداشت کر سکتا ہو اور اس بات پر بھی ایمان مضبوط ہو کہ اگر ایک ہفتہ تک اسے رزق نہ ملے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا مرنا بہتر ہے اسی لیے اس نے رزق روک لیا ہے تو ان احوال و مشاہدات کے ساتھ توکل پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے ورنہ بالکل نہیں ہوگا۔

عیالدار کا توکل:

جان لو کہ عیالدار کا حکم، اکیلے آدمی کے حکم سے الگ ہے کیونکہ تنہا آدمی کا توکل دو باتوں سے صحیح قرار پاتا ہے ایک یہ کہ وہ کسی تنگدلی اور لوگوں کی تاک کے بغیر ایک ہفتہ تک بھوکا رہ سکتا ہو اور دوسری بات یہ ہے کہ ایمان کی وہ اقسام پائی جائیں جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ اگر اس کے پاس رزق نہ آئے تو وہ موت کو دل کی خوشی سے قبول کرے اس اعتبار سے کہ وہ موت اور بھوک کو ہی اپنا رزق جانتا ہو یہ بات اگرچہ دنیوی اعتبار سے نقصان ہے لیکن آخرت کے اعتبار سے (ثواب کے) اضافے کا باعث ہے پس وہ یوں خیال کرتا ہے کہ دو رزقوں میں اچھا

رزق (آخرت کا رزق) اس کی طرف چلایا گیا ہے اور یہی مرض الموت ہے اور وہ اس پر راضی ہے اور یہ اسی طریقے پر ہے جس طرح تقدیر میں لکھا گیا ہے تو اس سے تنہا آدمی کا توکل مکمل ہوتا ہے۔

لیکن بال بچوں کو بھوک پر صبر کرنے کی تکلیف دینا جائز نہیں اور یہ بات بھی ممکن نہیں کہ ان کے سامنے توحید کی تقریر کی جائے اور یہ کہ بھوک کا مزہ قابلِ رشک بات ہے اگرچہ شاذ و نادر ایسا ہو بھی جاتا ہے اسی طرح ایمان و اعتقاد کا مسئلہ ہے کہ وہ ان پر صبر کرے لہٰذا ان کے حق میں مال کمانے والے کا توکل ممکن ہے اور یہ تیسرا مقام ہے جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا توکل ہے جب آپ کسبِ معاش کے لیے بازار تشریف لے گئے۔

لیکن اولاد کے حق میں توکل اختیار کرتے ہوئے جنگلوں میں نکل جانا یا ان کے معاملات کا اہتمام نہ کرنا اور اسے ان کے حق میں توکل سمجھنا حرام ہے اور بعض اوقات یہ بات ان کی ہلاکت کا باعث بنتی ہے اور اسی سے اس کا مواخذہ ہوگا۔

بلکہ تحقیق یہ ہے کہ خود اس کی ذات اور اہل و عیال میں کوئی فرق نہیں اگر وہ کچھ مدت بھوک پر صبر کریں اور بھوک سے مرنے کو اُخروی رزق اور غنیمت سمجھیں تو ان کے حق میں توکل بھی جائز ہے اور اس کا نفس بھی تو عیال میں شامل ہے اور اسے ہلاک کرنا بھی جائز نہیں ہاں اگر وہ ایک خاص مدت تک بھوک برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو ٹھیک ہے اور اگر وہ اس کی طاقت نہیں رکھتا اور اس سے اس کے دل میں اضطراب اور عبادت میں خلل پیدا ہوتا ہے تو اس کے لیے توکل جائز نہیں۔

اسی لیے منقول ہے کہ حضرت ابوتراب نخشی رحمہ اللہ نے ایک صوفی کو دیکھا کہ اس نے تربوز کے چھلکے کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ اسے کھائے اور تین دن بھوک سے گزر چکے تھے تو انہوں نے فرمایا تمہارے لیے تصوف صحیح نہیں بازار جایا کرو —— مطلب یہ کہ تصوف تو توکل کے ساتھ ہوتا ہے اور توکل اس آدمی کا صحیح ہوتا ہے جو تین دن سے زیادہ کھانے سے صبر کر سکے۔

حضرت ابوعلی روذباری رحمہ اللہ نے فرمایا جب کوئی فقیر پانچ دن کے بعد کہے کہ مجھے بھوک لگی ہے تو اسے کہو بازار جایا کر (یعنی کام کاج کیا کر) تو انسان کا بدن بھی اس کا عیال ہے اور اس کا بدن کے اعتبار سے توکل اسی طرح ہے جس طرح اہل و عیال کے اعتبار سے توکل کرنا ان دونوں میں ایک اعتبار سے فرق ہے وہ یہ کہ آدمی اپنے نفس کو بھوک پر صبر کا مکلف بنا سکتا ہے لیکن عیال کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں۔

اس گفتگو سے تمہارے لیے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسباب سے قطع تعلق کا نام توکل نہیں بلکہ ایک مدت تک بھوک برداشت کرنے اور کبھی رزق میں تاخیر ہو جائے تو موت پر راضی ہونے، شہروں اور دیہات میں رہنے یا ایسے جنگلوں میں رہنے کا نام توکل ہے جن میں کوئی سبزی وغیرہ مل جائے یہ تمام چیزیں باقی رہنے کے اسباب ہیں البتہ ان

میں کچھ نہ کچھ اذیت بھی ہے اس لیے کہ صبر کے بغیر ان پر برقرار رہنا مشکل ہے اور شہروں میں توکل اختیار کرنا جنگلوں میں توکل کی نسبت اسبابِ بقا کے حصول کے زیادہ قریب ہے اور یہ سب اسباب ہیں لیکن لوگ ان سے زیادہ ظاہرا اسباب کی طرف جھک گئے اور انہوں نے ان کو اسباب میں شمار نہ کیا اور اس کی وجہ ان کے ایمان کی کمزوری اور حرص کا زیادہ ہونا ہے نیز وہ آخرت کی خاطر دنیا میں اذیتوں پر صبر نہیں کرتے اور سوئے ظن اور طویل امید کی وجہ سے ان کے دلوں پر بزدلی کا غلبہ ہے۔

اور جو شخص آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کی طرف نظر کرتا ہے اس کے لیے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مُلک و ملکوت کی تدبیر فرمائی اور یہ ایسی تدبیر ہے کہ بندے کا رزق اس سے الگ نہیں ہو سکتا چاہے وہ تردد نہ کرے کیوں کہ جو شخص تردد و اضطراب سے عاجز ہے (یعنی کما نہیں سکتا) اسے بھی تو رزق ملتا ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے جب وہ حرکت کرنے سے عاجز ہے تو اللہ تعالیٰ نے کسی طرح اس کی ناف کو اس کی ماں کے ساتھ ملا دیا حتیٰ کہ ماں کی خوراک کا زائد حصہ اس ناف کے ذریعے بچے تک پہنچتا ہے اور اس میں بچے کی کوئی تدبیر شامل نہیں ہوتی۔

پھر جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ ماں کے دل میں اس کی محبت اور شفقت ڈال دیتا ہے تاکہ وہ اس کی پرورش کرے اس کا دل مانے یا نہ۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ماں کے دل میں محبت کی آگ شعلہ زن ہے پھر جب تک بچہ غذا کو چبانے کے قابل نہیں ہو جاتا تو اس کا رزق اس دودھ میں رکھا ہے جس کو چبانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور چوں کہ بچہ اپنے مزاج کی نرمی کی وجہ سے کثیف غذا کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے لطیف دودھ اس کی ماں کے پستانوں میں رکھ دیا تاکہ جب بچہ پیدا ہو جائے تو حسب ضرورت وہ دودھ اسے ملتا رہے تو کیا یہ سب کچھ بچے کی اپنی تدبیر سے ہوتا ہے یا ماں کی تدبیر سے؟

پھر جب وہ اس عمر کو پہنچتا ہے کہ اب کثیف غذا کھا سکتا ہے تو اس کے دانت اُگ آتے ہیں جو کاٹتے بھی ہیں اور پیستے بھی تاکہ وہ اسے چبا سکے۔ پھر جب بڑا ہو جاتا ہے اور خود اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے تو اس کے لیے حصولِ علم اور آخرت کے راستے پر چلنا آسان کر دیا جاتا ہے لہذا بالغ ہونے کے بعد اس کی بزدلی جہالت کی وجہ سے ہے کیوں کہ بالغ ہونے کے بعد اسبابِ معیشت کم نہیں ہوتے بلکہ زیادہ ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ پہلے وہ مال کمانے پر قادر نہیں تھا اب قادر ہو گیا لہذا اس کی طاقت بڑھ گئی۔

ہاں پہلے اس پر شفقت کرنے والا ایک ہی شخص تھا یعنی ماں یا باپ، اور اس پر شفقت زیادہ بھی تھی وہ اسے ایک دن میں ایک یا دو مرتبہ کھلاتا پلاتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی محبت ماں باپ پر مسلط کر دی تھی۔ اسی طرح اب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں اس کی شفقت، محبت، نرمی اور رحمت ڈال دی ہے بلکہ تمام شہر والے اس پر شفقت کرتے ہیں حتیٰ کہ شہر کے جس آدمی کو کسی محتاج کا علم ہوتا ہے تو اس کا دل دُکھتا ہے اور نرمی پیدا ہوتی ہے اور اس کی حاجت کو زائل کرنے کے لیے جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ پہلے اس کا مشفق ایک تھا اب ہزار سے بھی زیادہ ہیں پہلے وہ اس پر اس لیے شفقت نہیں کرتے تھے کہ وہ اس کی ماں یا باپ کی کفالت کو جانتے تھے اور وہ خاص مشفق تھے لہذا وہ اسے محتاج نہیں

سمجھتے تھے اور اگر کسی یتیم بچے کو دیکھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کسی ایک مسلمان یا تمام مسلمانوں کے دلوں میں اس پر رحم کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے حتیٰ کہ وہ اس کی کفالت کرتے ہیں۔ آج تک نہیں دیکھا گیا کہ قحط سالی کے حالات نہ ہونے کی صورت میں کوئی یتیم بچہ بھوک سے مر گیا ہو حالانکہ وہ کمانے سے عاجز ہے اور اس کا کوئی خاص کفیل نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ ہی اس شفقت کے واسطے سے اس کی کفالت کرتا ہے جو شفقت اس نے بندوں کے دلوں میں رکھی ہے نمعلوم بالغ ہونے کے بعد اس کا دل رزق میں کیوں مشغول ہو جاتا ہے جب کہ بچپن میں مشغول نہیں ہوتا حالاں کہ بچپن میں اس کا مشفق ایک تھا اور اب ایک ہزار ہیں؛ ہاں (یہ بات ہے کہ) ماں کی شفقت زیادہ مضبوط اور وافر ہوتی ہے لیکن وہ ایک ہے اور عام لوگوں کی ایک ایک بندے کی شفقت اگرچہ کمزور ہو مل کر غرض کا فائدہ دیتی ہے۔ کتنے ہی بچے ایسے ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی حالت آسان کر دی جو ماں باپ والے بچے کی حالت سے زیادہ اچھی ہوتی ہے تو ایک ایک آدمی کی کمزور شفقت کا نقصان شفقین کی کثرت سے اور عیاشی کو ترک کر کے صرف ضرورت کی مقدار پر اکتفا کرنے سے پورا ہوتا ہے کسی شاعر نے اچھی بات کہی ہے۔

جَرَىٰ قَلَمُ الْقَضَاءِ بِمَا يَكُوْنُ فَسِيَّانِ
التَّحَرُّكُ وَالسُّكُوْنُ جُنُوْنٌ مِنْكَ
اَنْ تَسْعٰى لِرِزْقٍ وَيُرْزَقُ فِيْ غِشَاوَتِهِ
الْجَنِيْنَ۔

جو کچھ ہونے والا ہے اس کے ساتھ قضاء و قدر کا قلم چل چکا ہے پس حرکت و سکون برابر ہیں تم پاگل ہو کر رزق کے لیے کوشش کرتے ہو حالانکہ وہ پردے کے اندر (پیٹ کے اندر) بچے کو بھی رزق دیتا ہے۔

سوال:

لوگ یتیم بچے کی کفالت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اس کے بچپن کی وجہ سے اسے عاجز جانتے ہیں لیکن بالغ تو کمانے پر قادر ہوتا ہے اس لیے لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے بلکہ وہ کہتے ہیں یہ ہماری طرح ہے لہٰذا اسے خود کوشش کرنی چاہیے۔

جواب:

اگر یہ شخص جو کمانے پر قادر ہے بیکار پڑا ہے تو لوگ سچ کہتے ہیں اس پر کمانا لازم ہے اس کے حق میں توکل کا کوئی معنیٰ نہیں ہے کیوں کہ توکل تو ایک دینی مقام ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے لیے فارغ رہنے پر مدد حاصل کی جاتی ہے لہٰذا بیکار آدمی کا توکل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے لیے مشغول ہے مسجد میں یا گھر میں بیٹھا علم و عبادت کا شغل اختیار کیے ہوئے ہے تو لوگ اسے ترکِ کسب پر ملامت نہیں کرتے اور نہ ہی اسے کمانے کی زحمت دیتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے لیے اس کی مشغولیت کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت مضبوط ہوتی ہے حتیٰ کہ اس کے پاس ضرورت سے زیادہ لے جاتے ہیں اس پر لازم ہے کہ وہ دروازہ بند کر لے لیکن بھاگ کر پہاڑوں پر نہ چلا جائے آج تک کوئی ایسا عالم یا عابد نہیں دیکھا گیا کہ وہ شہر میں رہ کر اپنا وقت اللہ تعالیٰ کے لیے (علم یا عبادت میں) گزارے اور وہ بھوکا مر جائے اور آئندہ

بھی یہ صورت نظر نہیں آئے گی بلکہ اگر وہ کسی ایک جماعت کو کھانا کھلانا چاہے تو محض اپنے کلام سے ایسا کر سکتا ہے کیوں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ہو جاتا ہے اور جو شخص اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ (کے دین) کے لیے وقف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت ڈال دیتا ہے اور اس کے لیے دلوں کو مسخر کر دیتا ہے جس طرح بچے کے لیے اس کی ماں کے دل کو مسخر کر دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے ملک و ملکوت کی ایسی تدبیر فرمائی ہے جو تمام اہل مُلک و ملکوت کو کافی ہے جو شخص اس تدبیر پر نظر کرتا ہے وہ مدبر پر اعتماد کرتا اور یقین رکھتا ہے اور اس کے ساتھ مشغول ہو جاتا ہے نیز اس پر ایمان لاتا ہے وہ اسباب کے مدبر کو دیکھتا ہے اسباب کو نہیں دیکھتا۔ ہاں اس نے یہ انتظام نہیں کیا کہ جو اس کی ذات میں مشغول ہوگا وہ اسے حلوا، موٹے موٹے پرندے، باریک پتلے کپڑے اور عمدہ گھوڑے ضرور بضرور اور ہمیشہ دے گا ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے لیکن وہ ایسی تدبیر ضرور کرتا ہے کہ جو شخص اس کی عبادت میں مشغول ہوا سے ہر ہفتے میں جو کی ایک روٹی یا سبزی ضرور دے گا جسے وہ کھائے۔

لیکن عام طور پر اس سے زیادہ ملتا ہے بلکہ حاجت اور کفایت سے زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ پس توکل کو ترک کرنے کا سبب یہ ہے کہ نفس کو ہمیشہ ناز و نعمت میں پلنے، عمدہ کپڑے پہننے اور لطیف غذائیں کھانے کی رغبت ہوتی ہے اور یہ آخرت کا طریقہ نہیں ہے۔ اور یہ (عمدہ چیزیں) محنت و حرکت کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں بلکہ محنت کی صورت میں بھی شاذونادر ہی حاصل ہوتی ہیں اور بعض اوقات کسی حرکت و محنت کے بغیر بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا جس شخص کی بصیرت کی آنکھ کھلی ہو اس کے نزدیک حرکت و محبت کا اثر کمزور ہوتا ہے اسی لیے وہ اپنی محنت پر مطمئن نہیں ہوتا بلکہ وہ ملک و ملکوت کے مدبر سے مطمئن ہوتا ہے جو ایسی تدبیر فرماتا ہے کہ بندے کا رزق اس سے الگ نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ گھر بیٹھا ہو ہاں محنت کرنے والے کے بارے میں بھی یہ تصور ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات اس کا رزق تاخیر سے ملے۔

جب ان امور کا انکشاف ہو جاتے اور اسے قلبی قوت اور نفسانی شجاعت بھی حاصل ہو تو حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے اس قول کا ثمرہ اسے حاصل ہوگا آپ نے فرمایا میں چاہتا ہوں کہ تمام اہل بصرہ میرے عیال میں ہوں (ان کا کھانا میرے ذمہ ہو) اور ایک ایک دانہ ایک دینار کا ملتا ہو حضرت وہیب بن ورد رحمہ اللہ نے فرمایا اگر آسمان تانبے کا اور زمین سیسے کی ہو اور میں اپنے رزق کا اہتمام خود کروں تو میں اپنے آپ کو مشرک سمجھوں گا۔

جب تمہیں ان امور کی سمجھ آجائے تو سمجھ لو کہ توکل ایک ایسا مقام ہے جو ذاتی طور پر معلوم ہے اور جو شخص اپنے نفس پر غالب آسکتا ہے وہ اس مقام تک پہنچ سکتا ہے اور تمہیں یہ بات بھی معلوم ہو جائے گی کہ جو شخص توکل اور اس کے امکان کا منکر ہے وہ جہالت کی وجہ سے انکار کرتا ہے تو تمہیں دو غرضوں کو جمع کرنے سے بچنا چاہیے یعنی اس توکل کے پائے جانے کا ذوق بھی نہ ہو اور بطور علم اس کا اعتقاد بھی نہ ہو (ایسا نہیں ہونا چاہیے)

تو تھوڑے سے مال پر قناعت کرنا اور حسب ضرورت رزق پر راضی ہونا تمہارے لیے ضروری ہے وہ تمہارے پاس ضرور

آئے گا اگرچہ تم اس سے بھاگو اس وقت اللہ تعالیٰ کے ذمہ کرم پر لازم ہے کہ وہ تمہاری طرف رزق ایسے شخص کے ذریعے بھیجے جس کے بارے میں تمہیں گمان بھی نہ ہو اگر تم تقویٰ اور توکل میں مشغول ہو جاؤ تو تم تجربے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مصداق دیکھ لو گے۔

ارشاد خداوندی ہے :

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ (۱)

اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے لیے (پریشانیوں سے) نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے اور اسے وہاں سے رزق دیتا ہے جس جگہ کے بارے میں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

ہاں وہ اس بات کا کفیل نہیں کہ وہ اسے پرندوں کا گوشت اور لذیذ کھانے دے گا وہ صرف اسی رزق کا ضامن ہے جس کے ذریعے انسان کی زندگی باقی رہے اور یہ چیز جس کی ضمان ہے ہر اس شخص کو ملے گی جو ضامن کے ساتھ مشغول ہو اور اس کی ضمان پر اسے اطمینان حاصل ہو۔ کیوں کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی تدبیر جو خفیہ اسباب رزق میں سے ہے، گھیرلے وہ اس سے بہت بڑی ہے جو مخلوق کے لیے ظاہر ہوتی ہے بلکہ رزق آنے کے دروازے بے شمار ہیں اور ان کے راستوں کی طرف راہنمائی نہیں ہوتی کیوں کہ اس کا ظہور زمین پر ہے اور سبب آسمان میں ہے ارشاد خداوندی ہے۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ۔ (۲)

اور آسمان میں تمہارا رزق ہے اور جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔

اور آسمان کے اسرار پر اطلاع نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ ایک جماعت حضرت جنید رحمہ اللہ کے پاس حاضر ہوئی تو آپ نے پوچھا تم کیا مانگتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا رزق مانگتے ہیں آپ نے فرمایا اگر تمہیں اس کی جگہ معلوم ہے تو وہاں سے طلب کرو انہوں نے کہا ہم اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہیں فرمایا اگر تمہارا خیال ہے کہ اس نے تمہیں بھلا دیا ہے تو اس کو یاد دلاؤ انہوں نے کہا ہم گھر میں داخل ہو کر توکل کرتے ہیں اور جو ہو گا اس کے منتظر رہتے ہیں آپ نے فرمایا تجربے کی بنیاد پر توکل شک ہے ان لوگوں نے پوچھا پھر کیا تدبیر اختیار کریں فرمایا تدبیر چھوڑ دو۔

حضرت احمد بن عیسیٰ خراز رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میں ایک جنگل میں تھا تو مجھے سخت بھوک لگی میرے دل نے مجبور کیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے کھانا مانگوں لیکن میں نے سوچا کہ یہ توکل کرنے والوں کا کام نہیں پھر دل نے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے صبر کا سوال کرو

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ طلاق آیت ۱، ۲

(۲) قرآن مجید، سورۂ ذاریات آیت ۲۲

جب میں نے اس کا ارادہ کیا تو ہاتف غیبی نے آواز دی اس نے کہا۔

وَيَزْعُمُ اَنَّهٗ مِنَّا قَرِيْبٌ وَاَنَّا لَا نُضِيْعُ مَنْ اَتَانَا وَيَسْاَلُنَا عَلَى الدِّيْنَارِ جُهْدًا كَاَنَّا لَا نَرَاهُ وَلَا يَرَانَا۔

وہ خیال کرتا ہے کہ ہمارے قریب ہے اور یہ کہ جو ہمارے پاس آتا ہے ہم اسے ضائع نہیں کرتے اور تنگی میں صبر کا سوال کرتا ہے گویا ہم اسے اور وہ ہمیں نہیں دیکھتا۔

تم یہ بات سمجھ گئے کہ جس کا نفس ٹوٹ جائے اور دل مضبوط ہو جائے بزدلی کے ذریعے اس کا باطن کمزور نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی تدبیر پر ایمان بھی مضبوط ہو تو اس کا نفس ہمیشہ مطمئن رہتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ پر مکمل اعتماد اور یقین ہوتا ہے اور زیادہ سے زیادہ برا حال یہی ہوگا کہ وہ مر جائے گا اور موت کا آنا تو یقینی ہے جس طرح اس آدمی کو بھی موت آتی ہے جس کا دل مطمئن نہ ہو۔

تو توکل کی تکمیل یوں ہوتی ہے کہ ایک طرف سے قناعت ہوتی ہے اور دوسری جانب (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق کی جو ضمانت ہے وہ پوری کی جاتی ہے اور وہ ذات سچی ہے جس نے ان لوگوں کو دینے کی ضمانت دی ہے جو ان اسباب پر قناعت کرتے ہیں جن کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے تو اے انسان! قناعت اختیار کر کے تجربہ کر و اس کو تم وعدے میں سچا پاؤ گے کہ اس نے جس عجیب و غریب قسم کے رزق کا تم سے وعدہ کیا جو تمہارے خیال میں بھی نہیں تھا وہ تمہیں عطا فرمائے گا اپنے توکل میں اسباب کے منتظر نہ رہو بلکہ مسبب الاسباب پر توکل کرو جیسے تم کاتب کے قلم کے نہیں بلکہ کاتب کے دل کے منتظر رہتے ہو، کیوں کہ حرکت قلم کی اصل تو وہی ہے اور محرک اول ایک ہی ہے لہٰذا صرف اسی کی طرف نظر ہونی چاہیے اور یہ اس شخص کے توکل کی شرط ہے جو جنگلوں میں زادِ راہ کے بغیر پھرتا ہے یا شہروں میں گمنام بیٹھتا ہے۔

ہاں جو شخص عبادت اور علم کے ساتھ مشہور ہو پس جب وہ رات اور دن میں ایک مرتبہ کے کھانے پر قناعت کرے وہ کھانا جیسا بھی ہو اگرچہ لذیذ کھانوں میں سے نہ ہو اور موٹا کپڑا جو دینداروں کے لائق ہے تو اسے یہ کھانا ہمیشہ ملے گا وہاں سے بھی جس جگہ کا اسے گمان ہے اور وہاں سے بھی جہاں کا گمان نہیں ہے بلکہ کئی گنا زیادہ آئے گا۔ پس اس کا توکل کو چھوڑ دینا اور رزق کا اہتمام کرنا انتہائی کمزوری اور کوتاہی ہے کیوں کہ جو شخص کسی شہر میں گمنام ہے وہ کمانے کے باوجود اس قدر رزق حاصل نہیں کر سکتا جس قدر اس شخص کی شہرت حصول رزق کا مضبوط سبب ہے پس دیندار لوگوں کے لئے رزق کا اہتمام قبیح ہے اور علماء کے لیے تو زیادہ برا ہے کیوں کہ ان کے لیے قناعت شرط ہے اور قناعت کرنے والے عالم کے پاس اس کا اپنا رزق بھی آتا ہے اور بہت بڑی جماعت کا رزق بھی، اگرچہ اس کے ساتھ ہوں۔ ہاں اگر اس کا ارادہ یہ ہو کہ وہ لوگوں کے ہاتھوں سے نہیں لے گا بلکہ اپنی کمائی سے کھائے گا تو اس کی بھی وجہ ہے جو اس باعمل عالم کے لائق ہے جو ظاہری علم و عمل پر چلتا ہے اور باطنی سیر نہیں کرتا کیوں کہ مال کمانا باطنی فکر کے راستے میں رکاوٹ ہے لہٰذا ایسا عالم سلوک الی اللہ میں

مشغول ہو اور ایسے شخص سے رزق حاصل کرے جو اس کو دینے کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو یہ زیادہ مناسب بات ہے کیوں کہ اس نے اللہ عزوجل کے لیے فراغت حاصل کی ہے اور حصول ثواب میں دینے والے کی مدد کی ہے۔

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے جاری طریقوں کو دیکھتا ہے اس کو معلوم ہے کہ رزق اسباب کی مقدار کے مطابق نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ایران کے کسی بادشاہ نے ایک دانا سے پوچھا کہ بیوقوف کو رزق ملتا ہے اور عقل مند محروم رہتا ہے اس کی کیا وجہ ہے اس نے کہا کہ خالق وصانع نے چاہا کہ اس کی ذات کو پہچانا جائے اگر ہر عقل مند کو رزق ملتا اور ہر بیوقوف محروم رہتا تو یہ گمان ہوتا کہ اس کی عقل اس کے رزق کا ذریعہ ہے جب انہوں نے اس کے خلاف دیکھا تو جان لیا کہ رازق کوئی اور ہے اور اب وہ ظاہری اسباب پر اعتماد نہیں کرتے۔ شاعر نے کہا۔

وَلَوْ كَانَتِ الْأَرْزَاقُ تَجْرِيْ عَلَى الْحِجَا	اگر رزق عقل کی بنیاد پر جاری ہوتے تو اس وقت جانور
هَلَكْنَ إِذًا مِنْ جَهْلِهِنَّ الْبَهَائِمُ	اپنی جہالت کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے۔

متوکلین کے اسباب سے تعلق کی مثال

اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلوق کی مثال اس طرح ہے جیسے مانگنے والوں کی ایک جماعت بادشاہ کے محل کے دروازے پر ایک میدان میں کھڑی ہو اور وہ سب کھانے کے محتاج ہوں بادشاہ ان کی طرف کئی غلاموں کو بھیجے جن کے پاس روٹیاں ہوں اور ان کو حکم دے کہ بعض کو دو دو روٹیاں دیں اور بعض کو ایک ایک روٹی دیں اور کوشش کریں کہ کوئی رہ نہ جائے اور ایک منادی کو حکم دے کہ اعلان کردو سب اپنی جگہ ٹھہرے رہیں جب غلام باہر آئیں تو ان سے لٹک نہ جانا بلکہ ہر شخص اپنی جگہ مطمئن کھڑا رہے کیوں کہ غلام حکم کے پابند ہیں وہ تمہارا حصہ ضرور تم تک پہنچائیں گے۔

پس جو شخص غلاموں سے چمٹ جائے گا اور ان کو اذیت دے کر دو روٹیاں لے جائے گا پھر جب میدان کا دروازہ کھلے گا اور وہ وہاں سے نکل جائے گا تو میں اس کے پیچھے ایک غلام بھیجوں گا جو اس پر مقرر ہو گا یہاں تک کہ وہ اسے پکڑ کر میرے پاس لائے گا اور میں اسے ایک دن سزا دوں گا جو مجھے معلوم ہے لیکن میں نے اسے پوشیدہ رکھا ہے۔

اور جو غلام کو اذیت نہ پہنچائے اور ایک روٹی پر قناعت کرے جو اسے غلام کے ہاتھ سے پہنچی ہے اور وہ خاموش رہے حرکت نہ کرے تو میں اسے ایک قیمتی خلعت دوں گا اور یہ اسی دن ہو گا جس دن دوسرے کو سزا دوں گا اور جو اپنی جگہ بیٹھا رہا لیکن دو روٹیاں لیں تو اسے نہ تو سزا ہو گی اور نہ ہی خلعت ملے گی اور جس کو میرے غلاموں سے کچھ نہ مل سکا اور اس نے بھوک کی حالت میں رات گزاری لیکن میرے غلاموں پر ناراضگی کا اظہار بھی نہ کیا اور نہ یہ کہا کہ کاش مجھے ایک روٹی مل جاتی تو ایسے شخص کو میں اپنا وزیر بناؤں گا اور اپنی سلطنت اس کے حوالے کروں گا۔

چنانچہ اس ندا کے بعد مانگنے والوں کی چار قسمیں ہوگئیں ایک قسم کے لوگ وہ ہیں جن پر پیٹ غالب آگیا اور انہوں نے اس سزا کی طرف توجہ نہ کی جس سے ڈرایا گیا تھا اور کہنے لگے کل تک بڑا وقت ہے اور ہمیں بھوک لگی ہوئی ہے چنانچہ انہوں نے غلاموں پر چڑھائی کردی اور ان کو اذیت دے کر دو دو روٹیاں لے لیں تو اس مقررہ وقت میں ان کو سزا دی گئی اب وہ وہ پشیمان ہوتے لیکن اس پشیمانی کا ان کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دوسری قسم کے لوگ سزا کے ڈر سے غلاموں سے نہ لپٹے لیکن بھوک کے غلبہ کی وجہ سے وہ دو دو روٹیاں حاصل کرلیں۔ اور وہ سزا سے محفوظ رہے لیکن ان کو خلعت عطا نہ ہوئی تیسری قسم کے لوگوں نے کہا ہم ایسی جگہ بیٹھتے ہیں جہاں غلام ہمیں دیکھ لیں اور ہمیں چھوڑ نہ دیں لیکن جب وہ دیں گے تو ہم ایک ایک روٹی لیں گے اور اس پر قناعت کریں گے۔ چوتھی قسم کے لوگ میدان کے مختلف کونوں میں پھیل گئے اور غلاموں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے انہوں نے کہا اگر وہ غلام ہمارے پیچھے آکر ہمیں دیں گے تو ہم ایک ایک روٹی پر قناعت کریں گے اور اگر انہوں نے ہمیں کچھ نہ دیا تو رات بھر بھوک کی سختی برداشت کریں گے ہوسکتا ہے ہم مانگنا نہ کرنے کی قوت حاصل کریں تو وزارت کا رتبہ اور بادشاہ کے قریب کا درجہ حاصل ہو لیکن وہ اپنے منصوبے میں کامیاب نہ ہوتے کیوں کہ غلاموں نے میدان کے مختلف کونوں میں ان کا پیچھا کیا اور ان میں سے ہر ایک کو ایک روٹی دی۔ کچھ دن اسی طرح ہوتا رہا اس کے بعد اتفاقاً تین آدمی ایک کونے میں چھپ گئے اور ان پر غلاموں کی نگاہ نہ پڑی اور کسی وجہ سے وہ زیادہ تفتیش نہ کرسکے چنانچہ انہوں نے بھوک کی حالت میں رات گزاری ان میں سے دو نے کہا اچھا ہوتا ہم غلاموں کے سامنے ہو جاتے اور ہمیں کھانا مل جاتا ہم صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے لیکن تیسرا صبح تک خاموش رہا چنانچہ اس نے قرب اور وزارت کا درجہ پایا۔

مخلوق کی مثال اسی طرح ہے میدان سے مراد دنیوی زندگی کا میدان ہے اور میدان کا دروازہ موت ہے اور مجہول میعاد سے قیامت کا دن مراد ہے اور وزارت کا وعدہ شہادت کا وعدہ ہے جو متوکل کے لیے ہے جب وہ بھوک کی حالت میں راضی رہتے ہوئے انتقال کرے اس وعدے کا ایفا قیامت تک مؤخر نہیں ہوگا کیوں کہ شہداء زندہ ہیں اپنے رب کے ہاں رزق حاصل کرتے ہیں۔ اور غلاموں سے چمٹنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسباب کے سلسلے میں حد سے بڑھتے ہیں اور مسخر غلام اسباب ہیں غلاموں کے سامنے میدان میں بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جو شہروں کی خانقاہوں اور مساجد میں سکون کے ساتھ بیٹھتے ہیں میدان کے کونوں میں چھپنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جو توکل کی صورت میں جنگلوں کی سیر کرتے ہیں اور اسباب ان کے پیچھے جاتے ہیں اور ان کے پاس رزق کبھی آتا ہے اگر ان میں سے کوئی بھوک پر راضی رہتے ہوئے فوت ہوجائے تو اسے شہادت اور قرب خداوندی کا انعام حاصل ہوتا ہے مخلوق ان چار قسموں میں تقسیم ہے شاید نوے فیصد اسباب سے تعلق رکھتے ہوں اور باقی دس میں سے سات شہروں میں رہتے ہوں اور محض اپنی حاضری اور شہرت کو سبب بناتے ہو باقی تین جنگلوں میں پھرتے ہوں پھر ان میں سے دو اسباب پر ناراض ہوں اور ایک کو قرب کے ذریعے کامیابی حاصل ہو۔ شاید گذشتہ زمانے میں

اسی طرح ہو لیکن آج کل اسباب کو چھوڑنے والے دس ہزار میں سے ایک بھی نہیں۔

دوسرا فن :

مال جمع کرنے کے اسباب کے درپے ہونا۔

جس شخص کو مال حاصل ہو، چاہے وراثت کے طور پر ہو یا کمانے کے ذریعے، یا مانگ کر حاصل کیا ہو یا اس کا کوئی دوسرا سبب ہو تو اس شخص کے لیے مال جمع کرنے میں تین حالتیں ہیں۔

پہلی حالت :

وقتی ضرورت کے مطابق مال حاصل کرے اگر بھوکا ہے تو کھالے ننگا ہے تو پہن لے اور رہائش کی ضرورت ہے تو مختصر سی رہائش گاہ خرید لے باقی مال اسی وقت تقسیم کر دے اور اسے جمع نہ کرے ہاں اتنی مقدار جمع کرے جس کی کسی دوسرے کو حاجت ہو اور وہ اس نیت سے رکھے تو ایسا شخص توکل کے تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے اور یہی سب سے بلند درجہ ہے۔

دوسری حالت :

پہلی حالت کے مقابلے میں ہے اور وہ توکل کی حدود سے باہر نکال دیتی ہے یعنی ایک شخص سال بھر یا اس سے زیادہ وقت کے لیے جمع کرے یہ شخص توکل کرنے والوں میں سے بالکل نہیں ہے اور کہا گیا ہے کہ جانوروں میں سے صرف تین حیوانات اکٹھا کرتے ہیں چوہا، چیونٹی اور انسان۔

تیسری حالت :

چالیس دن یا اس سے کم کے لیے جمع کرے تو کیا ایسا شخص اس مقام محمود سے محروم ہے جس کا آخرت میں متوکلین سے وعدہ کیا گیا ہے؛ تو اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ حضرت سہل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ توکل کی حد سے نکل جاتا ہے حضرت خواص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ چالیس دنوں کے لیے جمع کرنے کی صورت میں توکل سے نہیں نکلتا البتہ زیادہ سے نکلتا ہے حضرت ابو طالب مکی رحمہ اللہ فرماتے ہیں چالیس دن سے زیادہ کے لیے جمع کرے تو بھی توکل کی حد سے نہیں نکلتا۔

جب جمع کرنے کی اصلاً اجازت ہے تو اس اختلاف کا کوئی مطلب نہیں ہاں یہ جائز ہے کہ کوئی شخص یوں گمان کرے کہ جمع کرنا ہی توکل کے خلاف ہے اس کے بعد مقدار کسی کو معلوم نہیں اور ہر وہ ثواب جس کا کسی رتبہ پر وعدہ کیا گیا ہے وہ اس رتبہ پر تقسیم ہوتا ہے۔ اور اس رتبے کا آغاز بھی ہوتا ہے اور انتہا بھی۔ انتہائی درجہ والوں کو سابقین کہا جاتا ہے اور ابتدائی درجہ والوں کو اصحاب یمین کہتے ہیں پھر اصحاب یمین کے کئی درجات ہیں اسی طرح سابقین بھی کئی درجات میں تقسیم ہوتے ہیں اور اصحاب یمین کے اونچے درجہ والے سابقین کے سب سے نچلے درجے والوں سے ملے ہوتے ہیں لہذا اس سلسلے میں کوئی مقدار مقرر کرنا صحیح نہیں۔

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ذخیرہ نہ کرنے کی صورت میں بھی توکل کی تکمیل اسی وقت ہوگی جب امید کم ہو اور یہ شرط لگانا

بہت بعید کہ اسے بالکل زندہ رہنے کی امید نہ ہو اگرچہ ایک دم کے لیے ہی ہو یہ تو غیر ممکن بات ہے۔ البتہ لوگ امید کے طویل اور کوتاہ ہونے میں مختلف ہیں کم از کم امید ایک دن رات اور اس سے کم وقت ہے اور زیادہ سے زیادہ جس کا تصور ہو سکتا ہے وہ انسان کی پوری زندگی ہے اور ان دونوں کے درمیان بے شمار درجات ہیں جو شخص ایک مہینے سے زیادہ کی امید نہیں رکھتا وہ اس شخص کے مقابلے میں جو ایک سال کی امید رکھتا ہے، مقصود کے زیادہ قریب ہے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی (کوہ طور پر جانے کے سلسلے میں) میعاد کے حوالے سے چالیس دن کی قید لگانا بعید ہے کیوں کہ اس واقعہ میں یہ بتانا مقصود نہ تھا کہ اتنی مدت کی امید کی اجازت دی جاتی ہے بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا استحقاق موعود چالیس دن کے بعد ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا تھا اور یہ ایک راز کی وجہ سے تھا جو اللہ تعالیٰ کی عادات میں سے ہے اور اس قسم کی مثالوں میں اللہ تعالیٰ کی عادت کریمہ امور کو تدریجاً بڑھانا ہے۔

جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اللّٰہَ خَمَّرَ طِیْنَۃَ اٰدَمَ بِیَدِہٖ اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا۔ (۱)

بے شک اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کا خمیر اپنے دست قدرت سے چالیس دنوں میں تیار کیا۔

کیوں کہ اس گوندھے ہوئے خمیر کا استحقاق اسی مدت پر موقوف تھا جس کا ذکر کیا گیا۔

پس جو شخص ایک سال سے زیادہ کے لیے جمع کرے وہ قلبی کمزوری کے باعث ایسا کرتا ہے نیز اس کا جھکاؤ ظاہری اسباب کی طرف ہے وہ مقام توکل سے خارج ہے اور وہ سچے وکیل کی خفیہ اسباب کے ساتھ تدبیر پر یقین نہیں رکھتا کیوں کہ داخلی اسباب پیداوار اور زکوٰۃ کے اعتبار سے ہر سال پیدا ہوتے ہیں اور جو شخص سال سے کم مدت کے لیے جمع کرتا ہے اس کے لیے امید کے کوتاہ ہونے کے اعتبار سے درجہ ہے جس آدمی کی امید دو مہینے کی ہو اس کا درجہ اس شخص کے درجے جیسا نہیں جس کی امید ایک مہینہ ہے اور جو آدمی تین مہینے کی امید رکھتا ہے بلکہ وہ رتبہ کے اعتبار سے ان دونوں کے درمیان ہے اور جمع کرنے سے مانع امید کی کمی ہی ہے پس افضل یہی ہے کہ بالکل جمع نہ کرے اگرچہ اس کا دل کمزور ہو جب وہ کم جمع کرے گا تو فضیلت زیادہ ہوگی۔

ایک فقیر جس کو غسل دینے کا حکم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی المرتضیٰ اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہما کو دیا تھا انہوں نے اس کو غسل دیا اور اسی کی چادر کا کفن دے کر دفن کیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا۔

اِنَّہٗ یُبْعَثُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَوَجْہُہٗ کَالْقَمَرِ لَیْلَۃَ الْبَدْرِ وَلَوْلَا خَصْلَۃٌ کَانَتْ فِیْہِ

اسے قیامت کے دن اس طرح اٹھایا جائے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمک رہا ہوگا اگر اس میں

---

(۱) الفوائد المجموعۃ ص ۴۸۱ کتاب الصفات

لَبُعِثَ وَوَجْهُهُ كَالشَّمْسِ الضَّاحِيَةِ۔ ایک عادت نہ ہوتی تو وہ قیامت کے دن اس طرح اٹھتا کہ اس کا چہرہ روشن سورج کی طرح ہوتا۔

٭ ٭ ٭

فرماتے ہیں ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ کیا عادت ہے؟ آپ نے فرمایا۔

كَانَ صَوَّامًا قَوَّامًا كَثِيْرَ الذِّكْرِ لِلّٰهِ تَعَالٰى غَيْرَ اَنَّهُ كَانَ اِذَا جَاءَ الشِّتَاءُ اَدَّخَرَ حُلَّةَ الصَّيْفِ لِصَيْفِهِ وَاِذَا جَاءَ الصَّيْفُ ادَّخَرَ حُلَّةَ الشِّتَاءِ لِشِتَائِهِ۔ وہ بہت زیادہ روزے رکھتا راتوں کو عبادت کرتا اور اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ ذکر کرتا تھا البتہ جب سردیوں کا موسم آتا تو گرمیوں کا لباس آئندہ گرمیوں کے لیے رکھتا تھا اور جب گرمی کا موسم آتا تو سردیوں کا لباس دوسرے موسم سرما کے لیے رکھ چھوڑتا تھا۔

اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا۔

بَلْ اَقَلُّ مَا اُوْتِيْتُمُ الْيَقِيْنُ وَعَزِيْمَةُ الصَّبْرِ۔ (۱) بلکہ کم از کم جو چیز تمہیں دی گئی ہے وہ یقین اور صبر کا عزم ہے

لوٹا اور چھری وغیرہ جن کی ہمیشہ ضرورت پڑتی ہے وہ اس معنیٰ میں نہیں ہیں کیوں کہ ان چیزوں کو جمع کرنا درجے کی کمی کا باعث نہیں (اس میں ضرورت کا تمام سامان داخل ہے) سردیوں کے کپڑوں کی گرمیوں میں ضرورت نہیں پڑتی اور یہ اس شخص کے لیے ہے کہ ترکِ ذخیرہ سے اس کا دل مضطرب نہ ہو اور نہ ہی وہ لوگوں کے ہاتھوں کی طرف دیکھے بلکہ اس کا دل صرف سچے وکیل (اللہ تعالیٰ) کی طرف متوجہ رہے اور اگر وہ اپنے دل میں اضطراب محسوس کرتا ہے جو اسے عبادت، ذکر اور فکر سے غافل کرتا ہے تو ایسے شخص کے لیے مال جمع کرنا زیادہ بہتر ہے بلکہ اگر وہ ایسا سامان رکھے جس کی آمدن اسے بقدر کفایت حاصل ہو اور اسی کی وجہ سے دل کو فراغت بھی حاصل ہوتی ہے تو ایسا کرنا بہتر ہے کیوں کہ مقصود تو یہ ہے کہ دل کی اصلاح کی جائے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے خالی ہو جائے اور کئی لوگ ایسے ہیں جن کے پاس مال کا ہونا انہیں غافل کرتا ہے اور بعض کے نزدیک نہ ہونا غافل کرتا ہے اور ممنوع وہ ہے جو اسے اللہ تعالیٰ سے غافل کرتا ہے ورنہ ذاتی طور پر دنیا ممنوع نہیں ہے نہ اس کا وجود اور نہ ہی اس کا عدم۔

اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مختلف قسم کے لوگوں کی طرف بھیجا گیا جن میں تاجر بھی ہیں اور صنعت و حرفت والے بھی تھے تاجر کو تجارت چھوڑنے اور کسی پیشے والے کو اپنا پیشہ چھوڑنے کا حکم نہیں دیا گیا اور جو لوگ ان دونوں باتوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے ان کو یہ کام اپنانے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا اور ان کی راہنمائی فرمائی کہ ان کی کامیابی اور نجات صرف اسی بات میں ہے کہ اپنے دلوں کو دنیا سے اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیں اور دل کا بہترین شغل اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہے پس کمزور آدمی کا حاجت کے مطابق جمع کرنا بہتر ہے جیسے مضبوط (دل والے) کا جمع نہ کرنا اچھا ہے اور یہ سب (مذکورہ بالا) منفرد کا حکم ہے۔

---

(۱)

جہاں تک عیال دار کا تعلق ہے تو بال بچوں کے لیے ایک سال کا خرچ جمع کرنے سے توکل کی تعریف سے نہیں نکلتا لیکن اس سے زیادہ جمع کرنا توکل کو باطل کر دیتا ہے کیوں کہ سالوں کے بدلنے سے اسباب بدل کر آتے ہیں لہذا اس سے زیادہ جمع کرنے کا سبب دل کی کمزوری ہے اور بہ قوتِ توکل کے خلاف ہے۔

پس متوکل اس شخص کو کہتے ہیں جو توحید پر ایمان رکھتا ہو اس کا دل مضبوط ہو، نفس اللہ تعالیٰ کے فضل پر مطمئن ہو اور اس کی تدبیر پر اعتماد ہو اسباب ظاہرہ کے وجود پر نہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے گھر والوں کے لیے ایک سال کا رزق جمع فرمایا (۱)

اور حضرت اُم ایمن رضی اللہ عنہا کو دوسرے دن کے لیے جمع کرنے سے منع فرمایا (۲)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے روٹی کا ایک ٹکڑا افطاری کے لئے رکھا تو آپ نے منع کرتے ہوئے فرمایا۔

اَنْفِقْ بِلَالُ وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالًا۔ (۳)

اے بلال اسے خرچ کرو اور عرش والے سے مفلسی کا ڈر نہ رکھو۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی سے ارشاد فرمایا۔

اِذَا سُئِلْتَ فَلَا تَمْنَعْ وَاِذَا اُعْطِیْتَ فَلَا تَخْبَاءُ۔ (۴)

جب تم سے مانگا جائے تو نہ روکو اور جب تمہیں دیا جائے تو نہ چھپاؤ۔

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں ایسا کرنا چاہیے آپ اتنی کم امید رکھتے تھے کہ جب پیشاب فرماتے تو پانی کے قریب ہونے کے باوجود تیمم فرماتے اور ارشاد فرماتے

مَا یُدْرِیْنِیْ لَعَلِّیْ لَا اَبْلُغُہٗ۔ (۵)

مجھے معلوم نہیں شاید اس (پانی) تک نہ پہنچوں۔

حالاں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو جمع بھی کرتے تو آپ کے توکل میں فرق نہ پڑتا کیوں کہ آپ کا بھروسہ اس چیز پر نہ تھا جسے آپ جمع فرماتے لیکن آپ نے اپنی امت کے مضبوط دل والوں کی تعلیم کے لیے یہ راستہ اختیار کیا کیوں کہ آپ کی امت کے مضبوط لوگ آپ کی نسبت سے کمزور ہیں۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۸۰۶ کتاب النفقات

(۲) مجمع الزوائد جلد ۱۰ ص ۲۴۱ کتاب الزھد

(۳) مجمع الزوائد جلد ۳ ص ۱۲۶ کتاب الزکوٰۃ

(۴) تاریخ ابن عساکر جلد ۳ ص ۱۳۴ ذکر من اسمہ بلال

(۵) مشکوٰۃ المصابیح ص ۴۵۰ کتاب الرقاق

آپ نے جو اپنے گھر والوں کے لیے ایک سال کا خرچ جمع کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کا دل یا آپ کے اہل خانہ کے دل کمزور تھے لیکن امت کے کمزور لوگوں کے لیے سنت بنانے کی خاطر ایسا کیا۔ بلکہ آپ نے اس بات کی خبر دی کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ جس طرح عزیمت (اصل حکم) پر عمل کیا جاتا ہے اسی طرح کمزور لوگوں کی دلجوئی کے لیے رخصت پر بھی عمل کیا جائے (۱)

تاکہ ان کی کمزوری ان کو مایوسی تک نہ لے جائے اور وہ انتہائی درجہ تک پہنچنے سے عاجز ہونے کی وجہ سے آسان نیکی بھی چھوڑ دیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام جہانوں کیلئے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے حالاں کہ ان کی مختلف اقسام اور مختلف درجات ہیں۔

جب تم نے اس بات کو سمجھ لیا تو تمہیں معلوم ہو گیا کہ مال کا جمع کرنا بعض لوگوں کے لیے نقصان دہ ہے اور بعض کے لیے نہیں اس پر حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی روایت دلالت کرتی ہے کہ اصحاب صفہ میں سے ایک صحابی انتقال کر گئے تو ان کے کفن کے لیے کپڑا نہ ملا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کے کپڑوں کی تلاشی لو تو دیکھا کہ ازار کے اندر دو دینار تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ دو داغ ہیں۔ (۲)

ان (صحابی) کے علاوہ کئی مسلمان فوت ہوئے اور مال چھوڑا لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں یہ بات نہیں فرمائی اس بات میں دو وجہوں کا احتمال ہے کیوں کہ ان کی حالت کے بھی دو احتمال تھے ایک یہ کہ داغ سے آگ کا داغ مراد لیا ہو جیسے ارشاد خداوندی ہے۔

فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ۔ (۱)

(زکوٰۃ نہ دینے والوں کے مال کو آگ میں گرم کر کے) اس کے ساتھ ان کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔

اور یہ اس صورت میں جب اس کی حالت سے زہد، فقر اور توکل کا اظہار ہو حالانکہ وہ ان امور سے خالی ہو تو یہ ایک قسم کا دھوکہ ہے دوسری صورت یہ ہے کہ یہ بات دھوکے کی وجہ سے نہ ہو اب مراد یہ ہوگی کہ درجۂ کمال میں نقصان واقع ہوا۔ جیسے چہرے پر دو داغ ہوں تو چہرے کے جمال میں کمی آجاتی ہے اور یہ کبھی دھوکے کی وجہ سے نہیں ہوتا کیوں کہ انسان جو مال بھی چھوڑتا ہے وہ اس کے اُخروی درجہ میں نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ کیوں کہ انسان کو دنیا میں سے جس قدر دیا جاتا ہے اسی قدر اس کے اُخروی حصے میں کمی واقع ہوتی ہے۔

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۱۰۸ مرویات ابن عمر

(۲) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ اول ص ۱۳۷ مرویات علی

لیکن جب اس صورت میں جمع کرے کہ اس جمع شدہ مال سے دل فارغ ہو تو اس سے توکل کا باطل ہونا لازم نہیں آتا اس سلسلے میں حضرت بشر رحمہ اللہ سے مروی بات گواہ ہے حضرت حسین مغازلی رحمہ اللہ جو اُن کے شاگردوں سے تھے فرماتے ہیں میں چاشت کے وقت حضرت بشر رحمہ اللہ کے پاس حاضر تھا کہ ایک شخص جو کمزور تھا، اس کا رنگ گندمی تھا اور تھوڑی تھوڑی داڑھی تھی حضرت بشر رحمہ اللہ ان کے استقبال میں کھڑے ہوئے راوی کہتے ہیں میں نے ان کو کسی کے اعزاز میں کھڑے ہوئے نہیں دیکھا تھا پھر انہوں نے مجھے ہتھیلی بھر درہم دیئے اور فرمایا جس قدر اچھا کھانا مل سکے خرید لاؤ حالانکہ اس سے پہلے انہوں نے کبھی بھی مجھے یہ بات نہیں فرمائی تھی فرماتے ہیں میں کھانا لے کر آیا اور ان کے سامنے رکھ دیا انہوں نے اس شخص کے ساتھ مل کر کھایا حالانکہ اس سے پہلے میں نے ان کو کبھی کسی کے ساتھ مل کر کھاتے نہیں دیکھا فرماتے ہیں ہم نے ضرورت کے مطابق کھایا اور بہت سا کھانا بچ گیا جو اس شخص نے لے کر کپڑے میں جمع کیا اور اٹھا کر ساتھ لے گیا مجھے اس بات پر تعجب بھی ہوا اور میں نے اسے ناپسند بھی کیا حضرت بشر رحمہ اللہ نے مجھ سے فرمایا شاید تمہیں اس شخص کے عمل پر اعتراض ہے؟ میں نے کہا ہاں وہ شخص اجازت کے بغیر باقی ماندہ کھانا لے کر چلا گیا حضرت بشر رحمہ اللہ نے فرمایا وہ ہمارے بھائی حضرت فتح موصلی رحمہ اللہ تھے وہ آج ہماری ملاقات کے لیے موصل سے تشریف لائے تھے انہوں نے ہمیں یہ بات سکھانے کا ارادہ کیا کہ جب توکل صحیح ہو تو مال جمع کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

تیسرا فن:

وہ اسباب اختیار کرنا جو خوف کے باعث پیش آنے والے ضرر کو دُور کرتے ہیں بعض اوقات نفس یا مال میں خوف کی وجہ سے بھی ضرر ہوتا ہے اور توکل کی شرائط میں یہ شرط نہیں کہ ضرر کو دُور کرنے والے اسباب کو بالکل چھوڑ دیا جائے مثلاً نفس کے اعتبار سے یوں کہ اس زمین پر سونا جہاں درندے ہوں یا وادی میں سیلاب کے راستے میں سو جانا یا گرنے والی دیوار اور ٹوٹی ہوئی چھت کے نیچے سونا یہ سب باتیں ممنوع ہیں اور ایسا شخص بعض اوقات کسی فائدے کے بغیر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے ہاں یہ اسباب قطعی بھی ہوتے ہیں، ظنی بھی اور موہوم بھی، ان میں سے موہوم کو چھوڑنا توکل کی شرط ہے اور یہ وہی ہیں جن کی دفعِ ضرر کی طرف نسبت داغ لگانے اور دم کروانے کی نسبت جیسی ہے کیوں کہ داغ لگانا اور دم کروانا بعض اوقات آنے والے خطرے کے پیش نظر پہلے ہی اختیار کر لیے جاتے ہیں۔

اور بعض اوقات اس خطرے کے آنے پر اس کے ازالہ کے لیے ان کاموں کو اختیار کیا جاتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے توکل کرنے والوں کا وصف اسی طرح بیان فرمایا کہ وہ داغ لگانے، دم وغیرہ کروانے اور فال لینے کو چھوڑ دیتے ہیں آپ نے یوں نہیں فرمایا کہ جب وہ کسی ٹھنڈی جگہ جاتے ہیں تو جُبہ نہیں پہنتے اور جبہ متوقع سردی کو دور کرنے کے لیے پہنا جاتا ہے اسی طرح دوسرے اسباب جو اس کے معنیٰ میں ہیں ہاں سردیوں میں سفر پر جاتے وقت اندر سے قوتِ حرارت کو برانگیختہ کرنے کے لیے لہسن کھانے کو بعض اوقات اسباب میں غور و فکر کرنا اور ان پر اعتماد

کرنا سمجھا جاتا ہے اور یہ داغ لگانے کے قریب ہے بخلاف جُبہ پہننے کے (اس کا حکم یہ نہیں)

اور ضرر کو دُور کرنے والے اسباب اگرچہ قطعی ہوں ان کو ترک کرنے کی ایک وجہ ہے کہ جب اسے انسانوں سے ضرر پہنچے اگر وہ صبر کر سکتا ہو اور ان کو دُور کر کے تشفی حاصل کر سکتا ہو تو توکل کی شرط یہ ہے کہ برداشت کرے اور صبر کرے ارشاد خداوندی ہے۔

فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ۔ (۱)

پس اس کو (اپنا) کارساز سمجھو اور ان (کفار) کی باتوں پر صبر کرو۔

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ۔ (۲)

اور ہم ضرور بضرور ان اذیتوں پر صبر کریں گے جو تم سے ہمیں پہنچیں اور بھروسہ کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

اور ارشاد فرمایا۔

وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ (۳)

اور ان کی اذیتوں سے درگزر فرمائیں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں۔

اور اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ۔ (۴)

پس صبر کریں جس طرح اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا۔

اور ارشاد خداوندی ہے:۔

نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ۔ (۵)

کتنا اچھا اجر ہے عمل کرنے والوں کا وہ جنہوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔

لیکن سانپوں، درندوں اور بچھوؤں کی اذیت پر صبر کرنا اور ان کو دُور نہ کرنا توکل نہیں ہے کیوں کہ اس میں کوئی

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ مزمل آیت ۹، ۱۰

(۲) قرآن مجید، سورۂ ابراہیم آیت ۱۲

(۳) قرآن مجید، سورۂ احزاب آیت ۴۸

(۴) قرآن مجید، سورۂ احقاف آیت ۳۵

(۵) قرآن مجید، سورۂ عنکبوت آیت ۵۸، ۵۹

فائدہ نہیں ہے اور کوشش کرنا یا اسے ترک کرنا ذاتی طور پر مقصود نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد دین پر مدد حاصل کرنا ہے اور یہاں اسباب کا ترتیب اسی طرح ہے جس طرح کسب اور حصول نفع کے سلسلے میں بیان ہوا ہم دوبارہ ذکر کرکے کلام کو لمبا کرنا نہیں چاہتے اسی طرح مال کی حفاظت والے اسباب کا حال ہے کہ باہر جاتے وقت دروازے کو تالہ لگانے یا اونٹ کا پاؤں باندھنے سے توکل میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ یہ اسباب اللہ تعالیٰ کی جاری عادت سے قطعی یا ظنی طور پر معلوم ہوئے ہیں اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعرابی سے جس نے اپنا اونٹ کھلا چھوڑ کر کہا کہ میں نے اللہ تعالیٰ پر توکل کیا، فرمایا باندھ کر توکل کرو (۱)

اور ارشاد خداوندی ہے :

خُذُوا حِذْرَكُمْ۔ (۲) اپنا بچاؤ اختیار کرو۔

اور نماز خوف کی کیفیت کے ضمن میں ارشاد فرمایا۔

وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ۔ (۳) اور چاہیے کہ وہ اپنا اسلحہ پکڑے رکھیں۔

اور ارشاد خداوندی ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ۔ (۴) اور ان (دشمنوں) کے مقابلے میں قوت تیار کرو اور (سرحدوں کی حفاظت کے لیے) گھوڑے باندھنا۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔

فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا۔ (۵) پس میرے بندوں کو لے کر راتوں رات چلے جائیں۔

اور رات کے وقت نکلنا دشمنوں سے چھپنا اور اذیت سے بچنا ہے۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا غار میں چھپنا دشمنوں کی آنکھوں سے چھپ کر ضرر سے بچنا تھا (۱) اور نماز میں ہتھیار اٹھائے رکھنا سانپ اور بچھو کو قتل کرنے کی طرح قطعی طور پر ضرر کو دفع کرنا نہیں ہے (کیوں کہ وہ قطعی ہیں) لیکن ہتھیار سنبھالے رکھنا ظنی سبب تو ہے اور ہم نے بیان کیا ہے کہ جو چیز ظنی ہو وہ قطعی کی طرح ہوتی ہے صرف موہوم وہ ہے کہ اس کا ترک توکل کا تقاضا ہے۔

---

(۱) حلیۃ الاولیاء جلد ۸ص ۳۹۰ ترجمہ ۴۲۸

(۲، ۳) قرآن مجید، سورۂ نساء آیت ۱۰۲

(۴) قرآن مجید، سورۂ انفال آیت ۶۰

(۵) قرآن مجید، سورۂ دخان آیت ۲۳

(۶) الوفا، جلد اول ص ۲۴۳، الواب ہجرت

سوال:

ایک جماعت سے منقول ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے کاندھے پر شیر نے پاؤں رکھا تو انہوں نے حرکت نہیں کی۔

جواب:

میں کہتا ہوں ایک جماعت سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ شیر پر سوار ہوئے اور انہوں نے اسے مسخر کیا پس تمہیں یہ مقام دھوکہ نہ دے اگرچہ یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے لیکن غیر سے سیکھنے کے سلسلے میں اقتدا کے لائق نہیں ہے بلکہ یہ تو کرامات میں ایک بلند مقام ہے اور یہ توکل میں شرط نہیں ہے اور اس میں ایسے اسرار ہیں کہ ان سے وہی واقف ہو سکتا ہے جو ان اسرار تک رسائی حاصل کرے۔

سوال:

کیا کوئی ایسی علامت ہے جس سے مجھے معلوم ہو کہ میں اس تک پہنچ گیا ہوں۔

جواب:

پہنچنے والا علامات کا محتاج نہیں ہوتا لیکن اس کے پائے جانے سے پہلے کی کچھ علامات ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ تمہارے ساتھ جو کتا رہتا ہے جسے غصہ کہا جاتا ہے اور وہ تمہیں بھی اور دوسروں کو بھی مسلسل کاٹتا رہتا ہے وہ تمہارے لیے مسخر ہو جائے۔ اگر یہ کتا تمہارے قابو میں آ جائے کہ وہ تمہارے اشارے سے ہی حرکت میں آئے اشارے کے بغیر نہ ابھرے اور تمہارے قابو میں رہے اور بعض اوقات تمہارا درجہ اس قدر بلند ہوتا ہے کہ تمہارے سامنے درندوں کا بادشاہ شیر بھی مسخر ہو جاتا ہے اور جنگلی کتوں کے مقابلے تمہارے گھر کے کتے کا مسخر ہونا زیادہ بہتر ہے اور تمہارے اندر کے کتے (غضب) مسخر ہونا گھر کے کتے کے مسخر ہونے سے زیادہ بہتر ہے پس جب تک تمہارا یہ باطنی کتا مسخر نہ ہو ظاہری کتے کے مسخر ہونے کی طمع نہ کرو۔

سوال:۔

جب متوکل دشمنوں سے بچنے کے لیے اسلحہ اٹھائے چور سے بچنے کے لیے دروازے کو تالہ لگا دے اور بھاگنے کے خوف سے اونٹ کے پاؤں کو باندھ کر رکھے تو وہ کس اعتبار سے متوکل کہلائے گا۔

جواب:۔

میں کہتا ہوں وہ جانتا ہے کہ اگر چور کو دور کیا جائے تو وہ صرف دروازہ بند کرنے سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے دور کرنے سے دور ہو گا کتنے ہی دروازے بند کیے جاتے ہیں لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور کتنے ہی اونٹ پاؤں سے باندھے جاتے ہیں لیکن وہ مر جاتے ہیں یا بھاگ جاتے ہیں اور کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جنہوں نے ہتھیار پکڑ رکھے ہوتے ہیں لیکن وہ قتل ہو جاتے ہیں یا ان پر کوئی غالب آ جاتا ہے پس ان اسباب پر بالکل بھروسہ نہ رکھو بلکہ مسبب الاسباب پر توکل کرو جیسا کہ ہم نے مقدمہ کے وکیل کی

مثال دیتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اگر موکل خود حاضر ہو اور دستاویز بھی حاضر کرے تو اپنے آپ پر اور دستاویز پر بھروسہ نہ کرے بلکہ وکیل کی کفایت اور قوت پر توکل کرے۔

جہاں تک حال کا تعلق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے گھر اور نفس کے بارے میں جو فیصلہ فرمایا ہے اس پر راضی رہے اور کہے یا اللہ! اگر تو میرے گھر کے مال پر کسی شخص کو مسلط کرے جو اسے لے جائے تو وہ تیرے راستے میں ہے اور میں تیرے فیصلے پر راضی ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ جو کچھ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے وہ ہبہ ہے تو واپس نہیں لے گا یا اُدھار اور امانت ہے جسے تو واپس لے لے گا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ میرا رزق ہے یا تیری ازلی مشیئت میں وہ کسی اور کا رزق ہے تو نے جو بھی فیصلہ کیا ہے میں اس پر راضی ہوں میں نے گھر کو تالہ اس لیے نہیں لگایا تھا کہ میں تیرے فیصلے سے بچنا چاہتا تھا یا میں اس پر ناراض تھا بلکہ ترتیب اسباب کے سلسلے میں تیرے طریقے کے مطابق میں نے ایسا کیا ہے اے مسبب الاسباب! میرا اعتماد تو صرف تیرے اوپر ہے اگر آدمی کی حالت یہ ہو اور علم کی وہ صورت ہو جو ہم نے پہلے ذکر کی ہے تو وہ اونٹ کا پاؤں باندھنے، ہتھیار پکڑنے اور دروازہ بند کرنے کی وجہ سے توکل سے باہر نہیں نکلے گا پھر جب گھر واپس آئے اور سامان کو گھر میں پائے تو مناسب یہ ہے کہ یہ اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی نئی نعمت ہو اور اگر وہ مال موجود نہ ہو بلکہ چوری ہو گیا ہو تو اپنے دل کو دیکھے اگر اسے اس پر راضی پائے یا اس پر اس لیے راضی ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے یہ مال اس لیے لیا کہ اس کے مقابلے میں آخرت میں زیادہ عطا فرمائے گا تو توکل میں اس کا مقام صحیح قرار پایا اور اس کی صداقت ظاہر ہو گئی۔ اور اگر وہ اس وجہ سے دل میں دُکھ محسوس کرے اور صبر کی طاقت بھی پاتا ہو تو اس کے لیے ظاہر ہو گیا کہ وہ توکل کے دعویٰ میں سچا نہیں تھا کیوں کہ توکل زُہد کے بعد آتا ہے اور زہد اسی شخص سے صحیح قرار پاتا ہے جو دنیا کے جانے پر افسوس نہیں کرتا اور جو کچھ آئے اس پر خوش نہیں ہوتا بلکہ اس کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے تو اس کے لیے توکل کیسے صحیح قرار پائے گا، ہاں بعض اوقات اس کے لیے صبر صحیح قرار پاتا ہے جب اسے چھپاتے اور شکوہ ظاہر نہ کرے اور تجسس وطلب میں اس کی کوشش زیادہ نہ ہو۔

اور اگر وہ صبر پر قادر نہ ہو حتیٰ کہ اس کے دل کو اذیت پہنچے زبان سے شکوہ کرے اور بدن کو مال کی طلب میں لگا دے تو چوری سے اس کا گناہ بڑھ جائے گا کیوں کہ ظاہر ہو گیا کہ تمام مقامات میں کوتاہی ہے اور وہ اپنے دعووں میں جھوٹا ہے اس کے بعد کوشش کرے اور نفس کی کسی بات کی تصدیق نہ کرے اور اس کے دھوکے کے جال میں نہ پھنسے کیوں کہ یہ دھوکہ باز ہے حکم برائی کا دیتا ہے اور دعویٰ نیکی کا کرتا ہے۔

سوال:-

متوکل کے پاس مال کیسے ہو سکتا ہے جسے چوری کیا جائے۔

جواب:

متوکل کے گھر میں کچھ نہ کچھ سامان تو ہوتا ہے جیسے ایک پیالہ جس میں وہ کھانا کھائے لوٹا جس سے پانی پیئے، وضو کرنے کے لیے کوئی برتن، تھیلی جس میں سامانِ سفر کی حفاظت ہو اور لاٹھی جس کے ساتھ دشمن کو دور کرے اور اس کے علاوہ گھریلو زندگی کا سامان۔

اور بعض اوقات اس کے پاس مال آتا ہے اور وہ اسے روک کر رکھتا ہے کہ جب کوئی محتاج آئے گا تو اسے دوں گا تو اس نیت سے جمع کرنا توکل کو باطل نہیں کرتا اور توکل کی شرط یہ نہیں ہے کہ جس لوٹے سے پانی پیتا ہے اور جس تھیلے میں سامان رکھتا ہے اسے گھر سے نکال دے دینے کا حکم کھانے کے سامان اور ضرورت سے زائد چیزوں کے بارے میں ہے اور اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ یہی ہے کہ مسجد کے کونوں میں بیٹھے ہوئے لوگوں تک کھانا پہنچتا ہے انہیں ہر دن یا ہر ہفتے میں لوٹے اور دیگر سامان پہنچانے کا طریقہ جاری نہیں ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی عادت سے نکلنا توکل کی شرط نہیں ہے اسی لیے حضرت خواص رحمہ اللہ سفر میں اسی، ڈولچی، قینچی اور سُوئی دھاگہ ساتھ رکھتے تھے کھانے پینے کا سامان نہیں رکھتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت دونوں چیزوں میں فرق کے ساتھ جاری ہے۔

سوال:

جب کسی کا ایسا سامان چوری ہو جائے جس کی اسے حاجت ہے تو وہ کیسے غمگین نہیں ہو گا اور افسوس نہیں کرے اور اگر وہ اسے نہیں چاہتا تو روک کر کیوں رکھتا ہے اور دروازہ کیوں بند کرتا ہے اور اگر وہ اس لیے روکتا ہے کہ اپنی حاجت کے لیے چاہتا ہے تو اس کے دل کو اذیت کیسے نہیں پہنچے گی اور کس طرح وہ غمگین نہیں ہو گا حالانکہ اس کے اور اس کی خواہش کے درمیان رکاوٹ پیدا ہو گئی۔

جواب:

اس نے اسے اس لیے محفوظ رکھا تھا کہ اس کے ذریعے دین پر مدد حاصل کرے کیوں کہ اس کا یہی گمان تھا کہ اس کی بھلائی اسی میں تھی کہ یہ سامان اس کے پاس ہوتا اگر اس میں اس کی بھلائی نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے یہ سامان عطا نہ فرماتا۔ تو اس نے اس بات سے استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ چیز بہم پہنچائی اور اس کے لیے آسان کی اور یہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں حُسنِ ظن ہے اس کے باوجود کہ یہ چیز اس کے دینی اسباب کے لیے مددگار رہے اور یہ بات اس کے نزدیک قطعی نہیں ہے کیوں کہ ہو سکتا ہے اس کی بھلائی کو اس مال کے گم کرنے سے آزمایا جائے حتیٰ کہ وہ اپنی غرض کے حصول کے لیے مشقت برداشت کرے اور اسے مشقت اور تھکاوٹ کی صورت میں زیادہ ثواب حاصل ہو۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے اس پر چور کو مسلط کر کے اس سے یہ مال لے لیا تو اس کا گمان بدل گیا کیوں کہ وہ تمام

حالتوں پر اللہ تعالیٰ پر یقین رکھتا اور اس کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہے وہ کہتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق اس مال کے آج تک میرے پاس ہونے اور اب میرے پاس سے جانے میں بھلائی نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ مجھ سے نہ لیتا تو اس قسم کے گمان سے اس بات کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کا غم دور ہو جائے کیوں کہ اس صورت میں اس کا اسباب پر خوش ہونا اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ وہ اسباب ہیں بلکہ اس اعتبار سے خوش ہوتا ہے کہ مسبب الاسباب نے اپنے فضل و کرم سے اس کے لیے ان اسباب کو آسان کر دیا سو وہ اس بیمار کی طرح ہے جو شفیق طبیب کے سامنے ہو وہ طبیب کے ہر فعل پر راضی ہوتا ہے اگر وہ اسے غذا دیتا ہے تو وہ خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے اگر طبیب اس بات کو نہ جانتا کہ یہ غذا میرے لیے نفع بخش ہے اور میں اس کو برداشت کی طاقت رکھتا ہوں تو وہ اسے میرے قریب نہ کرتا اور اگر وہ اس سے غذا کو دور رکھتا ہے تو وہ اس بات پر بھی خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے اگر غذا مجھے نقصان نہ دیتی اور موت کی طرف نہ لے جاتی تو طبیب اس کے اور میرے درمیان رکاوٹ کھڑی نہ کرتا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کے بارے میں وہ عقیدہ نہ رکھتا ہو جو مریض اپنے مشفق اور ماہر طبیب والد کے بارے میں رکھتا ہے تو اس شخص سے توکل بالکل درست نہیں ہوتا۔

اور جو شخص اللہ تعالیٰ اس کے افعال اور بندوں کی اصلاح کے سلسلے میں سنت الٰہیہ کی پہچان رکھتا ہے وہ اسباب پر خوش نہیں ہوتا کیوں کہ معلوم نہیں کہ کون سے اسباب اس کے لیے بہتر ہیں جیسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ میں غنی ہونے کی حالت میں صبح کرتا ہوں یا حالتِ فقر میں، کیوں کہ میں نہیں جانتا کہ ان میں سے کونسی بات میرے لیے بہتر ہے اسی طرح مناسب یہی ہے کہ متوکل آدمی اپنے مال کے چوری ہونے یا نہ ہونے کی پرواہ نہ کرے کیوں کہ وہ نہیں جانتا کہ ان دونوں باتوں میں سے کون سی بات اس کے لیے دنیا اور آخرت میں بہتر ہے کتنے ہی دنیوی سامان انسان کی ہلاکت کا سبب ہوتے ہیں اور کتنے ہی مالدار اپنی مالداری کی وجہ سے کسی واقعہ میں مبتلا ہو کر کہتے ہیں کہ کاش میں فقیر ہوتا۔

متوکلین کا سامان چوری ہو جائے تو کیا کریں

جب متوکل گھر سے نکلے تو اس سلسلے میں اس کے لیے کئی آداب ہیں۔

پہلا ادب :-

دروازہ بند کر دے اور حفاظت کے اسباب کے درپے نہ ہو مثلاً پڑوسیوں سے کہنا کہ خیال رکھنا حالانکہ تالہ بھی لگا دیا ہے اور جیسے کئی تالے لگانا حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ اپنے دروازے کو تالہ نہیں لگاتے تھے لیکن کسی رسی وغیرہ سے باندھ دیتے اور فرماتے اگر کتے نہ ہوتے تو میں اسے نہ باندھتا۔

دوسرا ادب:

گھر میں ایسا سامان نہ چھوڑے جو چوروں کی رغبت کا باعث ہو یہ ان لوگوں کے گناہ کا سبب بنے گا یا اس کا روکنا ان کی رغبت کے بڑھنے کا سبب ہوگا یہی وجہ ہے کہ جب حضرت مغیرہ رحمہ اللہ نے حضرت مالک بن دینار رحمہ اللہ کو ایک ڈولچی بطور تحفہ دی تو انہوں نے فرمایا اسے لے جاؤ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے پوچھا کیوں؟ فرمایا اس لیے کہ دشمن میرے دل میں وسوسہ ڈالے گا کہ چور اسے لے گیا ہے گویا انہوں نے اس بات سے احتراز کیا کہ چور گناہ کا مرتکب نہ ہو جائے اسی لیے حضرت ابو سلیمان رحمہ اللہ نے فرمایا یہ صوفیاء کے دلوں کی کمزوری ہے اس نے دنیا سے رغبتی اختیار کرلی تو جو کوئی لے جائے اسے کیا غرض ہے۔

تیسرا ادب:

جو چیز گھر میں چھوڑ کر جانے پر مجبور ہے جاتے وقت اس کے بارے اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کی نیت کرے کہ اس نے اس پر چور کو مسلط کیا اور کہے کہ جو کچھ چور لے گیا ہے وہ اس کے لیے حلال ہے یا وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہے اور اگر وہ فقیر ہے تو یہ مال اس پر صدقہ ہے اور اگر فقر کی شرط نہ رکھے تو یہ زیادہ بہتر ہے پس اس کے لیے دو نیتیں ہوں اگر اس مال کو مال دار نے لیا ہے یا فقیر نے، ایک یہ کہ یہ مال اس کے لیے گناہ سے بچنے کا ذریعہ بنے کیوں کہ بعض اوقات وہ (چور) اس مال کی وجہ سے مستغنی ہو جاتا ہے اور اس کے بعد چوری کی حاجت نہیں رہتی اور حرام کھانے کی وجہ سے جو گناہ ہوا تھا وہ حلال قرار دینے سے زائل ہو گیا۔ اور دوسری نیت یہ کہ وہ کسی مسلمان پر ظلم نہ کرے پس اس کا مال دوسرے مسلمان کے لیے فدیہ قرار پائے گا اور جب وہ اپنے مال کے ذریعے دوسرے کے مال کی حفاظت کی نیت کرے گا یا چور سے گناہ دور کرنے کی نیت کرے گا یا اس کے لیے آسانی کی نیت ہوگی تو گویا اس نے مسلمانوں کی خیر خواہی کی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی پر عمل کیا۔

اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُومًا۔ (۱) اپنے بھائی کی مدد کرو وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روکو اور اسے معاف کر دینا بھی ظلم کو ختم کرنا اور اس سے روکنا ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ نیت اسے کسی وجہ سے بھی نقصان نہیں دیتی کیوں کہ اس (نیت) میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو چور کو مسلط کرے اور ازلی فیصلے کو بدل دے لیکن زہد کی وجہ سے اس کی نیت ثابت ہو جاتی ہے اگر اس کا مال لے لیا گیا تو اسے ہر درہم کے بدلے سات سو درہم ملیں گے کیوں کہ اس نے اس (صدقہ) کی نیت کی اور اسی کا قصد کیا ہے۔ اور اگر اس کا مال چوری نہ ہوا تو بھی اسے اجر ملے گا۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۱۰۲۸ کتاب الاکراہ

مروی ہے جس نے عزل ترک کر دیا (جماع کے وقت جب انزال ہونے لگے تو بیوی سے الگ ہو جانا عزل ہے) پھر نطفہ ٹھہر گیا تو اسے اتنا ثواب ہوگا کہ گویا اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا وہ زندہ رہا اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کیا اور شہید ہو گیا اگرچہ بچہ پیدا نہ ہو کیوں کہ بچے کے سلسلے میں اس کے اختیار میں صرف جماع ہے تخلیق، حیات، رزق اور بقا اس کے اختیار میں نہیں ہے (۱)

اور اگر وہ پیدا ہوا تو بھی ثواب اس کے فعل پر ہوگا اور وہ معدوم نہیں ہوا تو چوری کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔

چوتھا ادب:

جب مال چوری ہو جائے تو غمگین نہیں ہونا چاہیے بلکہ اگر ممکن ہو تو خوش ہو اور یوں کہے کہ اگر اس (چوری) میں میری بھلائی نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے نہ لیتا پھر اگر اسے اللہ تعالیٰ کے راستے میں وقف نہ کیا ہو تو اس کی تلاش میں زیادہ کوشش نہ کرے اور نہ ہی مسلمانوں کے بارے میں زیادہ بدگمانی کرے اور اگر اللہ تعالیٰ کے راستے میں وقف کر دیا ہے تو اس کی طلب چھوڑ دے کیوں کہ اس نے اپنی آخرت کے لیے ذخیرہ بھیجا ہے اور اگر وہ اس کی طرف لوٹایا جائے تو بہتر یہ ہے کہ قبول نہ کرے کیوں کہ وہ اس کو اللہ تعالیٰ کے راستے میں وقف کر چکا ہے اور اگر اس نے قبول کر لیا تو ظاہری علم (فقہ کے مطابق) وہ اس کی ملک ہے کیوں کہ محض نیت کرنے سے ملک زائل نہیں ہوتی لیکن یہ بات متوکلین کے نزدیک ناپسندیدہ ہے

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اونٹنی چوری ہو گئی آپ اسے تلاش کرتے کرتے تھک گئے پھر فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں وقف ہے آپ مسجد میں داخل ہوئے اور دو رکعت نماز پڑھی اتنے میں ایک شخص نے حاضر ہو کر عرض کیا، اے ابو عبدالرحمن! آپ کی اونٹنی فلاں جگہ پر ہے آپ نے فرمایا میں نے کہہ دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں (وقف) ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں میں نے اپنے ایک بھائی کو اس کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا تو میں نے پوچھا اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے بخش دیا اور جنت میں داخل کیا نیز جنت میں میرے محلات میرے سامنے پیش کئے تو میں نے ان کو دیکھا لیکن اس کے باوجود وہ پریشان حال اور غمگین تھا میں نے کہا اللہ تعالیٰ نے تمہیں بخش دیا اور جنت میں داخل کیا اور تو غمگین ہے؟ اس نے درد مند دل سے ایک سرد آہ بھری پھر کہا میں قیامت تک غمگین ہی رہوں گا۔ میں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا جب میں نے جنت میں اپنا مقام دیکھا تو میرے سامنے علیین میں ایسے مقامات بلند کئے جن کی مثل میں نے نہیں دیکھے چنانچہ میں ان پر خوش ہوا لیکن جب وہاں جانے کا ارادہ کیا تو ان کے اوپر سے ایک منادی نے ندا دی کہ اسے یہاں سے واپس کر دو یہ مقام اس کے لیے نہیں ہے یہ اس شخص کے لیے ہے جو راستے کو پورا کرے میں نے پوچھا راستے کو پورا کرنا کیا ہے؟ مجھے کہا گیا کہ تم کہتے تھے یہ چیز اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہے پھر اس میں رجوع کر لیتے اگر تم اس سبیل کو پورا کرتے تو ہم بھی تمہارے لیے پورا کرتے۔

مکہ مکرمہ میں عبادت کرنے والوں میں سے ایک شخص کے بارے میں حکایت کی گئی ہے کہ وہ ایک شخص کے پہلو میں لیٹا ہوا تھا اور اس شخص کے پاس پیسوں کی تھیلی تھی جب وہ آدمی بیدار ہوا تو تھیلی نہ پائی چنانچہ اس نے اس عبادت گزار پر تہمت لگائی اس نے پوچھا تمہاری تھیلی میں کتنی رقم تھی اس نے رقم بتائی تو وہ اسے اپنے گھر لے گیا اور اتنی رقم وزن کر کے دے دی پھر اس شخص کے دوستوں نے کہا ہم نے مذاق میں وہ تھیلی لی تھی چنانچہ وہ اور اس کے ساتھ اس عابد کے پاس آئے اور سونا لوٹایا لیکن اس عابد نے انکار کر دیا اور فرمایا لے جاؤ یہ تمہارے لیے حلال اور پاکیزہ ہے میں نے جو مال اللہ تعالیٰ کے راستے میں نکالا ہے اسے واپس نہیں لوں گا پس اس نے قبول نہ کیا جب انہوں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے اپنے بیٹے کو بلا کر وہ مال تھیلیوں میں رکھ کر فقراء کے پاس بھیجنا شروع کر دیا حتیٰ کہ اس میں سے کچھ بھی باقی نہ رہا۔

تو اسلاف کے اس قسم کے اخلاق تھے اسی طرح جو شخص فقیر کو دینے کے لیے روٹی پکڑتا ہے اور فقیر چلا جاتا تو اسے واپس گھر لانا پسند نہ کرتا کیوں کہ وہ اسے نکال چکا تھا پس کسی اور فقیر کو دے دیتا۔ درہم و دینار اور دوسرے صدقات کے بارے میں بھی وہ لوگ یہی طریقہ اختیار کرتے تھے۔

پانچواں ادب:

یہ سب سے کم درجہ ہے یعنی جس چور نے اس کا مال چوری کیا ہے اس کے خلاف بددعا نہ کرے اگر ایسا کیا تو اس کا توکل باطل ہو گیا اور یہ اس بات کی دلیل ہو گی کہ اس نے اس حال کا جانا برا جانا اور اسے افسوس ہوا اس طرح اس کا زہد باطل ہو گیا اور اگر زیادہ بددعا کرے گا تو اسے پہنچنے والی مصیبت پر اجر و ثواب بھی نہیں ملے گا۔

حدیث شریف میں ہے۔

مَنْ دَعَا عَلٰی ظَالِمِہٖ فَقَدِ انْتَصَرَ۔ (۱)

جس نے اپنے اوپر ظلم کرنے والے کے لیے بددعا کی اس نے خود بدلہ لے لیا۔

حضرت ربیع بن خثیم رحمہ اللہ کا ایک گھوڑا چوری ہو گیا اور اس کی قیمت بیس ہزار (درہم) تھی آپ نماز پڑھ رہے آپ نے نہ تو نماز توڑی اور نہ ہی اس کی تلاش کے لیے مضطرب ہوئے لوگ آپ کے پاس تسلی دینے کے لیے آئے تو آپ نے فرمایا میں دیکھ رہا تھا جب اس شخص نے گھوڑا کھولا کہا گیا کہ آپ کو اس شخص کے خلاف آواز بلند کرنے سے کس چیز نے روکا؟ فرمایا میں اس سے زیادہ محبوب کام میں مصروف تھا یعنی نماز پڑھ رہا تھا وہ لوگ چور کو بددعا دینے لگے تو آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو بلکہ اس کے لیے اچھے کلمات کہو میں نے یہ گھوڑا اس کے لیے صدقہ کر دیا ہے۔

کسی بزرگ کی کوئی چیز گم ہو گئی تو ان سے کہا گیا کیا آپ اس ظالم کے خلاف بددعا نہیں کرتے؟ آپ نے فرمایا میں اس

---

(۱) مصنف لابن ابی شیبہ جلد ۱۰ ص ۳۴۸ حدیث ۹۶۲۵

کے خلاف شیطان کا مددگار بننا پسند نہیں کرتا عرض کیا گیا اگر وہ لوٹا دے تو؟ فرمایا نہ تو میں اسے لوں گا اور نہ اس چیز کی طرف دیکھوں گا کیوں کہ میں نے اس چیز کو اس کے لیے حلال کر دیا ہے۔

کسی دوسرے بزرگ سے عرض کیا گیا کہ جس نے آپ پر ظلم کیا ہے اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے کیا اس مسکین کے لیے یہ کافی نہیں کہ اس نے اپنے آپ پر خود ظلم کیا کہ میں (بددعا کے ذریعے) اس کے شر میں اضافہ کروں۔

کسی شخص نے بعض اکابر کے سامنے حجاج بن یوسف کو بہت گالیاں دیں کیوں کہ اس نے اس پر کچھ زیادتی کی تھی فرمایا گالی دینے میں مت ڈوبو اللہ تعالیٰ جس طرح حجاج سے لوگوں کے مال لینے اور خون بہانے کا بدلہ لے گا اسی طرح لوگوں سے اس کی ہتکِ عزت کا بدلہ بھی لے گا۔ اور ایک حدیث شریف میں ہے

إِنَّ الْعَبْدَ لَيُظْلَمُ الْمَظْلَمَةَ فَلَا يَزَالُ يَشْتُمُ ظَالِمَهُ وَيَسُبُّهُ حَتَّى يَكُونَ بِمِقْدَارِ مَاظَلَمَهُ ثُمَّ يَبْقَى لِلظَّالِمِ عَلَيْهِ مُطَالَبَةٌ بِمَا زَادَ عَلَيْهِ يُقْتَصُّ لَهُ مِنَ الْمَظْلُومِ۔ (۱)

کسی شخص پر کوئی ظلم ہوتا ہے پس وہ ظلم کرنے والے کو مسلسل گالیاں دیتا رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اس کے ظلم برابر ہو جاتی ہیں اور اس کے بعد جو زائد ہوتی ہیں اس کا مطالبہ ظالم کے اس شخص کے ذمہ باقی رہتا ہے اور مظلوم سے اس کا بدلہ لیا جائے گا۔

چھٹا ادب:

اس بات پر غمگین ہو کہ چور نے چوری کر کے گناہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اس کو مظلوم بنایا ظالم نہیں بنایا اور اس بات کو اس کی دنیا کا نقصان بنایا دین کا نہیں کسی شخص نے ایک عالمِ دین سے شکایت کی کہ اس پر ڈاکہ پڑا اور اس کا مال لوٹا گیا ہے تو انہوں نے فرمایا اگر تمہیں اس بات کا غم نہیں کہ مسلمانوں میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جو لوٹ کھسوٹ کے مال کو حلال سمجھتے ہیں تو تم مسلمانوں کے خیر خواہ نہیں ہو۔

حضرت علی بن فضیل رحمہما اللہ کے کچھ دینار چوری ہو گئے اور اس وقت وہ طواف کر رہے تھے ان کے والد (حضرت فضیل رحمہ اللہ) نے ان کو دیکھا کہ رو رہے ہیں اور غمگین ہیں تو فرمایا کیا دیناروں کے لیے روتے ہو؟ عرض کیا نہیں بلکہ مجھے تو اس مسکین پر رونا آرہا ہے کہ جب قیامت کے دن اس سے سوال ہو گا تو اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہو گی۔

کسی بزرگ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ جس نے آپ پر ظلم کیا ہے اس کے خلاف بددعا کریں انہوں نے فرمایا مجھے اس کا غم اس قدر ہے کہ بددعا کے لیے میرے پاس وقت ہی نہیں —— تو اسلاف کرام رحمۃ اللہ علیہم کے اخلاق مبارکہ اس انداز کے تھے۔

چوتھا فن:

---

(۱)

ضرر کو دور کرنے کی کوشش کرنا جس طرح بیماری وغیرہ کو دُور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے بیماری کو زائل کرنے والے اسباب بھی تین قسم کے ہیں یعنی یا تو وہ قطعی ہوتے ہیں جس طرح پیاس کے ضرر کو دُور کرنے کے لیے پانی بھوک کے ضرر کے ازالہ کے لیے روٹی ہے یا وہ اسباب ظنی ہوتے ہیں جس طرح پچھنے کے ذریعے خون نکلوانا اور جلاب لینا اور اس طرح دیگر دوائیاں ——— یعنی ٹھنڈک کا علاج حرارت سے اور حرارت کا علاج ٹھنڈک سے کرنا طب کے ظاہری اسباب یہی ہیں اور تیسری قسم موہوم اسباب کی ہے جس طرح داغ لگوانا اور دم وغیرہ کروانا۔

جہاں تک قطعی اسباب کا تعلق ہے تو توکل کے لیے ان کو چھوڑنا شرط نہیں ہے بلکہ موت کے خوف کے وقت ان اسباب کو چھوڑنا حرام ہے موہوم اسباب کا ترک کرنا توکل کے لیے شرط ہے کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متوکلین کا وصف یہی بیان فرمایا کہ وہ اسباب کو ترک کرتے ہیں اور ان میں سے سب سے زیادہ قوی داغ لگوانا ہے پھر دم کروانا اور آخر میں فال لینا ہے اور ان سب باتوں پر اعتماد کرنا اور بھروسہ کر لینا اسباب کو ملاحظہ کرنے میں انتہائی درجہ کا ڈوبنا ہے۔

جہاں تک درمیانے درجہ یعنی ظنی اسباب کا تعلق ہے جیسے ڈاکٹروں کا ظاہری اسباب سے علاج کرنا تو ایسا کرنا توکل کے خلاف نہیں ہاں موہوم اسباب توکل کے خلاف ہیں لیکن ظنی اسباب کو چھوڑنا بھی ممنوع نہیں ہے جب کہ قطعی اسباب کو ترک کرنا ممنوع ہے بلکہ بعض اوقات اسباب موہومہ کو اپنانے کی بجائے ترک کرنا افضل ہے اسی طرح بعض اشخاص کے لیے بھی یہی حکم ہے تو یہ ایک درمیانہ درجہ ہے اور یہ اس بات پر دلالت ہے کہ دوا استعمال کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل، قول اور حکم سے یہ بات ثابت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اس طرح ہے۔

مَا مِنْ دَاءٍ اِلَّا وَلَهٗ دَوَاءٌ عَرَفَهٗ مَنْ عَرَفَهٗ وَجَهِلَهٗ مَنْ جَهِلَهٗ اِلَّا السَّامُ۔ (۱)

ہر بیماری کی دوا ہے جس نے اسے پہچانا اس نے پہچانا اور جس کو معلوم نہ ہوا اسے معلوم نہ ہوا سوائے موت کے۔

یعنی موت کا کوئی علاج نہیں۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

تَدَاوَوْا عِبَادَ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ الدَّاءَ وَالدَّوَاءَ۔ (۲)

اے اللہ کے بندو! دوائی استعمال کیا کرو بے شک اللہ تعالیٰ نے بیماری اور علاج دونوں کو پیدا فرمایا ہے۔

پوچھا گیا کہ کیا دوا اور دم اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو رد کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے ہیں۔ (۳)

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد اوّل ص مرویات عبداللہ

(۲) سنن ابی داؤد جلد ۲ ص ۱۸۳ کتاب الطب

(۳) سنن ابن ماجہ ص ۲۵۷، ابواب الطب

ایک مشہور حدیث میں ہے (آپ نے ارشاد فرمایا)

مَا مَرَرْتُ بِمَلَاءٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ اِلَّا قَالُوْا مُرْ اُمَّتَكَ بِالْحِجَامَةِ۔ (۱)

میں، فرشتوں کی جس جماعت سے گزرا انہوں نے کہا کہ اپنی امت کو پچھنے لگوانے کا حکم دیں۔

اور حدیث شریف میں ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

اِحْتَجِمُوْا لِسَبْعَ عَشَرَةَ وَتِسْعَ عَشَرَةَ وَاحِدَىٰ وَعِشْرِیْنَ لَا یَتَبَیَّغُ بِکُمُ الدَّمُ فَیَقْتُلَکُمْ۔ (۲)

سترہ، انیس اور اکیس تاریخ کو پچھنے لگوایا کرو کہیں خون جوش مار کر تمہیں ہلاک نہ کر دے۔

آپ نے بیان فرمایا کہ خون کا جوش مارنا موت کا سبب ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہلاک کرتا ہے یہ بھی بتایا کہ خون کا نکالنا اس سے بچنے کا ذریعہ ہے مہلک خون کو چمڑے سے نکالنے، بچھو کو کپڑے کے نیچے سے نکالنے اور سانپ کو گھر سے نکالنے میں کوئی فرق نہیں۔ اور اسے چھوڑ دینا توکل کی شرائط میں سے نہیں ہے بلکہ یہ اسی طرح ہے جس طرح گھر میں آگ لگ جائے تو اس کے نقصان سے بچنے کے لیے اس پر پانی ڈال کر اسے بجھایا جاتا ہے اور وکیل برحق کی عادت سے باہر نکلنا توکل بالکل نہیں ہے ایک مقطوع روایت میں ہے (تابعی کا قول حدیث مقطوع ہوتی ہے)

مَنِ احْتَجَمَ یَوْمَ الثُّلَاثَاءِ لِسَبْعَ عَشَرَةَ مِنَ الشَّهْرِ کَانَ لَهٗ دَوَاءٌ مِّنْ دَاءِ سَنَةٍ۔ (۳)

جو شخص مہینے کی سترہ تاریخ کو منگل کے دن پچھنے لگوائے اس کے لیے یہ سال بھر کی بیماری کا علاج ہوگا۔

جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امر کا تعلق ہے تو آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بارہا دوائی استعمال کرنے اور پرہیز کرنے کا حکم دیا۔ (۴)

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی فصد (رگ) کھولی، (۵)

اور حضرت سعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کو داغ لگایا (۶)

نیز حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں میں تکلیف تھی تو آپ نے ان سے فرمایا ان (تر کھجوروں) سے نہ کھائیں اور یہ

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۳۵۴ مرویات ابن عباس

(۲) مجمع الزوائد جلد ۵ ص ۹۳ کتاب الطب

(۳) مجمع الزوائد جلد ۵ ص ۹۳ کتاب الطب

(۴) سنن ابن ماجہ ص ۲۵۳، ابواب الطب

(۵) صحیح مسلم جلد ۲ ص ۲۲۵ کتاب السلام

(۶) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ جلد اول ص ۳۴ ترجمہ ۱۰۹

کھاؤ یہ تمہارے مزاج کے موافق ہے یعنی ساگ جو جَو کے آٹے میں پکایا گیا تھا (۱)

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی آنکھ میں تکلیف تھی تو آپ نے ان کو کھجوریں کھاتے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ آپ کھجور کھا رہے ہیں حالانکہ آپ کی آنکھوں میں درد ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ میں دوسری طرف سے کھا رہا ہوں اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا پڑے (۲)

جہاں تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کا تعلق ہے تو اہل بیت کے طریق سے مروی ہے کہ آپ ہر رات سرمہ لگایا کرتے تھے اور ہر مہینے پچھنے لگاتے نیز ہر سال دوا پیتے (۳) کہا گیا کہ وہ سنا مکی تھی (یعنی اس کا جلاب لیتے تھے)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار بچھو وغیرہ کے کاٹنے سے علاج کرایا (۴)

ایک روایت میں ہے جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو آپ کے سر میں درد ہو جاتا اور آپ اس پر مہندی کا لیپ کرتے تھے۔ (۵)

ایک حدیث شریف میں ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم زخم پر مہندی لگایا کرتے ہیں (۶) اور آپ نے ایک زخم پر مٹی بھی چھڑکی تھی (۷)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوائی استعمال کرنے اور اس بات کا حکم دینے کے سلسلے میں بے شمار روایات آئی ہیں اور اس سلسلے میں ایک کتاب تصنیف ہوئی ہے جس کا نام "طب نبوی" ہے۔

اسرائیلی روایات میں بعض علماء نے ذکر کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک بیماری لاحق ہوگئی بنی اسرائیل آپ کے پاس حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ کی بیماری کو معلوم کر لیا اور آپ کو ایک دوائی استعمال کرنے کا مشورہ دیا آپ نے فرمایا میں دوائی استعمال نہیں کروں گا حتی کہ اللہ تعالیٰ دوائی کے بغیر مجھے صحت عطا فرمائے چنانچہ آپ کی بیماری بڑھ گئی انہوں نے کہا اس بیماری کی دوائی معروف اور مجرب ہے اور ہم اس دوائی کے ذریعے صحت حاصل کیا کرتے ہیں آپ نے فرمایا میں دوائی نہیں لوں گا آپ اپنی بات پر ڈٹے رہے اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی بھیجی (فرمایا) مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم! میں آپکو

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۲۵۴، ابواب الطب

(۲)

(۳) کنز العمال جلد ۷ ص ۱۳۳ حدیث ۱۸۳۶۰

(۴) مجمع الزوائد جلد ۵ ص ۷۸، کتاب الطب

(۵) مجمع الزوائد جلد ۵ ص ۹۵ کتاب الطب

(۶) جامع ترمذی ص ۳۰۰، ابواب الطب

(۷) مسند امام بن حنبل جلد ۶ ص ۹۳ مرویات عائشہ

اس وقت تک صحت یاب نہیں کروں گا جب تک آپ ان لوگوں کی بیان کردہ دوائی استعمال نہ کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مجھے وہ دوائی دو جس کا تم نے ذکر کیا ہے چنانچہ انہوں نے دوائی دی اور آپ ٹھیک ہو گئے اس سے آپ کے دل میں کچھ محسوس ہوا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی فرمائی (ارشاد فرمایا) کہ کیا آپ مجھ پر توکل کے ذریعے میری حکمت کو باطل کرنا چاہتے ہیں بتائیے دوائیوں میں نفع میرے سوا کس نے رکھا ہے؛

ایک دوسری روایت میں ہے کہ ایک نبی علیہ السلام کو بیماری کی شکایت ہوتی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی کہ آپ انڈے کھائیں ایک دوسرے نبی علیہ السلام نے کمزوری کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ دودھ کے ساتھ گوشت کھائیں کیونکہ اس میں قوت ہے کہا گیا کہ یہ قوت باہ کی کمزوری تھی۔

ایک روایت میں ہے کہ بعض لوگوں نے اپنے نبی سے شکایت کی کہ ان کی اولاد کی شکلیں اچھی نہیں ہوتیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ اپنی بیویوں کو حمل کے دوران بہی دانہ کھلایا کریں اس سے اولاد خوبصورت ہوگی۔ اور یہ کام تیسرے اور چوتھے مہینے میں کریں۔ کیونکہ اس مہینے میں اللہ تعالیٰ بچے کی شکل بناتا ہے وہ لوگ حمل دوران عورتوں کو بہی اور بچہ پیدا ہونے کے بعد کھجور کھلاتے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ مسبب الاسباب کا طریقہ جاریہ یہ ہے کہ اس نے مُسبّبات کو اسباب سے مربوط کیا اور یہ اس کی حکمت کے اظہار کے طور پر ہے اور دوائیں بھی دوسرے اسباب کی طرح اسباب ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت ہیں جس طرح روٹی، بھوک کا علاج ہے پانی، پیاس کی دوا ہے اسی طرح سکنجبین، صفرا کی دوا ہے، سقمونیا، اسہال کی دوا ہے البتہ دو باتوں میں فرق ہے ایک بات یہ کہ پانی اور روٹی کے ذریعے بھوک اور پیاس کا علاج واضح ہے جس کا ادراک تمام لوگوں کو ہوتا ہے جب کہ سکنجبین کے ذریعے صفراء کے علاج کا ادراک ہو جاتا ہے اس کے حق میں پہلی بات اور اس میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ دوائی جو اسہال پیدا کرتی ہے اور سکنجبین جو صفراء کو ٹھہراتی ہے اس کے لیے کچھ دیگر باطنی شرائط بھی ہیں اور مزاج کے اندر کچھ اسباب ہیں بعض اوقات تمام اسباب سے آگاہی مشکل ہوتی ہے اور کبھی بعض شرائط فوت ہو جاتی ہیں جس کے نتیجے میں دوائی دست و اسہال نہیں لاتی جب کہ پیاس کے پانی کے علاوہ کوئی شرط نہیں ہے البتہ بعض اوقات کچھ ایسے عوارض پیدا ہوتے ہیں جو بہت زیادہ پانی پینے کے باوجود پیاس کو باقی رکھتے ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے

اسباب میں جو خلل واقع ہوتا ہے وہ ان ہی دو باتوں سے ہوتا ہے ورنہ جب سبب پایا جائے تو لامحالہ مسبب اس کے ساتھ آتا ہے بشرطیکہ سبب کی شرائط مکمل ہوں اور یہ سب کچھ مسبب الاسباب کی تدبیر، تسخیر اور ترتیب سے ہوتا ہے جو اس کی حکمت اور کمالِ قدرت کا فیصلہ ہوتا ہے اب جب متوکل کی نگاہ مسبب الاسباب پر ہوتی ہے طبیب اور دوائی پر نہیں تو اسے کچھ نقصان نہیں ہوتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے انہوں نے عرض کیا اے اللہ! بیماری اور علاج کس کی طرف سے ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میری طرف سے، عرض کیا طبیب کیا کرتے ہیں؟ فرمایا وہ اپنا رزق کھاتے ہیں اور میرے بندوں کا دل خوش کرتے ہیں یہاں تک کہ میرے بندوں پر میری قضا یا شفا آجائے۔

تو علاج کروانے کے باوجود توکل اختیار کرنے کا مطلب علم اور حال کے ساتھ توکل ہے جیسا کہ ضرر کو دور کرنے اور نفع لانے والے اعمال کے سلسلے میں گزر چکا ہے لیکن دوائی کے استعمال کو مکمل طور پر ترک کر دینا توکل کے لیے شرط نہیں ہے۔

سوال:

داغ لگوانا بھی ان اسباب میں سے ہے جن کا نفع ظاہر ہے۔

جواب:

یہ بات اس طرح نہیں ہے کیوں کہ ظاہری اسباب ایسے ہوتے ہیں جیسے رگ کٹوانا، خون نکلوانا، مسہل دوائی پینا اور حرارت والے کو ٹھنڈی چیزیں پلانا اگر داغ لگانے جیسے عمل کا اثر ظاہر ہوتا تو بے شمار شہر اس سے خالی نہ ہوتے حالانکہ اکثر شہروں میں داغنے کا طریقہ جاری نہیں ہے یہ تو بعض ترکیوں اور اعرابیوں کی عادت ہے یہ دم جھاڑے کی طرح موہوم سبب ہے البتہ ان میں ایک بات کے حوالے سے فرق ہے وہ یہ کہ داغنا بلا ضرورت آگ سے جلانا ہے کیوں کہ ہر وہ تکلیف جس کا علاج داغنے کے ذریعے کیا جاتا ہے اس کا علاج جلانے کے بغیر بھی ہو سکتا ہے آگ سے جلانا ایسا زخم ہے جو جسم کو خراب کر دیتا ہے جب اس کی ضرورت نہ ہو تو اس سے احتراز کیا جائے کیوں اس کے سرایت کرنے کا بھی ڈر ہوتا ہے جبکہ رگ کٹوانے اور پچھنے کی سرایت کا ڈر بہت بعید بات ہے اور کوئی دوسری چیز ان کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے داغنے سے منع فرمایا دم جھاڑے سے منع نہیں کیا (۱) حالاں کہ یہ دونوں توکل سے دور ہیں۔

ایک روایت میں ہے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیمار ہو گئے تو ان کو داغ لگوانے کا مشورہ دیا گیا لیکن انہوں نے نہ مانا جب بار بار اصرار کیا گیا اور ان کو قسم دی گئی تو انہوں داغ لگوایا وہ فرماتے تھے میں نور دیکھا کرتا تھا آواز سنا کرتا تھا اور فرشتے مجھے سلام کرتے تھے لیکن جب میں نے داغ لگوایا تو یہ سلسلہ ختم ہو گیا وہ فرماتے تھے میں نے کئی داغ لگوائے لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا نہ مقصود حاصل ہوا پھر انہوں نے اس سے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کا وہ پہلا معاملہ ان کی طرف لوٹا دیا۔

---

(۱) صحیح بخاری جلد ۲ ص ۸۵۰/۸۵۴ کتاب الطب

انہوں نے حضرت عبداللہ بن مطرف رضی اللہ عنہ سے فرمایا کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے جن فرشتوں کے ذریعے مجھے اعزاز بخشا تھا ان کو لوٹا دیا حالانکہ اس سے پہلے ان کے جانے کی خبر دے دی تھی۔

تو داغ لگوانا اور اس طرح کے دیگر امور توکل کرنے والے کے لائق نہیں ہیں کیوں کہ اس کے لیے متوکل کو تدبیر اختیار کرنا پڑتی ہے اور یہ مذموم ہے اور اس میں اسباب کی طرف توجہ اور ان میں اچھی طرح غور کرنا پایا جاتا ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

فصل ۷:

ترک علاج اور توکل

بعض اوقات علاج کو ترک کرنا قابل تعریف اور قوت توکل کی دلیل ہوتا ہے اور یہ بات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے خلاف نہیں۔

جان لو کہ بے شمار اسلاف نے دوائی استعمال کی ہے لیکن اکابر میں سے ایک جماعت نے علاج معالجے کو ترک بھی کیا ہے تو اس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ نقصان ہے کیوں کہ اگر یہ کمال ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسے ترک فرماتے کیوں کہ توکل کے سلسلے میں دوسروں کا حال آپ کے حال سے زیادہ کامل نہیں ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ آپ سے عرض کیا گیا اگر ہم آپ کے لیے طبیب کو بلائیں تو کیسا ہے؟ آپ نے فرمایا طبیب نے مجھے دیکھا اور فرمایا ہے کہ میں جو چاہوں کرتا ہوں۔

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کی بیماری کے دوران ان سے پوچھا گیا کہ آپ کو کیا تکلیف ہے؟ فرمایا مجھے گناہوں کی شکایت ہے پوچھا گیا آپ کیا چاہتے ہیں؟ فرمایا اپنے رب کی طرف سے مغفرت چاہتا ہوں انہوں نے پوچھا کیا آپ کے طبیب کو بلاؤں؟ فرمایا طبیب نے ہی مجھے بیمار کیا ہے۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں دکھتی تھیں تو آپ سے کہا گیا آپ دوائی استعمال کریں تو کیا حرج ہے؟ انہوں نے فرمایا مجھے ان آنکھوں کی کوئی فکر نہیں کیا گیا اگر آپ اللہ تعالیٰ سے سوال کریں کہ وہ آپ کو صحت عطا فرمائے تو اچھا ہے فرمایا میں اس سے اس بات کا سوال کرتا ہوں جو ان آنکھوں سے زیادہ اہم ہے۔

حضرت ربیع بن خثیم رحمہ اللہ فالج کے مرض میں مبتلا ہوئے تو ان سے عرض کیا گیا کہ آپ علاج کروائیں انہوں نے فرمایا میں نے ارادہ کیا تھا لیکن پھر مجھے قوم عاد، ثمود کنویں والے (حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم) اور دوسری قومیں یاد آئیں ان میں معالج بھی تھے پس طبیب بھی ہلاک ہوا اور مریض بھی۔ اور ان کو دم جھاڑے نے بھی کوئی فائدہ نہ دیا۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے تھے جو شخص توکل کا عقیدہ رکھتا ہو اور اس راستے پر چلتا ہے میں اس کے لیے

دوائی وغیرہ پینے کے ذریعے علاج کے ترک کو پسند کرتا ہوں آپ کو کئی بیماریاں تھیں لیکن آپ طبیب کے پوچھنے پر بھی نہ بتاتے۔

حضرت سہل رحمہ اللہ سے پوچھا گیا کہ بندے کے لیے توکل کب صحیح ہوتا ہے؟ فرمایا جب اس کے جسم میں کوئی ضرر اور مال میں نقصان واقع ہو تو وہ اپنے حال میں مشغولیت کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ نہ ہو اور یوں خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر پر قائم ہے۔

تو بہت سے بزرگوں نے دوائی کا استعمال ترک کیا اور ان میں سے بعض نے اس کو ناپسند کیا تو ان کے افعال اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل میں مطابقت اسی وقت ہو سکتی ہے جب علاج کے موانع بیان کئے جائیں تو ہم کہتے ہیں کہ ترکِ علاج کے کئی اسباب ہیں۔

پہلا سبب:

مریض اہل مکاشفہ میں سے ہو اور اسے کشف ہو کہ اس کا وقت پورا ہو چکا ہے اور دوائی اسے نفع نہیں دیتی اور یہ بات بعض اوقات اسے سچے خواب کے ذریعے بھی معلوم ہوتی ہے اور کئی مرتبہ اندازے سے علم ہوتا ہے اور کبھی حقیقی کشف کے ذریعے معلوم ہوتا ہے ہو سکتا ہے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اسی وجہ سے علاج ترک فرمایا کیونکہ آپ اہل مکاشفہ میں سے تھے آپ نے وراثت کے سلسلے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ تمہاری دو بہنیں ہیں حالاں کہ آپ کی ایک ہی بہن تھیں لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زوجہ حاملہ تھیں اور ان کے ہاں بچی پیدا ہوئی معلوم ہوا کہ آپ کو کشف کے ذریعے معلوم ہوا تھا کہ آپ کی زوجہ کے پیٹ میں بچی ہے تو یہ بات بعید نہیں کہ آپ کو کشف کے ذریعے اپنی وفات کا حال معلوم ہو گیا ہو حالانکہ آپ نے دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوائی استعمال کی اور اس کا حکم بھی دیا۔

دوسرا سبب:

یہ ہے کہ مریض اپنے حال میں مشغول ہو اسے اپنی عاقبت کا خوف ہو نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ اس پر مطلع ہے تو اس وجہ سے وہ بیماری کی تکلیف کو بھول جاتے اور اس کا دل اپنے حال میں مشغولیت کی وجہ سے علاج معالجے کے لیے فارغ نہ ہو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ مجھے آنکھوں کی فکر نہیں اسی بات پر دلالت ہے اور حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے جو یہ بات فرمائی کہ مجھے اپنے گناہوں کی بیماری ہے تو گویا ان کا دل گناہوں کے خوف کی وجہ سے بدنی بیماری کی تکلیف کے مقابلے میں زیادہ تکلیف میں تھا اس کی مثال اسی طرح ہے کہ کسی شخص کا کوئی بہت ہی عزیز رشتہ دار فوت ہو جائے یا کسی شخص کو بادشاہ کے پاس قتل کے لیے لے جایا جا رہا ہو اور وہ خوف زدہ ہو جب اس سے کہا جائے کہ تم بھوک کے باوجود کھانا کیوں نہیں کھاتے تو وہ جواب دیتا ہے میں بھوک کی تکلیف بھول چکا ہوں تو اس کا یہ کہنا اس بات کا انکار

نہیں ہے کہ کھانا بھوک کی حالت میں نفع دیتا ہے اور نہ کھانے والے پر کچھ طعن ہے۔

حضرت سہل رحمہ اللہ سے جب پوچھا گیا کہ قوت (رزق) کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا یہ حیّ وقیوم ذات کا ذکر ہے عرض کیا گیا ہم قوام (جس سے جسم قائم رہتا ہے) کے بارے میں پوچھتے ہیں فرمایا وہ علم ہے کہا گیا کہ ہم آپ سے غذا کے بارے میں سوال کر رہے ہیں فرمایا وہ ذکر ہے عرض کیا گیا ہم نے کھانوں کے بارے میں سوال کیا ہے تو حضرت سہل رحمہ اللہ نے فرمایا تمہیں جسم سے کیا غرض ہے اسے اسی ذات پر چھوڑ دو جس نے پہلے اس کی پرورش کی ہے وہی اس کی آخر میں بھی پرورش کرے گا اور جب وہ کسی بیماری کا شکار ہو تو اسے اس کے بنانے والے کی طرف لوٹا دو کیا تم نہیں دیکھتے کہ جب کسی چیز میں خرابی پیدا ہوتی ہے تو اسے اس کے بنانے والے (کاریگر) کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے وہی اسے درست کرتا ہے۔

تو حضرت سہل رحمہ اللہ کے قول کا بھی وہی مطلب ہے (جو اوپر بیان ہوا)

تیسرا سبب:

بیماری پرانی ہوتی ہے اور جس دوائی کا اسے مشورہ دیا گیا ہے اس کا نفع بیماری کی نسبت موہوم ہوتا ہے تو یہ داغ لگوانے اور دم کروانے کی طرح ہے اس لیے متوکل اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ حضرت ربیع بن خثیم رحمہ اللہ کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے جب انہوں نے فرمایا کہ میں قوم عاد اور قوم ثمود کو یاد کرتا ہوں ان میں طبیب بھی تھے لیکن علاج کرنے والے اور بیمار دونوں ہلاک ہو گئے یعنی دوائی پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ بات بعض اوقات واقعتاً اسی طرح ہوتی ہے کہ دوائی کا نفع یقینی نہیں ہوتا اور کبھی مریض کے خیال میں ایسا ہوتا ہے کیوں کہ طب کے ساتھ اس کا زیادہ تعلق نہیں ہوتا اور اس کا تجربہ بھی کم ہوتا ہے لہٰذا اس کو اس کے نفع بخش ہونے کا غالب گمان نہیں ہوتا اور اس میں شک نہیں کہ تجربہ کار طبیب دواؤں کے بارے میں دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ پکا اعتقاد رکھتا ہے اور اعتقاد تجربہ کے اعتبار سے ہوتا ہے۔

اور جن عبادت گزار اور زاہد لوگوں نے علاج معالجے کو ترک کیا ہے ان میں سے اکثر کی دلیل اور سند یہی بات ہے کیوں کہ ان کے نزدیک دوائی ایک موہوم چیز ہے جس کی کوئی اصل نہیں اور یہ بات بعض دوائیوں کے بارے میں ان لوگوں کے نزدیک صحیح ہوتی ہے جو فن طب سے واقف ہیں اور بعض دوائیوں کے بارے میں صحیح نہیں ہوتی لیکن جو شخص طبیب نہیں ہے وہ تمام دوائیوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے پس وہ علاج کروانے کو داغ لگوانے اور دم وغیرہ کی طرح اسباب کی پابندی قرار دیتا ہے پس توکل کی بنیاد پر علاج معالجے کو ترک کر دیتا ہے۔

چوتھا سبب:

بندہ اس لیے دوائی کا استعمال ترک کرتا ہے کہ اس کا مرض باقی رہے اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی آزمائش پر اچھی طرح صبر کرنے کا ثواب حاصل ہو یا وہ صبر کرنے پر طاقت حاصل ہونے کا تجربہ کرے اور مرض کے ثواب کے بارے

میں بے شمار روایات آئی ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

نَحْنُ مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَاءِ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ يُبْتَلَى الْعَبْدُ عَلَى قَدْرِ اِيْمَانِهِ فَاِنْ كَانَ صَلْبَ الْاِيْمَانِ شُدِّدَ عَلَيْهِ الْبَلَاءُ وَاِنْ كَانَ فِي اِيْمَانِهِ ضَعْفٌ خُفِّفَ عَنْهُ الْبَلَاءُ۔ (۱)

ہم گروہ انبیاء پر باقی سب لوگوں کی نسبت زیادہ آزمائش آتی ہے پھر درجہ بدرجہ کم ہو جاتی ہے بندہ اپنے ایمان کے انداز سے پر آزمائش میں مبتلا ہوتا ہے اگر اس کا ایمان مضبوط ہو تو آزمائش بھی سخت ہوگی اور اگر اس کے ایمان میں کچھ کمزوری ہو تو اس کی آزمائش بھی ہلکی ہوتی ہے۔

ایک دوسری حدیث شریف میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُجَرِّبُ عَبْدَهُ بِالْبَلَاءِ كَمَا يُجَرِّبُ اَحَدُكُمْ ذَهَبَهُ بِالنَّارِ فَمِنْهُمْ مَنْ يَخْرُجُ كَالذَّهَبِ الْاِبْرِيْزِ لَا يَرِيْبُهُ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَمِنْهُمْ مَنْ يَخْرُجُ اَسْوَدَ مُحْتَرِقًا۔ (۲)

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو آزمائش میں ڈال کر اس کا تجربہ کرتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی ایک سونے کو آگ میں ڈال کر اس کا تجربہ کرتا ہے پس ان میں سے بعض تو کالے جلے ہوئے ہوتے ہیں۔

ایک دوسری حدیث جو اہل بیت کے طریق سے مروی ہے اس میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا اِبْتَلَاهُ فَاِنْ صَبَرَ اِجْتَبَاهُ فَاِنْ رَضِيَ اِصْطَفَاهُ۔ (۳)

اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے پس اگر وہ صبر کرے تو اسے مجتبیٰ (چنا ہوا) بنا دیتا ہے اور اگر وہ اس پر راضی ہو تو اسے مصطفیٰ (منتخب) بنا دیتا ہے۔

ایک دوسری حدیث شریف میں ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

تُحِبُّوْنَ اَنْ تَكُوْنُوْا كَالْحُمُرِ الضَّالَّةِ لَا تَمْرَضُوْنَ وَلَا تَسْقَمُوْنَ۔ (۴)

کیا تم چاہتے ہو کہ تم بھٹکے ہوئے گدھوں کی طرح ہو جاؤ تمہیں کوئی بیماری نہ آئے۔

---

(۱) المستدرک للحاکم جلد ۳ ص ۳۴۳ کتاب معرفۃ الصحابۃ / کنز العمال جلد ۳ ص ۳۲۹ حدیث ۶۷۸۳

(۲) المستدرک للحاکم جلد ۴ ص ۳۱۴ کتاب الرقاق

(۳) مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۲۹۱ کتاب الجنائز

(۴) شعب الایمان جلد ۷ ص ۱۶۳ حدیث ۹۸۵۶ / التاریخ الکبیر للبخاری جلد ۷ ص ۲۶۷ ترجمہ ۱۱۲۹

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جب تم مومن کو دیکھو گے تو اس کا دل صحیح اور جسم بیمار ہوگا۔ اور منافق کو یوں دیکھو گے کہ اس کا جسم تندرست اور دل بیمار ہوگا۔

گویا جب لوگوں نے بیماری اور آزمائش کی تعریف زیادہ دیکھی تو ایک جماعت نے بیماری کو پسند کیا اور غنیمت جانا تاکہ وہ اس پر صبر کا ثواب پائیں ان میں سے بعض اپنی بیماری کو چھپاتے تھے اور طبیب کے سامنے ذکر نہیں کرتے تھے بیماری کی تکلیف برداشت کرتے اور اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی رہتے تھے وہ اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ دل پر حق کا غلبہ اس قدر ہے کہ بیماری کی وجہ سے اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا بیماری محض اعضاء کے لیے رکاوٹ بنتی ہے وہ اس بات کو بھی جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر صبر کرتے ہوئے بیٹھ کر نماز پڑھنا صحت و عافیت کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے زیادہ فضیلت رکھتی ہے ایک حدیث شریف میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ لِمَلَائِكَتِهٖ اُكْتُبُوْا لِعَبْدِيْ صَالِحَ مَاكَانَ يَعْمَلُهٗ فَاِنَّهٗ فِيْ وِثَاقِيْ اِنْ اَطْلَقْتُهٗ اَبْدَلْتُهٗ لَحْمًا خَيْرًا مِنْ لَحْمِهٖ وَدَمًا خَيْرًا مِنْ دَمِهٖ وَاِنْ تَوَفَّيْتُهٗ تَوَفَّيْتُهٗ اِلٰى رَحْمَتِيْ۔ (۱)

اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے میرے نیک بندے کے وہ اعمال لکھو جو وہ کیا کرتا تھا کیوں کہ یہ شخص میری قید میں ہے اگر میں اس کو رہا کر دوں تو اسے اس گوشت سے عمدہ گوشت اور اس خون سے اچھا خون عطا کروں گا اور اگر میں اس کو موت دوں تو اپنی رحمت کی طرف اس کو وفات دوں گا۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ مَا اُكْرِهَتْ عَلَيْهِ النُّفُوْسُ۔ (۲)

بہترین اعمال وہ ہیں جن پر جن کے کرنے پر نفس مجبور ہوں۔

کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس پر بیماریاں اور مصیبتیں زیادہ آئیں اسی بات کی طرف اس ارشاد خداوندی میں اشارہ ہے۔

وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۳)

اور ہو سکتا ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔

---

(۱) کنز العمال جلد ۳ ص ۳۰۹ حدیث ۶۶۸۵

(۲) یہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کا قول ہے (رب نواز)

(۳) قرآن مجید، سورۃ بقرہ آیت ۲۱۶

حضرت سہل رحمہ اللہ فرماتے ہیں علاج معالجے کا ترک اگرچہ عبادات میں کمزوری اور فرائض میں کوتاہی کا باعث ہو اس علاج سے بہتر ہے جو عبادات کے لیے کیا جائے اور آپ خود بہت بڑی بیماری میں مبتلا تھے لیکن اس کا علاج نہیں کرواتے تھے اور دوسرے لوگ جو اس بیماری میں مبتلا ہوتے ان کا علاج کیا کرتے تھے اور جب آپ کسی شخص کو دیکھتے کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے اور بیماری کی وجہ سے نیک اعمال نہیں کر سکتا اور وہ نماز کے لیے کھڑا ہونے اور عبادات کے لیے اٹھنے کی خاطر علاج کرواتا ہے تو آپ کو اس پر تعجب ہوتا اور آپ فرماتے اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہتے ہوئے بیٹھ کر نماز پڑھنا قوت اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے لیے علاج کروانے سے بہتر ہے۔

جب آپ سے کوئی شخص دوائی پینے کے بارے میں پوچھتا تو آپ فرماتے کمزور لوگوں کے لیے اس کی بھی گنجائش ہے لیکن دوائی استعمال نہ کرنا افضل ہے کیوں کہ جو شخص دوائی استعمال کرتا ہے اگرچہ وہ ٹھنڈا پانی ہی ہو تو اس سے پوچھا جائے گا کہ اس نے اسے کیوں استعمال کیا اور جو استعمال نہیں کرے گا اس سے سوال ہو گا۔

اور حضرت سہل رحمہ اللہ اور بصریوں کا مذہب یہ تھا کہ بھوک اور خواہشات کو توڑنے کے ذریعے نفس کو کمزور کر دیا جائے کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ دل کے اعمال مثلاً صبر، رضا اور توکل وغیرہ کا ایک ذرہ بھی اعضاء کے پہاڑوں جیسے اعمال سے افضل ہیں اور بیماری قلبی اعمال کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی ہاں جب اس کی تکلیف غالب ہو اور دہشت میں ڈالتی ہو۔

حضرت سہل رحمہ اللہ نے فرمایا جسمانی بیماریاں رحمت ہیں اور دلوں کی بیماریاں سزا ہیں۔

پانچواں سبب:

بندے نے پہلے کچھ گناہ کئے ہوں اور اسے ان کا ڈر ہو اور ان کا کفارہ بھی ادا نہ کر سکتا ہو تو وہ بیماری کی طوالت کو ان گناہوں کا کفارہ خیال کرتا ہے اور اس لیے علاج نہیں کرواتا کہ بیماری جلدی ختم نہ ہو جائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَا تَزَالُ الْحُمّٰى وَالْمَلِيْلَةُ بِالْعَبْدِ حَتّٰى يَمْشِيَ عَلَى الْاَرْضِ كَالْبَرَدَةِ مَا عَلَيْهِ ذَنْبٌ وَلَا خَطِيْئَةٌ ۔ (۱)

آدمی ہمیشہ بخار اور ملال میں رہتا ہے حتیٰ کہ وہ زمین پر اولے کی طرح چلتا ہے اس پر کوئی گناہ اور خطا باقی نہیں رہتی۔

ایک روایت میں ہے۔

حُمّٰى يَوْمٍ كَفَّارَةُ سَنَةٍ ۔ (۲)

ایک دن کا بخار ایک سال کا کفارہ ہوتا ہے۔

---

(۱) الکامل لابن عدی ترجمہ ضمام بن اسماعیل جلد ۴ ص ۲۲۴

(۲) تذکرۃ الموضوعات ص ۲۰۶ باب المرض من الحمیٰ

اس کی وجہ یوں بیان کی گئی کہ یہ ایک سال کی قوت کو ختم کر دیتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انسان کے تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور بخار ان سب میں داخل ہو جاتا ہے اور ہر جوڑ تکلیف محسوس کرتا ہے پس ہر درد ایک دن کا کفارہ بنتا ہے۔

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذکر فرمایا کہ بخار گناہوں کا کفارہ بنتا ہے تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے دعا کی کہ وہ ہمیشہ بخار کی حالت میں رہیں۔ چنانچہ ان سے بخار کبھی بھی جدا نہ ہوا حتیٰ کہ انتقال فرما گئے انصار میں سے ایک گروہ نے بھی یہی تمنا کی چنانچہ وہ بھی ہمیشہ بخار کی حالت میں رہتے تھے۔

اور جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

مَنْ اَذْهَبَ اللّٰهُ كَرِيْمَتَيْهِ لَمْ يَرْضَ لَهٗ ثَوَابًا دُوْنَ الْجَنَّةِ۔

جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کی دو کریم چیزوں (آنکھوں) کو لے جاتا ہے تو اس کے ثواب کے طور پر جنت سے کم پر راضی نہیں ہوتا۔

تو انصار میں سے ایسے لوگ بھی تھے جو نابینا ہونے کی تمنا کرتے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وہ شخص جو اپنے جسم اور مال پر مصائب و امراض کے داخل ہونے پر خوش نہیں ہوتا وہ عالم نہیں ہو سکتا کیوں ان میں خطاؤں کے کفارے کی امید ہوتی ہے۔

مروی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک شخص کو دیکھا جو بہت بڑی آزمائش میں مبتلا تھا آپ نے عرض کیا اے میرے رب! اس پر رحم فرما اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں جس چیز کے ذریعے اس پر رحم کر رہا ہوں اس میں کیا رحم کروں؟ یعنی اس آزمائش کو میں اس کے گناہوں کا کفارہ بناتا ہوں اور اس کے ذریعے اس کے درجات میں اضافہ کرتا ہوں۔

چھٹا سبب:

یہ ہے کہ بندہ زیادہ دیر تک صحت مند رہنے سے اپنے نفس میں تکبر اور سرکشی کا ڈر محسوس کرتا ہے لہٰذا وہ اس خوف سے علاج ترک کرتا ہے کہ مرض زائل ہونے کی صورت میں دوبارہ غفلت، اکڑ، سرکشی، لمبی امید، فوت شدہ کے تدارک میں لیت و لعل اور نیکیوں میں تاخیر پیدا ہو جائے گی کیوں کہ صحت، قوتِ صفات کا نام ہے اور اس سے خواہش ابھرتی ہے شہوات حرکت میں آتی ہیں اور گناہوں کی دعوت دیتی ہیں اور کم از کم بات یہ ہوتی ہے کہ مباح چیزوں میں عیش پسندی کی طرف بلاتی ہیں اور یہ وقت کا ضیاع ہے نیز مخالفتِ نفس اور اطاعت کو لازم پکڑنے کے سلسلے میں حاصل ہونے والے بہت بڑے نفع کو بیکار چھوڑنا ہے۔

اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے امراض و مصائب میں مبتلا کرنے کے ذریعے خبردار کرنے سے خالی نہیں چھوڑتا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ مومن بیماری، قلت، لغزش سے خالی نہیں ہوتا ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے مفلسی میرا قید خانہ ہے اور بیماری میری بیڑی ہے میں اپنی مخلوق میں سے جس کو سب سے

زیادہ پسند کرتا ہوں اسے اسی میں قید کرتا ہوں۔

پس جب بیماری کی صورت میں سرکشی سے اور گناہوں کی سواری سے رکاوٹ ہے تو اس سے بہتر چیز کیا ہو سکتی ہے اور جس آدمی کو اس سرکشی) کا ڈر ہو اس کے لیے بیماری کے علاج میں مشغول ہونا مناسب نہیں۔ پس عافیت، گناہوں کو ترک کرنے میں ہے ایک عارف نے ایک شخص سے پوچھا کہ میرے بعد تم کیسے رہے؟ اس نے کہا عافیت میں رہا اس نے کہا اگر تم نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کی تو تم عافیت میں ہو اور اگر تم نے اس کی نافرمانی کی ہے تو نافرمانی سے بڑھ کر کون سی بیماری ہو سکتی ہے جو شخص اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اس کے لیے کیا عافیت ہے۔

حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے عید کے دن عراق میں نبطیوں کو زینت میں دیکھا تو پوچھا ان لوگوں نے یہ کیا طریقہ اختیار کیا ہے انہوں نے کہا اے امیر المومنین! یہ ان کی عید کا دن ہے آپ نے فرمایا ہر وہ دن جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی جائے وہ ہمارے لیے عید کا دن ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ (۱) — اس کے بعد کہ اس نے تمہیں تمہارا پسندیدہ کام دکھایا، تم نے نافرمانی کی۔

کہا گیا ہے اس سے عافیت مراد ہے۔ اور ارشاد خداوندی ہے۔

كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لَيَطْغَىٰ أَنْ رَآهُ اسْتَغْنَىٰ (۲) — ہاں ہاں بے شک انسان سرکشی کرتا ہے اس پر کہ اپنے آپ کو غنی سمجھ لیا۔

اسی طرح جب وہ صحت و عافیت کے ساتھ مستغنی ہوتا ہے (تو بھی سرکشی کرتا ہے) اور بعض بزرگوں نے فرمایا کہ چونکہ فرعون ایک عرصہ دراز تک عافیت کے ساتھ رہا کیوں کہ وہ چار سو سال تک زندہ رہا لیکن اس دوران نہ تو کبھی اس کے سر میں درد ہوا اور نہ اس کا جسم بخار کا شکار ہوا اسی لیے اس نے کہا۔

أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (۳) — میں تمہارا بلند و بالا رب ہوں۔

فرعون نے اسی وجہ سے رب ہونے کا دعویٰ کیا اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اگر اسے ایک دن بھی درد شقیقہ ہوتا (آدھے سر کا درد) تو وہ اسے فضول کاموں سے روک دیتا ہے ربوبیت کا دعویٰ تو ایک طرف رہا۔

---

(۱) قرآن مجید، سورۂ آل عمران آیت ۱۵۲

(۲) قرآن مجید، سورۂ علق آیت ۶، ۷

(۳) قرآن مجید سورۂ نازعات آیت ۲۴

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اَکْثِرُوْا مِنْ ذِکْرِ ھَاذِمِ اللَّذَّاتِ - (۱) لذتوں کو توڑنے والی چیز (موت) کا زیادہ ذکر کیا کرو۔

کہا گیا ہے کہ بخار موت کا قاصد ہے اور وہ اس کی یاد دلاتا ہے نیز (عمل میں) ٹال مٹول سے بچاتا ہے)

ارشاد خداوندی ہے۔

اَوَلَا یَرَوْنَ اَنَّھُمْ یُفْتَنُوْنَ فِیْ کُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ لَا یَتُوْبُوْنَ وَلَا ھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ۔ (۲) کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ان کو سال میں ایک یا دو مرتبہ آزمایا جاتا ہے پھر وہ توبہ نہیں کرتے اور نہ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

کہا گیا کہ اس سے مراد ان کو امراض میں مبتلا کر کے آزمانا ہے۔

اور کہا جاتا ہے کہ جب بندہ دو بیماریوں میں مبتلا ہو پھر توبہ نہ کرے تو موت کا فرشتہ اس سے کہتا ہے اے غافل! تیرے پاس قاصد کے بعد قاصد آیا لیکن تو نے اس کی بات نہ مانی اور اسلاف کا طریقہ تو یہ تھا کہ اگر کسی سال ان کو نفس یا مال میں کوئی نقصان نہ پہنچتا تو وہ گھبرا جاتے اور وہ کہتے تھے کہ مومن پر چالیس دن میں کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آتی ہے یا وہ کسی آزمائش میں مبتلا ہوتا ہے حتیٰ کہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے ایک عورت سے شادی کی اور وہ کبھی بیمار نہ ہوئی تو آپ نے اسے طلاق دے دی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عورت کی پیشکش کی گئی اور اس کے اوصاف ذکر کئے گئے حتیٰ کہ آپ نے اس سے نکاح کا ارادہ فرمایا تو عرض کیا گیا کہ وہ کبھی بیمار نہیں ہوئی آپ نے فرمایا مجھے اس کی کوئی حاجت نہیں (۳)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماریوں اور درد دل حتیٰ کہ سر درد وغیرہ کا ذکر فرمایا تو ایک شخص نے عرض کیا صداع (درد سر) کیا ہوتا ہے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ سے دور ہو جاؤ (اور) جو شخص کسی جہنمی کو دیکھنا چاہتا ہے وہ اس شخص کو دیکھے (۴) اور یہ بات اس لئے فرمائی ہے کہ دوسری حدیث شریف میں آیا ہے۔

اَلْحُمّٰی حَظُّ کُلِّ مُؤْمِنٍ مِنَ النَّارِ۔ (۵) بخار ہر مومن کا آگ سے حصہ ہے۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ ص ۳۲۴، ابواب الزھد

(۲) قرآن مجید، سورۃ توبہ آیت ۱۲۶

(۳) مسند امام احمد بن حنبل جلد اول ص ۳ مرویات ابوبکر الصدیق

(۴) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۲ ص ۳۳۲ مرویات ابوہریرہ

(۵) مجمع الزوائد جلد ۲ ص ۳۰۶ کتاب الجنائز

نوٹ :۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جو جہنمی قرار دیا تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کو وحی کے ذریعے اس کا انجام بتایا گیا ہو یا بطور تنبیہ فرمایا کہ اس میں مومنوں والی صفات نہیں ورنہ بیمار نہ ہونا جہنم میں جانے کا ذریعہ نہیں ہے ۱۲ ہزاروی ——

حضرت انس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے عرض کیا گیا یا رسول اللہ! کیا قیامت کے دن شہداء کے ساتھ ان کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہوں گے ؟ آپ نے فرمایا ہاں جو شخص روزانہ بیس مرتبہ موت کو یاد کرے - (۱)

اور دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں کہ جو شخص اپنے گناہوں کو یاد کر کے روئے (۲) اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مریض عام طور پر موت کا ذکر کرتا ہے

پس جب بیماری کے فوائد زیادہ ہیں تو ایک جماعت نے اس کے زوال کا حیلہ ترک کر دیا کیونکہ انہوں نے اس میں اپنے لیے زیادہ ثواب دیکھا اس لیے نہیں کہ وہ علاج معالجے کو نقصان دہ سمجھتے تھے اور یہ نقصان کیسے ہو سکتا ہے جبکہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عمل کیا۔

فصل ۲ :

ہر حال میں ترکِ علاج کو افضل سمجھنے والوں کا رد

اگر کوئی شخص کہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عمل (علاج کروانا) اس لیے اختیار کیا کہ لوگوں کے لیے سنت بنے ورنہ یہ تو کمزور لوگوں کی حالت ہے اور مضبوط لوگوں کا درجہ دوائی کے ترک کے ساتھ توکل کو واجب کرتا ہے۔

تو (اس کے جواب میں) کہا جائے گا کہ اس طرح تو مناسب یہی ہے کہ جوشِ خون کے وقت پچھنے نہ لگوانا اور رگ نہ کٹوانا بھی توکل کی شرط ہونی چاہیے۔

اگر کہا جائے کہ یہ بھی شرط ہے تو اس سے لازم آئے گا کہ جب اسے بچھو یا سانپ کاٹے تو اسے اپنے پاس سے دور نہ کرے کیوں کہ خون باطن کو ڈستا ہے اور بچھو ظاہر کو، تو دونوں میں فرق کیا ہے۔

اگر وہ کہے کہ توکل کے لیے یہ بات بھی شرط ہے تو کہا جائے گا کہ اس کا مطلب یہی ہوا کہ پیاس کے ڈسنے کو پانی کے ذریعے دور نہ کرے اور بھوک کے ڈسنے کا علاج روٹی کے ذریعے نہ کرے ٹھنڈک ڈسے تو جبے کے ذریعے اس کا علاج بھی نہ کرے اور اس بات کا کوئی بھی قائل نہیں اور ان درجات کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ یہ سب

---

(۱) الفوائد المجموعہ ص ۲۶۴ کتاب الادب حدیث ۱۷۵

(۲)

اسباب ہیں مسبب الاسباب سبحانہ وتعالیٰ نے ان کو مرتب فرمایا اور ان کے ساتھ اپنا طریقہ جاری کیا۔

ان امور کے توکل کی شرائط میں سے نہ ہونے پر حضرت عمر فاروق اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے طاعون کے کے قصے میں سری بات دلالت کرتی ہیں کہ انہوں نے ملک شام کا قصد کیا اور جب جابیہ کے مقام پر پہنچے تو انہیں خبر ملی کہ وہاں بہت زیادہ موت واقع ہورہی ہے اور وبا پھیلی ہوئی ہے تو اب صحابہ کرام دو گروہوں میں بٹ گئے ان میں سے بعض نے کہا ہم وبا پر داخل نہیں ہوں گے اس طرح تو ہم خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالیں گے جب کہ دوسرے گروہ نے کہا بلکہ ہم داخل ہوں گے اور توکل کریں گے اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور موت سے نہیں بھاگیں گے ورنہ ان لوگوں کی مثل ہو جائیں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ۔ (۱)

کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے موت کے خوف سے نکلے اور وہ کئی ہزار تھے۔

پھر انہوں نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف رجوع کر کے آپ کی رائے معلوم کی آپ نے فرمایا ہم واپس لوٹیں گے اور وہاں نہیں داخل ہوں گے لیکن آپ کی رائے کی مخالفت کرنے والوں نے کہا کیا ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہاں ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف لوٹ رہے ہیں

پھر آپ نے ان کے لیے ایک مثال بیان کرتے ہوئے فرمایا تمہارا کیا خیال ہے اگر تم میں سے کسی ایک کی بکریاں ہوں پس وہ ایک وادی میں اترے جس کی دو گھاٹیاں ہوں ایک سرسبز و شاداب اور دوسری خشک ہو تو کیا یہ بات نہیں کہ اگر وہ سبزی والی گھاٹی میں چرائے تو اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے چراتا ہے اور اگر خشک گھاٹی میں چرائے تو بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے چراتا ہے؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں یہی بات ہے پھر آپ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو بلایا تاکہ ان کی رائے طلب کریں اور آپ موجود نہ تھے صبح ہوئی تو حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ تشریف لائے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں ان سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا اے امیر المومنین! اس سلسلے میں میرے پاس ایک بات ہے جو میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے یہ سن کر حضرت عمر فاروق نے فرمایا اللہ اکبر (بیان کیجئے)

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا۔

اِذَا سَمِعْتُمْ بِالْوَبَاءِ فِيْ اَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوْا عَلَيْهِ وَاِذَا وَقَعَ فِيْ اَرْضٍ وَاَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوْا فِرَارًا مِنْهُ۔ (۲)

جب تم سنو کہ کسی علاقے میں وبا ہے تو وہاں نہ جاؤ اور جب کسی جگہ وبا پھیلے اور تم وہاں موجود ہو تو اس (وبا) سے بھاگتے ہوئے وہاں سے نہ نکلو۔

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۰۶ مرویات اسامہ۔

(یہ بات سن کر) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خوش ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی کہ ان کی رائے حدیث کے مطابق ہوئی۔ اور لوگوں کو مقام جابیہ سے واپس لے گئے۔

تو کس طرح تمام صحابہ کرام توکل کو چھوڑنے پر متفق ہوتے حالانکہ یہ سب سے اعلیٰ مقام ہے اگر اس قسم کی مثالیں توکل کی شرائط میں سے ہوتیں۔

سوال:-

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وبا والے مقام سے نکلنے سے کیوں منع فرمایا اور طب کے مطابق وبا کا سبب ہوا ہے اور علاج کا سبب سے زیادہ ظاہر طریقہ مضر چیز سے بھاگنا ہے اور ہوا ہی مضر ہے تو اس کی اجازت کیوں نہ دی گئی؟

جواب:-

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مضر چیز سے بھاگنا منع نہیں ہے کیونکہ پچھنے لگوانا اور رگ کٹوانا مضر چیز سے بھاگنا ہے اور اس قسم کی مثالوں میں توکل کو چھوڑنا مباح ہے۔ اور یہ مقصود پر دلالت نہیں لیکن اس میں جو چیز خرابی پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ہوا اس لیے نقصان نہیں دیتی کہ وہ ظاہری بدن سے ملتی ہے بلکہ اس لیے نقصان دیتی ہے کہ آدمی مسلسل سانس لیتا ہے پس جب اس میں بدبو ہو اور پھیپھڑوں، دل اور آنتوں کے اندر تک تو دیر تک سانس لینے سے ان میں اثر ہوتا ہے پس ظاہر پر اس وقت اثر نہیں ہوتا جب تک باطن میں زیادہ دیر تک تاثیر نہ ہو پس شہر سے نکلنا عام طور پر اس اثر سے نجات نہیں دیتا جو پہلے پکا ہو چکا ہے لیکن خلاصی کا بھی احتمال ہے پس یہ ان باتوں کی جنس سے ہے جن کا محض وہم ہوتا ہے جیسے دم کروانا اور فال نکالنا وغیرہ۔ اب اگر وہاں سے نکلنے میں صرف یہی بات پائی جاتی تو یہ توکل کے خلاف تھی لیکن منع نہیں ہاں یہ کسی دوسری بات کے مل جانے سے ممنوع قرار پائی وہ یہ کہ اگر صحیح لوگوں کو وہاں سے نکلنے کی اجازت دی جاتی تو شہر میں صرف بیمار ہی رہ جاتے جن کو طاعون نے وہاں روک رکھا ہے پس ان کے دل ٹوٹ جاتے اور ان کی نگرانی کرنے والا کوئی بھی باقی نہ رہتا نہ کوئی شخص ان کو پانی پلانے والا ہوتا اور نہ ہی کھانا کھلانے والا، جب کہ وہ خود یہ کام نہیں کر سکتے تو اس طرح یہ ان بیماروں کو ہلاک کرنے والی بات ہوتی اور ان کے بچ جانے کی امید بھی ہے جیسے تندرست لوگوں کے بچنے کی امید ہے کیونکہ اگر تندرست لوگ وہاں ٹھہرے رہیں تو ان کی موت قطعی نہیں ہے اور اگر وہاں سے نکل جائیں تو یہ نکلنا ان کی خلاصی کے لیے قطعی نہیں ہے جب کہ باقی لوگوں کی ہلاکت کے لیے قطعی ہے اور مسلمان ایک دیوار کی طرح ہیں جس کا بعض، دوسرے بعض کو مضبوط کرتا ہے جب اس کے کسی ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو تمام جسم میں تکلیف ہوتی ہے۔

تو ہمارے نزدیک ممانعت کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے اور جو شخص ابھی تک شہر میں نہیں آیا اس کے حق میں معاملہ برعکس ہے کیونکہ ہوا نے اس کے باطن میں اثر نہیں کیا اور نہ ہی شہر والوں کو اس کی حاجت ہے ہاں اگر شہر میں

صرف طاعون زدہ لوگ ہی ہوں اور ان کو نگران کرنے والوں کی ضرورت ہو اور ایک جماعت ان کے پاس آئے تو بعض اوقات ان کی اعانت کے لیے ان لوگوں کا شہر میں داخل ہونا اچھا قرار پاتا ہے اور ان کو داخل ہونے سے منع نہیں کیا جائے گا کیوں کہ یہ موہوم ضرر ہے اور باقی مسلمانوں سے ضرر کو دور کرنے کا یقین ہے اسی لیے بعض روایات میں طاعون سے بھاگنے کو میدان جنگ سے بھاگنے کی طرح قرار دیا گیا ہے (۱) اس لیے کہ اس میں باقی مسلمانوں کا دل توڑنا اور ان کی ہلاکت کی کوشش کرنا ہے۔

تو یہ باریک باتیں ہیں پس جو شخص ان کا خیال نہ کرے اور روایات و آثار کے ظاہر کو دیکھے تو جو کچھ وہ سنتا ہے ان میں سے اکثر کو وہ ایک دوسرے کے خلاف جانتا ہے عابدین وزاہدین کو عام طور پر یہاں دھوکہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے علم کو شرف اور فضیلت حاصل ہے۔

سوال:

جب علاج معالجہ ترک کرنے میں فضیلت ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کیوں ترک نہیں فرمایا تاکہ آپ بھی فضیلت حاصل کرتے۔

جواب:-

اس میں ان لوگوں کی نسبت سے فضیلت ہے جن کے گناہ زیادہ ہیں تاکہ یہ بات ان گناہوں کا کفارہ بنے یا اسے صحت کی حالت میں اپنے پر سرکشی اور غلبۂ شہوات کا خوف ہو یا وہ اس بات کا محتاج ہو جو اسے موت کی یاد دلائے کیوں کہ اس پر غفلت کا غلبہ ہے یا وہ راضی رہنے والوں اور متوکلین کے مقامات سے کوتاہی کی وجہ سے صابرین کا درجہ پانے کا محتاج ہو یا وہ فوائد جو اللہ تعالیٰ نے دواؤں میں رکھے ہیں ان پر مطلع ہونے سے اس کی بصیرت کوتاہ ہو، حتیٰ کہ اس کے حق میں یہ موہوم ہو جیسے دم کروانا، یا وہ اپنے حال میں مشغول ہو جو علاج کروانے سے اسے بے خبر رکھے اور اگر علاج کروائے تو یہ حالت چلی جائے کیوں کہ وہ دونوں باتوں کو جمع کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو علاج نہ کروانے کے یہ اسباب ہیں اور یہ سب باتیں بعض لوگوں کی نسبت سے کمالات ہیں لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ کی نسبت نقصان ہیں بلکہ آپ کا مقام ان تمام مقامات سے اعلیٰ ہے کیوں کہ آپ کے حال کا تقاضا یہ ہے کہ اسباب ہوں یا نہ دونوں صورتوں میں آپ کا مشاہدہ ایک ہی طریقے پر ہو کیوں کہ آپ کی نظر اسباب پر نہیں بلکہ مسبب الاسباب پر تھی اور جس شخص کا یہ مقام ہو اسے اسباب نقصان نہیں پہنچا سکتے جیسے مال کی رغبت نقصان دہ ہے اور اسے ناپسند کرتے ہوئے اس سے اعراض کرنا اگرچہ کمال ہے لیکن اس شخص کے مقابلے میں نقصان ہے جس کے نزدیک مال ہونا نہ ہونا برابر ہو یس پتھر اور سونے

(۱) کنز العمال جلد ۱۰ ص ۷۷، حدیث ۲۸۴۳۵

کو ایک جیسا سمجھنا سونے سے بھاگنے اور پتھر سے نہ بھاگنے کے مقابلے میں زیادہ کامل بات ہے جب کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ تھی کہ آپ کے نزدیک مٹی کا ڈھیلا اور سونا برابر تھا آپ اسے لوگوں کو زہد کی تعلیم دینے کی خاطر نہیں رکھتے تھے کیوں کہ ان کی انتہائی قوت یہی ہے یہ بات نہیں تھی کہ مال کو روک رکھنے سے آپ کو اپنے اوپر کسی قسم کا خوف تھا کیوں کہ آپ کا مقام اس قدر بلند ہے کہ دنیا آپ کو دھوکہ نہیں دے سکتی تھی اور آپ پر دنیا کے خزانے پیش کئے گئے لیکن آپ نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا (۱)

اور اسی مشاہدہ کی بنیاد پر آپ کے لیے اسباب کو اختیار کرنا اور نہ کرنا ایک جیسا تھا آپ نے علاج معالجہ اس لیے ترک نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عادت اسی طرح جاری ہے (کہ علاج کے ذریعے بیماری دور کرتا ہے) اور امت کو ان کی حاجت کے مطابق اجازت دینا بھی مقصود تھا باوجودیکہ اس (علاج کروانے) میں کوئی ضرر بھی نہ ہو بخلاف مال جمع کرنے کے کیوں کہ اس کا ضرر زیادہ ہے ہاں دوائی کا استعمال اس اعتبار سے ضرر رساں ہے جب دوائی کو نفع بخش سمجھا جائے اس کے خالق کو نہیں اور اس بات سے منع کیا گیا ہے نیز یہ کہ اس کے ذریعے صحت اس لیے حاصل کی جائے کہ اس کے ذریعے گناہوں پر مدد حاصل کرے اور یہ ممنوع بات ہے اور مومن عام طور پر اس بات کا قصد نہیں کرتا۔

اور کوئی بھی مسلمان دوائی کو ذاتی طور پر نافع نہیں سمجھتا بلکہ اس کا عقیدہ یہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نفع کا سبب بنایا ہے جیسے وہ پانی کو ذاتی طور پر سیراب کرنے والا اور روٹی کو سیر کرنے والی نہیں جانتا پس مقصود کے اعتبار سے علاج کروانا مال کمانے کی طرح ہے اگر وہ نیکی پر مدد حاصل کرنے یا گناہوں پر مدد کے لیے مال کمائے تو اس کا وہی حکم ہوگا۔ اور اگر مباح چیز سے لذت حاصل کرنے کے لیے کمائے تو اس کا وہی حکم ہوگا۔

جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے اس سے ظاہر ہوا کہ بعض حالات میں علاج معالجہ ترک کرنا افضل ہے اور بعض صورتوں میں علاج کروانا افضل ہے اور یہ تبدیلی، احوال کی تبدیلی سے پیدا ہوتی ہے نیز اشخاص، اور نیتوں کا اختلاف بھی اس تفاوت میں مؤثر ہے نیز توکل میں دوا کا استعمال اور عدم استعمال شرط نہیں ہاں موہوم امور مثلاً داغ لگوانا اور دم وغیرہ کو ترک کرنا شرط ہے کیوں کہ یہ کام تدبیروں میں پڑنا ہے جو توکل کرنے والوں کے شایان شان نہیں۔

مرض کو ظاہر کرنے اور چھپانے کے سلسلے میں متوکلین کے احوال

جان لو! بیماری، فقر اور دیگر مصائب کو چھپانا نیکی کے خزانوں میں سے ہے اور اس کا بہت بڑا مقام ہے کیوں اللہ تعالیٰ کے حکم پر راضی رہنا اور اس کی آزمائش پر صبر کرنا یہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان معاملہ ہے لہٰذا اس کو مخفی رکھنا

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۵۴ مرویات ابوامامہ

آفات سے زیادہ محفوظ رہتا ہے لیکن اس کے باوجود اسے ظاہر کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں جب نیت اور مقصد صحیح ہو اور مقاصد اظہار تین ہیں۔

پہلا مقصد :

اس کی غرض علاج کروانا ہو پس ڈاکٹر کے سامنے ذکر کرنے کی ضرورت ہو گی تو وہ شکایت کے طور پر نہیں بلکہ حکایت کے طور پر ذکر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کو ظاہر کیا ہے حضرت بشر رحمہ اللہ، عبدالرحمن طبیب کے سامنے اپنی بیماریوں کا ذکر کرتے تھے، اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ جب بیماری کا شکار ہوتے اس کی خبر دیتے تھے اور فرماتے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے مجھ پر جو اثر کیا میں اس کی خبر دے رہا ہوں۔

دوسرا مقصد :

طبیب کے علاوہ کسی سے بیان کرے اور یہ شخص (مریض) ان لوگوں میں سے ہو جن کی اقتدا کی جاتی ہے اور معرفت میں صاحب مرتبہ ہو پس وہ کسی شخص سے اس لیے ذکر کرے کہ وہ اس سے مرض میں اچھی طرح صبر کرنا سیکھے بلکہ اچھی طرح شکر کرنا، یعنی وہ اس بات کا اظہار کرے کہ بیماری ایک نعمت ہے اور اسی پر شکر کرنا چاہیے اس لیے وہ اس کا اس طرح ذکر کرتا ہے جیسے وہ نعمت کا ذکر کرتا ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں جب مریض اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے اور اس کا شکر ادا کرے پھر اپنے درد کا ذکر کرے تو یہ شکوہ نہیں ہے۔

تیسرا مقصد :

بیماری کا ذکر کرے نیز اپنے عجز اور بارگاہ خداوندی میں محتاجی کو ظاہر کرے اور یہ بات اس شخص سے اچھی معلوم ہوتی ہے جو قوت و شجاعت کے لائق ہو اور عاجزی کرنا اس سے بعید معلوم ہو جیسا کہ مروی ہے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ان کی بیماری کے دوران پوچھا گیا آپ کیسے ہیں؟ آپ نے فرمایا بہت برا ہوں لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے گویا انہوں نے اس بات کو پسند نہ کیا اور اسے شکایت خیال کیا آپ نے فرمایا کیا میں اللہ تعالیٰ پر بہادری ظاہر کروں تو آپ نے اس بات کو پسند فرمایا کہ اپنا عجز اور محتاجی ظاہر کریں حالانکہ آپ کی قوت و شجاعت معروف تھی لیکن آپ نے وہی طریقہ اختیار فرمایا جس کی تعلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی جب حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ الفاظ کہتے ہوئے سنا۔

اَللّٰهُمَّ صَبِّرْنِیْ عَلَی الْبَلَاءِ۔ یا اللہ مجھے مصیبت پر صبر عطا فرما۔

تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا۔

لَقَدْ سَأَلْتَ اللّٰهَ تَعَالٰی الْبَلَاءَ فَسَلِ اللّٰهَ آپ نے اللہ تعالیٰ سے مصیبت کا سوال کیا ہے پس

الْعَافِيَةَ۔ (۱) — اللہ تعالیٰ سے عافیت کا سوال کریں۔

تو یہ مقاصد مرض کے ذکر کی اجازت دیتے ہیں اور یہ باتیں اس لیے شرط ہیں کہ بیماری کا ذکر شکایت ہے اور اللہ تعالیٰ سے شکایت اور شکوہ حرام ہے جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا کہ فقراء کے لیے ضرورت کے بغیر سوال کرنا حرام ہے۔

بیماری کا اظہار اس وقت شکوہ قرار پاتا ہے جب اس میں اللہ تعالیٰ کے فعل پر ناراضگی اور ناپسندیدگی ظاہر کی جائے اور اگر ناراضگی کے قرینے اور ان نیتوں سے بھی خالی ہو جن کا ہم نے ذکر کیا ہے تو اسے حرام نہیں کہا جائے گا لیکن یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ ترکِ ذکر زیادہ بہتر ہے کیوں کہ بعض اوقات اس سے شکایت کا وہم ہوتا ہے اور کبھی اس میں بناوٹ ہوتی ہے کہ جس قدر بیماری موجود ہے اس سے زیادہ بیان کی جاتی ہے اور جو شخص توکل کی وجہ سے علاج کروانا ترک ہے اس کے حق میں اظہار کی کوئی وجہ نہیں کیوں کہ اظہار کے ذریعے راحت کے حصول سے دوائی کے ذریعے حاصل ہونے والی راحت افضل ہے بعض بزرگوں نے فرمایا جس نے مرض کا ذکر کیا اس نے صبر نہیں کیا۔ اور آیتِ کریمہ

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ (۱) — پس صبر اچھا ہے۔

کے معنی کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ اس سے وہ صبر مراد ہے جس میں شکوہ نہ ہو۔

حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آپ کی آنکھوں کی بینائی کیسے چلی گئی؟ آپ نے فرمایا زمانے کے گزرنے اور غموں کی طوالت سے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ آپ میرے بندوں کے سامنے شکایت پر آمادہ ہو گئے۔ تو آپ نے عرض کیا اے میرے رب! میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں۔

حضرت طاؤس اور حضرت مجاہد رحمہما اللہ نے فرمایا بیمار کا آہ آہ کرنا اس پر لکھا جاتا ہے اور اسلاف مریض کی آہ کو برا جانتے تھے کیوں کہ یہ ایسے معنیٰ کا اظہار ہے جو شکوہ کا مقتضی ہے یہاں تک کہا گیا کہ حضرت ایوب علیہ السلام سے شیطان کو جو کچھ ملا وہ آپ کے حالتِ مرض میں آہ کرنا تھا اس ملعون نے اسی آہ کو اپنا حصہ قرار دیا۔

اور حدیث شریف میں ہے۔

إِذَا مَرِضَ الْعَبْدُ أَوْحَى اللهُ تَعَالَى إِلَى الْمَلَكَيْنِ انْظُرَا مَا يَقُولُ لِعُوَّادِهِ فَإِنْ حَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى بِخَيْرٍ دَعَوَا لَهُ وَإِنْ شَكَا وَذَكَرَ شَرًّا قَالَا كَذَلِكَ

جب بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ دو فرشتوں کی طرف وحی بھیجتا ہے کہ دیکھو یہ شخص اپنے عیادت کرنے والوں سے کیا کہتا ہے اگر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے تو وہ اس کے لیے دعا مانگتے ہیں اور اگر وہ شکایت کرے اور برائی کا ذکر

---

(۱) مسند امام احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۳۵ مرویات معاذ (۲) قرآن مجید، سورۂ یوسف آیت ۸۳

تَکُوْنُ۔ (۱) کرے تو وہ کہتے ہیں اسی طرح ہو۔

بعض عبادت گزار عیادت کو اس لیے برا جانتے تھے کہ انہیں شکایت اور کلام کے زیادہ ہونے کا خوف تھا چنانچہ ان میں سے بعض بیماری کی حالت میں اپنا دروازہ بند کر دیتے تھے۔

پس ان کے پاس کوئی بھی نہ جاتا حتی کہ وہ ٹھیک ہو کر خود ان کے پاس باہر تشریف لاتے ان میں حضرت فضیل حضرت وہیب اور حضرت بشر رحمہم اللہ شامل ہیں اور حضرت فضیل رحمہ اللہ فرماتے تھے میں چاہتا ہوں کہ بیمار ہوں تو کوئی شخص میری بیمار پرسی نہ کرے اور فرماتے تھے میں بیماری کو عیادت کرنے والوں کی وجہ سے ناپسند کرتا ہوں اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو۔

توحید و توکل کی بحث اللہ تعالیٰ کی مدد اور حسن توفیق سے مکمل ہوتی اس کے بعد محبت، شوق، اُنس اور رضا کا بیان ہوگا اللہ سبحانہ وتعالیٰ توفیق دینے والا ہے۔



(۱) کنز العمال جلد ۳ ص ۱۲۳ حدیث ۶۷۰۴